# اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء

# اِقبال نمبر

بیادگار علامہ اِقبال مرحوم

ایڈیٹر:— عبدُالحق

شائع کردہ

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) نئی دہلی

# اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے -

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ -

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے - نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے -

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۵، ہارڈنگ ایوی نیو، نئی دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کو لکھنا چاہیے -

المشتہر : انجمن ترقیء اردو (ہند) نئی دہلی

---

## نرخ نامۂ اجرت اشتہارات 'اردو' و 'سائنس'

| کالم | ایک بار کے لیے | چار بار کے لیے |
|---|---|---|
| دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ | ۸ روپے | ۳۰ روپے |
| ایک کالم ( آدھا صفحہ ) | ۴ روپے | ۱۵ روپے |
| نصف کالم ( چوتھائی صفحہ ) | ۲ روپے ۴ آنے | ۸ روپے |

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُس کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے -

المشتہر منیجر انجمن ترقیء اردو (ہند) نئی دہلی

---

# اردو


| حصہ ۷۲ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ع | جلد ۱۸ |
|---|---|---|


انجمن ترقی اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

نئی دہلی

رشید احمد ایم-اے نے لطیفی پریس دہلی میں چھپوا کر
انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے شایع کیا ۔

# دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

## مرتبۂ

## انجمن ترقی اُردو ( ھند )

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

( ۱ ) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

( ۲ ) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

( ۳ ) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

( ۴ ) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

( ۵ ) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

( ۶ ) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

( ۷ ) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

( ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳ ) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصولڈاک

### ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیٔ اردو ( ھند ) اورنگ آباد

# اردو

## فہرست مضامین

# نامۂ سر تیج بہادر سپرو

مخدومی و محترمی جناب عبدالحق صاحب -

تسلیم و نیاز - جب میں تین ہفتے کے قریب ہوتے ہیں کہ حیدر آباد میں خدمت عالی میں حاضر ہوا تھا اس وقت میں نے بر سبیل تذکرہ اقبال مرحوم کی صناعی کی تعریف کی تھی - اور تمثیلاً یہ عرض کیا تھا کہ پچھلی فروری میں جب میں لاہور میں تھا اور اُن سے ملنے گیا تھا میرے ساتھ میرے داماد پنڈت چاند نرائن ریغا جو پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور جن کو اقبال صاحب سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، گئے - اُنھوں نے کچھ عرصہ ہوا چند اشعار اقبال صاحب کے متعلق لکھے اور مجھ کو سنائے - میں نے اُن سے کہا کہ اپنے استاد کی موجودگی میں اُن اشعار کو پڑھیں - چنانچہ اُنھوں نے مرحوم کو وہ اشعار سنائے - اور اُنھوں نے بہت تعریف کی لیکن ایک مصرعے میں کچھ اصلاح دی - چوتھے شعر کا پہلا مصرع پنڈت چاند نرائن نے حسب ذیل لکھا تھا :—

'تیرے جذبوں نے دیا ہے میری فطرت کو فروغ'

اقبال صاحب نے فوراً مصرع میں حسب ذیل اصلاح کی :—

'تیرے جذبوں نے کیا ہے میری فطرت کو بلند'

میں نے عزیز موصوف کو لکھ کر وہ اشعار منگائے ہیں اور میں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں - اُنھوں نے چوتھے مصرعے کو اب یوں تبدیل کر لیا ہے -

'ساغر دل میرا جذبوں سے ترے لبریز ہے'

مجھے آپ کے "اقبال" نمبر کا بڑا انتظار ہے - اقبال نے اپنے ایک شعر (بال جبریل صفحہ ۳۵) میں اپنی زندگی کا پورا اور سچا نقشہ کھینچا ہے -

پر سوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

اور اپنے فلسفہ اور شاعری کے بارے میں شاعرانہ تعلی کے ساتھ نہیں، بلکہ صداقت کے ساتھ ایک یہ شعر لکھا ہے -

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

اور اسی خیال کو اپنے ایک فارسی کے شعر میں یوں ادا کیا ہے -

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال
فقیر راہ نشین ست و دل غنی دارد

اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا - یہ کہنا اس کے دایرۂ اثر کو محدود کرنا ہے - یہ ضرور ہے کہ اُس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے - لیکن کسی نے آج تک "ملٹن" کے نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا "کالیداس" کے نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو نہ محدود کیا اور نہ اور مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اُس کی قدردانی میں کمی کی - اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں - بال جبریل میں (میں صرف تمثیلاً عرض کرتا ہوں) جو نظم متعلق "ہسپانیہ" لکھی ہے کیا اس کا اثر صرف مسلمان

کے هی دل پر هو سکتا هے - اُن کے تین اشعار کی طرف میں آپ کو توجہ دلاتا هوں وہ اشعار یہ هیں :—

(۱) بوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں هیں
خاموش ادائیں هیں تری باد سحر میں

(۲) پھر تیرے حسینوں کو ضرورت هے حنا کی
باقی هے ابھی رنگ میرے خون جگر میں

(۳) دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی
هے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

شاعری اور تخیل ایک طرف ان اشعار کی زبان دوسری طرف - آج کل جو مسلۂ زبان کے اوپر بحث چھڑی هوئی هے اُس پر اکثر غور کرتا هوں اور سوچتا هوں کہ جس زبان میں یہ درد، یہ قدرت اور یہ وسعت هے جو ان اشعار سے پائی جاتی هے، اُس کو هم کیوں چھوڑیں - مگر زمانے کی فضا بدلی هوئی هے، رنگ بدلا هوا هے - خلاصہ یہ کہ مزاج یار دگرگوں هے - ایجاد اور مجاد کا مقابلہ هے - خدا معلوم هم کہاں سے کہاں پہنچیں - آپ الہ آباد کب تشریف لائیں گے - آیندہ آپ اگر غریب خانہ پر قیام نہ کریں گے تو مجھے شکایت هوگی - زیادہ نیاز

نیاز کیش

تیج بہادر سپرو

# "اِقبال"

شمع اِقبال تیرا میں بھی اِک پروانہ ہوں
تو سراپا سوز ہے میں سوز کا دیوانہ ہوں

تو نے بخشا ہے مری ظلمت فگن فطرت کو نور
تو حقیقت کی ضیا باطل کا میں کاشانہ ہوں

میری کشت طبع ہے ممنون تیرے فیض کی
گلستاں جس کو کیا تو نے میں وہ ویرانہ ہوں

ساغر دل میرا جذبوں سے ترے لبریز ہے
جس میں مے تیری چھلکتی ہے میں وہ پیمانہ ہوں

گیسوئے تخییل ہے میرا ابھی بکھرا ہوا
تو ہے شانہ اور میں منت پذیر شانہ ہوں

دل مگر "اقبال" ہے گنجینۂ قارون ترا
تو ہے لیلیٰ سخن ہندوستاں مجنوں ترا

"چاند"

# تاریخ وفات

## سر محمد اقبال رحمہ اللہ تعالے

از

(سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

عیاں ہو فاش و خفی جس پہ ، وہ دل آگاہ — فضا جھمک اُٹھے جس سے، وہ برق تاب نگاہ

وہ عرش گیر تخیل کہ دیکھ اُس کا عروج — زمیں کو رشک سے تکنے لگیں ستارہ و ماہ

طپید قلب میں ہو جس کے سوز عالم سوز — بیان درد میں ، دنیا کے زخمیوں کی کراہ

نفوس مردہ کو دے جس کی تان یوں جنبش — صدائے کوس پہ جس طرح گامزن ہو سپاہ

ہم ایسے مطرب ہنگامہ زا کے ہیں قائل

سنی ہیں ورنہ بہت خوش نوائیاں سر راہ

ندیم ، دنگ نہ ہو دیکھ کر یہ رنگ مقال — مری زباں کا ہر بولِ خون دل سے ہے لال

تمام دہر کا شیون ہے میرے بین میں آج — ہے مرآت غم گیتی مری جبین ملال

زمیں سے اُٹھتا ہے خیرالملل کا وہ سر خیل — عطا ہوا تھا جسے فکر آسماں پامال

نوا میں گونج گیا جس کی نغمۂ کونین — قلم سے جس کی کھنچا نقش حال و استقبال

وفات حضرت اقبال ، ہاشمی ہے ہے

جگر میں قوم کے ناسور غم رہے گا یہ سال

۱۳۵۷ ھ

سید ہاشمی فرید آبادی

# قطعات تاریخ وفات حسرت آیات ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

(از - حضرت حکیم ظہیرالدین احمد قریشی - ویلور)

وا دریغا سوے عقبیٰ زیں سراے ‏ ‏ ڈاکٹر 'اقبال' گشتہ رہگرای

زود شد خلد بریں اقبال آہ ‏ ‏ تافتہ رو زیں جہان تنگنای

۱۳۵۷ھ.

---

صاعقہ افتاد بر دل خوں بریخت ‏ ‏ خبر مرگ روح فرسا غم فزای

پنجشنبہ نوزدہ ماہ صفر ‏ ‏ جنت الماوی برفت 'اقبال'- وای

۱۳۵۷-ھ

---

گفت 'قریشی' از دل رنجور' سال ‏ ‏ انتقال ڈاکٹر 'اقبال' ہای

۱۳۵۷-ھ

---

## دیگر

پنجشنبہ و بست و یک اپرل ‏ ‏ شور افتاد ناگہاں بہ جہاں

وقف ماتم شدہ است شرق چہ غرب ‏ ‏ وای 'اقبال' رفت باغ جناں

۱۹۳۸-ع

## دیگر

دریغا بست و یک اپرل هم پنجشنبه بد ناگاه

بفردوس ڈاکٹر علامۂ 'اقبال' رفتا - آه
۱۹۳۸ ع

مسیحی سال 'قرشی' از دل رنجور گفت آں گاه

سر علامہ محمد ڈاکٹر 'اقبال' رفتا - آه
۱۹۳۸ ع

---

## دیگر برائے لوح مزار

نوزده بد صفر بست و یکم اپرل پنجشنبه

بفردوس - آه - رفتا ڈاکٹر علامۂ 'اقبال'
۱۹۳۸ ع

سوی گور غریباں کہ بکہ چوں بگذری اے دوست

دعا فرما - بایں تربت بود علامۂ 'اقبال'
۱۳۵۷ ھ

۷۸۶
۹۲

بسم اللہ عالم الغیوب
۱۳۵۷

# "مثنوی صلاے خودی"
۱۳۵۷

بہ تقلید معانی "اسرار خودی" 'اقبال'
۱۹۳۸

مع تحسین کلام و پیام عالم افروز 'اقبال'
۱۳۵۷

با تاریخ ھاے وصال
۱۳۵۷

(متاع کاسد از بے ھنر حامد حسن قادری)
۱۳۵۷

بر 'نظامی' باد رحمت دمبدم — "مثنوی" را خواند قرآن عجم

من چه گویم وصف آن روشن کتاب — "آفتاب آمد دلیل آفتاب"

جان قرآں در تن آں مثنویست — معنی وحی است و لفظ مولویست

لیک از دور زمان بے ثبات — شد دگر گوں نظم بزم کائنات

چوں بقرن بستم آمد دور جام — میکشاں گشتند زاں مے تلخ کام

شد جهاں آ بستن اقوام نو — ساقی نو، بادهٔ نو، جام نو

شرع و دیں، علم و عمل تغییر یافت — رنگ دیگر گوں کهن تصویر یافت

در سرشت آں آب و هم آں گل نماند　　آه سر و سودا و درد و دل نماند

هم زمیں هم آسمانے شد دگر　　ایں جهاں گویا جهانے شد دگر

لا جرم نازل بشد الهام نو

بهر نو اقوام ایں ایام نو

آمد 'اقبال' و پیامے داد نو　　بزم کهنه را نظامے داد نو

* بیند آں کش چشم دل بینا بود　　نشهٔ آں مے که در مینا بود

دید مسلم را که مهرش زرد شد　　شد دل او ساکن و تن سرد شد

کار اصلاحش کجا آساں بود　　جاں دمیدن در تن بے جاں بود

آں ز گرمی نفس 'اقبال' کرد　　آنچه نتواں کرد کس 'اقبال' کرد

آنچه از 'رازی' و 'غزّالی' نشد　　آنچه از 'سر سید' و 'حالی' نشد

کرد 'اقبال' آنچه از 'غالب' نشد　　آنچه از 'عرفی' و از 'طالب' نشد

آنچه از 'ایران' نشد از 'هند' شد　　آنچه از 'ملا' نشد از 'رند' شد

آنچه 'رومی' گفت هم 'اقبال' گفت　　لیک حسب حال عصر حال گفت

آنچه نتواں گفت 'رومی' گفت او　　نو گهر در رشتهٔ نو سفت او

آشکارا کرد اعجاز خودی　　مهر بشکست از خم راز خودی

گفت خود هستی ز آثار خودیست　　بے خبر مسلم ز اسرار خودیست

هست درمانے ولے بیمار نیست　　وا در میخانه و میخوار نیست

آں مے مرد افگن لشکر شکن　　† گشت از قحط خریداری کهن

---

* ماخوذ از شعر اقبال :—

یا رب درون سینه دل با خبر بده　　در بادہ نشه را نگرم آں نظر بده

† غالب کے اس مصرع سے ماخوذ هے (ایں مے از قحط خریداری کهن خواهد شدن) - پهلے مصرعے میں ''مے مرد افگن'' بهی غالب هی کی ترکیب هے -

این کہ داد 'اقبال' پیغام خودی
داد سرّ وحی را نام خودی

نیست آں چیزے بجز تعیین ذات | یعنی احساس شرف بر کائنات
تا نسنجد پایۂ خود آدمی | تا نداند مایۂ خود آدمی
احسن تقویم خود را تا ندید | بر فلک تقدیم خود را تا ندید
تا نہ خود را از ملک برتر نہاد | لا مکاں را تا نہ زیر پر نہاد
تا نہ خود را داشت محکم تر ز کوہ | در شکوہ افزوں ز بحر پر شکوہ
تا نہ روشن تر ز مہر و ماہ شد | تا نہ از نور دلش آگاہ شد
تا نہ خود را داند افضل از ہمہ | * ویں ہمہ را از دم خود دمدمہ
کے شود ہستی او مقصود کن | کے شود مصداق اِنّی جاعِلٌ
ماحی معبود باطل کے شود | ماحی توحید کامل کے شود
گہ پرستارِ مظاہر می شود | گاہ محکوم عناصر می شود
چوں نداند عز و شان خویش را | بندہ گردد بندگان خویش را
آنکہ مہر از نور او بنمود چہر | ذرہ داند خویشتن را پیش مہر
آنکہ دریا با وجود شوکتش | قطرۂ باشد ز بحر ہمتش
من چہ گویم آں غلط اندیش را | قطرۂ ہم می نداند خویش را
می وزد بادے دلش لرزاں شود | آید آبے دامنش ترزاں شود

---

* میں نے دانستہ یہ فارسی محاورہ اردو محاورہ (دم کا دمدمہ) سے اختراع کیا ہے۔ غالب نے بھی ایک اردو کا محاورہ (ہماری گرہ سے کیا جاتا ہے) فارسی میں ترجمہ کرکے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:—

گوئی مباد در شکن طرّۂ خوں شود | دل زاں تست از گرہ ما چہ می رود

چوں ہواے* او اِلٰہ او بود
سخت کوتہ بیں نگاہ او بود

می پرستد آنچہ اندر عالمست | دور تر از چشم و بالا تر ز دست
در پرستاری ازیں ہم بگذرد | جامۂ عقلش بدست خود درد
ترک گوید دانش و فرہنگ را | خود تراشد خود پرستد سنگ را
انجم و اشجار معبود ویند | آتش و ہم آب مسجود ویند
زن، زمیں، زر، زور، اِلٰہاں ویند | ہم دل و جاں، دین و ایمان ویند
مُلک و رنگ و خوں خداوندان او | از شمار افزوں خداوندان او

رفت از یادش چو پیمان الست
از شراب حب باطل گشت مست

چوں خودی خویش را از دست داد | جیب و دامانش بدست مست داد
دست باطل دامن حق چاک کرد | نور باطن را نہاں در خاک کرد
گشت چوں عرفان نفس از وے جدا | رفت از دل ہم خودی و ہم خدا

پس خودی چیزے بجز توحید نیست
دین و دنیا را جز ایں تمہید نیست

ہست تعیین خودی اعلان حق | یاد دار اعلان آں جانان حق
†نعرہ چوں آں سرکشے رہ کردہ گم | زد - لنا العزیٰ و لا عزیٰ لکم

---

*اریت من اتخذ اِلٰہہ ہواہ (کیا تم نے اس پر نظر کی جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے)
(سورۂ فرقان - پارہ ۱۹ - رکوع ۴)

† جنگ اُحد میں لشکر کفار سے نعرہ بلند ہوا - لنا العزیٰ و لا عزیٰ لکم - (ہمارا مددگار عزیٰ بت ہے تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں) - آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے یہ نعرہ سن کر صحابۂ کرام سے ارشاد فرمایا کوئی شخص پکار دو ' اللہ مولانا ولا مولی لکم (اللہ ہمارا مولی ہے اور تمہارا کوئی مولی نہیں) - حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ نے فوراً اُٹھ کر یہ نعرہ بلند کردیا——قادری

قال للفاروق وحی اللہ ثم　　قل؛ لنا المولی و لا مولی لکم

لیکن این اعلائے حق آید بروں　　زانکہ پر از ذوق حق گشتش دروں

گم چو شد فرق حق و باطل ازو　　در دل او نے انا ماند نہ ھو

کے خدا ماند؛ خودی شد گر فنا　　از انا ھو هست و هم از ھو انا

این پیام حق کہ سر اقبال داد

قوم را بار دگر اقبال داد

گرچہ بسپارند دیں را رهبراں　　نیست این سر در حدیث دیگراں

گرچہ بسپارند استادان شعر　　بر نیامد این گہر از کان شعر

این نمی آید ز حرف دیگراں　　این نمی گنجد بظرف دیگراں

هر دل و جاں قابل این درد نیست　　کنز مخفی گنج باد آورد نیست

بود راسخ حب حق در روح او

باد رحمت هائے حق بر روح او

باد رحمت هائے حق بر تربتش　　آمد؛ «المغفور»، سال رحلتش
۱۳۵۷

*هم ز روئے داد در وحی کریم　　گفت هاتف؛ «عندہ اجر عظیم»
۴ (over داد)
۱۳۵۷ = ۱۳۵۳ + ۴

سال دیگر هم ز قرآن مبین

گفت حامد «لذة للشاربین»
۱۳۵۷

---

حامد حسن قادری

پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

---

* روئے داد سے اشارہ کرکے (داد) کے حرف اول (دال) کے چار عدد کا تعمیہ کیا گیا ھے--قادری

# SIR MUHAMMAD IQBAL.

BY

(SIR E. DENISON ROSS)

The death of Sir Muhammad Iqbal at the age of sixty-two means a very serious loss not only to the Muslims of India, but also to all who are interested in the modern progress of Islam. No one since Sir Syed Ahmed, the founder of Aligarh College, has been held in such high esteem and affection by his coreligionists. His education, first at Lahore where he came under the influence of the late Sir Thomas Arnold, and at Cambridge where he was the pupil of McTaggart, fitted him admirably for his self-imposed task as a modern spiritual leader in Islam. Being at heart a staunch believer in the Prophet and in the future of Islam, he tried to reconcile his creed with progress by pointing out that the backwardness of his own people was due to their slowness to realise the importance of liberal and scientific studies, and that the ideals of the Prophet had been lost sight of in the mists of theological hair-splitting and pantheistic mysticism.

He employed as his chief medium his undoubted poetic gifts, but he felt that in order to reach the people he must conform to the classical forms of Persian poetry with all its old conventions and similes. I often wondered whether this method of preaching was the most effective he could have chosen; for Persian verse when well written is so apt to be an end in itself that it makes little practical appeal to the reader. In 1934, however, he published a series of six lectures, in which he set forth more plainly his philosophy and his ideals for a better world centred in Islam, entitled *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, by which he will probably be best remembered.

# اقبال کا تصور خودی

از

(ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دھلی)

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ اقبال کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے - یہ سن کر شاید آپ کے ذہن میں الجھن پیدا ہو کہ بھلا فلسفہ شعر کیونکر ہوسکتا ہے - فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے اور شعر اس کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر - فلسفی صورت کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کر دیتا ہے جو ہماری لوح فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں - بہ خلاف اس کے شاعر نبض کائنات کی تڑپ، قلب حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے جو ہمارے دل میں اتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے -

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است<br>
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

کیا اقبال کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہے؟

جسے اقبال کے کلام سے زرا سا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں - اقبال کی شاعری تو آب حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی

اور زندہ دلی کے چشمے اُبلتے ھیں جن سے سیراب ھوکر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑجاتی ھے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ھے -

بات یہ ھے کہ جب شعر کے لیے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ھے تو فلسفے کی صرف ایک ھی صنعت مد نظر ھوتی ھے یعنی موضوع کی کلیت اور ھمہ گیری - اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ھے کہ وہ ایک کلی تصور حیات پیش کرتا ھے - اس کا موضوع فرقہ اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ھے جسے ھم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ھیں - ورنہ اگر طرز ادا کو دیکھیے تو وہ اُسی سوز و گداز، رنگ و آھنگ سے لبریز ھے جو ایشیائی شاعری کی جان ھے -

یہاں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ھے - کہنے والے کہتے ھیں کہ اقبال کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت یعنی مسلمانوں سے ھے، کُل نوع انسانی سے نہیں، ان کے پیش نظر ملت کا نصب العین ھے جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ھے - اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ھندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ھے جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ھیں - مگر زرا غور سے دیکھیے تو محض جذبات و کیفیات کی مصوری اور چیز ھے اور زندگی کے ایک مکمل تصور کی تعمیر اور چیز ھے - جذبات کل انسانوں میں یکساں ھیں لیکن نصب العین حیات کی تشکیل میں اختلاف پیدا ھونا ناگزیر ھے - ایک عالمگیر انسانی تمدن کا خیال ھر زمانے میں بعض لوگوں کے پیش نظر رھا ھے اور اب بھی ھے لیکن محض مجرد تصور یعنی فلسفے کی شکل میں - اس تصور کو کسی ایک شخص کے قلب سے بھی وہ زندہ تعلق پیدا نہیں ھوا جو اسے موضوع شعر بنانے کے لیے ضروری ھے - اب تک ھر شاعر اس پر مجبور ھے کہ انسانیت کا عکس کسی خاص ملت

یا قوم کے آئینے میں دیکھے - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اور ملت کے تصورات میں کون زیادہ وسیع ہے - اگر آپ قوم سے اہل مغرب کی اصطلاح میں وہ جماعت مراد لیں جس میں قدر مشترک محض نسل اور وطن ہے اور ملت اقبال کے محاورے میں اس گروہ کو کہیں جس کے لیے ایک روحانی اور اخلاقی نصب العین رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ملت کے تصور کا وسیع تر اور انسانیت سے قریب تر ہونا ممکن ہے - اس لیے کہ نسل و وطن کا فرق دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اگر اس پر زیادہ زور دیا جائے تو نوع انسانی میں اتحاد پیدا ہونا محال ہے - لیکن ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے متحد کر دینا کم سے کم خیال میں آسکتا ہے - دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جو نصب العین اقبال کے ذہن میں ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے - محض یہ بات کہ وہ ملت کے تصور سے وابستہ ہے اُسے تنگ اور محدود کہنے کے لیے کافی نہیں -

اقبال کی شاعری اور اُن کے نصب العین زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اُس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں - جب اُفق ہند سے وہ ہلال نو نمودار ہوا جو ایک دن فلک شعر پر ماہ کامل بن کر چمکنے والا تھا، اِس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالم اسلام پر حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی - سب سے بدتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی - جہل اور غلامی کی بدولت ان کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی اور جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھیے راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا - مغربی فاتحوں کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر

مستولی تھی - وہ اس بے پناہ قوت سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے مگر یہ مقناطیس کی طرح انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی - اس زمانے میں ایک باہمت ' خود دار اور مدبر مسلمان سید احمد خاں نے جسے یقین تھا کہ ملت اسلامی کی سطحی کم زوری کی تہ میں فولاد کی قوت پنہاں ہے ' مسلمانوں کو اس پر اُبھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے رگڑ کھانے دیں - اس رگڑ سے ابتدا میں انھیں سخت صدمہ پہنچا ' مگر اسی سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنھوں نے ان کے دلوں میں غیرت و حمیت کی آگ بھڑکادی -



تدبیر و سیاست کو چھوڑ کر صرف شعر کے میدان کو دیکھیے تو آپ کو دو ممتاز صورتیں نظر آئیں گی جنھوں نے مسلمانوں کے مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور اُن میں خود داری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی - ایک 'حالی' جس نے سوز و درد کے لہجے میں ملت اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گزشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کردی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی - دوسرے 'اکبر' جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کردیا - 'حالی' جدت پسند تھے ' قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے - 'اکبر' قدامت پسند تھے ' نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے - مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزت قومی کے جذبے کو اُبھارا ' اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دلایا اور یاس کی تاریکی میں اُمید کی ایک جھلک دکھائی -

لیکن ان دونوں بزرگوں کی نظر بات کی تہ تک نہیں پہنچی - انہوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہیں پہچان سکے - 'اکبر' نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہوگئے اور 'حالی' نے یہ کہا کہ وہ اجتہاد فکر اور وسعت نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے - مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی - اس وجہ کے معلوم کرنے کے لیے اقبال کی فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی - شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا اور اسی کاہلی اور عیش پرستی نے انہیں رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا - لیکن 'اقبال' جس کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ نفس پر بھی عبور رکھتی تھی' اس توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے - وہ جانتے تھے کہ ایک اولوالعزم قوم میں' جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا ہو' جسمانی تعیش اور کاہلی کی لہر' جب تک اس کے اندر روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو' ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے - یہ روحانی تعیش اور کاہلی اقبال کے نزدیک وحدت وجود کے عقیدے پر مبنی ہے جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں سے فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا - اس اجمال کی تفصیل خود اقبال کی زبان سے سنیے :—

"مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی' اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے - شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے' اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا - اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متأثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہوگئے - ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کُل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے - انھوں نے جزو و کُل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگ چراغ" میں "خون آفتاب" اور "شرار سنگ" میں "جلوۂ طور" کا مشاہدہ کیا" -

"مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلۂ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماج گاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوق عمل سے محروم کر دیا"-

وحدت وجود کا مسئلہ جس کی طرف مندرجہ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے' یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات کا ہے - مخلوق

جس میں عالم طبیعی اور انسان سبھی داخل ھیں' محض اعتباری اور موھوم وجود رکھتے ھیں اور اسی ایک نور ایزدی کے پرتو ھیں - ھم نے اپنی کوتاہ بینی سے ان اصنام خیالی کو حقیقی سمجھ لیا ھے اور تعینات کے ان پردوں نے ھمیں معرفت ذات سے محروم کر دیا ھے

کثرت آرائی وحدت ھے پرستاری وھم
کر دیا کافر اِن اصنام خیالی نے مجھے
(غالب)

---

اصل میں یہ احساس وحدت ایک کیفیت ھے جو قلب حال پر ایک خاص وقت میں آناً فآناً گزر جاتی ھے مگر جب زبان قال اسے تصورات کے جال میں پکڑ کر رکھنا چاھتی ھے تو الفاظ کے سوا کچھ ھاتھ نہیں آتا - انھیں الفاظ کو شاعر لے اڑتے ھیں اور نظم کا خوشنما لباس پہنا کر اس قدر دلکش اور دلفریب بنا دیتے ھیں کہ سننے والوں کا دل و دماغ مسحور ھو جاتا ھے - یہی وہ تصوف ھے جس کے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ھے کہ " برائے شعر گفتن خوب است " - اگر یہ قیل و قال محض تفریح کے لیے ھو تو کوئی حرج نہیں' مگر غضب تو یہ ھے کہ جو قوم عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے گھبرانے لگتی ھے اور ان سے بچنے کا حیلہ ڈھونڈھتی ھے وہ اس متصوفانہ شاعری کو اپنا فلسفۂ حیات بنا لیتی ھے - کائنات کا موھوم ھونا' نفس انسانی کا بے حقیقت اور زندگی کا بے ثبات ھونا' سعی و عمل کا لا حاصل ھونا وہ خیالات ھیں جو شعر کے میٹھے سروں میں تھکی ھوئی قوم کو لوریاں دے کر سلا دیتے ھیں - پھر جب اپنی غفلت کی بدولت وہ دولت و حکومت قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ھے تو یہی دلفریب

نغمے' جو پہلے صبر و سکون اور کیف و سرور کا سبب ہوتے تھے' اب قنوت و یاس اور حزن و ملال کا باعث بن جاتے ہیں اور اسے ایک بار گرنے کے بعد پھر اٹھنے نہیں دیتے - یہی ماجرا تھا جو مسلمانوں پر گزرا اور جس نے ان میں بے مرکزی' بے اصولی اور بے عملی پیدا کردی- مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی امراض کا یہی سب سے بڑا سبب تھا جسے حکیم ملت اقبال نے پہچانا اور جس کے ازالے کی کوشش میں انہوں نے اپنی مسیحائی کی خدا داد قوت صرف کی -

اس عقیدے کو جو اقبال کے نزدیک ملت اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ہے وہ "نفی خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے "اثبات خودی" کے نظریے سے رد کرنا چاہتے ہیں - خودی یا انانیت کا لفظ اُردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لیے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا' گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے' لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پایدار اور لا زوال ہو جاتا ہے - اسرار خودی کے دیباچے میں فرماتے ہیں "یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے' اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعیین ذات ہے"-

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے - کسی نے کہا ہے کہ فلسفے کا آغاز ایک حیرت اور الجھن سے ہوتا ہے - وہ سوال جس نے اقبال کو الجھن میں ڈالا یہ ہے "یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مُستنیر ہوتے ہیں' یہ

پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کا شیرازہ بند ہے، یہ 'خودی' یا 'انا' یا 'میں' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لا زوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علما اور حکما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو - مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر - مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتارنے کا نام نجات ہے - مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی.........مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لا زوال ہو سکتی ہے..........
میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو"۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ جس خیال کو اقبال نے یہاں مجمل طور پر نثر میں بیان کیا ہے اس کی تفصیلات اس با کمال سخنور کے فیض طبع سے شعر کا جامہ پہن کر کس قدر دلنشیں اور دل آویز' روح پرور اور روح افزا' جاں نواز اور جاں بخش بن جاتی ہیں -

---

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں - ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لیے اس نے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا - غیر خود کی علت غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدے کے لیے آئینے کا اور اس کے عمل ارتقا کے لیے معمول کا کام دے - خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لیے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعے سے اس کی اندرونی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلۂ ارتقا کو طے کرتی ہے - اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم' کشمکش اور کارزار ہے - جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے اُسی نسبت سے اس کا درجہ مدارج حیات میں متعین ہوتا ہے -

پیکر ہستی ز آثار خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیدا ست از اثبات او
سازد از خود پیکر اغیار را تا فزاید لذت پیکار را
چوں حیات عالم از زور خودی است پس بہ قدر اُستواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستی خود محکم است ماہ پابند طواف پیہم است
ہستی مہر از زمیں محکم تر است پس زمیں مسحور چشم خاور است

---

اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے

خودی کیا ہے راز درون حیات — خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

---

مخلوقات میں بہ اعتبار مدارج انسان اسی لئے سب سے برتر ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے - وہ بھی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے مگر اس کی ہستی محض اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے - اس کے مقابلے میں عالم فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی ادراک و مشاہدے کا پابند ہے

این جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است — جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اورا — حلقۂ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نا دیدن من — چہ زماں و چہ مکاں شوخی افکار من است

جہاں را فربہی از دیدن ما — نہانش رستہ از بالیدن ما
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست — کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست
جہان رنگ و بو گلدستۂ ما — ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی اورا بہ یک تار نگہ بست — زمین و آسماں و مہر و مہ بست

---

بہ قول ڈیکارٹ کے انا یا خودی کی ہستی بدیہی ہے اس لیے کہ اسے بلا واسطہ اپنا شعور ہوتا ہے دراں حالے کہ غیر خود یعنی عالم فطرت کی ہستی دلیل کی محتاج ہے - اگر انسان کو اپنے وجود میں شک ہو تو یہ شک خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی شک کرنے والا موجود ہے

| | |
|---|---|
| اگر گوئی کہ 'من' وہم و گماں است | نمودش چوں نمود این و آں است |
| بگو با من کہ دارائے گماں کیست | یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست |
| جہاں پیدا و محتاج دلیلے | نمی آید بہ فکر جبرئیلے |
| خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است | یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است |
| خودی را حق بداں باطل مپندار | خودی را کشت بے حاصل مپندار |

---

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے - جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں' خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے - یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لیے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے - اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا' اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے - اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے

زندگانی را بقا از مدعا ست کاروانش را درا از مدعا ست
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقص دل در سینہ ہا سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاع آرزو تابندہ ایم

---

یہ سوز آرزو طالب خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا - ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اسی طرح راہ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے - اسی بے قراری اور بے چینی، اسی سعی پیہم اور جہد مسلسل کا نام زندگی ہے - سکون خواہ وہ بہشت کا سکون کیوں نہ ہو، روح انسانی کے لیے موت کا پیام ہے -

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نہ سازد دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے سر منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے نہ نوائے درد مندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کے منازل ترقی اس عالم زمان و مکاں کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے - شاعر کی چشم تخیل انسان کے جہد و عمل کے لیے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے -

خودی کی یہ ہے منزل اولیں مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر طلسم زمان و مکاں توڑ کر

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخی فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق ہے - عشق اس مرد کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفت نفس کے مدارج سے گزر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے - محبت کا دوسرا نام تقلید ہے - لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھودے یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کر لے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشت گلے بوسہ زن بر آستان کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلید یار تا کمند تو شود یزداں شکار

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لا فانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے اسے بھی لا زوال بنا دیتی ہے

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

طلب ہدایت کے لیے کسی مرد کامل کے آگے سر نیاز جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لیے ارباب اقتدار کا دست نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے

اے فراہم کردہ از شیراں خراج گشتہ روبہ مزاج از احتیاج
از سوال افلاس گردد خوار تر از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی بے تجلی نخل سینائے خودی
وائے بر منت پزیر خوان غیر گردنش خم گشتہ احسان غیر
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب می نخواہد از خضر یک جام آب
چوں حباب از غیرت مردانہ باش ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس دولتمند کا طفیلی بن جائے بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کر کے نہ کمائے، بلکہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے، اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے، سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زریں قبا
اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے مرد غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

---

گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی مال دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیس فطرت پر حکمرانی کرنا، دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا، مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے

چیست فقر اے بندگان آب و گل؟ یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نان شعیر — بستۂ فتراک او سلطان و میر

فقر بر کروبیاں شبخوں زند — بر نوامیس جہاں شبخوں زند

با سلاطیں درفتد مرد فقیر — از شکوہ بوریا لرزد سریر

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر — وارہاند خلق را از جبر و قہر

بر نیفتد ملتے اندر نبرد — تا درو باقی است یک درویش مرد

آبروئے ما ز استغنائے او — سوز ما از شوق بے پروائے اوست

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

---

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

---

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرماں دہ عالم شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشت او شق می شود

---

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند　ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند　بہ خلوت اند و زمان و مکاں در آغوش اند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے - خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لیے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے (بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے - وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے)۔ خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانون حیات کی پابندی جو خالق عالم نے ہر مخلوق کے لیے مقرر کیا ہے

هر که تسخیر مه و پروین کند　خویش را زنجیری آئین کند
باد را زندان گل خوشبو کند　قید بو را نافهٔ آهو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم　پیش آئینے سر تسلیم خم
سبزه بر دین نمو روئیده است　پائمال از ترک آں گردیده است
لاله پیهم سوختن قانون او　برجهد اندر رگ او خون او
قطره ها دریا ست از آئین وصل　ذره ها صحرا است از آئین وصل
باطن هر شے ز آئینے قوی　تو چرا غافل ازیں ساماں روی
باز اے آزاد دستور قدیم　زینت پا کن هماں زنجیر سیم
شکوه سنج سختی آئیں مشو　از حدود زندگی بیروں مشو

دوسرا درجہ ضبط نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنے قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے' قابو میں لائے خصوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں' غالب آئے

نفس تو مثل شتر خود پرور است | خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خزف
طرح تعمیر تو از گل ریختند | با محبت خوف را آمیختند
خوف دنیا خوف عقبیٰ خوف جاں | خوف آلام زمین و آسماں
حب مال و دولت و حب وطن | حب خویش و اقربا و حب زن
تا عصائے لا الہ داری بدست | ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد | فارغ از بند زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان اس درجے پر فائز ہوگا جسے نسانیت کا اوج کمال سمجھنا چاہیے - یہ نیابت الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے - اسی کی تلاش میں نوع انسانی ہزارہا سال سے سرگرم سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روز ازل سے بے قرار ہے

نائب حق در جہاں بودن خوش است | بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است | ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جز و کل آگہ بود | در جہاں قائم بامر اللہ بود

---

اے سوار اشہب دوراں بیا | اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو | در سواد دیدہ ہا آباد شو

نوع انساں مزرع و تو حاصلی کاروان زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر از جبین شرمسار ما بگیر

---

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

---

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین
ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

---

ہم نے اوپر اس مافوق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی کی تکمیل کے لیے لازمی ہے - یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے جسے اقبال "بے خودی" کہتے ہیں -

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفس انسانی کو قطرے سے اور ذات ایزدی کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں - اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و

ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں - لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے - وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے، اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پایدار اور لا زوال بن جاتی ہے

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثل صبا گرداندش

چوں اسیر حلقۂ آئیں شود — آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

---

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

---

اب تک ہم نے اقبال کے کلام سے تصور خودی کے وہ عناصر منتخب کرکے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں جو عالم گیر ہیں - اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں - لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہان کا درد ہے، ان کی محبت کل نوع بشر کو محیط ہے اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لیے عام ہے - وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تا کہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں

من نہ گویم از بتاں بیزار شو — کافری شائستۂ زنار شو

اے امانت دار تہذیب کہن — پشت پا بر ملت آبا مزن

گر ز جمعیت حیات ملت است     کفر هم سرمایۂ جمعیت است
تو که هم در کافری کامل نۂ     لائق طوف حریم دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور     تو ز آذر من ز ابراهیم دور
قیس ما سودای محمل نه شد     در جنون عاشقی کامل نه شد

---

ان کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت کل نوع انسانی سے خطاب کیا ہے - لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا جاں بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کل انسانوں کے لیے ہے' قطعی ثبوت "پیام مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں :—

" حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے......مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو - فطرت کا یہ اٹل

قانون، جس کو قرآن نے اِن اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کرکے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو' قابل احترام ہے''۔

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد اور اقوام کی نگاہ کو ''جغرافی حدود سے بالا تر کرکے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید'' ہے۔ اسی کو انھوں نے اپنی تصانیف میں مدنظر رکھا ہے اور اسی کا پیام مغرب و مشرق کو دینا چاہتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خالص فلسفیانہ نظریے کی حیثیت سے انسانیت کا ایک عالم گیر تصور ممکن ہے' لیکن جب اس تصور کو ایک زندہ نصب العین کی صورت میں پیش کرنا ہو تو وسیع سے وسیع نظر رکھنے والا بھی اس پر مجبور ہے کہ انسانیت کی تصویر کسی خاص ملت کے آئینے میں دیکھے۔ اقبال کے لیے ملت بیضائے اسلام اس آئینے کا کام دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعے سے ممکن ہے اس لیے کہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتۂ اتحاد' نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا وسیع اور ہمہ گیر عقیدہ ہے۔

با وطن وابستہ تقدیر امم بر نسب بنیاد تعمیر اُمم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
ملت ما را اساس دیگر است ایں اساس اندر دل ما مضمر است
مدعائے ما مآل ما یکیست طرز و انداز خیال ما یکیست
لا إلہ سرمایۂ اسرار ما رشتہ اش شیرازۂ افکار ما
ملت بیضا تن و جاں لا إلہ ساز ما را پردہ گرداں لا إلہ

از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است جزو ما از جزو ما لا ینفک است
از میان بحر او خیزیم ما مثل موج از ہم نمی ریزیم ما
دین فطرت از نبیؐ آموختیم در رہ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحر بے پایان اوست ایں کہ یک جا نیم از احسان اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازو حفظ سرِّ وحدت ملت ازو

---

فرد کو حقیقی آزادی ملت اسلامی ھی کے اندر حاصل ہوئی کیونکہ اسی ملت نے نوع انسانی کو حقیقی معنی میں حریت' مساوات اور اخوت کا نمونہ دکھایا۔ توحید کے عقیدے نے نسل و نسب کے امتیاز کو مٹا دیا' غریبوں کو امیروں کے اور زبردستوں کو زیردستوں کے تسلط سے آزاد کر کے عدل و انصاف کی حکومت قایم کی اور اسلام کے رشتے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔

اُمتے از ماسوا بیگانۂ بر چراغ مصطفیٰ پروانۂ
نا شکیب امتیازات آمدہ در نہاد او مساوات آمدہ
پیش قرآں بندہ و مولا یکے است بوریا و مسند دیبا یکے است

عشق را آرام جاں حریت است ناقہ اش را سارباں حریت است

موسی و فرعون و شبیر و یزید این دو قوت از حیات آمد پدید

زندہ حق از قوت شبیری است باطل آخر داغ حسرت میری است

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

کُلُّ مومن اِخوۃٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گِلش

تکمیل خودی کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ نفس زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے اور یہ بات بھی ملت اسلامی کے اندر حاصل ہو سکتی ہے جو خود حدود زمانی و مکانی سے بالا تر ہے اس لیے کہ اس کا اساس نسل و وطن کا مادی تخیل نہیں بلکہ توحید و رسالت کا روحانی عقیدہ ہے۔ نسل فنا ہو سکتی ہے' وطن کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے' مگر کلمۂ توحید کا رشتہ لا فانی اور لا زوال ہے۔

جوہر ما با مقامے بستہ نیست بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست

عقدۂ قومیت مسلم کشود از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد بر اساس کلمۂ تعمیر کرد

ہر کہ از قید جہات آزاد شد چوں فلک در شش جہت آباد شد

اُمت مسلم ز آیات خدا ست اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

تا خدا ان یطفئو فرمودہ است از فسردن ایں چراغ آسودہ است

رومیاں را گرم بازاری نماند آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست رونق خمخانۂ یوناں شکست

مصر هم در امتحاں ناکام شد  استخوان او تہ اهرام شد
درجہاں بانگ اذاں بوداست وهست  ملت اسلامیاں بود است و هست

ملت اسلامی کے لیے قرآن کریم آئین حیات کا اور اخلاق محمدی اُسوۂ زندگی کا کام دیتا ہے - آئین الہی پر عمل کرنے سے اس کی سیرت میں پختگی اور آداب محمدی کی پیروی سے حسن اور دلکشی پیدا هوتی هے - اس کا مرکز مشہود کعبہ اور اس کا نصب العین حفظ و نشر توحید هے -

تو همی دانی کہ آئین تو چیست  زیر گردوں سر تمکین تو چیست
آں کتاب زندہ قرآن حکیم  حکمت او لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات  بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلماں زندہ است  پیکر ملت ز قرآں زندہ است

ملت از آئین حق گیرد نظام  از نظام محکمے گیرد دوام
هست دین مصطفی دین حیات  بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

غنچۂ از شاخسار مصطفی  گل شو از باد بہار مصطفی
از بہارش رنگ و بو باید گرفت  بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرت مسلم سراپا شفقت است  در جہاں دست و زبانش رحمت است

---

قوم را ربط و نظام از مرکزے  روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار راز ما بیت الحرام  سوز ما هم ساز ما بیت الحرام

تو ز پیوند حریمے زندۂ تا طواف او کنی پایندۂ
در جہاں جان اُمم جمعیت است در نگر سر حرم جمعیت است

---

زانکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشر لا اِلہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے
آب و تاب چہرۂ ایام تو در جہاں شاہد علے الاقوام تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ از علوم اُمیے پیغام دہ
تا بدست آورد نبض کائنات وانمود اسرار تقویم حیات
در جہاں وابستۂ دینش حیات نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

---

یہ یک آئینی اور یک جہتی، ہم مرکزی اور ہم مقصدی ملت کو متحد کرکے ایک نفس واحد بنا دیتی ہے اور اس میں ایک اجتماعی خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس کی مجموعی قوت فرد کی خودی کو تقویت پہنچاتی ہے اور وسیع تر اور محکم تر بناتی ہے - یہ ملت کا احساس خودی بھی فرد کے احساس خودی کی طرح اسی سے توسیع اور استحکام حاصل کرتا ہے کہ کارزار حیات میں عالم خارجی کی قوتوں کا مقابلہ کرے، علم کے ذریعے سے ان کی حقیقت کو پہچانے اور عمل کے ذریعے انہیں تسخیر کرے - عالم اسباب کو حقیر جان کر ترک کر دینا غفلت کی انتہا ہے - یہ فرد اور ملت کا میدان عمل اور ان کی عقل اور ارادے کی تربیت گاہ ہے - اگر انسان علم کی مدد سے اپنے خارجی ماحول پر غالب نہ آئے تو اس سے مغلوب ہو کر ہلاک ہو جائے گا - اس لیے علم اشیا بھی معرفت نفس کی طرح خودی کے نشو و نما کے لیے ناگزیر ہے -

هرکہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرهٔ تعمیر کرد
کوه و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر تختهٔ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیوں خفتهٔ علم اسباب را دوں گفتهٔ
خیز و واکن دیدهٔ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است امتحان ممکنات مسلم است
کاروان رهگذار است ایں جهاں نقد مومن را عیار است ایں جهاں
گیر اورا تا نہ او گیرد ترا همچو مے اندر سبو گیرد ترا

---

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر نشہ زیر پردهٔ صهبا نگر
تا قوی از حکمت اشیا شود ناتواں باج از توانایاں خورد
علم اشیا اعتبار آدم است حکمت اشیا حصار آدم است

---

ملت کے احساس خودی کی توسیع کے لیے علم کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی روایات کی یاد کو دل میں تازہ رکھے ۔ تاریخ اقوام کی زندگی کے لیے قوت حافظہ کا حکم رکھتی ہے ۔ حافظہ ہی وہ چیز ہے جس سے فرد کے مختلف ادراکات میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے ۔ جب خارجی حیات کے ہجوم میں اسے "میں" یا "انا" کا مرکز ہاتھ آتا ہے تو یہی حافظہ اس احساس خودی کی حفاظت کرتا ہے ۔ بالکل اسی طرح تاریخ سے ملت کی زندگی کے مختلف ادوار میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور یہی شیرازہ بندی اس کے شعور خودی کی کفیل اور اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے ۔ وہی قومیں دنیا میں زندہ

رہتی ہیں جو اپنے حال کا رشتہ ایک طرف ماضی سے اور دوسری طرف مستقبل سے استوار کرتی ہیں' زندگی نام ہی اس احساس تسلسل کا ہے۔

---

کودکے را دیدی اے بالغ نظر  کو بود از معنی خود بے خبر
نقش گیر این و آن اندیشہ اش  غیر جوئی غیر بینی پیشہ اش
تا ز آتشگیری افکار او  گل فشاند زرچک پندار او
چشم گیرائش فتد بر خویشتن  دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسایش کند  حفظ ربط دوش و فردایش کند
این "من" نو زادہ آغاز حیات  نغمۂ بیداری ساز حیات

ملت نو زادہ مثل طفلک است  طفلکے کو در کنار مادر
بستہ با امروز او فرداش نیست  حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست
چشم ہستی را مثال مردم است  سینہ را بیننده و از خود گم است
صد گرہ از رشتۂ او واکند  تا سر تار خودی پیدا کند
گرم چون افتد بہ کار روزگار  این شعور تازہ گردد پایدار
نقشہا بردارد و اندازد او  سر گزشت خویش را می سازد او
قوم روشن از سواد سر گزشت  خود شناس آمد ز یاد سر گزشت
نسخۂ بود ترا اے ہوشمند  ربط ایام آمدہ شیرازہ بند
ضبط کن تاریخ را پایندہ شو  از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو  خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لا زوال  رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگی است  مے کشان را شور قلقل زندگی است

---

اوپر کے صفحات میں اقبال کے تصور خودی کے دو پہلو آپ کے سامنے آگئے - ایک یہ کہ خودی کا غیر خود یعنی عالم خارجی سے، دوسرے یہ کہ اس کا نفس اجتماعی یعنی ملت سے کیا تعلق ہونا چاہیے - ابھی ایک تیسرا پہلو باقی ہے جو ان دونوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہے اور وہ یہ ہے کہ فرد کا بہ حیثیت مخلوق کے اپنے خالق سے صحیح علاقہ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ خودی غیر خود سے ٹکراکر اور اس کی قوتوں کو تسخیر کرکے استحکام اور توسیع حاصل کرتی ہے، اپنی فطرت کے قانون کی پابندی سے یعنی توحید و رسالت کے روحانی عقیدے کی بنا پر ملت کے حبل متین میں مربوط ہو جانے سے پایدار اور لازوال بن جاتی ہے - اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ محدود لازوال ہستی اس ذات لایزال سے جس نے اس کو اور کل کائنات کو پیدا کیا، کیا رشتہ رکھتی ہے -

اب تک اقبال کے کلام کا موضوع فلسفۂ نفس اور فلسفۂ تمدن کے مسائل تھے جن میں جذبات کو بہت کم دخل ہے - جذبات شاعری کی جان ہیں اور خشک فلسفیانہ مسائل میں جو جذبات کے کیف اور رنگ سے خالی ہوں، شعریت پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے - یہ اقبال کا کمال فن ہے کہ انہوں نے حکمت کو اپنے سوز دل کی حرارت سے شعر بنا دیا - یہ ان کے حصے کی چیز ہے جس میں ایشیا کے قدیم و جدید شاعروں میں بہت کم ان کے ساتھ شریک ہیں - لیکن اب وہ تصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں واردات قلب کو ناتمام تصورات کا ایک ہلکا سا لباس پہنا کر الفاظ میں ادا کرنا ہے - ایک لحاظ سے یہ مرحلہ ایشیائی شاعر کے لیے سب سے زیادہ آسان ہے اس لیے کہ یہ احساسات اس کی طبیعت میں رچے ہوئے ہیں

اور پھر ان میں کچھ اس درجہ شعریت ہے کہ خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے دیکھیے تو یہ میدان اس قدر پامال ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی نئی راہ نکالنا نہایت مشکل ہے - لیکن اقبال کا طرز خیال ہی سب سے جدا ہے اس لیے ان کے تصوف نے خود بخود اپنے لیے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے اور وہ اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جو ان کے فلسفۂ حیات کی منزل ہے - یہی وہ نازک مقام ہے جس میں روحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آکر کھو جاتی ہیں - بادۂ معرفت کے پہلے ہی جام میں علم کائنات اور احساس خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے - یہ اقبال ہی کا ظرف ہے کہ عالم بے خودی میں بھی انہیں اتنا ہوش رہتا ہے کہ اس امانت کو نہیں بھولتے جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے -

ہم نے اوپر کہا تھا کہ طالب خودی اس مرد "خدا" کی محبت میں جو مدارج خودی میں اس سے برتر ہے' سرشار ہو جاتا ہے - پھر کہنا یہ تھا کہ اس کیف و مستی کا جو خودی کے مبدا و منتہا اور خالق و پروردگار یعنی خدائے تعالے کی محبت اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہے- انسان اپنے دائرہ ارتقا میں خودی کے کل مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص و ناتمام ہی رہتا ہے اور کمال و تمام کا وہ جلوہ جو اسے ذات مطلق میں نظر آتا ہے اس کے دل کو بےساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے - اسی کشش کا نام عشق حقیقی ہے - عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں:- آرزو اور جستجو' دیدار' وصل - قدیم صوفی شعرا کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدود و نامحدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور

ہی نہیں ہو سکتا - مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں پہلی منزل سوز و گداز آرزو کی ہے' دوسری کیف دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب 'فزا بھی - تیسری کوئی منزل نہیں - لذت دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفس انسانی روح مطلق سے جدا رہتا ہے اور درد جدائی سے تڑپتا ہے - یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر -

---

اب اس اجمال کی تفصیل اقبال کے کلام میں ملاحظہ ہو - صوفی شعرا کے نزدیک عالم شہود کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ شاہد مطلق اس آئینے میں اپنے جمال کا نظارہ کرے -

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے :—

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید از نقش ایں و آں بہ تماشائے خود رسید

فرق یہ ہے کہ اوروں کے نزدیک ما سوا محض موہوم ہے اور اقبال کے نزدیک موجود - غالب کہتے ہیں :—

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

مگر جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اقبال کے خیال میں کائنات کے اندر حیات حقیقی یعنی خودی کی قوت مضمر ہے اور اس اعتبار سے مظاہر کائنات محض وہم ہی وہم نہیں ہیں بلکہ کم سے کم بالقوۃ وجود رکھتے ہیں - جب یہ قوت رفتہ رفتہ ارتقا پاکر انسان کی ذات میں شعور اور ارادہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا وجود نمایاں ہو جاتا ہے - میلاد آدم دنیا میں ایک نئے دور

حیات کا آغاز ہے اس لیے کہ وہ اپنی نیستی کا شعور اور ہستی مطلق کی معرفت کا حوصلہ رکھتا ہے

نعرہ زد عشق که خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید که صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت که از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں به شبستان ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش به آغوش حیات
چشم واکرد و جہان دگرے پیدا شد

---

یه نیا مخلوق سوز و ساز آرزو سے معمور ہے، اس کے دل میں ابتدا سے نه صرف اپنی محدود حقیقت بلکه ذات ایزدی کی نا محدود حقیقت کا مظہر بننے کی لگن ہے - وہ زبان حال سے کہتا ہے

چه خوش است زندگی را همه سوز و ساز کردن
دل و کوہ و دشت و صحرا به دمے گداز کردن
به گدازهائے پنہاں به نیازهائے پیدا
نظرے ادا شناسے به حریم ناز کردن
گہے جز یکے نه دیدن به ہجوم لاله زارے
گہے خار نیش زن را ز گل امتیاز کردن
همه سوز ناتمامم همه درد آرزویم
به گماں دهم یقیں را که شهید جستجویم

---

پہلے اس کی آرزو صرف یہیں تک محدود ہوتی ہے کہ ماسوا کے پردے سامنے سے ہٹ جائیں اور شاہد مطلق کا جمال بے حجاب نظر آئے -

چلد بروئے خود کشی جلوۂ صبح و شام را

چہرہ کشا تمام کن جلوۂ نا تمام را

---

بر سر کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را

بند نقاب بر کشا ماہ تمام خویش را

---

اگر وہ طاقت دیدار رکھتا ہے تو یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے مگر صرف اس حد تک کہ کبھی کبھی حسن مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور آناً فآناً چھپ جاتی ہے

نہ ایں عالم حجاب اورا نہ آں عالم نقاب اورا

اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن

---

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر

کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر

---

بہ دیگراں چہ سخن گسترم ز جلوۂ دوست

بہ یک نگاہ مثال شرارہ می گزرد

---

تو ز راہ دیدۂ ما بہ ضمیر ما گزشتی

مگر آں چناں گزشتی کہ نگہ خبر نہ دارد

مگر اس سے طالب دیدار کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کا اضطراب قلب اور بڑھ جاتا ہے اور اس کشمکش سے عاجز آکر وہ چاہتا ہے کہ بحر وجود اپنی کشش کو اور بڑھا دے اور اس کے قطرۂ خودی کو اپنے آغوش میں لے کر سکون دائمی بخشے

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

گیسوے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیط بے کراں میں ہوں زرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن اس دیدار و وصل میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں قطرہ دریا میں مل کر اپنی خودی کو فنا نہ کردے اور یہ بات اقبال کو کسی طرح گوارا نہیں

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولی
نہ گیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

---

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجود من
بہ ایں قیمت نہ می گیرم حیات جاودانی را

وہ ایسا وصل نہیں چاہتے جس میں قطرے کا انفرادی وجود مٹ

جائے - لیکن ان کے خیال میں یہ اندیشہ بے جا ہے - دیدار و معرفت الہی سے خودی کی آب و تاب کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے

کمال زندگی دیدار ذات است		طریقش رستن از بند جہات است
چناں با ذات حق خلوت گزینی		ترا او بیند و اورا تو بینی
منور شو ز نور "من یرانی"		مژہ برہم مزن تو خود نہ مانی
بہ خود محکم گزر اندر حضورش		مشو نا پید اندر بحر نورش
چناں در جلوہ گاہ یار می سوز		عیاں خود را نہاں اورا بر افروز

اگر قطرے کے دل میں کبھی اپنی کم مایگی کا خطرہ گزرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دریا کے آگے اس کی ہستی معدوم محض ہے تو خود بحر حقیقت اس کی خودی کی بقا کی ضمانت کرتا ہے

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید		خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ "جائے کہ دریا ست من کیستم		گر او هست حقا کہ من نیستم"
و لیکن ز دریا بر آمد خروش		ز شرم تنک مایگی رو مپوش
ز موج سبک سیر من زادۂ		ز من زادۂ در من افتادۂ
بیاسائے در خلوت سینہ ام		چو جوہر درخش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوش قلزم بزی		فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

اسی طرح قطرۂ نا چیز میں جوش عشق وہ ظرف پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دریا کو اپنے آغوش میں لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے

در سینۂ من دمے بیاسائے		از زحمت و کلفت خدائی

---

حفظ خودی کا خیال عشق کے منافی نہیں بلکہ عین عشق ہے - حسن کا عیار عاشق کا دل ہے اور بزم حسن کا فروغ عاشق کے دم سے ہے - وہ اپنی خودی کی حفاظت اپنے لیے نہیں بلکہ معشوق کی خاطر کرتا ہے -

خدائے زندہ بے ذوق سخن نیست
تجلی ہائے او بے انجمن نیست
کہ برق جلوۂ او بر جگر زد
کہ خون آں بادہ و ساغر بہ سر زد
عیار حسن و خوبی از دل کیست
مہ او در طواف منزل کیست
الست از خلوت ناز کہ برخاست؟
بلی از پردۂ ساز کہ برخاست؟
اگر ماہیم گرداں جام ساقی است
بہ بزمش گرمی ہنگامہ باقی است
مرا دل سوخت بر تنہای او
کنم سامان بزم آرائی او
مثال دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہ دارم خودی را

---

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں' محدود کا حقیقی وصل نا محدود سے یہی ہے کہ اس کے اندر محو ہو جائیے - بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیش نظر ہے ' حقیقت میں وصل نہیں ہے - یہ ایک خاص حالت ہے

جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوز و ساز فراق اور بڑھ جاتا ہے

او در من و من در وے ہجراں کہ وصالست ایں
اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

ازو خود را بریدن فطرت ما ست
تپیدن نا رسیدن فطرت ما ست
نہ مارا در فراق او عیارے
نہ اورا بے وصال ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است
فراق ما فراق اند، وصال است

---

کبھی درد فراق میں اقبال اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ سوز و گداز کا یہ کیف انسان ہی کا حصہ ہے - خدا اس سے محروم ہے

سوز و گداز حالتے است بادہ ز من طلب کنی
پیش تو گر بیاں کنم مستی ایں مقام را

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

کبھی شوخی تخیل سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بندہ خدا کے ہجر میں بے چین ہے اُسی طرح خدا بھی بندے کے فراق میں بے قرار ہے -

ما از خدائے گم شدہ ام او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو ست

---

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مـــرا انتظار کـــر

بہر حال یہ جدائی انسان کے لیے مبارک ہے کیونکہ یہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے -

جدائی عشق را آئینہ دار است جدائی عاشقاں را سازگار است
اگر ما زندہ ایم از درد مندی است و گر پایندہ ایم از درد مندی است

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو' ہجر میں لذت طلب

گرمی آرزو فـــراق' لذت ہائے وہو فـــراق
موج کی جستجو فراق' قطرے کی آبرو فراق

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس نظریۂ حیات کا جو اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے - یہ فلسفی شاعر دنیا میں ایک ایسا دل لے کر آیا جو سوز حیات اور درد کائنات سے لبریز تھا اور ایک ایسا دماغ جو زندگی کے اسرار و معارف کا محرم تھا - اس نے دنیا کو ایسی حالت میں پایا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق جو اب تک خواب غفلت میں مدہوش تھا' کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہتا ہے مگر غلامی کا کابوس جو اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے اُسے ہلنے نہیں دیتا - مغرب جس نے اپنی بیدار مغزی سے ربع مسکوں پر اپنا سکہ بٹھا لیا ہے' طمع و نخوت کے نشے میں چور' انقلاب کی ان قوتوں سے جو خود اس کے

اندر سے اُبھر رہی ہیں ' ٹکرایا چاہتا ہے - اس کا دل کڑھا ایشیا کی بے حسی اور بے بسی پر جو قید مذلت میں گرفتار ہے اور کچھ نہیں کرتا اور یورپ کی نا عاقبت اندیشی پر جو قعر ہلاکت میں گرنے والا ہے اور کچھ نہیں دیکھتا - اس نے ایک کی بے عملی اور دوسرے کی بے بصری کے اسباب پر غور کیا اور اس کی حقیقت بین نظر سطحی چیزوں سے گزرتی ہوئی اُن تصورات حیات پر جا کر پڑی جن پر ان دونوں تہذیبوں کی بنیادیں قائم ہیں - اس نے دیکھا کہ ایشیا کے قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دست عمل کو شل کرنے والا نفی خودی اور نفی کائنات کا فلسفہ ہے - اب رہا یورپ تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اثبات خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدان عمل میں قدم بڑھایا اور فرد و جماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو اُستوار بنایا لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کسی عالمگیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادّی نظریے پر تھی ' اس لیے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہو گئیں - صحیح نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام کا ہے جس نے ایشیا کی روحانیت اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دین فطرت کی راہ دکھائی مگر گردش زمانہ سے اسلام کے پیرو بھی وحدت وجود کے عقیدے کی بدولت جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے ' اسی غفلت و جمود کا شکار ہو گئے جو ایشیا کی اور قوموں پر طاری تھا - اس کی سزا اُنہیں یہ ملی کہ یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں - ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبال اپنے جاں بخش اور جاں فزا نغمۂ امید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا ہے تا کہ وہ اس خدمت کو جو خدا نے اس کے سپرد کی ہے ' پورا کرے اور دنیا کو اس روحانی اور مادّی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی ہے ' نجات دے -

اقبال کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لیے وہ پہلے مسلمانوں کے اور پھر کل اقوام عالم کے قلوب میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے - وہ دنیا سے اٹھ گیا مگر اس کا پیام فضائے عالم میں گونج رہا ہے اور گونجتا رہے گا۔

---

# رومی، نطشے اور اقبال

از

( ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ )

اکثر بڑے شعرا اور مفکرین کے کلام کا اگر عقلی تجزیہ کیا جائے تو کسی ایک کے کلام میں ایک یا دو سے زیادہ اساسی تصورات نہیں ملتے - ہر بڑے آدمی کی، خواہ وہ مفکر ہو یا مُصلح، زندگی کے متعلق ایک نظر ہوتی ہے - اس کی ہزاروں باتیں ایک یا دو تصورات سے مشتق ہوتی ہیں - کوئی ایک تصور عام طور پر اُس کا تصور حیات ہوتا ہے، افکار کی فلک بوس تعمیر کسی ایک چٹان پر قائم ہوتی ہے - اس کے شجر حکمت کے پھول اور پھل برگ و شاخسار اپنی گونا گونی اور بوقلمونی کے باوجود ایک جڑ سے نکلتے ہیں - سمجھنے کے لیے جب تک وہ اصل ہاتھ نہ آئے کسی بڑے مفکر کا کلام اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا - بعض اوقات ایک بڑی تصنیف یا ایک بڑا فلسفہ ایک قفل ابجد ہوتا ہے - جب تک ان حروف کا علم نہ ہو جو اس کے لیے بطور کلید ہیں وہ قفل نہیں کُھل سکتا - یہ کیفیت فقط ان مفکرین کی ہے جن کے خیال میں سنجیدگی اور توافق داخلی پایا جاتا ہے اور زندگی کے متعلق کسی تصور نے ان کی شخصیت پر مکمل قبضہ کر لیا ہے - ایسے اشخاص کے تمام افکار بلکہ تمام اعمال ایک رنگ میں رنگے جاتے ہیں - میر انیس نے شاعرانہ تعلی میں اپنے متعلق کہا ہے :- ع

اک رنگ کا مضموں ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑے مفکر اور شاعر کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے ایک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھا ہے - اکثر مذہبی کتابوں کا بھی یہی حال ہے - کسی ایک مذہب کی تمام تعلیم کا تجزیہ کیجیے تو تہ میں ایک نظریۂ حیات نکلتا ہے جو بعض اوقات دو حرفوں یا دو جملوں میں پورا بیان ہو جاتا ہے -

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت اقبال کے ہاں بھی کوئی اِس قسم کا اساسی تصور موجود ہے جو اس کے تمام کلام کے لیے بطور کلید کام آسکے - اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کوئی شاعر تنوع افکار اور ثروت تصورات میں اقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتا - فلسفۂ جدید اور فلسفۂ قدیم' تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع' مذاہب عالم کے گونا گوں تصورات' معاشرتی' سیاسی اور اخلاقی مسائل' فکر اور عمل کی تمام قدیم اور جدید تحریکات' ان تمام چیزوں کو اقبال نے اپنی شاعری کے خم میں غوطہ دے کر انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے - شاعروں اور دیگر فن کاروں اور حسن کاروں کے متعلق ایک عام خیال ہے کہ ان کو کسی ایک نظریے کا پابند نہیں ہونا چاہیے - اگر شاعر کے لیے کوئی نظریہ زنداں بن جائے تو اس کی پرواز فقط طائر قفس کی پرواز رہ جائے گی - اگر اس نے کسی ایک خیال کا پرچار شروع کر دیا تو وہ شاعر نہیں رہے گا بلکہ واعظ ہو جائے گا' اس کا فن تبلیغ کا رنگ اختیار کر لے گا - اسی وجہ سے عام طور پر نقادان سخن کسی شاعر کے کلام سے کوئی ایک تعلیم' کوئی ایک نظریۂ حیات یا کوئی ایک پیغام تلاش کرنا اصولاً غلط سمجھتے ہیں - قرآن کریم میں بھی شاعر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اسی خیال کے ماتحت ہے - نبی کریم صلعم کو مخالف لوگ کبھی مجنون کہتے تھے اور کبھی شاعر' قرآن کریم میں ان دونوں اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے - نبی کو مجنوں کہنا

اس لیے غلط ہے کہ مجنون کے اقوال و اعمال بے ربط ہوتے ہیں اور نبی کے اقوال و اعمال میں داخلی اور خارجی موافقت پائی جاتی ہے - از روے قرآن نبی کو شاعر کہنا اس لیے غلط ہے کہ شاعر کی عام کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اُس پر لازماً عمل نہیں کرتا اور اس کے کہنے کا یہ حال ہے کہ وہ ہر چیز کے متعلق مختلف حالات میں مختلف قسم کی باتیں کہتا ہے، اُس کے تاثرات میں یک رنگی نہیں ہوتی - موسم بہار میں خوش ہوتا ہے تو اس کا بیان اس رنگ سے کرتا ہے کہ تمام زندگی بہار ہی بہار ہے، عیش ہی عیش ہے، مسرت ہی مسرت ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ مست ہے - وہ اپنی طبیعت کا رفتنی اور گزشتنی رنگ تمام چیزوں پر چڑھا دیتا ہے - اسی طرح جب خزاں کا ذکر کرتا ہے تو تمام کائنات کو افسردہ بنا دیتا ہے - کہتا ہے کہ ہر چیز فنا کی گرفت میں ہے - زندگی ایک ماتم خانہ ہے اور اس کی اصلیت غم جانگداز کے سوا کچھ نہیں - زندگی کی وادیاں لا متناہی ہیں - اور شاعر تصورات و تاثرات میں ہرزہ گرد ہے - اس کا کوئی ایک مقام اور مسکن نہیں، فی کُل واد یہیمُون - اس لیے شاعر براہ راست رہنمائی کا کام نہیں کر سکتا - جو گروہ شاعر کو مرد عمل سمجھ کر زندگی میں اس کی پیروی کرے گا وہ یقیناً گمراہ ہو جائے گا، اس لیے کہ شاعر کی اگر کوئی معین سمت فکر نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی معین سمت عمل بھی نہیں ہو سکتی - اقبال کے بعض معاصر شاعر جو اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں، اقبال کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں سمجھتے تھے - اُن کا اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے شاعری سے تعلیم و تبلیغ اور پیغام رسانی کا کام لینا شروع کردیا ہے جس سے اس کی شاعرانہ حیثیت کو نقصان پہنچا ہے - اس کے مقابلے میں وہ اپنی آزادی اور بے عنانی کو روح شعریت کی اصلیت سمجھتے ہیں - اِن نقادوں کو مد نظر

دیکھتے ہوئے اقبال نے خود بھی کہنا شروع کردیا تھا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور جو شخص آب و رنگ شاعری کا مجھ سے تقاضا کرتا ہے وہ میرے مقصد کو نہیں سمجھتا - طرب آفرینی اور سکون آفرینی اور تخیل میں رنگ بھرنا میرے فن کا مقصود نہیں -

اگر شاعری فقط بے معانی تخیل اور تصورات کی ریزہ گردی کا نام ہے تو ماننا ہے کہ بعض اکابر شعرا کی نسبت یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اصل معنوں میں شاعر نہیں تھے - لیکن اصل حقیقت وہ ہے جسے خود ایک شاعر نے ایسے شعرا کی نسبت بیان کیا ہے کہ :—

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خود قرآن کریم نے عام شعرا کا ایسا صحیح نقشہ کھینچنے کے بعد ان شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا ہے جن میں ایمان اور عمل صالح بھی شعریت کے دوش بدوش پایا جائے - ایمان اور ذوق عمل ایک شاعر کو بھی بے راہ روی سے بچا سکتا ہے - اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ خاص حقائق حیات پر اقبال کا ایمان نہایت قوی ہے - اقبال بھی مختلف وادیوں میں گھوم سکتا ہے اور وقتاً فوقتاً گھومتا بھی ہے' لیکن ایک صراط مستقیم ہے جس پر وہ ہمیشہ ہر پھر کر واپس آجاتا ہے - مولانا روم کی مثنوی اور اقبال کی شاعری میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ دونوں گلگشت کے لیے اکثر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں لیکن ہر طرف سے اپنے اصل راستے کی طرف راہ نکال لیتے ہیں - اسی قسم کی شاعری ہے جس کو پیغمبری کا جز قرار دیا گیا ہے اور اسی قسم کا شاعر ہے جو تلمیذالرحمن ہوتا ہے - مولانا روم کی نسبت یہ کہا گیا کہ :— ع

'نیست پیغمبر ولے دارد کتاب' اور اقبال کی نسبت بھی گرامی کا یہ مصرع مشہور ہے :— 'پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت' -

جو شخص اقبال کی شاعری سے آشنا ہے اس پر یہ امر بہ آسانی واضح ہو جاتا ہے کہ تنوع افکار اور بوقلمونی تصورات کے باوجود بعض میلانات اقبال کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں - "خودی" اقبال کا خاص مضمون ہے - یہ لفظ اسلامیات میں ایک بد نام لفظ تھا - اقبال نے اپنے اعجاز بیان سے اس کو نیک نام کر دیا - خودی کے مفہوم کو گہرا اور وسیع اور بلند کرکے اقبال نے اس کی تعریف اور تضمن کو بالکل بدل دیا - صدیوں کے رائج شدہ تصورات کی قلب ماہیت معمولی انسانوں کا کام نہیں ہے - اسی طرح اقبال نے مومن کا مفہوم' تقدیر کا مفہوم' خدا کا مفہوم' انسان کا مفہوم' اسلام کا مفہوم قرنوں کے قائم شدہ روایتی مفہوم سے الگ کر دیا ہے - مناسبت طبعی اور یکسانی نظریۂ حیات کی وجہ سے اپنے پیشرووں میں سے اقبال دو مفکروں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا - مشرق قدیم میں سے عارف 'رومی' کو اپنا مرشد بنایا اور مغرب جدید میں سے 'نطشے' کا فلسفۂ خودی اور تصور انسان بہت پسند آیا - سرسری نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے بہترین حصوں میں یا رومی کی ترجمانی کی ہے یا نطشے کی - سطحی نظر سے دیکھنے والے بعض نقادوں نے اقبال کو ان دو مفکروں کی محض آواز بازگشت قرار دیا - اس میں کوئی شک نہیں کہ رومی کا ایمان اور نطشے کا کُفر اقبال کو ایک ہی تصویر کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں :—

کفر و دین است در رہت پویاں وحدہ لا شریک لـــہ گویاں

اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اقبال نے ان دونوں سے فیض حاصل کیا ہے - مولانا روم کی مثنوی اور ان کا دیوان ایک قلزم زخار ہے -

مولانا کے افکار کی گونا گونی میں رشتۂ وحدت کو ڈھونڈھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن ان کے تصوف میں بعض امتیازی خصوصیات ہیں جن پر اقبال کی نظر پڑی۔ اِس بات کی تحقیق کے لیے کہ اقبال نے رومی سے کیا سیکھا اور وہ کہاں تک اپنے مرشد کا رہین منت ہے' پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ مختصراً یہ معین کیا جائے کہ جلال الدین رومی کا تصوف اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ اس کے بعد اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ اقبال کہاں تک مرشد رومی کا مقلّد ہے' کہاں تک اس عارف کے دوش بدوش چلا ہے اور آیا کچھ ایسے نظریے بھی اقبال میں ملتے ہیں جہاں وہ حالات حاضرہ کے تقاضے سے مرشد سے کچھ آگے نکل گیا ہے۔ بعد میں ہم یہ طریقہ نطشے اور اقبال کے مقابلے میں بھی استعمال کرسکیں گے۔

رومی کا تصوف

جس چیز کو تصوف کہتے ہیں وہ کم و بیش مماثل انداز میں تمام بڑے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ زندگی کے تمام اساسی حقائق کی طرح اس کی تعریف و تحدید بھی نہایت مشکل ہے۔ فقط اِسلامی تصوف میں سیکڑوں مختلف تعریفیں اس کی ملتی ہیں اور بعض تعریفیں باہم اس قدر متخالف معلوم ہوتی ہیں کہ ان میں سے کسی قدر مشترک کو اخذ کرنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن سا کام معلوم ہوتا ہے تاہم تصوف کی اکثر شکلوں میں مفصلہ ذیل عناصر ملتے ہیں:—

(۱) اصل حقیقت ایک ہے۔

(۲) تمام مظاہر اسی ایک حقیقت کے شئون ہیں اور ہر مظہر اسی ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) جس طرح تمام وجود اِسی ایک حقیقت سے سرزد ہوتے ہیں اسی طرح ہر شے اسی ایک اصل کی طرف عود کرنے کی طرف مائل ہے۔

(۴) اِس اصل حقیقت کا وجدان ایک حد تک عقل سے بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ یہ عقل جزئی نہ ہو بلکہ کُلی ہو۔

(۵) اصل علم استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ عقل کے مقابلے میں تاثر اس کی طرف زیادہ رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) زندگی کا مقصد یہ ہے کہ روحانی تاثر کے ذریعے اس اصل کا وجدان حاصل کیا جائے تا کہ زندگی پھر اپنی اصل سے ہم وجود ہو جائے۔

(۷) اس تاثر کا نام عشق ہے۔ حقیقت کا علم بھی اس عشق کے اندر مضمر ہے۔

(۸) یہی عشق تمام مذہب اور تمام اخلاق عالیہ کا سر چشمہ ہے۔ اس کے بغیر مذہب اور اخلاق ایک خارجی اور اعتباری حیثیت رکھتے ہیں۔ عقل بھی اس عشق کے بغیر ایک 'حلقۂ بیرونِ در' ہے۔

تصوف کے یہ اساسی حقائق بہت قدیم ہیں۔ یونانی فلسفے میں افلاطون نے ان کو وضاحت سے بیان کیا اور اس کے بعد فلاطینوس اسکندر رومی نے ان پر تصوف کی ایک فلک بوس تعمیر کھڑی کر دی۔ اسلامی اور عیسوی تصوف میں افلاطون اور فلاطینوس کے تصورات اور تخیلات خالص اسلامی اور عیسوی تعلیمات میں ایسے گُھل مل گئے ہیں کہ اب ان کو علیحدہ کرنا نا ممکن ہو گیا ہے۔ اسلامی دنیا میں یہ تصورات پہلے فلسفے کے ساتھ لپٹے ہوئے آئے۔ اِس کے بعد صوفیانہ وجدان نے اپنے عقلی اظہار کے لیے ان کو استعمال کیا۔ بدھ مت کے نظریۂ نروان اور ویدانت کے نظریۂ وحدت الوجود میں بھی ان سے مماثل عناصر ملتے ہیں اس لیے بعض مستشرقین نے یہ قیاس بھی قائم کیا کہ تصوف اسلام میں اسی سمت سے داخل ہوا۔ لیکن تاریخی حیثیت سے اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔

جلال‌الدین رومی کے زمانے تک یہ تصورات تمام اسلامی دنیا میں پھیل چکے تھے - فلسفے اور شاعری کے علاوہ دینیات کے حرم میں بھی اِن کو داخل ہونے کی اجازت مل چکی تھی - اِلٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے تمام اساسی مسائل زیر بحث آچکے تھے - عارف رومی کی مثنوی کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ افکار کی عظیم الشان ثروت اس کے پیش نظر ہے - وہ نہ فقیہ ہے نہ فلسفی نہ شاعر' لیکن حقائق اصلیہ کی نسبت ایک گہرا وجدان رکھتا ہے جو کسی قسم کی تقلید کا رھین منت نہیں - اپنے تاثرات اور افکار کو پیش کرتے ہوئے استدلالی تضاد اور منطقی تناقض کی پروا نہیں کرتا - اس کی یہ غرض نہ تھی کہ فلسفے یا دینیات کا کوئی نظام قائم کرے - نثر کے بجائے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا بھی تسلسل استدلال کو مانع تھا -

تاریخ فکر میں بارھا ایسا ہوا ہے کہ کوئی بڑا صاحب نظر مفکر اپنے زمانے تک پیدا شدہ تمام نظریات حیات کے مختلف رنگوں کے رشتے لے کر ان کا تار و پود بناتا ہے اور اضداد کو ایک نئی وحدت میں پرو لیتا ہے - افلاطون کے فلسفے میں جو وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے اس کا بھی یہی راز ہے کہ اس سے پہلے جو نظریے ثبات اور تغیر وجود اور حدوث' معقول اور محسوس کی بابت پیدا ہو چکے تھے اس نے ان سب میں سے اہم عناصر کو لے کر انہیں ایک جدید نظریۂ حیات میں ترکیب دیا - ایسا مفکر اگر بلند پایہ شخص ہے تو وہ محض انتخاب پسند نہیں ہوتا - وہ مختلف افکار کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک ان مل' بے جوڑ خرقۂ درویش نہیں بناتا' نہ ھی اس کا دماغ درویش کا کچکول ہوتا ہے جس میں رنگ رنگ کے ٹکڑے جمع ہوں - ایک بڑے مفکر کا کام تخلیقی ہوتا ہے - وہ اپنے سے پیشتر کے متضاد نظریات کو خام پیداوار کی طرح استعمال کرتا ہے - اس کے ذہن میں ایک نئی تصویر ہوتی ہے جس میں پہلے رنگ

استعمال کرتا ہے لیکن خاکہ اور نقشہ اس کا اپنا ہوتا ہے - ایک نئی تعمیر اس کے ذہن میں ہوتی ہے - جس کے لیے وہ سنگ و خشت پہلے کھنڈرات میں سے مہیا کرتا ہے - ایمرسن کا ایک قول مشہور ہے کہ تناقض ادنیٰ نفوس کے لیے ہوّا ہوتا ہے اور استدلالی تناقض سے ڈر کر وہ زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں - کسی بڑے مفکر نے کبھی استدلالی تناقض سے خوف نہیں کھایا - مذہب کی گہری سے گہری تعلیم تناقضات ہی میں بیان ہوتی ہے - مابعد الطبیعیات کے انتہائی مسائل اکثر لفظی تناقض میں الجھ جاتے ہیں لیکن کوئی اعلیٰ درجے کا فلسفی اس سے گھبراتا نہیں - خود جدید طبیعیات مادے کی جس اساس پر پہنچ سکی ہے اس کی تعریف و تحدید میں تناقض پایا جاتا ہے کہ وہ محض جوہر بھی ہے اور محض قوت بھی - انتہائی ذرہ محض ایک ذرہ بھی ہے اور محض ایک لہر بھی -

جلال الدین رومی کے سامنے ایک طرف خالص اسلامیات کی ایک عظیم الشان تعمیر ہے جس کی تہ میں ایک خاص نظریۂ حیات و کائنات اور اس سے سرزد ہونے والا ایک خاص نظریۂ عمل ہے - دوسری طرف یونانی فلسفے کی وہ ثروت افکار ہے جو بہترین دلوں اور دماغوں کی پیداوار ہے - ایک طرف حکمت ایمان و قرآن ہے اور دوسری طرف حکمت عقلی - ایک طرف حکمت استدلالی ہے تو دوسری طرف حکمت نبوی - اس کے علاوہ صوفیانہ وجدانات ہیں جو ایک خاص نظریۂ حیات کا سر چشمہ ہیں - ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو عارف رومی کلیتہً ترک کر سکتے - وہ جس پہلو میں جتنی صداقت سمجھتا ہے اس کو فراخ دلی سے پیش کرتا ہے اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کرتا کہ اس سے کون سا گروہ ناراض ہو جائے گا نہ وہ اس امر سے گھبراتا ہے کہ منطقی طور پر کوئی ایک عقیدہ دوسرے عقیدے سے اچھی طرح منسلک

نہیں ہوتا - زندگی کے واضح اور ناقابل تردید پہلوؤں کو دبا کر وہ فکری توافق پیدا کرنے کا قائل نہیں - دیانت فکر کا حقیقت میں یہی رویہ ہونا چاہیے - جن مذہبوں اور جن فلسفوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی اور نفوس و آفاق میں نئی کائناتوں کا انکشاف کیا ان تمام میں ایسے اہم عناصر ملتے ہیں جن کو عقل' استدلالی آج تک غیر متضاد طور پر متحد نہیں کر سکی -

عارف رومی اور علامہ اقبال میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے - دونوں اعلی درجے کے شاعر ہیں - دونوں اسلامی شاعر ہیں - دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے - دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مرجح سمجھتے ہیں - دونوں خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہیں - دونوں کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بے خودی میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ ہے - دونوں کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسلمہ تخیل سے الگ ہے - دونوں کا خیال ہے کہ تقدیر میں جزئی طور پر اعمال افراد پہلے ہی سے خدا کی طرف سے معین اور مقدر نہیں بلکہ تقدیر آئین حیات کا نام ہے - دونوں ارتقائی مفکر ہیں - نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنی سے اعلی منازل کی طرف عروج کر رہے ہیں - انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں - قوت آرزو اور جہد صالح سے کئی نئی کائناتیں انسان پر نہ صرف منکشف ہو سکتی ہیں بلکہ خلق ہو سکتی ہیں - دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوع انسان کی معراج کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں - دونوں جد و جہد کو زندگی اور خفتگی کو موت سمجھتے ہیں - دونوں کے ہاں بقا مشروط ہے سعی بقا پر - دونوں اپنے سے پیشتر پیدا کردہ افکار سے کما حقہ واقف ہیں اور متضاد عناصر کو ایک بلند تر وحدت فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہیں - اس ازلی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف

رومی کا مرید سمجھتا ہے - یہ مرید معمولی تقلیدی مرید نہیں - کمال عقیدت کے ساتھ پیر کے رنگ میں رنگا ہوا مرید ہے لیکن آزادی حقیقت یہ ہے کہ عارف رومی کا صحیح خلیفہ چھ سو برس کے بعد پیدا ہوا - جب تک دنیا میں مثنوی معنوی پڑھنے والے اور اس سے روحوں میں سوز و گداز پیدا کرنے والے باقی رہیں گے تب تک اقبال کا کلام بھی اس کے ساتھ پڑھا جائے گا اور روحانی لذت اور زندگی پیدا کرتا رہے گا -

اب ہم رومی اور اقبال دونوں کے بعض اساسی تصورات کو لے کر اقتباسات کے ذریعے ان کا مقابلہ کریں گے تا کہ مذکورہ صدر وعدہ پایۂ ثبوت کو پہنچ سکے - ان دونوں کے ہاں ایک مرکزی تصور عشق کا تصور ہے' ہم اس سے شروع کرتے ہیں -

**عشق** مثنوی معنوی اور مولانا کے دیوان "دیوان شمس تبریز" میں عشق کی کیفیت پر اس قدر بلیغ نشہ آور اور مرقص اشعار ملتے ہیں کہ دنیا کا کوئی اور شاعر عارف رومی کے اس جذبے میں اس کا مقابل یا حریف نہیں ہو سکتا - وہ عشق کو تمام کائنات کی روح رواں' اس کا مبدا اور منتہی سمجھتا ہے' عشق وہ جذبہ ہے جس کی بدولت ہر چیز اپنی اصل کی طرف عود کرنے کے لیے بے تاب ہے - عشق ہی نغمۂ نے ہے اور عشق ہی نشۂ مے - آتش عشق سے ہر روح میں سوز و گداز ہے - عشق ہی میں زندگی کا راز ہے - عشق ہی سوز ہے اور عشق ہی ساز ہے - عشق ہی ذوق نظر ہے - عشق ہی کائنات کا پردہ در ہے - عشق میں متضاد کیفیتیں ایک وحدت میں ختم ہو جاتی ہیں - وہ زہر بھی ہے اور تریاق بھی - وہ فقر بھی اور سلطانی بھی - وجود و عدم کا زیر و بم سب عشق سے ہے - ستاروں کی گردش اسی جذبے سے ہے - ذروں کا امتزاج اسی کی بدولت ہے - زندگی کے اندر یہی ذوق وصال اور یہی ذوق ارتقا ہے - ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف عروج عشق ہی کا کرشمہ ہے -

ہر قسم کی پستیوں اور کمزوریوں کے خس و خاشاک اس سے سوختہ ہو جاتے ہیں - عشق ہی اخلاق فاضلہ کا سر چشمہ ہے - عشق ہر جان کی غذا اور ہر مرض کی دوا ہے - نخوت و ناموس کی تمام بیماریاں اس سے دور ہو جاتی ہیں - عشق ہی افلاطون ہے اور عشق ہی جالینوس ہے - اسرار و رموز کے لیے عشق اصطرلاب ہے - مادی دنیا میں عشق حرکت کا باعث ہے - جنبش خاک اور حرکت افلاک اسی سے ہے - نباتات میں یہ نشو و نما ہے اور حیوانات میں نقل مکانی - انسان کے اندر مادی' نباتی اور حیوانی عشق بھی پایا جاتا ہے - عشق کسی چیز کا بھی ہو وہ عشق ازلی کی ایک لہر ہے اور ترقی کرکے اپنی اصل تک پہنچ سکتا ہے - 'خوردن گندم' سے جو فساد پیدا ہوتا ہے وہ بھی عشق ہی کی ایک ادنیٰ صورت ہے - عالم رنگ و بو کا عشق بھی اصلی عشق کی ایک جھلک ہے - لیکن انسان کو چاہیے کہ عشق کے ادنیٰ مظاہر سے اعلیٰ مظاہر کی طرف بڑھتا جائے - کسی ایک مظہر پر اٹک جانا نفی حیات ہے -

اقبال کی بہترین نظموں میں عشق اور عقل کا تقابل پایا جاتا ہے - اقبال جوش' قوت' وجدان جبلت و جذبہ اور تخلیق کا شاعر ہے - ان تمام چیزوں کے لیے اس کے پاس ایک ہی لفظ ہے عشق - عشق اور عقل کا یہ تقابل تاریخ فکر میں بہت قدیم ہے - نطشے کا خیال ہے کہ یونانی تہذیب میں جب صحیح زندگی موجود تھی تو یونانیوں میں Dionysims کی پوجا ہوتی تھی جو جذبۂ حیات اور جذبۂ تخلیق کا دیوتا تھا - پر جوش رقص و سرود کے ذریعے لوگ اس دیوتا سے ہم آغوش ہوتے تھے - اعلیٰ درجے کا یونانی المیۂ (ٹریجڈی) اِس جذبۂ حیات کی پیداوار تھی - یہ جذبہ بہ نسبت مصوری اور سنگ تراشی کے موسیقی میں زیادہ پایا جاتا ہے - عقل اس جذبے سے بہت

بعید ہے اور فن لطیف اس سے بہت قریب ہے بشرطیکہ فن لطیف عقلیت کا شکار نہ ہو جائے - فنون لطیفہ پر سب سے زیادہ موسیقی اصل حیات کی آئینہ دار ہے - موسیقی کُنہِ حیات کا رمزی اظہار ہے - مسلمان صوفیا میں بھی جو جذبۂ عشق کے دلدادہ تھے، موسیقی کی نسبت اس قسم کے خیالات ملتے ہیں - صوفیا کے ایک طبقے نے اس غرض سے موسیقی کو عبادت میں داخل کر لیا - رقص اور موسیقی جلال الدین رومی کے مریدوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے - صوفیا کے دوسرے سلسلوں میں بھی جذبہ آفرین موسیقی روحوں کو گرمانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے - نطشے اور 'شوپن ھائر' نے موسیقی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مثنوی مولانا روم میں کئی صدیاں پہلے بڑی خوبصورتی اور گہرائی کے ساتھ بیان ہو چکے تھے - حقیقت حیات میں غوطہ زنی کے ساتھ موسیقی کا کیا تعلق ہے، اُن اشعار سے بہتر غالباً اس کا کہیں اظہار نہیں ہوا جن سے مثنوی کی ابتدا ہوتی ہے - مولانا نے نے کو حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال کر کے اپنا تمام نظریۂ حیات شروع ہی میں بیان کر دیا ہے - اِن اشعار میں موسیقی اور تصوف دونوں کا فلسفہ یکجا بیان ہو گیا ہے - نے کی دلگدازی اس لیے ہے کہ روح کو اپنی حقیقت اور اپنا وطن یاد آ جاتا ہے - تمام راز حقیقت اس نے کے اندر ہے جس طرح جان تن کے اندر ہے - جوش عشق نے کے اندر اس طرح ہے جس طرح شراب میں نشہ - ہر فراق زدہ کو اس لیے موسیقی بہت دل سوز معلوم ہوتی ہے اور کوئی راگ جتنا درد انگیز ہو اتنا ہی شیریں ہوتا ہے - زندگی کی اساس میں جو منطقی تضاد پایا جاتا ہے وہ پوری طرح موسیقی میں ملتا ہے - اسی لیے اس کے اندر درد اور طرب جیسی دو متضاد کیفیتیں ہم آغوش ہیں - یہ زہر بھی ہے اور تریاق بھی - بانسری کے دو دھن

ھیں - ایک حقیقت نے نواز کے ساتھ لگا ہوا ھے اور دوسرا حقیقت ظاھر کی سمت میں نالہ افگن ھے - اس انداز کے سماع راست سے روح میں گداز پیدا کرنا ھر شخص کا کام نہیں - اس کے اندر ایسے رموز حیات کا انکشاف ھوتا ھے کہ اگر ان کو فاش طور پر بیان کر دیا جائے تو علم اور عمل کے تمام نظام درھم برھم ھو جائیں :—

سرِّ پنہاں است اندر زیر و بم  فاش گر گویم جہاں برھم زنم

رباب کی نسبت لکھتے ھیں :—

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست

از کجا می آید ایں آواز دوست

نطشے اس تمام جذبۂ باطن کو فن لطیف کا سر چشمہ قرار دیتا ھے - سقراط' افلاطون اور ارسطو جیسے عقلیت کے دیوتاؤں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ھے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری محض عقل سے نہیں بلکہ ایک قسم کے جنون سے پیدا ھوتی ھے - جس شاعر میں اس جنون کی کمی ھے وہ زبان کی خوبیوں اور صنعتوں پر قادر ھونے کے باوجود محض زبان اور علم کی بنا پر ایسے اشعار نہیں کہہ سکتا جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جائیں - معرفتی جنون کا یہ نظریہ رومی' نطشے اور اقبال تینوں میں پایا جاتا ھے - نطشے کو سقراط اور افلاطون سے یہ شکایت ھے کہ انہوں نے عقلیت کو جو ایک ثانوی چیز ھے' اصلی قرار دیا اور جذبۂ حیات کو جو ایک اصلی چیز ھے اور تمام تخلیق کا سر چشمہ ھے' فرعی سمجھا اور ایک ایسی تہذیب اور ایسے فلسفے کی بنا ڈالی جو خشک استدلال کے تار و پود سے بنایا جائے - افلاطون نے باوجودیکہ وہ خود شاعر مزاج فلسفی ھے' اپنی مجوزہ جمہوریت میں سے شاعروں کو نکال دینا چاھا - لیکن موسیقی کا وہ محض اس لیے قائل تھا کہ اس سے عقلی توازن اور ھم آھنگی

میں مدد ملے گی - افلاطون کا تصور موسیقی کی نسبت' رومی اور نطشے کے وجدانی اور تاثراتی تصور سے الگ ہے - وہ مائتھالوجی' دیو مالا یا اسباب فطرت کے متعلق تخیلی افسانوں کو خلاف عقل ہونے کی وجہ سے بے کار سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ فقط بچوں اور عوام کی تعلیم میں دروغ مصلحت آمیز کے طور پر ان سے کام لے سکتے ہیں - اس سے زیادہ ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں - زمانۂ حال میں پہلے نطشے نے اور اس کے بعد اقبال نے سقراطی افلاطونی نظریۂ حیات پر حملہ کیا ہے - یہ دونوں بجائے اپولو کے ڈائیو نیستھس کے پجاری ہیں - اقبال نے جو اسرار خودی میں افلاطون کو گوسفند قرار دیا ہے :—

راہب اول فلاطون حکیم گوسفند از گوسفندان قدیم

اس تلخ تنقید کا ماخذ نطشے ہی کا وہ زبردست وار ہے جو اس نے افلاطون کی عقلیت پر کیا ہے - نطشے کے نزدیک جذباتی اور جمالیاتی کیفیت استدلالی اور عقلی کیفیتوں سے بہت افضل ہے - اس نقطۂ نظر کے ماتحت اقبال نے سیکڑوں اشعار لکھے ہیں - جس طرح نطشے اور رومی موسیقی کو استدلال پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح اقبال شعر کو فلسفے کے مقابلے میں زیادہ حقیقت رس خیال کرتا ہے - دین کا سر چشمہ بھی شعر اور موسیقی کے سر چشمے کی طرح جذبۂ حیات یا جذبۂ عشق ہی ہے - محض سائنس کی تعلیم یا خالص عقلی تعلیم کو نطشے ایک بے مغز پوست خیال کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں علوم کی تعلیم دینے والوں نے اس کو ایسا بے جان کر دیا ہے کہ کسی روح میں اس سے کوئی گرمی پیدا نہیں ہوتی - محض معلومات کے اضافے سے کوئی جذبۂ تخلیق پیدا نہیں ہوتا - حقیقی تخلیق وہیں ہوگی جہاں بجائے عقل کے جبلت اور وجدان کے تار مرتعش ہوئے ہیں - وہ کہتا ہے کہ اب تاریخ جیسا مضمون بھی اس طرح پڑھایا جاتا ہے کہ

زندگی کے متعلق کوئی جوش اس میں پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی بلند مقاصد کی تخلیق ہوتی ہے - اس کی وجہ وہ یہی بیان کرتا ہے کہ یہ عقل خشک کے پجاری ابھی تک سقراط اور افلاطون کے جادو سے باہر نہیں آسکے - اسی طرح شاعری کے بہت سے معلم اور نقاد شعر کی روح سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں اور اعلیٰ درجے کی نظم کو صرف و نحو' عروض اور لسانیات کی بے معنی بحثوں میں الجھا کر شعر فہمی قرار دیتے ہیں - اِسی طرح مذہبی صحیفوں کو ان کی مائتھالوجی سے معرا کرکے خالص استدلالی اور خشک منطق سے سمجھنا چاہتے ہیں حالانکہ مذہبی افسانوں کی تعمیر تخیل جو جذبۂ حیات سے پیدا ہوتی ہے محض منطقی استدلال کے مقابلے میں حقیقت حیات سے بہت زیادہ قریب ہے - کانٹ اور شوپن ھائر نے عقل استدلالی کو محض مظاہر کے تعلقات تک محدود کرکے عقلیت کی بت شکنی کی ہے - نطشے کو اس سے امید ہوتی ہے کہ غالباً اس بڑے بت کے توڑنے کے بعد جرمن قوم پھر آزادانہ جبلی تخلیق پر مائل ہوگی اور ایسی موسیقی شاعری' ڈرامہ اور افسانہ پیدا کرے گی جو بجائے کمینہ سود و زیاں کی کشمکش کے زندگی کی گہرائیوں میں سے اُبھرے اور جس کے حقائق سقراط' افلاطون اور ارسطو کی منطق کے پیمانے سے ناپے جائیں - اِس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی شاعری کے اُس دور میں جس میں اسرار خودی تصنیف کی گئی' اقبال نطشے سے متاثر تھے - علاوہ اس داخلی شہادت کے جو اسرار خودی سے بکثرت اور بوضاحت مل سکتی ہے' مجھ کو اس بارے میں شخصی طور پر بھی کچھ معلومات حاصل ہیں - یورپ کے قیام کے دوران میں اقبال کو اس مومن قلب اور کافر دماغ مجذوب کا فلسفہ بہت دلکش معلوم ہوا - بیسویں صدی کے آغاز میں نطشے عقلی اور اخلاقی دنیا میں ایک زلزلہ پیدا کر چکا تھا - اس زمانے میں اقبال یورپ

میں حکمت فرنگ کے قدیم اور جدید پہلوؤں کا بنظر غائر مطالعہ کر رہے تھے۔ یورپ میں اکثر نوجوان شاعر اور فلسفی اس انقلابی مفکر کے دلدادہ تھے۔ نطشے کو ایک نقاد نے ایک مست بیل سے تشبیہ دی ہے جو کسی کے چینی خانے میں گھس کر تمام قیمتی ظروف کو پاش پاش کر دے۔ اِسی تشبیہ کو کسی قدر بدل کر اقبال نے اس مصرعے میں استعمال کیا ہے کہ "دیوانۂ بکار گہ شیشہ گر رسید"۔ ہر مصلح بت شکن ہوتا ہے۔ نطشے مفکر اور شاعر ہونے کے علاوہ کسی قدر مجذوب ہونے کی وجہ سے بت خانہ افکار و اقدار میں اپنی لاٹھی بے دھڑک گھما چکا تھا۔ بہت سے بت اِس نے پاش پاش کر ڈالے تھے۔ جو ٹوٹے نہیں تھے وہ اپنا مرکز ثقل کھو کر سرنگوں ہو گئے تھے۔ جو طبقہ مروجہ مذہب اور روایتی اخلاق کی کمزوریوں اور ریاکاریوں سے بیزار ہوچکا تھا لیکن جرأت رندانہ کے فقدان کی وجہ سے کوئی آواز بلند نہیں کر سکتا تھا یا خود اس کے شعور میں اس ضرورت انقلاب نے کوئی معین صورت اختیار نہیں کی تھی، اس کو نطشے کی تعلیم میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک نئے نبی کی آواز ہے جو حال سے زیادہ مستقبل کے انسانوں کو پیش کرتا ہے۔ جب تک نطشے کے اہم اور مرکزی افکار اور میلانات سے واقفیت نہ ہو اس امر کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اقبال پر اس کی تعلیم کے کس پہلو نے اثر کیا اور کن خیالات میں اقبال اس کا ہم نوا نہ ہو سکا۔ نطشے کے افکار میں بظاہر کوئی نظم اور انضباط نہیں۔ مختلف ادوار میں اس کے خیالات میں بہت تبدیلیاں پائی جاتی ہیں۔ شروع میں ایک چیز کی توصیف میں رطبُ اللّسان تھا تو آخر میں اس کا بے پناہ دشمن ہو گیا۔ مختلف تصانیف میں آپس میں تصادم معلوم ہوتا ہے اور بہت سی باتیں فقط مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد اتنا ہو سکتا ہے کہ جو میلانات

اس میں غالب معلوم ہوتے ہیں ان کو الگ کر لیا جائے اور اندازہ کیا جائے کہ بحیثیت مجموعی اس کا نظریۂ حیات کیا تھا۔ مفصلۂ ذیل بیان میں اختصار کے ساتھ اس کے اساسی نظریات کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب

(۱) نطشے خدا کا مُنکر ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جب تک خدا کا تصور پورے طور پر انسان کے دل سے محو نہ ہو جائے' انسان اپنی موجودہ ذلیل غلامانہ حالت سے آگے قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ جب تک لوگ دیوتاؤں اور طلسمات کے قائل تھے' سائنس اور حکمت پیدا نہیں ہو سکی۔ جب تک انسان یہ آخری بت نہیں توڑے گا' کسی بلند سطح کی طرف عروج نہیں کر سکے گا۔

(۲) نطشے عیسائیت کا جانی دشمن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے عیسائیت کی بیخ و بن پر کلہاڑی مارنے والا کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا تھا جو اس امر میں نطشے کا مقابلہ کر سکے۔

اِس سے پہلے اسلام نے عیسائیت پر جو حملہ کیا وہ ادھورا سا تھا۔ مسلمانوں نے مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو نہایت برگزیدہ اور ان کی اصلی تعلیم کو صحیح سمجھا۔ عیسائیوں کے نصف سے زائد عقائد مسلمانوں کے عقائد کا بھی جز بنے رہے۔ خود عیسائیوں میں جو آزاد خیال مفکر پیدا ہوئے اُنہوں نے بھی مسیحؑ کے اخلاق کی مدح سرائی کی اور فقط معجزات و کرامات کو توہمات قرار دیا۔ نطشے عیسائیت کو عروج انسانی کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے' اِس لیے کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب دو قسم کے ہیں۔ (۱) اثبات حیات کے مذاہب' جو زندگی کو 'ہاں' کہتے ہیں اور (۲) نفی حیات کے مذاہب جو زندگی کو 'نہیں' کہتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر زندگی کو نعمت سمجھ کر اس کے حصول اور فلاح میں

کوشش کرنے والے اور زندگی کو لعنت سمجھ کر اس سے بھاگنے والے۔ عیسائیت اور بدھ مت کو وہ نفی حیات کے مذاہب قرار دیتا ہے اس لیے زندگی کے کمال اور صعود کی خاطر ان کا عقلاً و عملاً تہس نہس کرنا چاہتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس کا خیال ہے کہ عیسائیت عاجزوں اور غلاموں کی ایک بغاوت تھی زبردست آقاؤں کے خلاف۔ زندگی میں جب براہ راست قوت حاصل نہ ہوسکے تو دروغ اور عاجزی بھی ہتھیار بن سکتے ہیں۔ اقتدار کو اُلٹ کر غلاموں نے اپنے حرمان و افلاس کو سب سے بڑی نعمت اور دولت قرار دیا اور یہ تعلیم دینی شروع کی کہ فقط عاجز٬ مفلس٬ بیکس٬ طمانچے کھانے والے٬ بیگار میں پکڑے جانے والے٬ بے گھر٬ بے در٬ بے زر لوگ خدا کی بادشاہت میں داخل ہو سکیں گے۔ جاہل کو عالم پر فوقیت ہے۔ غریب کو امیر پر اور ناتواں کو توانا پر۔ فطرت کا حسن ایک دھوکا ہے اور جسمانی اور مادی زندگی گناہ آدم کی ابدی سزا ہے۔ نطشے کہتا ہے کہ اس ہتھیار سے یہودیوں نے اہل روما کو شکست دی٬ غلام آقاؤں پر غالب آگئے٬ شیر بکرے بن گئے۔

اخلاق

نطشے کسی ازلی اور ابدی خیر و شر کی مطلق تفریق اور تقسیم کا قائل نہیں۔ وہ پیکار حیات اور ارتقا کا ماننے والا ہے۔ زندگی اپنی بقا کے لیے مختلف منزلوں میں خاص خاص چیزوں پر خیر اور شر کی مہر لگاتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے جو عمل ایک حالت میں خیر ہے وہ دوسری حالت میں شر ہو جائے۔ پہلے نتائج پر خیر و شر کا اطلاق ہوتا تھا٬ اس کے بعد یہ الفاظ اعمال پر لگنے لگے جن سے خاص خاص نتائج سرزد ہوتے تھے۔ اس سے آگے بڑھ کر محرکوں اور نیتوں پر بھی اصطلاحیں عاید ہونے لگیں۔ آخر میں خود انسان نیک یا بد شمار ہونے لگے۔ علم اللسان کا ماہر ہونے کی

حیثیت سے نطشے نے لسانیات سے اس کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ خیر کا اطلاق پہلے قوت پر ہوتا تھا اور اچھا آدمی قوی آدمی تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ عاجزوں پر اس کا اطلاق نوع انسان کے انحطاط کا موجب ہے۔

اخلاق دو طرح کے ہیں (۱) آقائی اخلاق (۲) غلامانہ اخلاق۔ صداقت کی تلاش' جرأت' زندگی کو لذت و الم اور سود و زیاں کے پیمانے سے نہ ناپنا' ہر قسم کا اثبات اور حیات افزا فعلیت آقائی اخلاق کے مظاہر ہیں۔ ہر قسم کی بزدلی' رسوم و قیود سے باہر آنے کی کوشش نہ کرنا عجز' قناعت توکل' خیرات' حلم' عبرت' غرضیکہ ہر قسم کی انفعالی صورتیں غلامانہ اخلاق میں داخل ہیں۔ بدھ مت اور عیسائیت میں غلامانہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر طریق زندگی اور طرز فکر جس سے قوت پیدا ہو' خیر ہے اور اس کے برعکس ہر طریق زندگی یا طرز فکر جو کمزوری سے پیدا ہو اور کمزوری کی طرف لے جائے' شر ہے۔ اعلی انسان کو شکاری ہونا چاہیے۔ سچا عیسائی ایک گھریلو اور پالتو جانور ہے جس میں جوش ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ آنسو بہانے والی ہمدردی ہمدرد کو بھی کمزور کر دیتی ہے اور اس کو بھی جس کی مظلومیت پر آنسو بہائے جائیں۔ خیرات کا دینے والا بھی ذلیل ہوتا ہے اور لینے والا بھی۔ اس سے رفتار ارتقا میں خلل اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ پیکار حیات میں آفرینش انواع صالحہ کے لیے انتخاب طبعی صحیح قانون ہے۔ جو کمزور کو بچانا چاہتا ہے وہ عروج آدم کا دشمن ہے۔ نطشے کے نزدیک اب تک نوع انسان نے جو اخلاق پیدا کیا وہ ایک سفید جھوٹ ہے لیکن یہ جھوٹ مفید اور مصلحت آمیز تھا۔ انسان کے اندر جو درندگی ہے وہ فقط دھوکے سے مغلوب ہو سکتی ہے۔ مذہب اور اخلاق کی دروغ بافیوں کے بغیر

انسان درندہ ہی رہتا - اس نے اپنے آپ کو ایک بلند قسم کی مخلوق تصور کر لیا اور اس دھوکے میں شدید قوانین کی ماتحتی قبول کر لی - مروجہ اخلاق کی بنیاد زیادہ تر رسم و رواج ہے - رسم و رواج کا پابند شخص نیک اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا بد شمار ہوتا ہے - بنی بنائی پگڈنڈیوں پر چلنا آسان ہوتا ہے اس لیے اکثر انسان محض عادت اور سہولیت کی وجہ سے نیک ہوتے ہیں - دوسروں سے الگ ہو کر سوچنا یا عمل کرنا زحمت اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے - حقیقت میں کوئی عمل فی نفسہ برا یا اچھا نہیں - جماعت یا مملکت اپنے نفع و ضرر کے لحاظ سے خیر و شر کا فیصلہ کرتی ہے - گناہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں - ہر چیز معصوم ہے- بدی صورت بدل کر نیکی اور نیکی صورت بدل کر بدی ہو جاتی ہے - حکمت شعار انسان ابھی پیدا نہیں ہوا - ابھی ارتقا نے اس کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے - ایک زمانہ آئے گا کہ نوع انسان کی زندگی اخلاق و مذہب کے بجائے حکمت پر مبنی ہوگی - اس آیندہ ابھرنے والے آفتاب کی کرنیں ابھی روح انسانی کی چوٹیوں پر پڑتی ہیں - نیچے وادی میں گھرا گھر اور اندھیرا ہے -

مذہب اور فن لطیف نے نوع انسان کے لیے ماں اور دایہ کا کام کیا ہے لیکن شباب کو پہنچ کر نہ ماں کی ضرورت رہتی ہے اور نہ دایہ کی -

سیاسیات میں نطشے کا خیال ہے کہ تمام اعلیٰ درجے کی تہذیب وہاں پیدا ہوئی ہے جہاں جماعت کے دو طبقے تھے- ایک جبری محنت کرنے والا' ایک آزاد اور اختیاری محنت کرنے والا - جنگ کے خلاف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس سے فاتح احمق ہو جاتا ہے اور مفتوح بد اندیش اور حاسد - اس کے

موافق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب انسانی کے لیے جنگ ایک قسم کی نیند ہے - اس نیند سے اُٹھنے کے بعد نوع انسان زیادہ تازہ دم ہو جاتی ہے —

اشتراکیون کہتے ہیں کہ ملکیت اور سرمائے کی تقسیم ظلم اور عدم انصاف پر مبنی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام تہذیب کی بنیاد ظلم اور غلامی اور مکر و فریب ہے - یہ چیزیں تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہیں - کسی فوری انقلاب سے ان کا علاج نہیں ہو سکتا - فقط احساس عدل کی تدریجی ترقی سے ان کی اصلاح ہو سکتی ہے —

یورپ میں اقوام کی تقسیم آگے چل کر ناپید ہو جائے گی - نطشے جمہوریت کا دشمن ہے اور اقبال نے بھی جا بجا اپنی نظموں میں جمہوریت پر نکتہ چینی کی ہے - نطشے کو جمہوریت پر یہ اعتراض ہے کہ یہ اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے - اخلاق اور قانون دونوں انسانوں میں مساوات کی بنا پر قایم کیے گئے ہیں اور عیسائیت کی قسم کے دوں ہمت اور سفلہ پرور مذاہب نے بھی یہ دھوکا پھیلایا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں - یہ ایک صریح فریب ہے جس کی شہادت واقعات سے کسی طرح بھی نہیں مل سکتی - ارتقاے حیات میں قدم اعلیٰ افراد کی طرف سے اُٹھتا ہے جو اپنے معاصرین سے جداگانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں - مساواتی دین و آئین ایسے افراد کو خطرناک تصور کرتا ہے اور ہر طریقے سے ان کو فنا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - ترقی حیات کبھی جمہور کی رائے سے نہیں ہوئی - العوام کالانعام ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے -

ازآں کہ پیرویٔ خلق گمرھی آرد نمی روم براہے کہ کارواں رفت است

نطشے ایک ارتقائی مفکر ہے لیکن دوسرے ارتقائی مفکروں سے اس کا نقطۂ نظر

کسی قدر الگ ہے - ڈارون اور اسپنسر اور ان کے پیروؤں نے تنازع للبقا یا پیکار حیات کو انواع کی پیکار قرار دیا اور اگر اس کشمکش میں کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد یہ ہے کہ ایک نوع بقائے حیات کے لیے دوسروں سے زیادہ قوی اور صالح ہو جائے - نطشے جب فوق البشر کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطمح نظر نوع نہیں، بلکہ فرد ہے - تاریخ اور فطرت کا یہ میلان ہے یا ہونا چاہیے کہ اس میں اعلیٰ درجے کے افراد پیدا ہوں جو آئین مساوات کے زیر اثر نہ ہوں، حقیقت میں آزاد ہوں مقلد نہ ہوں، صداقت کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مقدم سمجھیں، سود و زیاں اور بیم و رجا سے پیدا شدہ امتیاز خیر و شر سے ماورا ہوں، جن کا قانون خود اپنے اندر ہو، جن کو ہر حیات بخش چیز صحیح اور ہر حیات کش طریقہ نا قابل قبول معلوم ہو - زندگی کا مدار اگر محض عوام کی رائے پر ہوتا تو انسان دوسرے جانوروں سے بھی پست تر ہو جاتا - جہاں برائے نام جمہوریت کا نظام پایا جاتا ہے وہاں بھی حقیقی فیصلے چند قوی افراد ہی کرتے ہیں اور باقی سب بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں - اقوام کے اہم اور نازک حالات میں کبھی جمہوریت سے کام نہیں چل سکتا - نطشے کے ہم خیال ہو کر موجودہ دنیا کے تمام بڑے بڑے آمرین اور مصلحین مساواتی جمہوریت کے مخالف ہیں - قدیم زمانے میں 'جمہوریۂ افلاطون' بھی جمہوریت ہی کے خلاف ایک شدید حرب و ضرب تھی - افلاطون کے نزدیک وہ جمہوریت جس میں سقراط جیسے انسان کو مخرب اخلاق اور دشمن انسانیت سمجھ کر زہر پلایا جائے، کسی حیثیت سے مستحسن نہیں ہو سکتی - اس قسم کی جمہوریت حقیقت میں ادنیٰ درجے کے انسانوں کی ایک سازش ہے جو افراد آزاد کے خلاف کی جاتی ہے - اس جمہوریت میں کور چشم اور تیرہ دل استبداد پسند افراد مملکت پر حاوی ہو جاتے ہیں - اعلیٰ درجے کے انسان اس میں

پیدا نہیں ہو سکتے - افلاطون نے اس جمہوریت کے خلاف اس وقت احتجاج کیا جب کہ اس کی قوم اس طرز حکومت کی دل دادہ تھی اور اس کو بہترین طرز حکومت سمجھتی تھی - نطشے نے اس کے خلاف اس وقت جہاد کیا جب کہ تمام مغرب اس کا فریفتہ تھا - اقبال نے بھی ہندوستان میں اس کی پوسعت کلدہ حقیقت کو اس زمانے میں پیش کیا جب کہ انگریزی ملوکیت اور انگریزی خیالات کے زیر اثر مشرقی اقوام اس سے مسحور ہو رہی تھیں - کارل مارکس اور لینن نے کلیسائی مذہب کو جمہور کے لیے ایک افیون قرار دیا تھا - لیکن نطشے کہتا ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت بھی عوام اور اقوام غلام کی ایک سازش ہے اور ایک طریق حیات ہے جس میں اعلیٰ درجے کے آزاد افراد پیدا نہیں ہو سکتے - اقبال اس جمہوری نظام کو سرمایہ داروں کا دام تزویر سمجھتا ہے - جلال الدین رومی نے عوام کو 'همرهان سست عناصر' قرار دیا ہے اور ان سے دل گرفتگی کا اظہار کیا ہے - غالب بھی اسی رنگ کا منکر شاعر ہے جو عوام کو گدھے سمجھتا ہے اور اپنے ظریفانہ انداز میں کہتا ہے کہ ہیں تو سب گدھے لیکن اس مجمع جہال میں بعض خر عیسیٰ ہیں اور بعض خر دجال - مرزا غالب کا طرز بیان اس بارے میں ایسا نادر ہے کہ اگر نطشے کو اس کا علم ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بہت داد دیتا - اقبال نے بھی اس خیال کے اظہار میں جا بجا بہت لطیف پیرائے اختیار کیے ہیں - کبھی تو وہ کہتا ہے کہ یہ دیو استبداد ہی ہے جو جمہوری قبا میں رقصاں ہے اور کبھی مساواتی جمہوریت کی بابت یہ فتویٰ دیتا ہے کہ :—

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

پیام مشرق میں نطشے کا اثر اس قدر نمایاں نہیں جتنا کہ اسرار خودی میں ہے - تا ہم جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی

تک اقبال نطشے کی تعلیم کے بعض پہلوؤں کو صحیح اور قابل تبلیغ سمجھتا ہے - مذہبی وجدان کا عام رخ ذات الٰہی کی طرف رہتا ہے اور مشرق و مغرب کا اسلامی اور غیر اسلامی تصوف بھی خدا شناسی اور خدا رسی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے - لیکن خدا سے پہلے آدمی کی تلاش کرنا جو اقبال کی شاعری کا امتیازی عنصر ہے ' نطشے اور اقبال میں ایک قدر مشترک ہے - اسلامی تصوف اس انداز تخیل سے نا آشنا نہیں تھا - عبدالکریم جیلی کی مشہور تصنیف ' الانسان الکامل ' میں اسی قسم کا فلسفہ مابعد الطبیعیاتی اور متصوفانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے - مولانا روم کی مثنوی اور دیوان میں بہت سے اشعار اسی موضوع کے ملتے ہیں اور قرآن کریم کا مسخر کائنات آدم بھی ایسے ہی افکار کا سر چشمہ ہے - مرور ایام سے مسلمانوں میں یہ انداز فکر قریباً ناپید ہو گیا تھا کہ یک بیک اقبال نے اس زور سے اس کا اعلان کیا کہ وہ اس کی زبان سے ایک نوزائیدہ اور جدید نظریۂ حیات معلوم ہوتا ہے - زمانۂ حال میں نطشے نے اس قدر علو آدم پر اپنی نگاہیں جمائیں کہ وہ خدا سے بالکل بیگانہ ہو گیا - نطشے نہ خدا پرست ہے اور نہ دھر پرست ' وہ آدم پرست ہے لیکن اس کا آدم وہ آدم نہیں جو اس کے سامنے موجود ہے - اس کا آدم ابھی تک کتم عدم میں ہے - وہ اسے معرض وجود میں لانا ارتقائے حیات کا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتا ہے - نصب العین آدم کی تلاش نطشے اور اقبال کے ساتھ مخصوص نہیں - دیو جانس کلبی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ دن میں چراغ لے کر منڈی میں پھر رہا تھا - اپنی قوم اسے ایک سنکی حکیم سمجھتی تھی - لوگوں نے پوچھا کہ حضرت دن دہاڑے چراغ لے کر کیا ڈھونڈھ رہے ہیں ؟ کہنے لگا کہ آدمی کو ڈھونڈھتا ہوں - جب اس سے کہا گیا کہ آدمیوں کا ہجوم تمہیں نظر نہیں آتا ؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ

سب ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہے' آدمی ان میں ایک بھی نہیں - یہی ' شیخ ' دیو جانس ہیں جن کا فلسفہ اس قصے کے پیرائے میں مولانا روم نے ان اشعار میں لکھا ہے جو اقبال کو اس قدر پسند تھے کہ انہیں اپنی کتاب کے سر ورق پر درج کیا ہے :—

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو است

از ہمرہان سست عناصـــر دلم گرفت
شیر خـــدا و رستم دستانم آرزو است

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو است

اس امر میں اقبال کے خیالات ایک طرف اسلامی مفکرین' خصوصاً جلال‌الدین رومی سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف نطشے سے - مگر فرق یہ ہے کہ رومی اور اقبال کے ہاں خدا بھی موجود ہے اور نطشے کے نزدیک خود اسی کے الفاظ میں " خدا کا انتقال ہو چکا ہے " اور جب تک انسان اس مردے کو پوجتا رہے گا وہ اپنی حقیقت سے نا آشنا رہے گا اور ارتقا میں آگے کی طرف قدم نہیں اٹھا سکے گا - اقبال کے لیے ناممکن تھا کہ نطشے کی طرح خدا کا منکر ہو جائے لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اقبال نے جا بجا دوسری ہستیوں سے جو آدم کا مقابلہ کیا ہے اس میں مختلف لطیف اور ظریفانہ پیرایوں میں آدم کو ترجیح دی ہے - اقبال جہاں خدا سے بھی آدم کا مقابلہ کرتا ہے تو خدا کی خدائی پر ایک چوٹ کر جاتا ہے -

نوائے عشق را ساز است آدم　　کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت　　مگر با ایزد انباز است آدم

---

خدائی اہتمام خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی درد سر ہے
مگر یہ بندگی استغفر اللہ　　یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

' تو شب آفریدی چراغ آفریدیم ' والی نظم میں بھی انسان کو خدا کی تخلیق و تکوین پر اضافہ کرنے والا قرار دیا ہے - خدا کے تصور کے متعلق ایک خیال اسلامی اور مغربی آزادہ رو مفکرین میں ملتا ہے کہ انسان نے خدا کو اپنی صورت پر تراشا ہے اور انسان اپنا ہر معبود اپنی ہی صورت پر تراشتا ہے - انجیل میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا - یہی خیال اسلامیات میں بھی ملتا ہے کہ خلق الانسان علیٰ صورتہ - اس کو ایک اسلامی شاعر نے الٹ دیا اور اس رنگ میں بیان کیا کہ معبود انسان سے کہہ رہا ہے کہ :—

مرا بر صورت خویش آفریدی　　بروں از خویشتن آخر چہ دیدی

اسی قبیل کا یہ مشہور فقرہ غالباً والٹیر کا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا اور انسان نے اس احسان کے بدلے میں یہ کیا کہ خدا کو اپنی صورت پر ڈھال لیا - پیام مشرق میں اسی مضمون کا ایک قطعہ ہے :—

تراشیدم صنم بر صورت خویش　　بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است　　بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اقبال نطشے کی طرح خدا کا انکار تو نہیں کرتا لیکن خدا کے ساتھ بے تکلفیاں اور بعض اوقات گستاخیاں بہت برتتا ہے - اقبال کی مشہور اردو نظم

'شکوہ' اسی قسم کی شوخیوں کا نتیجہ ہے - جلال‌الدین رومی میں جہاں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں وہ بھی اقبال کو اس درجہ پسند ہیں کہ بعض اوقات بغیر مانگے کے لے کر اپنا لیے ہیں - مولانا روم کا ایک مشہور شعر ہے :—

بزیر کنگــــرہ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اسی مضمون کو اقبال نے اس مصرع میں ادا کیا ہے کہ :—

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یہ سرقہ نہیں ہے اور محض مضمون اُڑالے جانے کا قصہ نہیں ہے - اس سے اقبال و رومی کی طبیعتوں کی ہمرنگی پائی جاتی ہے - خدا کی محبت' خدا تک رسائی' خدا کی عبادت' یہ تمام مضامین مذہب اور فلسفۂ مذہب کے عام اور قدیم مضامین ہیں لیکن انسانوں کو یہ تعلیم دینا کہ پیغمبروں اور فرشتوں اور خود خدا کا شکار کرو ایک انوکھا نقطۂ نظر ہے - رومی' نطشے اور اقبال تینوں کی جرأت اس بارے میں حیرت انگیز ہے - یہ شاعرانہ اور صوفیانہ تعلی اور طامات بافی سے بالکل الگ چیز ہے - اس مضمون کو کہ انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ انسان خدا کو تلاش کرے' اقبال نے اُلٹ دیا ہے - وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے اپنی تلاش کرے اس کے لیے یہ راستہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ 'خدا ہم در تلاش آدمی ہست' - اکثر مذاہب کی یہ تعلیم تھی کہ انسان تقدیر کی نوشت یا کرم کی کڑیوں سے پا بزنجیر ہے - لیکن رومی اور اقبال دونوں نے تقدیر کے مفہوم کی نئی تعبیر کی ہے - ان دونوں کے نزدیک روح انسانی خود اپنی تقدیر کی معمار ہو سکتی ہے - مومن خود تقدیر الہی ہے - جب وہ خود بدل جاتا ہے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے - مولانا روم نے قد جف القلم کی ایک بلیغ تفسیر کی ہے - "تقدیر کا قلم

خشک ہو چکا ہے، جو مقدر تھا مقرر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی کاٹ چھانٹ یا اضافہ نہیں ہو سکتا" اس سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ ہر شخص کے اعمال پہلے ہی سے مقرر ہیں، جو خیر و شر انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے انسان کے اعمال سزا و جزا کے مستوجب ہیں۔ اس انداز فکر سے نہ صرف منطقی تناقض واقع ہوتا ہے بلکہ اخلاقی ذمہ داری کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ بغیر اختیار حقیقی کے اخلاقی ذمہ داری ایک مہمل چیز ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ جس کو تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں قوانین حیات کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قانون قانون نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تبدیلی اور تلوّن سے مبرا نہ ہو۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تقدیر کا اٹل ہونا صحیح ہے، سنۃ اللہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، لیکن سنۃ اللہ یہ ہے کہ اگر تم چوری کروگے تو تم پر اور جماعت پر فلاں فلاں نتائج مترتب ہوں گے، سچ بولوگے تو فلاں فلاں قسم کی صلاح و فلاح اس کا نتیجہ ہوگی، خدا نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چوری کراتا ہے اور نہ کسی کی زبان کو ہلاکر اس سے سچ یا جھوٹ بلواتا ہے، عمل اختیار سے سرزد ہوتا ہے لیکن اس کے نتائج تقدیری یعنی آئینی ہیں جو فطرت انفس و آفاق میں غیر متبدل ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفوس میں تغیر پیدا نہ کرے۔ خدا نے یہاں اپنے عمل کو اقوام کے اختیاری عمل پر مشروط قرار دیا ہے اور اس طرح ایک اٹل قانون حیات بیان کیا ہے جو ارادوں کو آزاد چھوڑنے کے باوجود تقدیر مبرم کی طرح کام کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں جا بجا اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں اور فلسفۂ اسلام پر اپنے مدراس والے لیکچروں میں بھی اقبال نے اس مفہوم پر استدلال کیا ہے —

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر ته این گنبد گرداں رہے ہست

اگر باور نداری خیز و دریاب که چوں پا واکنی جولانگہے ہست

اقبال ایک نئے آدم کی تعمیر ممکن سمجھتا ہے جو اپنے لیے نیا جہان اور نئی تقدیر پیدا کر لے- وہ کہتا ہے کہ اگر تو بدل جائے تو یہ عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بھی بدل جائے- اقبال کے نزدیک زندگی کے لامتناہی ارتقا کا کوئی پہلے سے بنا بنایا نقشہ کسی لوح پر محفوظ نہیں ہے- زندگی جیسے جیسے تخلیقی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے وہ اپنی تقدیر خود ڈھالتی جاتی ہے :—

تو می گوئی که آدم خاک زاد است اسیر عالم کون و فساد است

ولے فطرت ز اعجاز که دارد بنائے بحر پُر جوشے نہاد است

زندگی طائر بام ہے' طائر زیر دام نہیں- انقلاب صبح و شام گردش ایام میں بھی ہے اور نفوس میں بھی- سوہان قضا اور فسان تقدیر سے شمشیر حیات تیز ہوکر اپنا راستہ خود کاٹتی جاتی ہے- مذہب کے علاوہ فلسفے سے بھی اقبال کو یہ شکایت ہے کہ وہ عقل پرستی سے ہٹ کر ابھی خود پرستی تک نہیں پہنچا- فلسفہ بھی تقلیدی مذہب کی طرح جسور و غیور نہیں- حکما نے بہت کچھ توہم شکنی کی لیکن ابھی تک قوت عشق سے قوت تکوین پیدا کرنے والے خود شناس آدم تک نہیں پہنچے' ابھی تک سومنات ہست و بود میں بت پرستی کر رہے ہیں- خدا' فرشتوں اور دیوتاؤں پر وہ اپنی کمند کہاں پھینک سکتے ہیں- حقیقت یہ ہے کہ "ہنوز آدم بہ فتراکے نہ بستند" —

جو شخص عام معنوں میں تقدیر کا قائل نہیں وہ بھلا تقدیر کا کہاں پرستار ہو سکتا ہے- جو شخص خدا سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا ہے وہ بندوں کے نقش قدم کی پوجا کہاں کرے گا- اقبال تقلید کا اس قدر دشمن ہے کہ آزادی سے گناہ کرنے کو تقلیدی نیکی سے بہتر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ :—

چو از دست تو کار نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اسی انداز کے مضامین نطشے اور رومی دونوں میں بکثرت ملتے ہیں - ایک مرتبہ اس مضمون پر اقبال سے گفتگو ہوئی - میں نے عرض کیا کہ مثنوی مولانا روم میں ایک عجیب و غریب مصرع ہے - مولانا نے سکون و جمود کا مقابلہ فعلیت سے کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "کوشش بیہودہ بہ از خفتگی" - یہ مصرع سن کر اقبال کا چہرہ روشن ہو گیا اور اس کی خوب داد دی - اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں تقلید کو خودکشی قرار دیا ہے - اس کے بعد اس نے بار بار تمام عمر اس مضمون کی طرف عود کیا :—

تا کجا طور پر دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

پیام مشرق میں ایک رباعی ہے :—

اگر آگاہی از کیف و کم خویش یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے ؟ شبے خود را برافروز از دم خویش

خودی کا پیغمبر بھلا تقلید کو کیسے گوارا کر سکتا ہے - کسی کے بتانے پر وہ خدا کا بھی قائل ہونا نہیں چاہتا - وہ ایسے مرد آزاد کا متلاشی ہے جو نور خودی سے خدا کو دیکھے - جو انسان کو ضمیر کُن فکاں سمجھتا ہے وہی اس جرأت سے کہہ سکتا ہے کہ :—

قدم بے باک تر نہ در رہ زیست بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

زمین ہمارا ہی میخانہ ہے، فلک ہماری ہی گردش پیمانہ ہے اور جہاں ہمارا ہی دیباچۂ افسانہ ہے - جس ہستی کا جوہر تخلیق ہے، تقلید اُس کے لیے موت کے مترادف ہے - جب کسی فرد یا قوم میں قوت تخلیق کی کمی واقع ہوتی ہے اور قوائے حیات کم زور پڑ جاتے ہیں تو وہ آسان سمجھ کر تقلید

کو اختیار کر لیتی ہے - جہاں تقلید کی پرستاری ہے وہاں سمجھنا چاہیے کہ زندگی شبستان عدم میں جاکر سو گئی ہے - اس مضمون میں اقبال نے کسی قدر برگساں کی بھی ہم نوائی کی ہے جس کے فلسفے کا لب لباب یہ ہے کہ زندگی تغیر اور تخلیق ہے اور زندگی کے جن پہلوؤں میں تقلید اور ثبات نظر آتا ہے وہاں زندگی ایک موج بے تاب نہیں رہی بلکہ مادہ اور جسم اور ریاضیات ہوگئی ہے - مادے اور جسم کی حرکتیں ایک ہی آئین میں پا بہ زنجیر ہو جاتی ہیں اور ریاضیات کی طرح اُن میں جبر پیدا ہو جاتا ہے ۔ مفصلہ ذیل مضمون برگساں ہی کی زبان میں بیان ہؤا ہے :—

بجان من کہ جاں نقش تن انگیخت ہوائے جلوہ ایں گل را دورو کرد
ہزاراں جلوہ دارد جان بے تاب بدن گردد چو با یک شیوہ خو کرد

اقبال کے ہاں اکثر جگہ خودی کی تقویت کا مضمون تقلید سے گریز کرنے کے ساتھ وابستہ ہے - تمام اکابر مصلحین نوع انسان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مقلد نہیں تھے' وہ آزادی سے نئی راہیں پیدا کرتے رہے - لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ پیروؤں نے ان کی حریت آفریدہ تعلیم کو تقلید کا حصن حصین بنا لیا - پیغمبروں کے رستے پر چلنے والا حقیقت میں وہ شخص ہے جو تقلید شکن ہے - اکثر افراد اور اقوام کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی یا موہوم ماضی سے ایسے پا بزنجیر ہوتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور وہ لکیر کے فقیر ہوکر رہ جاتے ہیں - ایسی قومیں جب استبداد کے شکنجوں میں جکڑی جاتی ہیں تو اُن کے نام نہاد مُصلح اپنی ذلت اور پستی کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ لوگوں میں آزادہ روی پیدا ہو گئی ہے اور تقلید کا جذبہ کم زور پڑ گیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے - جب تک گری ہوئی قومیں اپنے ماضی سے جکڑی رہتی ہیں ان کے لیے نئی زندگی پیدا

کرنا دشوار بلکہ محال ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اقبال نے بڑی آزادی سے بیان کیا ہے :—

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے　　ز بند پا ستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　پیمبر هم رہ اجداد رفتے

پیام مشرق میں اقبال نے دو تین جگہ نطشے پر کچھ اشعار لکھے هیں۔ ایک نظم شوپن هائر اور نطشے پر ہے جس میں دونوں کے فلسفوں کا مقابلہ ایک تمثیل سے کیا ہے۔ شوپن هائر کا فلسفہ فلسفۂ یاس ہے۔ بعض فلسفوں اور بعض مذهبوں میں زندگی کے متعلق قنوط کا رنگ غالب رها ہے لیکن شوپن هائر کے فلسفے میں قنوطیت کی اساس ایسی استوار کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک مستقل نظریۂ حیات بن گئی۔ شوپن هائر کے نزدیک زندگی کے تمام مظاهر ایک عالم گیر کورانہ ارادے کی پیداوار هیں۔ ایک تاریک اور بے مقصد ارادۂ حیات هر طرح وجود پذیر هونے میں کوشاں ہے۔ رنج اور مصیبت' دکھ اور درد اس کی لازمی پیداوار هیں۔ چونکہ ایک اندھا ارادہ زندگی کی اصل هے اس لیے اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ تہذیب اور علم کی ترقی سے بجائے صلاح و فلاح کی ترقی کے دکھ کی ترقی هوتی هے۔ تنازع للبقا زندگی کی نفسا نفسی هے جو شجر اور حجر' حیوان اور انسان سب کے لیے بے تابی کا باعث هے۔ جہاں زندگی هے وهاں پیکار اور رنج و محن کا بازار گرم هے۔ شوپن هائر کا خیال تھا کہ بدھ مت اور ویدانت کی بھی یہی تعلیم هے۔ ' فرار عن الحیات' زندگی کی کشمکش سے نکل جانا سب سے اعلیٰ اور صحیح مقصد هے۔

نطشے اور شوپن هائر کے فلسفوں میں بعض اهم اساسی نظریات مشترک پائے جاتے هیں۔ دونوں کے نزدیک ارادۂ حیات زندگی کی اصل ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ شوپن هائر کے نزدیک زندگی محض زندہ رهنے کی کوشش ہے

اور ہر وجود محض اپنی بقا کے لیے ساعی اور دوسروں کے لیے بر سر پیکار ہے - نطشے نے اس میں یہ ترمیم کی کہ زندگی محض بقا کی کوشش نہیں بلکہ حصول قوت کی کوشش ہے - ہر کوشش کسی نہ کسی رنگ میں اضافۂ قوت کی کوشش ہے - زندگی اس لحاظ سے بے مقصد نہیں کیوں کہ حصول قوت اس کا مطمح نظر ہے- اس کو دکھ اور سکھ کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیے - قوت اور کمزوری کے سود و زیاں کے علاوہ باقی سب قسم کے سود و زیاں اور نفع و ضرر بے معنی ہیں - زندگی کی مشکلات کا حل اس سے فرار نہیں بلکہ اپنی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے - ہر رکاوٹ ایک دعوت عمل ہے - زندگی سے بھاگنے کے بجائے اس میں ھَل مِن مَزِید کا اصول کارفرما ہونا چاہیے - زندگی اب تک ارتقا کے جو مدارج طے کر چکی ہے اس سے آگے لامتناہی مدارج اور بھی ممکن ہیں - اخلاق کہن اور ادیان کہن کا پیدا کیا ہوا توہم پرست اور لذت پرست اور غیر پرست انسان محض ایک پل ہے جس پر سے گزر کر فوق الانسان کی طرف بڑھنا لازمی ہے - زندگی پر آنسو بہانے والوں کے بجائے بہادر اور دلیر انسان پیدا ہونے چاہییں جو موجودہ انسانوں کی طرح سست عناصر نہ ہوں - نفی حیات کے تمام مذاہب اور فلسفے غلط ہیں - فقط وہی نظریۂ حیات صحیح ہے جس میں اثبات حیات اور ذوق نمو ہے - قنوط زندگی کی ایک بیماری ہے - صحیح عناصر کا انسان پیکار حیات سے خوش رہتا ہے اور سیلاب کوہسار کی طرح رکاوٹوں پر رقص کرتا ہوا چلتا ہے - شوپن ہائر اور نطشے کے نظریات حیات کے اس تفاوت کو اقبال نے اُس نظم میں ادا کیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے -

مرغے ز آشیانہ بہ سیر چمن پرید خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید

ایک مرغ اپنے گھونسلے سے سیر بوستاں کے لیے اُڑا' پھول سے لذت اندوز ہونا چاہتا تھا' لیکن ایک کانٹا اس کے نازک بدن میں چبھ گیا - وہ نہ صرف

اپنے درد سے کراہا بلکہ چمن روزگار کی فطرت کو برا کہنے لگا - گل کو وہمی اور خار کو حقیقی سمجھنے لگا - اس کو ذکی الحس ہونے کی وجہ سے تمام مرغان چمن کا درد جگر محسوس ہونے لگا - لالے کے اندر اس کو کسی بے گناہ کے خون کا داغ دکھائی دینے لگا - گل کو چاک پیرہن اور عندلیب کو نوحہ گر سمجھا - بہار کو سیمیا اور جوے آب کو سراب تصور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تمام چمن کی اساس فریب اور رنج و محن پر ہے - اس درد جاں کاہ سے اس نے ایسا نالہ کیا کہ اس کی نوا خون بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑی - حسن اتفاق سے ایک ہدہد نے اس کی آہ و فغاں کو سنا ' اس کو رحم آیا اور اس کا کانٹا اپنی منقار سے نکال دیا اور اس کو نصیحت کی کہ آہ و نالہ نہیں کرنا چاہیے - زندگی کی اصل بد نہیں لیکن اس کی فطرت یہ ہے کہ اس میں گوہر سود جیب زیاں کے اندر رہتا ہے - گل اپنے شگاف سینہ سے زر ناب پیدا کرتا ہے - درد آشنا ہونا ہی درد کا علاج ہے - اگر تو کانٹوں کا خوگر ہو جائے تو خود سراپا چمن بن جائے -

پیام مشرق میں ایک اور نظم نطشے پر ہے جس کے نیچے اقبال نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا ہے جو مفصلہ ذیل ہے :—

"نطشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے - اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے - گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں - قلب او مومن دماغش کافر است - نبی کریم صلعم نے اس قسم کا جملہ امیّہ ابن الصّلت عرب شاعر کی نسبت فرمایا ۱-۲ - آمن لسانہ و کفر قلبہ"

یہ فقط چار اشعار کی ایک چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس میں ہر شعر نطشے کے فلسفے کے کسی ایک پہلو کا صحیح آئینہ ہے - اس کے علاوہ

ان اشعار میں اقبال نے اپنا زاویۂ نگاہ نطشے کی تعلیم کی نسبت بڑی خوبی سے پیش کر دیا ہے اور ضمناً یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام کی تعلیم سے اس کی تعلیم کو کس قسم کا تعلق ہے۔

گر نوا خواہی ز پیش او گریز　　در نئے کلکش غریو تندر است

نیشتر اندر دل مغرب فشرد　　دستش از خون چلیپا احمر است

آں کہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت　　قلب او مومن دماغش کافر است

خویش را در نار آں نمرود سوخت

زاں کہ بستان خلیل از آذر است

اس کی آواز ایک کڑکا اور ایک گرج ہے۔ شیرینی نوا کے طالب کو اس سے گریز کرنا چاہیے۔ اس کی صریر قلم تلوار کی جھنکار ہے۔ عیسائیت کے خون سے اس کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنا بت خانہ اسلام کی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کا دل مومن ہے اور دماغ کافر۔ تو اس نمرود کی آگ میں بے دھڑک داخل ہوجا۔ اگر تجھ میں ایمان خلیل ہے تو تو جلے گا نہیں بلکہ یہی آگ تیرے لیے بوستاں بن جائے گی۔

یہ اشعار کسی قدر مزید تشریح کے طالب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نطشے نے مسیحیت پر جو حملہ کیا اس کی بنا کیا تھی؟ آزاد خیال لوگوں نے سائنسدانوں نے' عقلیت کے پرستاروں نے' دہریوں اور ملحدوں نے نطشے سے قبل اور نطشے کے بعد عیسائیت پر کئی طرف سے حملے کیے ہیں لیکن نطشے نے جس پہلو سے حملہ کیا ہے اور جس جرأت سے حملہ کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کسی نے کلیسا کے استبداد اور حریت کشی پر حملہ کیا' کسی نے معجزات اور کرامات پر' کسی نے مسیح کی پیدایش اور موت کے افسانوں کو جھٹلایا' لیکن مسیحیت کے خلاف اور اس کے نظریۂ حیات کو کسی نے اس

طرح انسانیت اور ارتقا کا دشمن قرار نہیں دیا جس طرح کہ نطشے نے - وہ مسیحیت کو غلاموں کی ایک بغاوت قرار دیتا ہے جس نے شجاعانہ اور آقایانہ اخلاق کی تمام اقدار کو تہ و بالا کر دیا ' یونان اور روما کی تہذیب کے بہترین عناصر اس سے تباہ ہو گئے اور ارتقائے حیات میں ایک بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی - تمام انسان مساوی ہیں' تمام انسان گنہ گار پیدا ہوتے ہیں' عقل اور علم کے مقابلے میں جہالت خدا کو زیادہ پسند ہے' غلام آقا سے بہتر ہے' جنت مفلسوں' ناداروں اور کمزوروں کے لیے ہے' قوت گناہ ہے اور عجز سب سے بڑی نیکی' یہ جسم یہ مادہ اور یہ دنیا ذلیل ہے اور بعد میں آنے والی دنیا اصل ہے: نطشے کے نزدیک اس قسم کی تعلیم غلاموں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے اور غلاموں ہی کے لیے موزوں ہو سکتی ہے اور غلام ہی اس کو سمجھ سکتے اور اس کی داد دے سکتے ہیں - جب تک انسان اس تعلیم کو بیخ و بن سے نہ اُکھاڑ دے وہ جسمانی اور روحانی موت میں سے نہیں نکل سکتا - نطشے کا یہ حملہ مسیحیت پر اسی زاویۂ نگاہ سے کیا گیا ہے جس زاویۂ نگاہ سے اسلام نے مسیحیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا - "لا رهبانية فی الاسلام" اسی نقطۂ نظر کے خلاف جہاد کا اعلان تھا - نطشے نے مذاہب کی جو تقسیم کی ہے کہ مذاہب فقط دو قسم کے ہیں' اثبات حیات کے مذاہب اور نفی حیات کے مذاہب' یا خود نطشے کے الفاظ میں' زندگی کو 'ہاں' کہنے والے اور زندگی کو 'نہیں' کہنے والے؛ اس تقسیم میں بدھ مت اور مسیحیت زندگی کو 'نہیں' کہنے والوں میں ہیں اور اسلام زندگی کو 'ہاں' کہنے والوں میں - نطشے کسی مذہبی تعلیم سے اس حقیقت تک نہیں پہنچا' وہ مذہب سے بیزار ہے اور مذہب کے خدا سے بھی بیزار اور اس کا منکر' باوجود اس کے اس کی نظر فطرت حیات کے متعلق ایسی صحیح ہے کہ بقول اقبال وہ کافرانہ انداز سے اسلام کے زاویۂ نگاہ پر آگیا

ہے - اقبال کو نطشے کی تعلیم کا وہی پہلو پسند ہے جو اسلام کی تعلیم کا ایک امتیازی عنصر ہے - اسلام کے اس پہلو سے متاثر ہونے کی وجہ سے اقبال نے نطشے کا اثر قبول کیا - اسلام نے جہاد کو ایمان کا ثبوت قرار دیا اور کہا کہ جہاد ہی اس امت کی رہبانیت ہے - زندگی باوجود اس کی کلفت اور کشاکش کے اسلام کے نزدیک ایک نعمت ہے جس میں قوت اور جمال پیدا کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے - اسلام نے فطرت کو صحیح سمجھا اور اپنے آپ کو بھی فطرت قرار دیا اور کہا کہ انسان اسی فطرت پر خلق کیا گیا ہے - ارتقائے حیات' علوّ آدم' تسخیر فطرت' احترام حیات' جسم اور مادے کو روحانیت کا معاون سمجھنا' حصول قوت کی کوشش' یہ تمام چیزیں اسلام اور نطشے کی تعلیم میں بہت حد تک مشترک ہیں گو انداز بیاں بہت مختلف ہے - اسلام اِن تمام نظریوں کو توحید کے عقیدے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور انہیں اسی عقیدے کے مشتقات کے طور پر پیش کرتا ہے - نطشے نہ خدا سے شروع کرتا ہے اور نہ خدا پر ختم کرتا ہے - اس کی نظر فقط فطرت اور انسان کے ممکنات تک محدود ہے - لیکن جہاں تک اس کی نظر جاتی ہے وہاں تک صحیح ہے - اقبال کو نطشے کا کفر بھی بہت ناگوار نہیں ہے - سست مومن سے جری کافر بہتر ہے - کسی صوفی شاعر کا ایک مشہور شعر ہے جو نطشے کی آواز معلوم ہوتا ہے :—

خود را نہ پرستیدۂ عرفاں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذت ایماں چہ شناسی

اقبال کو نطشے کی ظلمات کفر چشمۂ حیات کی طرف لے جانے والی تاریکی معلوم ہوتی ہے - اس کے قلب کا مومن ہونا اقبال کے لیے ایسا دل کش ہے کہ اس کے دماغ کے کافر ہونے سے وہ نہیں گھبراتا - اقبال کے فلسفے میں اصل چیز دل

ہے' دماغ نہیں؛ روح حیات عشق ہے' عقل و استدلال نہیں اور عشق کا کام آزادی اور تخلیق اور علوّ درجات' تسخیر کائنات اور ارتقائے لامتناہی ہے۔ یہ سب چیزیں نطشے کے افکار پریشان میں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک نطشے ایک دیوانہ ہے جو شیشہ گروں کی کارگاہ میں لٹھ لے کر گھس گیا ہے اور تمام سامان فریب کو اس نے چکنا چور کر ڈالا ہے۔ اگر اس کا لٹھ کچھ مقدس ظروف پر بھی پڑ گیا ہو تو قابل معافی ہے۔

جاوید نامے میں اقبال مولانا روم کی رہبری میں جب 'آں سوئے افلاک' پہنچ گیا تو ایک مقام پر نطشے سے بھی ملاقات ہوئی۔ اقبال' رومی اور نطشے کا عالم خیال میں ایک مقام پر جمع ہو جانا خود اقبال کی نفسی ترکیب پر روشنی ڈالتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں 'آں سوئے افلاک' نہیں بلکہ ایں سوئے افلاک خود اقبال کے دل کے اندر جمع ہیں۔ لیکن خود دل کی حقیقت اگر آں سوئے افلاک ہے تو یہ مقام ملاقات بالکل صحیح ہے۔ کسی کا ایک بڑا بلیغ شعر ہے:—

دل منزل خود آں طرف ارض و سما داشت
وہم است ترا ایں کہ بہ پہلوئے تو جا دشت

اقبال نے نطشے سے متاثر ہو کر بہت سے اشعار لکھے ہیں اور خود نطشے پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں اور ان میں اس کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس نظم میں اس نے نطشے کے متعلق ایک انوکھا پہلو اختیار کیا ہے جو فقط وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جو اسلامی تصوف' اس کی نفسیات اور اس کی تاریخ سے آشنا ہو۔ نطشے اپنی عمر کے آخری حصے میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ آج تک سوانح نگاروں اور نقادوں میں یہ بحث چلی جاتی ہے کہ آیا دیوانگی کے بالکل ظاہر اور نمایاں ہو جانے سے

قبل بھی وہ نیم دیوانہ تھا یا نہیں - اس کی تصانیف میں جو بے ربطی اور تناقض اور کیفیات کے انقلاب پائے جاتے ہیں ان کو اسی امر پر محمول کیا جاتا ہے کہ ہر وقت اس کے ہوش ٹھکانے نہیں ہوتے تھے - وہ مسلسل اور منظم انداز سے سوچ نہیں سکتا تھا - اس کا تخیل دیوانگی کی وجہ سے بے عنان ہو جاتا تھا اور اس کے جذبۂ حیات کی وہی کیفیت تھی جس کو غالب نے اس مصرعے میں بیان کیا ہے :— ع شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے - اقبال نے اسلامی تصوف کی نفسیات کے ماتحت نطشے کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ مجذوب تھا' مجنون نہیں تھا - مجذوب اور مجنون کی یہ تفریق مغرب کی نفسیات اور طب میں موجود نہیں - اقبال نے نطشے کی کیفیت نفسی کو مجذوبیت کے ماتحت بڑے لطیف پیرایوں میں بیان کیا ہے - وہ اس کو 'حلاج بے دار و رسن' کہتا ہے - منصور نے بھی حق کو انائے انسانی میں ضم کر دیا تھا - اس کے زمانے کے ملاؤں اور فقیہوں نے اس کو کافر قرار دے کر مصلوب کردیا - لیکن جب تصوف کی چاشنی عالم اسلام میں عام ہوگئی اور ہر ملا اور عالم کو صوفی بننے یا صوفی کہلانے کا شوق ہوا تو منصور کا درجہ اس قدر بلند ہوا کہ تصوف اور متصوفانہ شاعری میں وہ بلندی نظر' حقیقت عرفان اور اتصال الی الحق کی مثال بن گیا - اقبال کے نزدیک نطشے کا حق کو انسان کامل یا فوق الانسان کا مرادف قرار دینا وہی حلاج ہی کی قسم کی بات تھی لیکن انداز گفتار میں فرق تھا :—

باز ایں حلاج بے دار و رسن نوع دیگر گفت آں حرف کہن
حرف او بے باک و افکارش عظیم غربیاں از تیغ گفتارش دو نیم

اقبال کو اس کا افسوس ہے کہ عشق و مستی سے بے نصیب عاقلان فرنگ نے اس کی نبض طبیب کے ہاتھ میں دے دی' اس کا علاج ابن سینا سے نہیں

ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے کسی مرشد کامل اور مرد راہ داں کی ضرورت تھی جس کے ظہور کے لیے مغرب کی عقلیت کی سر زمین موزوں نہیں، اس کے جوش حیات کو صحیح راستہ نہ مل سکا اس لیے اس نے ایک زلزلے اور سیلاب کی صورت اختیار کرلی۔ اس کی شراب اپنی تیزی کی وجہ سے مینا گداز ہو گئی۔ اس کا نغمہ اس کے تار چنگ سے افزوں ہو گیا۔ اس کے سوز نے ساز کو توڑ ڈالا ــــ

عاشقے در آہ خود گم گشتۂ    صادقے در راہ خود گم گشتۂ

مستی او ہر زجاجے را شکست    از خدا ببرید او ہم از خود گسست

وہ جمال و جلال، قاہری اور دلبری کا اختلاط چاہتا تھا۔ صحیح ترکیب امتزاج سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے قاہری دلبری پر اور جلال جمال پر غالب آگیا۔ سالک راہ شناس نہ ہونے کی وجہ سے وہ راستہ بھول گیا۔ پہلے وہ خدا سے منقطع ہوا، اس کے بعد اپنے آپ سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ جو کیفیت معراج قلب سے پیدا ہوتی ہے اس کو وہ آب و گل کے ارتقا میں تلاش کرتا تھا۔ وہ عروج نفس میں مقام کبریا ڈھونڈھتا تھا لیکن اس مقام کو عقل و حکمت کے ذریعے سے تنازع للبقا میں تلاش کرتا تھا۔ جہاں تک نفی ماسوا کا تعلق ہے وہ صحیح راستے پر تھا لیکن استحکام خودی میں لا سے الاّ کی طرف قدم نہ اُٹھا سکا، نفی میں گُم ہو گیا، اثبات تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ تجلی سے ہم کنار تھا لیکن بے خبر تھا۔ موسیٰ کی طرح وہ بھی طالب دیدار تھا لیکن دیدار الٰہی کی طلب سے اِدھر اُدھر دیدار آدم کی طلب میں رہ گیا۔ اگر شیخ احمد سرہندی کی قسم کا مرشد، روح کے احوال و مقامات سے واقف اس کو مل جاتا تو وہ رویت الٰہی تک اس کو لے جاتا لیکن افسوس کہ وہ اپنی عقل ہی کے بھنور میں چکر کھاتا رہا۔ اس نظم میں اقبال نے نطشے کے متعلق افسوس

کہا ہے کہ وہ مرشد کامل نہ مل سکنے کی وجہ سے سالک ہونے کے بجائے مجذوب ہو گیا - کاش کہ اس کو کوئی ایسا مرشد مل جاتا -

بال جبریل میں ایک غزل میں نطشے کی نسبت اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کو خیال ہوتا ہے کہ میں خود بھی اس کا مرشد بن سکتا تھا —

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اِس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اس شعر پر اقبال نے ایک نوٹ لکھا ہے - ''وہ جرمن کا مشہور مجذوب و فلسفی نطشے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اُسے غلط راستے پر ڈال دیا -''

بال جبریل میں صفحہ ۲۲۱ پر یورپ کے عنوان کے تحت دو اشعار ہیں جن میں اقبال نے نطشے کے اس خیال کو نظم کیا ہے کہ اگر یورپ میں اور کچھ عرصے تک سرمایہ داری کا دور دورہ رہا تو تمام یورپ یہودیوں کے پنجۂ اقتدار میں آجائے گا —

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

آزادی افکار کے خطرے کے متعلق بال جبریل میں جو نظم ہے اس میں بھی اقبال نے نطشے ہی کے اس خیال کو اپنے خاص رنگ میں بیان کیا ہے کہ آزادی افکار فقط بلند قسم کے انسانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے - دونی فطرت اور بے ضبطی قلب کے ساتھ آزادی افکار تباہی کا باعث ہوگی -

ضرب کلیم میں صفحہ ۴۰ پر مہدیٔ برحق کے متعلق اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں اس میں ایک طرف اس زمانے کے بعض سست عناصر مدّعیان نبوت اس کے سامنے ہیں جو حقیقی نبوت کے راستے ہی پر نہیں پڑے - ایسوں کو اقبال مسیلمۃ ہی سمجھتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر نطشے پر بھی ہے - اس کو وہ جھوٹا نہیں سمجھتا بلکہ بھٹکا ہوا نبی خیال کرتا ہے - مہدیٔ برحق کے لیے وہ ایک شرط یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ زلزلۂ عالمِ افکار ہو، محض دیہاتی مناظرے کرنے والا کتاب ساز اور کتاب فروش نہ ہو - نہ وہ مقلد ہو اور نہ محض افکار کہن کا مجدد - زلزلۂ عالمِ افکار لکھتے ہوئے یقیناً نطشے اقبال کے مدنظر ہے - اقبال کی گفتگو میں بھی جب جدید زمانے کے مدّعیان نبوت کا ذکر ہوتا تھا تو نطشے کو بھی اس فہرست میں داخل کیا جاتا تھا اگرچہ نطشے نے کوئی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی امت بنانا چاہی -

باوجود مدّاحی اور اثر پذیری کے حقیقت ہے کہ اقبال کبھی نطشے کا پورے طور پر پیرو نہیں رہا - نطشے کے افکار کا ایک حصہ اقبال کو بہت حیات افروز معلوم ہوا - کچھ تو نطشے کا فلسفۂ خودی اقبال کی اپنی طبیعت کے موافق تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ اپنی ہمت باختہ قوم کے اِحیا کے لیے وہ اس حربے سے کام لینا چاہتا تھا - اقبال نے بہت سے حکما و صوفیا سے فیض حاصل کیا لیکن اپنے فلسفۂ خودی کے مطابق وہ پوری طرح کبھی کسی کا مقلّد نہیں ہوا - ہر بڑے مفکر کے ساتھ وہ کچھ دور تک چلتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کو چھوڑ کر پھر اپنی راہ پر پڑ جاتا ہے - اسرار خودی میں جو اثرات مغربی فلسفے کے نمایاں ہیں ان میں صرف نطشے کا ہی فلسفہ نہیں ہے بلکہ المانوی فلسفی فشتے اور فرانسیسی یہودی فلسفی برگساں کے افکار

بھی ملتے ہیں - خودی کے فلسفے کی تاسیس میں صفحہ ۱۲ پر جو اشعار ہیں وہ فشتے سے ماخوذ ہیں جس کا فلسفہ یہ تھا کہ عین ذات یا حقیقت وجود ایک 'انائے ساعی' ہے - عمل اس کی فطرت ہے - اخلاقی عمل اور پیکار اور نشو و نما کے لیے اس نے اپنا غیر یا ماسوا پیدا کیا تا کہ امکان پیکار اور اس کے ذریعے سے امکان ارتقا ممکن ہو جائے - اس فلسفے کو جوں کا توں اقبال نے ایسے بلیغ و رنگین انداز میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ فلسفے کا خشک صحرا گلزار ہو گیا ہے - مفصلہ ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے :—

پیکر ہستی ز آثار خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیدا ست از اثبات او
در جہاں تخم خصومت کاشت است خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکر اغیار را تا فزاید لذت پیکار را
می کشد از قوت بازوئے خویش تا شود آگاہ از نیروئے خویش
خود فریبی ہائے او عین حیات ہمچو خوں از گل و ضو عینِ حیات
بہر یک گُل خون صد گلشن کند از پئے یک نغمہ صد شیون کند

---

عذر ایں اسراف و ایں سنگیں دلی خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغ یک محمد برفروخت

یہ سب فشتے کا فلسفۂ انا اور فلسفۂ حیات ہے - جہاں تک افکار اقبال کی اساس کا تعلق ہے اقبال بہ نسبت نطشے کے فشتے سے زیادہ متاثر ہے - فشتے کی کشمکش حیات میں اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے جو نطشے میں اس قدر نمایاں نہیں - فشتے ایک خاص انداز کا موحّد ہے اور نطشے منکر خدا ہے —

اسرار خودی میں نطشے کے زیر اثر جو نظمیں لکھی گئی ہیں اب ان پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اقبال پر نطشے کا اثر کس انداز کا ہے - صفحہ ۲۵ پر افلاطون پر جو تنقید ہے وہ نطشے سے ماخوذ ہے - افلاطون اس عالم محسوس سے ماوریٰ ایک ازلی اور ابدی غیر متغیر عالم عقلی کا قائل تھا- اس متحرک اور متغیر اور محسوس زندگی کو مقابلتاً غیر اصلی سمجھتا تھا- اس کا اثر عیسوی اور اسلامی فلسفے اور تصوف پر بہت پایدار اور بہت گہرا ہے - اسلامی تصوف میں جو افکار بعض اکابر صوفیا کے نام کے ساتھ منسوب ہیں وہ حقیقت میں یا افلاطون کے افکار ہیں یا اس کے افکار کے مشتقات ہیں - محی‌الدین ابن عربی کی 'فصوص الحکم' کا بیشترین حصہ اسی سے ماخوذ ہے اور فلسفۂ اشراق کی بنیاد بھی افلاطونی ہے - اسلامی دینیات اور تصوف میں یہ چیزیں اس طرح سما گئیں اور سموئی گئیں کہ اب ان کو اصل اسلام سے علیحدہ کرنا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا ہے - یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نطشے کا یہ خیال تھا کہ افلاطون اور سقراط کے اثر سے جو فلسفہ اور تہذیب اور فن لطیف پیدا ہوئے ہیں۔ وہ سب انحطاطی ہیں اور جب تک اُن کا قلع قمع نہ کیا جائے اس پھڑکتی ہوئی اور دھڑکتی ہوئی فطرت کو اصل سمجھنا دشوار ہے - افلاطون کا اثر جس انداز میں عیسائیت اور مغربی علوم و فنون میں ملتا ہے اس سے کچھ ملتا جلتا اثر اسلامیات میں بھی پایا جاتا ہے - افلاطون پر نطشے کے انداز کی تنقید کرنے کے بعد اقبال اسلامی ادبیات کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کو عجمی ادبیات میں بھی وہ رنگ ملتا ہے جس کو وہ انحطاط کی علت اور اس کا معلول قرار دیتا ہے - جوش جہاد میں اقبال نے حافظ پر بھی حملہ کر دیا جس سے حافظ کے پرستاروں میں بہت ہل چل مچی اور انہوں نے بہت سخت الفاظ میں اقبال

کے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی - اقبال نے حافظ کی نسبت کہہ دیا تھا کہ :—

مارِ گلزارے کہ دارد زهر ناب صید را اول همی آرد بخواب

نطشے کی طرح اقبال بھی اس خواب آور فن لطیف کے بہت خلاف تھا - افلاطون کے ساتھ اس نے حافظ کو بھی عجمی ادبیات کا نمونہ سمجھ کر ہدفِ تنقید بنایا - لیکن قوم کے براگیختہ ہونے سے اقبال نے اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں سے حافظ کا نام نکال دیا - میں نے اقبال سے اِس کے متعلق دریافت کیا - فرمانے لگے کہ " خیالات میرے وہی ہیں ' میں نے مصلحتاً حافظ کا نام نکال دیا ہے کیونکہ اِس میں خدشہ یہ ہے کہ اِس مخالفت کی وجہ سے لوگ کہیں میرے نظریے ہی کے مخالف نہ ہو جائیں - اگر وہ حافظ کو ایسا نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں لیکن ادبیات کے متعلق میرے اِس نظریے پر غور کریں"

اسرار خودی میں صفحہ ۴۴ پر خودی کے جو تین مراحل بیان کیے گئے ہیں ان میں بھی نطشے کا کسی قدر اثر ہے - اقبال نے یہ عنوان تجویز کیا ہے کہ " تربیت خودی را سہ مراحل است - مرحلۂ اول را طاعت و مرحلۂ دوم را ضبط نفس و مرحلۂ سوم را نیابت الہی نامیدہ اند " -

اِن مراحل میں مرحلۂ اول میں خودی کو شتر قرار دیا ہے - یہ خیال بعینہ نطشے سے ماخوذ ہے - باقی دو مراحل اقبال نے اسلامیات سے لیے ہیں - نطشے کے ہاں بھی مراحل تین ہیں - وہ کہتا ہے کہ روح حیات تین مراحل میں سے گزرتی ہے یا یوں کہو کہ تبدیلی ہیئت میں وہ یکے بعد دیگرے تین ہیئتیں اختیار کرتی ہے - پہلی ہیئت میں وہ اونٹ ہے ' دوسری میں شیر اور تیسری میں بچہ - ہیئت اُشتری میں روح نہایت صبر اور جبر سے اپنے اوپر فرائض اور اوامر و نواہی کا بوجھ لاد لیتی ہے - اس کے بعد جبر اور

بار برداریؔ احکام میں سے نکل کر وہ جب ہیئت اختیاری میں آتی ہے تو شیر ہو جاتی ہے - اِس کا اپنا آزاد ارادہ ہی قانون حیات بن جاتا ہے - لیکن نئی اقدار کے پیدا کرنے کے لیے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تیسری ہیئت طفلی ہو جس میں معصومیت اور نسیان کی ضرورت ہے - پہلے مراحل کو بالکل بھول جائے ، زندگی کو ایک کھیل سمجھے ، نئے سرے سے اس کا آغاز کرے ، گردش ایام کے پہئے کو بازیچہ سمجھ کر گھمائے - ایک مقدس اثبات خودی - نئی زندگی کی ایک نئی علت - اس طرح کہ وہ کسی پہلی چیز کی معلول نہ ہو -

اقبال نے نطشے کے تین مراحل میں سے صرف مرحلۂ اُشتری کو لے لیا - قرآن کریم نے بھی ہیئت اُشتری کی طرف توجہ دلائی ہے - فانظر الی الابل کیف خلقت - دیکھو اونٹ کی طرف کہ وہ کس طرح بنایا گیا ہے - اسلامی تہذیب و تخیل میں اونٹ علامت ملّی کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تین مراحل میں سے دو مراحل اطاعت اور ضبط نفس دونوں اس میں پائے جاتے ہیں -

نطشے کے ہاں جو مرحلۂ شیری ہے اس کو اقبال نے دوسری جگہ بیان کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس کو نظر انداز کردیا ہے - نطشے کے ہاں اقبال کی نیابت الٰہی کی جگہ ایک خلق جدید اور ایک آغاز نو ہے جس کو وہ انداز طفلی سے تعبیر کرتا ہے -

اسرار خودی کے صفحہ ۶۲ اور ۶۳ پر ریزۂ الماس اور شبنم پر جو اشعار ہیں وہ براہ راست نطشے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں - ایک پرندہ ریزۂ الماس کو شبنم سمجھ کر چاٹنے لگا - لیکن اس کی سختی کی وجہ سے شکست کھا گیا - اس قسم کا مضمون اقبال نے 'ابوالعلا معرّی' والی نظم میں بھی بیان کیا ہے - معرّی مذہباً آزاد خیال شخص تھا - گوشت نہیں کھاتا تھا - کسی نے

پھلا ھؤا تیتر اس کو بھیجا کہ شاید اس کے منہ میں پانی بھر آئے لیکن وہ
تیتر کو مخاطب کرکے پوچھنے لگا کہ کیوں بھائی کس قصور میں یہ سزا ملی؟
خود ھی جواب دیتا ہے کہ یہ کم زور ہونے کی سزا ہے - اگر شاہین ہوتا تو خود
شکار ہونے کے بجائے دوسروں کا شکار کرتا - زندگی میں کم زور ہونا ہی
سب سے بڑا جرم ہے - اسی طرح 'الماس و زغال' والی نظم کا مضمون نطشے
سے ماخوذ ہے - کیمیاوی لحاظ سے ہیرا اور کوئلہ ایک ہی چیز ہے - ایک میں
مرورِ ایّام سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کہ وہ کمال سختی کی وجہ سے
ہیرا بن جاتا ہے - سخت جانی سے زندگی میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے -
دوسرا نرم رہنے کی وجہ سے تیرہ رو رہتا ہے - نطشے کی اخلاقیات کا
اصولِ اوّلین جو اس کے مذہب کا کلمہ ہے یہ ہے کہ 'سخت ہو جاؤ' - اس
اصول کی تشریح میں نطشے نے بھی اس قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے -

اسرار خودی میں مغربی مفکرین میں سے تین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا
ہے - اساس خودی کا بیان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے' نطشے سے ماخوذ ہے -
استحکام خودی' سخت کوشی اور سختی پسندی کا فلسفہ نطشے کا ہے لیکن
حقیقت وقت اور سیلان حیات کے متعلق جو اشعار یا نظمیں ہیں' وہ برگساں
سے ماخوذ ہیں - برگساں کا اثر اقبال پر اسرار خودی کے بعد بھی قائم رہا -
افسوس ہے کہ اسرار خودی میں اقبال نے برگساں کا نام نہیں لیا اور اس کا
تمام فلسفۂ وقت حضرت امام شافعی کے ایک قول کے ماتحت نظم کر دیا
ہے - حضرت امام شافعی کے قول کے تحت میں کوئی فلسفہ نہیں تھا - جو
فلسفہ اقبال نے برگساں سے لے کر اس قول کی تفسیر میں پیش کر دیا ہے
وہ خود امام صاحب کی سمجھ میں نہ آتا - ان کا تدیّن اور تورّع ایسے افکار
سے بہت گریزاں تھا - برگساں کا یہ فلسفہ توحید کے مقابلے میں دہریت سے زیادہ

# اقبال اور آرٹ

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس)
جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد

اقبال کی طبیعت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جو تھی اور اس کی شخصیت میں ایسے مختلف عناصر جمع ہو گئے تھے جو عام طور پر کسی ایک شخص کی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں - اس کے ذہن اور اس کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی - اس کے جمال پرست اور عشق پرور دل نے اپنے تخیل کی گلکاریوں سے اپنی ایک الگ دنیا آباد کرلی تھی - اس دنیا کی خیالی تصویر میں اس نے اپنے جذبات کے موقلم سے ایسی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کیا کہ انسانی نظر جب اس تصویر پر پڑتی ہے تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیتی - اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے - اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفان جو، صداقت پسند اور نظم آفریں روح تھی جو جذبۂ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظام قایم کرنا چاہتی تھی - وہ شاعر بھی تھا اور حکیم نکتہ داں بھی - اس کے ہاں درد و سوز بھی ہے اور رندی و مستی بھی، نصیحتیں بھی ہیں اور دین و تمدن کی تعلیم بھی، عقل و عشق کی ابدی کشمکش کا بیان بھی ہے اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی نقاشی بھی - اس کی نظر حقیقت اور مجاز دونوں کو

بے نقاب کرتی ہے - کبھی وہ والہانہ انداز میں جذبات انسانی کی ترجمانی کرتا ہے اور کبھی اپنے افکار عالیہ سے حیات و تقدیر کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہے - وہ کبھی زندگی کے قافلے کو طوفان و ہیجان کی منزل کی طرف بڑھائے لیے جاتا ہے اور کبھی اپنے علم پرور اور حکیمانہ مشوروں ضبط نظم کی تعلیم دیتا ہے - غرض کہ زندگی کی ہنگامہ زائیوں کے کوئی اسرار اس کی بصیرت سے پوشیدہ نہیں - اس کی شاعری اور زندگی کے مختلف رخ اپنے اندر اس قدر وسعتیں پنہاں رکھتے ہیں کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کا علیحدہ علیحدہ اور مجموعی طور پر استقصا کیا جائے - یہ کام اس وقت ہو سکے گا جب کہ ہماری قوم کے بہترین دل و دماغ اس کے پیغام کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لیے عرصہ تک اپنے تئیں مصروف رکھیں گے - اقبال کا آرٹ حسن و عشق کے اسرار کا حامل ہے اور علم و معرفت کے جو خزانے اس کے اندر پوشیدہ ہیں' ان تک پہنچ صرف انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جنھوں نے اپنے دل و دماغ پر وہ کیفیات طاری کرنے کی کوشش کی ہے جو اُس پر گزر چکی ہیں -

اقبال کی زندگی مجمع البحرین تھی جس میں مشرق و مغرب کے علم و حکمت کے دھارے آکر مل گئے تھے - اس کی شخصیت جامع کمالات تھی - اس کا کلام اس کے دل و دماغ کی غیر معمولی اور لازوال قوتوں کا آئینہ دار ہے - اس نے عہد جدید کے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے' جسے وہ مرد مسلم کہتا ہے' وہ ایسا جان دار تصور ہے کہ ہمیشہ زندہ رہے گا - جتنا زمانہ گزرے گا اتنی ہی اس کے کلام کی تاثیر بڑھتی جائے گی - ادب اس کے جذبات کی قدر کرے گا' فلسفہ اس کے تخیل و وجدان سے بصیرت اندوز ہوگا اور سخن آرائی اس کی نازک خیالی پر وجد کرے گی - اقبال کی طبیعت میں جو ہمہ گیری تھی اس کی مثالیں تاریخ ادب میں بہت کم ملتی ہیں - اس کی زندگی

اور شاعری کا ہر پہلو اپنے اندر بے پایاں دلکشی رکھتا ہے - بقول نظیری :-

ز پائے تا بسرش هر کجا که می نگرم
کرشمہ دامن دل می‌کشد که جا این جا ست

ادبیات عالم کی تاریخ میں شاذ و نادر ایسی مثال ملے گی کہ کسی دوسرے شاعر نے اقبال کی طرح اپنے دلاویز نغموں سے اتنی بڑی جماعت پر جیسی کہ مسلمانان هند کی جماعت ہے ' اتنا گہرا اثر چھوڑا ہو - اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اقبال نے زندگی کے ان مہتم بالشان حقایق کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا جو قوموں اور جماعتوں کی سیرت کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتے اور انہیں فلاح و سعادت کی طرف لے جاتے ہیں - اگر چہ وہ خود زمین مردہ میں پیدا ہوا جیسا کہ اس نے "پیام مشرق" میں اپنا اور المانوی شاعر گوئٹے کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

او چمن زادے چمن پروردۂ　　من دمیدم از زمین مُردۂ

لیکن اس نے اپنے پیغام کے طلسم سے ایک پوری قوم کی رگوں میں زندگی کی لہر پیدا کردی -

اقبال نے مختلف موقعوں پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں - اس نے اپنی قوم سے شکایت کی ہے کہ :-

او حدیث دلبری خواهد ز من　　رنگ و آب شاعری خواهد ز من
کم نظر بے تابئ جانم ندید　　آشکارم دید و پنهانم ندید

اس سے دراصل اس کی مراد یہ ہے کہ وہ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں برتتا بلکہ اس کو اپنے مخصوص مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ تصور کرتا ہے † -

† وکٹر هیوگو نے "آرٹ برائے آرٹ" (l'art pour l'art) کی اصطلاح کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس نے اس کو استعمال کیا تھا - لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے - اس نے

بقیہ بر حاشیہ ۸۴۰

چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۳۹
سنہ ۱۸۶۴ ع میں شیکسپیئر کے فرانسیسی ترجمے پر ایک نہایت جامع دیباچہ لکھا تھا جس میں اس نے لکھا ہے :—

" ۳۵ سال کا عرصہ ہونے آیا ( یعنی سنہ ۱۸۲۹ ع میں ) کہ ایک روز والتیر کے المیہ ناٹکوں کے متعلق ایک صحبت میں بعض شاعروں اور نقادوں میں بحث ہو رہی تھی - میں بھی وہاں موجود تھا - میں نے کہا کہ والتیر کے ناٹکوں میں اشخاص ایک دوسرے سے باتیں نہیں کرتے ' بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک فقرہ دوسرے فقرے سے باتیں کر رہا ہو - اس کے ہاں ہمیں خالص آرٹ برائے آرٹ کی مثالیں ملتی ہیں - غیر دانستہ طور پر میرے الفاظ " آرٹ برائے آرٹ " مناظرہ اور حجت کے لیے ایک اصول موضوعہ بن گئے " - لیکن شاید وکٹر ہیوگو کو اس کا علم نہ تھا کہ اس سے قبل یہی الفاظ وکٹر کوزین نے اپنے ایک لکچر میں استعمال کیے تھے :- " آرٹ نہ مذہب و اخلاق کی خدمت کے لیے ہے اور نہ اس کا مقصد مسرت و افادہ ہے......مذہب مذہب کی خاطر ہونا چاہیے ' اخلاق اخلاق کی خاطر اور آرٹ آرٹ کی خاطر - نیکی اور پاکبازی کے راستے سے افادہ اور جمال تک پہنچ نہیں ہو سکتی - اسی طرح جمال کا مقصد افادہ یا نیکی یا پاکبازی نہیں ہے - جمال کا راستہ جمال ہی کی منزل کی طرف رہبری کر سکتا ہے " - ( ملاحظہ ہو پال استایفر کی کتاب " مذہبی اور جمالیاتی مسائل " (Questions esthetiques et religieuses) - ص ۲۷

وکٹر کوزین پر کانٹ کے فلسفے کا بہت اثر تھا - چنانچہ اس نے کانٹ کے اس خیال پر کہ آرٹ کے لیے بے تعلق و بے غرض ہونا ضروری ہے اور مزید حاشیہ چڑھایا اور اپنی خطابت و ذہانت سے اسے ایک مستقل مسئلہ بنا دیا -

انیسویں صدی کے وسط میں یورپ کے تمام ادبی حلقوں میں اس مسئلے پر بڑی زور و شور کی بحثیں رہیں کہ آیا آرٹ آرٹ کے لیے ہے یا زندگی کے لیے - خود وکٹر ہیوگو اس کا قائل تھا کہ آرٹ زندگی کے لیے ہے ' آج تک مغربی ادب میں ان دونوں مسلکوں کے ادبی متبع اور حامی برابر چلے آرہے ہیں - اس ادبی مسلک کو کہ آرٹ زندگی کے لیے ہے ' فرانسیسی حکیم اور ادیب ماری ژان گویو نے اپنی تصانیف میں مستقل نظام خیال کے تحت پیش کیا ہے - رسکن اور ٹالسٹائے دونوں نے ' جو گویو کے ہمعصر تھے ' بڑی حد تک اپنے خیالات گویو کی تصانیف سے لیے اور ان کی اشاعت کی - گویو کی تصانیف جن میں اس مسئلہ پر بحث ہے ' یہ ہیں -

(1) L'Art au point de vue Sociologique.
(2) Les problemes de l'esthetique contemporaine.

اقبال اپنے آرٹ کے ذریعے اجتماعی وجدان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا ہے ۔ وہ آرٹ کی مہمیز سے اپنے 'ہمرہانِ سست عناصر' کو منزل مقصود کی جانب تیز گام دیکھنے کا متمنی ہے - اس کے نغمہ کی دل کش صدا اس کے ساتھیوں کی بے آہنگیوں کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے -- جس طرح حقیقی حسن مشاطگی کا رھین منت نہیں ہوتا اور اس کی بے نیازی کا اقتضا ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے بے پروا رہے' اسی طرح اقبال جو ھمہ تن شعر ہے' اپنی شعریت کا ویسا عامیانہ احساس نہیں رکھتا جو جھوٹے شاعروں کا شیوہ ہے ۔ وہ سوائے اپنی مخصوص صحبتوں کے عام طور پر پیشہ ور شاعروں کی طرح شعر پڑھنا اور دوسروں کو سنانا تک پسند نہ کرتا تھا ۔ کیا اُس کی اس شاعرانہ بے نیازی سے ہم بھی اس کو مصلح قوم تو سمجھیں لیکن اس کے شاعرانہ کمال کو محض ضمنی خیال کریں؟ واقعہ یہ ہے کہ اُس نے آرٹ یا شاعری کو مقصود بالذات کبھی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ذریعے سے اشاروں اشاروں میں حیات انسانی' فطرت اور تقدیر کے اسرار و رموز ہمارے لیے بے نقاب کردیے :—

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز درونِ میخانہ

ہر بڑے شاعر کے کلام کی تہ میں آرٹ کا ایک مخصوص تصور کار فرما ہوتا ہے جو در اصل بڑی حد تک اس شاعر کے تصور کائنات کے تابع ہوتا ہے - سوال یہ ہے کہ اقبال کے آرٹ کا کیا تصور ہے جسے اس نے صوت و لحن کی ہم آہنگی سے ظاہر کیا ۔ اس نے اپنے اس تصور کے متعلق مختلف جگہ اشارے کیے ہیں - وہ آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتا ہے - اس کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی شخصیت کی قوت اور جوش عشق کی بدولت

اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے - یہی کیفیت آرٹ کی جان ہے - اس میں جلالی اور جمالی عنصر دونوں پہلو بہ پہلو ہونے چاہییں - چنانچہ وہ کہتا ہے :—

دلبری بے قاہری جادوگری ست دلبری با قاہری پیغمبری ست

' مرقع چغتائی ' کے دیباچے میں اقبال نے اپنے آرٹ کے تصور کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے - وہ کہتا ہے :— "کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس کے شعرا اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے - لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو - یہ ایک عطیہ ہے جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ اسے حاصل نہ کر چکا ہو - اس لیے وہ شخص جو اس عطیے سے فیضیاب ہوا ہو اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتے ہیں - کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک' اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے' قوم کے لیے بہ نسبت اٹیلا یا چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے - رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے امراء القیس کے متعلق جو قبل اسلام کا سب سے بڑا عرب شاعر گزرا ہے' فرمایا تھا :— اشعر الشعرا و قائدھم الی النار ( یعنی وہ شاعروں کا سردار ہے لیکن جہنم کی راہ میں وہی ان کا رہبر ہوگا )"

" مرئي کو اس کا موقع دینا کہ غیر مرئی کی تشکیل کرے اور فطرت کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جسے سائنس کی زبان میں مطابقت یا توافق کہتے ہیں' در حقیقت یہ تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ فطرت نے انسانی روح پر غلبہ پا لیا - انسانی قوت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے مہیجات کے

خلاف مقاومت اختیار کی جائے نہ کہ ان کے عمل کے سامنے اپنے تئیں رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے - جو کچھ موجود ہے اس کی مقاومت اس واسطے کرنی چاہیے کہ جو موجود نہیں ہے اس کی تخلیق ہو - ایسا کرنا صحت و زندگی سے عبارت ہے - اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ زوال اور موت کی طرف لے جانے والا ہے - خدا اور انسان دونوں دوامی تخلیق سے قایم و زندہ ہیں :— ۔

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آن چہ می بایست پیش ما کجاست

" جو آرٹسٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ انسانیت کے لیے باعث برکت ہے- وہ تخلیق میں خدا کا ہمسر ہے اور اس کی روح میں زمانہ اور ابدیت کا پرتو منعکس ہوتا ہے .......... عہد جدید کا آرٹسٹ فطرت سے اکتسابِ فیض کرتا ہے حالانکہ فطرت تو بس "ہے" اور اس کا کام یہ ہے کہ ہماری اس جستجو میں روڑے اٹکائے جو ہم اس کے لیے کرتے ہیں جو "ہونا چاہیے" اور جسے آرٹسٹ اپنے وجود کی گہرائیوں میں پا سکتا ہے" -

اقبال کی شاعری مُتعین روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ہے - وہ اپنے سامع کے دل میں جذب و قوت کی ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے وہ فطرت پر قابو پا سکے - اس کے آرٹ کے دو محرکات خاص طور پر قابل لحاظ ہیں - ایک تو انسانی زندگی کے لامحدود امکانات کا عقیدہ اور دوسرے نفس انسانی کی کاینات میں فوقیت - بالعموم ایسا ادب جو کسی خاص غرض کے حصول کا ذریعہ ہو ' خشک ' بے کیف اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے پست ہو جاتا ہے - لیکن اقبال نے اپنے مطالب کو اس سلیقے سے رنگ و آب شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ وہ دل و نظر کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں - وہ منطقی مقدمات

سے نتائج نہیں نکالتا بلکہ وہ انسان کی ذوقی صلاحیت سے اپیل کرتا ہے - اس کا اسلوب بیان ایسا رنگین اور دل کش ہے کہ بعض اوقات وہ نہایت عمیق مطالب کو باتوں باتوں میں ہمارے ذہن نشین کردیتا ہے - اس کے کلام کی تاثیر کے دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں: ایک تو خود اس کی بلند شخصیت کا کرشمہ اور اس کا خلوص اور دوسرے اس کے طرز ادا کی ندرت اور طرفگی - وہ اپنے آرٹ سے ایسا معنی خیز طلسم پیدا کر دیتا ہے جس میں زندگی اور فطرت دونوں کی اندرونی اور خارجی کیفیات شامل ہوتی ہیں - اس کی نظر اشیا و حقایق کے معنی تک پہنچتی اور بصیرت اندوز ہوتی ہے - اس کے آرٹ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے کبھی زندگی کا دامن نہیں چھوٹتا :—

اے میانِ کیسہ ات نقد سخن    بر عیارِ زندگی او را بزن

اقبال کے نزدیک حسن و صداقت ایک ہیں - آرٹ کی اعلیٰ قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی انداز کا احساس و توازن ادراک حسن کے ذریعے پیدا کرے - اس کے نزدیک حسن آئینۂ حق ہے اور دل آئینۂ حسن جیسا کہ اپنی نظم "شیکسپیئر" میں اُس نے کہا ہے :—

برگِ گل آئینۂ عارض زیبائے بہار    شاہد مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن    دل انسانِ ترا حسن کلام آئینہ †

† یہی خیال شیکسپیئر اور کیٹس نے اپنے اپنے رنگ میں ظاہر کیا ہے - شیکسپیئر کہتا ہے :—

" O how more doth beauty beauteous seem
By that sweet ornament which truth doth give
The rose looks fair, but fairer we it deem
For that sweet odour which doth in it live".

کیٹس کہتا ہے :—

" Beauty is Truth, Truth Beauty—that is all
Ye know on earth, and all ye need to Know."

بقیہ بر حاشیہ ۸۲۵

صداقت کی تخلیق ذہن اور فطرت کی آویزش سے ہوتی ہے - اس کا وجود ادراک اور حافظہ کا ایک کرشمہ ہے - اس جد و جہد کی ہر منزل پر نئے نئے حقایق ظاہر ہوتے ہیں - صداقت کے اس پُر پیچ راستے میں حقیقت مطلق کی منزل اور زیادہ دور ہٹتی جاتی ہے جہاں تک انسان کبھی نہیں پہنچ سکتا - جتنی وہ انسان سے بچ نکلنے یا گریز کی کوشش کرتی ہے اتنا ہی وہ اس پر ریجھتا اور اس پر قابو پانا چاہتا ہے - یہی فریب نظر حسن کے تمام خیالی اور حقیقی پیکروں کی خصوصیت ہے - بغیر اس کے ان میں دل کشی نہ رہے - حسن اور حقیقت سے انسان جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے آپ کو ان سے دور تصور کرنے لگتا ہے - اگر یہ احساس نہ ہو تو پیہم آرزو کی لگن باقی نہ رہے - اقبال کہتا ہے :—(۱)

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می باید

آرٹ کے ذریعے احساسات اور کیفیات شعوری کی ساری منتشر قوتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں اور پھر وجدانی وحدت بن کر ظاہر ہوتی ہیں - شاعر کا لمحۂ فکر ابدی زمانے میں ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پھول

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۴۴

ایک فرانسیسی شاعر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :—

" Rieu n'est bean que be vrai
Le vrai seul est aimable."

(۱) غالب نے اس خیال کو اس طور پر ادا کیا ہے کہ منزل کی طرف جس تیزی سے میرا قدم بڑھتا ہے اُسی رفتار سے بیابان مجھ سے دور بھاگتا ہے :—

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

(چونکہ غالب اور اقبال میں خاص ذوقی اور باطنی مناسبت پائی جاتی ہے اس سبب سے ہم نے ان دونوں کے فکر و احساس کی مماثلت کو کہیں کہیں ظاہر کیا ہے - اسی طرح اقبال اور رومی میں بھی ذہنی تعلق ہے جسے واضح کیا گیا ہے)-

میں صدہا بہاروں کی خوشبوئیں پنہاں ہوتی ہیں - اقبال رنگ و آب شاعری کی طرف سے چاہے کتنا ہی بےنیاز کیوں نہ ہو لیکن اس کو کیا کیجیے کہ فطرت نے اسے شاعر پیدا کیا ہے اور اس کے سینے میں ایک بےچین اور حساس دل رکھ دیا ہے - اس کی شاعری میں جن خیالات و جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہ در اصل اس کے دوررس وجدان کا نتیجہ ہیں - وہ ذوق جمال کو زندگی سے علیحدہ نہیں تصور کرتا - وہ اس کا قائل نہیں کہ انسانی زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے - زندگی کی طرح اقدار حیات کی تہ میں بھی لطیف وحدت ہونی چاہیے - آرٹ کا جامہ حسن و عشق کے تانے بانے سے بنتا ہے - زندگی کے یہ دونوں مظہر دائمی ہیں - شاعر ان سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کرسکتا - کبھی وہ انہیں معنی طور پر اور کبھی حقیقت نگاری کے تحت پیش کرتا ہے - زندگی کے سارے حقایق مسرت و غم' آرزوؤں کی کشمکش' انسانیت کی کامرانیاں اور حسرتیں' قوموں کا عروج و زوال' غرض کہ زندگی کے سارے مسائل شاعر کے لیے جاذب نظر ہوتے ہیں؛ وہ ان میں سے جسے چاہے اپنی طبیعت کی افتاد کے موافق اپنا موضوع قرار دے -

حقیقت بینی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ عالم فطرت کی ہو بہو نقل ہو جائے - آرٹ حسن کے وہمی تصور کو خارجی تشکیل دیتا ہے تا کہ شے مدرکہ کی روح کا اظہار ممکن ہو - ہم کسی عملِ آرٹ کو اسی حد تک سمجھ سکتے یا اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جس حد تک کہ ہم وجدانی طور پر اس کی حقیقت پنہانی کو محسوس کر سکیں - جب ہم کسی شعر سے متاثر ہوتے ہیں تو در اصل ہم خود ایک قسم کی تخلیق آرٹ کا کام انجام دیتے ہیں - ہماری اس تخلیق کا معیار ہمارے احساس کی شدت کے متناسب ہوگا - جس

طرح کسی خوبصورت جسم کو دیکھ کر زندگی کا اعتبار بڑھتا ہے اسی طرح شعر کی معنوی خوبیوں کو سمجھنے والا زندگی کی دل کشی اور بلندی میں اضافہ کرتا ہے -

شاعر مظاہر خارجی سے چاہے وہ فطری ہوں یا انسانی' اکتساب فیض کرتا ہے اور اپنے اعجاز سے نغمہ کی پوشیدہ روح کو نہانخانۂ دل سے باہر نکالتا ہے - وہ مردہ فطرت میں اپنے اندرونی جذب و کیفیت سے جان ڈال دیتا ہے - اس کی بے تاب نظر خوابیدہ فطرت کے رخ روشن پر گُدگُدی کرتی اور اسے اس کی ابدی نیند سے بیدار کرتی ہے - آرٹسٹ کی بدولت فطرت کے مہمل طومار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں - آرٹسٹ کی زندگی دو دنیاؤں میں بسر ہوتی ہے - ایک اس کے نفس کی دنیا اور ایک خارجی عالم فطرت - کبھی وہ اپنے جذبات و تأثرات کا عکس فطرت کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور کبھی ذرہ ذرہ میں اسے حسن ازل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جسے موسیقی کے ایمائی طریقے سے وہ ظاہر کرتا ہے - موسیقی شاعری کی بنیاد ہے - کسی دوسرے آرٹ میں موسیقی کی سی ایمائی قوت نہیں - اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ آرٹسٹ کے رجحانات اور خواہشات در اصل اس کے تجربہ یا اس کی یادوں پر مشتمل ہوتی ہیں - اصلی آرٹسٹ خارجی عالم کی چمک دار سطح کی نقالی کو باعث ننگ تصور کرتا ہے - برخلاف اس کے وہ اس کی پر اسرار روح کو جذب کرتا ہے - فطرت نقل کے لیے نہیں ہے بلکہ توجیہ کے لیے - کائنات اظہار و توجیہ کی منتظر ہے اور شاعر اس کام کو انجام دیتا ہے - توجیہ صرف آئینہ سے نہیں ہو سکتی جو مختلف اشیا کو ہو بہو پیش کر دیتا ہے لیکن روح کا پتہ نہیں چلا سکتا - شاعر کا وجدان روح کائنات پر قابو پاتا اور اسے ظاہر کرتا ہے -

آرٹسٹ اپنے موضوع کی مناسبت سے اپنے دل میں تخیلی پیکروں کی ایک

دنیا آباد کرلیتا ہے اور اپنے خون جگر سے ان کی پرورش کرتا ہے - اس کا احساس اس قدر شدید ہوتا ہے کہ تجریدی وجود بھی اس کے نزدیک جان دار بن جاتے ہیں - بقول گوئٹے " میرے ذہن میں کبھی دو تصورات تجریدی شکل میں نہیں رہتے بلکہ وہ فوراً دو شخصوں کی صورتیں اختیار کرلیتے ہیں جو آپس میں مباحثہ کر رہے ہوں" - آرٹسٹ شدت احساس کی حالت میں اپنے تئیں ان تخیلی پیکروں سے وابستہ کر لیتا ہے اور پھر انہیں ایک ایک کر کے لحن و صوت کی قبا میں چھپا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - شاعر یا آرٹسٹ کا تخیل اس کی زندگی کی وسعت کا آئینہ دار ہوتا ہے - وہ تخیل کی راہ سے اپنی فطرت اور تقدیر کی منزل طے کرتا اور جن بلندیوں تک انسانی روح کی رسائی ممکن ہے وہاں تک پہنچتا ہے - اس کا تخیل اسے ایسے ایسے عالموں کی سیر کراتا ہے کہ جنہیں ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی - تخیل کی قوت کی کوئی انتہا نہیں - وہ عقل سے زیادہ قدیم اور قوی ہے - سوائے اس کے جذبات کی دنیا کا کوئی اور محرم راز نہیں ہو سکتا - اس کی بصیرت کے آگے فکر ششدر و حیران رہ جاتی ہے - جسے عقل ادھورا دیکھتی ہے اسے تخیل مکمل دیکھ لیتا ہے - عقل کی طرح وہ زندگی کی تحلیل نہیں کرتا بلکہ عشق کی طرح وہ اپنی امتزاجی بصیرت سے اسے کل کی حیثیت سے دیکھتا ہے - ہر وہ آرٹ جس کا موضوع زندگی ہے اس میں امتزاج و ترکیب کی ذہنی صلاحیت بدرجۂ اتم ہونی چاہیے - آرٹسٹ اس کے مطابق اپنے خیالی پیکروں کی تعمیر کرتا ہے - بادی النظر میں آرٹسٹ کی تخیلی دنیا میں زندگی کا معمولی ربط و نظم نہیں ہوتا بلکہ اس کی جگہ انتشار نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ربط پنہانی کو سمجھنے کے لیے وجدان کی رہبری کے بغیر چارہ نہیں - جس حقیقت کی تلاش انسان کو ہے وہ اسے خارجی کاینات فطرت میں نہیں

ملتی اور اگر مل جاتی ہے تو بڑی گریز پا ثابت ہوتی ہے۔ اسے شاعر اپنے دل کی دنیا میں پیدا کر سکتا ہے اور جب وہ اسے پا لیتا ہے تو مجبور ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے خود دیکھا ہے اس کی ایک خفیف سی جھلک دوسروں کو بھی دکھا دے۔ جس طرح ادراک و شعور کی دنیا میں انسانی نفس کی آزادی علم کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح احساس کی دنیا میں نفس انسانی اپنی آزادی کو آرٹ یا شعر کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ علم کا تعلق خارجی مظاہر و حقایق سے ہے اور آرٹ کا تعلق انسانی دل کی اندرونی حقیقت سے ۔ شعر اس فکر سے عبارت ہوتا ہے جس پر جذبات نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہو ۔ شعر کے الفاظ اس کے معانی کا قالب ہوتے ہیں ۔ ضرور ہے کہ معانی کا اثر قالب کی ظاہری شکل پر پڑے ۔ آرٹسٹ کی روح کا رقص اور موسیقی اس کے آرٹ میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔

شاعر کی ایک بڑی خصوصیت اس کا خلوص ہے۔ غیر مخلص شاعر شاعر نہیں، نقال ہے ۔ شعر پر کیا منحصر، کوئی فن خلوص کے بغیر اپنے اظہار میں مکمل اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے جس چیز کو 'خون جگر' کہا ہے وہ یہی خلوص ہے۔ اپنی نظم 'مسجد قرطبہ' میں وہ کہتا ہے کہ معجزہ ہائے ہنر آنی اور فانی ہیں سوائے ان کے جن کی تہ میں خلوص کار فرما ہے:—

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر †

---

† حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ　پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

نغمۂ نے کی تاثیر کا راز نے نواز کے دل میں تلاش کرنا چاہیے :—

آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرور مے اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

حقیقی شاعر کا ہر مصرعہ اس کے دل کا قطرۂ خون ہوتا ہے -

برگ گل رنگیں ز مضمون من است مصرع من قطرۂ خون من است

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ نغمہ اس وقت تک نغمہ نہیں جب تک کہ اُس کی پرورش آغوش جنوں میں نہ ہوئی ہو - وہ اس آگ کے مثل ہے جسے آرٹسٹ نے اپنے خون دل میں حل کیا ہو - ایک تو آگ اور پھر ایک حساس دل کے خون میں حل کی ہوئی' اس کی تاثیر کا کیا کہنا! اگر شعر میں خلوص نہیں تو وہ بجھی ہوئی آگ کے مثل ہے - شعر اور آرٹ کی عظمت کے متعلق اب کچھ سنیے :—

نغمہ می باید جنوں پروردۂ آتشے در خون دل حل کردۂ
نغمہ گر معنی نہ دارد مردہ ایست سوز او از آتش افسردہ ایست
آن ہنر مندے کہ بر فطرت فزود راز خود را بر نگاہ ما کشود
حور او از حور جنت خوشتر است منکر لات و مناتش کافر است
آفریند کاینـــاتے دیگرے قلب را بخشد حیات دیگرے
زاں فراوانی کہ اندر جان او ست ہر تہی را پر نمودن شان او ست

اگر کوئی آرٹسٹ زندگی کو فراوانی اور فروغ نہیں بخشتا' اگر اس کے آرٹ سے مسرت و بصیرت میں اضافہ نہیں ہوتا اور اگر اس سے حقایق حیات کے الجھے ہوئے تار نہیں سلجھتے تو وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے - اس کا کوئی مصرف نہیں :—

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ ہنر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیات ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

جب شاعر زندگی کے سنجیدہ اور مہتم بالشان مقاصد پیش کرے تو ضرور ہے کہ خود اس کا یقین و ایمان مکمل ہو - اس کے بغیر زندگی اپنے اصلی محرک سے محروم رہتی ہے - شدت خلوص کا نتیجہ ہے انہماک جس کی بدولت آرٹسٹ پر زندگی کے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے -

اقبال شاعر حیات ہے - اس نے اپنے کلام میں سوز و ساز زندگی کے موضوع کو ایسے ایسے لطیف اور نادر استعاروں اور تشبیہوں سے بیان کیا ہے کہ اس کی مثال مشکل ہی سے ہمیں دنیا کے کسی اور دوسرے شاعر یا ادیب کے ہاں مل سکتی ہے - فارسی اور اردو میں اس نے سب سے پہلے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی - جہاں تک مجھے علم ہے ہمارے شعرا میں سے کسی نے بھی زندگی کو اس وسیع معنی میں نہیں پیش کیا جس طرح کہ اس نے پیش کیا ہے - وہ اس موضوع کو ایسے دل کش اور موثر طور پر پیش کرتا ہے کہ سامع کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا وجود ایک امانت ہے - اس کے نزدیک سچا آرٹ زندگی کی خدمت کے لیے ہے :—

علم و فن از پیش خیزان حیات علم و فن از خانہ زادان حیات

اقبال اپنے تخیلی پیکروں کی تخلیق سے صرف اپنے دل کو ہجوم جذبات سے ہلکا نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ وہ تمدنی اقدار کو بھی تقویت پہنچانا چاہتا ہے - جس تمدنی گروہ سے اس کا تعلق ہے اس کی روایات اور اخلاقی ذمہ داریوں کو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے - اس کے آرٹ میں شخصی اور داخلی عنصر کے علاوہ عمرانی پہلو بھی موجود ہے - وہ محض تفنن طبع کے لیے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے مقاصد کے لیے ایک وسیلہ تلاش کرتا ہے - اس کے یہ مقاصد

اس قدر بلند ہیں کہ ان کی بدولت خود اس کا آرٹ سر بلند ہو گیا - کسی آرٹسٹ کے آرٹ کی عظمت کا انحصار بڑی حد تک اس کے موضوع کی عظمت پر منحصر ہے - ممکن ہے کوئی شاعر معاملہ بندی کے اچھے شعر نکال لیتا ہو جو فنی اعتبار سے بے عیب ہوں- لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی تخلیقِ جمال کی کوشش میں کسی قسم کی عظمت اور بلندی بھی پائی جائے - مثلاً غنائی شاعری انسان کے دل کے تاروں کو چھیڑتی اور مسرت و غم اور حسرت و آرزو کی سچی اور جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے کھینچتی ہے لیکن شاعر کی نظر زندگی کے متعلق نہایت وسیع نہ ہو تو وہ کوئی بلند مضمون نہیں پیدا کر سکے گا- اقبال اپنے آرٹ کو جن مقاصد عالیہ کے لیے وقف کرتا ہے ان کی بدولت اس کے کلام میں غیر معمولی عظمت و تاثیر پیدا ہوگئی ہے - وہ اپنی شعلہ نوائی کے ذریعے اپنے دل کی خلش کو دور کرتا ہے :—

تو بجلوہ در نقابی کہ نگاہ بر نتابی
مہ من اگر ننالم تو بگو دگر چہ چارہ
غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نگردد ز گسستنِ شرارہ

لیکن وہ کہتا ہے کہ شعر کے ذریعے وہ اپنے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ میں سے صرف ایک شرارہ باہر پھینک سکا ہے- باقی وہ آگ ویسی کی ویسی اب بھی موجود ہے† - وہ اپنی گرمیٔ گفتار سے زندگی کی نئی روح کی تخلیق کرنا چاہتا ہے جس نے اس کے دل میں نالہ و سوز کا طوفان بپا کیا ہے اس سے التجا کرتا ہے :—

---

† اس سے ملتا جلتا مضمون 'غالب' کے ہاں بھی ہے :—

مجھے انتہاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

اے کہ ز من فزودۂ گرمی آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشاے
تازہ کن از نسیمِ من داغِ درون لالہ را

آرٹسٹ اپنے آرٹ کے ذریعے زندگی کے اظہار کا آرزو مند ہوتا ہے - جو آرٹسٹ زندگی سے دور ہے اس کی تخلیق لازمی طور پر مصنوعی، بےجان اور غیر حقیقی ہو جاتی ہے - شاعر اپنے وارداتِ قلبی کو زندہ اور بیدار حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جذبے سے بڑھ کر زندہ اور بیدار حقیقت کوئی اور موجود نہیں جس کا انسان کو احساس اور علم ہو - زندگی کی سب سے بیش بہا چیز انسانی دل ہے کہ اس کے جینے سے زندگی عبارت ہے - زندگی چاہے وہ کتنی ہی ادنیٰ اور حقیر کیوں نہ ہو، ہمارے واسطے موت کے مقابلے میں باعثِ دلچسپی ہے - زندگی کا ایک وہ رخ ہے جو مشین کی طرح کام کرتا ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جو نشو و نما سے نئے نئے روپ اختیار کرتا ہے - شاعر کی نظر سے دونوں رخ پوشیدہ نہیں ہوتے - لیکن اپنے موضوع کے لیے وہ زندگی کے اُس رخ کو ترجیح دیتا ہے جو بدلتا رہتا ہے اس واسطے کہ اس کی نظر ہر وقت ممکنات حیات پر رہتی ہے - اس کی نظر زندگی کی تہ میں ایسے ایسے لطیف نقش و نگار کا مشاہدہ کرتی ہے جسے ہماری آنکھیں اعتبارات میں محدود ہونے کے باعث نہیں دیکھ سکتیں - وہ اپنے جذبۂ درونی کی بدولت حقیقت میں گہرائی پیدا کر دیتا ہے - زوال پذیر آرٹ میں اجتماعی و اخلاقی زندگی سے رشتہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے - فطرتِ شاعر کے متعلق خود اقبال کی زبان سے سنیے :—

فطرت شاعر سراپا جستجو ست　　خالق و پروردگارِ آرزو ست

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل ملّتے بے شاعرے انبار گِل

سوز و مستی نقشبندِ عالمے ست شاعری بے سوز و مستی ماتمے ست

شعر را مقصود اگر آدم گری ست شاعری هم وارث پیغمبری ست

زندگی کی ایک اعلیٰ قدر حسن ہے - یہ کاینات کا ابدی جوہر اور انکشاف حیات کا لطیف وسیلہ ہے - شاعر کا سینہ تجلی زارِ حسن ہوتا ہے - اس کے دل میں کاینات کے حسین ترین اوصاف کا عکس موجود ہوتا ہے - وہ فطرت کے حسن کو اسی طرح اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے جیسے بھونرا پھولوں کے رس کو - اس کو فطرت یا زندگی میں جہاں کہیں حسن نظر آجاتا ہے وہ اس کی توجیہ کے لیے بےتاب ہو جاتا ہے - بغیر جلوۂ حسن وہ تخلیق شعری نہیں کر سکتا - اگر حسن نہ ہو تو شاعر اس ساز کے مثل ہے جس کے سب تار ٹوٹ گئے ہوں :—

بے تو جان من چو آں سازے کہ تارش در گُسست

در حضور از سینۂ من نغمہ خیزد بے بہ بے

شاعر اپنے تاثرات میں اپنے جذبات کی آمیزش سے حسن کے نئے نئے دلفریب پیکر تخلیق کرتا ہے - اس کا قوی اور گہرا احساس تخیل کے ذریعے کاینات فطرت اور انسانی دلوں کا راز معلوم کر سکتا ہے - وہی جذبات جن کی بدولت اس نے اپنے دل کی دنیا کو تخیلی پیکروں سے آباد کیا تھا' اب اسے اظہار کے لیے بےچین کرتے ہیں - وہ اپنے جوشِ تخلیق کو متناسب اور موزوں الفاظ کی خراد پر سڈول اور ہموار کرکے پیش کرتا ہے - اس کی طبیعت کی موزونی ان میں کوئی کور کسر باقی نہیں چھوڑتی - اس طرح جذبۂ ترنم کی رنگین قبا زیب تن کرتا ہے - تخلیق کی حالت سخت ہیجان اور بےچینی کی حالت ہوتی ہے - جذبات اپنے اظہار کے لیے بےتاب ہوتے ہیں اور

شاعر یا آرٹسٹ اُنھیں ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے دل کے اندر آوڈ کی ایک نئی حقیقت محسوس کرتے وقت اسی کیفیت سے گزرتا ہے جس سے پیغمبر لوگ الہام کے وقت گزرتے ہیں۔ تخلیق کا جوش اور برانگیختگی شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ موزونیت اور تناسب کو ہاتھ سے نہ جانے دے اس واسطے کہ خود تخلیق میں ان سے مدد ملتی ہے۔ شاعر کا یہ احساسِ موزونیت حسن آفریں ہوتا ہے۔ آرٹسٹ میں اس موزونیت کا وجدانی شعور جس قدر قوی ہوگا اسی قدر اس میں تخلیق حسن کی صلاحیت زیادہ ہوگی۔ آرٹسٹ شروع شروع میں جب اپنے دل کو تخیلی پیکروں سے آباد کرتا ہے تو اُن میں نظم و ترتیب نام کو نہیں ہوتی' لیکن جوں جوں اس کا ذہن تخلیق کے لیے پختہ ہوتا جاتا ہے اس کی کیفیات و جذبات میں نظم و ضبط پیدا ہونے لگتا ہے۔ اب گویا ذہن آہستہ آہستہ جذبات کو اپنے قابو میں کرتا جاتا ہے۔ اگر شاعر کی فنی تخلیق حقیقی جذبات کی ترجمان ہے تو ضرور ہے کہ وہ حسن و صداقت کے دائمی آئین کی پابند ہو بلکہ انھیں پر مبنی ہو۔ صوت و لحن کی ہم‌آہنگی سے شاعر جو تخلیق حسن کرتا ہے اور اس کے لیے اس کو جو جگرسوزی کرنی پڑتی ہے اس کا اہل محفل کو کیا علم۔ اقبال اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے:

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست

پیش محفل جُز بم و زیر و مقام و راہ نیست

اس کو اس کا احساس ہے کہ اس کی زبان پوری طرح اس کے جذبات کی متحمل نہیں ہوسکتی لیکن اسے جو کہنا ہے وہ کہے جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے رباب کے تار کم زور ہیں اور اس کے نغمے کو ظاہر نہ کرسکیں گے لیکن اس کو اپنے عالم جذب میں ان تاروں کے ٹوٹنے کی پروا نہیں رہتی۔ وہ اس

حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے کہ اس کے طوفان ندیوں میں نہیں سمانے کے، ان کے لیے سمندروں کی وسعتیں درکار ہیں۔ لیکن دلوں میں جب طوفان اُمڈتے ہیں تو وہ اظہار کے لیے ایسے بے تاب ہوتے ہیں کہ سمندر کی وسعتوں کا انتظار ان کے لیے محال ہو جاتا ہے :—

نغمہ ام ز اندازۂ تار است بیش     من نترسم از شکستِ عود خویش

در نمی گنجد بہ جو عمانِ من     بحرہا باید پئے طوفانِ من

بڑا اور حقیقی شاعر اپنے دل کی گرمی اور اپنی شعلہ نوائی سے اپنے خیالی پیکروں کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ وہ ان میں اپنی زندگی کے رس کو اس خوبی سے رچا دیتا ہے کہ وہ بھی اس کی شخصیت کی طرح لازوال اور ان مٹ بن جاتے ہیں۔ شاعر حسن ازلی کا جلوہ خود ہی نہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کو دکھانے پر بھی اسے قدرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بعض نغمے جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ کبھی بھی ظاہر نہیں ہوتے اور اس کے دل ہی کے اندر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان چاہے کتنی ہی منجھی ہوئی کیوں نہ ہو، اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان نغموں کو جو جذبات کی مضراب سے روح کے تاروں میں پیدا ہوتے ہیں؛ ظاہر کر سکے۔ وہ ایک خاص انفرادی تجربے تک محدود رہتے ہیں۔ زبان ایک مکانی اور عمرانی چیز ہے جس کے ذریعے صرف ان تصورات کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں۔ یہ نازک مطالب جامۂ الفاظ کے رہینِ منت نہیں ہوتے اور نغموں کی آواز بازگشت کی طرح دل کی وادیوں میں گونجتے رہتے ہیں :—

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے     بمعنیٔ کہ بر او جامۂ سخن تنگ است

دوسری جگہ اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :—

هر معنئ پیچیدہ در حرف نمی گنجد

یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی †

شاعر پروردگار حسن ہے ۔ وہ اپنے شعر کے ذریعے تخلیقِ حسن کرتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ حسن سے کیا مراد ہے ؟ یہ پر اسرار چیز تعریف کی مشکل ہی سے رهینِ منت ہو سکتی ہے ۔ بہت سے لوگ انفرادی تجربے کے طور پر جانتے ہیں کہ احساس جمال کیا ہے لیکن اگر آپ ان سے کہیں کہ اس کیفیت کی تعریف کیجیے تو وہ شش و پنج میں پڑ جائیں گے ۔ جس چیز کو وہ کبھی شدت کے ساتھ محسوس کر چکے ہیں، شاید اس کے متعلق ان سے کچھ بھی کہتے نہ بنے ۔ اکثر اہلِ فکر جنھوں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے، اس پر متفق ہیں کہ حسن اظہار کا دوسرا نام ہے اور بد صورتی اظہار کی کوتاہی ہے ۔ یہ وہ اظہار ہے جو ذہن اپنے وجدانوں کو عطا کرتا ہے ۔ حسن دراصل دیکھنے والے کی نظر میں مضمر ہوتا ہے نہ کہ محبوب میں ۔ اس کا تعلق زندگی کے معروضی حقایق سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ اندرونی احساس سے ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت تغیر و زوال ہے ۔ وہی چیز جو اس وقت حسین و جمیل معلوم ہوتی ہے کچھ عرصے بعد حسین نہیں معلوم ہوتی ۔ یہ ایک تخییلی فعل ہے جو اپنے مخصوص خیالی پیکر تراشتا اور اس طرح خود اپنی تخلیق کرتا ہے ۔ کائنات میں جہاں کہیں کوئی شے ان خیالی پیکروں سے مشابہ مل جاتی ہے وہ اپنے تئیں اس سے وابستہ کر لیتا ہے ۔ اقبال حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایسے دل پذیر سروں میں بیان کرتا ہے جو نغمۂ حیات

---

(۱) سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر　　نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

(غالب)

سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس کی جذبات نگاری نوحہ کے لیے نہیں اور نہ وہ پھر حقیقی معشوقوں کے عشق کے لیے اپنی جان کھپانا پسند کرتا ہے۔ اس کی نظر فطرت کے نہاں‌خانہ میں مشاہدۂ حسن کرتی اور اس کے کان ہوا کی سنسناہٹ میں موسیقی کے نغمے سنتے ہیں۔ اس شدتِ احساس کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ دوسروں کو اپنے جذبات میں شریک کر سکے۔ جب تحسینِ جمال سے دماغوں کی کدورتیں کافور ہوتی ہیں تو اس ذہن کا کیا کہنا جو خود تخلیقِ حسن کرے۔ آرٹسٹ جب اپنے اندرونی تجربے کو خارجی شکل دیتا ہے تو حقیقت جمالی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ وہ اپنے خونِ جگر سے اس کی تخلیق کرتا اور پھر خود اس کے مشاہدے سے مسرور و شادماں ہوتا ہے۔ نظارۂ جمال کے لیے شاعر کی آنکھ ستارے کی طرح مدام دیدہ‌بار رہتی ہے :—

من اگرچہ تیرہ خاکم دلکے است برگ و سازم
بہ نظارۂ جمالے چو ستارہ دیدہ بازم
بکسے عیاں نکردم ز کسے نہاں نہ کردم
غزل آں چناں سرودم کہ بروں فتاد رازم

آرٹسٹ کے اندرونی تجربے اور آرٹ کی خارجی شکل کی نوعیت میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اب تک اس کی سعیٔ اظہار جو محض ایک داخلی کیفیت تھی، خارجی حقیقت بن جاتی ہے۔ وہ اظہار کے لیے جو وسیلہ تلاش کرتا ہے وہ اس کے احساس و وجدان کی طرح یکتا اور ذاتی نہیں ہوتا بلکہ عمرانی ہوتا ہے۔ بغیر اس کے وہ اپنے اندرونی تجربے کو دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس واسطے آرٹ کی اصلیت کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ نہ تو خالص انفرادی چیز ہے اور نہ خالص اجتماعی، بلکہ دونوں عناصر اس کی ساخت میں پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آرٹسٹ اپنے جوشِ وجدان کے اظہار کے

لیے ایسا بیتاب ہوتا ہے کہ اس کو اس امر کی پروا نہیں رہتی کہ دوسرے اس کے مافی‌الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں - اس کا آرٹ اس کی طبیعت کے فطری اقتضا کے باعث اظہار چاہتا ہے نہ کہ دوسروں کی قدردانی کی خاطر - گویا کہ آرٹسٹ کے لیے اس کا آرٹ کافی بالذّات اور بجائے خود اپنا آپ مقصود ہے - لیکن جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، زندگی اور آرٹ کا یہ نقطۂ نظر بہت محدود ہے - آرٹ اظہار حسن ہے جس کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں ظاہر کرے اور اس لیے ظاہر کرے کہ دوسرے دیکھیں - غالب نے کیا خوب کہا ہے :—

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینۂ زانوئے فکر اختراعِ جلوہ ہے

اقبال کا آرٹ محض اس کے من کی موج نہیں، بلکہ وہ اس کے ذریعے اپنی شخصیت کے طلسم کو دوسروں پر اثر انداز کرتا ہے - وہ خشک طریقے پر وعظ و نصیحت نہیں کرتا - واعظانہ مقدمات اس کی شاعری میں شاذ و نادر ہیں لیکن اس کی شوخِ گفتاری اخلاقی موضوعوں کو ایسے لطیف اور دل‌کش انداز میں پیش کرتی ہے کہ سامع کے دل کو سیری نہیں ہوتی - اس کی ہمدردی کی کوئی انتہا نہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت کشادہ دلی سے اپنے اندرونی تجربات میں ہمیں شریک اور اپنا رازدار بنا لیتا ہے - وہ جو کچھ کہتا ہے اس طرح کہتا ہے کہ گویا ہم خود اسے خطاب کر رہے ہیں - بلاغت کا یہ کمال ہے - اس نے علم و حکمت کے ان تمام خزانوں کو جو اس کے دل و دماغ میں محفوظ تھے، اپنے آرٹ کو موثر بنانے کے لیے نہایت سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے - اس کی حسن آفرینی منزلِ شوق کے مسافر کو لبھاتی اور عشق کے لیے سامانِ شباب بہم پہنچاتی ہے - وہ کہتا ہے :—

یک نوائے سینہ تاب آوردہ‌ام عشق را عہدِ شباب آوردہ‌ام

اقبال کا آرٹ کا نظریہ اس کے فلسفۂ خودی کے تابع ہے - آرٹ اظہار خودی کا ایک وسیلہ ہے - چنانچہ وہ آرٹ جس میں خودی باقی نہیں رہتی، اقبال کے نزدیک کوئی مستحسن چیز نہیں ہے - چنانچہ اس نے اپنے اس اصول کا اطلاق فن اداکاری پر کیا ہے - اپنی نظم "تھیاتر" میں اس نے بتایا ہے کہ اداکاری کا کمال یہ ہے کہ خودی باقی نہ رہے لیکن اگر خودی نہ رہی تو آرٹ کی تخلیق کیسے ہو سکتی ہے - میرے خیال میں اسی لیے اقبال ڈرامے کو بہت ہی ادنیٰ درجے کا آرٹ تصور کرتا تھا - چنانچہ وہ کہتا ہے :—

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

یہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا، آرٹسٹ یا شاعر کے اندرونی جذبات و کیفیات کا تجزیہ تھا - ان کی بدولت وہ اپنے دل کو کائنات کے ساتھ متحد کر لیتا ہے - اس کے دل کی ہنگامہ زائیاں شورش حیات کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن جاتی ہیں - اس کا نغمہ زندگی کے زیر و بم میں توازن پیدا کرتا ہے اور اس کے درد کی کسک کائنات کی روح کو تڑپا دیتی ہے - شاعر کے دل کی اندرونی دنیا کا حال ہم سن چکے - اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی دنیا اور خارجی عالم میں کس طرح رشتہ جوڑتا ہے - وہ اپنے آرٹ کے ذریعے فطرت سے

تعلق پیدا کرتا اور اپنے نفس گرم سے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے - وہ فطرت کی سرگوشیوں کو سنتا ہے یا یوں کہیئے کہ اپنے جذبات کو فطرت پر طاری کر دیتا ہے - فطرت جو بات ہکلا ہکلا کر اکھڑے اکھڑے طور پر کہتی ہے اس کو وہ اپنی شدت احساس کی بدولت موزوں طریقے سے بیان کرتا ہے - وہ اپنے جذبِ دروں سے حقیقت مدرکہ میں گہرائی پیدا کر دیتا ہے - فطرت کے جلووں کی رنگا رنگی اور رعنائی آرٹسٹ کے دل میں جب اپنا عکس ڈالتی ہے اور اس کے جذبات میں حل ہوکر اظہار چاہتی ہے تو اس وقت دراصل وہ اپنے وجود کی غایت پوری کرتی ہے - فطرت کا کمال وجود یہ ہے کہ وہ اہل نظر کو اپنی طرف مائل کرے اور اس کی مشہود بنے تا کہ وہ اپنے تاثر جمال کو اس کے توسط سے ظاہر کرسکے - فطرت اس وقت تک حسن سے عاری رہتی ہے جب تک کہ انسانی نظر اس میں جمال آفرینی نہ کرے - شفق کے منظر میں اسی وقت دل‌کشی آتی ہے جب کوئی صاحب نظر اس کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ وہ دیکھو کیا خوبصورت منظر ہے! فطرت کا وجود آرٹسٹ کا ممنون نظر ہوتا ہے - اقبال نے اس مضمون کو کیا خوب ادا کیا ہے :—

جہان رنگ و بو گلدستۂ ما　　ز ما آزاد و هم وابستۂ ما
خودی او را به یک تار نگه بست　　زمین و آسمان و مهر و مه بست
دل ما را باو پوشیده راهے است　　که هر موجود ممنون نگاهے است
گر اورا کس نه بیند زار گردد　　اگر بیند یم و کهسار گردد
جهان غیر از تجلی هائے ما نیست　　که بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

اس مضمون کو اقبال نے اپنی نظم 'شبنم' میں ظاہر کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ رگ ایام کی نمی دراصل ہمارے اشک سحر کی رہین منت ہے اور زندگی کی ساری ہما ہمی ہمارا ہی فریب نظر ہے -

نم در رگ ایام ز اشک سحر ماست — این زیر و زبر چیست؟ فریب نظر ماست
انجم بہ بر ماست، لخت جگر ماست

جمالیاتی محرکات کم و بیش دنیا کی ہر قوم میں مختلف پیرایوں میں ملتے ہیں - جلوۂ حسن کی کشش، درد اشتیاق کی کسک اور آرزو کی ہنگامہ زائیاں انسانیت کی متاع مشترک ہے جو فن کاروں کے لیے تخلیقی محرک کا کام دیتی ہے - لیکن بہت کم فن کار ایسے گزرے ہیں جنہیں یہ ملکہ حاصل ہو کہ اپنے جذبات کی کیفیت کو بے جان مظاہر فطرت پر طاری کرسکیں - غالب نے دیدہ وری کا یہ نصب العین پیش کیا تھا کہ خاک کے ہر ذرے میں رقص بتان آذری نظر آنے لگے :—

دیدہ ور آنکہ دل نہد تا بشمار دلبری — در دل خاک بنگرد رقص بتان آذری

اقبال بھی اپنے روحانی اور فنی پیشرو کی طرح انسانی دل کی کسوٹی پر فطرت کے کھرے کھوٹے کو پرکھتا ہے - وہ کہتا ہے :—

عالم آب و خاک را بر محک دلم بسائے — روشن و تار خویش را گیر عیار این چنین

فطرت کے بے معنی طومار میں آرٹسٹ کی نظر نظم و معنی پیدا کرتی ہے - فطرت کے جلووں کی بوقلمونی اسی کے دیدۂ بیدار کی رہین منت ہے - بغیر اس کے دست فطرت کی حنا بندی کرنے والا کوئی نہیں - زمان و مکان بھی اسی کی شوخیٔ افکار کے آئینہ دار ہیں -

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را
حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است

ہستی و نیستی از دیدن و نا دیدن من
چہ زمان و چہ مکان شوخیٔ افکار من است

شاعر فطرت کی ہر ادا کا نکتہ داں ہے - وہ اپنے ذہن اور ارادے کی بدولت اپنے نفس اس سے بالکل علیحدہ تصور کرتا ہے - وہ اپنی زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ فطرت پر تصرف و استیلا حاصل کرے - فطرت اس کے مقاصد کا ایک وسیلہ ہے - وہ اس کی تسخیر میں جس قدر سعی و جہد کرتا ہے اسی قدر اپنی شخصیت کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتا ہے - اگرچہ کائنات اپنی وسعت کے اعتبار سے بے پایاں ہے اور انسان اس کے مقابلے میں ذرا سا ہے اور اس کی تاریخ دوران کائنات کے گرد و غبار کے ایک ذرے سے زیادہ نہیں' لیکن باوجود اس کے اسے اس پر ناز ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہے اس سے اس کا زبردست حریف محروم ہے یعنی ذہن فعال - انسان تو یہاں تک بڑھ بڑھ کے باتیں کرتا ہے کہ کائنات مدرکہ اسی ذہن فعال کے ایک کرشمہ سے زیادہ وقیع نہیں - جس طرح آرٹ انسانی ذہن کا کارنامہ اور حقیقت کا براہ راست ادراک ہے اسی طرح فطرت ذات باری کا کارنامہ ہے - فطرت کا خالق خدا ہے اور آرٹ کا خالق انسان ہے - اس میں اختلاف ہے کہ آیا خدا کی بنائی ہوئی دنیا زیادہ دل کش ہے یا انسان کی بنائی ہوئی دنیا - فطرت کا حسن و جمال کسی دیدہ ور کے اشارۂ چشم کا منتظر رہتا ہے - بہار تو بس اتنا کرتی ہے کہ پھول کھلاتی ہے لیکن آرٹسٹ کی آنکھ اس میں رنگ و آب پیدا کرتی ہے :-

بہار برگ پراگندہ را بہم بر بست　　　نگاہ ما ست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

اقبال نے اس قسم کے خیال کو متعدد جگہ مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ فطرت مجبور محض ہے - وہ جیسی ہے بس ویسی ہے - وہ اپنے مزاج کو نہیں بدل سکتی - حالانکہ انسانی ذہن کی تخلیقی استعداد کی کوئی حد نہیں - شاعر کو فطرت سے شکایت ہے کہ اس کے " عشرت کدۂ امروز و فردا "

میں اس قدر یکسانیت ہے کہ دل اس سے اچاٹ ہوا جاتا ہے - وہ فطرت کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ کیا کہ روز وہی باتیں - تو کبھی نئی تخلیق بھی تو کر اس لیے کہ ہماری طبیعت میں جدت پسندی ہے - بغیر اس جدت و تخلیق کے ہمارا دل اس خاکدان میں نہیں لگ سکتا -

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند اُفتادہ ایم

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

آدم خاکی کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ نت نئے جہان آرزو پیدا کرے - ستارے آج سے ہزارہا سال پہلے جس طرح گردش کرتے تھے اسی طرح آج بھی گردش کرتے ہیں - انہیں یہ مجال کہاں کہ اپنی اُپج سے کچھ کرسکیں -

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہا ست

مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

اقبال نے نہایت دقیقہ سنجی سے مذکورہ بالا موضوع کو خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے - خدا کہتا ہے کہ میں نے ساری دنیا کو ایک ہی آب و گِل سے پیدا کیا لیکن انسان نے ایران و توران کی تقسیمیں قایم کرلیں - میں نے لوہا پیدا کیا اور تو نے اس سے شمشیر و تفنگ بنائے' میں نے چمن اور پودے پیدا کیے اور تو نے کاٹنے کو کلہاڑیاں بنائیں' میں نے طائران خوش‌الحان پیدا کیے اور تو نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے قفس بنائے - اس پر انسان کہتا ہے کہ تیری تخلیق میرے لیے کافی نہیں تھی - میری طبیعت کا اقتضا یہ تھا کہ تیری طرح میں بھی تخلیق کروں اور اپنے منشا کے مطابق جہان رنگ و بو کو آراستہ کروں اور اس طرح اپنی فراست اور اپنی قوت ارادی کی کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کروں - پھر انسان بڑی بےباکی سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری تخلیق بہتر ہے کہ میری - تو نے شب پیدا کی

اور میں نے چراغ' تو نے مٹی بنائی اور میں نے اس سے ساغر بنایا' تو نے بیابان اور کہسار اور مرغزار پیدا کیے اور میں نے خیابان و گلزار بنائے - تو نے سنگ پیدا کیا اور میں نے اس سے آئینہ نکالا' تو نے زہر پیدا کیا اور میں نے نوشینہ -

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

شاعر اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ فطرت ہم سے آزاد بھی ہے اور وابستہ بھی' لیکن ایک چیز انسان میں ایسی ہے جو اس کو فطرت سے علیحدہ کرتی ہے اور وہ اس کا احساس ہے - لالہ کے دل میں بھی داغ ہے لیکن یہ تمنا کا داغ نہیں اور نرگس و شہلا لذت دید سے محروم رہتی ہے -

لالۂ ایں گلستاں داغ تمنائے نداشت
نرگس طناز او چشم تماشائے نداشت † -

یہ مضمون بھی بہت اچھوتا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ فطرت جیسی ہے اُسے ویسا ہی رہنے دے' اس کے متعلق چنیں چناں نہ کر - لیکن آدم کہتا ہے کہ ہاں فطرت جیسی ہے ویسی تو ہے لیکن میرے پیش نظر تو یہ ہے کہ کیسی ہونی چاہیے ؟

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

† اس خیال کو غالب نے نہایت بلیغ انداز میں ادا کیا ہے - وہ انسان (یا معشوق) کو مخاطب کرکے لکھتا ہے کہ تیرا گل لطف گویائی رکھتا ہے اور تیری نرگس لذت دید سے آشنا ہے - تیری بہار ایسی پر کیف ہے کہ فطرت کی بہار میں وہ طرفگی کہاں:

گلی را نوا نرگسی را تماشا تو داری بہاری کہ عالم ندارد

ایک جگہ "بال جبریل" میں اقبال نے اپنی دنیا اور دنیائے فطرت کا مقابلہ کیا ہے اور ذات باری سے شکوہ کیا ہے کہ میں نے تجھے اپنے دل کی دنیا میں براجمان کر لیا لیکن میں تیری دنیائے فطرت میں بے بس ہوں۔

تری دنیا جہان مرغ و ماہی     مری دنیا فغان صبحگاہی

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور     مری دنیا میں تیری پادشاہی

اقبال کے نزدیک فطرت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی تکمیل خودی کی راہ میں مزاحمت پیدا کرے۔ انسان کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ اس پر غلبہ پائے اور تسخیر جہات کرے۔ انسان کی یہ سعی و جہد تخلیقی نوعیت رکھتی ہے۔ فطرت جو اس کی مزاحمت کرتی ہے انسان اسی کے توسط سے اپنی ذہنی استعداد کو ظاہر کرتا ہے اور اسے بھی اپنی شخصیت اور احتیاج کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے سے زندگی کی تمام مخفی قوتوں کو بیدار کرتا اور تکمیل حیات کرتا ہے۔ اس تخلیق و تسخیر میں انسان کو جذبۂ عشق سے بڑی مدد ملتی ہے۔ لفظ عشق کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ مجاز و حقیقت دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جس کے تانے بانے سے ذات اپنی الٰہی صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لیے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی' انہماک اور جذب کلی ہے۔ اس سے انسانی ذہن زمان و مکان پر اپنی گرفت مضبوط کرتا اور لزوم و جبر کی دائمی زنجیروں سے چھٹکارا پاتا ہے۔ اس کے بغیر حقیقی آزادی سے کوئی ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ عشق کا ایک اور خاصہ پیہم آرزو ہے۔ اقبال کا عشق کا تصور ہمارے دوسرے شعرا کے نام نہاد رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے ہاں وہ

زندگی کا ایک زبردست محرک عمل ہے - اقبال عشق سے تسخیر فطرت کا کام بھی لیتا ہے اور اس کے ذریعے اپنے دل کو کائنات سے متحد کرتا ہے - اسی کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمت مردانہ کے سامنے جبریل کو ''صید زبوں'' سمجھنے لگتا ہے اور اپنے وجدان کی کمند سے ذات یزداں پر قابو پانے کے منصوبے سوچتا ہے -

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

کہنے والے کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ آواز ایک نرے شاعر یا آرٹسٹ کی نہیں ہے - یہ جرأت رندانہ اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب رند چشم ساقی کے اشاروں کو سمجھتا اور پہچانتا ہو - یہ لب و لہجہ اسی کا ہو سکتا ہے جس کے ہاں ہم ورائے شاعری چیزے دگر ہست - اس کے انداز بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ''فوق البشر'' شعر کی زبان میں دنیا والوں کو خطاب کر رہا ہو - اس کی بے نیازی اور جرأت دیکھیے :

یم عشق کشتیٔ من ' یم عشق ساحل من

نہ غم سفینہ دارم نہ سر کرانہ دارم

جذبۂ عشق مجاز کی منزلوں سے گزرتا ہوا جب شاہد حقیقی سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو عقل اپنے گلے میں غلامی کا طوق ڈال لیتی ہے - قافلۂ حیات کی ساری ہماہمی اسی کی بدولت ہے اور اسی کے حلقۂ دام میں آکر زندگی کو ذوق تمنا نصیب ہوتا ہے :—

من بندۂ آزادم عشق است امام من

عشق است امام من عقل است غلام من

ہنگامۂ ایں محفل از گردش جام من

ایں کوکب شام من ایں ماہ تمام من

جان در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود
مستانہ نواہا زد در حلقۂ دام من

اے عالم رنگ و بو این صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

یہ اشعار ہیں یا جذبات کا فطری نغمہ - "عشق است امام من" کے ٹکڑے کی تکرار سے کس قدر قوت اور اعتماد کا اظہار ہو رہا ہے - پھر ما اور تا کی اصوات سے ان اشعار میں کس قدر مستی اور ترنم پیدا ہو گیا ہے - یہ اشعار وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کے دل و دماغ عشق و محبت میں رچے ہوئے ہوں یہ صرف حقیقت کے مخلص پرستار کا ہی طرز کلام ہو سکتا ہے - ہر لفظ قلبی واردات کا آئینہ دار ہے - یہ خیال کہ عشق کی بدولت روح انسانی کو دوام نصیب ہوتا ہے جدید فلسفے کا ایک معرکۃالارا مسئلہ ہے جس کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے - عشق ہی زندگی کا سب سے بڑا محرک تخلیق ہے - کسے معلوم کہ اسی کی بدولت زندگی اپنے مد مقابل یعنی مادہ یا فطرت پر پوری فتح حاصل کرے اور فنا سے نجات حاصل کر سکے - برگسون اور بعض دوسرے فلاسفہ کے نزدیک شدت احساس جسے وہ روحانی جوش یا کچھاؤ کی حالت سے تعبیر کرتے ہیں' روح انسانی کو ابدی اور دوامی بنا دیتا ہے - دراصل عشق اسی قسم کی شدت احساس سے عبارت ہے - اقبال "عالم رنگ و بو" یعنی کائنات فطرت کی حالت پر ترس کھا کر کہتا ہے کہ تیرا اور میرا ساتھ بس تھوڑے عرصے کے لیے ہے اس واسطے کہ تیرا دوام موت و فنا میں مضمر ہے اور میرا دوام عشق سے ہے -

اقبال نے عشق کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے - یہ مضمون اسے بہت عزیز ہے کہ عشق ہی سے ساری کائنات کی رونق ہے اور حیات انسانی کی ساری ہنگامہ زائیاں اسی کی رہین منت ہیں -

بہ برگ و لالہ رنگ آمیزیٔ عشق　　بجان مـــــــا بلا انگیزیٔ عشق

اگر ایں خاکداں را وا شگافی　　درونش بنگری خوں ریزیٔ عشق †

برگ و لالہ میں رنگ آمیزیٔ عشق سے شاعر کا اشارہ حیاتیات کے اس مسئلہ کی طرف ہے کہ کس طرح پھولوں کی خوشبو اور ان کے رنگ کی شوخی کیڑے مکوڑوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے - انہیں کے ذریعے سے پھول کا زیرہ دوسرے پھولوں تک پہنچتا اور بار آوری کا موجب بنتا ہے - فطرت اپنے اس مقصد کو کبھی طائران خوش الحان کے ذریعے اور کبھی باد صبا کے ایلچی کے توسط سے پورا کراتی ہے۔اور اس طرح نہایت لطیف اور پر اسرار طریقوں سے اپنے منشا کی تکمیل کرتی ہے -

دوسری جگہ اسی موضوع کو یوں بیان کیا ہے :-

بماہیاں باد نووردیں دہد عشق　　پرافاں غنچہ چوں پروین دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است　　بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

یہ مضمون بالکل اچھوتا ہے کہ سمندر میں مچھلی جو اپنا راستہ تلاش کرلیتی ہے یہ بھی عشق ہی کا کرشمہ ہے - اس شعر میں اقبال کا اشارہ اس نکتے کی طرف ہے کہ ارتقا کوئی اندھی یا بے کیف میکانیت کا نتیجہ نہیں بلکہ جبلت عشق و شوق و آرزو کی بدولت اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچاتی ہے - انسان و حیوانات کے اعضا دراصل اسی احتیاج اور اندرونی جوش حیات

---

† مولانا روم پتے سے دریافت کرتے ہیں کہ بتا وہ کونسی قوت تجھ میں ہے جس کی بدولت تو شاخ سے پھوٹ نکلتا ہے اور اظہار خودی کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے :—

اے برگ قوت یافتی تا شاخ را بشگافتی ~ چوں رستی از زنداں بگو تا می دریں حبس آں کنم

سے عبارت ہیں جو وہ اپنی شخصیت کو خارجی فطرت میں وسیع کرنے کے لیے ظاہر کرتے ہیں۔

عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے - اس کے جذب و تمنا کی سعی و جہد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے - شاعر کہتا ہے کہ انسانی آنکھ اسی طرح 'لذت دیدار کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس طرح منقار بلبل اس کی سعی نوا کی مرہون منت ہے - یہ سب زندگی کی تمنائے اظہار کے شیون ہیں - عشق اس اظہار میں ممد و معاون ہوتا ہے - کبوتر کی شوخیٔ خرام اور بلبل کا ذوق نوا دونوں جذب و مستی کے مظاہر ہیں -

چیست اصل دیدۂ بیدار ما      بست صورت لذت دیدار ما

کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت      بلبل از سعیٔ نوا منقار یافت

عشق ایک زبردست محرک شعری ہے - وہ جذبات انسانی کا سرتاج ہے - اس کی وارداتیں عالمگیر ہیں - یہ محرک شعری دنیا کی ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ رہا ہے - فارسی اور اُردو میں اس موضوع پر ہمارے شعرا نے ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کیے ہیں کہ ان کی مثال دوسری زبانوں میں شاید ہی ملے - مولانا روم کے زمانے سے لے کر اب تک ہمارے شعرا نے عشق کو عقل و علم کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے - اقبال نے بھی اس مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اسے ایسا اپنایا ہے کہ وہ گویا اسی کا ہوگیا - وہ جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ علم و حکمت کا پس منظر مستور باقی رہے - اس لیے اس کے مطالب نہایت دقیق اور اس کے اشارے اور کنائے نہایت دوررس ہوتے ہیں - اقبال عشق کو عقل کے مقابلے میں فضیلت دیتا ہے اس واسطے کہ اس کے ذریعے حقایق اشیا کا مکمل علم و بصیرت حاصل ہوتی ہے - پھر یہ کہ انسانی زندگی میں جتنا اس کا اثر ہے عقل کا اس کا عشر عشیر

بھی نہیں - زندگی کا ہنگامہ اسی کی بدولت ہے - اگر دل بھی عقل کی طرح فرزانہ ہوتا تو جینے کا لطف باقی نہ رہتا -

تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے گِلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

فطرت کی بزم خموشاں میں عشق کی ساری رونق ہے -

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

لطف یہ ہے کہ عشق کا لازمی نتیجہ بے تابی اور اضطراب ہے لیکن دل کو اسی میں مزہ ملتا ہے-

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بے تابی *

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اقبال عقل کا دشمن ہے - وہ عقل کو بھی زندگی کے خادموں میں شمار کرتا ہے - زندگی پر اس کے بہت کچھ احسانات ہیں - لیکن وہ سب کچھ تو نہیں - اُس پر حد سے زیادہ تکیہ کرنا درست نہیں - اس کی پہنچ بس ایک حد تک ہے - اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے - یعنی بجائے خود وہ تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی - جب تک کہ عشق و وجدان اس کی پشت پناہی پر موجود نہ ہوں' وہ

---

* عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا (غالب)

اس موضوع پر مولانا روم فرماتے ہیں :-

دور گردوں باز موج عشق داں چون نبودے عشق بفسردے جہاں
کے جمادی محو گشتے در نبات کے فدائے روح گشتے نامیات
روح کے گردے فدائے آں دمے کز نسیمش حاملہ شد مریمے

خود آگے قدم بڑھاتے ہوے ہچکچاتی ہے - جہاں وہ پس و پیش اور حیص بیص میں ہوتی ہے وہاں عشق زندگی کے قافلہ کی رہبری کرتا ہے - چنانچہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہ تمام اہم امور جن سے قوموں کی زندگی بدل گئی ہے کسی نہ کسی جذبہ کے تحت انجام پائے ہیں - اسی خیال کو اقبال اس طرح ادا کرتا ہے -

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل اسباب و علل کی بھول بھلیاں میں ایسی پھنس جاتی ہے کہ اصل حقیقت اس کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتی ہے -

عقل در پیچاکِ اسباب و علل عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقیں لاینفک است

اقبال کو عقل سے شکایت بھی ہے کہ وہ ظن و تخمین کی ایسی پابند ہو جاتی ہے کہ اس میں تخلیقی استعداد اور قوت عمل مفقود ہو جاتی ہے - لیکن عقل بھی ذوق نگہ سے کلیۃً محروم نہیں ہے —

عقل ہم عشق است و از ذوق نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرأت رندانہ نیست
با جنوں ذوق جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

عشق کے جنون تخلیق و عمل پر اگر عقل کی روک نہ رہے تو انسانی معاملے درہم برہم ہو جائیں - چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ جنون کی حالت میں گریبان چاک کرنا تو بہت آسان ہے لیکن یہ بہت دشوار ہے کہ جنون بھی ہو اور گریبان بھی سلامت رہے - در اصل یہی عشق و عقل کا امتزاج ہے جو

انسانی عمل کو سعادت کی راہ پر لے جاتا ہے - اقبال نے اسی مسلک کی حمایت کی ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی خالص نکھری ہوئی شکل میں عشق و عقل دونوں ایک ہو جاتے ہیں - اقبال نے جس عقل کی کوتاہیاں ظاہر کی ہیں وہ عقل جزوی ہے جو مادہ کی حقیقت کو سمجھتی ہے لیکن زندگی کو نہیں سمجھ سکتی - وہ جب زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو مسخ کر ڈالتی ہے - وہ تجزیہ کر سکتی ہے لیکن زندگی کو جو ایک تسلسل کی زمانی حقیقت ہے اپنی گرفت میں نہیں لا سکتی - تجزیہ مکانی اشیا کا ممکن ہے لیکن جب عقل جزوی کو زندگی جیسی حقیقت سے سابقہ پڑتا ہے جس کے اجزا آپس میں ایسے گتھے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تو وہ اسے سمجھنے سے قاصر رہتی ہے - وہ ہر حقیقت کا مکانی نقشہ بنانا چاہتی ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھر انہیں جوڑتی ہے تاکہ مکمل حقیقت کا علم ہو سکے - ہر انسانی جذبہ سیکڑوں کیفیات کے عناصر پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک دوسرے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے متعین خطوط ایک دوسرے سے علیحدہ مقرر کرنا ناممکن ہے - لیکن عقل کلی کے ڈانڈے وجدان سے جاکر مل جاتے ہیں - وہ مکمل علم حاصل کر سکتی ہے - اقبال نے اس کو وہی رتبہ دیا ہے جس کی وہ مستحق ہے - وہ تسلیم کرتا ہے کہ عقل بھی انسان کو منزل مقصود کی طرف لے جاتی ہے اور عشق بھی' لیکن دونوں کے طریقوں میں فرق ہے - عقل حیلے حوالے سے منزل طے کراتی ہے اور عشق میں خود اتنی کشش ہے کہ وہ کشاں کشاں قافلۂ حیات کو منزل کی طرف تیز گام لے جا سکتا ہے - اس خیال کو اقبال نے نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے :-

ہر دو بہ منزلے رواں' ہر دو امیر کارواں عقل بہ حیلہ می برد' عشق برد کشاں کشاں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال عقل کو انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ خیال کرتا ہے۔ وہ اس کا مخالف نہیں۔ وہ صرف اس کی کوتاہیوں کو سمجھتا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ جدید تمدن و تہذیب کا زیادہ تر رجحان عقل پرستی کی طرف ہے۔ وہ زندگی کو ایک روکھی پھیکی' بے رنگ و بے لطف میکانکی چیز تصور کرتی ہے۔ جدید عقلیت اس قدر برخود غلط ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور چونکہ اس کے اصول موضوعہ پر عمل پیرا ہونے سے سطحی دنیاوی مفاد کے حصول میں سہولتیں ہوتی ہیں اس لیے ہر شخص اسی کا سہارا چاہتا اور زندگی کی دوسری قوتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اقبال نے اس زمانے کے اور دوسرے بڑے مفکروں کی طرح اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر انسان کے وجدانی سر چشمے خشک ہو گئے تو اس سے زندگی کو بہت بڑا نقصان ہوگا۔ عقل ہم ربطی تو پیدا کر سکتی ہے لیکن تخلیق اس کے بس کے باہر ہے۔ ایک ایسا تمدن جو عقلیت کے نشہ میں سرشار ہو' بہت جلد غیر تخلیقی ہو جائے گا جو در اصل اس کے زوال سے عبارت ہے۔ اس لیے اقبال نے عشق و وجدان کو عقل و علم کے مقابلے میں اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ لیکن اصل حقیقت عشق و عقل کے امتزاج کا نام ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوۂ بے باکش
از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی

عشق و محبت اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود انسانیت۔ یہ جذبہ انسانی جبلت کے ساتھ وابستہ ہے اور زندگی کا قوی ترین محرک ہے۔ اس کی قبائے رنگین لذت تخلیق کے تانے بانے سے بنی ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمات میں اور بعد میں ابن سینا نے عشق کی حقیقت کے متعلق بڑی دقیقہ سنجی

سے بحثیں کیں - ان دونوں کے خیال میں عشق وہ قوت ہے جو عالم کون و فساد میں ربط و نظم قایم کرتی ہے - یہی جذبہ انسان کے دل میں جب جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کو حیات جاودانی بخشتا ہے - اقبال نے اسی خیال کو نہایت لطیف انداز میں اپنی نظم "محبت" میں بیان کیا ہے - وہ کاینات کی اس ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچتا ہے جب کہ آسمان کے ستارے لذت گردش سے نا آشنا تھے اور عروس شب کی زلفیں پیچ و خم سے نا واقف تھیں - گویا نظم هستی پوری طرح قایم نہ ہوا تھا - اشیا کی تخلیق تو ہو چکی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کسی چیز کی کمی ہے اور وہی چیز لذت وجود کی جان تھی - یہ نظم آرٹ کے نقطۂ نظر سے نہایت مکمل ہے -

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مُسلّم سے
کمال نظم هستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینہ کی تمنا چشم خاتم سے

چشم خاتم سے نگینہ کی تمنا کا ہویدا ہونا کس قدر دل کش اور بلیغ استعارہ ہے - شاعر یہ بات ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس وقت ہر چیز غیر مکمل تھی لیکن ہر چیز کی تکمیل کا سامان و امکان موجود تھا - جس طرح کوئی دریا بغیر پانی کے بھیانک معلوم ہوتا ہے اسی طرح ایک انگوٹھی جس میں نگ نہ ہو' پکار پکار کر کہتی ہے کہ میں اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوں - میری کمی کو پورا کرو - اس غیر مکمل حالت کی تصویر پیش کرنے کے بعد شاعر آگے بڑھتا ہے -

سنا ہے عالم بالا پہ کوئی کیمیاگر تھا

صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے

لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اک اکسیر کا نسخہ

چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی

وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب

تمنائے دلی آخر برآئی سعیٔ پیہم سے

پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں

چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے محرم سے

یہ کیمیاگر انسانی شخصیت تھی - اس نے مختلف اجزا کو حل کرکے ایسا مرکب تیار کیا جس کی تاثیر کے طلسم سے آج تک کائنات اسی کا کلمہ پڑھ رہی ہے - اس کے اثر سے سکون حرکت میں بدل گیا - اس حرکت سے جوش حیات اور شوق نمود وجود میں آئے اور دنیا کی وہ ساری عماہمی اور رونق پیدا ہوئی جو آج ہمارے لیے نظرافروز ہے - اس مرکب کے اجزا ملاحظہ ہوں :—

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی

حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی

ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں

مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

جس چیز کی بدولت ذروں میں جنبش پیدا ہوئی اور عناصر میں یہ میلان ظاہر ہوا کہ اپنے ہم جنس عناصر سے ملیں' وہ شاعر کے نزدیک عشق تھا - مادہ کے مختلف ذرات کا اس طرح اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہم آغوش ہو کر اپنے وجود کو مستقل کرنا سائنس کا ایک دل چسپ مسئلہ ہے جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے - اس بلیغ اشارے سے فطرت ایک زندہ حقیقت بن جاتی ہے اور شاعر اپنے اندرونی جذبات و تاثرات کو عالم خارجی پر طاری کر دیتا ہے

--- ---

اقبال کی شاعری کا فنی حیثیت سے تجزیہ کیا جائے تو (۱) رومانیت اور (۲) رمزیت کے عناصر خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں - یہ دونوں عناصر شعری مشرقی ادب کا طرۂ امتیاز رہے ہیں - شاعر اپنی بات در حدیث دیگراں بیان کرتا ہے' اور بلاغت کا کمال بھی یہی ہے - الکنایۃ ابلغ من التصریح - رومانیت اور رمزیت مشرقی ادب میں قدیم سے موجود ہیں - لیکن اہل یورپ ان اسالیب بیان سے نشاۃ جدیدہ کے بعد سے واقف ہوئے - بعض اہل تحقیق کا یہ خیال ہے کہ یہ اسلامی ادب کے اثر کا نتیجہ تھا -

اقبال کی شاعری کا کمال اس کی رمزیت میں مضمر ہے - لیکن اس کی رمزیت مغربی رمزیت کی طرح قدیم ادبی روایات کو کلیۃً ترک نہیں کرتی - چوں کہ اقبال ادب اور آرٹ کو زندگی سے علیحدہ اور بےتعلق نہیں سمجھتا اس لیے

---

(۱) Romanticism (۲) Symbolism

ضرور ہے کہ وہ تسلسل اور روایات کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑے۔ لیکن وہ ایمائی اور اشارتی اسلوب بیان کو اس خوبی سے برتتا ہے کہ باید و شاید ۔ اس کو استعارہ اور کنایہ سے مطالب ادا کرنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ بعض اوقات معمولی الفاظ سے گہرے جذباتی معانی کی تخلیق کرتا ہے۔ رمزیت کی بدولت شاعر کے محدود مشاہدہ میں بے پایانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تخلیق کا یہ وصف ہے کہ وہ لامتناہی ہونا چاہئی ہے۔ اعلیٰ شعر کا مطلب بادی النظر میں جہاں ختم ہوتا ہے در اصل وہاں وہ شروع ہوتا ہے۔ وہ ایسا معنی خیز ہوتا ہے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی کنائے پوشیدہ دیکھتی ہے۔ شعر کا مطلب کبھی محدود نہ ہونا چاہیے۔ رمزیت کا کمال یہ ہے کہ اس کی بدولت سامع کے حافظے میں بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور ہوتی رہیں۔ اقبال کے ہاں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ ایمائی اثر سے ہماری نظروں کے سامنے بے پایانی کی جھلکیاں دکھا دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی تقدیر کو اپنی شخصیت کے آئینہ میں بے حجاب دیکھے اور اپنے بھولے ہوئے خواب کی تعبیر تلاش کرے :—

از روزگار خویش ندانم جز ایں قدر　　خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزو ست

وہ اپنے بھولے ہوئے خواب کی تعبیر ایسے دل کش اور پر اسرار طریقے سے بیان کرتا ہے اور اسی ضمن میں وہ اور بہت سی باتیں اشاروں میں کہہ جاتا ہے کہ آدمی کا جی چاہتا ہے کہ بس سنے جائیے۔ خواب کو سلیقہ سے بیان کرنے کے لیے انسان کو انتہا درجہ بیدار ہونا چاہیے اور خصوصاً بھولے ہوئے خواب کو بیان کرنا ہر کس و نا کس کا کام نہیں۔ بھولے ہوئے خواب کی تعبیر پیش کرنے کی یہ کوشش کس قدر لطیف اور شاعرانہ

کوشش ہے - اس میں ایک زبردست آرٹسٹ کی روح کی حرکت اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے - وہ اپنے اسلوب کی رومانیت اور رمزیت کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے :—

حرف با اہلِ زمیں رندانہ گفت  حور و جنّت را بت و بتخانہ گفت
شعلہ ہا در موج دودش دیدہ ام  کبریا اندر سجودش دیدہ ام

رمزیت کی بہترین تعریف اقبال کے اس شعر میں ہے جس پر خود اس نے اپنے آرٹ میں عمل کیا ہے :—

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست *

اس مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے :—

فلسفہ و شاعری اور حقیقت ہے کیا  حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

ادب اور آرٹ کی ایک قسم وہ ہے جس میں تخیل اور جذبات کا زور ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جس میں طریق فن اور ظاہری شکل کا زیادہ خیال

* رمزیت وہ اسلوب بیان ہے جس میں اشیا و خیالات کو اصلی حالت میں پیش کرنے کے بجائے اشاروں کے ذریعے ظاہر کیا جائے - رمزیت (Symbolism) کی ادبی تحریک کو فرانس میں انیسویں صدی کے اواخر میں خاص طور پر فروغ حاصل ہوا - اس تحریک کے علمبردار کلاسکیت اور رومانیت دونوں رجحانوں کے خلاف تھے - رین بو' مالارمے' پال ورلین اور بودلیر کی شاعری اسی اسلوب کے مطابق تھی - موجودہ ادیبوں میں پال ولیری اس کا سب سے بڑا حامی ہے - جرمنی میں رلکے کی شاعری اسی طرز کی ہے - ویسے گوئٹے اور ہائنے کے ہاں بھی کہیں کہیں یہ رنگ موجود ہے - اس تحریک کا لب لباب مولانا روم کے اس شعر میں موجود ہے :-

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں  گفتہ آید در حدیث دیگراں

غالب نے بھی اسی خیال کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے :-

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو  بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ دوسری جگہ کہتا ہے :-

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد  محرم آنست کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

ملحوظ رکھتا ہے - بالعموم اول الذکر تخلیقی اور ثانی الذکر روایتی نوعیت رکھتے ہیں - مغربی ادب اور آرٹ کی تاریخ میں ان دونوں رجحانوں کو رومانی اور کلاسکی کی اصطلاحوں سے تعبیر کرتے ہیں - اقبال کے ہاں ان دونوں میلانات کا امتزاج موجود ہے - اس نے قدیم اور روایتی اسلوب بیان کو کلیۃً ترک نہیں کیا بلکہ اس پرانے اور فرسودہ ڈھانچے میں زندگی کا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اس نے نہایت خوبی سے پرانے فنی طریق کار کو اپنے جذبات و تخیل کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا ہے - اس کے ہاں لفظوں کی مناسبت' موزونیت اور ضبط بھی ہے اور تخیل کی جولانی کے لیے زبان و محاورہ کی بے قید آزادی بھی - کلاسکی مسلک کے مطابق انسانی فطرت متعین ہے - صرف نظم و ترتیب اور مقررہ روایات کی پابندی سے آرٹسٹ کوئی دلپذیر چیز پیدا کرسکتا ہے - اس مسلک کے حامی کہتے ہیں کہ غیر محدودیت اور بلند پروازی کے عناصر آرٹ کے لیے مہلک ہیں - ان کے نزدیک انسانی زندگی کے امکانات بھی محدود ہیں -

رومانیت کے ادبی مسلک کا حامی زندگی کے روحانی اور وجدانی عنصر کو مادی اور حیوانی عنصر پر فوقیت دیتا ہے - اس کے نزدیک جذبہ اور عمل بہ نسبت خالص فکر کے قابل ترجیح ہیں - وہ آرٹ کی تخلیق میں بے پایانی اور لا محدودیت کے تصور سے کام لیتا ہے اس لیے کہ وہ زندگی کو بے پایاں اور پر از ممکنات تصور کرتا ہے - زندگی کا کوئی مظہر قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے مکمل نہیں - چوں کہ موجودہ حقیقت کا دائرہ اس کے جولاں تخیل کے لیے تنگ ہوتا ہے اس واسطے وہ اپنی عین دنیا پیدا کرلیتا ہے جہاں اس کا ذوق تخیل سامان تسکین بہم پہنچاسکے - اس مسلک کا حامی شاعری کا یہ حق سمجھتا ہے کہ وہ تجریدی تخیل کو خارجی شکل دے اور اپنے نفس گرم سے اس کو جان دار بنادے - وہ جن مسائل حیات کے متعلق تخیل کی جیتی جاگتی تصویریں ہماری

نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ در اصل پہلے اس کے ذہن میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر عرصے سے موجود تھی - انسانی ذہن جو بجائے خود محدود ہے تخیل کے ذریعے غیر محدود اور بے پایاں تصورات کی تخلیق کرسکتا ہے - آرٹسٹ کا نفس گرم کیفیات شعوری کی ساری منتشر قوتوں کو اپنی شخصیت کی وحدت عطا کرتا ہے - اگر اس میں نفس گرم نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں - والٹیر جیسا کلاسکی ادیب ادب میں ضبط و ترتیب کو انتہا درجہ اہمیت دیتا تھا - اس کے بغیر کسی آرٹ کو مکمل نہیں تصور کرتا - اس نے ایک دفعہ اپنے زمانے کی مشہور المیہ اداکار میڈموزل ڈیومیسنل (Mll. Dumesnil) کی اداکاری کو دیکھ کر کہا تھا کہ وہ بہت غیر جذباتی قسم کی ہے - میڈموزل ڈیومیسنل نے جب یہ تنقید سنی تو والٹیر سے شکایتاً کہا کہ "آپ جس لب و لہجہ کی مجھ سے توقع رکھتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے جسم میں شیطان ہو" - والٹیر نے جواب دیا کہ "اس میں کیا شک ہے کہ ہر آرٹ میں کمال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے جسم میں شیطان ہو" - والٹیر کی اس سے یہ مراد تھی کہ ہر تخلیقی آرٹ جذبہ کے تحت وجود میں آتا ہے + - اقبال بھی

+ والٹیر نے نہایت لطیف اور بلیغ بات کہی ہے - شیطان سے اس کی مراد انسان کے وہ صفات و لوازم ہیں جن کا اظہار مختلف جذبات کی شکل میں ہوتا ہے - اس کے کہنے سے ایک ہزار سال قبل حضرت رسول اکرم فرما چکے تھے - ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم (شیطان انسان کے اندر اسی طرح گردش کرتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے) یہ حدیث مسلم اور بخاری دونوں میں ہے - شیطان ہی وہ چیز ہے جو انسان کی رگ رگ اور نس نس میں نشتر لیے نچوکے دیتا پھرتا ہے - در اصل شیطان سے مراد جذبات کی تخلیقی قوت ہے جس کو سیدھی راہ پر ڈالنے کی کوشش مذہب و اخلاق کرتے ہیں - انہیں جذبات سے زندگی کے مفاسد بھی پیدا ہوتے ہیں اور انہیں کی بدولت انسانی سیرت اپنے معراج کمال تک پہنچتی ہے - بغیر ان کے زندگی نہایت روکھی پھیکی اور بے لطف چیز ہو جائے - زندگی اور آرٹ کا چمن انہیں کی بدولت سرسبز رہتا ہے - جو آرٹ جذبہ سے خالی ہے وہ غیر حقیقی اور مصنوعی ہے -

اپنے آرٹ کی یہی نشانی بتاتا ہے کہ اس میں نفس گرم کی آمیزش ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں :—

من آں جہان خیالم کہ فطرت ازلی
جہان بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم
تواں ز گرمی آواز من شناخت مرا

مشرق کے شعرا سے اقبال کو یہ شکایت ہے کہ ان کے ہنر میں نفس گرم اور خلش آرزو کی کمی ہے - اپنی نظم "شاعر" میں وہ کہتا ہے :—

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

رومانیت پسند آرٹسٹ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتا ہے - وہ اپنے اندرونی ترنم کی ساری صلاحیتوں کو اپنی روح کے گرد مرکوز کر دیتا ہے - اسی لیے اس میں ایک طرح کی انفرادیت پسندی اور موضوعیت ، پیدا ہونا لازمی ہے - وہ اپنے دل کی امنگوں اور حوصلوں کو دباتا نہیں - اس کی بے چین طبیعت اکتا دینے والے موجود پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں حسب منشا تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے - یہی عینیت کی بنیاد ہے جس پر سارا رومانی آرٹ مبنی ہے - لیکن اس کے معنی حقیقت سے گریز نہیں بلکہ اس

میں تبدیلی پیدا کرنے کی خواہش ہیں - جس طرح ایک اولوالعزم مہم جو کو اس وقت تک چین نہیں پڑتا جب تک کہ وہ جوکھوں میں نہ پڑے اور نئے نئے ملک نہ دریافت کرے اسی طرح رومانیت پسند آرٹسٹ بنے تکے اور مقررہ موضوعوں کے بجائے اپنے دل کی دنیا کے گوشوں اور وادیوں کی چھان بین کرتا اور نئے نئے موضوعوں کے ذریعے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے - اس دوامی امید اور آزادی کی بدولت اس کے آرٹ میں بے انتہا وسعت پیدا ہو جاتی ہے - اپنے آرٹ کی آزادی کا اقبال نے اپنے پیشرووں سے اس طرح مقابلہ کیا ہے :—

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

بعض اوقات رومانیت پسند آرٹسٹ کی بے راہ روی اور بے قاعدگی اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے لیکن اقبال اپنے کلام میں نظم و ضبط کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا - اس نے بھی گوئٹے کی طرح اپنے آرٹ میں حقیقت پسندی اور عینیت' رومانیت اور کلاسکیت کا امتزاج پیدا کر لیا ہے - وہ زبان و ادب کے مسلمہ قواعد سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا - در حقیقت اقبال کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس پر مشکل ہی سے آپ کوئی ادبی لیبل لگا سکتے ہیں - جس طرح اس کے فلسفہ میں عینیت اور معروضیت دونوں کے عناصر موجود ہیں اسی طرح اس کے آرٹ میں بھی مختلف دھارے آکر مل گئے ہیں جنہیں اس نے اپنی ذہنی قوت سے ایک کر لیا ہے - بجائے مختلف میلانوں کے تضاد کے اس کے ہاں ہمیں ایک قسم کی لطیف ہم آہنگی اور وحدت نظر آتی ہے جس کو وہ اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کرتا ہے - دراصل انسانی تجربہ نہ خالص

موضوعی ہوتا ہے اور نہ خالص معروضی بلکہ اس میں ہمیشہ دونوں کی آمیزش موجود رہتی ہے - کائنات فطرت اور انسانی انا (خودی) آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گُتھے ہوئے ہیں کہ انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا - شاعر بھی اپنے اندرونی تجربات و کیفیات کو زبان کے ذریعے بیان کرنے پر مجبور ہے جو ایک معروضی اور مکانی چیز ہے - شاعر اپنے اندرونی جذب سے اس پر قابو پاتا ہے - شاعرانہ اظہار اس اعتبار سے تسخیر فطرت ہے یا یوں کہیے کہ نفس انسانی اس طور پر خارجی مزاحمت کو دور کرتا اور موجودات ذہنیہ کو متعین کرتا ہے - سائنس اور آرٹ کی ہر صداقت زبان کی محتاج ہوتی ہے - صداقت صداقت اس وقت بنتی ہے جب وہ معرض بیان میں آسکے - شاعر اپنے الفاظ سے کائنات مدرکہ کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتا ہے جو اس کی انا کا جزو ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے آرٹ کو مخصوص شکل و صورت عطا کرتا ہے - اس کا آرٹ اگر چہ زندگی سے الگ نہیں ہوتا لیکن اس کی مخصوص شکل پھول کی پنکھڑیوں کے مثل ہوتی ہے جو اصل میں پتیاں ہوتی ہیں لیکن خاص مقصد کی تکمیل کے لیے مخصوص شکل و صورت اختیار کر لیتی ہیں - ظاہری اور سطحی نظر والے کو اس میں دھوکا ہو سکتا ہے لیکن حقیقت بیں نگاہ سے اصلیت نہیں چھپ سکتی - چنانچہ بعض اوقات وہ شاعر حقیقت سے زیادہ قریب ہوتا ہے جو رمز و کنایہ کے ذریعے اپنے اندرونی تجربے کو ظاہر کرتا ہے بہ نسبت اس کے جو محض خارجی فطرت کی ہو بہو نقل کو حقیقت نگاری کا کمال سمجھتا ہے -

اقبال کے طرز ادا میں آزادی' مستی اور جذب ایسے ملے ہوئے ہیں کہ انسان اس کے کلام کو سن کر وجد کرنے لگتا ہے - وہ اپنی شخصیت کا اظہار لفظ "قلندر" سے کرتا ہے جس سے بڑھ کر رومانیت پسندی کے اظہار کے لیے غالباً اور کوئی

دوسرا لفظ نہیں - رومانیت اور رمزیت کی روح اس ایک لفظ "قلندر" میں آگئی ہے -

ز بیرون درگزشتم ز درون خانہ گفتم　　سخن نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

اسی مضمون کو اردو میں اس طرح کہا ہے :—

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

ایک جگہ اس نے ان چیزوں کو گنایا ہے جو وہ بطور تحفہ بزم شوق یعنی زندگی کے لیے لایا ہے - یہ سب چیزیں رومانیت کی جان ہیں :—

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

شاعر خاص خاص موضوعوں کو اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق منتخب کرتا ہے تاکہ ان کے ذریعے اپنی شعری کیفیات کا اظہار کرے - موضوع کے انتخاب کے لیے بڑا سلیقہ درکار ہے - پھر موضوع کی تصویر کا صرف وہی پہلو نمایاں کرنا جو آرٹسٹ کی نظر میں اہمیت رکھتا ہے اور طبایع انسانی کے لیے اس میں کشش ہے خاص ذوق پر دلالت کرتا ہے - ذہن انسانی مختلف حسیات و ادراکات میں سے اصول تجربہ کے مطابق صرف انہیں کو اپنے موضوع کی مناسبت سے چُنتا ہے جن کے ذریعے کلام موثر بن سکے - ہر آرٹسٹ میں، چاہے کسی ادبی مسلک سے اس کا تعلق ہو، بعض جبلی رجحانات ہوتے ہیں جن کا اس کے کلام میں ظاہر ہونا ضروری ہے - اس کے یہ میلانات اس کے موضوعوں کی شکل اختیار کرتے ہیں - وہ جب انسان یا فطرت کا مطالعہ کرتا ہے تو کبھی اپنے ذہنی رجحان کا عکس اپنے ماڈل (Model) میں دیکھتا ہے اور کبھی اپنے ماڈل کی معنوی خصوصیات کے

مطابق اپنی ذہنی تجرید کرتا ہے - بعض صنّاعوں میں یہ موضوعی اور معروضی دونوں طریقے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں - بڑے آرٹسٹ کا کمال یہ ہے کہ ان دونوں میلانات میں امتزاج پیدا کرے اور غلو سے احتراز کرے ورنہ اس کا آرٹ حقیقت سے دور ہو جائے گا - اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض اوقات حقیقتِ موجود و محسوس سے زیادہ وہ خواب حقیقی ہوتا ہے جو اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے - لیکن اس کے علاوہ ایک معیار مصنوعی کمال‌بینی کا ہے - آرٹسٹ نہ تو اپنے ذاتی میلانات کے مطابق مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور نہ خارجی حقایق کی معنوی خصوصیات کے لحاظ سے اپنے ذہنی اور تخئیلی پیکروں کی تشکیل کرتا ہے بلکہ محض رسمی قواعد کے بموجب اپنا معیار فن و کمال متعین کرتا ہے - اس قسم کا آرٹ جھوٹا، نقلی اور غیر حقیقی ہوتا ہے - ہمارے ادب میں غزل کا مروجہ طریق اسی نوعیت کا ہے -

اقبال کے کیرکٹر اس کے اندرونی وجدان کا عکس ہوتے ہیں - لیکن وہ اپنے تخئیل کی دنیا میں ایسا گم نہیں ہو جاتا کہ حقیقی اور اصلی دنیا کے مظاہر اس کے لیے موجود نہ رہیں - اس کے کیرکٹر اس کے تصور حیات کی ترجمانی کرتے ہیں - پہلے وہ ان کی تصویر اپنے آئینۂ نفس میں دیکھتا ہے اور پھر اسے دوسروں کو دکھاتا ہے - وہ ان کی معنوی خصوصیات اجاگر کرنے کے ساتھ اپنے ذاتی میلانات کو بھی اشاروں میں بیان کر دیتا ہے - وہ اپنے آرٹ کے ذریعے احساس حیات کو اپنے اور دوسروں کے لیے زیادہ شدید، گہرا اور معنی خیز بنا دیتا ہے - وہ شاعری کے ذریعے زندگی سے گریز کا کام نہیں لیتا بلکہ زندگی کے انکشاف کا - اس کے طرز بیان میں جوش و جذبہ کی باطنی گہرائی ہے - اس کی شاعری کی خصوصیت یہ

ہے کہ وہ محض زندگی کے حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کی توجیہ بھی پیش کرتا ہے - اس کے آرٹ کا کمال اس میں ہے کہ وہ اپنے شخصی اور ذاتی احساس کو نہایت خوبی سے عام اور عالمگیر بنا دیتا ہے اور اپنے طلسم الفاظ سے سامعین پر ایسا اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ زندگی کو بہ نسبت پہلے کے بہتر سمجھنے لگیں - وہ زندگی کے کسی مظہر کو حقیر نہیں سمجھتا اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ ان کی کنہ تک پہنچنے کے لیے انسانی ذہن کو کتنی سعی و جہد کرنی پڑتی ہے - یہ مختلف مظاہر حیات جب اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں تو وہ اپنے احساس کو شعر کا جامہ پہنا دیتا ہے -

آرٹسٹ اس وقت تک اپنے لطیف تصورات کو دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ انہیں موزوں لباس نہ پہنائے اور آداب فن اور طریق کار کا پورا پورا لحاظ نہ رکھے - اس کا احساس چاہے کتنا گہرا اور شدید اور اس کا تخیل چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن اثر آفرینی کے لیے آداب فن کے پورے لوازمات برتنا ضروری ہے - ظاہری کلام کی نفاست خود جذبات و تخیل کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے - شاعر کو اپنے لفظوں کے اثر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہونا چاہیے - لفظوں میں اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کتاب میں پڑھی ہوئی یا سنی سنائی باتوں کے بجائے اپنی زندگی کی حقیقی واردات کا اظہار کرے - اگر اس میں خلوص نہیں تو وہ لفظوں کا چاہے کیسا ہی دل نواز ترنم کیوں نہ پیدا کرے اور تخیل کا چاہے کیسا ہی نظر افروز پری خانہ کیوں نہ تعمیر کرے، اس کی آواز کھوکھلی، مصنوعی اور بے اثر رہے گی - وہ آواز ایسے شخص کی ہوگی جس کی روح اندر سے خالی ہے - برخلاف اس کے جس آرٹسٹ نے زندگی کے حقیقی تجربات پر اپنے تخیل کی بنا رکھی ہے وہ

اپنی پہلی آواز میں دلوں پر قابو پا لے گا - اس کے کلام میں پیام ابدیت پنہاں ہوگا جو اس کی شخصیت کی طرح انمٹ ہوگا - لیکن یہ اثر آفرینی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آرٹسٹ کو اپنے فنی طریق کار پر پوری قدرت حاصل نہ ہو - ضرور ہے کہ حقیقی احساس اور بلند تخیل الفاظ کی جو خارجی قبا زیب تن کرے وہ اس کے شایان شان ہو - اگر شاعر کو فنی طریق کار پر قدرت حاصل نہیں تو باوجود تخیل کی بلندی کے اس کی باتیں اکھڑی اکھڑی ہوں گی اور وہ کبھی سامع پر اثر پیدا نہ کر سکے گا - اثر آفرینی کے لیے موضوع سے بھی زیادہ اہمیت طرز ادا کو حاصل ہے - شاعر کو جو کہنا ہے وہ بلا شبہ اہم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے - طرز ادا کا انحصار کافی شاعر کی شخصیت پر ہوتا ہے جس کی بدولت کلام میں غیر معمولی قوت اور تازگی پیدا کی جا سکتی ہے

اب ہم اقبال کے چند شاعرانہ موضوعوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جن میں اس نے رومانیت ' کلاسکیت اور رمزیت کے ادبی مسلکوں کا بڑی خوبی سے امتزاج کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے تخیل میں غیر معمولی قوت ' وسعت اور بلندی پیدا ہوگئی ہے -

اقبال نے اپنی نظم "تسخیر فطرت" میں میلاد آدم اور انکار ابلیس کا قصہ بیان کیا ہے - شیطان کا کیرکٹر ایک خالص رومانی کیرکٹر ہے اس کی داستان آرٹ کا ایک زبردست المیہ (Tragedy) ہے - المیہ کی روح یہ ہے کہ کسی شخصیت کی اندرونی کشمکش ایک ناگزیر حقیقت ہو جس سے مفر ممکن نہیں - یہ شخصیت کسی مقصد کے لیے جد و جہد میں اپنی جان کو مبتلائے الم کرتی ہے لیکن باوجود ہر کوشش کے مقصود حاصل نہیں ہوتا - کبھی فطرت اور کبھی

تقدیر اس کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں - المیہ کے موضوع کی سیرت میں جو جذبات محرک عمل ہوتے ہیں وہ اس کی خلقت کے ساتھ ایسے وابستہ ہوتے ہیں کہ ان کی کشمکش سے کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا - یہ جبر، یہ تقدیری عنصر المیہ کی جان ہے - یہ جبر و تقدیر اسی قانون فطرت کے تابع ہوتے ہیں جس کے تحت المیہ کے ہیرو کی کشمکش اور اپنے مقدر کو بدلنے کی سعی و جہد - المیہ کے ہیرو کی شخصیت کے ساتھ عالمگیر دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے اس واسطے کہ اس کی طبیعت کے عناصر سب انسانوں میں کم و بیش مشترک پائے جاتے ہیں - شیطان کا کیرکٹر بھی اسی نوعیت کا ہے - ملٹن نے "فردوس گم شدہ" میں اور گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں شیطان کے کیرکٹر کو اسی انداز میں پیش کیا ہے - اقبال نے بھی شیطان کے کیرکٹر کے متعلق مختلف جگہ نہایت لطیف اشارے کیے ہیں - اس کے نزدیک شیطان خودی، لذت پرستی اور خالص عقل کا ایک پیکر مجسم ہے جو کسی قسم کے ضبط و آئین کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے - اس کی روح محبت اور عقیدت سے یکسر عاری ہے جس کے بغیر خودی گم گشتہ راہ رہتی ہے - وہ انکار اور نفی کی روح ہے - اضطراب اور لذت پرستی اس کے خمیر میں ہیں - عشرت حیات اور قوت عمل کے تانے بانے سے اس کی قبائے زندگی بنی ہے - زندگی کی محبت اور عمل کا ولولہ اسی کے رہین منت ہیں - اس کی کوتاہی یہ ہے کہ ضبط و ترتیب کے ساتھ اپنی شخصیت کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کے بجائے اس نے یک طرفہ اور غیراخلاقی ذہنی زندگی کو ترجیح دی - نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی اقدار میں توازن اور ہم آہنگی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا - انسانی خودی میں بھی شیطانی عنصر موجود ہوتا ہے - انسان کی جبلّت کا تعلق تحت شعوری احساس سے ہے جو مثل ایک تاریک غار کے ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں - اس میں

نیکی اور بدی دونوں عناصر پوشیدہ ہیں - شیطان بدی کا لاشعوری عنصر ہے جو حرکت اور تخلیق کی قوت کا خزانہ ہے - اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ شورش اور طوفان کے آغوش میں پرورش پائے - اسے نظم آفرینی سے دشمنی ہے - وہ مذہب و اخلاق کا اسی لیے مخالف ہے کہ یہ دونوں انسانوں کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنا چاہتے ہیں - شیطان جیسا ہے ویسا ہمیشہ رہے گا - وہ اپنی خلقت کی کسی خاص کوتاہی کے باعث اپنی تقدیر کی آیندہ تشکیل پر قابو نہیں رکھتا - البتہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ کوئی اپنے مقدر کے ہاتھوں مجبور محض ہو جائے -

اقبال نے ''تسخیر فطرت'' میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جب ذات باری نے شیطان کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر تو اس نے صاف انکار کر دیا اور جواب دیا کہ مجھے بھی کیا دوسرے فرشتوں کی طرح بھولا بھالا' خودی ناآشنا سمجھا ہے کہ میں خاک کے پتلے کے آگے اپنا سر نیاز خم کروں - میں خود اس سے افضل ہوں - میری وجہ سے زندگی کی ساری رونق اور ہنگامہ زائیاں قایم ہیں - وہ ذات باری کو یوں خطاب کرتا ہے :—

نوریٔ نادان نیم' سجدہ بآدم برم — او بہ نہاد است خاک' من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من خونِ رگ کائنات — من بہ دو صرصرم' من بہ غو تندرم
رابطۂ سالمات' ضابطۂ امہات — سوزم و سازے دہم' آتش میناگرم
ساختۂ خویش را' در شکنم ریز ریز — تا ز غبار کہن' پیکر نو آورم
پیکر انجم ز تو' گردش انجم ز من — جاں بجہاں اندرم' زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی' شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہ زنی' من بہ تپش رہبرم
آدم خاکی نہاد' دوں نظر و کم سواد — زاد در آغوش تو' پیر شود در برم

اب شیطان آدم کو بہشت میں بہکاتا اور یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ تیری یہ سکون کی زندگی کس قدر بے سوز' بے رنگ اور بے کیف ہے - جب تک تو دل

میں سوز و تپش نہیں پیدا کرے گا اس وقت تک تو اس قابل نہ ہوگا کہ زندگی کا اصل لطف اٹھا سکے - میرے ساتھ آ ' میں تجھے ایک نئی دنیا کی سیر کراؤں اور تجھ کو سوز و ساز زندگی سے آشنا کروں -

زندگیٔ سوز و ساز بہ ز سکون دوام فاختۂ شاهیں شود از تپش زیر دام

ھیچ نیاید ز تو غیر سجود نیاز خیز چو سرو بلند' اے بعمل نرم گام

کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل گیر ز میخانۂ تاک بادۂ آئینہ فام

خیز کہ بنمایمت مملکت تازۂ چشم جہاں بیں گشا ' بہر تماشا خرام

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل چیست حیات دوام؟ سوختن نا تمام

آدم شیطان کے کہنے میں آگیا اور اس پر عمل کیا - جنت سے نکل کر خاک‌دان تیرہ کی سیر کی تو زندگی کے سوز و شورش میں غیر معمولی لذت محسوس کی جس سے اب تک وہ نا آشنا تھا - اس کے دل میں آرزو کی کسک پیدا ہوئی - پہلی سی وہ اندھادھند عقیدت بھی باقی نہیں رہی بلکہ اب ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا - اس کا یقین شبہ میں تبدیل ہو گیا - اب جب تک وہ اپنے ذہن کو تسکین نہ دے لے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا - اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے شاعر فوراً اپنی نظم کی بحر بدل دیتا ہے جس سے آزادی اور شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے - آدم اپنی نئی زندگی کا حال اس طرح مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے -

چہ خوش است زندگی را همہ سوز و ساز کردن

دل کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے

رہ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن

بگداز ہائے پنہاں' بہ نیاز ہائے پیدا

نظرے ادا شناسے بہ حریم ناز کردن

ہمہ سوز نا تمامم ہمہ درد آرزویم

بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

یہ نظم ہر اعتبار سے مکمل ہے - مضمون کے اُتار چڑھاؤ اور مطالب کی مناسبت سے وزن و بحر میں نہایت خوبی سے تبدیلی کی گئی ہے - نیکی اور بدی کے ازلی محاربہ کے دونوں ہیرو آدم اور شیطان کی نفسی کیفیات کو اس سے زیادہ لطیف اور دل کش انداز میں ظاہر کرنا ممکن نہ تھا - اس نظم کا آخری سین یہ ہے کہ آدم حضور باری میں عذر گناہ پیش کر رہا ہے - وہ کہتا ہے کہ اگرچہ مجھ سے فروگذاشت ہوئی لیکن اس کو کیا کروں کہ بغیر شیطان کے فسوں کا مزہ چکھے ہوئے خود میری انسانیت مکمل نہیں ہوتی - انسان کامل جب تکمیل خودی کر لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ باوجود وساوس شیطانی کے اقدار حیات کی تخلیق کر سکے - انسان کی یہی صلاحیت اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دلاتی اور زندگی کے شیطانی عنصر پر اس کو قابو بخشتی ہے - آدم کہتا ہے :-

گرچہ فسونش مرا برد ز راہ صواب از غلطم درگزر عذر گناہم پذیر

رام نگر دوجہاں تا نہ فسونش خوریم جز بکمند نیاز ناز نہ گردد اسیر

تا شود از آہ گرم ایں بت سنگیں گداز بستن زنار او بود مرا نا گزیر

عقل بدام آورد فطرت چالاک را

اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

"بال جبریل" میں شاعر نے یہ منظر بیان کیا ہے کہ جب آدم بہشت سے نکالے گئے تو روح ارضی نے ان کا استقبال کیا اور انہیں یقین دلایا کہ

تیرے فیضے میں سب کچھ ہے - زمانہ تیرے رخ زیبا کا آئینہ ہے جس میں تو اپنی ادائیں دیکھ سکتا ہے : —

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
نا پید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ

" بال جبریل " میں جبریل اور ابلیس کا مکالمہ نہایت دلچسپ ہے - جبریل اپنے ہمدم دیرینہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذرا کچھ جہان رنگ و بو کا حال ہمیں تو بتاؤ - شیطان جواب دیتا ہے کہ جہان عبارت ہے سوز و ساز و درد و جستجو سے - پھر جبریل بھولے پن سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس کا امکان نہیں کہ تو پھر ذات باری میں قرب حاصل کر لے - اگر تو اپنے افعال سے باز آ جائے تو ممکن ہے پھر تجھ کو تیرا پرانا مرتبہ مل جائے - یہ سن کر شیطان نے جواب دیا کہ میں اب افلاک پر آکر کیا کروں گا - وہاں میرا دل نہیں لگے گا - وہاں کی خموشی اور سکون میرے لیے اجیرن ہو جائیں گے - افلاک پر جہان رنگ و بو کی سی ہماہمی اور شورش کہاں ؟ جب جبریل نے یہ باتیں سنیں تو بولے کہ انکار تیری سرشت معلوم

ہوتی ہے - اس کی وجہ سے تونے فرشتوں کی بے عزتی کرائی - چشم یزداں میں اب ان کی خاک آبرو رہی - اس پر شیطان نے جواب دیا کہ میری جرأت رندانہ سے کائنات میں ذوق نمو پیدا ہوا - تیرا کیا ہے' تو تو فقط ساحل پر کھڑا تماشا دیکھا کرتا ہے - تو خیر و شر کی جنگ کو دور سے دیکھتا ہے اور میں اس میں شریک ہو کر طوفانوں کے طمانچے کھاتا ہوں - میری بدولت آدم کے قصے میں رنگینی پیدا ہوئی ورنہ وہ بڑا ہی خشک اور بے لطف قصہ تھا :—

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

انسان جو شیطان کے کہنے میں آکر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے در اصل ہمدردی کا مستحق ہے - وہ بعض اوقات گناہ کے منہ میں کشاں کشاں اپنی جہلت اور تقدیر سے مجبور ہو کر چلا جاتا ہے - گناہ ایسی دل کش شکل میں گناہ گار کے سامنے آتا ہے کہ وہ باوجود اپنے ضبط کے اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے - انسانی زندگی کا یہ بھی ایک المیہ ہے - شخصیت کی اندرونی کشمکش جبر و اختیار کے بھنور میں اس طرح پھنس جاتی ہے کہ اس سے آدمی کے لیے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے - اقبال کو گناہ سے نفرت ہے اس لیے

کہ اس سے ہر شر کی طرح شخصیت اور خودی ضعیف ہوتی ہے لیکن گناہ گار سے وہ نفرت نہیں کرتا بلکہ ہمدردی کرتا ہے - فطرت انسانی کے رمز شناس کی حیثیت سے اس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ بعض اوقات انسان کو تقدیر کے آگے ہار ماننی پڑتی ہے - اگرچہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ شخصیت کا نشو و نما تقدیروں تک کو بدل سکتا ہے -

" جاوید نامہ " میں اقبال نے " فلک قمر " کی سیر کا حال لکھا ہے - وہ کہتا ہے کہ جب وہ وادیٔ طواسین میں پہنچا تو وہاں گوتم بدھ سے ملاقات ہوئی - گوتم نے اپنا فلسفیانہ تصور حیات شاعر پر اس طرح واضح کیا :—

ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی گزرد
کوہ و صحرا و بر و بحر کراں چیزے نیست
از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگزر
کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

ذرا آگے بڑھا تو شاعر کی ملاقات ایک زن رقاصہ سے ہوئی جس نے گوتم کے ہاتھ پر توبہ کی تھی - اس کے لہجۂ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلک قمر کی خموشی اور سکون سے تنگ آگئی ہے - شاعر اب فوراً گوتم کے سنجیدہ لہجے کو بدل دیتا ہے اور نہایت شگفتہ بحر میں رقاصہ کا حال دل لکھتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ حرکت اور رقص کی حالت میں ہے - رقاصہ یوں گویا ہوتی ہے :—

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
از تو درون سینہ ام برق تجلی کہ من
با مہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد

عشق فریب می دہد جان امیدوار را

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں بھولی بسری یادیں چٹکیاں لے رہی ہیں - اقبال نے رمزیت کا کمال ان اشعار میں ظاہر کیا ہے - یہ رقاصہ در اصل زندگی کی حرکت اور ہم آہنگی کا پیکر مجسم ہے - فلک قمر کے دائمی سکون سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا ہے اور اس کی فطرت سوز و شورش کی متقضی ہے جس کا وہاں کوئی سامان نہیں - شاعر کی نکتہ رس آنکھ اس کے لطیف جذبات و کیفیات تک پہنچ جاتی ہے اور اپنے موضوع کے تاثرانگیز پہلو کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کر دیتی ہے - رقاصہ کہتی ہے :-

تا بفراغ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم

باز بہ مرغزار دہ طائر مرغزار را

طبع بلند دادۂ بند ز پائے من کشائے

تا بہ پلاس تو دہم خلعت شہریار را

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است

عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

اگر فرہاد نے شیریں کی خاطر تیشہ سے پہاڑ میں نہر کھودنی چاہی تو یہ کونسی تعجب کی بات ہے - رقاصہ کہتی ہے کہ عشق میں تو وہ قوت ہے کہ تیشہ چلانے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور آدمی ایسے کوہساروں کو اپنے دوش پر اٹھائے پھرے * تعجب اس پر ہے کہ جب بغیر تیشہ کے بھی وہ اپنا مقصد

---

* غالب کہتا ہے کہ فرہاد کو جان دینے کے لیے تیشہ کی ضرورت پڑی یہ اس سبب سے تھا کہ وہ "سرگشتۂ خمار رسوم" تھا ورنہ عام طریقے سے مرنے سے اجتناب کرتا :-

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

بقیہ بر صفحہ ۸۹۷

حاصل کر سکتا تھا تو پھر اس نے تیشہ کیوں اٹھایا - اس نظم کا ہر شعر موسیقی میں رچا ہوا اور رقص کے لیے موزوں ہے - نہ صرف رقص بلکہ نیرت کے لیے بھی یہ اشعار نہایت خوبی سے استعمال کیے جا سکتے ہیں - بلاغت کلام کے ایسے نمونے دوسرے شعرا کے ہاں مشکل ہی سے دستیاب ہوں گے - «بلند ز پائے من کشائے» کا ٹکڑا رقاصہ کی بانی کس قدر حسرتوں اور آرزووں کو اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے - لطف یہ ہے کہ شاعر کے ہاتھ سے حقیقت کا دامن کہیں نہیں چھوٹتا اگرچہ وہ رمز و ایما کی زبان سے سب کچھ کہتا ہے -

اقبال نے 'پیام مشرق' میں ایک اور نہایت دل چسپ رومانی موضوع پر طبع آزمائی کی ہے - اس نے ''حور اور شاعر'' کے عنوان سے ایک نظم' المانوی شاعر گوئٹے کی اسی موضوع کی نظم کے جواب میں لکھی ہے - اتفاق سے کہیں کوئی شاعر بھولا بھٹکا جنت میں پہنچ گیا - وہ اپنے خیالات میں ایسا محو تھا کہ جنت کی دل کشی کی طرف اس نے کوئی توجہ نہ کی - حور اس سے کہتی ہے - کہ تو عجیب و غریب مخلوق ہے کہ نہ تجھے شراب کا شوق ہے' نہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے - تو راہ و رسم آشنائی سے بالکل بیگانہ معلوم ہوتا ہے - بس تجھے یہ آتا ہے کہ اپنے سوز آرزو سے خیالی دنیا کا ایک طلسم پیدا کرے - اس پر شاعر کہتا ہے کہ میرا دل جنت میں نہیں لگتا - آرزو کی کسک

بقیہ صفحہ ۸۹۶

پھر دوسری جگہ اپنی طبیعت کی ندرت اور طرفگی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ یہ قصہ تو ہر ایک نے سنا ہوگا کہ حضرت ابراہیم آگ میں نہیں جلے لیکن شاید یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہو کہ میں بغیر شعلہ و شرر کے بھی جل سکتا ہوں :-

شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم　　بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

حضرت ابراہیم کے متعلق تو تم نے سنا ہوگا لیکن میری حالت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو - 'شنیدۂ' اور 'بہ بیں' کا تقابل کتنا دل پذیر ہے -

مجھے کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی - جب میں کسی خوبرو کو دیکھتا ہوں تو بجائے اس کے کہ اس کے حسن سے لذت اندوز ہوں' میرے دل میں فوراً یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش کہ اس سے بھی زیادہ خوبرو کو دیکھا ہوتا - جنت تو بڑی بےلطف جگہ ہے - یہاں نہ نوائے دردمند سنائی دیتی ہے' نہ یہاں غم ہے اور نہ غمگسار' یہاں ہر کوئی مطمئن نظر آتا ہے' کسی کے دل میں داغ تمنا نہیں - حور شاعر کو اس طرح خطاب کرتی ہے :—

نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی
عجب این کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی
بنوائے آفریدی چہ جہان دل کشائے
کہ ارم بچشم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر اس کا اس طرح جواب دیتا ہے :-

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے

نہ نوائے درد مندے نہ غمے نہ غمگسارے †

---

† اسی مضمون کو غالب نے اپنی مثنوی "ابر گہر بار" میں بیان کیا ہے - وہ بہشت کا منظر یوں پیش کرتا ہے :-

هماں پاک میخانۂ بے خروش　　چہ گنجایش شورش نائے و نوش
سیہ مستئ ابر باراں کجا ؟　　خزاں چوں نباشد بہاراں کجا ؟
اگر حور در دل خیالش کہ چہ　　غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ ؟
چہ منت نہد ناشناسا نگار　　چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا　　فریبد بسوگند وینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوے　　دہد کام و نبود دلش کام جوے
نظر بازی و ذوق دیدار کو　　بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند در لالۂ　　نہ دل تشنۂ ماہ پر کالۂ
بہ بند امید استواری نرست　　بہ غالب خط رستگاری نرست

اردو میں متعدد جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے :-

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں　　ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

غالب اپنے ایک خط میں جو مرزا حاتم علی بیگ 'مہر' کے نام ہے' لکھتے ہیں :-

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی - اقامت جاودانی ہے - اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے - اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے - ہے ہے وہ اجیرن ہو جائے گی - طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردیں کاخ' وہی طوبیٰ کی ایک شاخ' چشم بد دور وہی ایک حور - بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ" :-

اس نظم میں شاعر نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اصل خیر وہ ہے جو انسان کو اپنی جبلت کے رجحانات پر قابو پانے اور انہیں ضبط و نظم کا پابند کرنے سے حاصل ہوتا ہے - یہ قدر حیات انسانی سعی و جہد کی محتاج ہے - زندگی کی حقیقی ہم آہنگی وہ ہے جو انسان نے اپنی اپج سے پیدا کی ہو - انسانی فضیلت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ موجود سے غیر مطمئن رہتا ہے' اور غیر موجود کی تخلیق چاہتا ہے تا کہ اپنے خواب کو قوت اور تعین عطا کرے - انسانی طبیعت خارجی لزوم و جبر کے خلاف بغاوت کرتی ہے - پیہم تخلیق کے سبب سے اس کو سکون و قرار کبھی نصیب نہیں ہو سکتا - یہ حالت انسان کو اس لیے پسند ہے کہ اس طرح وہ اپنی ذات کی قوت کا احساس کرتا اور اس کی تکمیل کرتا ہے - جوں ہی اس کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو کسی دوسری خواہش کا کانٹا اس کے دل میں چبھنا شروع ہو جاتا ہے - انسان کی یہ تخلیقی جد و جہد بعض اوقات اس کی شخصیت پر ایسی چھا جاتی ہے کہ وہ کرتا پہلے ہے اور سوچتا بعد میں ہے - خیال اس کے عمل میں ایسا جذب ہو جاتا ہے جیسے خشک مٹی پانی کو جذب کر لیتی ہے - خیر وہی ہے جسے خود انسان نے تخلیق کیا ہو نہ کہ کسی دوسرے نے اس پر عاید کیا ہو - فرشتہ یا حور جو نیکی اور پاک دامنی کے پیکر ہیں اس لیے نیک ہیں کہ وہ بد ہو ہی نہیں سکتے - اسی لیے شاعر کی نظر میں ان کی زندگی بے کیف اور بے رنگ ہے - اگر سمندر میں طوفان نہ ہوں اور باد مخالف سے بادبانوں کے پھٹنے اور پتواروں کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ رہے تو مہم جو لوگوں کے لیے اس میں کوئی دل کشی باقی نہ رہے گی - شاعر اپنی ایمائی قوت کا سارا زور اس حقیقت کو بے نقاب کرنے میں صرف کرتا ہے کہ زندگی کے سکون و ہم آہنگی کی قدر اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کی ہنگامہ زائیاں

بدستور موجود رهیں - شیطان اور حور کے خیالی پیکروں کے ذریعے شاعر زندگی کی دائمی شوریدگی اور دائمی سکونی کیفیت کی تصویر همارے سامنے پیش کردیتا هے - فرشتہ اور حور کی زندگی کی بے کیفی اس سبب سے هے کہ وہ احساس خودی کی لذت سے نا آشنا هیں اور شیطان کی کوتاهی یہ هے کہ وہ اپنی خودی کو نظم و آئین کا پابند نہ کر سکا - انسان کو یہ شرف حاصل هے کہ وہ اقدار حیات کو اپنی شخصیت میں نئے سرے سے تخلیق کرتا هے اور انهیں نظم و ضبط کا پابند کرتا هے - اس کی زندگی خود اس کی تخلیق هوتی هے -

رومانی موضوع جو رمز و کنایہ کے ذریعہ بیان هوں اکثر پھڑکتے هوئے اور اثر آفرین هوتے هیں - لیکن اقبال فنی ضبط کے ساتھ ایسی ایمائی کیفیت پیدا کرتا هے جو مبالغہ سے عاری هوتی هے - اس کو جو کچھ کہنا هے وہ سب ایک دم سے نہیں کہتا بلکہ مصور کی طرح کشش کے هلکے سے خط کے ذریعے ایک جہان معنی پیدا کر دیتا هے -

" بال جبریل " میں عبدالرحمٰن اول کے سر زمین اندلس میں پہلا کھجور کا درخت بونے پر جو نظم هے وہ اقبال کے آرٹ کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتی هے - ایک کھجور کے درخت میں شاعر تاریخ و روایات کے آب و رنگ سے کمال بیدلی کی تصویر دیکھتا هے - اس نظم کو پڑھ کر انسان کے دل میں معاً وہ سب حالات گزر جاتے هیں جو فاتح عربوں کے ذوق عمل کے آئینہ دار تھے - جس طرح وہ اندلس کی سر زمین میں اپنے تئیں اجنبی محسوس کرتے تھے اسی طرح کھجور کا درخت بھی اس سر زمین کی آب و هوا سے نا آشنا تھا - کھجور کے درخت کو دیکھ کر ایک عرب کے دل پر جو کیفیت طاری هوتی هے شاید هم لوگ اس سے ناواقف هیں - عرب کا تخیل انهیں

نخلستانوں میں پرورش پاتا ہے اور اسے ریگستان کی وسعت کی طرح پھیلتا اور بڑھتا ہے - یہ نظم "تاریخ المقری" سے ماخوذ ہے - جس طرح اس کا مضمون سادہ اور دلکش ہے اسی طرح اس کی بحر اور زبان بھی سادہ اور دل نشیں ہے - عبدالرحمن اول کھجور کے درخت کو اس طرح مخاطب کرتا ہے :—

میری آنکھوں کا نور ہے تو　　میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں　　میرے لیے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا　　صحرائے عرب کی حور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو　　ساقی تیرا نم سحر ہو

شاعر نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ عرب فاتح اندلس میں اپنے تئیں اجلبی محسوس کرتے تھے - لیکن اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان اپنے عمل کی بے پناہ زد سے ہر ماحول پر قابو پا سکتا ہے اور ہر کہیں رس بس سکتا ہے وہ کسی ایک سر زمین سے وابستہ نہیں - انسان کی فضیلت خاک کی بدولت نہیں بلکہ اس کے سوز دروں کی رہین منت ہے - چنانچہ کہتا ہے :—

ہمت کو شناوری مبارک　　پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوز دروں سے زندگانی　　اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال نے اپنی نظم 'نغمۂ ساربان حجاز' میں ایمائی اور اشارتی کیفیت سے عجیب و غریب طلسم پیدا کیا ہے - بحر و وزن اور تشبیہوں کی ندرت سے اثر آفرینی کا کمال ظاہر کیا ہے - ایک بدو کے لیے اس کا اونٹ سب کچھ ہے - وہی اس کی پونجی ہے ' وہی اس کی روزی کا سہارا اور لق و دق ریگستانوں

میں اس کا رفیق و غمگسار ہوتا ہے - اس کو اپنے جانور کے ساتھ ایک طرح کا جذباتی تعلق پیدا ہو جاتا ہے - جس طرح حدی‌خواں اپنے نغمے سے اپنی کلفتوں کو بھلاتا اور ہمسفروں کی ہمت افزائی کرتا ہے اسی طرح شاعر کے نغمے کا زیر و بم زندگی کے قافلہ کے لیے بانگ درا کی حیثیت رکھتا ہے - اونٹ کے لیے بدو کی زبان سے آہوئے تاتار' دولت بیدار' شاہد رعنا' رو‌کش حور' دختر صحرا اور کشتی بے بادبان کی تشبیہیں کس قدر بلیغ اور با کیف ہیں - چند بند ملاحظہ ہوں :—

ناقۂ سیار من' آہوئے تاتار من
درہم و دینار من' اندک و بسیار من
دولت بیدار من
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

دلکش و زیباستی' شاہد رعناستی
رو‌کش حوراستی' غیرت لیلاستی
دختر صحراستی
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

نغمۂ من دلکشاے' زیر و بمش جانفزاے
قافلہ ہا را دراے' فتنہ ربا فتنہ زاے
اے بہ حرم چہرہ ساے
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

---

اقبال کی نظموں میں اس کی نظم مسجد قرطبہ' جدید اردو ادب کا

شاہکار ہے - اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے - اس میں آرٹ' تاریخ اور فلسفہ ایسے خوش‌اسلوبی سے سموے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا اور داد دیتا ہے - وہ تفصیل سے ہسپانیہ کی اسلامی عہد کی تاریخ نہیں بیان کرتا - وہ صرف چند اشارے کرتا ہے - یہ چند اشارے ضخیم تاریخوں پر بھاری ہیں - وہ کہتا ہے کہ زمانے کی چیرہ‌دستی کے ہاتھوں کائنات کی کوئی چیز محفوظ نہیں' نہ سلطنت' نہ ہنر اور نہ شخصیت - دنیا کی ہر چیز بے ثبات اور نا پایدار ہے - سات سو سال قبل اندلس کی حالت کچھ اور تھی اور آج کچھ اور ہے :—

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

لیکن اقبال اپنے نغمے کو اس مایوسی کی لے پر نہیں ختم کرتا - کائنات کی نا پایداری میں ایک عنصر ایسا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا - وہ عنصر عشق ہے - اس کے مظاہر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں - زمانہ سیل ہے

اور عشق اس سے بڑھ کر قوی سیل ہے - وہ زمانے کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے - ہسپانیہ میں آج مسلمان نہیں لیکن ان کی تہذیب کی روح مسجد قرطبہ کی شکل میں موجود ہے - ممکن ہے آگے چل کر مسجد قرطبہ بھی نہ رہے لیکن اسلامی روح زندہ رہےگی اس لیے کہ اس کی ساخت عشق کے خمیر سے ہوئی ہے :—

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک‌سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

مسجد قرطبہ ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی، جاں بازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے - سنگ و خشت کے ذریعے کسی نے اپنے سوز دل کو ظاہر کیا ہے :—

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل

وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

یہاں تک ذکر کرکے شاعر بطور گریز یورپ کے مختلف انقلابوں کا حال بیان کرتا ہے - جرمن کی تحریک اصلاح نہ تھی اور فرانسیسی انقلاب نے اہل مغرب کی زندگی کی کایا پلٹ دی - یہ انقلابات زمانہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں - شاعر یہ باتیں کرتا جاتا ہے لیکن یہ محض اوپری باتیں ہیں - اس کے دل کی تہ میں اصل بات اور ہی ہے — وہ کہتا ہے کہ جس طرح ہسپانیہ آج وہ نہیں ہے جو سات صدی قبل تھا اور جس طرح یورپ کے دوسرے ملکوں کی زندگی آج وہ نہیں ہے جو چند صدیوں قبل تھی اسی طرح اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے اگر وہ قوم جس نے "مسجد قرطبہ" بنائی تھی پھر سوتے سے جاگ اٹھے اور باوجود اپنی کہن سالگی کے لذت تجدید سے پھر جوان ہو جاے - وہ اس ضمن میں اٹلی کی مثال پیش کرتا ہے اور اس سے اپنے حسب دل خواہ نتیجہ اخذ کرتا ہے - اگر ایسا ہوا اور ضرور ہوگا' تو دنیا پھر ایک زبردست انقلاب دیکھےگی جس کے سامنے پچھلے سب انقلاب ماند پڑ جائیں‌گے - وہ کہتا ہے :-

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

"مسجد قرطبہ" دریاے کبیر کے کنارے واقع ہے - شاعر اس دریا کے کنارے ایک خواب دیکھتا ہے - اس خواب کی تعبیر وہ صاف صاف نہیں بیان کرتا اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ صاف صاف کہےگا تو لوگ اسے مجذوب

دی بڑ سمجھیں گے - خصوصاً اهل مغرب جو عقل کے پرستار اور تهذیب متی کے هیں اِن مجذوبانہ باتوں کو سن کر پریشان هو جائیں گے - وہ دن دور نهیں جب دوسرے بهی اُسے دیکھ لیں گے - پردۂ تقدیر میں جو نیا عالم مضمر هے اس کی سحر صرف اب تک شاعر کی آنکھوں میں بے حجاب هوتی هے - اس جذب و کیف کے عالم میں شاعر جو خواب دیکھتا هے وہ حقیقت هے اور اس حقیقت پر اس کو پورا ایمان هے - وہ کہتا هے :—

آب روان کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رها هے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو هے ابهی پردۂ تقدیر میں
میری نگاهوں میں هے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹها دوں اگر چهرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ هو انقلاب موت هے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

---

جب انقلاب آئین دهر هے تو ممکن هے کبهی هماری بهی قسمت جاگے!

اب آئیے اقبال کے کلام کو فنی حیثیت سے ذرا دیکھیں - اس کے محاسن کلام پر تبصرہ کرتے وقت معانی اور الفاظ دونوں کے جوهر بلاغت همارے پیش نظر رهنے چاهییں -

اقبال نہایت خوبی سے تجریدی تصورات کو جان‌دار شکل میں پیش کردیتا هے - اس کے افکار و تصورات محسوس استعاروں کی شکل اختیار کر لیتے هیں - زوال حسن کے متعلق بہت سے شعرا نے اظهار خیال کیا هے - لیکن اقبال

اپنی نظم "حقیقت حسن" میں اس ابدی جوہر کائنات کو کس ندرت کے ساتھ بے نقاب کرتا ہے - یہ نظم محاسن لفظی و معانی کے اعتبار سے اس کی مکمل نظموں میں شمار ہونے کے لایق ہے - وہ کہتا ہے :—

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

کس قدر بلیغ مصرع ہے "شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا" - اس نظم میں شاعر نے جس حقیقت حیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی تغیر اور تبدیلی کا نام ہے - حسن و شباب بھی تغیر سے مستثنیٰ نہیں ہیں - زمانہ ان کا خالق ہے اور وہی انھیں آمادۂ زوال کرتا ہے -

اقبال کو ادبی مصوری میں کمال حاصل ہے - وہ بے جان اشیا کو اس

طرح محسوس شکل میں پیش کرتا ہے کہ گویا وہ ذی روح ہیں - ستاروں کی زبانی وہ اُن سب باتوں کو کہلا دیتا ہے جو خود اسے کہنی ہیں - اس کی نظم "بزم انجم" ملاحظہ ہو :—

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے — کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

جب انجمن فلک رونق پر تھی تو عرش بریں سے ایک صدا آئی :

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو

تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری

آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں

شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری

پھر شاعر قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اشاروں اشاروں میں ستاروں کی زبانی کہتا ہے :—

یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا

قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے

جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قایم نظام سارے

پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

سورج کا شام کو جو سیہ لباس زیب تن کیے ہوئے ہے' طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارنا اور عروس قدرت کا چاندی کا گہنا پاتا اُتار کر سونے کا زیور

پھلنا کس قدر بلیغ اور لطیف تشبیہیں ہیں جن کی ندرت اور طرفگی پر ذوق ادبی وجد کرتا ہے -

شاعرانہ مصوری کے نہایت عمدہ نمونے اقبال کے کلام میں ملتے ہیں - اپنی ایک نظم ''ایک آرزو'' میں شاعر دنیا کے شور و شر سے علیحدگی اور پر سکون زندگی کی خواہش ظاہر کرتا ہے - وہ چاہتا ہے کہ کسی دامن کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے خیالوں کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے - یہاں کا منظر وہ اس طرح بیان کرتا ہے :—

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

یہ کہنا کہ نظارۂ فطرت ایسا دل کش تھا کہ دریا کا پانی بھی اٹھ اٹھ کر اس کا نظارہ کر رہا تھا کس قدر اچھوتا خیال ہے - شاعر نے نہایت لطیف انداز میں ایک واقعہ کی توجیہ ایسے سبب سے کی ہے جو حقیقت میں اس کا سبب نہیں ہے - اس نے صنعت حسن تعلیل کو کس خوبی اور بے تکلفی سے استعمال کیا ہے - صنعت سے اس وقت کلام میں ندرت اور اثر پیدا ہوتا ہے جب سامع کو یہ گمان نہ ہو کہ شاعر نے صنعت کی خاطر شعر لکھا ہے -

اقبال کو منظر کشی میں کمال حاصل ہے - وہ لفظوں کے طلسم سے فطرت کی تصویر کھینچ دیتا ہے - اس نے اپنی نظم ''کشمیر'' میں سحر نگاری سے ایسا سماں باندھا ہے کہ حقیقت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے - پھر مضمون

کی مناسبت سے بحر اور وزن کی شگفتگی کا پورا خیال رکھا گیا ہے :—

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر ناروں نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

سفر افغانستان کے دوران میں قندھار کی تعریف میں جو اشعار لکھے ہیں ان کی زمین اور بحر اس پہاڑی علاقے کی متانت اور سنجیدگی کی آئینہ دار ہے - شاعر کہتا ہے :-

رنگ‌ہا بوہا ہواہا آب‌ہا تابندہ چوں سیماب‌ہا
لالہ‌ہا در خلوت کہسارہا نارہا یخ بستہ اندر نارہا

آ کی صوت سے شاعر نے شگفتگی کے بجائے سنجیدگی کو نمایاں کیا ہے' بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس صوتی کیفیت میں ایک قسم کی ہیبت کا اظہار ہوتا ہے - کشمیر اور قندھار کے منظروں کو بیان کرنے میں جو فن‌کاری کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے وہ شاعر کے کمال پر دلالت کرتا ہے— غالباً اس نے غیر دانستہ اور غیر محسوس طریق پر ایسا کیا ' لیکن جو بات قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے فطری طور پر مقتضاے حال کی کتنی صحیح اور موثر ترجمانی کی ہے - یہی وجدان شعری بلاغت کی جان ہے :—

اقبال تشبیہوں کا بادشاہ ہے اور تشبیہ حسن کلام کا زیور ہے - وہ مضمون

کی طرفگی اور حسن کو اپنی تشبیہوں سے دوبالا کر دیتا ہے - اس کی ایک نظم ہے "جگنو" جس میں اس نے ان تشبیہوں کی ندرت کا کمال ظاہر کیا ہے - وہ اسے پھولوں کی انجمن کی شمع' مہتاب کی کرن' شب کی سلطنت میں دن کا سفیر اور مہتاب کی قبا کا تکمہ کہہ کر مضمون کو انتہا درجے دل کش بنا دیتا ہے - وہ کہتا ہے :-

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑکر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گم نام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

اقبال نے جس زمانے میں مثنوی "اسرار خودی" لکھی تھی اس وقت سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے اس کے چند ہم‌نوا تھے - چنانچہ شاعر نے مثنوی کے آخر میں ذات باری سے اس کا گلہ کیا ہے کہ میرا درد دل سمجھنے والا کوئی نہیں - ان اشعار میں فکر موسیقی اور خلوص کے ساتھ حل ہو کر جذبہ بن گئی ہے :—

من کہ بہر دیگراں سوزم چو شمع — بزم خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فردا ستم — در میان انجمن تنہا ستم
در جہاں یا رب ندیم من کجا ست — نخل سینایم کلیم من کجا ست
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ ایں پروانۂ من اہل نیست

انتظارے غمگسارے تا کجا جستجوئے رازدارے تا کجا
ایں امانت بار گیر از سینہ ام خار جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ عشق عالم سوز را آئینہ دہ

پھر شاعر نہایت والہانہ انداز میں شکوہ کرتا ہے کہ دنیا میں ہر کسی کا کوئی نہ کوئی مونس و غمخوار موجود ہے لیکن میری زبان سمجھنے والا جسے میں اپنا رازدار بنا سکوں' کوئی نہیں - ان اشعار میں رمز و ایما کی زبردست قوت سے شاعر اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے :—

موج در بحر است ہم پہلوئے موج ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است ماہ تاباں سر بزانوئے شب است
ہستی ء جوئے بہ جوئے گم شود موجۂ بادے بہوئے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص می کند دیوانہ با دیوانہ رقص
من مثال لالۂ صحرا ستم درمیان محفلے تنہا ستم
خواہم از لطف تو یارے ہمدمے از رموز فطرت من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ از خیال ایں و آں بیگانۂ
تا بجان او سپارم ہوئے خویش باز بینم در دل او روئے خویش

زور کلام اور اثر آفرینی کا اعلیٰ ترین نمونہ دیکھنا ہو تو اقبال کی نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" کو پڑھیے - اس کا ایک ایک لفظ درد و خلوص میں ڈوبا ہؤا ہے - اس نظم کا موضوع بجائے خود دل پر اثر ڈالنے والا ہے - پھر اقبال کی سحر بیانی نے اس کو اور موثر بنا دیا - فاطمہ بنت عبداللہ ایک معصوم کم سن عرب لڑکی ہے - طرابلس کے ریگستان کی چلچلاتی دھوپ میں وہ غازیوں اور زخمیوں کو پانی پلاتے پلاتے خود جام شہادت نوش کرتی ہے - اقبال کا تخیل اس واقعہ میں ملت اسلامیہ کی نشأۃ جدیدہ کا خواب دیکھتا ہے - وہ کہتا ہے :—

فاطمہ تو آبروئے ملّت مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
فاطمہ ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے شور سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

شاعرانہ تصویر کشی کے بےشمار اعلیٰ نمونے اقبال کے کلام میں موجود ہیں - وہ لفظوں کے طلسم سے ایسی تصویر کھینچتا اور تخیل کے مو قلم سے اس میں ایسی رنگ آموزی کرتا ہے کہ حقیقت جیتی جاگتی شکل میں سامنے آجاتی ہے - ''شکوہ'' میں اسلامی مساوات کی تصویر وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :—

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مسلمانوں کی فتحمندی اور جرأت کا وہ اس طرح ذکر کرتا ہے :—

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر تیرا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے ؟
دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

"شکوہ" میں ایک بند بتوں کی زبانی ہے - شاعر نے کمال بلاغت سے وہی لب و لہجہ اختیار کیا ہے جو مقتضائے حال تھا اور جس کی بتوں سے توقع کی جا سکتی تھی :—

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبہ کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

شاعر کا ایک بڑا کمال محاکات ہے - وہ الفاظ کی صوتی کیفیت سے سامع کے ذہن پر ایسا اثر پیدا کر دیتا ہے جس سے ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے اور حقیقت کا سماں بندھ جائے -

اقبال نے اپنی ایک نظم "ایک شام" میں دریائے نیکر کے کنارے کا منظر بیان کیا ہے - وہ خاموشی کی تصویر لفظوں میں کھینچنا چاہتا ہے - چنانچہ اس نے حرف ش کی صوتی کیفیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے - اکثر آریائی زبانوں میں س اور ش کا صوتی اثر خاموشی کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے - وہ کہتا ہے :—

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش　　کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے

نظم "شاعر" میں تشبیہوں کی بہار ملاحظہ ہو :—

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے

فارسی اور اردو شعرا نے غزل کو عشق و محبت کے معاملات کے لیے مخصوص کر لیا - ابتدا میں غزلوں کے مضامین میں تنوع اور لطف ہوتا تھا لیکن جب جذبات کی پستی اجری تو غزلوں میں بھی جوش و مستی کے بجائے قافیہ بندی تقلید پرستی اور لفظی مناسبت مقصود بالذات ہو گئی - غزل کا بلند ترین معیار خواجہ حافظ نے فارسی میں اور غالب نے اردو میں اپنی نغمہ سنجیوں سے قایم کیا - ان دونوں کے ہاں لوازم عشق کی کیفیات کو اس طرح تمثیلوں میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی ہمسری ممکن نہیں - اقبال نے بائرن کی تعریف میں جو شعر لکھا ہے وہ حقیقت میں ان دونوں پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے :-

خیال او چہ پری خانۂ بنا کردہ است　　شباب غش کند از لذّت لب بامش

غزل گو شاعر کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جس پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو - اس خواب میں اگر آپ تحیر اور مستی کے دو عناصر کا اور اضافہ کر دیں تو میں سمجھتا ہوں تغزل کی مکمل توجیہہ ممکن ہوگی - غزل گو شاعر اپنے نفس کے اندرونی تجربے کے علاوہ اور کسی دوسرے تجربے کا قایل نہیں ہوتا - وہ اپنے نفس کی کیفیات کو رمز و کنایہ کے ذریعے ظاہر کرتا ہے - چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ فارسی اور اردو کی غزلوں میں رمزیت ( Symbolism ) کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی اور ادب میں موجود نہیں - مستی اور تحیر کی حالت میں رمز و کنایہ بہ مقابلہ منطقی تسلسل بیان کے زیادہ بلیغ ہوتا ہے - فرانسیسی شاعر بودلیر حقیقی شاعر کے لیے مستی اور جذب کو لوازمات فن میں سے تصور کرتا ہے - بقول اس کے "ہر وقت بدمست و بے خود رہو' سب کچھ اسی میں ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ کس قسم کی مستی؟ یہ چاہے شراب کی ہو' شاعری کی ہو یا نیک کرداری کی ہو' لیکن ہو ضرور -..................ہوا سے پوچھو کہ کیا وقت ہے' سمندر کی موجوں سے پوچھو' ستارے سے پوچھو' طائر خوش الحان سے پوچھو' گھڑی سے پوچھو' ہر اس چیز سے پوچھو جو رواں دواں ہے' جو نوحہ خواں ہے' جو گردش میں ہے' جو نغمہ طراز ہے' جو طاقت گویائی رکھتی ہے اور تمہیں ان سبھوں سے یہی جواب ملے گا کہ وقت مست و بےخود ہونے کا ہے' اگر تم وقت کے مظلوم غلام نہیں ہونا چاہتے تو مست بنو چاہے وہ مستی شراب کی ہو' چاہے شاعری کی' چاہے نیک کرداری کی - یہ تمہاری رغبت اور پسند پر منحصر ہے" - اقبال کے ہاں اسی مستی اور جذب کی کیفیت کو قلندری کے لفظ سے ظاہر کیا ہے - اس جذب کا حرکتی عنصر اس کو دوسرے غزل گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے - اس کی شاعری دراصل اس کے تحیر اور جذب کی ترجمانی

ہے - اس کی مستی میں بھی عجب شان ہے - وہ کہتا ہے کہ میری خاک کا ہر ذرہ اس آنکھ کی طرح ہے جو مست تماشا ہو :-

دانم کہ نگاہ او ظرف ہمہ کس بیند
کردہ است مرا ساقی از عشوہ و ایما مست

ایں کار حکیمے نیست' دامان حکیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست' یک بندۂ دریا مست

دل را بچمن بردم از باد چمن افسرد
میرد بہ خیابانہا ایں لالۂ صحرا مست

سینا است کہ فاران است؟ یا رب چہ مقام است ایں
ہر ذرۂ خاک من چشمے است تماشا مست

خواجہ حافظ کی غزل سکونی اور جمالیاتی ہے اس میں جلالی عنصر نام کو نہیں - اقبال کے آرٹ کے تصور میں جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے' جمالی اور جلالی دونوں عنصر پہلو بہ پہلو موجود ہیں جن کے متعلق اس نے کہا ہے :-

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

اقبال کی غزل میں چاہے وہ عشق و محبت کی معاملہ بندی ہی کیوں نہ ہو ایک طرح کی قوت اور تازگی کا اظہار ہوتا تھا - پھر چونکہ اس کی نظر زندگی کے متعلق نہایت وسیع ہے اس لیے لازمی طور پر اس کے رمز و کنایہ میں ایک جہان معانی پنہاں ہوتا ہے - معانی کے علاوہ محاسن کلام کے ظاہری یعنی لفظی رعایتوں کو برتنے پر بھی اسے پوری قدرت حاصل ہے - اس کے ہاں شاعرانہ رمز نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں - رمز نگاری تخیل کا ایک کرشمہ ہے - شاعر اپنے تاثرات اور واردات قلبی کا اظہار اشاروں میں کرتا ہے تاکہ

اس کے ذوق و وجدان کی ان میں سمائی ہو سکے - ایمائی طور پر شاعر اپنے جذبے کو جس کا اسے شدید احساس ہوتا ہے بلند ترین مقام تک پہنچا سکتا ہے - وہ رمز و کنایہ کی زبان میں بتاتا ہے کہ بزم شوق کے لیے میں کیا لایا ہوں :-

آں کہ من در بزم شوق آوردہ‌ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوش بیان اور رمزیت ہے جس کی مثال حافظ اور غالب کو چھوڑ کر دوسروں کے ہاں مشکل ہی سے ملے گی - اس کے نظم الفاظ میں بلا کی ایمائی قوت پوشیدہ ہوتی ہے - وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر دیتا ہے -

ایک غزل میں اس نے مُغ‌بچے کی زبانی درد اِشتیاق کی شرح بیان کی ہے - وہ کہتا ہے کہ عشق و محبت کا بنیادی راز اس حقیقت کے جاننے میں پوشیدہ ہے کہ جو اشک ضبط کیے جائیں ان میں بادۂ گلگوں سے زیادہ مستی ہوتی ہے - پھر مُغ‌بچہ کس شوخی سے کہتا ہے کہ جب دیر مغاں میں آؤ تو تمہارا موضوع سخن بلند ہونا چاہیے - معمولی افسانہ و افسوں کو صوفی کی خانقاہ کے لیے رکھ چھوڑو - شاعر کا یہ کہنا کہ اس غزل خوانی کے باعث میں مدرسے کی قیل و قال کے قابل نہیں رہا کس قدر بلیغ اور پر معنی ہے :-

دی مُغ‌بچۂ با من اسرار محبت گفت
اشکے کہ فرو خوردی از بادۂ گلگوں بہ
در دیر مغاں آئی مضمون بلند آور
در خانقہ صوفی افسانہ و افسوں بہ
اقبال غزل خواں را کافر نتواں گفتن
سودا بدماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

ایک غزل میں دن اور دھم کی اصوات اور نظم الفاظ سے نہایت لطیف ترنم پیدا کیا ہے :-

مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم
تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم
سوز نوایم نگر ریزۂ الماس را
قطرۂ شبنم کنم خوے چکیدن دہم
چوں ز مقام نمود نغمۂ شیریں زنم
نیم شباں صبح را میل دمیدن دہم
یوسف گم گشتہ را باز کشودم نقاب
تا بہ تنک مایگاں ذوق خریدن دہم
عشق شکیب آزما خاک ز خود رفتہ را
چشم ترے داد و من لذت دیدن دہم

الفاظ و معانی کی موزونیت کے علاوہ اس غزل کا مضمون کس قدر بلند ہے - اس پر طرز ادا کی شوخی اور ندرت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے - شاعر اپنی فطرت کی مخفی قوتوں اور کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر چاہوں تو ذرہ کو ذوق تپش سے آشنا کردوں اور وہ شرر کی طرح اُڑتا پھرے - میری آواز کا سوز و گداز ایسا ہے کہ اگر چاہوں تو ریزۂ الماس کو پگھلا کر شبنم کردوں اور وہ قطرے بن بن کر ٹپکنے لگے - اظہار درد کے لیے میرے ساز سے آدھی رات کے وقت اگر نغمے نکلیں تو صبح قبل از وقت ظہور کے لیے بے تاب ہو جائے - میں نے اپنے یوسف گم گشتہ کو اس لیے ظاہر کیا ہے کہ تنک مایہ لوگوں میں ذوق خریداری کی آرزو پیدا ہو - پھر کہتا ہے کہ انسان کو عشق کی بدولت چشم تر نصیب ہوتی ہے اور وہ شاعر کے نغمے کی بدولت لذت دید

سے بہرہ یاب ہوتا ہے - یہ غزل فنی اعتبار سے مکمل ہے - سامع کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شاعر اپنے خیالی پیکروں سے گفتگو کر رہا ہے - یہ ایک غزل سیکڑوں دیوانوں پر بھاری ہے - اس میں شاعر نے تاثر و وجدان نے کیا کیا بدیع‘ شوخ اور لطیف نکتے پیدا کیے ہیں -

فارسی کی چند اور غزلیں ملاحظہ کیجیے اور داد سخن دیجیے - اس کی ان تمام غزلوں میں غنائی عنصر کا بہترین اظہار موجود ہے - وہ ایسی بحریں اور زمین منتخب کرتا ہے جو تغزل کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں - شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے سے شاعر اپنے کلام میں بےپایاں دل فریبی اور دل کشی پیدا کر دیتا ہے - اقبال کے ہاں بھی شراب و نغمہ‘ بادہ خوار اور مے فروش‘ زلف و خال‘ اور رخسار و دندان کا مجازی پیرایہ بیان موجود ہے لیکن وہ ان کے ذریعے رمز و کنایہ کی ایسی دنیا تخلیق کر دیتا ہے کہ جذبہ و وجدان جھومنے لگتے ہیں :—

فصل بہار ایں چنیں‘ بانگ ہزار ایں چنیں

چہرہ کشا‘ غزل سرا‘ بادہ بیار ایں چنیں

باد بہار را بگو پے بخیال من برو

وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں

عالم آب و خاک را بر محک دلم بسائے

روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

ترکیبوں کی نزاکت اور‘ تازگی اور تقابل و تناسب کو شاعر نے اپنے کلام میں کس سلیقے سے سمویا ہے :—

شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی

تو بطلعت آفتابی سزد ایں کہ بے حجابی

تو بہ درد من رسیدی بضمیرم آرمیدی

ز نگاہ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

تو عیار کم عیاراں تو قرار بے قراراں

تو دوائے دل فگاراں مگر ایں کہ دیر یابی

غم عشق و لذت او اثر دو گونہ دارد

گہے سوز و درد مندی گہے مستی و خرابی

جانم در آویخت با روزگاراں جوئے است نالاں در کوهساراں

داغے کہ سوزد در سینۂ من آں داغ کم سوخت در لالہ زاراں

کہتا ہے کہ میری جان کی آویزش عالم فطرت کے ساتھ ویسی ہے جیسے دریا کوهساروں میں ٹکراتا نالہ کناں اپنا راستہ نکالتا چلا جاتا ہے - زندگی کی دریا کے ساتھ تشبیہہ جو پہاڑوں میں بہنے کے لیے راستہ نکالتا ہو کس قدر دلاویز ہے - اس کی ایمائی قوت کی کوئی حد نہیں - جس طرح دریا پہاڑوں کو چیرتا اور چٹانوں سے ٹکراتا ہے تاکہ اپنے وجود کا سکہ بٹھائے اسی طرح انسان خارجی فطرت کی نا مساعدتوں پر قابو پاتا ہے تاکہ اپنی زندگی کی تشکیل کرے اور اسے موثر بنائے - دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی سینے میں جو داغ آرزو ہے اس کی مماثلت عالم فطرت میں تلاش کرنا عبث ہے - لالہ زاروں میں جو داغ نظر آتے ہیں وہ درد اور آرزو کے داغ نہیں بلکہ صرف دیکھنے کے ہیں :—

از چشم ساقی مست شرابم بے مے خرابم ' بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی بینم نہ بینم در پیچ و تابم

از من بروں نیست منزل گہ من من بے نصیبم راہے نیابم

اس غزل کا ہر شعر تغزل کی جان ہے "بے مے خرابم" کی تکرار ' سادگی اور اس کے ساتھ جذب و مستی کی تاثیر دیکھیے - اقبال کا ساقی زندگی ہے

جس کے نشے میں بغیر مے کے وہ مدھوش و سرشار ہے -

یار سے اگر نگہ محرمانہ کی آرزو ہو تو شاعر اس کے حاصل کرنے کی تدبیر بتاتا ہے :—

اگر بہ بحر محبت کرانہ می خواهی
هزار شعلہ دهی یک زبانہ می خواهی
یکے بدامن مردان آشنا آویز
ز یار اگر نگہ محرمانہ می خواهی
تو هم بعشوہ گری کوش و دل بری آموز
اگر ز ما غزل عاشقانہ می خواهی

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن
گفتند جہان ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برهم زن
اے لالۂ صحرائی تنہا نہ توانی سوخت
ایں داغ جگر تابے بر سینۂ آدم زن
تو سوز درون او، تو گرمیء خون او
باور نکنی چاکے در پیکر عالم زن
لخت دلِ پرخونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے ز بدخشانم بردار و بخاتم زن

---

اس غزل میں مآ اور نآ کی صوتی هم آهنگی سے شاعر نے عجیب کیفیت پیدا کردی ہے - هر لفظ کلام کی بلاغت کی دستاویز ہے - کس بے ساختگی سے

مضامین عالیہ کو ادا کیا ہے - غزل کا اصل مضمون زندگی کی برگزیدگی اور برتری ہے جو اپنی تشکیل کی مختار کل ہے - اگر فطرت سازگار نہیں تو وہ فطرت کو درهم برهم کر دے گی - پیکر عالم میں اسی کی بدولت گرمیٔ خون پیدا ہوئی - پھر کیا خوب مضمون ہے کہ بدخشاں کو اپنے لعل پر ناز ہو تو ہوا کرے لیکن خاتم جہات میں جو لعل جڑا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے وہ "لخت دل پر خون ہے" جو میری آنکھوں سے ٹپکا ہے - بدخشاں کے لعل اور اس لعل میں جو میں نے تخلیق کیا ہے، مقابلہ کر لو :-

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی     درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

گفتی مجو وصالم بالا تر از خیالم     عذر نو آفریدی اشک بہانہ جو را

عاشقوں کو سوز دوام تو ملا لیکن آزار جستجو کے لیے درمان نہیں پیدا کیا گیا - پھر "اشک بہانہ جو" کی عذر خواہی معاملہ بندی کا کمال ہے -

اشتیاق غزل سرائی کے لیے شاعر نے کس قدر شگفتہ بحر منتخب کی ہے - ہر شعر موسیقی اور رقص کے اجزا سے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے - یہ مانا کہ قصۂ دل کہنے کی چیز نہیں اور درد جگر کو چھپانا ہی اچھا ہے لیکن "لذت ہائے ہائے" کو دل کیا کرے - درد شوق کی شرم بھی کی ہے اور آخر میں اپنی خودداری کو بھی جتا دیا ہے :-

باز بہ سرمہ تاب دہ چشم کرشمہ زائے را
ذوقِ جنوں دو چند کن شوق غزل سرائے را

قصۂ دل نگفتنی است، درد جگر نہفتنی است
خلوتیاں کجا برم لذت ہائے ہائے را

آہ درونہ تاب کو، اشک جگر گداز کو
شیشہ بسنگ می زنم عقل گرہ کشائے را

بزم بہ باغ و راغ کش' زخمہ بہ تار چنگ زن
بادہ بخور' غزل سرائے' بند کشا قبائے را
نار شہاں نمی کشم' زخم کرم نمی خورم
در نگر اے ہوس فریب ہمّت این گدائے را

— —

ایں گنبد مینائی' ایں پستی و بالائی
در شد بہ دل عاشق' با ایں ہمہ پہنائی
عشق است و ہزار افسوں'حسن است و ہزار آئیں
نے من بہ شمار آیم' نے تو بہ شمار آئی
ہم باخود و ہم با او' ہجراں کہ وصال است ایں
اے عقل چہ می گوئی' اے عشق چہ فرمائی؟

کیا خوب مضمون ہے کہ میں اور تو کسی شمار و قطار میں نہیں' اصل معاملہ تو "ہزار افسونی عشق" اور "ہزار آئینی حسن" کے درمیان ہے ؛ زندگی کے یہ دونوں منظر دائمی ہیں- پھر عقل اور عشق دونوں سے اپیل کی ہے کہ تم ہی میری الجھن کے سلجھانے میں کچھ مدد کرو-

اقبال کے جوش بیان کا اظہار اس کی اردو غزلوں میں بھی ہوتا ہے - اقبال نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے :—

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس ایک شعر پر بہت سے شعرا کے دیوانوں کو قربان کیا جاسکتا ہے -

بعض اردو غزلیں سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی ہیں - ان کا ایک ایک لفظ جذبات و کیفیات کی آواز بار گشت ہے - لوازم عشق کی کیفیات کو وہ کس لطف اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا ہے :—

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

---

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی — بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

---

اس غزل کا جوش بیان اور الفاظ کی تازگی اور حرکت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں :—

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

---

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر' قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

ان دو شعروں میں کس قدر شوخی ہے - شاعر ذات باری کو اس پیرائے میں مخاطب کرتا ہے گویا ناز بندگی کا اظہار کر رہا ہے :—

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اور کئی جگہ اقبال نے ذات باری کو ایسے انداز میں مخاطب کیا ہے ' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات شوق کا روئے سخن سوائے اس کے اور کسی کی طرف نہیں ہو سکتا - اس کی اس بے تکلف شوخی سے اس کی بلند مقامی کا اظہار ہوتا ہے - وہ کہتا ہے :—

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں دراز

پھر کہتا ہے :—

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

بے باک آرٹسٹ کی رعنائی فکر اور شوخی گفتار ملاحظہ ہو :—

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بے باک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

جبریل کو کس مزے سے طعنہ دیا ہے :—

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی

تن آساں عرشیوں کو ذکر تسبیح و طواف اولیٰ

اس غزل کی زبان اور مضمون کس قدر بلند ہے :—

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں *

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

اقبال شاعر حیات ہے۔ اس کے آرٹ اور زندگی کے تصور میں ''مظہر قوت'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا اعلیٰ ترین اظہار قوت کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ جہاں کہیں کائنات فطرت میں اس مظہر حیات سے دو چار ہو جاتا ہے تو وہ فوراً ٹھٹک جاتا ہے۔ یہ مظہر اس کے لیے جاذب نظر ہے اور اس کے آرٹ کے لیے محرک کا کام دیتا ہے۔ محرکات تخلیقی اس قدر مخلوط ہوتے ہیں کہ اس کا نفسیاتی تجزیہ ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کے وجدان اور جذبات شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ ''مظہر قوت'' ہے جو اسے عالم انسانی اور عالم فطرت دونوں میں نظر آتا ہے۔ قوت میں اسے حسن نظر آتا ہے۔ قوت اظہار حسن ہی کی ایک خاص شکل ہے۔ جہاں کہیں اس کی آنکھ اس مظہر حیات پر پڑ جاتی ہے تو وہ جھومنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلبل اور قمری کی تشبیہوں کے بجائے وہ باز اور شاہیں کو ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ آخرالذکر

---

* ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

(غالب)

اس کے وجدان شعری کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور ان کے ذریعے وہ اپنے حسب دلخواہ اخلاقی نتائج مترتب کر سکتا ہے جو اس کا اصل مقصود ہیں - آرٹ کے محرکات عجیب و غریب ہوتے ہیں - بعض اوقات آرٹسٹ اپنے رجحان کے مطابق معمولی روزمرہ کے کسی واقعہ سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے محرک تخلیق بن جاتا ہے - ایک فرانسیسی ماہر نفسیات نے لکھا ہے کہ بعض بڑے ماہر موسیقی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے رنگ و خطوط کو دیکھ کر نئے سر دریافت کیے - اسی طرح بعض مصوری اور بت گری کے استاد ہوے ہیں جنھوں نے موسیقی کی کسی لے کو سن کر رنگ و خط کی خاص شکلیں پیدا کیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی طرح آرٹ حقیقت میں ایک ہے - چاہے اس کے فنی اور اصطلاحی مظاہر میں فرق کیوں نہ ہو - اسی طرح قوی سیرت کے مظاہر مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کی حقیقت ایک ہے - اقبال "مظہر قوت" کا قدردان ہے چاہے وہ اپنوں میں ملے یا غیروں میں، چاہے عالم فطرت میں ہو یا عالم انسانی میں - لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہو خالص سونا، ملمع نہ ہو—بعض اوقات لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ اس جذبہ کے تحت متضاد خیالات کا اظہار کر جاتا ہے - اس کی محفل میں لینن اور مسولینی، نطشے اور ٹالسٹائی، برگسوں اور کارل مارکس، مصطفیٰ کمال اور جمال‌الدین افغانی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں - اگر چہ بادی‌النظر میں یہ فکر کا تضاد ہے لیکن حقیقت یہ ہے اس کے خیال کی تہ میں لطیف ہم آہنگی موجود رہتی ہے - اقبال پیشہ‌ور فلسفی نہیں جس کے نزدیک تجریدی منطقی واسطوں کو زندگی سے زیادہ اہمیت حاصل ہو - اور واقعہ بھی یہ ہے کہ زندگی کچھ ہے لیکن منطق نہیں - زندگی کے مظاہر کی طرح آرٹسٹ بھی منطق کا پابند نہیں ہوتا -

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اقبال کے نزدیک آرٹ کا مقصد زندگی کی خدمت ہے - اس نے شعر کے ذریعے زندگی کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اس کے حرکتی عنصر کو خاص طور پر اُجاگر کیا ہے - یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنے کلام میں زندگی کے متعلق جس قدر تشبیہیں' استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں ان کی مثال کسی زبان کے بڑے شاعر کے ہاں نہیں ملتی - ہم ذیل میں بطور مثال ان ترکیبوں کو لکھتے ہیں جن کی ندرت اور طرفگی سے فارسی اور اردو ادب کو چارچاند لگ گئے ہیں - دراصل واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے موضوع کو فارسی اور اردو میں سب سے پہلے اسی نے پیش کیا - اس کی تشبیہیں اور ترکیبیں اس کی وسعت فکر پر دال ہیں - چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

شراب زندگی ' حباب زندگی ' سرود بربط ہستی ' رزم گاہ خیر و شر ' آرزوے ناصبور ' شورش بزم طرب ' سلسلۂ ہستی ' ذوق جدت ' ذوق نمو ' ذوق نمود ' دفتر ہستی ' نگوں دہر ' خاتم ہستی ' آئینہ دار ہستی ' ذوق آگہی ' مست شراب تقدیر ' لذت گیر وجود ' سرمست مئے نمود ' بربط کون و مکاں ' محشرستان نوا ' ملت کش ہنگامہ ' مذاق رم ' تاب دوام ' لطف خرام ' کوشش ناتمام ' محفل ہستی ' غمکدۂ نمود ' ذوق تپش ' سوز و ساز ہستی ' وجہ قیام گلستاں ' مجروم تیغ آرزو ' آرایش رنگ تعلق ' بزم معمورۂ ہستی' لیلی ذوق طلب ' نشۂ ہستی ' شمشیر ذوق جستجو ' توسن ادراک' لذت خودی' ذوق تبسم ' شانۂ ہستی ' کشاکش پیہم' حکایت غم آرزو' حدیث ماتم دلبری' صبح دوام زندگی' جہان اضطراب' قلزم ہستی' نقد حیات' طرب آشنائے خروش' شہید ذوق وفا ' خم زندگی' صنم خانۂ پندار' گرو دیدۂ بیدار' خلش کرشمہ' ضربت روزگار' فیض شعور' جلوۂ نور و صدا' ممنون نگاہ' تقدیر حواس ' ذوق فردا ' لذت امروز' چراغ ہوش' انگبین زندگانی' سوز مشتاق'

شاخ یقین، ولایت عشق، قامت خرد، قندیل دل، عفت فکر، تسخیر جہات، جہان نزد و دور، کف تقدیر، کاروان زندگی، رشتۂ سود و زیاں، حریم کائنات، لذت بےتابی، لذت ایجاد، تب و تاب جاودانہ، رسم شاہبازی، طائرک بلند بال، مست ظہور، قافلۂ رنگ و بو، طائر لاہوتی، نشاط رحیل، نقطۂ پرکار حق، فطرت بےتاب، ہنگامۂ اسباب، سوار اشہب دوراں، فروغ دیدۂ امکاں، رونق ہنگامۂ ایجاد، امتحان تیغ عزم، خیابان خودی، عود حیات، جذبۂ پیدائی، لذت یکتائی، ضمیر کائنات، کوکب تقدیر، سر پنہان وجود، تقاضائے وجود، آئین مکافات عمل، امین جلوہائے لازوال، محرم راز حیات، آئینۂ اندیشہ، نیروئے خودی، تخلیق تمنا، داغ آرزو، قطرۂ وسعت طلب، زخمہ ہائے آرزو، سردی خون حیات، سعی حصول مدعا، تقویم حیات، گماں آباد حکمت، بلدۂ تخمین و ظن، نوائے سیلۂ تاب، فیض آرزو، شہید لذت نظارہ، شہید جلوۂ فردا، پیش خیزان حیات، خانہ زادان حیات، سرود زندگانی، پروردگار آرزو، خط سیمائے حیات، ذوق سیر، سطوت رفتار دریا، بیت موزون حیات، شرار زندگی، فریب خوردۂ منزل، عیار ممکنات جسم و جان -

ان میں سے بہت سے تصورات اور ترکیبیں آج ہماری زبان کا جزو بن گئی ہیں اور ہمارے شعرا اور ادیب انہیں بلا تکلف برتتے ہیں - اقبال کے فکر و تخیل سے اردو زبان کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے اسے ہمارا قومی ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا - اس نے اپنے آرٹ سے ہم سبھوں کے تصور حیات کو حقیقت میں وسیع تر بنا دیا اور ہمارے ادب کی نشو و نما کے لیے نئی راہیں نکالیں - اس نے آرٹ کے ذریعے ایک سوتی ہوئی قوم کو بیدار کیا اور زوال کے زمانے میں عروج کے خواب دکھائے - صرف خواب ہی نہیں دکھائے بلکہ ان خوابوں کو حقیقت بنانے کا راستہ بھی دکھایا - اس مقصد کے لیے ضرور تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے - اس نے اپنے آرٹ سے یہ کام لیا - اس نے کبھی اپنے دلاویز نغموں

سے سامعین کے دلوں کو لبھایا ' کبھی ان کی گزشتہ عظمت کے نقشے ان کی آنکھوں کے سامنے کھینچے ' کبھی اشاروں اشاروں میں اپنے قافلے کے "ہمرہان سست عناصر" کو تیز گامی کی دعوت دی اور کبھی اپنا جذبۂ دل نالہ و فریاد کے ذریعے ظاہر کیا - وہ ایک قلندر تھا جو ہم میں آیا تھا اور اپنے مستانہ نعرے لگاتا ہوا چلا گیا - اس کے نعرے ابھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں اور اس کی فریاد ہمارے دلوں کو متاثر کر رہی ہے - جتنا زمانہ گزرے گا اقبال کے کلام کی تاثیر میں اضافہ ہوتا جائے گا - اس کی شاعری اس کے درد دل کی فریاد تھی - اس کی تاثیر کی کوئی انتہا نہیں - وہ خود کہتا ہے کہ میں تو اپنا کام کرچکا - فریاد عشق کے لوازمات میں سے تھی سو وہ بھی کرلی - اب اس کی تاثیر دوسرے دیکھیں -

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہوچکی<br>
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

---

# اقبال کی شخصیت اور اُس کا پیغام

از

( ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم-اے ، پی ایچ - ڈی (برلن) )

---

# اقبال کی شخصیت اور اُس کا پیغام

از

( ڈاکٹر قاضی عبدالحمید، صاحب ایم۔اے ، پی ایچ - ڈی (برلن) )

## ۱ - اقبال کے تعارف

علامہ اقبال کی شاعری اور تبحر علمی کا میں ہمیشہ سے معتقد رہا ہوں - اُن کے کلام کے ذریعے میں ان سے غائبانہ طور پر بچپن سے متعارف ہوچکا تھا -

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

ہمارے ملک کا ایسا کون مسلمان بچہ ہوگا جس نے بارگاہ ایزدی میں خشوع و خضوع کے ساتھ بچپے کی دعا نہ مانگی ہوگی :-

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

ہندوستان کا ایسا کون شخص ہے جس کے دل کو اقبال کے ہندی ترانے :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی وہ گلستاں ہمارا

اور اسلامی ترانے :-

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

نے گرمایا نہ ہوگا - اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے تذکرہ کا تو اس وقت موقع نہیں ہے جس کے ایک ایک شعر نے زندگی اور امید کی روح ہندوستان کے مسلمانوں میں پھونک دی ہے -

مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا کہ علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ مجھے کچھ

دن گزارنے اور خود ان کی زبانی ان کے خیالات سننے کا موقع ملےگا - لیکن قسمت کی یاوری دیکھیے کہ علامہ اقبال جس وقت دوسری گول میز کانفرنس سنہ ۱۹۳۴ع میں مسلمانان ہند کے وفد کے صدر کی حیثیت سے لندن جارہے تھے تو میرا اُن کا جہاز پر ساتھ ہوگیا - افغان قونصل جنرل اور بمبئی کے دیگر معزز اشخاص ان کو الوداع کہنے کے لیے اطالوی جہاز پر آئے ہوئے تھے - جہاز کے عرشہ ہی پر میں نے ان سے اپنا تعارف ایک دوست کے ذریعے کروا لیا اور اس بات کی اجازت چاہی کہ میں گاہے بگاہے ان کی خدمت میں حاضر ہو سکوں جسے انہوں نے نہایت ہی خندہ پیشانی سے عنایت فرمایا - میں دوسرے روز ہی ناشتے کے بعد اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا - علامہ مرحوم نے جس محبت اور توجہ کے ساتھ میرے تمام سوالات کے جوابات عنایت فرمائے اس سے میں ان کے تبحر علمی کے ساتھ ان کے وسیع اخلاق اور سادگی کا بھی قایل ہو گیا - علامہ مرحوم کی طبیعت اس وقت علیل تھی اور وہ کیبن ہی میں اپنا تمام وقت لیٹے لیٹے گزارتے تھے - جب میں روانہ ہونے لگا تو فرمایا کہ بغیر تکلف جب طبیعت چاہے آیا کرو - اب تو میں روزانہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگا - صبح ناشتے کے بعد جاتا اور دوپہر کے کھانے کے وقت وہاں سے واپس ہوتا اور پھر شام کے پانچ بجے سے سات بجے تک اُن کے ساتھ وقت گزارتا - یہ سلسلہ تقریباً دو ہفتے تک جاری رہا - بالآخر ہمارا جہاز وینس پنہچ گیا اور میری زندگی کے یہ زرین ترین اوقات ختم ہوگئے - میں وہاں سے سیدھا لندن چلا گیا اور علامہ مرحوم پیرس میں اپنے ایک دوست کے یہاں کچھ دنوں کے لیے ٹھہر گئے - اس عرصے میں غالباً دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر علامہ مرحوم سے تبادلۂ خیالات نہ ہوا ہو - معمولی سے معمولی اکل و شرب کے مسایل سے لے کر مشکل سے مشکل مابعد الطبیعیاتی مسائل زیر بحث آگئے - ہر چیز پر علامہ مرحوم

کی وسیع معلومات اور ایک خاص زاویۂ نگاہ دیکھ کر میں متحیر ہوجاتا تھا -

۲ - علامہ مرحوم کی لطف صحبت کے چند واقعات

ایک مرتبہ کھانوں کا ذکر آیا تو علامہ موصوف فرمانے لگے کہ افسوس ہے کہ اس وقت کھانوں میں کسی قسم کی جدت باقی نہیں رہی ہے - وہی پرانے کھانے اب تک چلے آرہے ہیں - اس سلسلے میں انہوں نے بارھویں صدی ہجری میں مرکزی ایشیا میں جو کھانے رایج تھے اور وہاں جو مختلف قسم کے پھل ہوتے تھے اس کا تذکرہ کیا اور لاانتہا کھانوں کے نام گنوا دیے - میں اُن کا غیر معمولی حافظہ دیکھ کر متحیر ہوگیا -

علامہ موصوف کو قیمتی پتھروں سے ' خصوصاً ہیروں سے بہت دل‌چسپی تھی - اس لیے نہیں کہ ان کی مادی قیمت زاید ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں شاعر کی نگاہ حسن ازل کی ایک جھلک دیکھتی ہے چنانچہ اسی سلسلے میں اُنہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کس طرح اُن کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے یہ خبر ملی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے جو نہایت چمکیلا ہے - جس وقت علامہ اقبال کی ملاقات اعلیٰ حضرت سے ہوئی تو اُنہوں نے اس ہیرے کے دیکھنے کی خواہش کی - اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا - اقبال نے پھر اس ہیرے کی چمک ' اس کے وزن اور اس کے حسن کا مکمل تذکرہ کیا - وہ یہ واقعہ جس جوش و خروش سے بیان کر رہے تھے اور جس طرح ان کی آنکھوں میں اس وقت ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو رہی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ حسن کا ہر مظہر کس طرح شاعر کی روح کے عمیق ترین جذبات کو چھیڑ دیتا ہے اور وہ پھر اسی سرمستی میں ازلی حسن کے گیت الاپنا شروع کر دیتا ہے -

## ۳ - شاعر کا قول و فعل

علامہ مرحوم حد درجہ سادگی سے گفتگو فرماتے تھے - وہ اپنے ساتھی کو اس کا احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ ایک بہت ہی بڑے عالم و فاضل کی معیت میں ہے - مخاطب کو مانوس اور اپنی خاکساری ظاہر کرنے کے لیے وہ ان سے اس قسم کے سوالات کرتے تھے کہ وہ گویا اس سے مستفید ہو رہے ہوں - علامہ کے اس طرز عمل نے مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو جو اب اکثر اُن کے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے' گستاخ کر دیا تھا - چنانچہ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ "آپ کے اشعار نے تو ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی ہے لیکن آپ تو اس سلسلے میں کچھ بھی عملی جدوجہد نہیں فرماتے" - علامہ نے بےساختہ جواب دیا "شعر کا تعلق عالم علوی سے ہے چنانچہ جب میں شعر کہتا ہوں تو عالم علوی میں ہوتا ہوں لیکن یوں تو میرا تعلق عالم اسفل سے ہے - اس لیے تم میرے اشعار اور میرے عمل میں کس طرح مطابقت دیکھ سکتے ہو" :-

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

علامہ اقبال کی اس خاکساری اور صاف گوئی سے میں بالکل خاموش ہو گیا -

## ۴ - اقبال اور ہندوستانی قومیت

میرے دل میں علامہ مرحوم کی طرف سے یہ کھٹک تھی کہ یہ شاعر انقلاب و آزادی کس طرح بعض مرتبہ ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے جس سے ہندوستان کی آزادی کی راہ میں بجائے مدد پہنچنے کے اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں - چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ع میں یورپ کی روانگی سے قبل علامہ نے لکھنؤ

کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب، سندھ اور بلوچستان وغیرہ کو ملاکر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہیے - اس پر اخبارات میں بڑی دھوم مچی اور اقبال پر الزامات عاید کیے گئے کہ وہ ہندستانی قومیت کو برباد کرنا چاہتے ہیں - میں نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ "میں ضرور چاہتا ہوں کہ ہندستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے ایک مرکز ہو اور یہ مرکز ظاہر ہے کہ صرف شمالی ہند کا یہ صوبہ ہو سکتا ہے لیکن اس سے میرا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ ہندستان کا ایک جزو ہو کر نہ رہے - میں تو ایک صحیح وفاق کا حد درجہ قایل ہوں - میں تو چاہتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک کی آزادی کے ضامن ہوں - اگر باہر سے لوگ اس ملک پر حملہ کریں گے تو ہم اس ملک کی حفاظت کریں گے - ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے - ہمیشہ ہندستان کے مسلمانوں نے باہر کے حملوں کو روکا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسلمان شمالی ہند میں خود کو آزاد محسوس کریں تو خود کی آزادی کی آیندہ کیوں نہ حفاظت کریں - میں نے دو تین صوبوں کو ملاکر جو ایک صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی ہے تو اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے مسئلے پر اتحاد ہو جائے - ہندو پنجاب میں مخلوط انتخاب رایج کرنا چاہتے ہیں - مسلمان اس کے اس بنا پر مخالف ہیں کہ انہیں ڈر ہے کہ کہیں ان کی تھوڑی سی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہوجائے - اس کا علاج صرف یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے صوبے پنجاب کے ساتھ ملحق کردیے جائیں - اس طرح مسلمانوں کی آبادی اس صوبے میں ساٹھ فی صدی ہو جائے‌گی اور مسلمانوں کے دل سے یہ ڈر نکل جائے‌گا کہ وہ کبھی بھی اس صوبے میں اقلیت میں تبدیل کردیے جائیں‌گے - اس صورت میں بآسانی مخلوط انتخاب رایج کر دیا جا سکے‌گا" -

اس سلسلے میں نفس قومیت کے متعلق علامہ مرحوم سے بحث چھڑ گئی۔ میں نے کہا کہ آپ کی ابتدائی نظمیں تو جذبۂ قومیت سے لبریز ہیں۔ کیا آپ کے خیالات میں اب کلیتاً تبدیلی پیدا ہو گئی ہے؟ فرمایا کہ "میں سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا اس لیے خاک وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت میرے خیالات بہت کچھ مادیت کی طرف مایل تھے۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب بھی میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے۔ اسلام اور مسلم میرے لیے خاص اصطلاحات ہیں جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لیے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے"۔

## ۵ - مغربی تحریک قومیت اور اتحاد اسلامی

علامہ اقبال مغربی جارحانہ قومیت کے سخت مخالف تھے جس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے، لیکن وہ قومی حکومتوں کے مخالف نہ تھے۔ انھیں اس کا اچھی طرح احساس تھا کہ دنیا میں ایک عالمگیر حکومت کا قایم کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ قوم، نسل، تاریخ، آب و ہوا اور دیگر جغرافیائی اختلافات ان کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اسلام میں خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک بھی ایک متحدہ اسلامی ریاست قایم نہ ہو سکی اور نہ اس کی کوئی امید دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اتحاد اسلامی کا تخیل اس معنی میں ضرور عملی جامہ پہن سکتا ہے کہ تمام اقوام آزاد ہوں اور وہ اسلامی مقاصد کے لیے باہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ یہ حکومتیں ایک قسم کی اسلامی قومی حکومتیں ہوں گی مگر ان قومی حکومتوں کی

بنیاد اخلاق اور محبت پر استوار ہونی چاہیے - یہ قومیت یورپ کی طرح جارحانہ نہ ہونی چاہیے جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہداری کی لعنت ہے - اخلاقی قومیت کے اقبال قطعی مخالف نہ تھے بلکہ موید تھے چنانچہ اس قسم کی قومیت کے علمبردار مسولینی وغیرہ کی تعریف میں وہ رطب‌اللسان ہیں - شروع شروع کی نظمیں اقبال نے اسی قومی اخلاقی احساس سے متاثر ہوکر لکھی ہیں - بعد میں جب اقبال نے قومیت کی بجائے اسلام کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صحیح اخلاقی قومیت کا مخالف ہوگیا بلکہ اس کی نظر اب اور وسیع ہوگئی - اخلاقی قومیت کی بنیاد پر وہ صرف ایک ملک کے باشندوں کو جمع کرسکتا تھا لیکن روحانی بنیاد یعنی اسلام کی بنیاد پر وہ تمام بنی نوع انسان کو جمع کر سکتا ہے - اس کی نظر کا دایرہ وسیع تر ہوگیا لیکن اس وسیع تر دایرے میں صحیح اسلامی قومیت کا دایرہ بھی شامل ہے چنانچہ اسلامی شاعری کے دور میں بھی اقبال کو ہندوستان کی غلامی رہ رہ کر ستاتی ہے اور ہندستان کی روح شعر کی زبان سے آہ و فغاں بلند کرتی ہے -

## ۲ - شاعر اور فطرت کے غیر معمولی مظاہر

خیال ہوتا ہے کہ اقبال جب جارحانہ قومیت کا مخالف ہے تو وہ اس کے علمبردار مثلاً مسولینی وغیرہ کی تعریف میں کیوں رطب‌اللسان ہے - مسولینی کی تعریف میں اقبال نے ایک شاندار نظم فارسی میں کہہ ڈالی ہے - خود مجھ سے بھی انہوں نے مسولینی سے ملاقات کا ذکر نہایت فخر سے کیا - وہ اس کے اخلاق کے بہت مداح تھے اور اس کی ظاہری شان و شوکت ' کشادہ سینہ ' مضبوط جسم میں روم کے شہنشاہوں کا جلوہ دیکھتے تھے - دوران گفتگو میں مسولینی نے مثنوی اسرار خودی کا تذکرہ کیا جس کا انگریزی ترجمہ وہ پڑھ

چکا تھا وہ شاعر مشرق کے خیالات سے بہت متاثر نظر آتا تھا چنانچہ اس نے اقبال سے درخواست کی کہ وہ اس کو اطالیہ کے نوجوانوں کے لیے کچھ نصیحت کریں - شاعر مشرق نے کہا کہ اطالیہ ابھی ایک نوجوان قوم ہے اور اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال آمدہ تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی و زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیے - معلوم نہیں مسولینی پر اس نصیحت کا کیا اثر پڑا مگر اس کے بعد ہی اطالیہ کے سب سے بڑے علمی ادارے' روم کی اکادمی نے اقبال کو اپنے یہاں تقریر کی دعوت دی اور اقبال کے بعض کلام کا اطالوی زبان میں ترجمہ کروایا گیا -

اقبال جو مسولینی سے متاثر ہے اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ اس کی وحشت و بربریت کا بھی مدح خواں ہے جو اس نے حبش میں کی - وہ شہنشاہیت کا بدترین دشمن ہے اور انسانیت پر ظلم و جبر کبھی بھی گوارا نہیں کرسکتا - اس کی یہ اثر پذیری شاعرانہ اثر پذیری ہے - وہ صرف اس مظہر قوت سے متاثر ہے جو اس کو مسولینی کی شخصیت میں دکھائی دیتا ہے - وہ ایک شاعر ہے اور شاعر کی طبیعت فطرت کے غیرمعمولی مظاہر سے ہر وقت متاثر ہوتی ہے یہ مظاہر چاہے بلند پہاڑ ہوں یا وسیع صحرا؛ پُر ہیبت موجیں ہوں یا گھنے جنگلات' مسولینی ہو یا مصطفیٰ کمال' جلال‌الدین رومی ہوں یا گوئٹے' غالب ہو یا شیکسپیر - اقبال نے ان تمام شخصیتوں سے متاثر ہو کر اشعار کہے ہیں - اسی طرح شاعر غیر معمولی حسن سے بھی متاثر ہوتا ہے - چاہے وہ حسن کسی مہ جبیں کی ابرو میں ہو یا کسی ہیرے کی کنی میں' کسی چشمے کی روانی میں ہو یا کسی چمکتے ہوئے ستارے کی سرخی میں -

اقبال کا مسولینی سے متاثر ہونا بھی اسی قسم کا ہے - شاعر المانوی گوئٹے

نے بھی جب نپولین کو دیکھا تھا تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

## ۷ - اقبال کی قومی شاعری کا دور

اقبال کی شاعری کو عموماً تین دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کا ہے جو اقبال کی قومی شاعری کا دور ہے۔ اس عرصے میں شاعر نے قومی درد سے لبریز خوب خوب نظمیں کہیں۔ وہ آزادیء ہند کی تحریک سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ چھوٹی نظموں میں کوہ ہمالہ' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' نیا شوالہ' ترانۂ ہندی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بڑی نظموں میں "تصویر درد" کا ایک ایک شعر وطن کے عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر نے ہندوستان کی موجودہ زبوں حالی پر خوب جی کھول کر نوحہ خوانی کی ہے اور اہل وطن کو آپس میں محبت کرنے اور غلامی سے آزاد ہونے کی تلقین کی ہے۔

قومی شاعری کا یہ دور زیادہ عرصے تک قایم نہ رہا' اس کے خاص طور پر تین اسباب ہوئے۔

الف - قیام یورپ

ب - تحریک تصوف کا مطالعہ

ج - اسلام کا مطالعہ

یورپ میں اقبال کو اپنی آنکھوں سے مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح جارحانہ قومیت کے تصور نے قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کردیا ہے' وہ کس طرح ایک دوسرے کی دشمن ہو گئی ہیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑانے میں مصروف ہیں۔

اپنے مقالہ فلسفۂ عجم کے سلسلے میں اقبال نے مغربی اور مشرقی فلسفہ و تصوف کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا۔ مغربی فلاسفہ اور مذہبی مفکرین میں سے اس نے

فلاطون ' سینٹ آگسٹائین ' سینٹ فرانسیس اسوسی ' اگنیشس لائیلا ' پوپ ' میدام
ھی گایاں براؤنلے ' الگزانڈر ' ھیگل ' نطشے ' برگساں وغیرہ کا مطالعہ کیا - مشرقی صوفیوں
میں خاص طور پر امام غزالی' رومی' جامی' حافظ اور ایرانی صوفیا کا کلام
اس کے پیش نظر رہا - ھندی فلسفے سے بھی اقبال کافی واقف تھا - شنکراچاریہ
کے فلسفے کا وہ خاص طور پر دل دادہ تھا - دکن کی تحریک تصوف کا جس
کے علم بردار ایک ناتھ اور دگمبر وغیرہ تھے' اقبال نے کافی مطالعہ کیا تھا -

تحریک تصوف کے اس مطالعہ نے ایک بات اقبال پر بہت واضح کر دی
کہ دنیا کی اصل حقیقت مادہ نہیں ہے بلکہ روح ہے -

عالم ظہور جلوۂ ذوق و شعور ہے

مذھبی اصطلاح میں اسی غیر مادی شعور کو روح کہتے ھیں - مولانا
روم کے خیالات سے اقبال بہت ھی متاثر نظر آتا ہے چنانچہ وہ خود کو ان کا
خوشہ چیں کہتا ہے -

## ۸ - اقبال کی فطری شاعری کا دور

سنہ ۱۹۰۵ع سے سنہ ۱۹۰۸ع تک اقبال کی شاعری کا در اصل عبوری
دور ہے - اس دور میں اقبال کی فطری شاعری کا رنگ اور بھی زیادہ نکھر آیا
ہے - یورپ کے حسین مناظر نے شاعر کے دل پر بہت اثر کیا اور اکثر نظمیں
انہیں تاثرات کا نتیجہ ھیں - اسی بنا پر اس دور کی شاعری کو ھم اقبال کی
فطری شاعری کا دور بھی کہہ سکتے ھیں - اسی دور میں اقبال نے بہت کم مگر
نہایت اچھی فطری نظمیں کہی ھیں - مثلاً ایک شام' حقیقت حسن' چاند
تارے' تنہائی وغیرہ فنی اعتبار سے نہایت لاجواب نظمیں ھیں - اس دور میں
بھی تصوف کا ھلکا سا رنگ اقبال کی شاعری میں موجود ہے - وہ فطرت انسانی
اور خارجی فطرت میں ایک عجیب ھم آھنگی اور ارتباط محسوس کرتا ہے -

انسانی دل کی کسک اور غنچے کے چٹکنے کی اصل وہ ایک ھی قرار دیتا ھے - وہ غیر محسوس طور پر فطرت کے تمام مظاہر کی اصل ایک ھی قرار دیتا ھے - اسی بنا پر دریا کی روانی اور سبزے کی شادابی میں اس کے مضطرب دل کو سکون حاصل ہوتا ھے -

## ۹ - اقبال کی اسلامی شاعری کا دور

سنہ ۱۹۰۸ع میں اقبال ھندستان واپس آگیا - اسی زمانے میں عالم اسلام میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی - اسلامی ممالک کی تباھی سے مسلمانان ھند بھی بے چین ھو گئے - جنگ طرابلس' جنگ بلقان' جنگ عظیم اور اس کے بعد جنگ اناطولیہ نے مسلمانوں کے جذبات کو اُبھارا - اقبال بھی مسلمانان ھند کی ان تحریکات سے کافی متاثر ہوا - چنانچہ اس عرصے میں اس نے درد اسلامی سے لبریز خوب خوب نظمیں کہیں - اسلام کی اس تحریک کو 'پان اسلامزم' کی تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام ممالک اسلامیہ کی خلیفہ کے تحت میں ایک اسلامی ریاست قایم کی جائے - سلطان عبدالحمید اس کے علم بردار تھے -

مجھے علامہ اقبال سے اس مسئلے پر کافی تبادلۂ خیالات کا موقع ملا - وہ اس قسم کی ایک اسلامی واحد سلطنت کے قیام کو ناممکن سمجھتے تھے - اس قسم کی سلطنت کا خاتمہ خلافت راشدہ کے بعد ہوگیا اور اس کے بعد وہ کبھی بھی قایم نہ ھو سکی - انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ خیال ایک فرانسیسی سیاست‌داں نے اس لیے تراشا تھا (جس کا نام میں اس وقت بھول گیا ھوں) کہ وہ اسلامی ممالک کے خلاف متحدہ یورپ کے جذبات بھڑکائے - اُن کو اسلامی غلبے سے ڈرائے تاکہ مغربی اقوام کو اسلامی ممالک میں دست درازی کا موقع مل جائے - چنانچہ ایسا ھی ہوا - انگریز سیاست دانوں نے

خود یہ خیال ہندوستان میں عام کیا تا کہ، مسلمانان ہند کی توجہ ملک کے داخلی سیاسی مسائل کی طرف نہ ہو بلکہ اسلامی ممالک کے ساتھ زبانی ہمدردی میں ان کا تمام جذبۂ عمل ختم ہوجائے' مسلمانان ہند کی سیاست عملی نہ ہو بلکہ صرف خیالی ہو کر رہ جائے - علامہ اقبال اس معنی میں جس معنی میں کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے' 'پان اسلامسٹ' نہ تھے بلکہ وہ ایک مسلمان کی طرح اخوت اسلامی کے زبردست قایل تھے - وہ آزادیء اسلام کو ہندوستان بلکہ تمام مشرق کی آزادی کا ضامن سمجھتے تھے -

## ۱۰ - مسلمانان ہند کی جدید تحریک قومی کے خصائص

مسلمانان ہند کی بیسوی صدی میں اسلامی قومی تحریک سے اقبال کے آیندہ خیالات کے سمجھنے کے لیے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے - وہ خود اسی شاعری کی تخلیق تھا اور اس تحریک کے پیدا کرنے میں اس کا زبردست ہاتھ تھا - اس تحریک کے تین زبردست علم بردار مولانا محمد علی' مولانا ابوالکلام اور علامہ اقبال تھے - محمد علی نے اپنی سیاسی تحریر و تقریر' ابوالکلام نے اپنی تفسیر قرآنی اور اقبال نے اپنی شاعری سے اس تحریک کو پیدا کیا اور اس کو پروان چڑھایا - اسلام کی پستی کے احساس کے باعث یہ تحریک پیدا ہوئی اور اسلام کو اس کے اصل رنگ و روپ میں دیکھنا اس کا مقصد قرار پایا - یہ تحریک بہت حد تک ماضی کی روایات پر مبنی تھی - قومی احساسات سے زیادہ مذہبی حس اس تحریک کی جان تھی - آزادی ہند کا خیال اس تحریک میں مفقود تو نہ تھا لیکن وہ بالذات مقصد بھی نہ تھی - یہ ایک جذباتی تحریک تھی جو ہندوستان کی عملی سیاست کی بجائے عالم اسلامی کی سیاست میں تجویزوں کے ذریعے حصہ لینا چاہتی تھی -

علمی اعتبار سے اس نے اردو علم و ادب میں ایک نئی انشا اور نئی

شاعری کی بنیاد ڈالی - اس کی بنیاد قرآن کے روحانی اور اخلاقی قوانین پر تھی - اس تحریک میں دیوبند کی مذہبی تحریک کے علما اور علی‌گڈھ کی دنیوی تحریک کے علم بردار لیڈر جو گزشتہ نصف صدی سے ایک دوسرے سے علیحدہ تھے' آکر مل گئے - دونوں کے اتحاد سے ہندستان میں ترکی اور ایران کے خلاف علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی کش‌مکش کا دور جاتا رہا اور دین و دنیا یک جا آکر مل گئے -

تعلیمی اعتبار سے اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی جس کی تشکیل میں مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کا ہاتھ شامل تھا اور جو مسلم نوجوانوں کو دین و دنیا دونوں سے بہرہ‌ور کرنا چاہتا ہے -

سیاسی اعتبار سے اس نے تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات پیدا کی اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی حکومت کے فنا ہو جانے کے ایک عرصہ بعد ایثار و قربانی کا عملی مجاہدانہ قدم اُٹھایا - اس تحریک کا اثر اقبال کے خیالات پر بہت پڑا اور ان کی شاعری اس تحریک کی آئینہ دار ہے -

## ۱۱ - فلسفی یا شاعر

اسی عرصے میں اقبال کا تصور کائنات بھی متعین ہونے لگا جس کا اظہار انہوں نے اپنی بعد کی کتابوں اسرار خودی' رموز بے خودی' پیام مشرق' جاوید نامہ' زبور عجم' ضرب کلیم وغیرہ میں کیا ہے - میں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا کہ اقبال نے اب اپنا فلسفہ مرتب کرلیا - اقبال کو فلسفے کے نام سے چڑ تھی اور وہ اپنے آپ کو کبھی بھی فلسفی کہنا پسند نہیں کرتے تھے - دوران گفتگو میں بعض مرتبہ میرے منہ سے بلا ارادہ اگر ان کے لیے فلسفی اور ان کے خیالات کے لیے نظام فلسفہ کے الفاظ نکل گئے تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ان کا کوئی نظام فلسفہ نہیں ہے - وہ کہا کرتے تھے کہ

فقیری ان کو وراثتاً ملی ہے اور فلسفہ وغیرہ انھوں نے صرف انھیں حقائق کو جن کا ان کو کلی یقین ہے' عقلی طور پر سمجھنے کے لیے سیکھ لیا ہے -

محدود معنی میں فلسفہ اس نظام خیالات کا نام ہے جو عقلی غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے' جو نامی نہیں بلکہ جامد ہوتا ہے - جس کا تعلق زندگی کے تمام سرچشموں سے نہیں بلکہ صرف عقل سے وابستہ ہوتا ہے' جو کاینات کے تمام تصور پر نہیں' بلکہ صرف عقلی استدلال پر مبنی ہوتا ہے - اقبال ایک شاعر تھا اور شاعری اس کے لیے جزو پیغمبری تھی - اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سرچشمہ حقیقت سے بلا واسطہ تعلق کا نتیجہ تھا - وہ صرف عقل کا ممنون احسان نہیں تھا بلکہ اپنی تمام وجدانی کیفیت کا - اسی بنا پر اس کے خیالات کو ہم محدود معنی میں فلسفہ نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ایک مکمل تصور کاینات تھا جس کو شاعری کا رنگ و روپ دے کر اقبال نے دنیا کے سامنے پیش کیا - ہر بڑے شاعر کے لیے ایک تصور کاینات کا ہونا لازمی امر ہے - اسی طرح اقبال کا بھی ایک تصور کاینات تھا - جو اقبال کے کلام اور زندگی کو بحیثیت ایک شاعر کے سمجھنے کی کوشش کریں گے وہ اسے صحیح سمجھیں گے' لیکن جو اسے بحیثیت ایک فلسفی یا سیاست داں کے سمجھنے کی کوشش کریں گے ان کے لیے اقبال کا کلام اور اس سے زیادہ اس کی زندگی ایک عقدۂ لاینحل ہو کر رہ جائے گی - اقبال از اول تا آخر ایک شاعر تھا -

## ۱۲ - اقبال کا اسلامی تصور کاینات

اقبال کے تصور کاینات پر بالاخر خالص اسلامی رنگ چڑھ گیا - غزالی و رومی کا مطالعہ کرتے کرتے بالاخر شراب حقیقت کا یہ پیاسا اصل سر چشمۂ زندگی تک پہنچ گیا - قرآن ہدایت انسانی کے لیے آخری صحیفہ ہے - اقبال کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر

کائنات کے تمام اسرار سربستہ کھل جائیں - رسول اللہ صلعم کی زندگی اس قرآن کی ایک عملی تفسیر ہے - دنیا پہلے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی اس لیے وہ عقلی احکامات نہ سمجھ سکتی تھی' - اس لیے معجزات کے ذریعے اس کی رہنمائی کی گئی - رسول اللہ صلعم کے زمانے میں دنیا اپنے عہد بلوغ کو پہنچ گئی' چنانچہ آپ کو ایسا پیغام دیا گیا جو انسان کے عقلی قوانین پر مستحکم ہو - ختم نبوت کے لیے اقبال ایک انوکھی دلیل لاتا ہے - وہ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم پر نبوت اس لیے ختم ہو گئی کہ انہوں نے انسانیت کو ایک ایسا نظام زندگی دیا جو عقل پر مبنی ہے - معجزات کی اب ضرورت اس لیے باقی نہیں کہ انسانی عقل اب اپنی فلاح و بہبود کے وسایل خود متعین کر سکتی ہے - انسانی عقل ہی اب تمام امور کے لیے آخری معیار قرار پایا - اندھی تقلید اور ایمان نہیں بلکہ عقلی غور و فکر و فطرت کا مطالعہ انسانیت کے لیے اصلی سرچشمۂ ہدایت ہے - قرآن کی تعلیمات اور عقل انسانی میں کسی قسم کا کوئی بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ قرآن کا ہر اصول و قانون عقل کے معیار پر پورا پورا اترتا ہے - یہاں اقبال کے خیالات کس قدر عقلیت پر مبنی نظر آتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوائے عقل کے کسی چیز کو بھی تسلیم نہیں کرتا لیکن در اصل یہ نہیں ہے - اس مسئلے کی وضاحت ہم آیندہ کریں گے -

انسانی نشو و نما کے لیے بنیادی قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے - وہ دے دیے گئے ہیں - ان اصولوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی البتہ مختلف حالات کے لیے جزیات میں تبدیلی کی ضرورت ہے سو وہ ان اصولوں سے استنباط کیے جا سکتے ہیں یا ضرورت زمانہ کے مطابق ان کی تاویل کی جا سکتی ہے - شریعت اسلامیہ میں اس کو اجتہاد کہتے ہیں لیکن یہ اجتہاد ہمیشہ قرآن و سنت

کے تابع ہوگا - اجتہاد کی صحت یا عدم صحت کا دار و مدار عقل اجتماعی پر منحصر ہے - اس اصول اجتہاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اقبال ہیئت اجتماعیہ کو جامد نہیں بلکہ ارتقائی تسلیم کرتا ہے - جماعت لحظہ بہ لحظہ نشو و نما کر رہی ہے - اس تغیر و ارتقا کے ساتھ اس کو نئے نئے قوانین کی ضرورت ہے اسلام نے اصول اجتہاد کے ذریعے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے -

## ۱۳ - اصول ارتقا اور کائنات

نہ صرف جماعت کے متعلق بلکہ کل کائنات کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر ارتقائی ہے - عدم سے وجود میں دنیا یک بیک نہیں آگئی ہے بلکہ اس نے ارتقا کی بہت سی منازل طے کی ہیں - مولانا روم کی طرح وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ انسان نے اپنی انسانیت سے پہلے جمادات ' نباتات اور حیوانات کی منازل طے کی ہیں اور آیندہ بھی وہ ترقی کی بے شمار منازل طے کرے گا - مادیت سے تدریجاً وہ روحانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس ارتقا کا خاتمہ مکمل روحانیت پر ہو جائے کیوں کہ ارتقا کی انتہائی منزل کا تصور صرف روحانیت ہی کا تصور ہو سکتا ہے -

انسان ' جماعت اور کائنات میں ارتقائی اصول کار فرما ہے لیکن یہ ارتقا ہموار نہیں ہوتا بلکہ اصول تضاد کا پابند ہے - صبح کی دلفریبی کے لیے شام کی تیرہ بختی ' بہار کے لیے خزاں ' بلند پہاڑوں کے لیے عمیق وادیاں ' خوشی کے لیے غمی ' زندگی کے لیے موت ' ضمیر انسانی کے لیے نفس امارہ ' نیکی کے لیے بدی ' اقوام کی ترقی کے لیے تنزل ' کائنات کے تناسب و ہم آہنگی کے لیے اُس کی ہیبت و قیامت ' خدا کے لیے شیطان ضروری ہے -

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اقبال زندگی کے اس دوسرے پہلو سے چشم پوشی نہیں کرتا - وہ کائنات کے ارتقا میں اصول تخریب کی اھمیت کو اسی طرح تسلیم کرتا ھے جس طرح اصول تعمیر کو - چنانچہ شیطان کو وہ "مولوی" کی طرح نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کی همت عالی کی داد دیتا ھے - نیکی و بدی کی اس کش مکش میں بالآخر غلبہ نیکی ھی کو حاصل ھوتا ھے کیوں کہ زندگی کی اصل خیر ھے - بدی تو محض نیکی کا ایک تکمہ ھے جس کے بغیر نیکی کا وجود نہیں ھو سکتا - بقول غالب :—

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ھے آئینۂ باد بہاری کا

کائنات کا یہ تصور کہ زندگی کی اصل صداقت ' نیکی اور حسن ھے ' رجائی فلسفہ تاریخ کا بنیادی اصول ھے - مذھبی پیشوا تو اس خیال کو ھمیشہ ھی سے پیش کرتے چلے آئے ھیں ' مغربی فلسفہ میں بھی افلاطون کے وقت سے یہ خیال عام ھوگیا ھے - اقبال بھی اس فلسفۂ امید کا پیامبر ھے - اس کے لیے کائنات کی اصل صداقت ' حسن اور نیکی ھے - وہ حسن کا ھر جگہ متلاشی ھے - وہ ایک عاشق ھرجائی ھے جو حسن کی اس کے ھر مظہر میں پرستش کرنا چاھتا ھے -

جستجو گُل کی لیے پھرتی ھے اجزا میں مجھے

حسن بے پایاں ھے درد لا دوا رکھتا ھوں میں

گو حسین تازہ ھے ھر لحظہ مقصود نظر

حسن سے مضبوط پیمان وفا رکھتا ھوں میں

وہ قنوطیت کو اپنے پاس بھی نہیں آنے دیتا - وہ 'شوپنھار' کی طرح جس نے ھندو فلسفے کے زیر اثر دنیا کو ایک کرب و الم کی جولاں گاہ سمجھا تھا ' مایوس نہیں ھے - وہ کائنات کی ھر نیرنگی اور تغیر میں قدرت کا رحیم

ھاتھ کار فرما دیکھتا ھے جو اس کو ترقی کی بلند سے بلند منازل کی طرف لے جا رھی ھے -

کاینات کے اس ارتقائی نظریے میں چند دقتیں ھیں جن کا حل برگساں کی طرح اقبال بھی آخر تک نہ کرسکا - کاینات ارتقا کہہ رھی ھے یعنی تغیر پذیر ھے - تغیر نشانی ھے نقص و کمی کی - کیا یہ نقص کبھی رفع ھو جائے گا یعنی کاینات مکمل ھو جائے گی ؟ جس وقت بھی کاینات مکمل ھو جائے گی اس وقت اس کی ترقی کے امکانات پھر محدود ھو جائیں گے یعنی اس میں نقص آجائے گا - کیوں کہ حد و تعین نقص کی نشانی ھے - خالق کاینات کاینات کے ذریعے اپنا اظہار کر رھا ھے - بقول غالب :—

اصل شہود و شاھد و مشہود ایک ھے

کیا مشہود کی طرح شاھد بھی اصول ارتقا کا پابند ھے - اقبال وھاں بھی اصول ارتقا کو تسلیم کرتا ھے - اگر یہ واقعہ ھے تو پھر مندرجہ بالا دقتیں یہاں بھی پیدا ھوتی ھیں - اگر وہ اصول ارتقا کا پابند ھے تو گویا اس میں نقص ھے اور اگر نہیں ھے تو اس کے ارتقا کے امکانات محدود ھیں جو خود ایک نقص کی نشانی ھے -

اقبال کے فلسفہ اور ھیئت اجتماعیہ کے متعلق اُس کے تفصیلی خیالات سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں جس کا اظہار اس نے Reconstruction of thought in Islam میں کیا ھے - اس کتاب میں اس نے جدید علوم و فلسفہ کی روشنی میں اسلام کا جدید علم کلام مرتب کیا ھے -

## ۱۴ - اقبال کا نظریۂ علم

اقبال کے بنیادی خیالات کو سمجھنے کے لیے البتہ دو ایک باتوں کا جان لینا ضروری ھے اولاً تو اس کا نظریۂ علم - اقبال ھمیشہ عقل کی تضحیک کرتا

ہے۔ اُس کی بے بضاعتی اور کم مایگی پر توجہ دلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقل زندگی کے اسرار سربستہ کو فشا نہیں کرسکتی اور نہ وہ زندگی کے لیے کوئی راہ عمل مرتب کرسکتی ہے۔ وہ عقل کے مقابلے میں دل کو سراہتا ہے اور دل کی صنعت عشق کا تو وہ دل دادہ ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

اقبال کے خیالات میں یہ ایک عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف تو وہ بے بضاعتی عقل کی طرف توجہ دلاتا ہے اور دوسری طرف وہ ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد ہی عقلی قوانین پر رکھتا ہے۔ در اصل اقبال کے خیالات میں الجھن اس لیے دکھائی دیتی ہے کہ وہ جس وقت عقل کو اہمیت نہیں دینا چاہتا تو اس کا محل وقوع دوسرا ہوتا ہے۔ اقبال عالم مادی میں عقل کی مکمل دسترس تسلیم کرتا ہے لیکن عالم ارواح میں وہ اس کو محض بے کار سمجھتا ہے۔ جہاں تک علوم طبعیہ، عقلی فلسفہ، منطق، فلسفہ سیاست و معیشت، ریاضی وغیرہ کا تعلق ہے یہاں صرف عقل ہی کی کسوٹی پر سچ اور جھوٹ کو پرکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح جسمانی اعضا سے عقل کا کام نہیں لیا جا سکتا اسی طرح عقل سے اصل حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا؛ کیوں کہ اصل حقیقت کی سرحد عقل سے ماوریٰ ہے۔ فرانس کا مشہور فلسفی برگساں جس کے اور اقبال کے خیالات میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے، حقیقت کے پتہ چلانے کے اس ذریعے کو وجدان کہتا

ھے - یہ وجدانی کیفیت عقل سے ایک ماوریٰ چیز ھے جو انسان کا تعلق حقیقت سے بلا واسطہ پیدا کر دیتی ھے - ۷

## ۱۵ - اقبال کا تصور عشق

وجدان کے نظری عناصر کے ساتھ اقبال نے زندگی کے عملی عناصر بھی شامل کردیے ھیں اور دونوں کی ترکیب سے اقبال کے تصور کاینات کی مشہور اصطلاح "عشق" وجود میں آئی ھے - عشق میں عقل کی موشگافیوں اور چوں و چراں کی گنجایش نہیں ھے - یہاں منطقی استدلال صغریٰ و کبریٰ' تجزیہ و تجرید کا سوال ھی نہیں اٹھتا - عشق رموز کے تمام پردے اٹھا دیتا ھے اور شاھد معنی یہاں بے نقاب ھو جاتا ھے - عشق ھر چیز میں انفرادیت پیدا کر دیتا ھے - عشق صرف انسان ھی میں نہیں پایا جاتا بلکہ اس کا وجود جمادات' نباتات' حیوانات غرض کہ کاینات کے ھر ذرے میں موجود ھے - یہ ھر ذرے کا تعلق اصل حقیقت سے قایم رکھتا ھے تاکہ اُس کی مادی اور معنوی تربیت ھو سکے - عشق تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو سر کرتا ھوا منزل مقصود کی طرف بڑھتا چلا جاتا ھے اور بالاخر کامیابی کا سہرا اسی کے سر رھتا ھے - خوف و حزن کا عشق میں گزر نہیں ھے -

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ھے محو تماشائے لبِ بام ابھی

عشق میں انسانی جد و جہد کو زیادہ دخل نہیں ھے بلکہ یہ فیضان رحمت کی طرف سے جسے چاھے اُسے عطا ھوتا ھے - سب سے زیادہ عشق پیغمبروں کو عطا کیا گیا ھے اور اس کا اکمل ترین اظہار خاتم النبیین محمد صلعم میں ھوا ھے - یہ عشق کارگاہ ھستی میں ایزدی رھنمائی ھے جس کے ذریعے انسان اپنی مادی اور روحانی منازل ارتقا طے کرتا ھے - خدا کو

خود اپنی ذات سے عشق ہے جس کے باعث اس نے کائنات کو پیدا کیا تاکہ وہ خود اپنا مشاہدہ کر سکے —

دھر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (غالب)

## ۱۶ - عقل و عشق

اقبال اگر وجدان و عشق ہی کو اصل سر چشمۂ ہدایت سمجھتا ہے تو پھر اس نے جدید عقلی علوم کی بنا پر ایک فلسفہ اور ایک جدید علم الکلام کیوں مرتب کیا ؟ یہ سوال میں نے خود علامہ مرحوم سے کیا تھا - انہوں نے فرمایا کہ "عشق ہی دراصل بنیادی چیز ہے - مگر دنیا میں تمام انسان یکساں نہیں ہوتے - بعض کو یہ عطیہ الٰہی نصیب نہیں ہوتا اور بعض پیغمبروں کی اطاعت بلا چوں و چرا کرنا نہیں چاہتے - ان کے لیے ضروری ہے کہ علوم عقلیہ کی جدید ترین تحقیقات کی بنیادوں پر مذہب کی حقیقت واضح کی جائے - لیکن سائنس کی تحقیقات کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا - وہ کسی حد تک مذہب کی بنیادی روحانی حقیقت تک ضرور رہنمائی کر سکتی ہیں - مگر اُن کی یہ رہنمائی نہ تو قطعی ہو سکتی ہے اور نہ ہمیشہ قابل یقین - اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فطری قوانین اور وحی الٰہی میں کبھی تضاد ہو سکتا ہے - لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عقل انسانی رفتہ رفتہ ترقی کر رہی ہے اور وہ ہنوز فطرت کے اسرار سر بستہ کو صحیح طور پر معلوم کرنے سے عاجز ہے -

علامہ اقبال کے اس خیال کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا - مادیین یہ کہتے ہیں کہ ذرات (Atoms) ہی اصل کائنات ہیں - یہ ذرات چوں کہ مادی ہیں اس لیے دنیا بھی صرف مادہ سے تعمیر کی گئی ہے - روح کا یہاں

کہیں وجود نہیں ہے - اس خیال کے مخالفین نے بتایا کہ انسانی شعور مادہ نہیں ہے کیوں کہ یہ مکان کا پابند نہیں ہے - مادہ اور شعور میں بنیادی اختلافات ہیں - کچھ دنوں اس ثنویت (Dualism) کو اہل علم تسلیم کرتے رہے - اب سائنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ذرات قابل تقسیم ہیں اور ان ذرات کی اصل ایلکٹران (Electron) ہیں جو مادی نہیں ہیں بلکہ ایک قسم کی قوت (Energy) ہیں - قوت اور شعور خاصیت میں ایک ہیں گویا کہ اب خود سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کی اصل شعور ہے -

منطق ' ریاضی ' علم طبیعات ' فلسفہ اور تاریخ کی مدد سے اقبال روحانی حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ یہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ کوشش صرف ان کے لیے ہے جو اصل سرچشمہ سے سیراب ہونا نہیں چاہتے یا نہیں ہو سکتے - اقبال مادیت کا سخت ترین مخالف ہے - وہ کانٹ کی ثنویت (Dualism) کو بھی تسلیم نہیں کرتا - اس کے نزدیک تو "عالم ظہور جلوہ ذوق شعور ہے" - وہ شنکراچاریہ اور ہیگل کی طرح شعور کو اصل کائنات تصور کرتا ہے لیکن شعور سے اُس کا مفہوم صرف عقلی اصول نہیں ہے بلکہ وہ عقل سے بھی جامع یعنی روح ہے جسے گوئٹے گائسٹ کہتا تھا - وہ گوئٹے کی طرح جمادات ' نباتات ' حیوانات اور انسانوں میں گائسٹ ہی کو اصل زندگی تصور کرتا ہے اور باقی ہر چیز کو اس کا مظہر - اس لیے اس کا دل جو روح ازلی کا مکین ہے گوئٹے کی طرح ہر چیز میں روح کا وجود دیکھ کر بےتاب ہو جاتا ہے - وہ دنیا کو جامد نہیں بلکہ نامی تصور کرتا ہے جو روح سے لبریز ہے -

## ۱۷ - اقبال کا تصور خودی

اقبال نے اپنے تصور کائنات کو نیم شاعرانہ' نیم فلسفیانہ اصطلاح "خودی" کے

ذریعے ظاہر کیا ہے - عشق خودی کا فعل ہے - شجر و حجر، حیوان و انسان غرض کہ کائنات کی ہر چیز کی ایک خودی ہوتی ہے - یہی خودی اصل زندگی ہے -

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سِرِّ زندگانی ہے

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداریء کائنات

-----

یہ خودی کیا چیز ہے؟ اقبال کے خیالات کو سمجھنے والوں کے لیے اس کو متعین کرنے میں اب دقت نہ ہوگی - خودی انسان کا مادی پہلو نہیں ہے کیوں کہ مادی پہلو تو اقبال کے لیے محض ایک عارضی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے - جو لوگ کہتے ہیں کہ اقبال جرمن فلسفی نطشے سے بہت متاثر ہوا ہے ان کی غلطی یہاں صاف عیاں ہو جائے گی - نطشے انسان کے حیوانی پہلو کی پرستش کرتا تھا - وہ قومی ہیکل انسانوں کو دنیا کے حاکم بنا دینا چاہتا تھا - وہ ان کے ہر ایک جابرانہ فعل کو انسانیت کے لیے معیار قرار دینا چاہتا تھا - اخلاق اس کے نزدیک صرف قومی حاکم کے اعمال کا نام تھا - اقبال اس کے بالکل برعکس انسان کی حیوانی خودی کو نہیں بلکہ اس کی روحانی خودی کو ترقی دینا چاہتا ہے - وہ جہد للبقا میں حیوانیت کو نہیں بلکہ روحانیت کو اصل معیار زندگی سمجھتا ہے - اس کا مثالی حاکم نطشے کی طرح قوی حاکم نہیں ہے بلکہ "مرد قلندر" ہے جو روحانی قدور کے سامنے دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا دیتا ہے - بادشاہ جس کے آگے سرنیاز خم کرتا ہے - جو اپنی شان و شوکت اور فوج و سپاہ

کے ذریعے نہیں بلکہ روحانیت اور فقر کے ذریعے دنیا و جہاں کی پادشاہت کرتا ہے - انسان کی جب یہ خودی بیدار ہو جاتی ہے تو اس کی ترقی کے امکانات لا محدود ہو جاتے ہیں ' کیوں کہ اس وقت اس کا ایزدی عنصر بیدار ہو جاتا ہے جس کی ترقی کے امکانات کا پتہ کون و مکاں کو بھی نہیں لگ سکتا -

افراد کی طرح یہ خودی اقوام میں بھی ہوتی ہے اور اُس کا مزاج ہر قوم میں مختلف ہوتا ہے - قوم کی اس خودی کو ہم روح قومی بھی کہہ سکتے ہیں - حافظہ کو جو حیثیت انسانی زندگی میں ہے اسی طرح قوم کی تاریخ کی حیثیت قومی زندگی میں ہے - قومی تاریخ کو محفوظ رکھنے اور اُس کو آیندہ نسلوں تک پہنچانے سے قومی خودی بیدار اور مضبوط ہوتی ہے -

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا چراغ
خودی کے ساز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

قومی خودی کی طرح انسانیت کی بھی خودی ہوتی ہے - اسی خودی کو سب سے اول محمد صلعم نے بیدار کیا - نسل و رنگ ' وطن و قوم' عرب و عجم کے تمام امتیازات کو مٹا کے ' انسنیت کا تخیل پیش کر کے اور اس کو عملی جامہ پہنا کے نبی اُمی نے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنا دیا - لیکن انسانیت کو اس خودی کا اب تک صحیح احساس پیدا نہیں ہوا ہے اس لیے وہ باہم دست و گریباں ہے - اقبال انسانیت کی اس تباہی پر خون کے آنسو بہاتا ہے - وہ جارحانہ مذموم قومیت ' سرمایہ داری' شہنشاہیت ' رنگ و نسل کے امتیازات جنگ و جدل' نفرت و عداوت پر نوحہ‌کناں ہے - انسانیت کی تباہی سے اقبال کے دل میں ٹیس اٹھتی ہے -

انسانیت کی خودی کی طرح تمام کاینات کی بھی ایک خودی ہے - وہ کاینات کی اصلی روحانی بنیاد ہے - مذہبی اصطلاح میں اسی کو خدا کہتے

ہیں - خودی اور خدا کا بڑا قریبی تعلق ہے - چنانچہ جو خودی کے اسرار و رموز سمجھ لیتا ہے وہ خدا کو سمجھ لیتا ہے -

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

خودی کے سمجھنے کے لیے فطرت' علم النفس' تاریخ اور مابعد الطبیعات کا مطالعہ ضروری ہے - خودی جمادات' نباتات' حیوانات اور انسان کے منازل طے کرتی ہوئی ارتقا کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے - جن قوانین کے ذریعے خودی یہ منازل طے کرتی ہے اس کو اقبال اسلام کہتا ہے' یعنی عناصر کی نظام کائنات سے مکمل ہم آہنگی - انسانوں میں جو اس قانون کی پیروی کرتا ہے اقبال اس کو مسلم کہتا ہے یعنی خدا کا اطاعت گزار بندہ' کائنات کی مشین میں ٹھیک بیٹھ جانے والا پرزہ -

اقبال کے فلسفیانہ خیالات اور اسلامی تعلیمات میں اب مکمل مطابقت پیدا ہو گئی - وہ کائنات کی بنیادی خودی کو اسلام کا خدا کہتا ہے - اس خودی کو تربیت دینے کے لیے جو انسان دنیا میں بھیجے جاتے ہیں وہ خدا کے رسول ہیں - محمد صلعم خاتم النبیین تھے کیوں کہ انھوں نے انسانی خودی کی تربیت کے لیے جو کچھ بھی قوانین ضروری ہیں وہ سب دنیا میں پیش کر دیے - اسلامی احکامات یعنی نماز' روزہ' زکواۃ اور حج وغیرہ کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی خودی کی نشو و نما ہوتی ہے - امت اسلامیہ چوں کہ ان تعلیمات کی حامل ہے اس لیے اس کے سپرد بنی نوع انسان کی رہنمائی کا کام کیا گیا ہے کیوں کہ کوئی پیغام بغیر کسی قوم کے پہنچایا نہیں جا سکتا - اقبال کے لیے رسول اللہ اور ان کے بعد خلفائے راشدین کا زمانہ انسانیت کی تعلیم کے لیے مثال کا کام دیتا ہے - اس وقت صحیح روح انسانی کا ظہور انسانی اجتماعی اداروں میں ہوا تھا - وہ اس وقت کی جمہوریت' معیشت اور مذہبی زندگی کو صحیح

زندگی سمجھتا ہے -

## ۱۸ - تصوف ' اسلام اور عمل

اقبال در اصل ایک اسلامی صوفی شاعر تھا - وہ منفی تصوف کا نہیں بلکہ اثباتی تصوف کا حامل تھا - منفی تصوف وہ ہندی عجمی تصوف ہے جو انسان کو اس دنیا سے بے تعلق کر کے صرف روحانیت میں گم کر دے - اثباتی تصوف اسلامی تصوف ہے جو انسان کا روحانیت سے اس طرح تعلق باقی رکھے کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ انفرادی اور اجتماعی فرایض انجام دے - اس کی سب سے اعلیٰ مثال رسول اللہ کی زندگی میں ملتی ہے - اقبال کو رسول اللہ کی ذات سے عشق تھا اور وہ خاک پاک حجاز میں مرنا جینے سے بہتر سمجھتا تھا - سنا ہے کہ وہ آخری عمر میں رسول اللہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کے لیے ایک نظم بھی لکھ رہے تھے جو نا مکمل رہ گئی - مشتاقان کلام اقبال کو اس کی طباعت کا بےچینی سے انتظار ہے -

گوشہ نشین صوفیا اور خشک ملاؤں کو اقبال پسند نہیں کرتا تھا - دونوں کو وہ اسلام کی اصل راہ سے ہٹا ہوا سمجھتا تھا -

برکلے کی طرح وہ دنیا کو محض وہم و خیال تصور نہیں کرتا تھا بلکہ اس کو ایک ٹھوس حقیقت مانتا تھا - وہ موضوعی عینیت (Subjective Idealism) کا نہیں بلکہ معروضی عینیت (Objective Idealism) کا قایل تھا - اسی بنا پر 'نفی' نہیں بلکہ 'اثبات' اس کے فلسفے کی جان ہے - وہ شاعر عمل ہے - کاینات کی بنیاد عمل پر ہے اس لیے وہ انسانوں کو عامل اور مرد مجاہد دیکھنا چاہتا ہے -

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

شاعرانہ بلندی میں اس کا مقابلہ ہندوستان میں صرف ٹیگور کر سکتا ہے -

دونوں صوفی منش شعرا ہیں - مگر ایک منفی تصوف کا حامل ہے تو دوسرا اثباتی تصوف کا - ٹیگور خاموش اور پر سکون زندگی گزارنا چاہتا ہے؛ اقبال پر جوش و خطرناک -

ٹیگور تخیل کی دنیا میں انسانی مشکلات بھول جانا چاہتا ہے؛ اقبال مشکلات کو دعوت دیتا ہے اور پھر ان پر حاوی ہونا چاہتا ہے -

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

مپارا بزم بر ساحل کہ آں جا نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز حیات جاوداں اندر ستیز است

ٹیگور خدا کے سامنے سر نیاز خم کر دیتا ہے؛ اقبال خدا کے حضور میں بھی اپنی انسانی خودی کو فراموش نہیں کرتا - ٹیگور کی شاعری کی جان سب کچھ ہستی کی نفی میں ہے؛ اقبال کے ہاں اثبات ہستی کا تصور سب سے زیادہ نمایاں ہے - ٹیگور ویدانت کے ذہنی فلسفے کا علم بردار اور ہندو قومیت کا ترجمان ہے؛ اقبال اسلام کے عملی فلسفۂ زندگی کا حامل مسلم قوم کا شاعر ہے -

خدا جانے حقیقت اصلی کیا ہے؟ شورش یا سکون؟ زندگی یا موت؟

## ۱۹ - روحانی اشتراکیت

آخری عمر میں اقبال تحریک اشتراکیت سے کافی متاثر ہوا اور اس کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا - چوں کہ مارکس اور لینن کے مادی فلسفہ کو تسلیم نہ کرسکتا تھا اس لیے اس نے اس کی تحریک اشتراکیت کی مادی بنیادوں کو ٹھکرا دیا - لیکن اس کے معاشی پہلو سے اسے بڑی دل چسپی پیدا ہوگئی - ایک مستقل معاشی نظریہ اقبال نے پیش نہیں کیا اور نہ شاعر سے اس کی توقع کرنی چاہیے، البتہ غریب و مفلوک الحال کسانوں اور مزدوروں کی حمایت میں اس نے درد و سوز سے لبریز بہت اچھی نظمیں کہیں -

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ‌دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

روحانی بنیادوں پر اقبال ایک ایسا معاشی نظام استوار کرنا چاہتا ہے جس میں سرمایہ‌دار غریبوں پر ظلم نہ کرسکیں اور نہ ساہوکار غریب کسانوں کو لوٹ سکیں۔

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناساز گار
حکـــم حق ہے لیس للانسان الاّ ماسعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہوگئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا و قد کنتم بہ تستعجلون
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون

اشتراکیت کے ایک بنیادی اصول ملکیت زمین کے بارے میں اقبال کہتا ہے :-

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے میرا مال ہے زمیں

کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت

کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں

پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو

بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے

جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

سرمایہ‌دار کس طرح حکومت کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں اس کے متعلق اقبال کہتا ہے :-

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں

پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا

مگر سرکار نے کیا خوب کاؤنسل ہال بنوایا

کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

غرض‌کہ اقبال اپنی آخری عمر میں بالکل اشتراکی ہوگئے تھے ' مگر اُن کی اشتراکیت کی بنیادیں اسلامی تعلیمات پر تھیں اس لیے ہم اس کو روحانی اشتراکیت کہہ سکتے ہیں -

## ۲۰ - شاعر زندگی

اقبال عہد جدید کا سب سے بڑا شاعر تھا - وہ ایک حساس دل رکھتا تھا اس لیے وہ فطرت کے ہر مظہر اور انسانیت کی ہر تحریک سے متاثر ہوا - لیکن ان تاثرات پر اس نے اپنی عظیم الشان شخصیت کی مہر ثبت کر دی اور ان کو پھر دوبارہ نئے انداز' جوش ' قوت اور حسن کے ساتھ پیش کیا - وہ شاعر زندگی تھا اس لیے اس نے مسلمانان ہند کو ایک نئی زندگی بخشی - اس نے اپنے اعلی اخلاقی اور روحانی معیار سے تمدن جدید کے مظاہر پر خوب

خوب تلقیدیں کیں تا کہ غفلت کے یہ بندے پھر بیدار ہوں -

اقبال نے تمام عمر دولت و ثروت' عزت و جاہ سے بے پروا ہوکر قلندری و فقیری کی زندگی گزاری -

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

اسی فقیری نے اسے وہ روحانی دولت بخشی جس سے اس کی زندگی کا ہر لمحہ اور اس کے کلام کا ایک ایک شعر لبریز ہے - دنیا میں جب تک ملت اسلامیہ اور انسانیت زندہ ہے اس کے عظیم الشان احسان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا - وہ اپنے کلام کے ذریعے گوئٹے و دانتے' رومی و سعدی' شکسپیر اور غالب کی طرح زندۂ جاوید ہو گیا کیوں کہ اس نے ہمیشہ ازلی و ابدی گیت گائے - اس کے نغمے ہمیشہ انسان کے اعلیٰ احساسات کو ابھاریں گے کیوں کہ وہ فطرت انسانی کی پاک ترین بنیادوں سے بلند ہوئے تھے -

اقبال ایک مرد قلندر' خودی کا پاسبان' عشق کا متوالا' آزادی ہند کا شاعر' ناموس مشرق کا محافظ' انسانیت کا علم بردار' توحید کا نغمہ‌خواں تھا - خدا اس کی مغفرت کرے -

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

---

# "اقبال کا ذہنی ارتقا"

از

ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے (علیگ) لیکچرار انگریزی (سابق لیکچرار اردو) سٹی کالج حیدرآباد دکن

آج اقبال کی شاعری اور ان کے کمال کے چاروں طرف گُن گائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے حوصلے کے مطابق ان کی شاعری اور شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے جیتے جی بھی لوگوں نے اُن کے من موہنے اور دل میں جوش پیدا کرنے والے شعروں کو بہت کچھ سراہا اور جی کھول کر داد دی۔ مگر اب جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں، اُن کی ہر ایک ادا، اُن کی دل میں وہ کھبنے والی باتیں اور بھی یاد آتی ہیں۔ قدر نعمت بعد زوال!

یہ طرف‌داری یا بڑبڑائی نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اقبال جیسا شاعر اردو زبان نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال سے پہلے جتنے شاعر اردو زبان نے پیدا کیے اُن میں کوئی گُن نہ تھا۔ مثال کے طور پر انیس اور غالب کو لیجیے جو اقبال سے کچھ ہی پہلے کے شاعر ہیں۔ دونوں نے اردو کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔ یا اکبر اور حالی کو لیجیے جو عین اُس زمانے کے شاعر ہیں جب کہ اقبال نے پر تولنے شروع کیے تھے۔ اکبر کی شاعری کا ہنس‌مکھ رنگ اور ہنسی ہنسی میں دل میں نشتر چبھونا، یا حالی کا دیس اور قوم کا دکھڑا بیان کرنا، کون ہے جو نہیں جانتا؟ ان دونوں کے مقابلے میں داغ بھی تھے جو انکے پائے کے شاعر نہ تھے۔ کہنے کو

پرانی لکیر پر چلتے تھے مگر زبان ایسی بانکی پائی تھی کہ سنیے تو دل لوٹ پوٹ ہو جائے - پھر ذرا غور سے دیکھیے تو وھی روندا روندایا خیال ' مگر بیان کرنے کا ڈھب ایسا کہ بے واہ واہ کہے بن نہ پڑے - یہ شاعری نہیں تو اور کیا ھے کہ ایک آدمی کو آپ پرانی وضع اور دقیانوسی خیال کا آدمی سمجھیں ' لیکن جب وہ کچھ کہے تو آپ بے اختیار پھڑک اُٹھیں - نہیں ' داغ شاعر تھا -

میں نے یہ سب ذکر یوں ھی بے سبب نہیں کیا - ان تینوں چاروں شاعروں کا اثر شروع شروع میں اقبال پر پڑتا رھا - یہاں تک کہ اپنی نو مشقی اور تقلید کے دور سے گزر کر اقبال نے اپنے لیے ایک نیا راستہ نکال لیا اور ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں کوئی اس کا شریک نہیں - اس کے باوجود بھی اقبال نے سدا اپنے پیش‌رووں کی بڑائی کا اعتراف کیا ھے - یہی اس کی بڑائی کی دلیل ھے - اوچھے ھیں وہ جو اپنے محسنوں کے احسان کو بھول جاتے ھیں - یاد رھے کہ بڑا آدمی ناشکرا نہیں ھوتا - اقبال نے غالب ' داغ ' حالی اور فارسی زبان کے بڑے بڑے شعرا کی بڑائی کو مانا ھے اور عقیدت کے طور پر ان لوگوں پر نظمیں لکھی ھیں جن سے اس کی نیک نیتی صاف جھلکتی ھے - خصوصاً غالب ' داغ ' اور حالی پر جو نظمیں "بانگ درا" میں ھیں انھیں پڑھ کر اپنے طور پر اندازہ کر لیجیے کہ ایک بڑا آدمی اپنے بڑوں کی بڑائی ماننے سے کبھی نہیں جھینپتا - اور تو اور شیکسپیئر پر بھی ایک پیاری نظم ھے' حالانکہ شیکسپیئر ھماری زبان کا شاعر نہیں - اسی طرح بعض ھندو بزرگوں اور ھند ماتا کے سپوتوں پر بڑی بانکی اور منوھر نظمیں لکھی ھیں - سوامی رام تیرتھ ' بھرتری ھری' رام چندر جی' لکشمن جی اور گرو نانک پر جو اشعار لکھے ھیں ' اُن سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ وہ محض مسلمانوں ھی کا شاعر نہ تھا بلکہ سچے معنوں میں بھارت اور بھارت‌باشیوں سے ایسی سچی چاھت رکھتا

تھا جس میں کہیں بھی پھوٹ اور نفرت کی بو نہیں - جن لوگوں نے اقبال کو فرقہ پرست سمجھا ہے' انصاف اور نہائے کا خون کیا ہے -

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی - مگر خیر میں نے بکواس سے کام نہیں لیا' یہ پہلو بھی اجاگر کر دینا ضروری تھا - اس لیے کہ جو باتیں کسی شاعر کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد دیں' وہ بھی ضروری ہوتی ہیں -

بہر حال اکبر اور حالی اور خاص طور پر داغ اور حالی کی شاعری کا ہندوستان کے چاروں کھونٹ غلغلہ تھا جب کہ اقبال نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا احساس کیا اور چپکے چپکے شعر کہنا شروع کیا' ابھی اپنی جنم‌بھومی سے باہر قدم نہ رکھا تھا - اردو کے تمام ہونہار شاعروں کی طرح پہلے پہل غزل گوئی ہی سے شاعری کی ابتدا کی - داغ کی شاعری اور زبان‌دانی کی چاروں طرف دھوم تھی' وہی عاشقانہ رنگ اختیار کیا - لوگ دهلی اور لکھنؤ کی زبان سے مرعوب تھے - پنجاب اور سیالکوٹ کی زبان‌دانی تو خیر کسی شمار قطار میں نہ تھی' ہندوستان کے دوسرے علاقے جہاں اردو کا چرچا تھا' دهلی اور لکھنؤ سے سند لیتے تھے - ایسی صورت میں اقبال کسی اهل زبان کا دامن نہ تھامتے تو کیا کرتے - لا محالہ استاد داغ کا دامن تھاما اور ان سے اصلاح لینے لگے - کچھ دنوں تک خط کتابت کے ذریعے یہ سلسلہ جاری رہا - آخر کو داغ نے سیر چشمی سے کام لے کر ہمت بندھائی اور لکھا کہ تمھیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں' تم جوہر قابل رکھتے ہو اپنی طبیعت کے بہاؤ پر چلو' خود ہی اپنا راستہ نکال لوگے -

اسی زمانے یا اس سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کیسے جوہر شناس تھے - سیالکوٹ سے ایف - اے پاس کرکے اقبال لاہور آئے تھے' بی - اے میں پڑھ رہے تھے' شعر گوئی کا سودا زوروں پر تھا'

غزلیں کہتے تھے اور بعض اوقات خوب مضمون نکالتے تھے - ایک مرتبہ کا ذکر سنیے : لاہور میں ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں اس زمانے کے خاص خاص شاعر جمع تھے - اقبال کے بعض بے تکلف دوست اُنھیں جبراً یہاں لے آئے اور غزل پڑھنے پر مجبور کیا - مرزا ارشد گورگانی میر مشاعرہ تھے - جب اقبال نے اپنی غزل کا ایک شعر پڑھا تو بےاختیار پھڑک اُٹھے - شعر تھا :—

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اسی غزل کا مقطع بھی ہے جو ہمارے لیے خاص دل چسپی رکھتا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہونے والا ایک بڑا شاعر کس قدر اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہے ' حالانکہ بڑائی کی منزل ابھی دور ہے :—

ہم کو تو لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہے غرض اقبال ہم اسیر ہیں زلف کمال کے

کتنے پیمبرانہ الفاظ تھے جو ایک فیضانی کیفیت میں اقبال کی زبان سے نکلے - اُس وقت کے سننے والوں نے اسے محض شاعرانہ بڑ اور تعلی سمجھا ہوگا' لیکن ہونے والے اقبال نے جس کی شہرت ہندستان سے باہر دور دور پہنچنے والی تھی ' بعد کو یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کا طلسم یوں توڑا جاتا ہے - خادم زبان اور ادیب ہونے کے لیے جوہر قابل کی ضرورت ہے ' دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اُلانگنا ضروری نہیں -

لیکن زبان کے اُلجھیڑوں سے آزاد ہونے سے پہلے اور بعد بھی اقبال ایک زمانے تک غالب کے زیر اثر رہے - گو کہنے کو انھیں داغ سے تلمذ تھا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاگرد تھے - اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے - اقبال غالب کے اِتنے گرویدہ کیوں تھے ؟

اس کے کئی ایک سبب ھیں - غالب کی طرح اقبال بھی جدت اور انوکھے پن کے حامی تھے - غالب ھی کی طرح فلسفیانہ طبیعت پائی تھی - فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعہ نے ان کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا کر دی تھی - انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم کی واقفیت نے مختلف اسالیب پر عبور حاصل کرنے میں ان کی مدد کی تھی - جرمن کی واقفیت کے باعث جرمن ادب کے شاھکاروں پر براہ راست انھیں عبور حاصل تھا - سنسکرت زبان بھی جانتے تھے اور اس طرح سنسکرت لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا تھا - فارسی کا پوچھنا کیا - "بہاوید گر ایں جا بود زباندانی" کا دعویٰ نہیں کیا' لیکن وہ کر دکھایا کہ ایک مغرور ایرانی بھی ان کا نام ادب سے لیتا ھے - غرض کہ اقبال ایک بڑے شاعر ھونے کے علاوہ ایک بڑے عالم بھی تھے - اس کے بعد ظاھر ھے کہ شاعری ان کی کنیز بن کر رھی - یہ جامعیت اردو کے شعرا میں تو کیا' دنیا کے اور باکمالوں میں بھی کم ملے گی - یہی وجہ ھے کہ میں اقبال کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ سمجھتا ھوں - غالب کی شاعری میں جو کمی تھی' اقبال نے اس کو پورا کیا -

البتہ ایک حیثیت سے اقبال کا رتبہ 'غالب' سے گھٹتا ھوا ھے - میں نے ایک جگہ بیان کیا ھے کہ "اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا - اِسی میں اُس کی عظمت کا راز پوشیدہ ھے" - فلسفے کو شعر بنانا واقعی کمال ھے - غالب نے بڑی حد تک یہی کیا ھے - وہ صد فی صد شاعر تھا اور ھر رنگ میں شاعر رھتا ھے' کبھی خشک فلسفی نظر نہیں آتا - لیکن اقبال بعض اوقات فلسفہ بگھارنے لگتے ھیں - یہیں ان کی شاعری واعظانہ روپ اختیار کر لیتی ھے - چنانچہ ان کے آخری دور کی شاعری کا رنگ بالکل واعظانہ اور مذھبی ھے - "بال جبریل"' "ضرب کلیم" اور "پس چہ باید کرد....." اسی

تکمیل کی کتابیں ہیں جن میں بے رس فلسفے اور مذہب کا پرچار کیا گیا ہے -
یہی وجہ ہے کہ اقبال کے مخالفین کو اعتراض اور بدگمانی کا موقع ملا -
غالب اس کے برخلاف ایک بے لاگ فلسفی' ایک آزاد مشرب انسان اور ایک
بلند نظر شاعر نظر آتا ہے -

بہر حال اقبال اور غالب کے موازنے کا یہ موقع نہیں - اتنی بات نظر
کے سامنے رہے کہ ابتدا میں ایک زمانے تک اقبال غالب کے زیرِاثر رہے اور
نومشقی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی جب کہ غالب کی عقیدت مندانہ تقلید
چھوڑ کر انہوں نے اپنے لیے ایک نیا راستہ نکال لیا تھا' یہ صاف ظاہر ہے کہ
اقبال نے غالب کے دیے سے دیا جلایا اور جس منزل پر غالب نے چند ناتمام
نقوش چھوڑے تھے' اقبال نے وہاں سے ابتدا کی اور چند اضافوں کے ساتھ اسے
بامِ تکمیل پر پہنچایا - ہندوستان میں اس وقت کوئی شاعر ایسا نہیں جو ان
کی جگہ لے سکے -

انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "شاعر اپنے عہد کا بچہ ہوتا ہے"-
عہدِ ماضی کا جو اثر اقبال پر ہوا' وہ تو ابھی میں بتا چکا' اس انگریزی مقولے
کی روشنی میں اب یہ بتانا ہے کہ "اپنے عہد" کا اقبال پر کیا اثر ہوا - اس
مضمون کا بقیہ حصہ اسی رخ کی تصویر ہے -

جس زمانے میں پورے طور پر اقبال نے اپنی شعری استعداد کا احساس
کیا' ہندوستان کی سیاسی فضا قومیت اور آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج
رہی تھی - تلک اور گوکھلے "ہوم رول" کا مطالبہ کر رہے تھے - مہاتما گاندھی اور
برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا' پھر بھی خاصے جوش و
خروش کا زمانہ تھا - دھنواں دھار تقریریں سیاسی پلیٹ فارم پر ہوا کرتی تھیں-
انڈین نیشنل کانگرس نے بھی قومیت کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا - سر سید

کی پُرخلوص کوششیں بارآور ہو چکی تھیں - حالی کی نوحہ خوانی کچھ رنگ لا رہی تھی - "اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے" کی تان سے مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا احساس ہو چلا تھا - گو "قلب کو گرمانے" اور "روح کو تڑپانے" والی آواز ابھی فضا میں پیدا نہ ہوئی تھی اور دعاؤں نے "شکوہ" کا رنگ اختیار نہ کیا تھا، تاہم بھارت کا یہ تھکا ہارا قافلہ چونک رہا تھا - غرض کہ یہ کچھ سماجی اور سیاسی حالات تھے - یہ تذبذب اور انتشار کا زمانہ تھا جب کہ اقبال نے چند نظمیں مثلاً ہندی ترانہ، نیا شوالہ، ہمالہ، میرا وطن وہی ہے اور تصویر درد جیسی نظمیں لکھیں اور تمام ہندوستان اس نئے شاعر کی والہانہ تانوں سے ونج اٹھا -

ان نظموں کے علاوہ جو ملک کی سیاسی حالت کی ترجمانی کرتی ہیں، اس دور کی چند اور نظمیں بھی ہیں جو اقبال کی اُفتادہ طبیعت، ذہنی بے چینی، تجسس اور تلاش کا پتہ دیتی ہیں - صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ابھی اپنی زندگی کا مقصد پایا نہیں، خودی کا احساس ابھی تیز نہیں ہوا اور وہ اسرار اُس پر منکشف نہیں ہوئے جن سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے - وہ وطنیت اور دیس کی چاہت کے سہانے گیت گا کر دلوں کو گرماتا ضرور ہے لیکن خود اس کے دل میں تذبذب اور شکوک کا ایک طوفان برپا ہے - اُس کا دل سراپا تجسس اور استفسار بنا ہوا ہے - زندگی اور حقایق زندگی کا وہ بھید پانا چاہتا ہے - چاروں طرف اس کی نگاہیں پڑتی ہیں مگر کسی طرف سے اس کی دل جمعی نہیں ہوتی - کبھی گُل کی رنگینی کو دیکھ کر وہ حسن کی کشش کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے، کبھی شمع و پروانے کی دل سوز حکایت میں وہ حسن و عشق کی حقیقت پانے کی دھن میں رہتا ہے - کبھی فراز آسمان پر مہر و ماہ کی جانب اُس کی نظریں دوڑتی ہیں، لیکن کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں پاتا، گو بظاہر

تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے دل کو سمجھانے کے حیلے بہانے تراش لیتا ہے - گل رنگیں، شمع و پروانہ، بچہ اور شمع، آفتاب، ماہ نو، جگنو، چاند، ستارے، کنار راوی، موج دریا، یہ تمام نظمیں غور سے پڑھیے، آپ کو اقبال کی اس تلاش اور بے چینی کا اندازہ ہوجائے گا - یہ سب جستجو محض اس لیے تھی کہ اقبال اپنے لیے ایک بڑا نصب العین اور مقصد حیات متعین کرنا چاہتے تھے - ایک نئے راستے کی لگن ان کے دل میں تھی - وہ مفسر حیات بننا اور زندگی اور موت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں - لیکن ابھی اُنھیں اپنے پر کامل بھروسہ نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی پورے طور پر اُنھوں نے خود کو پہچانا ہے - ابھی ابھی جن نظموں کے عنوانوں کا حوالہ میں نے دیا ہے، اُن کے کچھ اشعار سنیے، آپ کو بہتر اندازہ ہوگا کہ میں کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں :—

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن

آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس

ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

(بچہ اور شمع)

— —

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں

اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

اِس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو

اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر شوق جستجو رہتا ہوں میں

(گل رنگیں)

---

سر کنارۂ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے' لیکن کھڑا ہوا ہوں میں
رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موجوں سے ملاح جس کی گرم ستیز
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(کنار راوی)

---

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا' عدم آباد' وطن ہے میرا
صبح کا دامن صد چاک'' وطن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت' نہ یہ عزت' نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

(ستارۂ صبح)

---

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا

وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

نظارۂ شفق کی خوبی زوال پر تھی

چمکا کے اِس پری کو تھوڑی سی روشنی دی

یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا

واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی

جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے

ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیء ازل ہے ؟

(جگنو)

پھر بھی اے ماہ مُبیں، میں اور ہوں تو اور ہے

درد جس پہلو میں اٹھتا ہے، وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو

سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو

(چاند)

---

زحمت تنگیء دریا سے گریزاں ہوں میں

وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(موج دریا)

---

نور کا طالب ہوں' گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں

(ماہ نو)

یہ ناصبوری' یہ تڑپ' یہ ذوق آگہی' یہ نور کی طلب اور یہ وسعت کی خواہش' سب کیا ہے؟ وہی ایک اعلیٰ نصب العین کی تلاش جس کی صلاحیت شاعر خود میں ابھی نہیں پاتا - غرض کہ کچھ اس قسم کی کھٹک اور خلش دل میں لے کر اقبال یورپ کا عزم کرتے ہیں اور دیس کو خیرباد کہنے سے پہلے حضرت نظام الدین محبوب الہی کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں - وہاں پہنچ کر یہ بلند جذبات پھوٹ پڑتے ہیں - چنانچہ اپنی منظوم التجا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اس خیال سے یورپ جا رہے ہیں کہ شاید وہاں کی گُلون بستی میں اُنہیں اپنے ذوق استفہام کا جواب اور دل کی اس بےتابی کی دوا ملے:-

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو
فلک‌نشین صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہمسفروں سے ہوا اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

یہ طلب اور یہ ارادے لے کر سنہ ۱۹۰۵ ع میں اقبال ہندستان سے رخصت ہوئے اور اِن تاثرات پر اس دور کی شاعری کی تان ٹوٹتی ہے - بعد میں اقبال کی شاعری نے جو پلٹا کھایا اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی -

البتہ ایک چیز خاص طور پر نظر کے سامنے رکھنی چاہیے جو اس دور کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اور آنے والے دور کی شاعری میں اور بھی شدت کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر میں وہ ایک پیمبرانہ روپ اختیار کر لیتی ہے - اس خاص چیز سے میری مراد اقبال کا گہرا مذہبی رنگ ہے - مذہب اُن کی گھٹی میں تھا اور جس صوبے کی آب و گِل سے اقبال کی سرشت کا ضمیر بنا تھا، مذہبی اعتبار سے پورا صوبہ اور علاقوں کے مقابلے میں شدت کے ساتھ مذہبی عصبیّت رکھتا ہے - یہی وجہ ہوئی کہ موجودہ حالات میں اقبال کا لہجہ بہتوں کے لیے غلط فہمی کا باعث ہوا اور بعض قوم پرستوں نے یہ سمجھا کہ ع "محفل کا وہ رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا" - اصل حقیقت سچ پوچھیے تو یوں نہیں ہے - یہ اُن کا نہیں بلکہ سمجھنے والوں کی سمجھ کا قصور ہے -

اپنے تین سالہ قیام (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸) کے زمانے میں جب کہ اقبال یہ کچھ

توقعات لے کر شراب علم کے حصول میں نگارخانۂ وطن سے یورپ کی سر زمین پر پہنچے اور وہاں کے حالات اور رنگ ڈھنگ کا غور سے مطالعہ کیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی - قومیت ' جس کا پودا ہندوستان میں لگایا جا رہا تھا ' یورپ میں خاصی بدنام اور خودغرضی کی مترادف ہو چکی تھی - جغرافی حدبندیوں نے نسل و رنگ کے امتیازات پیدا کر کے انسانوں کو تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا - مادیت اور مادہ پرستی نے انسان کو انسانی ہمدردی اور روحانی و اخلاقی مسائل سے بیزار اور بےبہرہ کر دیا تھا - وہ سمجھنے لگا تھا کہ جو کچھ ہو اور جو کچھ کہا جائے ' سب اپنی ہی بھلائی اور ذاتی نفع کے لیے ہو - جمہوری نظام کی باگیں خطرناک قسم کے بنیوں اور خوں‌خواروں کے ہاتھ آگئی تھیں اور سرمایہ‌دار بڑی بےدردی کے ساتھ غریبوں کا خون چوس رہے تھے - اپنے حصول مقصد کے لیے قومیں قوموں کے خلاف ' جماعتیں جماعتوں کے خلاف اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف آستینیں چڑھا کر موقع کا منتظر تھا - جنگ عظیم کے ڈراؤنے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے - یہ ننانئی کچھ رنگ لانے والی تھی -

ان حالات میں اقبال نے دیکھا کہ یہ قومیت اور وطنیت کا بھوت ' انسانوں کو درندوں سے بدتر بنا کر رہے گا - غرض‌کہ قومیت ' برابری اور تہذیب و شایستگی کے سہانے گیت گانے والی یہ قومیں ' ایک طرف تو اپنوں ہی کے حلق پر خنجر چلانے پر تلی بیٹھی تھیں اور دوسری طرف یہ منصوبے ہو رہے تھے کہ جس طرح بن پڑے اپنے حصول مقصد کی خاطر مشرقی اقوام کو آہستہ آہستہ ہڑپ کرلیا جائے اور بسم‌اللہ ترکی اور ایران سے کی جائے - اسی مقصد کے مدنظر ترکی کے خلاف بلقان اور اٹلی کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں برطانوی سیاست کا بھی در پردہ ہاتھ تھا - "مریض یورپ" کا ادھر یہ

حال تھا ' اُدھر برطانیہ اور روس کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے ایران کی جان کے لالے پڑے تھے - ان واقعات اور احساسات کی تھوڑی سی جھلک آپ کو اقبال کی اُس نظم میں بھی دکھائی دے گی جس کا عنوان ہے "ہلال عید"- چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں :—

قافلے دیکھ اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ' ان کی گرفتاری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ' آبرو والوں کی' تو
اور جو بے آبرو تھے' اُن کی خودداری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

غرض کہ ان اسباب کی بنا پر اسلامی ممالک کی فلاح اور یک جہتی کی خاطر وہ تحریک شروع ہوئی جس کو ہمہ اسلامی تحریک یا "پان اسلامزم" کہتے ہیں - اپنے قیام یورپ کے زمانے میں اقبال اس تحریک کی حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے اور اپنی آنکھوں سے یورپ کی ہوس کاری اور بدنیتی کا منظر دیکھ کر انہوں نے "ہمہ اسلامیت" کو اپنی شاعرانہ سحرکاریوں کا موضوع بنانے کی دل میں ٹھان لی اور مشرقی اقوام کے سامنے قومیت اور عالمگیر برادری کا اعلیٰ تصور پیش کیا - پھر اپنی شاعری کے لیے وسیع تر میدان پیدا کرنے کی نیت سے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا -

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی رواداری' اسلام کا شاندار ماضی' اور

اقوام عالم پر اس کے عظیم احسانات ' یہ سب ایسی کھلی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا - لہذا اقبال نے اسلامی ممالک کو ان کے شاندار ماضی سے روشناس کرا کے ' اگر ان کے سینوں میں عمل اور بیداری کی لہر دوڑا دی تو برا کیا کیا ؟ پھر یہ کہ گو "لے" حجازی تھی ' مگر کاہل رگوں میں خون حرارت دوڑانے میں یہ نوا سب کے لیے برابر تھی - اس میں ہندی اور ترکی ' عجمی اور تازی ' یا ہندو اور مسلمان کی کچھ تخصیص نہ تھی - لیکن سوئوں کے کھوٹ نے اس درد اور خلوص بھری آواز کے معنی ہی کچھ اور لیے اور جس طرح ایک غلط فہمی یہ پھیلی کہ اقبال اردو سے بیزار ہو گئے اسی طرح بعض حلقوں میں یہ بد ظنی بھی عام تھی کہ اقبال قوم‌پرست سے مُسلم‌پرست اور ہوتے ہوتے کٹر فرقہ‌پرست ہو گئے ' حالانکہ اقبال کا پیام عمل اور بیداری کا سندیس سب کے لیے ہے - جس طرح زبان (اردو سے فارسی) بدل گئی تھی مگر دل وہی تھا ' اسی طرح قومیت کا ڈھانچہ بدل سا گیا تھا مگر روح وہی تھی - بھلا جو شاعر قومیت اور رنگ ' نسل اور ذات پات اور برتری اور کم‌تری کے جھگڑے مٹانے آیا تھا ' کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تنگ‌نظر اور فرقہ‌پرست ہو ؟ اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں بڑی غلطفہمی ہوئی اور کوئی اللہ کا بندہ بر وقت ایسا نہ کھڑا ہوا کہ اس بد ظنی اور غلط فہمی کو اقبال کے جیتے جی دور کرتا - اس چیز نے اقبال کی مقبولیت اور شہرت کو بڑا صدمہ پہنچایا اور اسے وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا -

بہر حال یہ اسباب ہوئے کہ اقبال نے " قومیت " کو چھوڑ کر "ملیت" کا راگ گایا اور مغرب کی عقیدت‌مندی کو تج کر ' اس کے خلاف جہاد شروع کیا اور چن چن کر اس کے عیب گنوائے - چنانچہ تمام یورپ کی چند نظموں کو چھوڑ کر (جن میں شکوک ' تجسس اور تلاش کا رنگ گہرا ہو گیا

ہے) بعد کے دور کا تمام کلام یورپ کے خلاف احتجاج اور قومیت اور جمہوریت سے بیزاری کا منظر پیش کرتا ہے - یہی ان کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع ہے -

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا - ایران کی مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں اور لٹریچر کو غور کی نظر سے دیکھا تھا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تہذیب کی ابتری اور تباہی کی ذمہ دار فارسی شاعری ہوی تھی جس نے افلاطونی فلسفے کی موشگافیوں میں پھنس کر، حیات کے سرچشموں کو خشک کر دیا - سکون اور بےعملی کو مقصد حیات تصور کیا جانے لگا - افراد میں خودی اور خودداری کی بو نہ رہی اور ذلت و نکبت موجب فخر سمجھی جانے لگی - یہ روگ آہستہ آہستہ پوری قوم اور ملت کی رگ و پے میں سرایت کرتا گیا - اردو ادب کچھ اس سے مستثنی نہ تھا - ایک تو براہ راست فارسی شاعری کے اثر سے اور پھر (سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد) اُس دیس کے عام اثرات کی وجہ سے جو صدیوں غلامی میں بسر کر چکا تھا اور اہمسا اور تیاگ جس کی رگوں میں بسا ہوا تھا، اس مجہولیت نے ہندوستان میں بھیانک روپ اختیار کرلیا - اس مجہولیت کے خلاف جہاد کرنا اور ہندیوں کی رگوں میں خون حیات اور عمل کی برقی لہر دوڑانا، اقبال کے نزدیک ازبس ضروری تھا - اس مقصد کے حصول کی خاطر اُنھوں نے اپنا منظوم دستورالعمل مرتب کیا جو اسرار خودی اور رموز بےخودی کے نام سے مشہور ہے - اسرار و رموز کا فلسفہ علاوہ اسلامی ممالک کے، ہندوستان کے لیے ایک خصوصی اپیل رکھتا ہے -

اسرار خودی اور رموز بےخودی کے اوراق کی ترتیب سے پہلے، اقبال نے کئی ایک پر جوش نظمیں لکھیں جن سے ان کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات

کا پتہ لگتا ہے - ان نظموں میں بعض اس زمانے کی ہیں جب کہ جنگ بلقان کے شعلوں کا دھنوئں ہندوستان تک پہنچ چکا تھا - چنانچہ شکوہ، فاطمہ اور جواب شکوہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو مسلمانوں کے اُمڈتے ہوئے جذبات اور اُس ذہنی ہیجان کی ترجمانی کرتی ہیں جو ترکی کی بقا اور فنا کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھے - شکوہ اور جواب شکوہ میں نام‌نہاد قومیت پر کچھ چوٹیں بھی ہیں اور اس کے برخلاف اُس عالم‌گیر اخوت اور سلسار برادری کی طرف اشارے بھی ہیں جو نسل، رنگ، اور دوسرے بکھیڑوں سے پاک ہو -

اسی زمانے (سنہ ۱۹۱۲ع) میں شمع و شاعر لکھی گئی جو اس دور کی نظموں میں سب سے اچھی نظم ہے اور جس کو بانگ درا کا دل کہنا بجا ہے - اقبال کا سارا فلسفۂ خودی یہاں سمٹ کر دل بن گیا ہے - فلسفے اور شعر کا یہ خوش‌گوار امتزاج یا تو یہاں ہے یا پھر بال جبریل کے ساقی نامے میں جس کا ذکر بعد میں آئے گا -

ان طویل نظموں کے علاوہ چند چھوٹی بڑی نظمیں اور بھی ہیں جن میں حیات اور فلسفۂ حیات کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے - وہ مسائل جو پہلے اور دوسرے دور کی نظموں میں شاعر کی نگاہوں میں چیستاں معلوم ہوتے تھے اور اُس کی ذہنی بےچینی کا باعث بنے تھے، اُن کا عقدہ اب کُھلتا جا رہا ہے - فراز آسماں پر پہلے کی طرح اُس کی نظریں پڑتی ہیں تو وہی چاند اور ستارے سے جو اُس کی حیرت اور پریشانیوں میں اضافہ کرتے تھے، اپنے سربستہ رازوں کو اب آہستہ آہستہ فاش کر رہے ہیں - قدرت کی ہر شے اسرار کے خزانے اُگل رہی ہے - شاعر کے نالے اسمانوں کے اُس پار پہنچ رہے ہیں اور خود شان کبریائی جب ازل و ابد کے بھید اُس کے سامنے آئینہ کر رہی ہو تو بھلا ان چھوڑوں

کی کیا ھستی ھے؟ بہر حال پہلے دور کی کم و بیش اِنھیں عنوان کی نظموں سے ان نظموں کا مقابلہ کیجیے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا - وھی چاند ھے، وھی شمع، وھی پروانہ، وھی موج دریا، وھی کنار جو، لیکن جو چیزیں پہلے گُم صم نظر آتی تھیں، اب ایک مرد خودآگاہ کے سامنے حقائق اور حقائق زندگی کے اسرار اُگل رھی ھیں - اِن کو غور سے اپنے طور پر پڑھیے - طوالت کے خوف سے میں اِن نظموں کو نظر انداز کر رھا ھوں -

غرض کہ اِدھر یہ سب نظمیں تیزی کے ساتھ لکھی جا رھی تھیں جن میں شاعر کے بدلتے ھوئے رجحانات صاف جھلکتے ھیں اور اُدھر فارسی زبان میں اسرار و رموز کے تانے بانے بھی درست ھو رھے تھے - پہلی مثنوی جنگ عظیم کے دھماکے کے ایک سال بعد (۱۹۱۵ء) اور دوسری اس دھماکے کے خاتمے سے ایک سال پہلے (۱۹۱۸ء) شایع ھوئی -

دونوں مثنویوں کا خاکہ، مولانا روم کی لازوال مثنوی پر تیار کیا گیا ھے - وھی زبان، وھی بحر، وھی اُسلوب، حتی کہ باریک مسائل اور حقائق مجردہ کو سلجھانے اور عام فہم بنانے کے لیے حکایت اور "ایلیگوری" (تمثالیہ) میں بیان کرنے کا ڈھنگ بھی رومی ھی کا ھے - پہلی مثنوی کے تمہیدی حصے میں صاف طور پر اقبال نے پیر رومی سے اپنی بےاندازہ عقیدت کا اظہار کیا ھے - یہ چیز ھمیں اور اچنبھے میں ڈالتی ھے، خصوصاً جب‌کہ ھم جانتے ھیں کہ بعض چوٹی کے مغربی حکما (کانٹ، ھیگل، برگساں وغیرہ) سے اُس نے کچھ نہ کچھ فیض حاصل کیا ضرور ھے - پھر بھی، رومی کے مقابلے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا - اور تو اور، نطشے کو بھی جس کے فلسفۂ حیات نے ایک حد تک اقبال پر اثر ڈالا تھا، وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ھے کہ "اُس کا دل تو مومن کا ھے مگر دماغ کافر کا" - (ع قلب او مومن دماغش کافر است) -

اقبال نطشے سے اتنا بیزار کیوں ہے؟ اس کے دو سبب ہیں - (۱) یہ کہ نطشے میں خاص طور پر اور حکمائے مغرب میں بیشتر' روحانیت کا فقدان ہے اور اقبال شدت سے روحانیت کا قایل ہے - اس کے نزدیک روحانیت کی کمی ہی فساد کی جڑ اور ساری انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کی ذمہ‌دار ہے - (۲) پھر یہ کہ اقبال خود فلسفی تھا - نقال تو تھا نہیں کہ بے سوچے سمجھے نطشے کے فلسفے کی نقل کی اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا - میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا یہ صاف انکار اور برہمی اس بنا پر ہے کہ سمندر پار کے لمبے پنڈتوں اور خود ہمارے دیس کے بعض مغرب‌زدہ احباب نے جوش ہمہ‌دانی میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نطشے کی نقل ہے - یہ سراسر زیادتی تھی' اس لیے کہ گو بظاہر اس کا فلسفہ نطشے کے فلسفے سے مماثلت کے کچھ پہلو پیش کرتا ہے' لیکن محض اس بنا پر اس کو نطشے کی نقل نہیں کہا جا سکتا - اس کے (اقبال کے) فلسفے میں چند عناصر ایسے ہیں جو اس کے اپنے اور اس کی لگاتار کوشش اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں - "کہیں سے کچھ قرض لینا اور سود بٹے کے ساتھ اصل میں اضافہ کرنا' سرقہ ہرگز نہیں!" یہ مقولہ ہے ملٹن کا جس پر بے‌دردوں نے کچھ اسی قسم کا بہتان باندھا تھا -

غرض‌کہ ہیر پھیر میں بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے - ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں جن سے نہ صرف میرے خیال کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں اقبال نے نطشے سے کچھ لیا بھی ہے تو اُسے کیا سے کیا کر دیا - "کیا اقبال نطشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے - وہ (اقبال) ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے - مثال کے طور پر اسرار خودی

کی حکایت " الماس و زغال " کو لیجیے جو نطشے کی تصنیف ( ارشادات زردشت ) کی ایک حکایت ( " پتھر اور کوئلہ " ) سے ماخوذ ہے - مگر چوں کہ اقبال نطشے سے بزرگ‌تر شاعر ہے ' اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا کہ الماس اس کا اپنا بن گیا..........نطشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے - اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت سے سر فراز کیا ہے - اس کی حیات‌افروز مثنویوں کا جو حیرت‌انگیز اثر ہوا ہے ' وہ شان‌دار مستقبل کا پتہ دیتا ہے.........."

تاہم یہ مثنویاں جا بجا نومشقی کا پتہ دیتی ہیں ' خصوصاً رموز بےخودی جس میں بےرس فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے اور شعریت کم - اپنے شاعرانہ کمال کے بہتر نمونے اقبال نے بعد میں پیش کیے جن کے آگے یہ مثنویاں پھیکی ہیں - البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحۂ عمل ہونے کی حیثیت سے ان مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے -

رموز بےخودی کی اشاعت کے ایک سال پہلے ( جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا ہے ) جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا - لیکن اُس کے اثرات سب پر پڑے - جو جیتے ان کی بھی برائے نام جیت رہی اور جو ہارے ان کا تو وارا نیارا ہی ہو گیا - جو بے تعلق رہے ' وہ بھی کچھ نفع میں نہ رہے - ورسائی میں جرمن قوم کی ابدی غلامی کا سرخط تیار ہوا - ترکوں کے آگے کوئی مستقبل نہ رہا - قسطنطنیہ پر " اتحادیوں " کی چھاؤنی تھی - سلطان وحیدالدین خاں کی نام نہاد خلافت صرف جمعہ کے خطبوں کی حد تک رہ گئی تھی - روس کے نظام زار کی بساط اُلٹ چکی تھی - مشرق قریب میں شام و عرب کی خوش آشام سر زمین دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی تھی اور برطانیہ اور فرانس کے تدبر نے اپنی عیاریوں سے عربوں اور شامیوں کی کمک سے ترکوں

کو اِن ممالک سے بے دخل کرنے کے بعد، تراج اور نفسی نفسی کا سوراج قائم کیا تھا ۔

غرض کہ اسلامی ممالک کا بظاہر کوئی مستقبل نہ تھا ۔ مغرب کی سیاست نے مشرق کو ایسی زک دی تھی کہ صدیوں تک اس کا ابھرنا دوبھر نظر آتا تھا ۔ اور 'ہمہ اسلامی تحریک' اور مشرق کی بیداری کا خواب محض سراب معلوم ہونے لگا ۔

اس زبردست جھٹکے نے اور اقوام عالم کو بھی ایک طرح سے پریشان کر رکھا تھا ۔ تجارت اور بیوپار کی وہ گرم بازاری نہ رہی ۔ عالمی کساد بازاری، بے روزگاری، افلاس اور فاقہ مستی کے مسائل نے دنیا کے مفکرین اور معاشیات کے ماہرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کیا ۔ یہی مسائل ہندوستان کے سامنے بھی تھے ۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۱۹۲۱ ع میں بڑی گرمائرمی کے ساتھ ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی جس کی باگیں مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں آئیں ۔ تھوڑی دیر کے لیے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے اور ترک موالات اور خلافت کی تحریک ایک ساتھ چلنے لگی ۔ علی برادران اور گاندھی جی کا سنجوگ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں خوب رنگ لایا، لیکن اکبر جیسے اہل نظر پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ یہ دوستی دیر تک نبھنے والی نہیں ۔ چنانچہ بعد میں جو واقعات درپیش ہوئے، ان سے اکبر کی دور نگاہی زبان‌زد خاص و عام ہوگئی ۔ ہر عارف و عامی کی زبان پر یہ شعر تھا :—

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گرد راہ ہیں، مگر آندھی کے ساتھ ہیں

( اکبر )

اس آندھی پانی میں اقبال بیٹھے کیا کرتے تھے؟ بہتیروں کا خیال تھا کہ اقبال کی ''حجازی لے'' سرد ہوگئی - لیکن اس موقع پر بھی وہ چوکے نہ تھے - بھلا وہ کب چوکنے والے تھے؟ الگ تھلگ بیٹھے' ایک نہ ایک پتے کی بات کہہ دیتے تھے - چنانچہ جب خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے مسلمانان ہند کی جانب سے ترکوں اور خلیفۂ عثمانی کو آزاد کرنے کی اپیل کرے' تو اقبال نے اس کوشش کی بیہودگی پر زہرخند اُگلا - چند اشعار کی ایک مختصر سی نظم تھی' لیکن بڑی دور نگاہی کا پتہ دیتی تھی - عنوان تھا ''دریوزۂ خلافت'':—

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے' جائے تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی؟
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشائی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن ابھی تک کوئی طویل نظم ایسی نہیں پیش کی گئی تھی جس سے جنگ عظیم کے ان پریشان‌کُن مسایل پر کافی روشنی پڑتی اور یہ معلوم ہو سکتا کہ ان حالات میں اقبال کے پیش نظر کس قسم کے منصوبے ہیں - آخرکار ۱۹۲۱ ع کے یا ۱۹۲۲ع کے شروع میں وہ نظم شایع ہوئی جو حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے - ایک خضر طریقت کی طرح اپنی اس نظم (خضر راہ) میں اقبال نے اُن تمام واقعات کا جائزہ لیا ہے جو اقوام عالم اور خصوصاً ایشیا والوں کی پریشانی کا باعث تھے - نظم کی ابتدا ایک گہرے اور پرسکون منظر سے ہوتی ہے - رات کا سناٹا ہے اور دریا کا کنارہ - زندگی کی چہل پہل

چُپ چاپ ہے - دریا کی موجیں ایک ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر پانی کی گہرائیوں میں سو گئی ہیں - جب کہ چاروں اُور (طرف) ہیں سکوت کا سنسار چھایا ہے' تاروں کی چھاؤں میں خضر سے شاعر کی مڈبھیڑ ہوتی ہے - شاعر اُس سے (خضر سے) کچھ سوالات کرتا ہے - یہ وہی مسایل ہیں جو اوروں کی طرح اُسے بھی پریشان کر رہے ہیں - خضر اِن سب کا امیدافزا جواب دیتا ہے - ان جوابات کی اوٹ میں اقبال کا سارا رجائی فلسفہ تاک جھانک مچائے ہے :

ساحل دریا پہ میں' اک رات تھا محو نظر
گوشۂ دل میں چھپائے' اک جہان اضطراب

شب ِسکوت افزا' ہوا آسودہ' دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے' یا تصویر آب؟

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں‌پیما' خضر
جس‌کی پیری میں ہے مانند سحر' رنگ شباب!

کہہ رہا ہے مجھ سے: "اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم' بے حجاب"

خضر کا اتنا اشارہ شاعر کے لیے ایک "سوال بند" بن جاتا ہے - وہ (شاعر) خضر سے تابڑ توڑ کئی ایک سوال کرتا ہے - وہ سوالات کیا ہیں؟ سنیے :

چھوڑ کر آبادیاں' رہتا ہے تو صحرانورد
زندگی تیری ہے' بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

ھو رھا ھے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک

نوجواں' اقوام نو دولت کے ھیں پیرایہ پوش

بیچتا ھے ھاشمی' ناموس دین مصطفیٰ

خاک وخوں میں مل رھا ھے' ترکمان سخت کوش

آگ ھے' اولاد ابراھیم ھے' نمرود ھے

کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ھے؟

ان پریشان کُن مسائل کے جو جوابات خضر نے دیے ھیں' اُن سے خود اقبال کا پہلو واضح ھوتا ھے - ھر عنوان کی ذیل میں کئی ایک اشعار ھیں جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ھر سرخی کے معنوی پہلو کو روشن کرتے ھیں اور ھر رنگ میں اقبال کی انوکھی اور بےنظیر رجائیت نراسوں کو آس دلاتی ھے - چاروں طرف مایوسی اور پریشانی کا عالم طاری ھے' بڑے بڑے سیانے حواس باختہ ھیں - مگر اقبال کے ماتھے پر نام کو شکن نہیں - پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ھے -

اِس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو ساحران فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی - برطانوی فوجیں بری طرح قسطنطنیہ سے کھسکیں - اب کیا تھا' ایک دھوم مچ گئی - دنیائے اسلام کی نظریں مصطفیٰ کمال پر پڑنے لگیں - اقبال کے دل میں بھی اُمید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ھوئیں - طلوع اسلام اِسی کیفیت کی آئینہ دار ھے - لیکن یہ خوشی تادیر رھنے والی نہ تھی' اس لیے کہ بعد میں کمال نے جو روش اختیار کی' اُس سے اقبال کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور اقبال نے پھر کبھی اُس طرف کو مڑکر بھی نہ دیکھا گو ترکی اور ایران نے نئے سرے سے جنم لیا - افغانستان نے بھی امان اللہ خاں کی قیادت میں آھستہ آھستہ رضا، اور

کمال کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی - "عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا " - لیکن ان ممالک کی مغرب‌زدہ چالیں اقبال کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہیں - لہذا یہاں سے اپنے فلسفے کے اجتماعی پہلوؤں کو تیج کر' اُنھوں نے خودی کی نوا کو تلخ‌تر کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ بےخودی کی تان " خودی " کے شور نشور میں گم ہوگئی - یہاں سے مسلسل کئی سال تک اقبال کی نوا' عجمی ( فارسی ) ہی رہی اور سنہ ۱۹۳۲ ع یعنی جاوید نامہ کے شایع ہونے تک اردو زبان میں اقبال نے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا ؛ اردو کی جگہ فارسی نے لی -

اقبال کی فارسی کا شباب طلوع اسلام کے بعد سے شروع ہوتا ہے - اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے - فلسفہ زیادہ چھانٹا گیا ہے اور شعریت کم - پیام مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور نو مشقی کا دور ختم ہو جاتا ہے - اسرار و رموز کی شراب سانچے میں ڈھل جاتی ہے -

پوری کتاب چار حصوں میں تقسیم ہوئی ہے - شروع کے (۸۰) صفحوں میں قطعہ‌نما رباعیاں ہیں جن میں لطف زبان کے ساتھ' خودی کے وجدآفریں رموز بیان کیے گئے ہیں - دوسرے حصے میں (جس کا عنوان ہے افکار) مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں - ان نظموں میں کچھ عنوانات بانگ درا کی نظموں کے عنوانوں سے ملتے جلتے ہیں (مثلاً افکار انجم' شبنم' لالہ' بوئے گل') لیکن یہاں ایک نئے انداز سے قدرت کے غوامض اور حسن بے پایاں پر روشنی ڈالی گئی ہے - فصل بہار' کشمیر اور ساقی نامہ میں اقبال کا رنگین تخیل انتہائی زور کے ساتھ فارسی زبان میں پھول برسا رہا ہے - بعض نظمیں خیال کی ندرت' زبان کی گھلاوٹ' اور اسلوب کی جدت کے لحاظ

سے فارسی ادب میں ایک انمول اضافہ ہیں - ایران جدید کے بعض شعرا نے جوشیلے اور مد بھرے گیت لکھے ہیں - اقبال کی نوائے وقت کو بھی پڑھیے جو ایران جدید کے کئی ایک ترانوں پر بھاری ہے - پوری نظم ولولہ انگیز ہے - خوف طوالت مانع ہے' ورنہ یہاں نقل کرتا -

حافظ کے ایک مشہور مصرعے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا (بدہ ساقی مے باقی) تیسرے حصے کا عنوان ہے - حافظ کی مینا میں فلسفۂ خودی کی شراب عجب بہار دکھاتی ہے - بعد کو یہ پری' رنگ چھان کر ایک نئے چھب سے زبور عجم میں نمودار ہوتی ہے -

چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ہے نقش فرنگ جس میں مغرب کے بعض حکما اور مشاہیر مثلاً نطشے' برگسان' ہیگل' تالستائے' ہائنا' بائرن وغیرہ پر مزے کے تبصرے ہیں - پوری کتاب گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب ہے -

پیام مشرق کے غالباً دو سال بعد زبور عجم شایع ہوئی جس میں اقبال نے اپنا سارا فلسفۂ حیات راگ اور نغمے کے پیکر میں پیش کیا ہے - فردوسی کو بھی دعوی تھا کہ اس نے اپنی فارسی سے عجم کو زندہ کیا - مگر یہ دعوی قصے کہانی اور رزمیہ افسانہ نگاری کی حد تک درست تھا - اقبال نے حقائق کو افسانے سے زیادہ دل‌چسپ بنا دیا ہے اور صدیوں کی سوئی ہوئی قوموں کو اپنے حیات‌پرور نغموں سے زندگی اور بیداری کا پیغام سنایا ہے - یہ جاں‌فزا ترانے غزل کے دل‌کش سانچے میں ڈھالے گئے ہیں - راگ اور رنگ مشرق کی جان ہے - اقبال اس راز کو خوب جانتے ہیں اور ایک ماہر نفسیات کی طرح مریض کی نفسیات کو پہچان‌کر حافظ کی مینا میں خودی کی شراب چھلکائی ہے - نتیجہ اس کا خاطر خواہ ہوا - زبان کے چٹخاروں پر جان دینے والوں نے جن بے‌آس باتوں کو اسرار و رموز میں بہ جبر پڑھا تھا' اب زبور عجم کی مد بھری

زبان میں اُنھیں مزے لے لے کر پڑھا -

پوری کتاب چار حصوں میں ہے - پہلا حصہ (۸۶) صفحوں پر مشتمل ہے اور اُس میں (۶۶) نغمے ھیں - میں ان کو نغمے ھی کہوں گا اس لیے کہ گو اُن کا ظاهری روپ غزل کا ہے مگر یہ غزلیں نہیں ھیں - ان نغموں میں بعض کی بحریں اور ردیف و قوافی' حافظ کی غزلوں کا کیف رکھتے ھیں - لیکن ان میں مدھوشی نہیں - دو ایک نغمے مخمس' مثلث اور ترکیب بند کی شکل میں بھی ھیں - ضرورت اس کی ہے کہ یہ نغمے سب کے سب پڑھے جائیں - محض ایک اندازے کی خاطر' چند اشعار یہاں پیش کروں گا - پہلا نغمہ ھی سنیے - دیکھیے لے غزل کی ہے' مگر غزل نہیں :

فصل بہار' ایں چنیں - بانگ هزار' ایں چنیں
چہرہ کُشا' غزل سرا' بادہ بیار' ایں چنیں
اشک چکیدہ ام ببیں' هم به نگاہ خود نگر
ریز به نیستان من' برق و شرار ایں چنیں
باد بہار را بگو' پے به خیال من برد
وادی و دشت را دهد' نقش و نگار ایں چنیں
زادۂ باغ و راغ را' از نفسم طراوتے
در چمن تو زیستم با گل و خار' ایں چنیں
عالم آب و خاک را' بر محک دلم بسائے
روشن و تار خویش را' گیر عیار' ایں چنیں
دل به کسے نہ باختہ' با دو جہاں نہ ساختہ
من به حضور می رسم' روز شمار ایں چنیں

زرا اس دل کی بھی بہار دیکھیے' مگر یہ ہمارے ہاں کے عشاق کا دل نہیں؛ یہ دل ایک مرد خودآگاہ کا دل ہے :—

بدہ آں دل کہ مستی‌ھائے او از بادۂ خویش است
بگیر ایں دل کہ از خودرفتہ و بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل' بدہ آں دل' کہ گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل' بگیر ایں دل کہ در بند کم و بیش است
مرا اے صیدگیر! از ترکش تقدیر بیروں کش
جگردوزی چہ می آید از آں تیرے' کہ در کیش است
نہ گردد زندگانی خستہ از کار جہاں‌گیری
جہانے در گرہ بستم' جہان دیگرے' پیش است

---

ایک آخری مثال - اشعار کیا ھیں سرود حیات - رمز اور اشارے میں کیسے پتے کی باتیں کہہ دی ھیں :-

چند بروے خود کشی' پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا' تمام کُن' جلوۂ ناتمام را
من بہ سرود زندگی' آتش او فزودہ ام
تو نم شبنمے بدہ' لالۂ تشنہ‌کام را
عقل ورق ورق بہ گشت' عشق بہ نکتۂ رسید
طائر زیرکے برد' دانۂ زیر دام را
نغمہ کجا و من کجا' ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم' ناقۂ بے زمام را
وقت برہنہ گفتن است' من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو' کجا برم ہم‌نفسان خام را

دوسرا حصہ پہلے حصے سے کچھ کم جاذب توجہ نہیں - اس حصے کی منظوم سرخی ہی وہ معنویت رکھتی ہے کہ اس میں اقبال کا سارا فلسفہ سمٹ سمٹا کر بیت الغزل بن گیا ہے - شعر ہے :-

شاخ نہال سدرۂ' خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی' منکر خویشتن مشو

اقبال خودی کا یہ پرچار بار بار کیوں کرتے ہیں؟ اس کا سبب کچھ انہیں کے مد بھرے الفاظ میں سنیے :-

چو موج مست خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشیں و پا بہ داماں کش ؟
بہ قصد صید پلنگ' از چمن‌سرا بر خیز!
بہ کوہ رخت کُشا' خیمہ در بیاباں کش
بہ مہر و ماہ کمند گلو فشار انداز
ستارہ را ز فلک گیر و در گریباں کش
گرفتم ایں کہ شراب خودی بسے تلخ است
بہ درد خویش نگر' زہر ما بہ درماں کش

---

اس آتما ترنگ کی چلد تانوں پر قناعت کیجیے - تناسب کا احساس مجھے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا - پوری زبور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے - اس حصے کے صرف ایک نغمے کو یہاں جگہ دی گئی ہے - پڑھنے والے کے ذوق خودی کو بیدار کرنے اور اس کے خون میں گرمی پیدا کرنے کے لیے ایسے (۷۴) نغمے اور ہیں - البتہ حصۂ اول و دوم کے ترجیع بند (۱۹' ۱۸' ۱۹ اور ۳۰) بڑے جوشیلے اور اثرآفریں نغمے یا ترانے ہیں جنھیں جوش (ملیح آبادی) نے تھوڑے سے تغیر کے بعد اُردو میں منتقل کیا ہے - ان ترانوں کے ترجمی

مصرعوں کے ٹکڑے ھیں: (۱) "انقلاب اے انقلاب" اور (۲) "از خواب گراں خیز" -

تیسرے حصے کا عنوان ھے: گلشن راز جدید جس میں نو منظوم سوالوں کے بطرز مثنوی مفصل جوابات دیے گئے ھیں - یہ سوال اور ان کے جوابات، چند فلسفیانہ موشگافیوں سے متعلق ھیں جو عام دل چسپی کا سامان نہیں رکھتے - چوتھے حصے کا عنوان ھے بندگی نامہ جس میں بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری پر اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ھے جو بعضوں کے نزدیک درست اور بعضوں کے نزدیک بحث و نزاع کا موضوع ھیں - لیکن ھر جگہ شاعر کی جادوبیانی پڑھنے والوں کی زباں بندی کر دیتی ھے - اصل یہ ھے کہ پہلے دو حصے زبور کی جان ھیں -

زبور عجم کی اشاعت کے دو ایک سال بعد ھی اقبال نے اپنی اس لازوال تصنیف کے تانے بانے درست کرنے شروع کیے جس نے اقبال کو زندۂ جاوید بنا دیا - اس سے میری مراد ھے جاوید نامہ جو اقبال کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ اور اس کی زندگی کا حاصل ھے - اب تک جو کچھ اقبال نے کہا اور کسی سطح سے کہا تھا، لیکن یہاں جو کچھ کہا ھے، ایسے بلند مقام سے کہا ھے جہاں الہام اور شعر عرفان اور ادبیات عالیہ کی حدیں ملتی ھیں - خود فرماتے ھیں :—

/آنچہ گفتم از جہانے دیگر است      ایں کتاب از آسمانے دیگر است

آسکروائیلڈ کا قول ھے کہ "فن کار کا عمل، اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ھوتا ھے" - جاوید نامہ اقبال کی یگانہ سرشت کا وہ بے مثل ثمر ھے جس کی مثال خود اقبال کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی - مسلسل تین سال تک اس کتاب کی تخلیق میں اقبال نے اپنی توانائی بے دریغ صرف کی، جب کہیں یہ انمول رتن عدم سے وجود میں آیا - سنہ ۱۹۲۹ع میں جبکہ اقبال مدراس

اور بنگلور میں اپنے خطبات سنا کر حیدرآباد آئے تھے' اُس زمانے میں اس کتاب کے کچھ دھندلے نقوش اُن کے ذہن میں تھے - اس موقع پر جب میں نے ان کو دیکھا تو ایک خاص تفکر اور پریشانی کے آثار اُن کے چہرے سے نمایاں تھے - یہ وہ آثار تھے جو کسی شاہکار کی تخلیق سے پہلے کسی فن‌کار کے چہرے سے "غم پنہاں" کی طرح ظاہر ہوتے ہیں - مطلب یہ کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ فکرمند اور کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے' جیسے کوئی انتہائی سونچ میں کسی چیز کی تلاش یا دھن میں ہو......بعینہ وہ دھن اور فکرمندی جو کسی اعلیٰ تخلیق کاری کا پیش خیمہ ہوتی ہے - چنانچہ اس انوکھی فکرمندی کا گُل اس وقت کھلا جب سنہ ۳۲ء میں جاوید نامہ شائع ہوا -

ملٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی "گم شدہ فردوس" اُس کی تمام زندگی کا حاصل اور اُس کے شاعرانہ کمال کا نچوڑ ہے - اپنی ساری توانائی اس نے اس کتاب پر صرف کردی' جب کہیں اس لازوال کتاب کے نقوش اس کے امرت بھرے قلم سے نغمے اور شعر کے پیکر میں ظاہر ہوئے - بعد کو اور بھی چیزیں اس کے قلم سے نکلیں لیکن یہ بات کسی میں نہ آئی - یہ مثل اقبال کے جاوید نامہ پر بھی صادق آتی ہے جس کی تیاری میں اس نے اپنا خون حیات پانی کی طرح بہا دیا - بعد کو دو مجموعے اردو کے اور ایک مجموعہ فارسی کا بھی نکلا - اردو کے پرستاروں کی جان میں جان آئی کہ اقبال نے پھر اردو کی طرف توجہ کی - لیکن میری رائے میں یہ دونوں کتابیں ایک تھکے ہوئے نقش‌کار کے وہ نقوش ہیں جو اس نے بائیں ہاتھ سے گھسیٹے ہیں - مانا کہ ان نقوش میں وہ کمال ہے جو بھتیرے باکمالوں کے داہنے ہاتھ کی تخلیق کاریوں میں نہیں' پھر بھی جاوید نامے کے آگے ضرب کلیم اور بال جبریل گھٹیا درجے کی چیزیں ہیں - میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو کم

سے کم ایک ایسے شخص کے الفاظ سنیے جو مشرقی علوم کی گود میں پلا ہے۔
مولانا اسلم جیراج‌پوری' جاوید نامے کے متعلق ایک جگہ لکھتے ھیں - "ہم
سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو
ملتی ھیں۔ شاھنامۂ فردوسی' مثنوی مولانا روم' گلستان سعدی اور دیوان حافظ۔
لیکن اب جاوید نامے کو پانچویں کتاب سمجھنا چاھیے' جو کہ معنویت اور
نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے - حقیقت میں یہ اس
قابل ہے کہ اس زمانے میں مسلمانان عالم کے نصاب میں شامل کرلی جائے"

شکر کا مقام ھے کہ یہ کتاب نصاب میں داخل نہیں ہوئی - یہی
اس کی عظمت کی دلیل ہے - ضرورت اس کی ھے کہ لوگ شوق سے اپنے طور
پر اس کو پڑھیں۔ جبراً پڑھانے اور شامل نصاب کرنے میں ایک شاھکار کا
حسن مارا جاتا ہے اور وھی مثل صادق آتی ہے کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد ؟"

ایک بلند پایہ تصنیف کی حیثیت سے یہ کتاب یوں بھی تفصیلی تنقید
سے بے نیاز ھے - میں خود بھی اس جوش تنقید اور زور ہمہ دانی کو بُرا
سمجھتا ھوں جب‌کہ ایک برخودغلط تنقیدنگار کسی اچھی کتاب کا سب
رس نکالنے کی کوشش میں اسے بےرس بنا دیتا ھے - آرٹ وھی ہے جو تنقید و
تعریف کی حدوں میں نہ آئے - اس لیے میں صرف ایسے اُمور پر اکتفا
کروں گا جن سے اس کتاب کو اپنے طور پر پڑھ کر محظوظ ہونے میں آپ کو
آسانی ھو۔

ساری کتاب رنگین تخیل' شاعرانہ پرواز نظر اور فلسفیانہ بلند نگاھی
کے ساتھ' ادبی اور فن‌کارانہ لطافتوں سے مالامال ہے - زبان میں پختگی کے علاوہ
بلا کی مٹھاس ہے - کتاب کا سارا بھرنگ' مثنوی میں ھے لیکن جا بجا پر کیف
نغمے بھی غزل کے سانچے میں پیش کیے گئے ھیں جن میں بلا کا ترنم اور

شعریت ھے - اِن میں سے بعض نغمے تو وھی ھیں جو زبور عجم سے لےکر یہاں پر مناسبِ موقع شامل کر دیے گئے ھیں - غزلوں کا یہ جزاؤ کام عجب بہار دکھاتا ھے -

کتاب کے شروع میں شاعر کا منظوم دیباچہ ھے جس سے اِس نظم جاوید کا معنوی پہلو چار مصرعوں میں آئینہ ھو جاتا ھے :

خیال من بہ تماشائے آسماں بودہ است

بدوش ماہ و بہ آغوش کہکشاں بودہ است

گُماں مبر کہ ھمیں خاک‌داں نشیمن ما ست

کہ ھر ستارہ جہان است یا جہاں بودہ است

شکوہ اور جواب شکوہ میں بھی اقبال ھنگامۂ زمین سے دور' آسمانوں کے اس پار گئے تھے - لیکن یہ اس وقت کا ذکر ھے جب کہ یہ فن‌کارانہ بلندی انھیں نصیب نہ ھوئی تھی' صرف زبانی جمع خرچ تھا - یہ معلوم ھوتا ھے جیسے کوئی زمین سے بلکارتا ھو - لیکن اِس مرتبہ وہ پورے اِھتمام اور فن کارانہ تفصیل کے ساتھ مختلف افلاک کی سیر کرتے ھیں اور اِس طرح نوبت بہ نوبت اور منزل بہ منزل فراز آسماں کا رخ کرتے ھیں اور اپنے عرفانی مدارج کا ھر زینہ' الفاظ کے نقوش سے اس طرح روشن کردیتے ھیں کہ پڑھنے والا بھی ساتھ ھی ساتھ اِس نئی دنیا کو دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھتا چلا جاتا ھے -

اِس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ھو تو دیباچے کے علاوہ "مناجات" (جس سے کتاب در اصل شروع ھوتی ھے) تمہید آسمانی' تمہید زمینی کو بغور پڑھیے جن کے ذریعے شاعر نے مختلف دل پذیر طریقوں سے واقعیت کا طلسم باندھا ھے - مناجات کے شروع ھی میں بتایا ھے کہ اُس "جہان ھفت رنگ" میں انسان کو سدا درد آشنا رفیق کی تلاش رھتی ھے کہ اس سے اپنے دل کا ماجرا بیان کرے - لیکن وہ ناکام ھی رھتا ھے اس لیے کہ ان مٹی کے پتلوں

سے دل‌دھی کی امید رکھنا ھی عبث ھے' خصوصاً اس دور میں کہ انسان دوربین ھے مگر بصیرت نہیں رکھتا -

غرض کہ نہایت دل‌آویز طریقوں اور نازک تشبیہوں اور اشاروں سے بارگاہ ایزدی میں یہ التجا کی جاتی ھے ' یہاں تک کہ شاعر کے اثر میں ڈوبے ھوئے الفاظ کی پذیرائی کا پڑھنے والے کو بھی یقین سا ھونے لگتا ھے - اس کے بعد تمہید آسمانی میں زمین کی بےرونقی پر آسمان کا زھر اُگلنا' پھر جناب باری میں زمین کی درد بھری فریاد اور رحمت‌باری کا جوش میں آکر خاک‌دان ھستی کو بھاگوان اور نہال کرنے کا وعدہ اور پھر ندائے غیبی کے بعد نغمۂ ملائک کی امیدافزا بشارت' یہ سب چیزیں اس کمال اور فن‌کارانہ اھتمام کے ساتھ پیش کی گئی ھیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ھے اور یہ محسوس ھونے لگتا ھے کہ وہ وقت دور نہیں جب کہ انسان کو وہ معراج عرفان حاصل ھو جائے جس کے وہ آرزومند ھیں - نغمۂ ملائک کے اشعار یہاں پیش کرتا ھوں - دیکھیے کہ اصل سے جدا ھونے کے بعد بھی ان کی یہ بہار ھے' تو اپنی جگہ پر کیا عالم ھوگا - سارے اشعار ترنم اور رجائیت میں شرابور ھیں :—

فروغ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر او' افزوں شود روزے

خیال او کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیل‌گوں' بیروں شود روزے

یکے در معنیء آدم نگر' از ما چہ می پرسی
ھنوز اندر طبیعت می خلد' موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او، پرخوں شود روزے

( تمہید آسمانی—جاویدنامہ )

نغمۂ ملائک ابھی کانوں میں گونجتا ہی رہتا ہے کہ شام کے شعریت سے لبریز سناٹے میں شاعر' مولانا روم کی ایک مستانہ غزل دریا کے کنارے گنگناتا ہوا دکھائی دیتا ہے - اشعار کے الفاظ بھی بڑے برمحل اور ذومعنی ہیں - ان پہلودار الفاظ اور تشبیہوں کی آڑ میں ایک جگہ اقبال نے اپنے زمانے کے " دیو و دد " اور اُن کی فرعونیت پر پیغمبرانہ لہجے میں برھمی کا اظہار کیا ہے - یہ چیز ضرب کلیم میں اور بھی نمایاں ہو گئی ہے' جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے - چند اشعار تمہید زمینی کے پیش کرتا ہوں - ضرب کلیم کا حوالہ بطور جملہ معترضہ کے تھا -

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزو است

بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزو

یک دست جام بادہ ' یک دست زلف یار

رقص چنیں میانۂ میدانم آرزو است

جانم مُلول گشت ز فرعون و ظلم او

آن نور جیب موسیٰ عمرانم آرزو است

دی شیخ با چراغ همی گشت گرد شہر

کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزو است

زیں همرهان سست عناصر' دلم گرفت

شیر خدا و رستم دستانم آرزو است

("تمہید زمیں" - جاوید نامہ)

شعر خوانی کا سلسلہ ختم ہونے پر' شعریت اور سکون سے اس لبریز ماحول میں دریا کے کنارے کچھ دور ایک پیکر نور' پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے - یہ وہی خضر طریقت ہے جس کے غائبانہ فیض نے اقبال

سے اسرار و رموز لکھوایا تھا - یہاں سے بے محابہ سوالوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے اور پھر رومی اقبال کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں - پھر معراج کے اسرار سے باخبر کرتے ہیں - معراج کیا ہے ؟ شعور کامل جس کے تین مدارج ہیں : (۱) شعور ذات ' (۲) شعور غیر ' (۳) شعور حق تعالی - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن ' زندگی است
چیست معراج ؟ آرزوئے شاهدے
امتحانے روبروئے شاهدے
پیکر فرسودہ را دیگر تراش
امتحان خویش کن موجود باش

*　　*　　*

تو ازیں نہ آسماں ترسی ؟ مترس
از فراخائے جہاں ترسی ؟ مترس
چشم بکشا ' بر زمان و بر مکاں
این دو یک حال است بر احوال جاں
چیست تن ؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقام چارسو خو کردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور ' از جذب و شوق
وا رهاند جذب و شوق ' از تحت و فوق

ایں بدن از جان ما انباز نیست
مشت خاکے مانع پرواز نیست

رومی کے ان الفاظ سے شاعر اپنے میں ایک غیر معمولی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے - زمان و مکان کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں اور رومی کی معیت میں شاعر عالم علوی کی سیر کرتا ہے جہاں زرواں (روح زمان و مکان) سے اُس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے - اس کے بعد رہا سہا حجاب بھی دور ہو جاتا ہے - زرواں کی نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ شاعر خود کو عالم افلاک کی طرف اُڑتا ہوا پاتا ہے - یہ کیفیت کیسے طاری ہوئی ؟ اِس کا لطف کچھ شاعر ہی کی زبان سے آئے گا:

در نگاہے او نمی دانم چہ بود     از نگاہم ایں کہن عالم ربود
یا نگاہم بر دگر عالم کشود     یا دگرگوں شد ہمیں عالم کہ بود
مردم اندر کائنات رنگ و بو     زادم اندر عالم بے ہائے و ہو
تن سبک‌تر گشت و جان سیّار تر     چشم دل بینندہ و بیدار تر

اب کیا تھا پھر کے اُڑنے لگے - مختلف سیّاروں کی خبر لی - پہلے فلک قمر پر پہنچے اور اس کے بعد دوسرے سیاروں کا جائزہ لیا - ہر جگہ اقبال کے جبریل امیں ساتھ ہیں - اب یہاں سے اپنے طور پر معراج اقبال کا کمال دیکھیے - آگے کیا بیان کیجیے کہ تنقید کے پر جلتے ہیں - مزہ جب ہی ہے کہ نشان منزل تھوڑا بہت بتانے کے بعد' پڑھنے والا خود پڑھے اگر سچ مچ لطف اٹھانا چاہتا ہے -

کتاب کے خاتمے پر بطور ضمیمہ کچھ اشعار ہیں جن میں اقبال کے فرزند جاوید سے خطاب ہے - اصل میں یہ خطاب ساری نئی پود سے ہے - نوجوانوں ہی سے اقبال کو بجا طور پر امیدیں ہیں - بڈھے تو پھوٹ کے پھل ہیں :

من کہ نومیدم ز پیران کہن　　دارم از روزے کہ می آید سخن!

بر جواناں سہل کن حرف مرا　　بہر شاں پایاب کن ژرف مرا

(مناجات - جاوید نامہ)

وہی ”تنگنائے غزل“ جس کے غالب کبھی شاکی تھے، اقبال نے اُس میں اب ”بقدر شوق“ وسعت پیدا کرلی ہے اور اس کے اندر سارا فلسفۂ خودی اور حالات حاضرہ سے متعلق اقبال کے تمام تاثرات موجیں مارتے ہیں - گویا 'سمندر ہے اک بوند پانی میں بند“ اس شاعرانہ اعجاز کا نمونہ وہ کتاب ہے جو جاوید نامے کی اشاعت سے تین سال بعد (سنہ ۱۹۳۵ع) بال جبریل کے عنوان سے شایع ہوئی - کتاب کا نصف سے زاید حصہ زبور کا چربہ ہے اور وہی باتیں بالفاظ دیگر دہرائی گئی ہیں - خیر سمیں اقبال نے اس کا نام بال جبریل کیوں رکھا - زبور ہند بہتر نام ہوتا - ممکن ہے کہ جاوید نامے میں سیر افلاک کرنے کے بعد بھی اس دنیا کے طلسمی مناظر دماغ میں گھوم رہے تھے جس کی بنا پر اقبال نے غالباً اس نام کو زیادہ موزوں پایا -

جن پر فارسی کے دروازے بند ہیں، انھیں بال جبریل پر قناعت کرنی چاھیے - پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامے پر انتہائی زور اور شاعرانہ توانائی صرف کرنے کے بعد اقبال نے اردو کا رخ کیا - گو وہ تنوع جو پیام مشرق میں ہے، یا وہ تغزل اور برجستگی جو زبور میں ہے، یا وہ فن‌کارانہ اہتمام اور وہ بیداروہ تخیل جو جاویدؔ نامے میں ہے، اس کتاب میں نہیں، تاہم ایک بےکراں دماغ کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے بےکراں چیز ہے اور محض اردو داں حضرات کے لیے جو فارسی کے ”نقشہائے رنگ رنگ“ سے بے بہرہ ہیں، بال جبریل ”زبور عجم اور جاوید نامے“ کا بدل ہے - کتاب کا بیشتر حصہ زبور کے ابدی نغموں کی صدائے بار گشت ہے - جس طرح زبور میں

شراب خودی حافظ کی مینا میں پیش کی گئی ہے' بال جبریل میں وھی شراب داغ اور غالب کے گلگا جمنی ساغر میں چھلکائی گئی ہے - بظاہر وھی کیف شیراز ان غزل نما نغموں میں بھی دکھائی دیتا ہے' لیکن یہ کچھ اور چیز بلکہ اقبال کی اپنی چیز ہے - فارسی سے برسوں شغف رکھنے کے باعث' زبان بانگ درا سے بہتر اور منجھی ہوئی ہے - اسلوب میں پختگی ہے اور بندشیں چست ھیں' مگر کہیں کہیں فارسی کی نامانوس ترکیبیں بھی آگئی ھیں -

دوسرا حصہ مختلف موضوعوں پر مشتمل ہے - کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارتوں اور مقامات پر ھیں جن سے ھر مسلمان کے جذبات اب تک وابستہ ھیں - گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اقبال جب یورپ گئے تھے تو ھسپانیہ کے ان شہروں کا جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و شایستگی کا گہوارہ تھے' نجی طور پر دورہ کیا تھا - مسجد قرطبہ اور دوسرے عنوانوں کی نظمیں جو ھسپانیہ سے متعلق ھیں' انہیں تاثرات کا نتیجہ ھیں - ایک نظم جس کا عنوان ہے " ذوق و شوق " فلسطین میں لکھی گئی تھی - خاصی اچھی اور پرترنم نظم ہے اور ابتدا میں مناظر قدرت کی مرقعکشی اقبال کے حسن کارانہ کمال کا پتہ دیتی ہے' جس کے بیشتر نمونے بانگ درا میں بھی جابجا موجود ھیں - ان نظموں کے علاوہ اور بھی چھوٹی بڑی نظمیں مختلف موضوعات پر ھیں' لیکن ساقی نامہ بہترین نظم ہے - بہار کا منظر اور قدرت کے مظاہر بہل بوٹے بڑی چابک دستی سے کھینچے گئے ھیں - بعد کے بندوں میں حالات حاضرہ کے بعض اہم مسائل پر کوثر کی دھلی ہوئی زبان میں تبصرے ھیں - پوری نظم مثنوی سحرالبیان کی طرز پر اور اسی بحر میں لکھی گئی ہے - لیکن اقبال کا سحر بیان کچھ اور ہے - جن کی نظریں محض لطف زبان پر ھیں' انہیں اتنا دھوکا ضرور ہوگا کہ اقبال کے پیکر میں میر حسن نے جنم

تو نہیں لیا؟ یہ چند اشعار دیکھیے - دور حاضر کے خشک اور الجھے ہوئے مسائل کو لیا ہے ' لیکن کتنی سلجھی ہوئی زبان اور نکھری تشبیہوں میں بیان کیا ہے - شروع میں رسمی طور پر ساقی سے خطاب ہے مگر یہ ساقی کوہ فاران کا ساقی ہے :—

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ' ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا تماشہ دکھاکر مداری گیا !
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے !
دل طور و سینا و فاراں دو نیم تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم !
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی !

* * *

شراب کہن پھر پلا ساقیا ! وہی جام گردش میں لا ساقیا !
مجھے عشق کے پر لگاکر اُڑا مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ! زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر !
جوانوں کو سوز جگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ! مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں !
اُمنگیں مری ' آرزوئیں مری ! اُمیدیں مری ' جستجوئیں مری !
مرا دل مری رزمگاہ حیات ! گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات !

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلہ میں لٹادے اسے!
لٹادے! ٹھکانے لگادے اسے!

ایک سال کے اندر باهر ضرب کلیم (سنہ ۱۹۳۶ ع) بهی شایع هوئی جس میں دور حاضر کی فرعونیت کے خلاف کُهلا "اعلان جنگ" (اعلان جنگ) هے - کتاب کا عنوان وجہ تسمیہ کو ظاهر کرتا هے - یہاں سے اقبال کی نوا میں زوال کے آثار صاف نمایاں هیں - یہی حال "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا بهی هے - هر کمالے را زوالے - آخر کہاں تک انسانی دماغ کام کرتا؟ دانتے کے بارے میں مشہور هے کہ "آسمانی طربیہ" کے زوال نغموں کے بعد اس کی صحت نے جواب دینا شروع کیا - یہی حال اقبال کا هوا - جاویدنامے نے انہیں زندہ جاوید کیا اور مارا بهی - دنیا کے اور صاحب‌کمالوں کی طرح وہ سخت جان تهے - استقلال اور همت نے جاویدنامے کے جان لیوا بار کے باوجود 'بال جبریل' کے اوراق اُن سے مرتب کرائے - لیکن بال جبریل کی اشاعت ان کے حق میں موت کا پیغام خیمہ تهی - کوئی تین سال اور جیے' لیکن کس طرح کہ دمے کی تکلیف سے ان کی جان ضیق میں تهی - اس پر بهی دو کتابیں لکھ هی ڈالیں - دونوں (ضرب کلیم اور پس چہ باید کرد) کتابوں میں اقبال ایک بپهرے هوئے شیر کی طرح جو گولی کهاکر بهی اپنے دشمن پر جست کرتا هو' موجودہ دور کی نا انصافیوں کے خلاف گرج رہے هیں - دونوں کتابوں کا لہجہ وہ جلالی شان رکهتا هے جیسے بنی‌اسرائیل کا کوئی نبی اپنی گمراہ قوم کو راہ راست پر لانے کے لیے کڑک رها هو - کلام میں مذهبیت زیادہ هے - اور شعریت کم - جہاں وعظ هو' وهاں شعریت کیسی؟

گاندهی اور اقبال کے بارے میں اختلاف رها هے اور رهے گا - یہی دونوں

کی عظمت کی دلیل ہے - دونوں ہندوستان کے ایسے سپوت ہیں کہ ملک انہیں کبھی بھلا نہیں سکتا - دونوں نے اس ملک کی ذہنی اور سیاسی بیداری میں ایسا انقلاب برپا کیا ہے کہ جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی - لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ اقبال ایک برتر انسان ہے، اس لیے کہ وہ ایک بڑا شاعر تھا اور اُس کا پیغام ہند سے گزر کر ایک عالمگیر اپیل رکھتا ہے - اس کا نام تاریخ کے اوراق میں سدا جگمگاتا اور سینوں اور دلوں میں جگنو کی طرح چمکتا رہے گا - وہ چل بسا، مگر اس کا پیام اٹل ہے :—

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

( بالِ جبریل )

# اقبال کا تصور زماں

از

( سید بشیر الدین صاحب - بی - اے - ارکونم )

عصر حاضر اپنی نت نئی ایجادات اور جدید نظریوں کی بدولت ایک متحرک دنیا میں سانس لے رہا ہے - وہ زندگی اور زندگی کے مختلف شعبوں کا حرکی (Dynamic) نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا چاہتا ہے اور زمانۂ قدیم کے سکونی (Static) تصورات کے لیے اپنے اندر کوئی لچک نہیں رکھتا - قدیم مذاہب اور فلسفیانہ نظام جن کا نقطۂ نظر سکونی ہے' یا تو زندہ نہیں یا اپنی عملی حیثیت کھو چکے ہیں - "متحرک" برق اور بھاپ کی عظمت بڑھتی جا رہی ہے اور "ساکن" آسمانی باپ دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے - اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں مہلک ہو یا دور جدید کی تہذیب کے حق میں برا ہو' لیکن اب مفکرین ایسے کامل انسانوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو انسانیت کو معراج کمال پر پہنچانے کی خدمت انجام دے سکیں - پروفیسر میکنزی نے اپنی تصنیف 'The Introduction to Sociology' میں شدت کے ساتھ ایسے لوگوں کی ضرورت محسوس کی ہے جو بیک وقت شاعری اور پیغمبری کی صفات سے متصف ہوں اور زمانۂ قدیم کے ہادیوں اور پیغمبروں کی طرح جنگلوں اور بیابانوں میں نہیں' لیکن متحرک اور روشن شہروں میں اپنا پیام پہنچا سکیں اور پرانے شاعروں کی طرح صرف فطرت ہی میں صفات الہی کا جلوہ نہ دکھائیں' بلکہ انسانی پیکر میں انوار ربانی کا مشاہدہ کرا سکیں - بہ الفاظ دیگر میکنزی نے ایسے صاحب نظر

شاعروں کی ضرورت محسوس کی ہے' جو انسان کی روحانی و مادی قوتوں اور ان کی صلاحیتوں پر ہی نظر نہ رکھتے ہوں' بلکہ اس دور کی متحرک روح کو بھی سمجھتے ہوں۔ پروفیسر موصوف کے 'انسان کامل' کی ایک تازہ اور بہترین نظیر حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی جدائی کے غم میں ہمارے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے۔ مشہور فارسی شاعر حضرت گرامی مرحوم نے علامہ موصوف کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:—

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال

پیغمبریؑ کرد و پیمبر نتواں گفت

در اصل اقبال قدیم و جدید علوم کا نادرۂ روزگار عالم ہی نہیں تھا بلکہ قدرت نے اسے کچھ ایسے جوہر عطا کرنے میں بھی فیاضی سے کام لیا تھا کہ اس کی گفتار و کلام سے پیغمبرانہ شان ہویدا ہے۔ وہ حکیم ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:—

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ!

اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبال کے پیام کی کامیابی کا راز بہت بڑی حد تک زماں کے اس تصور میں مضمر معلوم ہوتا ہے کہ زماں ایک حقیقت ہے اور زندگی نام ہے زماں میں ایک مسلسل حرکت کا۔ زماں کا یہ تصور اُس کے ادب میں جاری و ساری ہے اور اس کے پایدار اور لازوال ہونے کا بہت بڑی حد تک ضامن ہے۔ اسی حرکی تصور کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس متحرک دور کے بڑے بڑے دماغوں کو متاثر کیا ہے جو انسانیت کی اعلیٰ تربیت کے لیے ایک موثر یعنی متحرک ادب کے متلاشی ہیں۔

زمان و مکان کی بحث فلسفہ اور الٰہیات کے لیے نئی چیز نہیں؛ خصوصاً اسلامی مفکرین کے لیے یہ ہمیشہ سے دل‌چسپی کا باعث رہی ہے - فلسفیانہ یا الٰہیاتی ضرورت کے علاوہ اس دل‌چسپی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کے مطابق اختلاف لیل و نہار میں خدائے عز و جل کی نشانیاں موجود ہیں † - اس کے علاوہ حدیث شریف میں 'دہر' (زمان) کو ذات الٰہی کا مرادف قرار دیا گیا ہے اور صوفیائے کرام مثلاً محی‌الدین بن عربی نے دہر کو اسمائے حسنیٰ میں شامل کیا ہے - لیکن اسلامی مفکرین فلسفیانہ اعتبار سے اس مسئلے کے متعلق کسی فیصلے پر پہنچ نہ سکے تھے - اب اگر اس ضمن میں فلسفہ اور سائنس کے جدید نظریوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے سامنے مختلف پیچ در پیچ راہیں کھلتی ہیں جن سے ایک سیدھی راہ پیدا کرنا ایسا مشکل کام ہے جس سے اقبال جیسے حقیقت‌آشنا رہنورد ہی عہدہ‌برآ ہوسکتے ہیں - در اصل اس دقیق مسئلے کو جس طرح اقبال نے سلجھایا ہے وہ فلسفے کا ایک شاہکار ہے اور خصوصاً اسلامی فلسفے پر اس کے اثرات بہت دوررس ہیں -

اسلامی مفکرین میں پہلی دفعہ جنھوں نے عقلی اعتبار سے زمان کی گتھی کو سلجھانا چاہا وہ اشاعرہ تھے - اشاعرہ سے قبل یونانیوں نے اس مسئلے پر معروضی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی اور نتیجہ یہ نکلا تھا کہ زمان غیر حقیقی ہے - چنانچہ افلاطون اور زینو حقیقت زمان کے قائل نہ تھے - اشاعرہ نے یونانیوں کی غلطی سے سبق حاصل نہیں کیا - انھوں نے بھی معروضی طریقہ اختیار کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زمان منفرد آنات (Nows) کا ایک تواتر ہے - اس صورت میں یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ ہر دو متصلہ منفرد آنات کے

---

† ملاحظہ ہو قرآن مجید: (۱۰ : ۶)' (۲۵ : ۶۳)' (۳۱ : ۲۸)' (۳۹ : ۷)' (۸۲ : ۲۳) -

درمیان ایک خلائے زمانی موجود ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں زمانۂ حال کی طبیعیات بھی اشاعرہ کی ہم‌نوا ہے - پروفیسر رانگیر کے مطابق کائنات میں غیرمدرک طور پر نہیں مگر اچانک جستوں یا طفروں (Sudden Jumps) میں تبدیلی واقع ہوتی ہے - ہر طبیعیاتی نظام متباین محدود حالات ہی کا اہل ہو سکتا ہے ؛ چوں‌کہ دو متصلہ حالات کے درمیان کائنات ساکن رہتی ہے اس لیے زماں بھی ساکت ہوجاتا ہے - لہذا زماں غیر مسلسل ہے اور زماں کی جوہری تقسیم کا تصور درست ہے - اس سلسلے میں ایک اور مثال نیوٹن کی ہے جس کے مطابق زماں کوئی شے ہے جو اپنے ہی اندر بہتی ہے اور اپنی فطرت کی بہ‌دولت مساوی طور پر بہتی ہے -
"Something which in itself and from its own nature flows equally."
اگر زماں کو اس نوع کی ایک نہر کی تمثیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہماری راہ میں ناقابل حل مشکلات حائل ہوتی ہیں - ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس نہر کے حدود کیا ہیں اور اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے اور ان چیزوں کے درمیان جو اس نہر کے اندر موجود ہیں اور ان چیزوں کے جو اس کے باہر واقع ہیں' فرق کیا ہوگا - اس کے علاوہ اگر اس قسم کی روانی' حرکت اور مرور کے تصور کے بغیر زماں کی ماہیت سمجھنا ممکن نہیں ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ پہلے زماں کی حرکت کی وقت‌شماری کے لیے ایک دوسرے زماں کی اور دوسرے زماں کی حرکت کی وقت‌شماری کے لیے ایک تیسرے زماں کی ضرورت ہے ...... اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا - اگرچہ ہمارے جسم میں کوئی ایسا عضو موجود نہیں ہے جو زماں کی ماہیت کا ادراک کر سکے' تاہم نیوٹن کے اس خیال سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زماں ایک قسم کی روانی (flow) ہے - اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زماں کی ایک خاص معروضی حیثیت

بھی ہوسکتی ہے : یعنی اس کے جوہری پہلو کی توجیہ بھی ممکن ہے - لیکن جیساکہ پروفیسر رانگیر کے پیش کردہ نظریے سے ظاہر ہوتا ہے' اشاعرہ کی طرح زمانۂ حال کی طبیعیات نے بھی اپنی تعمیری جد و جہد میں نفسیاتی تشریح سے کامل بےتوجہی برتی ہے اور خالص موضوعی نقطۂ نظر سے کام لیا ہے - اس غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ مادی جواہر کے نظامات اور زمانی جواہر کے نظامات میں صاف طور پر بعد نظر آتا ہے اور ان کے مابین کوئی عضوی ربط (Organic relation) پایا نہیں جاتا - اس کے علاوہ مزید مشکل یہ ہے کہ ذات باری پر جوہری زمان کا انطباق ہو نہیں سکتا' کیوں‌کہ اس صورت میں ایک تخلیقی فاعلیت کے لحاظ سے ذات باری کا ادراک ناممکن ہے -

اشاعرہ کے بعد کے مفکروں کو ان دشواریوں کا احساس تھا - ملا جلال الدین دوانی کا خیال ہے کہ اگر ہم زمان کو ایک قسم کی مقدار فرض کریں جس کی بہ‌دولت یہ ممکن ہو کہ حوادث ایک متحرک جلوس کی شکل میں ظاہر ہو سکیں اور پھر ہم اس مقدار کو ایک وحدت تصور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمان فعالیت الہی کی ایک اصلی کیفیت ہے جو اس فعلیت کے بعد ظاہر ہونے‌والی تمام کیفیتوں پر حاوی ہے - آگے چل کر صاحب موصوف نے فرمایا ہے کہ اگر تواتر زمان کی ماہیت کا ایک عمیق جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تواتر محض اضافی ہے اور ذات الہی کے لیے یہ کوئی چیز نہیں' کیوں‌کہ اُس کے لیے تمام حوادث ایک آن واحد میں حاضر رہتے ہیں - اس نظریے سے ملتا جلتا عراقی کا نظریہ ہے جس کے نزدیک زمان کے مختلف اقسام ہو سکتے ہیں - ٹھوس مادی اجسام کا زمان جو ماضی ' حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' گردش افلاک سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی ماہیت یہ ہے کہ جب تک ایک دن گزر نہیں جاتا' دوسرا دن ظاہر نہیں ہوتا - اس کے بعد

غیر مادی اجسام کا زمانہ ہے جو اگرچہ مادی اجسام کے زمان کی طرح تسلسل کی صفت سے متصف ہوتا ہے' لیکن اس کے مرور کی خصوصیت یہ ہے کہ مادی اجسام کا ایک سال غیر مادی اجسام کے ایک دن کے برابر ہے - اس طرح غیر مادی اجسام کے بلند تر طبقوں سے گزرتے ہوئے اخیر درجے پر ہم زمان الہی تک پہنچیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرور سے قطعی آزاد ہے اور تقسیم' تغیر یا تسلسل کا متحمل ہو نہیں سکتا - وہ ابدیت سے بالاتر ہے اور اُس کی ابتدا ہے نہ انتہا - تمام مرئی اور ممکن‌السماعت چیزوں کا ادراک خدائے تعالیٰ کو ایک واحد اور غیر منقسم عمل میں ہوتا ہے - خدائے تعالیٰ کی اولیت (Priority) زمان کی اولیت کی وجہ سے نہیں مگر زمان کی اولیت خدائے تعالیٰ کی اولیت کی وجہ سے ہے - چنانچہ قرآن حکیم کی رو سے زمان الہی "اُم‌الکتاب ہے" جس کے اندر تمام تاریخ مسبب تسلسل' (Casual Sequence) کے حال سے آزاد ہوکر ایک بالا ابدی آن (Super Eternal now) میں جمع ہو گئی ہے - جاویدنامے میں یہی نکتہ اقبال نے "زروان" (روح زمان و مکان) کی زبانی اُن الفاظ میں ادا کیا ہے :—

من حیاتم من مماتم من نشور من حساب و دوزخ و فردوس و حور

آدم و افرشتہ در بند من است عالم شش روزہ فرزند من است

ہر گلے کز شاخ می چینی منم اُم ہر چیزے کہ می بینی منم

حکمائے اسلام میں امام فخرالدین رازی نے نہایت انہماک کے ساتھ مسئلہ زمان پر غور کیا ہے اور اس سلسلہ میں تمام ہم‌عصر نظریوں کی خوب چھان بین کی ہے - لیکن ان کا نقطۂ نظر بھی زیادہ تر معروضی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکے' جیسا کہ اخیر میں انہوں نے اعتراف کرلیا ہے -

اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ زمان کی ماہیت سمجھنے میں معروضی نقطۂ نگاہ ایک حد تک ہی ہمارا معاون ہو سکتا ہے - صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے شعوری تجربہ ( Conscious Experience ) کا نفسیاتی تجزیہ کریں - ہم جانتے ہیں کہ کائنات زمان کے اندر واقع ہوئی ہے - لیکن چونکہ کائنات ہم سے خارجی حیثیت رکھتی ہے ' اس لیے کائنات کے وجود ہی میں شک و شبہ کی گنجایش ہو سکتی ہے - اب اگر ہم ایک ایسی چیز پر غور کریں جس کے وجود میں کسی قسم کے شبہ کی گنجایش نہ ہو اور جس کی بدولت لمحۂ خالص ( Duration ) کا نظارہ کیا جا سکے تو ہماری مشکل حل ہو سکتی ہے - کائنات کی تمام اشیا کے متعلق جو میرے اردگرد نظر آتی ہیں ' میرا علم سطحی اور خارجی ہے ' لیکن میری اپنی خودی کے متعلق میرا علم داخلی اور یقینی ہے - لہذا شعوری تجربہ وجود کی ایک ایسی صورت ہے جس میں ہم حقیقت سے ہم‌آغوش ہو جاتے ہیں - اس صورت کے تجزیہ کی بدولت ہم اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ وجود کا انتہائی منشا ( Ultimate meaning ) کیا ہے - جب میں اپنے شعوری تجربہ پر اپنی توجہ مبذول کرتا ہوں تو مجھے کیا نظر آتا ہے ؟ برگساں کے الفاظ میں : " میں ایک حالت سے دوسری حالت بدلتا[1] ہوں ؛ میں گرمی محسوس کرتا ہوں یا سردی محسوس کرتا ہوں ؛ میں خوش ہوتا ہوں یا ملول ہوتا ہوں ؛ میں کام کرتا ہوں یا کچھ نہیں کرتا ؛ میں اطراف کی کسی چیز کو دیکھتا ہوں یا کسی اور چیز کا خیال کرتا ہوں ؛ میرا وجود ' احساسات ' تاثرات ' ارادات اور خیالات کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے جو باری باری مجھے مصروف رکھتے ہیں اور میں لگاتار بدلتا رہتا ہوں" - لہذا میری داخلی زندگی میں کوئی چیز ساکن نہیں ؛ جو کچھ ہے وہ ایک مستقل

حرکت ہے ـــــــ مختلف کیفیتوں کی ایک دائمی روانی جو سکون و ثبات سے ناآشنا ہے - زماں کی عدم موجودگی میں مسلسل تغیر کا تصور نہیں کیا جاسکتا ؛ چنانچہ ہماری داخلی زندگی کی تمثیل کی بنا پر شعوری وجود کا مفہوم " زندگی در زماں " ہونا چاہیے - اب شعوری تجربے کی ماہیت پر اگر ایک عمیق نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خودی اپنی داخلی زندگی میں مرکز سے باہر کی جانب حرکت کرتی ہے - گویا اس کے دو پہلو ہیں جنھیں قدرآفریں ( Appreciative ) اور موثر ( Efficient ) کہا جا سکتا ہے - موخرالذکر عملی پہلو ہے جس کی وساطت سے روزمرہ زندگی میں ہم دنیا سے (جسے دنیائے مکانی کہتے ہیں ) ربط پیدا کرتے ہیں - دنیا یعنی خارجی اشیا کے نظامات ہماری گزرنے والی شعوری کیفیتوں کا تعین کرتے ہیں اور ان پر اپنی خصوصیت یعنی ' باہمی بعد مکانی ' کا نقش چھوڑ جاتے ہیں - اس دوران میں خودی اپنے مرکز سے باہر رہتی ہے اس کی وحدت بہ ترتیب متبائن کیفیتوں کی کثرت میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی ہے - غرض موثر (Efficient) پہلو کا زماں وہ زماں ہے جس کا عموماً ہمیں احساس ہوتا ہے اور جس پر طوالت و اختصار کا اطلاق ہو سکتا ہے - دراصل یہ زماں مکانی ہے جس کو ہم ایک خط مستقیم فرض کر سکتے ہیں جو مختلف متصلہ مکانی نقطوں کی ترکیب پر مشتمل ہے - لیکن برگساں کے نزدیک زماں مکانی میں وجود کی ماہیت محض جعلی ہے - شعوری تجربے کا اگر ایک عمیق تجزیہ کیا جائے تو ہمیں قدرآفریں خودی (Appreciative Self) کا پتہ چلتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ زندگی میں خارجی اشیا کے نظامات میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خودی کے اس پہلو کی ایک جھلک کا بھی احساس نہیں ہوتا - گویا خارجی اشیا کے تعاقب میں منہمک ہو کر ہم اپنے اور قدر آفریں خودی (Appreciative Self)

ریاضی تفاعل ( Mathematical function ) کا تصور قایم کیا - کایدات کی تصویر میں تفاعل کا تصور زمان کے عنصر کو داخل کرتا ھے اور قایم ( Fixed ) کو متغیر ( Variable ) میں تبدیل کرتا ھے - خوارزمی نے الجبرا کی بنیاد ڈالی جو دراصل یونانیوں کے خالص مقدار (Pure Magnitude) کے تصور سے خالص اضافت (Pure Relation) کی طرف ایک اقدام تھا - البیرونی نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ضابطۂ ادراج (Formula of Interpolation) کی تعمیم مثلثی تفاعل سے عام تفاعل میں کی - اسی طرح حرکی نقطۂ نگاہ کی ایک او مثال ابن مسکویہ (معاصر البیرونی) کا نظریۂ ارتقا ھے - ابن مسکویہ کے مطابق ارتقا کے ابتدائی مدارج میں نباتات کی نمود و افزایش کے لیے بیج کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ جمادات کے جمود سے ارتقا کی طرف پہلا قدم ھے - بعد کے درجوں میں ان کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوتی ھیں جو خفیف سی حرکت کرسکتی ھیں اور افزایش جنس کے لیے بیج کی ضرورت ہوتی ھے - اس سے بلندتر مدارج میں علی الترتیب جنبش کرنے اور جھومنے کی قابلیت بڑھتی جاتی ھے اور درخت' تنے اور پھلوں کے مالک ہوتے ھیں - اس سے بلندتر مدارج میں ان کی نشو و نما کے لیے بہتر موسم اور بہتر زمین کی ضرورت ہوتی ھے - چنانچہ نباتات میں ارتقا کا اخیر درجہ انگور کی بیل اور کھجور کے درخت ھیں جو گویا اس سرحد پر استادہ ھیں جو نباتی اور حیوانی زندگی کو جدا کرتی ھے......نباتی زندگی سے حیوانی زندگی کی طرف پہلا قدم' ایک مقام سے دوسرے مقام کو حرکت کرنے کی قابلیت سے شروع ہوتا ھے - حیوانی زندگی کے مدارج حاسوں پر مبنی ھیں——لمس کا احساس پہلا ھے اور بصر کا آخری - حاسوں میں اضافے کے ساتھ حرکت کی قابلیت بڑھتی جاتی ھے جیسے بہ ترتیب کیڑوں' چھپکلیوں' چونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کے درجوں سے پایا جاتا ھے - چرپایوں میں حیوانیت کی تکمیل گھوڑے میں اور پرندوں میں باز میں

ہوتی ہے - اخیر درجہ بندر ہے جو بہ لحاظ ارتقا انسان سے ایک درجہ نیچے ہے - اس کے بعد ارتقا نفسیانی تغیرات پر مبنی ہوتا ہے' یہاں تک کہ بشریت جہالت و بربریت سے تہذیب کے درجے کو پہنچتی ہے - لیکن زمان کا حرکی تصور جس طرح ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ سے عیاں ہے' وہ اپنی مثال آپ ہے - سائنٹفک نقطۂ نظر سے تاریخ کا جائزہ لینا کوئی آسان کام نہیں - اس کے لیے وسیع تجربہ' عملی استدلال کی پختگی اور زندگی اور زمان کے متعلق بعض صحیح اور واضح تصورات سے کامل آشنائی ضروری ہے - اُن میں سے دو تصورات نہایت ہی اہم ہیں اور یہ دونوں کے دونوں قرآن حکیم میں موجود ہیں :— ( ۱ ) زندگی کا تصور ایک عضوی وحدت ( Organic Unity ) کی حیثیت سے اور ( ۲ ) زمان کی حقیقت کا ادراک اور زندگی کا تصور زمان میں ایک مسلسل حرکت کے لحاظ سے - ابن خلدون کی دقیقہ رس نگاہوں نے قرآن حکیم کی روح تک رسائی حاصل کی اور جس چیز نے ابن خلدون کو تاریخ جدید کے ابوالابا کے لقب کا مستحق ٹھہرایا ہے وہ زمان کی حقیقت کا ادراک ہے جس کی بہ دولت یہ نظریہ مرتب ہوتا ہے کہ زمان میں مسلسل حرکت کے لحاظ سے' تاریخ ایک ایسی حرکت نہیں جس کی راہ پہلے سے مقررشدہ ہو' بلکہ ایک ایسی حرکت ہے جو خالص تخلیقی ہے - بہت ممکن ہے کہ ابن خلدون برگساں کی طرح اِس تصور کے ذہنی تجزیے کی کوشش کر سکتا' لیکن الٰہیات سے اُس کی بنتی نہ تھی -

تاریخ اسلام میں اقبال پہلا مفکر ہے جس نے ابن خلدون کی طرح زمان کی حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ برگساں سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس مسئلے پر معروضی اور موضوعی' دونوں حیثیتوں سے روشنی

تمانی اور کامیاب طور پر الہیاتی پیچیدگیوں کو حل کیا - اس ضمن میں زیادہتر اس نے فلسفیانہ بحثوں سے کام لیا ہے ' لیکن جہاں کہیں اس نے شاعرانہ زبان میں اس عقدے کو وا کیا ہے وہاں بےاختیار ہماری زبان پر یہ شعر آجاتا ہے :

ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت
کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید!

ذیل کے اشعار سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حقیقت زمان کا احساس اُس کے تخیل پر کس قدر شدت کے ساتھ اثرفرما ہے - حقیقت یہ ہے کہ محض فلسفیانہ ہی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے اس سے بہتر شاعری سمجھ میں نہیں آسکتی -

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات !
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھکو پرکھتا ہے یہ ' مجھکو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات !

---

# علامہ اقبال کی آخری علالت

از

(سید نذیر نیازی صاحب)

سنہ ۱۹۳۴ء کا ذکر ہے - عیدالفطر کا دن تھا — ۱۰ جنوری — لاھور کے ھر گلی کوچے میں خوشیاں منائی جا رھی تھیں - حضرت علامہ بڑی نہایت مسرور تھے - ان کا معمول تھا کہ اس مبارک تقریب پر ھمیشہ احباب کے ساتھ نماز کے لیے تشریف لے جاتے - چودھری محمد حسین صاحب - رات ھی سے کہہ رکھا تھا - ان کے آنے پر گاڑی منگوائی گئی اور حضرت علامہ' چودھری صاحب' جاوید سلمہ اور علی بخش* کے ساتھ شاھی مسجد روانہ ھوگئے -

علی بخش کہتا ہے ۱۰ جنوری کا دن نہایت سرد تھا - صبح ھی سے تیز اور ٹھنڈی ھوا چل رھی تھی - حضرت علامہ لباس کے معاملے میں نہایت بےپروا تھے - سوٹ اسی وقت پہنتے جب کوئی خاص مجبوری ھوتی - گلوبند سے تو خیر انہیں نفرت تھی ھی' موزے بھی استعمال کرتے تو نہایت باریک - بالعموم شلوار' کوٹ اور پگڑی ھی میں باھر تشریف لے جاتے - اس روز بھی ان کا لباس یہی تھا - علی بخش کا خیال ہے کہ حضرت علامہ کو موٹر میں آتے جاتے ھوا لگی - اس پر طرہ یہ کہ جاڑے کی شدت سے دھن یخ ھو رھی تھی - جن حضرات نے شاھی مسجد کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ھیں کہ دروازے سے محراب تک کتنا فاصلہ ہے - حضرت علامہ کو دوبار صحن مسجد سے گزرنا

* حضرت علامہ کا معتمد اور وفاشعار ملازم -

ہوا اور دونوں بار ان کے پاؤں نے سردی محسوس کی - واپس آئے تو حسب عادت سویاں کھائیں - پنجاب میں شیرخرما کا رواج بہت کم ہے - عام قاعدہ یہ ہے کہ سویاں ابال کر رکھ دیں اور پھر جب جی چاہا ان میں دودھ اور شکر کا اضافہ کرلیا - لیکن حضرت علامہ نے اپنے والد ماجد مرحوم کی تقلید میں دودھ کی بجائے دہی استعمال کیا - عید کا دن تو خیر آرام سے گزر گیا لیکن اگلے ہی روز ان کو نزلے کی شکایت ہوگئی - حضرت علامہ کا گلا بچپن ہی سے خراب رہتا تھا - مجھے خوب یاد ہے، آج سے انیس بیس برس پہلے جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت بھی وہ ہر منٹ دو منٹ کے بعد زور زور سے کھنکارتے تھے - ان کا اپنا بیان ہے کہ حکیم فقیر محمد صاحب مرحوم نے انہیں عرصے سے تاکید کر رکھی تھی کہ دودھ اور ہر اس شے سے جو دودھ سے بنی ہو، پرہیز کریں - لہذا اس موقعہ پر بھی انہیں قدرتاً خیال ہوا کہ یہ سردی میں دہی کھانے کا اثر ہے جو دو چار دن میں جاتا رہے گا - لیکن عجیب بات ہے کہ دواؤں کے استعمال کے باوجود انہیں بہت کم فائدہ ہوا - علی بخش معمولاً ان کی خوابگاہ کے پاس ہی بڑے کمرے میں سویا کرتا تھا - وہ کہتا ہے "اس تکلیف کو شروع ہوئے ۱۵ دن گزرے تھے کہ ایک شب کو دفعۃً میری آنکھ کھل گئی؛ اس وقت کوئی دو ڈھائی کا عمل ہوگا - کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب چارپائی پر بیٹھے کھانسی سے بےحال ہو رہے ہیں - صبح تک یہی حالت رہی - اب کی ان کے لیے مسہل تجویز کیا گیا - پھر ایسا ہوا کہ کھانسی تو جاتی رہی مگر گلا بیٹھ گیا" - اس کے بعد ایک نہیں متعدد علاج ہوئے - اطبا اور ڈاکٹروں نے جو تدبیر سمجھ میں آئی، کی - بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ حضرت علامہ بالکل تندرست ہیں لیکن گلے کو ٹھیک نہ ہونا تھا نہ ہوا - معلوم نہیں ان کا مرض کیا تھا کہ اس کے سامنے تمام کوششیں اکارت گئیں -

میں ان دنوں دھلی میں تھا اور ان حالات سے بالکل بے خبر - یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر بہجت وھبی جامعہ ملیہ کی دعوت پر توسیعی خطبات کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے - ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خواھش تھی کہ سال گزشتہ کی طرح ان میں سے کسی ایک کی صدارت حضرت علامہ بھی کریں - یوں بھی جامعہ کا ھر طالب علم ان کی زیارت کا مشتاق تھا - چنانچہ ڈاکٹر ذاکر کی فرمایش پر ایک عریضہ میں نے بھی ان کی خدمت میں لکھا - اس کا جواب موصول ھوا تو میں نے تعجب سے دیکھا کہ والانامہ تو حضرت علامہ ھی کا ھے مگر تحریر کسی دوسرے ھاتھ کی - مضمون یہ تھا :—

"میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ھے - اس لیے ڈاکٹر وھبی کے لیکچر کی صدارت سے معذور ھوں - ڈاکٹر انصاری کا تار بھی آیا تھا ... ڈاکٹر ذاکر کا خط بھی اس مطلب کا آیا ھے - آپ انھیں اطلاع دے دیجیے کا ... لاھور آنے کا ارادہ ھو تو اس وقت تشریف لائیے جب میں اچھا ھو جاؤں" —۱۴ فروری ۳۶ء

اس غیر متوقع خبر کو سن کر مجھے بڑی تشویش ھوئی کیوں کہ حضرت علامہ نے خط صرف اس وقت اپنے ھاتھ سے لکھنا چھوڑا جب نزول الما کی تکلیف سے پچھلے برس ان کے لیے پڑھنا لکھنا تقریباً ناممکن ھو گیا تھا - میں نے خیریت مزاج دریافت کی تو کچھ روز کے بعد اس کا جواب حضرت علامہ نے خود مرحمت فرمایا :—

" ڈاکٹر بہجت وھبی سے مل نہ سکنے کا افسوس ھے - میں کئی دنوں سے علیل ھوں - انفلوئنزا ھو گیا تھا ؛ اب صرف گلے کی شکایت باقی ھے" —۲۷ فروری

بظاھر یہ خط میرے اطمینان کے لیے کافی تھا اور اس کے بعد حضرت علامہ نے بھی اپنی بیماری کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا لیکن آخر اپریل میں جب مجھے کچھ دنوں کے لیے لاھور آنے کا اتفاق ھوا تو میں نے دیکھا کہ حضرت علامہ بدستور علیل ھیں - وہ اس وقت اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی

کی نشستگاہ میں بیٹھے تھے اور ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا - آواز نہایت کمزور تھی، جیسے کوئی سرگوشیاں کرتا ہو - اٹھنے بیٹھنے میں ضعف و نقاہت کا اظہار ہوتا تھا - میں نے باادب عرض کی " ڈاکٹر صاحب یہ کیا ماجرا ہے - میں تو سمجھتا تھا آپ بالکل اچھے ہوں گے " - فرمایا " کچھ پتہ نہیں چلتا - کئی ایک علاج ہوئے لیکن گلے کی تکلیف بدستور قائم ہے - ممکن ہے مقامی خرابی ہو - ممکن ہے نقرس کا اثر " - میں نے زیادہ تفصیل سے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ اول کھانسی تھی، پھر گلا بیٹھ گیا - اس کے لیے غرغرے تجویز ہوئے، دوائیں لگائی گئیں مگر بے سود - آخر رائے یہ ٹھہری کہ ایکس رے (XRay) کرایا جائے - ایکس رے ہوا تو پتہ چلا کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے - چونکہ یہ علامت نہایت خطرناک تھی اس لیے کچھ دنوں کے بعد پھر اس عمل کا تکرار ہوا اور اب کے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے - بہتر ہوگا " ڈاکٹر صاحب " وصیت کردیں - میں نے ان حالات کو سن کر عرض کیا - " کیوں نہ حکیم نابینا صاحب سے مشورہ کر لیا جائے - ۱۹۲۸ میں جب ڈاکٹر صاحبان کی آخری اور قطعی رائے تھی کہ جراحت کے سوا گُردوں کا اور کوئی علاج نہیں تو یہ انھیں کی معجزنما دواؤں کا اثر تھا کہ آپ کو شفا ہوئی " - فرمایا - " عجیب بات ہے مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا - اب تم دہلی جاؤگے تو سب حالات ان کی خدمت میں عرض کرنا - ممکن ہوا تو ایک آدھ روز کے لیے میں بھی چلا آؤں گا " - اس زمانے میں لاہور میں میرا قیام کوئی ہفتہ دو ہفتہ رہا اور میں نے دیکھا کہ طرح طرح کی دواؤں کے باوجود حضرت علامہ کی صحت میں کوئی خاص تغیر نہ ہوا - ایک دن حفیظ جالندھری عیادت کے لیے آئے - میں بھی موجود تھا - انھوں نے مزاج پرسی کی تو حضرت علامہ نے اشارے سے پاس بلا لیا اور پھر اپنا یہ شعر پڑھا ـــ

سخن اے ہم‌نشیں از من چہ پرسی
کہ من با خویش دارم گفت گوئے

ان باتوں کو سن کر اگرچہ ہر شخص کو تشویش ہوئی مگر ان کے نیازمند کیا کر سکتے تھے - ان کے پاس بجز دعا کے اور تھا ہی کیا - غرض کہ میں ان حالات میں دہلی واپس آیا اور آتے ہی حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا - حکیم صاحب قبلہ بڑی عنایت سے پیش آئے - میں نے حضرت علامہ کے مرض کی ساری کیفیت بیان کی تو بہت متردد ہوئے اور پھر دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگے "نیازی صاحب! گھبرائیے نہیں - بیشک 'ڈاکٹر صاحب' کے اعصاب کمزور ہیں اور ان کا قلب بھی ضعیف ہے لیکن مجھے ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق نہیں - آپ انہیں اطمینان دلائیے - میں نسخہ تجویز کیے دیتا ہوں' انشاءاللہ جلد صحت ہوگی "- بس یہ دن تھا جب حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع ہوا اور باوجود طرح طرح کے قیمتی مشوروں اور تدابیر کے جو نئی اور پرانی طب کے ماہرین نے کیں' تا دم آخر قایم رہا - حقیقتاً انہیں جس قدر بھی فایدہ ہوا حکیم صاحب ہی کے علاج سے ہوا اور جب ان کی تدابیر ناکام ثابت ہوئیں تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی -

حضرت علامہ نے حکیم صاحب کی دواؤں کے ساتھ مزید احتیاط یہ کی کہ جدید طریقہ ہائے تشخیص سے برابر امداد لیتے رہتے اور پھر ان کے نتائج سے بلا کم و کاست مجھے اطلاع کر دیتے - میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سب حالات بیان کردیتا - اس اثنا میں ڈاکٹروں نے کئی نظرئیے قایم کیے مگر حکیم صاحب اپنے خیال پر جمے رہے - ان کا ارشاد تھا "ڈاکٹر صاحب کے اعصاب میں برودت ہے - قلب ضعیف

ہے جگر میں حدت پیدا ہو گئی ہے - ان کو ہلکا سا دمہ ہے - ڈاکٹروں نے بلغم کے انجماد کو غلطی سے رسولی سمجھ لیا ہے -" راقم الحروف کو اگرچہ فنی اعتبار سے رائےزنی کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن اتنا مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر لفظی اختلافات سے قطع نظر کر لی جائے تو بعد کے امتحانات سے حکیم صاحب ہی کی تشخیص کم و بیش صحیح ثابت ہوگی - حضرت علامہ ۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۴ کے عنایت نامے میں لکھتے ہیں :—

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلہ صوت (Larynx) ہے ' اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے - اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے - چار ماہ تک علاج ہوا ' کچھ خاص فایدہ اس سے نہ ہوا - جسم کی کمزوری بڑھ گئی ہے - درد گردہ اور نقرس کا حال تو حکیم صاحب کو خود ہی معلوم ہے' بعض ڈاکٹر کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر بھی گلے پر پڑ سکتا ہے - واللہ اعلم " -

پھر فرماتے ہیں :-

"ڈاکٹروں نے مزید معاینہ کیا ہے ...... ایکس رے فوٹو لیے گئے ہیں - معلوم ہوا کہ دل کے اوپر کی طرف ایک نئی (Growth) ہو رہی ہے جس سے (Vocal chord) متاثر ہے - ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج الیکٹرک ہے اور بہترین الیکٹرک علاج یورپ ہی میں ہو سکتا ہے - اس وقت تک تمام اندرونی اعضا اچھی حالت میں ہیں - اندیشہ ہے پھیپڑوں پر اثر نہ پڑے........لیکن میں اس سے پہلے ہی مغربی اطبا کا امتحان کرچکا ہوں - حکیم صاحب سے مشورہ کیے بغیر یورپ نہ جاوں گا - یورپ کے علاج پر روپیہ صرف بھی نہیں کر سکتا"——۲ جون

ابھی میں ان باتوں کو حکیم صاحب کے گوش گزار نہ کرنے پایا تھا کہ اگلی

ہی صبح کو ان کا دوسرا خط موصول ہوا :-

"دو دفعہ ڈاکٹروں نے خون کا معاینہ کیا - پہلی دفعہ خون ہاسلیق سے لیا گیا - اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں زہریلے جراثیم موجود ہیں - دوسری دفعہ انگلی سے لیا گیا اور نتیجہ یہ کہ حالت بالکل نارمل ہے"——۳ جون

میں اس اثنا میں حکیم صاحب کے مشورے سے ایک عریضہ لکھ چکا تھا - اس کے جواب میں فرمایا :-

"آپ کا خط ابھی ملا ہے - الحمد اللہ کہ خیریت ہے - میرے تمام احباب کو تشویش ہے اور معالجوں کو بھی مگر میں خود حکیم صاحب پر کامل اعتماد رکھتا ہوں اور موت و حیات کو اللہ کے ہاتھ سمجھتا ہوں......ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ فوراً لندن یا وی آنا جانا چاہیے...... ان کے نزدیک اس ( Growth ) کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں ہے......کیا آپ نے حکیم صاحب اور اپنے امریکن دوست سے اس کا ذکر کیا؟......کل شام ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر حکیم صاحب کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا دوسرا معجزہ ہوگا" ——۵ جون

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان کے نزدیک حضرت علامہ کا مرض کس قدر خطرناک تھا - لہذا انہیں بار بار مشورہ دیا جا رہا تھا کہ یورپ یا انگلستان تشریف لے جائیں - میں نے حکیم صاحب کی طرف سے ایک تسلی آمیز خط لکھا تو جواب آیا :—

"تشویش صرف اس بات کی تھی کہ دل کے اوپر جو خالی Area ہے وہاں ڈاکٹر ایکس رے کی تصویر سے ایک Growth بتلاتے ہیں جس کا علاج ایکس رے اکسپوژر ( Exposure ) یا ریڈیم ہے جو یورپ ہی

میں میسر آئےگا - اب معلوم ہوا کہ بحث مباحثہ کے بعد ان میں بھی اختلاف ہے "—۸ جون

ویسے حکیم صاحب کی دواؤں سے فائدہ ہو رہا تھا جیسا کہ حضرت علامہ نے اسی والانامہ میں اعتراف کیا - " میری عام صحت بہت اچھی ہے - صرف آواز اونچی نہیں نکل سکتی - میں چاہتا ہوں خود حاضر ہوکر حکیم صاحب کی خدمت میں تمام حالات عرض کروں" -

لہذا ۱۱ جون کی صبح کو حضرت علامہ حکیم صاحب سے مشورہ کی خاطر ایک روز کے لیے دھلی تشریف لائے اور حکیم صاحب نے انہیں دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا - حضرت علامہ بھی نہایت خوش و خرم واپس گئے - اب کے جو دوا تجویز ہوئی اس کے اثرات کے متعلق فرماتے ہیں :—

" آج ساتواں روز ہے - میں صبح کی نماز کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں . ..بلغم ناک کی راہ سے بھی نکلتا ہے .. آواز میں فرق ضرور آگیا ہے مگر نمایاں طور پر نہیں .....گلے میں خارش سی معلوم ہوتی ہے - کہتے ہیں یہ صحت کی علامت ہے - واللہ اعلم ...میرے تمام احباب منتظر ہیں کہ دیکھیں کب ڈاکٹروں کو شکست ہوتی ہے"—۱۹ جون

اب حضرت علامہ کی صحت بتدریج ترقی کر رہی تھی اور لاہور میں اسے طب کا ایک معجزہ تصور کیا جاتا تھا - اسی طرح لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا - گویا سوال حضرت علامہ کی صحت کا نہیں تھا بلکہ قدیم اور جدید کے تصادم کا - حضرت علامہ خود فرماتے ہیں :—

" آواز میں جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں ' فرق آگیا ہے - عجب معاملہ ہے جس سے انسانوں کے ضمیر میں جو کچھ گزر رہا ہے اس کا پتہ چلتا ہے - بعض لوگ میری بیماری سے محض اس واسطے دل‌چسپی کا

اظہار کر رہے ہیں کہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے......
اب کی دفعہ دوا اور زیادہ طاقت‌ور ہو تو اچھا ہے تاکہ معجزے کا
ظہور۔جلد ہو"— ۱۷ جون

مختصراً یہ کہ حکیم صاحب قبلہ کا علاج یہاں تک کامیاب ہو رہا تھا کہ حضرت علامہ نے سفر کا پروگرام مرتب کرنا شروع کردیا۔ روڈز لیکچرز کے سلسلے میں آکسفورڈ سے پہلے ہی دعوت آچکی تھی۔ پھر جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے ان سے تشریف‌آوری کی درخواست کی اور اس کے بعد:—

"جرمنی سے خط آیا ہے کہ ترکی کی طرف سے بھی دعوت آنے والی ہے۔
بہر حال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے
برآور ہرچہ اندر سینہ داری سرودے' نالۂ' آہ و فغانے"—۲۰ جون

لیکن صحت کی اس تدریجی ترقی کے ساتھ حضرت علامہ نے پرہیز کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس معاملے میں ان کا مزاج بڑا نازک تھا۔ یوں وہ کوئی بہت زیادہ کھانے والے نہیں تھے مگر کھانے پینے کی چیزوں میں شاعری تو کرسکتے تھے۔ ان کا برسوں یہ معمول تھا کہ رات کو صرف دودھ دہی پر اکتفا کرتے اور جی چاہتا تو کشمیری چائے بھی استعمال کر لیتے۔ اس موقع پر حضرت علامہ کے نیازمند بالائی کی تقسیم پر خوب خوب لڑا کرتے تھے (بنی ہوئی بالائی نہیں بلکہ بالائی جو عام طور سے دودھ میں ہوتی ہے)۔ ان کا کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا یعنی گوشت میں پکی ہوئی سبزی۔ ناشتہ صرف لسّی یا ایک آدھ بسکٹ اور چائے کا ہوتا اور وہ بھی روزمرہ نہیں۔ خوراک کی مقدار بھی کم تھی اور اس کا اہتمام اس سے بھی کم۔ آخری دنوں میں جب بچوں کی جرمن اتالیق آگئی ہے تو ان کی تربیت کے خیال سے میز کرسی کا انتظام کیا گیا— یہ چیزیں موجود تو تھیں مگر اتفاقی ضروریات کے لیے—

اور حضرت علامہ بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے لگے - مگر پھر دو ہی تین دن میں اپنی عادت سے مجبور ہو جاتے - فرماتے - "علی بخش میرا کھانا الگ لے آؤ" - علی بخش پانی اور چلمچی لیے کمرے میں داخل ہوا - حضرت علامہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور وہیں پلنگ پر نشست جمالی - تولیہ یا رومال زانوؤں پر ڈال لیا - علی بخش نے کھانے کی کشتی سامنے رکھ دی - احباب میں سے اگر کوئی صاحب بیٹھے ہیں تو انہیں نے آپ بھی آئیے کہہ کر کھانا کھانا شروع کردیا ' ہاں اگر کھانے کے بعد پھل آگئے تو وہ باصرار ہر شخص کو ان میں شریک کر لیتے - یہ تھا ان کا کھانا کھانے کا انداز اور ہر چند کہ اس میں تکلف یا اہتمام کو کوئی دخل نہ تھا مگر ان کی رائے تھی کہ جو چیز بھی کھائی جائے خوش مذاقی سے کھائی جائے: اس کا ذایقہ عمدہ ہو' رنگ اور بو خوش گوار ہو - ترشی اور سرخ مرچ انہیں بہت پسند تھی - پھلوں میں آم کے تو وہ گویا عاشق تھے - غذاؤں میں کباب اور بریانی خاص طور سے مرغوب تھی - فرمایا کرتے تھے یہ "اسلامی غذا" ہے - گرمیوں میں برف کے استعمال کو ہر شخص کا جی چاہتا ہے لیکن حکیم صاحب نے گلے کی تکلیف کے خیال سے منع کر رکھا تھا - حضرت علامہ بار بار پوچھتے برف کے متعلق کیا رائے ہے؟ ایک دفعہ لکھا - مکہ شریف سے ایک شخص صراحی لیا تھا اسی میں پانی ٹھنڈا کر لیتا ہوں - مگر جب صحت کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو استفسارات کی بھرمار ہونے لگی - اب مزاج میں بھی لطافت اور شگفتگی آچلی تھی - ایک خط میں لکھتے ہیں :—

"حکیم صاحب قبلہ سے کہیے آپ انصار ہیں' میں مہاجرین میں سے ہوں کیوں کہ میں نے زمانۂ حال سے خیرالقرون کی طرف ہجرت کی ہے روحانی نہیں تو دماغی اعتبار ہی سے سہی - اس واسطے میرا ان پر

حق ہے اور میں ان سے اسی سلوک کا متوقع ہوں جو انصار نے مہاجرین سے کیا تھا......میری عمومی صحت بہت اچھی ہے...... نیند رات کو خوب آئی ؛ البتہ آواز کھلنے کی رفتار سست ہے - آج چلغوزہ کھایا ہے - تازہ انجیر کی تلاش جاری ہے - سردے کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا لیکن ترشی کے لیے ترس گیا ہوں - لیمو کو تو ہاتھ نہیں لگاتا مگر کیا کسی اور قسم کا اچار بھی منع ہے ؟ دہی کی اجازت حکیم صاحب نے دی تھی......ایک روز دہی کا رایتہ کھایا مگر اس قدر میٹھا تھا کہ لطف نہ آیا.....پودینہ اور اناردانہ کی چٹنی کے لیے کیا حکم ہے ؟ "—۲۰ جون

حکیم صاحب قبلہ ان تحریروں کو سنتے اور سن سن کر کبھی ہنستے کبھی مسکراتے - ان کے منہ سے حضرت علامہ کے لیے سینکڑوں دعائیں نکلتی تھیں اور وہ ان خطوں پر اس مزے کی گفتگو کرتے کہ گھنٹہ دو گھنٹے ان کے یہاں خوب صحبت رہتی - ان کا قاعدہ تھا کہ حضرت علامہ کی فرمایشوں کا حتی الوسع خیال رکھتے - مغزیات اور پھلوں کے استعمال کی انھوں نے خاص طور سے ہدایت کر رکھی تھی - یوں بھی ان کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کی غذا نہایت زودہضم اور مقوی ہونی چاہیے مگر معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کبھی کبھی بدپرہیزی بھی کرلیتے - ۲۴ جون کے گرامی نامے میں لکھتے ہیں :—

"آواز میں کوئی فرق نہیں بلکہ ترقی معکوس ہے......اس کے سبب تین ہوسکتے ہیں :— (۱) میں نے دہی کھایا اور لسی پی - (۲) فالودہ پیا (برف ڈال کر) - (۳) دوا کی خوراک بڑھ جانے سے تو ایسا نہیں ہوا ؟ "

ایک دوسرا خط ہے :—

" ہر چیز کے متعلق فرداً فرداً دریافت کیجیے...چائے ' سبزی ' پھل '

گوشت' شربت وغیرہ.. علیٰ ھذا چاول' خشکہ' پلاؤ' شہد'' —— ۲۷ جون

تقریباً یہی انداز طبیعت ان کا دواؤں کے متعلق تھا - دوا جو بھی ہو لطیف ہو' خوش‌ذائقہ ہو' خوش‌رنگ ہو' بو ایسی کہ ناگوار نہ گزرے' خوراک کم اور موثر - لیکن چوں‌کہ حکیم نابینا صاحب کی دوائیں اس معیار پر پوری اترتی تھیں' اس لیے ان سے زیادہ‌تر اختلاف کھانے پینے کی چیزوں میں ہوتا - وہ کہتے ڈاکٹر صاحب کے لیے مغز عصفور یا مغز خرگوش بہت مفید رہے گا - حضرت علامہ فرماتے مغز اور اس کا استعمال؟ معاذ‌اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے تو اس کے دیکھنے ہی سے کراھیت محسوس ہوتی ہے - میں گوشت تو کھا لیتا ہوں مگر دل' گردہ' کلیجی وغیرہ کبھی نہیں کھائی- حکیم صاحب تدبیریں سوچتے - اگر مغز کو شوربے یا چاول میں ملا دیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں چلے گا - میں علی بخش کو الگ خط لکھتا مگر علی بخش کی تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ وہ کوئی کام حضرت علامہ کے خلاف منشا نہ کر سکتا - وہ فوراً کہہ دیتا - نیازی صاحب نے اس طرح کا خط بھجوایا ہے - حضرت علامہ ان باتوں کو سنتے اور سنتے ہی مجھے لکھ دیتے کہ اگر مغز کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے تو کیوں نہ اُس کا جوہر طیار کرلیا جائے!

غرض‌کہ ایک ہی مہینے کے اندر حکیم صاحب کی دواؤں سے وہ فائدہ ہوا کہ حضرت علامہ شدید گرمیوں کے باوجود سفر کے لیے طیار ہوگئے - اب کے قصد سرھند کا تھا اور تقریب اس کی یہ کہ:—

''چند روز ہوے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی - کسی نے پیغام دیا ہم نے جو خواب تمھارے اور امیر شکیب ارسلان کے متعلق دیکھا تھا اسے سرھند بھیج دیا ہے - ہمیں یقین ہے اللہ تعالیٰ تم پر بہت

بڑا فضل کرنے والا ہے۔ مزید بر آں جاوید جب پیدا ہوا تو میں نے عہد کیا تھا کہ ذرا بڑا ہولے تو حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا" —۲۹ جون

چنانچہ ۲۹ جون کی شام کو حضرت علامہ سرہند تشریف لے گئے اور ۳۰ کی شام کو واپس آگئے - تاثرات سفر کے متعلق ان کے بعض عنایت‌ناموں کے اقتباسات یہ ہیں :—

"نہایت عمدہ پاکیزہ اور پرفضا جگہ ہے - انشااللہ پھر بھی جاؤں گا"—۲جولائی

"مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا - بڑا پاکیزہ مقام ہے - پانی اس کا سرد اور شیریں ہے - سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آگیا جس کی بنا حضرت عمر بن العاص نے رکھی تھی - اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں - یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا "—۳ جولائی

رفتہ رفتہ حضرت علامہ کی صحت اس قدر اچھی ہونے لگی کہ ڈاکٹروں کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی-۵ جولائی کا خط ہے :—

"... ...کہتے ہیں کہ ٹیومر یا گروتھ کا نظریہ صحیح نہیں کیوں‌کہ آپ کی صحت اور دوسرے حالات سے مطابقت نہیں کھاتا - اگر ٹیومر یا گروتھ ہوتی تو عام صحت اس قدر اچھی نہ ہوتی بلکہ اس کی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی " -

پھر لکھتے ہیں :—

" یہ بات اب یقینی ہو گئی ہے کہ ٹیومر یا گروتھ نہیں - صرف شاہ‌رگ کا پھیلاؤ ہے ' یا تو خون کے سمی مادوں کی وجہ سے یا نفس کے زیادہ استعمال سے - بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی یہ شکایت ہوجاتی ہے"—۱۱ جولائی

" میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ٹیومر کا نظریہ ایکس رے ہی نے غلط ثابت کر دیا - ڈاکٹر کہتے ہیں گو ٹیومر نہیں تاہم شاہ رگ کا پھیلاؤ ہے اور یہ بھی ایک قسم کا Swelling ہے - ان کی رائے میں یہ مرض خطرناک نہیں لیکن آواز کا طبعی حالت میں عود کرنا مشتبہ ہے......اس کا علاج صرف یہ ہے کہ موجودہ آواز پر اکتفا کی جائے اور شاہ رگ کے مزید پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعے روکا جائے "—۱۳ جولائی

گویا قدیم اور جدید کے درمیان جو تصادم مہینوں سے جاری تھا ' اس کا خاتمہ بالآخر قدیم ہی کی فتح پر ہوا - حکیم نابینا صاحب کے اس اعجاز کا شہر بھر میں چرچا تھا - اس اثنا میں حضرت علامہ خود بھی اظہار تشکر کے لیے دہلی تشریف لائے - ان کی بیماری کو اب کم و بیش چھے مہینے گزر چکے تھے - شروع کے چار مہینوں میں ایلوپیتھک علاج ہوتا رہا - حکیم صاحب کی تدابیر کا نتیجہ یہ تھا کہ :—

"اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس ۹ ماہ کی بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا کیوں کہ اس بیماری نے حکیم صاحب کی وہ ادویہ استعمال کرنے کا موقعہ پیدا کیا جنھوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا کہ تمام عمر میری صحت کبھی ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے" —۲۳ جولائی

لیکن حکیم صاحب کی اس معجزنما کامیابی کے باوجود آواز کا مسئلہ جوں کا توں قایم رہا - اس میں کوئی شک نہیں کہ اب گلے کی حالت بہتر تھی اور آواز بھی نسبتاً بڑھ گئی تھی جیسا کہ حضرت علامہ خود فرماتے ہیں :—

"آواز کچھ روبہ‌صحت معلوم ہوتی ہے مگر اس کی ترقی نہایت خفیف ہے - خدا جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا - میں نے پھیپھڑوں اور

دل کا معاینہ دوبارہ کرایا ہے - سب کچھ درست ہے - حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ آپ کے روحانی اثر کی ضرورت ہے....انگلستان نہ جاؤں گا "—۹ اگست

لیکن آواز کا دھیماپن بدستور قایم رہا - اب حضرت علامہ نے گھبرا کر دواؤں کے متعلق رائےزنی کرنا شروع کردی - "یہ دوا ٹھیک نہیں - اُس دوا سے فایدہ زیادہ معلوم ہوتا تھا - نئی گولیاں کس شکایت کے لیے ہیں - انھیں کھلا کر استعمال کروں ؟ کھلا کر استعمال کرنا تو مشکل ہے - فلاں دوا کی مقدار کیوں نہ بڑھا دی جائے - اس کی کیا وجہ ہے کہ دوسرے ہفتے آواز پر کوئی اثر نہیں پڑا ؟ کیا آپ میرے خط حکیم صاحب قبلہ کو سنا دیتے ہیں ؟ میں سمجھتا ہوں کئی ایک باتیں جواب طلب ہیں - آپ بھول گئے یا حکیم صاحب ہی نے خیال نہیں کیا ؟ " اور ماحصل اس تمام پریشانی کا یہ کہ :—

" دو ماہ میں آواز نے کوئی خاص ترقی نہیں کی اس واسطے ڈاکٹر صاحبان بغلیں بجا رہے ہیں کہ آواز درست نہ ہوگی - میں کبھی کبھی مایوس ہو جاتا ہوں مگر حکیم صاحب کی توجہ اور روحانیت پر بھروسہ رکھتا ہوں "——۱۸ اگست

ایک طرف صحت کی عمدگی کی یہ کیفیت :—

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے مگر تعجب ہے آواز میں کوئی تبدیلی نہیں "—۳ ستمبر

دوسری جانب آواز کی پستی - غرض‌کہ حضرت علامہ گھبرا گئے - ڈاکٹر انھیں یورپ کے سفر پر آمادہ کر رہے تھے لیکن حضرت علامہ کو شاید خود بھی جدید طریقۂ علاج پر کچھ بہت زیادہ اعتماد نہیں رہا تھا - البتہ ڈاکٹروں

کی تلقتھ اور رائٹیزنی کو وہ بڑے غور سے سنتے - ان کے پاس علم تھا' آلات تھے' نظریے تھے' مفروضے تھے اور ان کی تردید کوئی آسان بات نہ تھی - مگر ان کی دواؤں میں کوئی اثر نہ تھا - وہ حکیم صاحب کے ان الفاظ کو سنتے "اعصاب میں برودت ہے اور جگر میں حدت" تو انہیں تعجب ہوتا کہ ان اصطلاحات کا فی الواقعہ کوئی مطلب ہے بھی یا نہیں - مگر حضرت علامہ کہا کرتے - نہ ان کو سائنس کی ترقی سے انکار تھا نہ آلات کی خوبی سے' لیکن وہ دیکھتے کہ حکیم صاحب کی گولیوں میں اثر ہے' طاقت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "رسولی" اور "بڑھاؤ" کے نظریوں کی تغلیط انہیں سے ہوئی تھی - لہذا وہ انگلستان نہ گئے -

میں یہ سب باتیں حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرتا - وہ کہتے آواز کی کشائش کے لیے وقت کی ضرورت ہے - صحت ٹھیک ہوگئی تو گلا اپنے آپ کھل جائے گا - در اصل انہیں آواز کا اتنا خیال تھا بھی نہیں جتنا حضرت علامہ کی عام صحت اور قلب و اعصاب کی تقویت کا - ادھر جب سے لوگوں نے یہ سنا کہ حکیم صاحب کا علاج کامیاب ہوا وہ از رہ خلوص و عقیدت جس نسخے کی تعریف سنتے اس کا ذکر فوراً حضرت علامہ سے کرتے - چنانچہ اب ان کے والا ناموں میں اس قسم کے اشارات ہونے لگے - "ایک صاحب کہتے ہیں اگر جونکیں لگوائی جائیں تو بہت فائدہ ہوگا" - (۲۳ جون)

"میرے مہربان— فرماتے ہیں کہ کشمیر کی پرانی گُل‌قند اس مرض کے لیے اکسیر ہے" (۹ جولائی) - "جراحوں کے ایک پرانے خاندان کے پاس شرطیہ لیپ ہے" (۱۹ جولائی) "مشک کا استعمال کیسا رہے گا؟" (۱۹ اگست) - ۱۸ ستمبر کو لکھتے ہیں :—

"عراق کے ایک ترک طبیب کے پاس شرطیہ علاج ہے - تمباکو میں چرس رکھ کر کھلائی جائے اور شکر کی بجائے گُڑ استعمال کیا جائے"

دو تین روز میں آواز صاف ہو جائے گی"۔

حکیم صاحب قبلہ ان تجاویز کو سنتے اور سن سن کر پریشان ہوجاتے مگر حضرت علامہ کے پاس خاطر سے کبھی آواز کشا گولیاں اور کبھی کوئی لیپ روانہ کر دیتے جن سے شاید فی الحقیقت دفع الوقتی مقصود ہوتی - یوں وہ اپنی دواؤں میں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے کہ آواز کو ترقی ہو لیکن حضرت علامہ تعجیل کے خواہاں تھے - وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلدی ممکن ہو انگلستان تشریف لے جائیں اور روڈز لیکچرز کے سلسلے میں فلسفۂ اسلامی کے تصورات مکان و زمان کی تشریح کر سکیں - ایک مرتبہ انہوں نے پریشان ہو کر لکھا :-

"صحت خدا کے فضل سے بہت اچھی ہے.. زیادہ کیا عرض کروں... آٹھ ماہ کی علالت سے (اور علالت بھی ایسی کہ فی الحقیقت کوئی علالت نہیں) تنگ آ گیا ہوں"— ۳۰ ستمبر

لیکن چونکہ انہیں حکیم صاحب پر اعتماد تھا اور اب ناک سے بھی بلغم کا اخراج ہو رہا تھا ' لہذا حضرت علامہ کو یقین تھا کہ آواز بتدریج مکمل ہو جائے گی - اس اثنا میں انہیں چھینکیں بھی آنے لگی تھیں - اس طرح آواز میں خاصی کشایش پیدا ہوجاتی گو وقتی طور پر سہی - ادھر سینے کی حالت سے ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے بلغم چھن رہا ہے - اس لیے وہ بار بار حکیم صاحب سے کوئی اکسیر طلب کرتے :-

"غرض کہ اب آواز کے لیے کسی ایسے اکسیر کی ضرورت ہے جو بہت جلدی نمایاں اثر کرے اور آج کل ایسا اکسیر سوائے حکیم صاحب کے اور کس کے پاس ہے - اگر نہیں ہے تو ان سے کہیے کہ اپنے طبی ذوق کی گہرائیوں سے پیدا کریں"—۲ اکتوبر

ان دنوں حضرت علامہ نے صرف دو شکایتیں اور محسوس کیں - اول یہ کہ

وسط اگست میں ان کا سر دفعتہً چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا۔ مگر یہ شکایت کچھ دنوں کے بعد خود بخود دور ہوگئی۔ ممکن ہے یہ اولین علامت ہو موتیابند کی جس نے تین سال کے بعد ۱۹۳۷ میں باقاعدہ ظہور کیا۔ ثانیاً یہ کہ ان کے دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد ہوجاتا تھا۔ یہ تکلیف اگرچہ روغن اوجاع کی مالش سے جاتی رہی لیکن سال چھے مہینے کے بعد اس کا دورہ ضرور ہو جاتا۔ مجھے خوب یاد ہے حکیم صاحب کو اس درد کے ازالے کا خاص طور سے خیال تھا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ اس زمانے میں حضرت علامہ کو دن میں ایک آدھ ہچکی سی آجاتی جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چوہخ کی شکل اختیار کرلی۔ مگر ان کے یہ عوارض اس قدر ہنگامی اور بےحقیقت تھے کہ حضرت علامہ نے انھیں کوئی خاص وقعت نہ دی گویا آواز کی پستی کے سوا اب وہ بالکل اچھے تھے۔ ان کو تعجب تھا تو صرف یہ کہ اتنا بلغم کہاں سے آتا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔

صحت کی طرف سے اطمینان ہوا تو حضرت علامہ از سرنو اپنے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ سب سے پہلے انھوں نے سیاحت افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو ''مسافر'' کے زیرعنوان ترتیب دیا اور پھر بال جبریل کی طرف متوجہ ہوئے جس کے بعض اجزا ابھی ناتمام پڑے تھے۔ ۱۹۳۰ میں میں نے ان کے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ لیکن حضرت علامہ کی رائے تھی کہ اردو زبان میں جدید فلسفیانہ مطالب کا ادا کرنا مشکل ہے اور نہ بھی ہو تو انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار جس ایجاز و اختصار سے کیا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ گول میز کانفرنس کی شرکت سے فارغ ہوجائیں تو ان کے زیر ہدایت ترجمہ پر نظر ثانی کی جائے ۔ اب اس کے علاوہ

ایک اور تجویز ان کے ذہن میں آئی - یعنی اپنی چیدہ چیدہ نظموں کے ایک الگ مجموعے کی ترتیب اور ایک ادارۂ نشر و اشاعت کا قیام خالص اسلامی ادب کی تخلیق کے لیے - لیکن مشیت ایزدی میں کسے دخل ہے - ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو مرحومہ والدہ جاوید سلمہ بیمار ہو گئیں اور ان کی بیماری نے ایک تشویش‌ناک صورت اختیار کر لی - اس طرح قدرتاً حضرت علامہ کا ذہن اپنے خانگی امور کی طرف منتقل ہو گیا اور انہوں نے طے کیا کہ تعمیر مکان کا مسئلہ جو پچھلے دو تین برس سے معرض التوا میں ہے' پورا ہوجائے - حضرت علامہ کو دنیوی آسایش اور مال و دولت کی ہوس تو کبھی تھی نہیں ان کی اس خواہش میں بھی دراصل بچوں ہی کے سود و بہبود اور حفاظت کا خیال مضمر تھا - لہذا تھوڑے ہی دنوں میں ایک مناسب قطعۂ زمین میو روڈ پر خریدا گیا اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب سیالکوٹ سے تشریف لے آئے - حضرت علامہ نے اگرچہ میکلوڈ روڈ سے اس وقت تک قدم باہر نہیں رکھا جب تک کوٹھی ہر طرح سے مکمل اور رہنے کے قابل نہیں ہوگئی لیکن ان کی طبع نازک کو یہ سن کر بھی تکلیف ہوتی تھی کہ زمین کی خرید اور عمارت کی طیاری میں کس قدر اهتمام اور سردردی سے کام لینا پڑتا ہے - وہ ان باتوں کو سنتے اور خطوں میں اکثر اپنے تکدر خاطر کا اظہار کرتے -

وصیت کا مسئلہ اس سے پہلے طے ہوچکا تھا اور بعض ضروری ہدایات وہ اپنے معتمد رفیق چودھری محمد حسین صاحب کو دے چکے تھے - ان کے نام ایک خط بھی تھا جو شروع جون میں ڈاکٹروں کی تشخیص کے زیر اثر لکھا گیا - اس میں جاوید سلمہ کی تعلیم اور بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ انہوں نے علی بخش کو چند ضروری ہدایات دی ہیں اور پھر مسلمانوں سے دعائے خیر کی درخواست کی ہے - مسلمانوں کا انھیں کس قدر خیال رہتا تھا ' اس

کا اندازہ ان الفاظ سے کیجیے جو علی گڑھ میں اشتراکیت کے خروج پر انہوں نے مجھے لکھے :—

"Anti-God سوسائٹی کا میں نے کسی سے سنا تھا جس کا مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بےخواب گزری اور صبح کی نماز میں گریہ و زاری کی کوئی انتہا نہ رہی"——۲۵ ستمبر

اس طرح ۱۹۳۴ بہ خیر و خوبی گزر گیا - ۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دھلی سے گزرے اور میں اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی - واپسی پر انہوں نے حکیم صاحب سے ملاقات فرمائی - انہوں نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی -

لیکن جنوری ۱۹۳۵ ع میں سر راس مسعود مرحوم کی محبت نے انہیں بھوپال کھینچ بلایا - ان ایام میں مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے خطبات کا سلسلہ جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام دھلی میں شروع تھا - چنانچہ ڈاکٹر انصاری اور اہل جامعہ نے پھر حضرت علامہ سے درخواست کی کہ ان کے کسی ایک خطبے کی صدارت کرنا منظور فرمائیں - شروع شروع میں تو حضرت علامہ خرابی صحت کا عذر پیش کرتے رہے مگر جب خانم نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا تو ان کے دل میں خود بھی اس بات کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اگر ممکن ہو تو ان سے ملیں - ایک خط میں انہوں نے فرمایا :—

"مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انہوں نے ظاہر کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے ... کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے کلچرل

تصادم میں نبی امی صلعم کی شخصیت اور قرآن پاک نے کیا حصہ لیا' مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کیوں کہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل اثرات کو دبائے رکھا - نیز خود مسلمان بھی دو تہائی سو سال تک یونانی فلسفہ کا شکار ہو گئے—
۲۳ جنوری ۱۹۳۵ ع"

بہر کیف ۳۰ جنوری کی صبح کو حضرت علامہ دہلی تشریف لے آئے اور خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبے کی صدارت کے بعد بھوپال تشریف لے گئے - انھوں نے باتوں باتوں میں خاتون موصوفہ کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ سمجھیں جیسا کہ ان کے خطبات اور بعد کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے -

بھوپال میں حضرت علامہ کا قیام شروع مارچ تک رہا - اس کی عمدگی ہوا اور حسن مناظر کی اکثر تعریف فرمایا کرتے تھے اور اپنے معالجین اور میزبانوں کے خلوص و توجہ کے دل سے شکرگزار تھے - ۵ فروری کے عنایت‌نامے میں لکھتے ہیں :—

"موسم نہایت خوشگوار ہے - طبی معاینے سے جو نہایت مکمل تھا' حکیم صاحب ہی کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی - آج ۱۱ بجے ماورا بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوگا" -

اس دوران میں حکیم صاحب کی دوائیں بند کر دی گئیں تا کہ نئے علاج میں حارج نہ ہوں - اس طرح جو اثرات ان کی صحت پر مترتب ہوئے ان کا مفاد یہ تھا :-

"بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا - کچھ خفیف سا فرق آواز میں ضرور ہے مگر زیادہ وضاحت کے ساتھ ۸ - ۱۰ مرتبہ کے علاج کے بعد

معلوم ہوتا - نبض کی حالت اور علی ھذالقیاس دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے"—۱۲ فروری

۸ مارچ کی صبح کو حضرت علامہ بھوپال سے دہلی تشریف لائے - حکیم صاحب کو نبض دکھلائی اور دو روز عز ایکسیلینسی سردار صلاح الدین سلجوقی قنصل جنرل دولت مستقلہ افغانستان کے اصرار پر قیام فرما کر ۱۲ کی صبح کو لاہور پہنچ گئے - اب حضرت علامہ کا معمول یہ تھا کہ اصل علاج تو حکیم صاحب ہی کا رہا ہاں بیچ میں کوئی ہنگامی شکایت پیدا ہوگئی تو مقامی اطبا یا ڈاکٹروں سے رجوع کر لیا - ان کا خیال تھا کہ آواز کی اصلاح گو دیر میں ہوگی لیکن بہت ممکن ہے' طبی علاج کے ساتھ بجلی کا علاج اور بھی کارگر ہو - لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے میں والدہ جاوید سلمہ کی حالت اور بھی خراب ہوگئی - آخر اپریل میں مجھے لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو میں نے انہیں بہت متردد پایا - ویسے ان کی اپنی صحت بہت اچھی تھی اور آمد شعر کا سلسلہ بھی جاری تھا - چنانچہ از رہ شفقت انہوں نے مجھے اپنے اکثر اشعار بھی سنائے - کہنے لگے اگر کتاب مکمل ہوگئی تو اس کا نام صور اسرافیل ہوگا (یہ وہی مجموعہ ہے جو بعد میں ضرب کلیم کے نام سے شایع ہوا) - ان دنوں انہیں سب سے زیادہ فکر گھر کی علالت کا تھا - میں دہلی واپس آیا تو ان کے والانامون میں زیادہ تر اسی کا ذکر ہوتا - آخر ۲۴ مئی کے مکتوب میں یہ افسوسناک خبر سنی:—

"کل شام والدہ جاوید اس جہان سے رخصت ہو گئیں - ان کے آلام و مصایب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینان قلب کا' اللہ فضل کرے - ہرچہ از دوست می رسد نیکو ست - باقی رہا میں سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی"-

یہ زمانہ حضرت علامہ کے لیے بڑی پریشانی کا تھا - انھیں اپنے نئے مکان جاوید منزل میں تشریف لائے غالباً دوسرا ہی دن تھا کہ بیگم صاحبہ کی ناگہانی موت کا صدمہ پیش آیا - اب سوال یہ تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال' حفاظت اور تربیت کا انتظام کیا ہو - ان کی اپنی طبیعت ناساز تھی - وکالت کا سلسلہ بند ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے - ان کی زندگی میں کسب مال اور حصول منصب کی ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے شہرت و خودداری میں آنکھ اُٹھاکر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا - وہ کسی قسم کے احسان اور منت‌پذیری یا غرض‌جوئی کو تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے - حقیقت میں یہ ملّت کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس نازک موقع پر اعلیٰ‌حضرت نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے تعلق خاطر اور خدمت اسلامی کے جذبے میں خود اپنی جیب سے حضرت علامہ کا ماہوار وظیفہ مقرر کردیا تاکہ وہ حسب خواہش قرآن‌مجید کے حقایق و معارف پر قلم اٹھا سکیں - حضرت علامہ نے اعلیٰ‌حضرت کے اس حسن سلوک کو کبھی فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ ان کے سپاس‌گزار رہے - انھیں دنوں کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

> " اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے میری لائف پنشن پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دی ہے - خدائے تعالی ان کو جزائے خیر دے ؛ انھوں نے عین وقت پر مجھ سے سلوک کیا - اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا "—یکم جون

اس کے بعد اگرچہ متعدد ذرائع سے یہ کوششیں ہوئیں کہ حضرت علامہ مزید وظائف قبول کریں مگر انھوں نے ہمیشہ انکار کر دیا اور یہی کہا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں - مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت دیتے ہیں ' میری ضروریات

کے لیے کافی ہے - حقیقت میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ حضرت علامہ سے اعلیٰ حضرت کا تعلق کیا ہے -

۵ جولائی کو حضرت علامہ تیسرا مہینہ کے لیے پھر بھوپال تشریف لے گئے تاکہ بجلی کا علاج مکمل ہو جائے - بھوپال میں حضرت علامہ کا قیام بالعموم سر راس مسعود مرحوم ہی کے یہاں رہتا اور سر راس مسعود ان کے آرام و آسایش کا اتنا خیال رکھتے کہ خود حضرت علامہ کو بھی تعجب ہوتا - انہوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب انہیں پیٹھ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصلی سبب ضعف قلب ہے لہذا انہیں چاہیے کہ نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں - حضرت علامہ کہتے ہیں "ریاض منزل میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا - میں جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے تاکہ زینہ چڑھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر میں نے اپنے شفیق دوست کی پاس‌داری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی تو میں نے کہا آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں - انہوں نے ''کوئی بات نہیں'' کہہ کر ٹال دیا "- حضرت علامہ کہتے ہیں "اسی دن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے - ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں' آرام سے لیٹے رہیے - میں نے پوچھا کیوں؟ تو انہوں نے بتلایا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے" - اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ سر راس مسعود کے خلوص و محبت کا ان کے دل پر کیا اثر ہوگا - ۱۹۳۷ ع میں جب دفعتاً ان کی موت کا سانحہ پیش آیا ہے تو حضرت علامہ کو بے حد صدمہ ہوا ؛ ان کی

آنکھیں مرحوم کی یاد میں اکثر اشک‌بار ہوجاتی تھیں اور وہ جب کبھی ان کا ذکر کرتے ' درد بھرے دل سے کرتے -

بھوپال سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کی صحت ایک خاص نقطے پر آکر رک گئی - ھنگامی تکلیف کا تو انھیں زیادہ خیال نہیں تھا - کبھی کبھی ڈاکٹر جمعیت سنگھ صاحب تشریف لے آتے اور ان کے دل اور پھیپھڑوں کے معاینے سے اپنا اطمینان کر جاتے - لیکن بجلی کے علاج اور حکیم صاحب کی دواؤں کے باوجود مرض کا استیصال نہ ہوا - اس طرح صحت اور بیماری کے درمیان جو کشمکش مدت سے رونما تھی ' اس کا نتیجہ کبھی کبھی ایک خراب رد عمل کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا - بھوپال سے واپس آکر انھیں ایک حد تک کمزوری کا احساس ہو رہا تھا ' لہذا انھوں نے پھر حکیم صاحب سے فرمایش کی :—

"دوا میں تین چیزوں کا احتاط ضروری ہے (۱) بلغم کا استیصال (۲) قوت جسمانی کی ترقی (۳) آواز پر اثر - اگر صرف قوت جسمانی کے لیے حکیم صاحب کوئی جوہر طیار کریں تو شاید باقی دو باتوں کے لیے مفید ثابت ہو"—۲۷ ستمبر

۱۵ اکتوبر کے کرم‌نامے میں لکھتے ہیں :—

" وہ آنا جانے کا خیال ہے - ڈاکٹر انصاری سے خط و کتابت کر رہا ہوں - انھوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے - اگر گیا تو فروری یا اپریل ۱۹۳۸ء میں جاؤں گا "

لیکن آخر اکتوبر میں جب مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب پر حضرت علامہ پانی‌پت تشریف لے گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے لیے کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنا ناممکن ہے - اس طرح یہ ارادہ ہمیشہ کے لیے ملتوی ہو گیا - لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس سفر کے لیے غیر معمولی

اخراجات کی ضرورت تھی لہذا اس امر کا افسوس رہے گا کہ حضرت علامہ یورپ نہ گئے۔ کیا عجب کہ اس طرح انہیں فایدہ ہی ہوتا!

چونکہ بجلی کے علاج کی تکمیل ضروری تھی اس لیے جنوری ۱۹۳۹ء میں ان کا ارادہ پھر بھوپال جانے کا ہوا۔ بایں ہمہ وہ آخر فروری تک لاہور ہی میں ٹھہرے رہے۔ یہ اس لیے کہ

"ایک ایرانی الفسل سہدزادے کی دوا نے بہت فایدہ کیا۔ کیا عجب کہ آواز بھی عود کر آے۔ اس واسطے میں نے چند روز بھوپال جانا ملتوی کر دیا ہے"۔۔۔ ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

مزید بر آں "قادیانی احراری نزاع" سے متاثر ہو کر حضرت علامہ جن خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کر چکے تھے اب انہیں کا تقاضا تھا کہ ایک مفصل بیان اس قضیے کے متعلق شایع کریں اس لیے کہ پنڈت جواہر لال نہرو جن کو اس مسئلے کی صحیح نوعیت کا مطلق احساس نہ تھا، خواہ مخواہ اس بحث میں کود پڑے تھے۔ حضرت علامہ کا یہ بیان کئی روز کی رد و کد اور کاوش کے بعد مرتب ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ذہنی اعتبار سے مسلمانان ہند اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے ماتحت وہ اس سیاسی عمرانی مسئلے کو فی الواقع سمجھے بھی ہیں یا نہیں جس کی ایک ہلکی سی تمہید حضرت علامہ نے اس بیان میں اٹھائی ہے۔ لیکن اگر ایک زندہ ثقافت کی حیثیت سے اسلام کا کوئی مستقبل ہے—جیسا کہ یقیناً ہے—تو ہماری آیندہ نسلیں ان کے بیش بہا اشارات سے فایدہ اٹھائیں گی۔

بہرکیف شروع مارچ میں حضرت علامہ دہلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جب سے ہزایکسیلنسی سردار صلاح الدین سلجوقی دہلی تشریف لائے تھے حضرت علامہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دہلی سے گزرتے یا آتے

جاتے ہوئے دو ایک روز ان کے یہاں ضرور قیام فرماتے - سردار صاحب موصوف کو بھی ان کی ذات سے عشق تھا اور وہ اپنے جوش عقیدت کو بہت کم مخفی رکھ سکتے - حضرت علامہ روانگی کا ارادہ ظاہر کرتے تو ہزایکسیلنسی کہتے "شام کو تشریف لے جائیے گا - ایک روز اور ٹھہر جانے میں کیا حرج ہے ؟" حضرت علامہ بھی حتی الوسع ان کے پاس خاطر سے کچھ وقت اور ٹھہر جاتے - قنصلخانہ افغانستان کی یہ صحبتیں بڑی دلچسپ ہوتیں - احباب کا مخصوص حلقہ، حضرت علامہ کے ارشادات، ہزایکسیلنسی کی بذلہ سنجیاں— فارسی کا شاید ہی کوئی دیوان ایسا ہو جو انہیں ازبر نہ ہو—اس وقت کسے معلوم تھا کہ ہم لوگ حضرت علامہ کے فیضان صحبت سے اس قدر جلد محروم ہوجائیں گے !

۹ اپریل ۱۹۳۶ع کو حضرت علامہ بھوپال سے لاہور تشریف لائے - یہ بھوپال میں ان کا آخری سفر تھا - ان کی صحت بظاہر نہایت اچھی معلوم ہوتی تھی اور وہ خود بھی ہر طرح سے خوش و خرم اور مطمئن تھے - میں اس زمانے میں دہلی سے لاہور آچکا تھا اور مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں مستقلاً حاضر رہنے کا موقع ملے گا - اس وقت کتنے ارادے تھے جو دل میں پیدا ہوئے مگر افسوس کہ بعد میں واقعات نے سب امیدوں کو خاک میں ملا دیا -

لاہور پہنچ کر حضرت علامہ نے اول ضرب کلیم کی اشاعت کا اہتمام فرمایا اور پھر "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے عنوان سے وہ مثنوی لکھنی شروع کی جو ستمبر ۱۹۳۶ع میں شایع ہوئی - حضرت علامہ فرماتے ہیں "میں بھوپال ہی میں تھا جب ایک روز خواب میں دیکھا جیسے سر سید احمد خاں مرحوم کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور

سرور کائنات صلعم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے - آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا

با پرستاران شب دارم ستیز باز روغن در چراغ من بریز '

پھر چند اشعار حضور صلعم سے عرض احوال میں ہوئے - رفتہ رفتہ ہندوستان اور بیرونی ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے حضرت علامہ کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مثنوی کی شکل اختیار کرلی -

لیکن ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں حضرت علامہ کے نیازمندوں نے دفعۃً محسوس کیا کہ ان کی صحت بتدریج گر رہی ہے - پچھلے دو سالوں میں تو ان میں اتنی ہمت تھی کہ حسب ضرورت آسانی سے چل پھر سکتے ' یہاں تک کہ قنصلخانۂ افغانستان اور دہلی ریلوے اسٹیشن کی بالائی منزلوں کا زینہ چڑھتے ہوئے بھی انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی - اس میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ حرکت کرنے سے ان کا سانس اس وقت بھی پھول جاتا تھا مگر اب تو یہ کیفیت تھی کہ چارپائی سے اُٹھ کر دو قدم چلے اور ہانپنے لگے - نہاتے نہاتے بدن ملا اور دم کشی شروع ہو گئی - بالآخر حکیم صاحب کی خدمت میں اطلاع کی گئی - ان کی دواؤں سے افاقہ تو ہوا لیکن میں دیکھتا تھا کہ حضرت علامہ سے علاج کے بارے میں ایک بڑی کوتاہی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ اس کا دار و مدار محض خط و کتابت پر ہے یا پھر سال چھ مہینے کے بعد ایک آدھ مرتبہ نبض دکھالی - مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت علامہ ابتدائے مرض ہی میں کچھ عرصے کے لیے دہلی تشریف لے جاتے اور حکیم صاحب قبلہ ان کی طبیعت کے روزانہ تغیرات ملاحظہ کرتے تو کیا عجب انہیں سچ مچ شفا ہو جاتی - لیکن میں نے جب کبھی اپنا یہ خیال ظاہر کیا انہوں نے کسی نہ کسی عذر کے ماتحت اسے ٹال دیا - مثلاً ' اب تو بڑی گرمی ہے ' سردیوں میں دیکھا جائے گا '' - سردیاں آئیں تو

فرماتے "موسم خوش‌گوار ہولے تو فیصلہ کروں"۔ در اصل ان کا مزاج اس قدر نازک تھا کہ وہ لاہور سے باہر رہ کر علاج معالجے کے بکھیڑوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے - اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان کی ساری توجہ اپنی صحت بدنی پر مرکوز ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ امر ان کی فطرت سے بعید تھا - مزید بر آں انہیں خیال ہو چلا تھا کہ سن و سال کے اعتبار سے ان کا زمانہ انحطاط کا ہے لہذا حکیم صاحب کی دواؤں سے فایدہ تو ہوگا مگر دیر میں - ہاں البتہ کوئی اکسیر دریافت ہو جائے تو الگ بات ہے - وہ حکیم نابینا صاحب کو بھی اکسیرسازی کی ہدایت کرتے اور حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور کو بھی جن کے فضل و کمال اور قابلیت فن کا انہیں دل سے اعتراف تھا - یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جو شخص بھی ان کے پاس آیا خواہ وہ عامی ہو یا طبیب اور اس نے کسی دوا کا ذکر کیا تو حضرت علامہ اس کی باتوں کو بڑے غور سے سنتے اور بسا اوقات ان کی دواؤں کا امتحان بھی کرلیتے اس امید میں کہ شاید طب قدیم کا کوئی نسخہ فی الواقعہ "تیر بہ ہدف" ثابت ہو - بالفاظ دیگر وہ اپنی حالت پر قانع ہو چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر صحت بالکل ٹھیک نہ ہو تو کیا مضایقہ ہے - انہیں غم تھا تو صرف احتباس صوت کا - بچپن ہی سے ان کی عادت تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے کرتے - ظاہر ہے کہ اب یہ فریضہ اس رنگ میں ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا تھا - اس کا انہیں بےحد قلق تھا -

اپنی علالت کے باوجود خارجی دنیا سے ان کا تعلق ایک لحظے کے لیے بھی منقطع نہیں ہوا بلکہ اس کا سلسلہ آخری وقت تک قایم رہا - اس لحاظ سے وہ ایک یگانہ حیثیت کے مالک تھے - اسلام اور اسلام کے انفرادی اور اجتماعی

نصب لعین کی دعوت میں انہوں نے جن مقاصد کو بار بار اپنی قوم اور دنیا کے سامنے پیش کیا وہ باعتبار فکر و وجدان اس قدر جامع ' اس قدر مکمل اور اس قدر مضبوط و محکم تھے کہ ان کا پیام دن بدن امت کے سینوں میں راسخ ہوتا گیا اور ان کے بڑے سے بڑے تنقیدنگار کو بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ ہوسکی - یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی اجتماعی تحریکات اس وقت جو شکل اختیار کر رہی ہیں ان سے حضرت علامہ کبھی متفق نہ ہوئے مگر ان کی مخالفت' تعصب و تنگ‌نظری اور رجعت‌پسندی کی بجائے جیساکہ بعض تیز طبیعت اہل سیاست کہہ اٹھیں گے ' ایک بہتر' اعلیٰ‌تر اور پاکیزہ‌تر مقصد کا نتیجہ تھی - وہ اپنے ایمان و ایقان ' بالخصوص تخیلات اور فراست و بصیرت سے مجبور تھے اور ان کی قوم اور ان کا وطن کچھ مشرق کے دیرینہ انحطاط اور مغرب کے غیرمعمولی استیلا اور کچھ سیاست و معیشت کے ہنگامی تقاضوں کے جوش میں ان کی عملی روش کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہا - میں نے خود دیکھا ہے کہ ان کی خدمت میں بعض نوجوان بڑے بڑے دعووں کو لے کر حاضر ہوئے لیکن ان کے زور استدلال اور زبردست منطق کے سامنے فوراً ہی خاموش ہو گئے - ان موقعوں پر وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا بجا ہے مگر ہمیں ان سے اختلاف ہے - میرا یہ مطلب نہیں کہ حضرت علامہ سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی یا ان کا طرز عمل بشری کمزوریوں اور سہو و خطا سے پاک تھا - مقصود یہ ہے کہ جو لوگ "جدید" اور "حاضر" اور "عمرانی اور عملی اور علمی" حقایق کا نام لے لے کر ان کے ارشادات کو جذبات و احساسات سے تعبیر کرتے ان کی نگاہیں بجائے خود سطح سے آگے نہیں بڑھیں اور معمولی سی جرح و قدح کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی کہ ان کو نہ ماضی کا علم ہے نہ مستقبل کی بصیرت - حضرت علامہ کا عمل "کمزور" سہی مگر

ان کا خلوص و دیانت تو مسلم ہے - انہوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ اپنی سرگرمیوں پر نفاق اور ظاہرداری کا پردہ ڈالیں - بھلا جس شخص کی نظر خالصاً قرآنی ہو اور جو انسانیت کبری کی اساس نبی امی صلعم کے اسوۂ حسنہ پر رکھے اس کے لیے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ چند علمی (Scientific) اور واقعی (Realistic) بنیادوں کے زیر اثر اخلاق و معاشرت کا کوئی ذاتی اور جماعتی (Private or Public) یا نسلی اور وطنی تصور قبول کرے - لہذا جہاں ان کے اہل وطن نے نقطۂ نظر کے اس اختلاف کے باعث اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ ہمارے ملکی مسائل کا حل ایک دوسری شکل میں بھی ہوسکتا ہے وہاں خود مسلمان بھی ان کے خیالات و ارشادات کی صحیح گہرائیوں کا بہت کم اندازہ کر سکے - یوں دیکھنے میں حضرت علامہ کا تعلق ہر اس تحریک سے قایم تھا جسے وہ اصولاً اور مصلحت وقت یا مجبوری حالات کی بنا پر ملت کے لیے مفید خیال کرتے لیکن چونکہ ان کی حیثیت مقدماً ایک مفکر اور مبصر کی تھی لہذا ان کی سرگرمیاں بیشتر مشورے ' نصیحت ' رائے اور اس کوشش سے آگے نہ بڑھ سکیں کہ ہماری زندگی میں کسی غیر اسلامی عنصر کا امتزاج نہ ہونے پائے - بایں ہمہ یہ کبھی نہ ہوا کہ حیات ملیہ اسلامیہ کا جو نصب العین ان کے ذہن میں تھا اس کے لیے کوئی عملی جد و جہد شروع ہوتی - شاید اس لیے کہ ایسا کرنے میں ابھی ملت کو بہت سے مراحل سے گزرنا ہے اور شاید اس لیے کہ فکر اور عبادت کے درمیان جو فصل ہے وہ محض آرزوؤں سے دور نہیں ہو سکتا - وہ خود فرمایا کرتے تھے I am not every thing (میں سب کچھ نہیں ہوں) حقیقت میں اپنے حدود کا علم جس قدر ان کو تھا شاید ہی کسی دوسرے کو ہو - انہوں نے اپنی وسعت

سے باہر کوئی دعویٰ نہیں کیا اور اس معاملے میں ان کے انکسار اور بے غرضی کا یہ عالم تھا کہ ان کا دامن عمل تکلف اور تصنع سے ہمیشہ پاک رہا - وہ جو کچھ بھی تھے اسی حیثیت میں سب کے سامنے آجاتے - جس طرح اپنے افکار کی تبلیغ میں انہوں نے ادعا سے کام لیا نہ تحکم سے بلکہ ہمیشہ اس امر کے منتظر رہے کہ اگر کوئی شخص ان کی غلطیوں کی تصحیح کرے تو فوراً اسے قبول کر لیں بعینہ انہوں نے اپنی کمزوریوں کو کبھی اس خیال سے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ایسا نہ ہو ان کی قدر و منزلت یا احترام میں فرق آجائے - یہ ان کی گہری روحانیت کا ایک زبردست ثبوت ہے اور ان کی غیرت و خودداری اور عزت نفس کا ایک قابل رشک پہلو کہ انہوں نے اپنی بشریت کے ہر نیک و بد کی ذمہ‌داری خود اپنی ذات پر لی - اس غیر معمولی ہمت اور جسارت کا سبب یہ ہے کہ حضرت علامہ اپنی شاعری اور فلسفہ کے باوجود اول و آخر انسان تھے اور انسانیت ہی کا شرف ان کے مقصود نظر - با ایں ہمہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انہیں اپنی قوم سے بے عملی کے طعنے سننا پڑتے حالانکہ ان کے نکتہ‌چین اس امر کو فراموش کر دیتے کہ ان کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے اور اگر عمل کے معنی ہیں نصب‌العین حیات کے لیے ترغیبات و ترہیبات دنیوی کے باوجود ایک خاص قسم کی سیرت اور کردار کی بالارادہ پرورش تو حضرت علامہ کسی صاحب عمل سے پیچھے نہیں تھے - ان کے ابنائے وقت نے کہا کہ وہ فرقہ‌دار ہیں' شہنشاہیت کی حمایت کرتے ہیں - حالانکہ اس ملک کا فرقہ‌دار اور شہنشاہیت‌پسند طبقہ ان کے انقلاب‌انگیز نظریوں سے ہمیشہ خائف رہا - ان حالات سے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ حضرت علامہ نے ایک قسم کی خاموش' الگ تھلگ اور تنہا زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی اور ان کے نیازمندوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ ان کی متاع عزیز قوم کی

بےحسی اور بے اعتنائی کے باعث کس طرح ضائع ہو رہی ہے - میرا یہ مطلب نہیں
کہ جمہور اسلام کو ان سے جو گہری عقیدت اور والہانہ تعلق تھا اس میں
کوئی فرق آ گیا تھا - ہرگز نہیں - برعکس اس کے جوں جوں لوگ ان سے قریب تر
ہوتے گئے ان کے خلوص و محبت میں اضافہ ہی ہوتا گیا - حضرت علامہ
کا دروازہ ہر شخص کے لیے کُھلا تھا اور ان کی سادگی پسند اور بےریا طبیعت
نے امیر، غریب، اپنے، بیگانے سب کو ایک نظر سے دیکھا - ان کے دار دولت
پر کبھی فرق مراتب یا امتیازات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا - معلوم نہیں
لوگ کہاں کہاں سے آتے اور کیا کیا خیالات اپنے دل میں لے کر آتے - ان میں
عامی بھی ہوتے اور جاہل بھی اور اُن کے ساتھ پڑھے لکھوں کو بھی شریک محفل
ہونا پڑتا - لیکن حضرت علامہ جس کسی سے ملتے بغیر کسی تکلف اور احساس
عظمت کے ملتے - بسا اوقات وہ اپنے ملنے والوں کی گفتگوؤں سے ایک طرح کا
ذاتی تعلق پیدا کر لیتے - لہذا حضرت علامہ کی صحبت سے جو شخص
اٹھتا، ان کے انکسار و رواداری اور وسعت و کشادہ دلی کا ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا -
نوجوانان اسلام اور ملت کے سواد اعظم کا تو خیر وہ سہارا تھے - وہ جو کچھ کہتے
انھیں کی زبان سے کہتے اور جو کچھ سنتے انھیں کے کانوں سے سنتے - انھیں اطمینان تھا
کہ جب تک ہمارے نبی اکرم صلعم کا عاشق اور ہمارے دین کا رازدار ہم میں
موجود ہے ہمیں یاس و ناامیدی کے کتنے بھی سبق دیے جائیں اقبال کا
پیغام اس سے کہیں بڑھ کر خودداری اور خوداعتمادی کی راہیں پیدا
کرے گا - لیکن افسوس یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ہماری قوم کا
بحیثیت قوم کسی عملی جد و جہد کا آغاز کرنا تو در کنار وہ حضرت علامہ کے
ان معمولی ارادوں کا اتمام بھی نہ کر سکی جن کا وہ اکثر اظہار فرمایا کرتے
تھے - مثلاً ایک علمی ادارے کی تاسیس، الٰہیات اسلامیہ کی تجدید، کوئی

ثقافتی مرکز یا معارف ا.لا.یہ کی تحقیق و تفتیش - البتہ یہ ضرور ھے کہ شخصی طور سے ان کی محبوبیت اور غیرمعمولی کشش دن بدن بڑھتی گئی اور ان کی عزت و احترام میں مسلم و غیر مسلم سبھی شریک تھے - حقیقت میں حضرت علامہ کا قیام انسانیت کی ان بلندیوں پر تھا جہاں اختلاف عقائد اور پختگیء مسلک کے باوجود افتراق و تصادم کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا برعکس اس کے محبت خلق میں ھمدردی اور خیرکوشی کی وہ روح پیدا ھوجاتی ھے جو نتیجہ ھے سچی خدا پرستی کا - انہوں نے خود اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں ضبط و خود داری کی منزلیں بڑی احتیاط اور متانت سے طے کی تھیں اور ان کی رسوائی ایک لحظے کے لیے بھی گوارا نہیں کی - لہذا یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس شخص کو بھی ان کا قرب و اتصال حاصل ہوا اس نے ان کی عظمت ذات کا اقرار کیا - دوسری طرف ان کا علم و فضل تھا اور فطرت انسانی کی نہایت وسیع اور گہری معلومات - پھر ان کا ھمہ‌گیر اور اخلاق‌رس تخیل' ان کی ذہانت و طباعی' جذب و اکتساب کی غیر معمولی قوت اور خوب و ناخوب کا نہایت تیز ادراک' یہ اور ان کی وسعت مشرب اور خلوص و للہیت نے ان کو حسن سیرت کی ان رفعتوں پر پہنچا دیا تھا جن کو ھم تہذیب نفس اور شائستگی ذات کے انتہائی مدارج سے تعبیر کرتے ھیں - مشرق و مغرب کی تو خیر وہ رگ رگ سے واقف تھے لیکن اسلامی دنیا میں بجز ان کے اور کون تھا جو ثقافت حاضرہ کے انتہائی ضمیر سے واقفیت کے باوجود اپنی آزادیء ذات' توازن اور رواداری کو قایم رکھے - ان کی قوت تنقید نے حال سے بددلی اور ماضی کے احترام کے باوجود مستقبل کو فراموش نہیں کیا - حضرت علامہ کوئی خیال‌مست شاعر نہیں تھے بلکہ ایک حقیقت‌بیں

مفکر بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ وہ ایک زبردست قوت تھے اور آج جب وہ اس دنیا سے کسی بہتر عالم میں تشریف لے گئے ہیں' ان کی طاقتور اور حیات آفرین شخصیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے -

سلسلۂ کلام کہاں سے کہاں پہنچ گیا - مجھے عرض کرنا چاہیے تھا کہ سنہ ۱۹۳۶ ع کی سردیاں آئیں تو حضرت علامہ کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہو گئی اور سنہ ۱۹۳۷ ع کے اختتام تک صحت کی یہ رفتار برابر قائم رہی - 'اس زمانے میں ایسا بھی ہوا کہ بسا اوقات ان کی آواز نہایت صاف ہو جاتی - علیٰ ہذا تنفس اور بلغم میں بھی کمی تھی - البتہ کمزوری کا احساس باقی تھا - لیکن اس کے باوجود حضرت علامہ پلنگ پر لیٹے رہنے کے بجائے اکثر نشست کے کمرے میں آ بیٹھتے مگر انہوں نے خود پڑھنا لکھنا ترک کر دیا تھا کیوںکہ مارچ یا اپریل سنہ ۱۹۳۷ ع میں موتیابند کی علامتیں قطعی طور سے ظاہر ہوگئی تھیں - بہرکیف اب اُن کی خواہش تھی کہ قرآن پاک کے حقایق و معارف کے متعلق اپنا دیرینہ ارادہ پورا کریں - لیکن سوال یہ تھا کہ کس رنگ میں؛ تفسیر و تشریح یا ابتدائی مطالعہ کے لیے ایک مقدمہ ؟ بالآخر موجودہ زمانے کی اجتماعی تحریکات کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں یہ خیال دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا کہ اس وقت ضرورت اسلام کے نظام عمرانی کی تصریح و توضیح کی ہے - وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی مانند تشکیل جدید فقہ اسلامی پر قلم اتھائیں اور یہ دیکھ کر کہ قرآن پاک نے ان مسائل کی رہنمائی کس انداز میں کی ہے - لیکن اس کے لیے وقت کی ضرورت تھی اور ان حضرات کی بھی جو فقہ اسلامی پر نظر رکھتے ہوے جدید عمرانی رجحانات کو سمجھ سکیں - حضرت علامہ نے اس غرض سے یورپ اور مصر کی بعض نئی مطبوعات بھی فراہم کرنا شروع کردی تھیں لیکن افسوس یہ ہے

کہ اس تصنیف کا کام استقصاے مسائل' ترتیب مقدمات اور تقسیم مباحث سے آگے نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ان کے غور و فکر اور گفتگوؤں کی دنیا میں - آگے چل کر جب وہ اپنی صحت سے ناامید ہوگئے تو اس ارادے کی ناکامی سے اس قدر شکستہ خاطر تھے کہ دو ایک بار فرمایا "میں یہ کتاب لکھ سکتا تو اطمینان سے جان دیتا"۔

'تشکیل جدید فقہ اسلامی' کا ارادہ ملتوی ہوا تو ان کا ذہن جس کی تیزی اور سرگرمی جمود و تعطل کی بجاے دن بدن بڑھتی جاتی تھی' ایک دوسری جانب منتقل ہوگیا - میں نے عرض کیا تھا کہ میں صبح و شام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور گھنٹوں مختلف مباحث پر ان سے گفتگو کرتا - ایک مرتبہ حضرت علامہ نے فرمایا "لوگوں سے بات چیت کرنے میں بہت سے عمدہ خیالات سوجھتے ہیں مگر بعد میں کوئی یاد رہ جاتا ہے اور کوئی نہیں"۔ میں نے خلاف ارادہ عرض کیا کہ میں نے تو اپنی بساط کے مطابق آپ کے ارشادات کا ایک روزنامچہ طیار کر رکھا ہے - کہنے لگے "ایکرمان کی طرح ؟" میں اپنی بےمایگی کے احساس سے خاموش ہوگیا - انہوں نے کہا "اگر تم اپنے ساتھ یادداشت رکھو تو بہت اچھا ہے - میں جس بات کو قلمبند کرنے کے لیے کہوں فوراً قلم بند کر لو" - لیکن ابھی دو ایک باتیں ہی درج یادداشت ہوئی تھیں کہ یہ امر واضح طور سے محسوس ہونے لگا کہ حضرت علامہ کے افادات ایک کتاب کی شکل اختیار کرسکتے ہیں لہذا انہوں نے حکم دیا کہ میں ہر روز عہدنامۂ عتیق یا اناجیل کا کوئی حصہ ان کو پڑھ کر سنایا کروں - یہ مشغلہ کئی روز تک جاری رہا - عہدنامۂ عتیق پر ان کی تنقید بڑے مزے کی ہوتی اور وہ اس کے انداز بیان اور مطالب کا مقابلہ بار بار قرآن پاک سے کرتے - ٠ فی الاصل ان کا خیال تھا کہ نطشے کی کتاب Also Sprach Zarathustra

کی طرح ایک نئی تصنیف What an Unknown Prophet Said یا The Book of an Unknown Prophet کے نام سے مرتب کریں اور اس کے لیے انھیں کسی مناسب ادبی اسلوب کی تلاش تھی -

اس امر کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تشکیل جدید فقہ اسلامی کی طرح اس کتاب کا تصور بھی کوئی عملی شکل اختیار نہ کرسکا - میں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ ۱۹۳۷ع میں حضرت علامہ کی صحت سال گزشتہ سے کہیں زیادہ بہتر تھی - رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے بدن میں ایک قسم کی تازگی اور قوت محسوس کرنا شروع کی - اس سے انھیں پھر امید بندھ گئی کہ شاید کچھ مدت کے بعد سفر کے قابل ہو جائیں - اس خیال کے آتے ہی حکیم صاحب قبلہ سے درخواستیں ہونے لگیں کہ تقویت بدن کے لیے کوئی زوداثر اکسیر ایجاد کریں - ایک خط میں انھوں نے یہ بھی کہا :—

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تن خاکی مرا
ایک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبح ازل
دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی 'روح الذہب'

جب سے حضرت علامہ کا گول میز کانفرنسوں کے سلسلے میں یورپ آنا جانا ہوا تھا بالخصوص سیاحت اندلس اور افغانستان کے بعد ان کے دل میں برابر یہ شوق پیدا ہورہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو بلاد اسلامیہ کا سفر کیا جائے تاکہ دنیائے اسلام کی موجودہ ذہنی کشمکش اور اجتماعی اضطراب کا صحیح اندازہ ہو سکے - ان کا خیال تھا کہ جو لوگ ان ممالک کی سیر کرتے ہیں ان کی قوت مشاہدہ نہایت محدود بلکہ اکثر معدوم ہوتی ہے - لیکن اس سے کہیں بڑھ کر ان کی ایک دیرینہ آرزو تھی اور وہ حرم پاک نبوی کی زیارت - سنہ ۱۹۳۲ع

واپس آتے ہوئے جب وہ موتمر اسلامیہ میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت سفر حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن پھر جیسا کہ انہوں نے خود مجھ سے فرمایا "اس بات سے شرم آتی تھی کہ میں گویا "ضمناً" دربار رسول صلعم میں حاضر ہوں" - خیر اس وقت تو یہ ارادہ پورا ہونے سے رہ گیا مگر ان کے تاثرات دب نہ سکے اور ان کا اظہار اس نظم میں ہوا جو 'ذوق شوق' کے عنوان سے بال جبریل میں موجود ہے - اب ۱۹۳۷ء میں ان کی حالت بہتر ہوئی تو انہوں نے مختلف جہازراں کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کر دی - خیال یہ تھا کہ ۳۸ء میں نہیں تو ۳۹ء میں وہ اس قابل ہوجائیں گے کہ فریضۂ حج کی ادائگی کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض‌یاب ہوں - رفتہ رفتہ انہوں نے عالم تصور ہی میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں طے کر لیں - ادھر وفور شوق نے ان کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور ادھر ان کی زبان جوش و مستی ترانہ‌ریز ہوئی :—

باایں پیری رہ یثرب گرفتم غزل خواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرشام کشاید پر بہ فکر آشیانہ

انہوں نے خیال ہی خیال میں احرام سفر باندھا اور ارض پاک کو روانہ ہو گئے

الا یا خیمگی خیمہ فرو هل ! کہ پیش آهنگ بیروں‌شد ز منزل
خرد از راندن محمل فروماند زمام خویش دادم در کف دل

کبھی وہ عین حرم کعبہ میں اپنی بےتابی کا اظہار کرتے

تنم وا ماند و جانم در تگ و پو ست سوئے شہرے کہ بطحا در رہ او ست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز کہ من دارم ہوائے منزل دوست -

اور کبھی دیار حبیب صلعم میں پہنچ کر ان کی بےچین روح کو تسکین و قرار کی ایک دولت ہاتھ آجاتی

دریں وادی زمانے جاودانی ز خاکش بے‌صور روید معانی
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش کہ ایں‌جا کس نہ گوید لن‌ترانی

اب طبیعت میں آمد کا وہ زور تھا کہ رباعیوں پر رباعیاں موزوں ہوتی چلی گئیں - پچھلے سال کی برسات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز مجھ سے ارشاد فرمایا "نیازی صاحب! ارمغان حجاز کا مسودہ صاف کرنا ہے"۔ عنوان کتاب اور رباعیات—یا قطعات اس لیے کہ اوزان کی رو سے غالباً انھیں قطعات کہنا ہی زیادہ مناسب ہے اگرچہ حضرت علامہ نے خود ان کو رباعیوں ہی سے تعبیر کیا—کا ذکر تو روزمرہ کی صحبتوں میں اکثر آتا رہتا تھا لیکن مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ مسودے کی تبییض کا وقت آ پہنچا - سنہ ۳۶ء سے اشعار کی ترتیب و تسوید کی خدمت حضرت علامہ نے میرے ہی ذمے کر رکھی تھی جس سے مجھے ان کی شاعری کے نفسیاتی پہلوؤں سے اور زیادہ گہرا اتصال پیدا کرنے کا موقع ملا - حضرت علامہ کی یہ آخری تصنیف جو ایک طرح سے حجاز کا خیالی سفرنامہ ہے—فرمایا کرتے تھے "اصل سفرنامہ تو وہ ہوگا جو حرمین پاک کی زیارت کے بعد لکھا جائے گا"—ان کی وفات سے بمشکل ایک ہفتہ پہلے مکمل ہوئی - میرا مطلب اس رباعی سے ہے جو آنے والے "مرد مسلم" کے متعلق انھوں نے درج بیاض کرائی ورنہ صحیح معنوں میں اس تصنیف کو مکمل کہنا غلط ہے کیوں‌کہ رباعیات کی آمد اور ان کی تصحیح و ترمیم، انتخاب اور قطع و برید کا سلسلہ آخر تک جاری رہا - ایک دن جب میں اور چودھری صاحب حسب‌معمول ان کی خدمت میں حاضر تھے تو فرمایا "بیاض لے آؤ اور فہرست مرتب کردو" - قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ لمحے میرے اور چودھری صاحب کے لیے کس قدر تکلیف اور رنج کا باعث ہوں گے - میں نے فہرست کو ترتیب دے کر عرض کیا "اور اردو نظمیں؟" فرمایا

" الگ عنوان دے کر ساتھ ہی شامل کر دو " -

اردو نظموں کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ حضرت علامہ کا مشغلۂ سخن تو ہمیشہ جاری رہتا - وہ اگر چاہتے بھی تو اسے بند نہ کر سکتے تھے - اس سلسلے میں انہوں نے ایک دن خود مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "آمد شعر کی مثال ایسی ہے جیسے تحریک جنسی کی - ہم اسے چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے " - "کہنے لگے میں بلا ارادہ بھی شعر کہہ سکتا ہوں" اور بعض دفعہ ایک ہی شب میں اشعار کی تعداد تین تین سو تک پہنچ گئی - ایک دفعہ سو کر اٹھے تو یہ شعر زبان پر تھا

"دیزہ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلاکو"

اور فرمایا "اس کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا " - غرض کہ ان مثالوں سے آپ ان کے جوش طبیعت کا اندازہ کرسکتے ہیں - 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کے عنوان سے ایک طویل نظم سنہ ۳۶ع میں ہوچکی تھی - اس کے بعد وقتاً فوقتاً یہ مشغلہ جاری رہا اور متعدد قطعات ' نظمیں اور رباعیاں مرتب ہوتی چلی گئیں - بعض اشعار کشمیر اور اہل کشمیر کے متعلق تھے - خیال تھا کہ یہ مجموعہ شاید صور اسرافیل کے نام سے شایع ہو مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا - آخری اردو نظم جو انہوں نے کہی اس کی تاریخ ۷ فروری ۳۸ع ہے ——٦ شعر کا ایک مختصر سا قطعہ جس کا موضوع تھا 'حضرت انسان'-

یوں حضرت علامہ کی علالت کو کم و بیش چار سال گزر گئے - پانچویں برس یعنی ۳۸ع کا آغاز ہوا تو ان کی طبیعت نے یک بیک پلٹا کھایا - میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ سنہ ۳۶ع کے بعد حضرت علامہ پھر کبھی بھوپال نہیں گئے - البتہ اپریل ۳۷ع میں دو ایک روز کے لیے دھلی ضرور تشریف لے گئے تاکہ حکیم صاحب کو نبض دکھا سکیں - ظاہر ہے کہ یہ مرض کے ازالے

کا کچھ بہت زیادہ موثر طریق نہ تھا - معلوم نہیں ان کے آخری عوارض کی ابتدا کب ہوئی لیکن جہاں تک میں اپنی قوت مشاہدہ پر اعتماد کر سکتا ہوں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان کی صحت آخر ۳۷ ع ہی سے گرنا شروع ہو گئی تھی - میں اس زمانے میں حضرت علامہ کو دیکھ کر اکثر گھبرا جاتا - بسا اوقات وہ اس قدر لاغر اور نحیف معلوم ہوتے تھے جیسے ان کے بدن میں خون کا ایک قطرہ نہیں - با ایں ہمہ ان سے جو کوئی بھی خیریت مزاج دریافت کرتا فرماتے "الحمد للہ، بہت اچھا ہوں" - اس زمانے میں حکیم محمد حسن صاحب قرشی نے ان کے لیے چند مرکبات تجویز کر رکھے تھے جن سے فایدہ ہو رہا تھا - لیکن ۳۸ ع کا آغاز ہوا اور 'یوم اقبال' کی تقریب خیر و خوبی سے گزر گئی تو انہیں دفعتاً ضیق النفس کے خفیف سے دورے ہونے لگے اور ایک روز انہوں نے شکایت کی کہ پچھلی رات کا اکثر حصہ بےخواب گزرتا ہے - پھر ایسا معلوم ہوا جیسے گردے کے مقام پر درد ہے - دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی مگر اس کے بعد بتدریج افاقہ ہوتا گیا - رہی نیند کی کمی، سو خیال یہ تھا کہ شاید تبدیلی وقت کی وجہ سے ایسا ہو کیوں‌کہ حضرت علامہ دن کا اکثر حصہ سو لیتے تھے اور بے خوابی کے باوجود تھکن یا بے چینی محسوس نہ کرتے - ضیق النفس کے لیے قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا جس کے استعمال سے فوراً سکون ہو جاتا - ان کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کو دمۂ قلبی (Cardiac Asthma) ہے ضعف قلب کے باعث اور ڈاکٹروں نے اس کی تائید کی - اس تکلیف میں حضرت علامہ اکثر بیٹھے بیٹھے سامنے کی طرف جھک جاتے اور بسا اوقات پائنتی پر تکیہ رکھے اپنا سر اس پر ٹیک دیتے - ایک عجیب بات یہ ہے کہ انہیں ایام میں انہوں نے دفعتاً مایوسی کا اظہار کرنا شروع کر دیا - علی بخش سے اکثر کہا کرتے

تھے "سنہ ۱۹۳۸ع خیریت سے گزر جائے تو سمجھنا کہ اچھا ہوں" - ۲۲ فروری کی شام کو مجھ سے شوپنہار کے متعلق گفتگو کرتے کرتے یک بیک کہنے لگے "نیازی صاحب، اس فلسفہ میں کیا رکھا ہے - کچھ بھی نہیں" - میں سمجھا ان کا اشارہ عقل کی بےمایگی کی طرف ہے - کہنے لگے "ہرگز نہیں - علم کی مسرت کوئی مسرت نہیں - مسرت یہ ہے کہ انسان کو صحت ہو، تندرستی ہو" - اس کے تین روز بعد یعنی ۲۵ فروری کی شام کو انہوں نے ضیق کو روکنے کے لیے حسب معمول جوشاندہ پیا مگر دورے کی شدت میں کوئی افاقہ نہ ہوا - اگلے روز ایلوپیتھک علاج شروع کیا گیا - اس میں کچھ دوائیں غالباً دورے کو روکنے اور کچھ نیند کے لیے تھیں - اس طرح چند روز آرام سے گزر گئے مگر پھر ۳ مارچ کو آخر شب میں ان پر ضعف قلب کے باعث غشی طاری ہو گئی اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے نیچے گر گئے - قریشی صاحب کا قاعدہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد حضرت علامہ کی خیریت معلوم کرنے اکثر جاوید منزل تشریف لے جاتے - اس روز بھی حسن اتفاق سے ایسا ہی ہوا - قریشی صاحب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ کو دمکشی سے بےحد تکلیف ہے - انہوں نے جہاں تک ممکن ہوا اس وقت مناسب تدابیر کیں اور پھر سیدھے میرے ہاں چلے آئے - ان کی اس غیر متوقع تشریف‌آوری سے مجھے ایک گونہ تعجب ہوا لیکن میں دریافت حالات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ انہوں نے خود ہی صبح کے پر خطر واقعہ کا ذکر کیا - کہنے لگے "دل نہایت ضعیف ہے - جگر اور گُردے ماوف ہو رہے ہیں - مگر اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے؛ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا"- میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے کہا "آپ فوراً جاوید منزل چلے جائیے اور حضرت علامہ کی حالت سے مجھے اطلاع دیجیے - میں دوائیں بھجواتا ہوں"-

گویا یہ آغاز تھا حضرت علامہ کے مرض الموت کا لیکن اس وقت بھی ان کے استقلال اور دل‌جمعی کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حسب معمول نہایت اطمینان سے باتیں کرنے لگے - "آج کیا خبر ہے؟ لڑائی ہوتی ہے یا نہیں؟ آسٹریا کا کیا حال ہے؟" دو تین گھنٹے کی حاضری کے بعد جب میں نے یہ دریافت کیا کہ قرشی صاحب سے کیا عرض کر دیا جائے تو مسکرا کر فرمایا "میری طبیعت اس قدر اچھی ہے کہ اگر کسی موضوع پر تقریر کرنا پڑے تو اس کا سلسلہ تین گھنٹے تک جاری رکھ سکتا ہوں"- حضرت علامہ نے یہ الفاظ اس لیے فرمائے کہ انہیں زیادہ گفتگو سے منع کر دیا گیا تھا - طبی اصطلاح میں ان کی نبض اگرچہ "نملی" تھی—چیونٹی کی طرح نہایت ضعیف—لیکن ان کا ذہن برابر صفائی سے کام کرتا رہا - معلوم ہوتا ہے 'اللہ تعالیٰ نے ان کو غیرمعمولی قلب و دماغ عطا کیے تھے - ان کے معالج اگرچہ ابتدا میں گھبرا جاتے تھے لیکن ان کی قوت دماغی سے چند ہی روز کے بعد امید بندھنے لگتی تھی کہ ابھی صحت کے امکانات باقی ہیں - اس سے پھر حضرت علامہ کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ ہر شخص کی طب انفرادی ہے اور دوران علاج میں مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہے -

حضرت علامہ کے تیمارداروں کے لیے یہ دن بڑے اضطراب کا تھا بالخصوص اس لیے کہ شام کو انہیں ذرا ذرا سی دیر کے بعد ضعف قلب کا دورہ ہونے لگتا - ظاہر ہے کہ اس تشویش‌انگیز حالت میں خطوں پر اکتفا کرنا نا ممکن تھا اور اگرچہ حکیم صاحب کی خدمت میں مفصل اطلاع کر دی گئی مگر اب عملاً علاج قرشی صاحب ہی کا تھا - یوں بھی حضرت علامہ انہیں اکثر مشورے کے لیے طلب فرما لیا کرتے تھے اور پچھلے برس سے تو ان کا معمول

ہوگیا تھا کہ ہر دوسرے تیسرے روز جاوید منزل تشریف لے جاتے تھے - حضرت علامہ کو ان کی ذات پر بے حد اعتماد تھا اور وہ ان کی وسعت معلومات اور لیاقت و حذاقت سے متاثر ہو کر اکثر فرمایا کرتے تھے "کہ شمالی ہند میں اب ان کے سوا اور کون ہے ؟ اگر ان کا وجود ایک چھوٹے سے ادارے کی شکل اختیار کرلے تو ہندوستان نہ سہی کم از کم پنجاب میں ہماری طب کو بہت کافی فروغ ہو سکتا ہے" - قرشی صاحب نے بھی جس خلوص اور دلسوزی سے حضرت علامہ کی خبرگیری کی ہے اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ ان کا تعلق محض طبیب اور مریض کا نہیں بلکہ ایک عقیدت مند، دوست اور خدمتگزار کا تھا - وہ ان ایام میں حضرت علامہ کی بیماری کے سوا اور سب کچھ بھول گئے - کتنے مرکبات تھے جو انہوں نے محض حضرت علامہ کے لیے اپنے زیر نگرانی طیار کیے - وہ صبح و شام ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھ کر کبھی دوا کھلاتے کبھی مزے مزے کی باتوں سے ان کا جی بہلاتے - اکثر وہ ان کی ہتھیلیاں سہلانے لگتے اور پھر چپکے چپکے ان کے چہرے اور پانو کا معاینہ کر لیتے — یہ اس لیے کہ ان کو ابتدا ہی سے خیال ہو چلا تھا کہ حضرت علامہ کا رجحان استسقا کی طرف ہے - خود حضرت علامہ کی یہ کیفیت تھی کہ ادھر قرشی صاحب نے جاوید منزل میں قدم رکھا اور ادھر ان کی تمام شکایات دور ہوگئیں - وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "میرا سب سے بڑا علاج یہی ہے کہ حکیم صاحب پاس بیٹھے رہیں" -

لہذا قرشی صاحب کی محنت اور توجہ سے جلد ہی دنوں میں یہ حالت ہوگئی کہ حضرت علامہ کو لحظہ بلحظہ افاقہ ہونے لگا اور بعض دفعہ وہ اپنی خوابگاہ میں چل پھر بھی لیتے تھے - اس اثنا میں حکیم نابینا صاحب کی دوائیں آگئیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر مظفرالدین صاحب ان

سے ضروری ہدایات لینے آئے —— حکیم نابینا صاحب اس وقت حیدرآباد تشریف لے جاچکے تھے —— اس طرح اطمینان کی ایک اور صورت پیدا ہوگئی مگر ان کے بعض نیازمندوں کا خیال تھا کہ اگر قرشی صاحب کے علاج میں ڈاکٹری مشورہ بھی شامل کرلیا جائے تو کیا حرج ہے - ممکن ہے ایسا کرنا مفید ہی ثابت ہو - چنانچہ اب ڈاکٹر محمد یوسف صاحب سے رجوع کیا گیا اور انہوں نے پورے خلوص اور توجہ سے اس امر کی کوشش کی کہ تخفیف مرض کی کوئی صورت نکل آئے - کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر کپتان الہی بخش صاحب سے بھی مشورہ ہوا مگر حضرت علامہ کی اپنی طبیعت کا یہ عالم تھا کہ ایلوپیتھک دواؤں سے بار بار گھبرا جاتے اور ایک خاص میعاد مقرر کرنے کے بعد ان کا استعمال چھوڑ دیتے -

یہاں پہنچ کر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ حضرت علامہ کا مرض فی الحقیقت کیا تھا - قرشی صاحب کہتے ہیں کہ "انہیں عظم و اتساع قلب کی شکایت تھی یعنی دل کے تناسب عمل میں نقص کا پیدا ہو جانا جس سے ان کے عضلی ریشے بڑے ہو کر ڈھیلے پڑ گئے تھے - اس طرح ان کے دل کی عضلی دیواریں دبیز اور ڈھیلی ہو گئیں اور ان کے جوف پھیل گئے - ان کی رائے میں سانس کی تکلیف دمۂ قلبی ہی کی وجہ سے تھی بالفاظ دیگر چوں‌کہ دل کا عمل پورا نہ ہوتا تھا اس لیے یہ تکلیف رونما ہو جاتی"- قرشی صاحب کی رائے تھی کہ "حضرت علامہ کی کھانسی' بول زلالی ' نبض کا ضعیف' سریع اور غیر منظم ہونا یہ سب اتساع قلب کے علامات ہیں - مزید برآں ان کا جگر بھی بڑھا ہوا تھا اور اگرچہ اتساع قلب میں بھی دوران خون کے اختلال کے باعث جگر بڑھ جاتا ہے مگر حضرت علامہ کا جگر پہلے سے ماؤف تھا" - اتنا تو مجھے بھی یاد ہے کہ حکیم نابینا صاحب حضرت علامہ کے جگر کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے-

قریشی صاحب کے نزدیک حضرت علامہ کے گردے بھی متاثر تھے اور ان کو شروع ہی سے خیال ہو گیا تھا کہ استسقا کا خدشہ ہے -

اس کے مقابلے میں ایک دوسری تشخیص یہ تھی کہ حضرت علامہ کو انورسما اور طی (انورزم) یعنی شہ رگ کی رسولی ہے - یہ اس لیے کہ جب ان کا دل کمزور ہوگیا تو خون کے مسلسل دباؤ نے شہ رگ میں جو ربر کے غبارے کی مانند پھیل گئی تھی' ایک گڑھا سا پیدا کردیا جس نے رفتہ رفتہ ایک دموی رسولی کی شکل اختیار کرلی - یہی سبب دقت تنفس کا تھا کیوں کہ قصبۃالریۃ (ہوا کی نالی) پر اس رسولی کا دباؤ پڑتا تھا - اس طرح حضرت علامہ کو مسلسل کھانسی ہوتی رہتی اور انورسما کے باعث چوں کہ آواز کے تورے کھل گئے تھے لہذا ان کا گلا بیٹھ گیا -

حضرت علامہ کے عوارض کی ان دو تشخیصوں کے متعلق—جن کی تفصیل کے لیے میں قریشی صاحب کا ممنون احسان ہوں — اگرچہ راقم‌الحروف کا کچھ کہنا بےسود ہوگا لیکن اتنا ضرور عرض کرنا پڑتا ہے کہ زیادہ تر اتفاق رائے غالباً پہلی تشخیص پر ہی تھا - ۲۱ مارچ کو جب میرے دوست محمداسد وائس (Weiss) حضرت علامہ کی عیادت کے لیے آئے ہیں اور ان کے ساتھ ڈاکٹر زیلسکر بھی تھے تو ان کا (ڈاکٹر زیلسکر کا) بھی یہی خیال تھا کہ حضرت علامہ کو اتساع قلب کا عارضہ ہے اور گلے کی تکلیف مقامی فالج کا نتیجہ - بہرکیف قریشی صاحب کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کو لطیف مقویات اور مفرحات کا زیادہ استعمال کرنا چاہیے اور ان کے لیے مشک' عنبر اور مروارید بہت مفید رہیں گے - ان دواؤں کا فی‌الواقع یہ اثر بھی ہوا کہ حضرت علامہ اگر کبھی تبدیلی علاج بھی کرتے تو ان کا استعمال برابر جاری رکھتے -

بات اصل میں یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی خیالات اور تجربات کی بنا پر طب قدیم کی خوبیوں کے قائل ہو چکے تھے - جدید نظریوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان میں انسان کی حیثیت محض ایک 'شے' کی رہ جاتی ہے اور اس کے نفسیاتی پہلوؤں کا کوئی خیال نہیں کرتا - اول تو ان کی رائے یہ تھی کہ طب کا علم ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم زندگی کی کنہ سے باخبر ہیں جو ظاہرا ایک غلط سی بات ہے - وہ کہتے تھے کہ اگر ایک حد تک طب ممکن بھی ہے تو ہر شخص کی طب دوسرے سے جداگانہ ہوگی کیوں‌کہ ہر انا (Ego) بجائے خود یکتا اور منفرد ہے - چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اس نقطۂ نظر کے ماتحت اٹلی میں ایک جدید طب کی تشکیل ہو رہی ہے - وہ کہا کرتے تھے علم طب نے کیا ترقی کی ہے؟ حالانکہ نوع انسانی کو اس کی ضرورت بدوِ شعور ہی سے محسوس ہو رہی ہے - ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ علم ہوتا یا پھر اس کی ابتدا اس وقت ہوگی جب تمام علوم و فنون کا ارتقا مکمل ہو جائے - لیکن جہاں تک عملی مجبوریوں کا تعلق ہے ان کے لیے دواؤں کا استعمال ناگزیر تھا - مگر وہ ایلوپیتھک دواؤں سے بہت ناراض تھے اس لیے کہ ان میں نہ ذائقے کا خیال رکھا جاتا ہے نہ پسند کا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدمت خلق کی بجائے تجارت کا ذریعہ بن گئی ہیں - ان کے مقابلے میں طبی دوائیں ہیں - کس قدر لطیف اور خوش مزہ! ان سے مسلمانوں کے ذوق جمال اور نفاست مزاج کا پتا چلتا ہے - جب وہ قرشی صاحب کے طیار کردہ خمیرہ گاؤزبان عنبری یا دواءالمسک کو مزے لے لے کر چاٹتے تو اس امر پر افسوس ظاہر کرتے کہ ان کی خوراک کس قدر کم ہے؟

نہ چھے نہ سات فقط تین ماشے! پھر ان کا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ درد گردہ کی شکایت جو انھیں مدت سے تھی ' حکیم نابینا صاحب ہی کے علاج سے دور ہوئی اور سنہ ۳۴ء میں جب ڈاکٹروں نے بار بار ان کی صحت سے مایوسی کا اظہار کیا تو یہ حکیم صاحب ہی کی دوائیں تھیں جن سے امید کی ایک جھلک پیدا ہوئی اور وہ کم و بیش چار برس تک اپنے مشاغل کو جاری رکھ سکے - دوران علاج میں حضرت علامہ نے بارہا اس امر کا مشاہدہ کیا کہ جدید آلات سے بالآخر انکشافات نبض ہی کی تصدیق ہوئی - لہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ ان کا اعتماد قدیم دواؤں پر دن بدن بڑھتا گیا - وہ کہا کرتے تھے ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ٹھیک ثابت ہو رہے ہیں - آج کل کی دواؤں کا کیا ہے ' اِدھر ایجاد ہوئیں اُدھر متروک۔

۱۷ مارچ کے بعد جب سے طبی علاج از سرنو شروع ہوا حضرت علامہ کی صحت میں خفیف سا مد و جزر پیدا ہوتا رہا - اس خیال سے کہ اگر ان حالات کی اطلاع عام ہوگئی تو شاید لوگوں کی عقیدت مندی ان کے آرام میں حارج ہو حضرت علامہ کی خرابی صحت کی خبر مخفی رکھی گئی - ان دنوں معمول یہ تھا کہ حضرت علامہ کے متعدد احباب کے علاوہ ہم لوگ یعنی چودھری محمد حسین ' راجہ حسن اختر ' قرشی صاحب اور راقم الحروف صبح و شام حضرت علامہ کی خیریت معلوم کر آتے اور پھر رات کو باقاعدہ ان کی خدمت میں جمع ہو جاتے - یا پھر ( انٹر کالیجیٹ مسلم برادرھڈ کے صدر ) محمد شفیع صاحب جاوید منزل ہی میں اُٹھ آئے تھے تاکہ حضرت علامہ کی دیکھ بھال اور دواؤں کا خیال رکھیں - خدمت گزاری کے لیے علی بخش اور دوسرے نیازمند موجود تھے - علی بخش بیچارا تو کئی راتیں سویا ہی نہیں - حضرت علامہ کو دن میں تو نسبتاً آرام رہتا تھا اور وہ کچھ وقت سو بھی لیتے لیکن رات کو ان کی تکلیف

بڑھ جاتی - کبھی اختلاج ہوتا ' کبھی ضعف ' کبھی احتباس ریاح - ضیق کے دورے بالعموم پچھلے پہر میں ہوتے تھے اور شفیع صاحب کو اس کی روک تھام کے لیے خاص طور سے جاگ جاگ کر دوائیں کھلانا پڑتیں - علی بخش' رحما' دیوان علی—حضرت علامہ کے ملازمین—(اور احباب) ان کا بدن دباتے - جب رات زیادہ ہوجاتی تو چودھری صاحب اور راجہ صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتے تاکہ حضرت علامہ سو جائیں - اس وقت قرشی صاحب اور بھی زیادہ قریب ہو بیٹھتے اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے - کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت علامہ دیوان علی سے بلھے شاہ کی کافیاں یا پنجابی گیت سنتے اور مجھ سے فرماتے کہ "میں بغداد یا قرطبہ کا کوئی ایسا افسانہ بیان کروں جس سے ان کو نیند آجائے" - اس طرح کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ کی طبیعت یہاں تک سنبھل گئی کہ راجہ صاحب سے (سرکاری مشاغل کی مجبوریوں کے باعث) ناغے ہونے لگے اور قرشی صاحب سے دوا اور غذا کے متعلق چھیڑچھاڑ شروع ہوگئی - حضرت علامہ ان سے ہر دوسرے تیسرے روز اس امر کی خواہش کرتے کہ ان کی غذا کی فہرست میں اضافہ ہو تاکہ انتخاب میں سہولت رہے - ایک مرتبہ کہنے لگے "پلاؤ کھانے کو بہت جی چاہتا ہے" - قرشی صاحب نے کہا آپ کھچڑی کھا لیجیے - فرمایا " بھلی ہوئی ؟ کافی گھی کے ساتھ ؟" انھوں نے کہا " نہیں' گھی کم ہونا چاہیے کیوں‌کہ آپ کا جگر بڑھا ہوا ہے" - حضرت علامہ کہنے لگے " تو پھر اس میں کیا لذت ہوگی - اس میں دہی کیوں نہ ملالی جائے " - قرشی صاحب بولے " مگر آپ کو کھانسی ہے .... دہی مُضر ہے " - فرمایا " تو پھر اس کھچڑی سے نہ کھانا اچھا ہے" - بقول قرشی صاحب آخری ایام میں ان کی قوت تنقید بہت بڑھ گئی تھی اور مزاج میں بےحد ذکاوت اور نفاست پیدا ہو چلی تھی - اس لیے ان کے سوالات کا جواب دینا کوئی آسان بات نہ تھی - بعض دفعہ

وہ (قریشی صاحب) خود بھی پریشان ہو جاتے - اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ ان کی بعض علامات دوسرے اسباب کے نتیجے ہیں تو وہ اس شدت سے جرح کرتے کہ جواب بن نہ پڑتا - ان کا اصرار تھا کہ ہر بات ٹھیک ٹھیک بیان کی جائے - ۱۶ اپریل کی شام کو جب راجہ صاحب اور سید عابد علی حسب معمول تشریف لائے اور ان سے مصلحتاً یہ کہا گیا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو حضرت علامہ بہت خفا ہوئے - کہنے لگے "میں جانتا ہوں یہ باتیں تعلق خاطر کی بنا پر کہی جاتی ہیں' مگر اس طرح سننے والے غلط رائے قایم کر لیتے ہیں" - دواؤں کے متعلق بھی ان کا کہنا یہ تھا کہ میں انہیں صحت کے لیے استعمال نہیں کرتا بلکہ اس لیے کہ شدت مرض سے میری خودی (Ego) کو نقصان نہ پہنچے " -

باایں ہمہ ان کے اخلاق عالیہ اور کمال وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمول اور روزمرہ زندگی میں انتہائی تکلیف کے باوجود کوئی فرق نہ آیا - وہ اپنے ملنے والوں سے اسی خندہ‌پیشانی اور تپاک سے ملتے جس طرح تندرستی میں ان کا شیوہ تھا بلکہ اب انہوں نے اس بات کا اور بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا کہ ان کی تواضع اور خاطرداری میں کوئی فروگزاشت تو نہیں ہوتی - صحت کی اس گئی گزری حالت میں بھی وہ اگر کسی کے کام آ سکے تو اس سے انکار نہیں کیا اور اپنی قوم کے معاملات میں جہاں تک ممکن تھا' حصہ لیا - انہیں اپنے احباب کے جذبۂ خدمت‌گزاری کی بڑی قدر تھی اور انہوں نے اپنی خلوتوں میں اس کا اظہار بھی کیا - ایک شام جب وہ انتہائی کرب کی حالت میں تھے علی بخش نے بےاختیار رونا شروع کر دیا - ہم نے اسے تسلی دی تو فرمایا "رونے دیجیے تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے - جی ہلکا ہو جائے گا "-

حضرت علامہ ایک زندہ انسان تھے اور آخر وقت تک صحیح معنوں میں

زندہ رہے - وہ اپنے ارد گرد کی زندہ دنیا کو ایک لحظے کے لیے بھی فراموش نہ کر سکے - برعکس اس نے یورپ اور ایشیا کے ایک ایک تغیر کا حال پوچھتے اور اپنے مخصوص انداز میں اس پر رائےزنی کرتے - لوگوں نے صرف اتنا سنا کہ آسٹریا کا الحاق جرمنی سے ہو گیا ہے - حضرت علامہ نے فرمایا "وسط ایشیا میں ۴ کروڑ ترک آباد ہیں - اتحاد اتراک پر اس کا اثر کیا رہے گا"- اس زمانے میں اٹلی اور برطانیہ کے درمیان گفت و شنید ہو رہی تھی - حضرت علامہ اس کی ایک ایک تفصیل کو سنتے اور فرماتے " اگر اٹلی نے فی الواقع انتدابیوں سے مصالحت کرلی جیساکہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے تو بلاد اسلامیہ کو مجبوراً روس کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑے گا - اس طرح سیاسیات عالم پر ان کے سبق‌آموز تبصروں کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار و افکار اور ارشادات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا - اپنی وفات سے دو روز پہلے وہ وجیہ صاحب کے بعض احباب سے شاعر کی ملی حیثیت اور اسلامی فن تعمیر پر فلسفیانہ بحث کر رہے تھے - ان کی گفتگوئیں لطف و حرارت سے کبھی خالی نہ ہوئیں اور اس کی جولانیاں مرتے دم تک قایم رہیں - علی بخش اور چودھری صاحب کی چھیڑ چھاڑ مدت سے چلی آتی تھی - ایک روز چودھری صاحب کہنے لگے "علی بخش کی مونچھوں کو دیکھتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں آخر ان کا رنگ ہے کیا ؟ جس بال کو دیکھیے دوسرے سے مختلف" - حضرت علامہ برجستہ کہہ اٹھے "میچھنٹی" -

ان کا یہ کہنا کہ دواؤں کا استعمال فائدے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اس لیے کرتا ہوں کہ میری خودی (Ego) کو نقصان نہ پہنچے ' لفظ بلفظ صحیح تھا اور معلوم نہیں اس میں دواؤں کو فی‌الواقع کوئی دخل تھا بھی یا نہیں - بہر حال انھوں نے اپنی قوت ادراک اور ذہن کی بیداری کو

جس طرح واضح طور پر قایم رکھا اسے دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا - ایک رات جب ہم لوگ اس کوشش میں تھے کہ حضرت علامہ سو جائیں ' دیوان علی نے گانا شروع کیا اور گاتے گاتے سہ حرفی ہدایت اللہ کے چند اشعار پڑھ ڈالے - اس پر حضرت علامہ یکبارگی اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے " چودھری صاحب اسے کہتے ہیں بحرفے اُمتے را می تواں کشت "- چودھری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں سر پر ہاتھ پھیرا اور 'ہوں' کہہ کر خاموش ہوگئے - حضرت علامہ فرما رہے تھے " مشرق کیا ایک طرح سے ساری شاعری کا پس منظر یہی ہے "- میں نے عرض کی کہ ہدایت اللہ نے موت و سکرات کا جو نقشہ پیش کیا ہے خلاف واقعہ تو نہیں - خود سورۂ ق میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - حضرت علامہ نے جواب میں فرمایا - " مجھے حقائق سے انکار نہیں - انکار حقائق کی تعبیر سے ہے " اور پھر اپنی وہ رباعی لکھوائی جس پر سول ملٹری گزٹ کے کالم سیاہ ہوتے رہے - بایں ہمہ اس کا مطلب بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آیا - رباعی تھی :—

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست بہشتے بہر پاکان حرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

( آخری رباعی اس کے چند روز بعد ہوئی )

حضرت علامہ نے اپنی بیماری کا مقابلہ جس ہمت اور استقلال سے کیا اس کو دیکھ کر ان کے تیماردار تو کیا معالجین کو بھی خیال ہونے لگتا تھا کہ شاید ان کا وقت اتنا قریب نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے - بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت علامہ نے ایک لحظے کے لیے بھی مریض بننا گوارا نہیں کیا - وہ مریض ضرور تھے مگر انھیں مریض کی حیثیت میں زندہ رہنا منظور نہ تھا - ایک دفعہ جب ان کی غذا و دوا اور آرام میں خاص

اہتمام ہونے لگا تو فرمایا "اس طرح کی زندگی گویا زندگی سے بغاوت کرنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں دنیا کے قابل نہیں رہا"۔ تکلیف کی حالت میں انہیں بے شک تکلیف ہوتی مگر ادھر اس کا احساس کم ہوا اور ادھر ان کی ساری شگفتگی عود کر آئی۔ اب ان کی باتوں میں وہ لطف اور دل‌چسپی پیدا ہو جاتی جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں تھے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان کی طویل علالت نے ان کے ذہن پر کوئی اثر نہ کیا۔ انہیں کوئی اندیشہ تھا نہ پریشانی۔ ان کے پاس‌ناآشنا دل میں اضطراب اور خوف کی ہلکی سی جھلک بھی پیدا نہ ہوئی۔ گویا موت و حیات کے متعلق جو دلیرانہ اور جرأت‌آموز رویہ انہوں نے عمر بھر اختیار کر رکھا تھا آخر تک قایم رہا۔ اس لحاظ سے وہ فی‌الواقع خودی کے پیغمبر تھے۔ موت سے ان کی بے خوفی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ جب ان کے معالجین کی بے بسی صاف صاف نظر آنے لگی اس وقت بھی ان کو مکروہات دنیوی کا مطلق خیال نہ آیا۔ چنانچہ آخری شب میں انہوں نے جو نصیحت جاوید سلمہ کو فرمائی اس کا ماحصل بھی یہ تھا "میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں تم میں 'نظر' پیدا ہو"۔ ایک دن جب انہیں درد کی شدت نے بےتاب کر رکھا تھا مجھ سے کہنے لگے "اللہ ہی اللہ ہے"۔ میرے پاس ان الفاظ کا کیا جواب تھا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ انہوں نے پھر فرمایا "یاد رکھو اللہ کے سوا اور کچھ نہیں"۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت ان کا ذہن وجود و عدم کے عقدوں سے الجھ گیا تھا اور ان کا اشارہ حضرت بایزید بسطامی* کے اس ارشاد کی طرف تھا جس کا ذکر انہوں نے 'تشکیل جدید' میں بھی کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک دن حضرت کے حلقے میں تخلیق کا مسئلہ زیر بحث

*حضرت بایزید بسطامی یا حضرت ابو سعید ابوالخیر' اس وقت میرا حافظہ ٹھیک کام نہیں کرتا۔

تھا - ان کے کسی مرید نے کہا "جب کچھ نہیں تھا تو صرف خدا تھا"۔ حضرت بایزید فوراً بول اٹھے "اور اب کیا ہے ! اب بھی صرف خدا ہے"۔

رہی اسلام سے ان کی شیفتگی سو اس کے متعلق کیا عرض کیا جائے - یہ داستان بڑی تفصیل چاہتی ہے - وہ اس کے مستقبل یا خود ان کے اپنے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کے 'مقدر' (Destiny) سے ایک لحظے کے لئے بھی مایوس نہیں ہوئے - عالم اسلامی کے جدید رجحانات ظاہرا کس قدر یاس‌انگیز ہیں لیکن ان کی رجائیت میں سرمو فرق نہ آیا - اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص بصیرت عطا کی تھی - لوگ ان کے پاس آتے اور بےچین ہو کر مادیت و وطنیت کے اس سیلاب کی طرف اشارہ کرتے جو بلاد اسلامیہ میں ہر طرف پھیل رہا ہے - حضرت علامہ فرماتے تمہاری نگاہیں قشر پر ہیں - اپنے ایمان کو مضبوط رکھو اور منتظر رہو کہ انسان کے اندرون ضمیر سے آخر کس چیز کا اظہار ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ عین اس وقت جب سیاست حاضرہ کی دسیسہ‌کاریوں سے عوام اور خواص تو کیا بڑے بڑے حجرہ‌نشیں اور عبادت‌گزار بھی محفوظ نہ رہے' حضرت علامہ کے پائے استقامت کو جنبش تک نہ ہوئی - ایک سہ‌پہر کا ذکر ہے - حضرات سالک و مہر بھی موجود تھے اور زعیم ترکی کی غیرمعمولی فراست کے متعلق باتیں کر رہے تھے - کسی نے کہا اتحاد شرق کا خیال نہایت مستحسن ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگورہ' کابل اور طہران کا میثاق اتحاد اسلامی کا نتیجہ ہے - حضرت علامہ نے فرمایا "بے شک' مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کی تکمیل کا راستہ اسلام ہی نے صاف کیا"۔ البتہ ایک حقیقت‌آشنا مبصر کی طرح وہ اس بات کو خوب جانتے تھے کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کی حالت کیا ہے اور ان کے ذہنی

اور اخلاقی انحطاط کا انہیں بڑا دکھ تھا - اکثر ایسا ہوتا کہ ہم لوگ رات کو انہیں اچھی حالت میں چھوڑ کر آتے مگر صبح جب قرشی صاحب پھر ان کی نبض دیکھتے تو ضعف و نقاہت کی انتہا نہ ہوتی - دریافت کرنے پر پتہ چلتا کہ حضرت علامہ ملت کی زبوں حالی پر دیر تک روتے رہے - انہیں جدید زمانے کے ان الحادپرور نظریوں سے بیحد تکلیف ہوتی تھی جو اندر ہی اندر ہمارے جسد ملی کو کھائے جا رہے ہیں مگر اس پر انہوں نے 'درویشانہ' خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ آخر دم تک ان کا مقابلہ کیا یہ اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ قوم اور ملت کی مہر اسلامی طریق پر انہوں نے اپنا بیان اس وقت لکھوایا جب رہ رہ کر ضعف اور اختلاج کے دورے ہو رہے تھے اور قرشی صاحب کو خطرہ تھا کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پر نہ پڑے - ان ایام میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے :—

حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمز دیں را

ایک رات انہوں نے یہ شعر پڑھا :—

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب بر دل ما آمد و آئینہ ما از ہمہ گوہر شکست

اور اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کے نیازمندوں کو اضطراب ہونے لگا - وہ کہا کرتے تھے "میں نے اسلام کے لیے کیا کیا ؟ میری خدمت اسلامی تو بس اس قدر ہے جیسے کوئی شخص فرط محبت میں سوتے ہوئے بچے کو بوسہ دے" - ایک دن مجھ سے حدیث رسول صلعم پر گفتگو فرما رہے تھے - جب حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالت مآب صلعم اپنے بعض اصحاب کے ساتھ اُحد پر تشریف لے گئے اور اُحد کانپ اٹھا تو حضرت علامہ کہنے لگے "یہ محض استعارہ نہیں" اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ایک ایک لفظ پر زور

دیتے رہے Mind you! It is no metaphor" (یاد رکھو یہ محض استعارہ نہیں)"۔ انہیں حضور سرور کونین صلعم سے کچھ ایسا عشق تھا کہ آپ کا ذکر مبارک آتے ہی ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرط ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حضور صلعم کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں۔

اس دوران میں مرض الموت کی رفتار کچھ عجیب سی رہی۔ اول استسقا کا حملہ ہوا جس سے چہرے اور پانو پر ورم آگیا۔ اب پیٹھ کے درد سے بھی خاصی تکلیف رہتی تھی اور حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ "میری دواؤں کی آزمایش اس میں ہے کہ پیٹھ کا درد جاتا ہے کہ نہیں"۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ان علامات میں تخفیف ہونا شروع ہو گئی حتے کہ قرشی صاحب ایک خاص مجبوری کے باعث دو روز کے لیے راولپنڈی تشریف لے گئے۔ لیکن اگلے ہی روز بیماری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ حضرت علامہ کے بائیں جانب تمام جسم پر ورم پھیل گیا۔ اس حالت میں ڈاکٹر جمعیت سنگھ صاحب کو بلوایا گیا۔ انہوں نے معاینے کے بعد قطعاً مایوسی کا اظہار کیا اور دو ایک باتیں حضرت علامہ سے بھی صاف صاف کہہ دیں۔ بایں ہمہ حضرت علامہ مطلق پریشان نہ ہوئے بلکہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو سن کر انہوں نے اس طرح سوالات کرنا شروع کر دیے جیسے کسی امر کی تنقیح مقصود ہو۔ ڈاکٹر صاحب گئے تو ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے کوشش کی کہ دو چار کلمات تسلی کے کہیں مگر حضرت علامہ الٹا ان کی تسکین خاطر فرماتے ہوئے کہنے لگے "میں مسلمان ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا"۔ اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا:—

نشان مرد مومن با تو گویم        چو مرگ آید تبسم بر لب او ست

تیسرے پہر ڈاکٹر جمعیت سنگھ پھر تشریف لائے - ڈاکٹر یارمحمد خاں صاحب بھی ساتھ تھے - شام کو کپتان الہی‌بخش صاحب بھی آگئے اور باھمی مشورے سے دواؤں اور انجکشنوں کی تجویز ہونے لگی - دوسرے دن قرشی صاحب بھی پہنچ گئے - اب ہر قسم کی تدابیر ہو رہی تھیں - قدیم و جدید سب -

بالاخر وہ وقت آپہنچا جس کا کھٹکا مدت سے لگا ہوا تھا - ۲۰ اپریل کی سہ پہر کو جب میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بیرن فان فلٹ ہائیم (Von Veltheim) اور ان کے ایک پارسی دوست سے گفت‌گو کر رہے تھے اور گوئٹے اور شلر اور معلوم نہیں کس کس کا ذکر تھا - فلٹ ہائیم گئے تو چند اور احباب آگئے جن سے دیر تک لیگ ' کانگریس اور بیرونی سیاسیات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا - شام کے قریب جب ان کے معالجین ایک ایک کرکے جمع ہوئے تو انہیں بتلایا گیا کہ حضرت علامہ کو بلغم میں کل شام سے خون آرہا ہے - یہ علامت نہایت یاس انگیز تھی اس لیے کہ خون دل سے آیا تھا - اس حالت میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ شاید وہ آج کی رات جاں‌بر نہ ہو سکیں - مگر انسان اپنی عادت سے مجبور ہے - تدبیر کا دامن آخر وقت تک نہیں چھوڑتا - قرشی صاحب نے بعض دوائیں تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی - اتفاق سے اسی وقت راجہ صاحب تشریف لے آئے - میں نے پوچھا گاڑی ہے ؟ کہنے لگے ”نہیں - مگر کیا مضائقہ ہے - ابھی لیے آتا ہوں“ - چوں‌کہ ان کی اپنی گاڑی خراب تھی لہذا اتنا کہہ کر راجہ صاحب موٹر کی تلاش میں نکل گئے - ادھر ڈاکٹر صاحبان کی رائے ہوئی کہ کرنل امیرچند صاحب کو بھی مشورے میں شامل کرلیا جائے - اس اثنا میں ہم لوگ حضرت علامہ کا پلنگ صحن

میں لے آئے تھے - کرنل صاحب تشریف لائے تو ان کی حالت کسی قدر سنبھل چکی تھی — مطلب یہ کہ ان کے حواس ظاہری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ پھر امید بندھ گئی — لہذا طے ہوا کہ کچھ تدابیر اس وقت اختیار کی جائیں اور کچھ صبح - تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحبان چلے گئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کو رات کے لیے ضروری ہدایات دیتے گئے - اب ہوا میں ذرا سی خنکی آچلی تھی اس لیے حضرت علامہ بڑے کمرے میں اُٹھ آئے اور حسب معمول باتیں کرنے لگے - دفعتاً انہیں خیال آیا کہ قریشی صاحب غالباً شام سے بھوکے ہیں اور ہرچند کہ انہوں نے انکار کیا لیکن حضرت علامہ علی بخش سے کہنے لگے کہ ان کے لیے چائے طیار کرے اور نئے بسکٹ جو میم صاحب نے بنائے ہیں' کھلائے - اس وقت صرف ہم لوگ یعنی قریشی صاحب' چودھری صاحب' سید سلامت اللہ اور راقم الحروف ان کی خدمت میں حاضر تھے - حضرت علامہ نے راجہ صاحب کو یاد فرمایا تو ان سے عرض کیا گیا کہ وہ کام سے گئے ہیں - ۱۱ بجے تو اس خیال سے کہ ہم لوگ شاید ان کی نیند میں حارج ہو رہے ہیں' چودھری صاحب نے اجازت طلب کی لیکن حضرت علامہ نے فرمایا "میں دوا پی لوں' پھر چلے جائیے گا "- اس طرح بیس پچیس منٹ اور گزر گئے حتیٰ کہ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آگئے - حضرت علامہ کو خوراک پلائی گئی مگر اس کے پیتے ہی ان کا جی متلانے لگا اور انہوں نے خفا ہوکر کہا - "یہ دوائیں غیر انسانی (Inhuman) ہیں "- ان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر قریشی صاحب نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی جس سے فوراً سکون ہوگیا - اس کے بعد حضرت علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایلوپیتھک دوا استعمال نہیں کریں گے اور جب شفیع صاحب نے یہ کہا کہ انہیں اوروں کے لیے زندہ رہنا چاہیے تو فرمایا "ان دواؤں کے سہارے نہیں (Not on these Medicines) "-

اس طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا - بالآخر یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ نیند کی طرف مائل ہیں ہم نے اجازت طلب کی - انھوں نے فرمایا بہت اچھا لیکن معلوم ہوتا ہے ان کی خواہش تھی کہ ہو سکے تو قریشی صاحب ٹھیرے رہیں - بایں ہمہ انھوں نے اس امر پر اصرار نہیں کیا - اس وقت بارہ بج کر تیس منٹ تھے اور کسی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ آخری صحبت ہے جاوید منزل کی!

ہم لوگ حضرت علامہ کی خدمت سے اٹھ کر آئے ہی تھے کہ راجہ صاحب تشریف لے آئے اور آخر شب تک وہیں حاضر رہے - شروع شروع میں تو حضرت علامہ کو سکون رہا اور وہ کچھ وقت سو بھی گئے لیکن پچھلے پہر کے قریب بےچینی شروع ہوگئی - اس پر انھوں نے شفیع صاحب سے کہا کہ قریشی صاحب کو لے آؤ - وہ ان کے ہاں آئے تو سہی لیکن غلطی سے اطلاع نہ کر سکے - شاید ۳ بجے کا وقت ہوگا کہ حضرت علامہ نے راجہ صاحب کو طلب فرمایا - ان کا (راجہ صاحب کا) اپنا بیان ہے کہ جب میں حاضر ہوا تو "حضرت علامہ نے دیوان علی سے کہا کہ تم سو جاؤ البتہ علی بخش جاگتا رہے کیونکہ اب اس کے سونے کا وقت نہیں - اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ پیٹھ کی طرف کیوں بیٹھے ہو؟ سامنے آجاؤ - میں ان کے متصل ہو بیٹھا - کہنے لگے قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ - کوئی حدیث یاد ہے؟ اس کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہو گئی - میں نے دیا گل کردیا اور باہر تخت پر آ بیٹھا - راجہ صاحب چلے آئے تو ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی کہ حضرت علامہ رات کی دوا استعمال کریں مگر انھوں نے سختی سے انکار کر دیا - ایک مرتبہ فرمایا "جب ہم حیات کی ماہیت ہی سے بے خبر ہیں تو اس کا علم (Science) کیوں کر ممکن ہے؟" - تھوڑی دیر کے

بعد راجہ صاحب کو پھر بلوایا گیا - حضرت علامہ نے ان سے کہا آپ یہیں کیوں نہیں آرام کرتے اور پھر ان سے قریشی صاحب کے لانے کے لیے کہا - راجہ صاحب کہتے ہیں "میں اس وقت کی حالت کا مطلق اندازہ نہ کرنے پایا تھا - میں نے عرض کیا حکیم صاحب رات دیر سے گئے ہیں شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو" - اس پر حضرت علامہ نے فرمایا "کاش ان کو معلوم ہوتا مجھ پر کیا گزر رہی ہے" - پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو گزشتہ دسمبر میں انہوں نے لکھی تھی -

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگار ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب کہتے ہیں - میں نے ان اشعار کو سنتے ہی عرض کیا کہ ابھی حکیم صاحب کو لاتا ہوں یہ واقعہ ۵—۵ کا ہے - راجہ صاحب گئے تو حضرت علامہ خواب‌گاہ میں تشریف لے آئے - ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ہدایات فروٹ سالٹ طیار کیا - حضرت علامہ بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہنے لگے "اتنا بڑا گلاس کس طرح پیوں گا ؟" اور پھر چپ‌چاپ سارا گلاس پی گئے - علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی - اب اس کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا - حضرت علامہ نے اول اسے شانوں کو دبانے کے لیے کہا پھر دفعتاً لیٹے لیٹے اپنے پانو پھیلا لیے اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "یا اللہ" - پھر فرمایا "میرے یہاں درد ہے" - اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا - علی بخش نے آگے بڑھ کر سہارا دیا تو انہوں نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں - اس طرح وہ آواز جس نے گزشتہ ربع صدی سے ملت اسلامیہ کے سینے کو سوز آرزو سے گرمایا تھا، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی - انہوں نے خود اپنے ارشادات کو کاروان اسلام کے لیے بانگ درا سے تعبیر کیا تھا اور آج جب ہماری اجڑی ہوئی محفل ان کے وجود سے خالی

تھے تو ان کا یہ شعر بار بار زبان پر آتا ہے :-

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے

وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن

---

۲۱ اپریل کی صبح کو میں سویرے ہی اٹھا اور حسب عادت جاوید منزل پہنچ گیا - لیکن ابھی پھاٹک میں قدم رکھا تھا کہ راجہ صاحب نظر آئے - ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں - میں سمجھا رات کی بےخوابی کا اثر ہے - میں ان کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "رات آپ کہاں تھے؟ آپ کا دیر تک انتظار رہا" - وہ معلوم نہیں ہاتھ سے کیا اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چلے گئے - پیچھے مڑ کر دیکھا تو قریشی صاحب سر جھکائے ایک روش پر ٹہل رہے تھے - میں نے ان سے حضرت علامہ کی خیریت دریافت کی تو ایک دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز میں ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا "فوت ہوگئے" -

میں ایک لحظے کے لیے سناٹے میں تھا - پھر دفعتاً حضرت علامہ کی خوابگاہ کی طرف بڑھا - پردہ ہٹا کر دیکھا تو ان کے فکرآلودہ چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم اور سکون و متانت کے آثار نمایاں تھے - معلوم ہوتا تھا وہ بہت گہری نیند میں سو رہے ہیں - میں پلنگ سے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا - شاید وہاں کچھ اور حضرات بھی بیٹھے تھے لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا - ہاں راجہ صاحب کو دیکھا - وہ ان کی پائنتی کا سہارا لیے زار زار رو رہے تھے - ان کو دیکھ کر میں اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کرسکا اور بےقرار ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا -

تھوڑی ہی دیر میں حضرت علامہ کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی - اب جاوید منزل میں ان کے عقیدت‌مندوں کا ہجوم تھا - یہ سانحہ کچھ اس قدر عجلت اور بےخبری میں پیش آیا تھا کہ جو شخص آتا یہی کہتا - "کیا ڈاکٹر صاحب فوت ہوگئے ! علامہ اقبال ..." گویا ان کے نزدیک یہ خبر ابھی غلط تھی - حالانکہ وہ گھڑی جو برحق ہے اور جس کا ایک دن ہر کسی کو سامنا کرنا ہے ' آپہنچی تھی - کل من علیہا فان - و یبقی وجہ ربک ذوالجلال و الاکرام -

جنازہ سہ پہر میں ۵ بجے کے قریب اٹھا - جاوید منزل کے صحن اور کمروں میں خلقت کا ازدحام تھا - معلوم نہیں ان کے غم میں کس کس کی آنکھیں اشک‌بار ہوئیں اور میو روڈ سے شاہی مسجد تک کتنے انسان جنازے میں شریک تھے - ہم لوگ لاہور کی مختلف سڑکوں سے گزر رہے تھے - شہر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا - جدھر دیکھیے حضرت علامہ ہی کا ذکر تھا - جنازہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اخباروں کے ضمیمے ' قطعات اور مرثیے تقسیم ہونے لگے - دفعتاً خیال آیا کہ یہ اس شخص کی میت ہے جس کا دل و دماغ رفتہ رفتہ اسلام میں اس طرح کھویا گیا کہ اس کی نگاہوں میں اور کوئی چیز جچتی ہی نہیں تھی اور جو مسلمانوں کی بےحسی اور اغیار کی چیرہ‌دستی کے باوجود یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا

گرچہ رفت از دست ما تاج نگیں　　ما گدایاں را بچشم کم مبیں

معلوم نہیں ساحر افرنگ کی فریب‌کاریوں نے اسے کس کس راہ سے سمجھایا کہ اس کی قوم کی نجات تہذیب نوی کی پرستش میں ہے مگر اس کے ایمان سے لبریز دل میں نبی اُمی صلعم کی محبت بے اختیار کہہ اٹھی :—

در دل مسلم مقام مصطفی است　　آبروئے ما ز نام مصطفی است

اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچنا شروع کردیا کہ یہ جنازہ تو بےشک اقبال ہی کا ہے لیکن کیا اقبال کی موت ایک لحاظ سے ہندوستان کے "آخری" مسلمان کی موت نہیں - اس لیے کہ وہ اسلام کا نقیب تھا' رازدار تھا - اور اب کون ہے جو علامہ مرحوم کی مخصوص حیثیت میں ان کی جگہ لے - اللہ تعالیٰ انہیں مقامات عالیہ سے سرفراز فرمائے اور ان کو اپنی رحمت اور مغفرت کے سائے میں جگہ دے - آمین' ثم آمین -

---

# اقبال اور اُس کے نکتہ‌چیں

از

( سید آل احمد سرور صاحب ' ایم - اے - لکچرار
مسلم یونیورسٹی علی‌گڑھ )

دور حاضر کا سب سے بڑا شاعر اقبال آج اس دنیا میں نہیں - بیماری سخت ' صحت خراب ' آخر یہ کشمکش کب تک جاری رہتی - جس کے بڑھاپے سے اردو شاعری میں جوانی آئی اور ملت اسلامیہ کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا ' وہ چل بسا ؛ خدا کرے یہ زندہ و تابندہ رہے -

اقبال کو اپنی زندگی میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئی - قبول عام کلام کی خوبی کا ضامن نہیں سمجھا جاتا مگر غور سے دیکھا جائے تو جمہور جس کے سر پر تاج رکھ دیتے ہیں اس کی بادشاہت کی بنیاد دیرپا عناصر پر ہوتی ہے - ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ "ادب کی خوبی کا آخری معیار عوام کے قبول کی سند ہے" - اس قول میں صداقت ضرور پائی جاتی ہے - عوام یوں ہی کسی کو سر پر نہیں بٹھاتے ' وہ کبھی کبھی سطحی چیزوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں مگر تھوڑی دیر کے لیے - بہت سے لوگ بہت کافی عرصے تک اُسی چیز کی تعریف کرتے ہیں جو تعریف کے قابل ہو -

غرض اقبال اس بارے میں کافی خوش نصیب رہے - وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے ' کہہ چکے تھے - ان کا مشن پورا ہو گیا تھا اور اگرچہ یہ یقین ہے کہ وہ

اور زندہ رہتے تو ان کے مرکزی خیال کی اور وضاحت ہو جاتی - مگر پھر بھی جو کچھ انہوں نے چھوڑا ہے وہ ہر حیثیت سے مکمل ہے - ان کے مرنے کے بعد ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک صف ماتم بچھی' رنج و الم کا اظہار ساری دنیا نے کیا - جلسے ہوئے' تقریریں کی گئیں' قرار دادیں پاس ہوئیں - بڑے بڑے لوگوں نے ہمدردی کے پیغام بھیجے - ہم لوگ اس سے زیادہ کرتے ہی کیا ہیں - جو کچھ ہوتا آیا ہے سب ہی ہوگیا -

مگر ان سب باتوں کے باوجود جاننے والے جانتے ہیں کہ اقبال پر اعتراضات بھی کیے گئے تھے - ان اعتراضات کی نوعیت مختلف قسم کی تھی - اول اول اشعار کو عروض کے کانٹے پر تولنے والے اور شخصی اور صنعتی معیار رکھنے والے' اقبال کی غلطیوں پر ہنستے تھے - "بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا" آج تک بزرگوں کے لبوں پر تبسم پیدا کرنے کو کافی ہے - اقبال نے بہت سی خوبصورت ترکیبیں وضع کی تھیں' بہت سے نئے استعارے اور تشبیہات پیش کیے تھے' وہ کانوں کو اجنبی معلوم ہوئے - ان کا حسن بعض نگاہوں میں نہ جچا - سورج نکلنے والا ہوتا ہے تو بعض ستارے کچھ دیر تک آنے والی روشنی کا مقابلہ کرتے ہیں' مگر کب تک' تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہو جاتے ہیں اور سارا عالم مطلع انوار ہو جاتا ہے -

بہت دن تک اقبال پر جو اعتراضات کیے گئے تھے وہ زبان سے متعلق تھے - وقت گزرتا گیا شاعر کا کلام مقبول ہوا - اس کی شاعری کا سونا زندگی کی بھٹی میں تیار ہوا تھا - اس لیے اس میں صداقت بھی تھی اور جوش بھی - اب وہ وقت آیا کہ اقبال اپنے دور پر اثر انداز ہوئے - ان کا رنگ بھی مقبول ہوا اور دوسرے شعرا غیر شعوری طور پر اس کا اتباع کرنے

لگے - اردو شاعری میں فلسفیانہ بلندآھنگی پیدا ھوئی - زندگی کے مسائل سے قربت حاصل ھوئی - پیامی رنگ آیا - زندگی کا امیدافزا پہلو سامنے رھنے لگا - ملک و قوم میں بیداری شروع ھوئی - ذھن و فکر میں انقلاب ھوا - اقبال نے اپنی چیزوں سے محبت سکھائی ' غیروں سے بےنیازی کا سبق دیا ؛ فرد کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ان صلاحیتوں سے جماعت کے مفاد کا کام لیا - غرض ایک نئی نسل تیار کی جو ان کی دماغی پیداوار کہی جا سکتی ھے -

اب اس نئی نسل نے دیکھا تو اقبال کے کلام میں کئی خرابیاں نظر آئیں - ایک نے کہا اقبال کا کلام (Parochial) ھے - دوسرے نے اعلان کیا کہ چوں‌کہ اقبال کی زندگی اور شاعری میں تضاد ملتا ھے اس لیے ان کی شاعری قابل اعتنا نہیں ھے - تیسرے نے اور آگے بڑھ کر آواز دی کہ اقبال کی شاعری بےجان ھے ' زندگی سے اُسے کوئی علاقہ نہیں - اقبال ایک ایسے ماضی کی یاد میں محو ھے جو کبھی واپس نہیں آ سکتا - چوتھے کو اقبال کے کلام میں مزدوروں اور جمہوریت کے خلاف وعظ نظر آیا - وہ فرمانے لگے کہ اقبال اسلامی فاشست ھے شاعروں نے کہا وہ تو فلسفی ھے ' اُسے شاعری سے کیا غرض - فلسفی بولے کہ وہ شاعر ھیں ' فلسفے کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں - صلح پسند حضرات اُن سے اس وجہ سے ناراض ھوئے کہ وہ قتل و خون کی دعوت دیتے ھیں اور چنگیز و تیمور کو دوست رکھتے ھیں - سیاست‌دانوں کی سمجھ میں ان کی سیاست نہ آئی - مولویوں کو یہ گوارا نہ ھوا کہ ان کے بجائے ایک "رند خراباتی" دین کی حمایت کا جھنڈا بلند کرے - یہ شاعری نہیں شواھد ملاحظہ ھوں :—

رسالہ شاعر آگرہ (بابت ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء) میں جناب سیماب اکبرآبادی نے بال جبریل کی زبان پر بعض اعتراضات کئے ھیں - انھیں صدمہ یہ ھے کہ

اقبال نے پرهیز کو مونث استعمال کیا هے جس کی مثال کهیں ڈهونڈهے سے قدما کے یہاں نہیں مل سکتی

اشارہ پاتے هی صوفی نے توڑ دی پرهیز

ایک اور جگه اس شعر پر اعتراض هے

مرا سبو یہ سلامت هے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی هیں صوفیوں کے کدو

یہاں کدو کا لفظ جناب سیماب کے نزدیک بازاری هے -

پهر پوچهتے هیں :—

اُسے صبح ازل انکار کی جرأت هوئی کیوں کر
تجهے معلوم کیا ؟ وہ رازداں تیرا هے یا میرا

اس شعر میں ابلیس کا نام کیوں نہیں آیا - حالانکہ اتنا سیماب صاحب بهی سمجهتے هیں کہ اشارہ اسی طرف هے - بهلا اس کا کوئی کیا جواب دے

ایک اور اعتراض سنیے :—

وهی اصل مکان و لامکاں هے مکاں کیا شے هے ' انداز بیاں هے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے اگر ماهی کہے دریا کہاں هے

دوسرا مصرع سیماب صاحب کے نزدیک مہمل هے - اسی طرح یہ شعر بهی :—

مدت سے هے آوارۂ افلاک مرا فکر کردے اسے تو چاند کے غاروں میں نظر بند

رسالہ حکیم دهلی کی پہلی اشاعت میں نواب جعفر علی خاں اثر لکهنوی نے بال جبریل پر ایک تبصرہ لکها تها - اور اس سلسلے میں سیماب صاحب کے ان اعتراضات پر بهی اچهی طرح رائےزنی کی تهی ، لکهنوی شعرا اور اقبال کی زبان کی گواهی' یہ کیا کم هے - بهر حال ان اعتراضات میں سے کوئی اتنا وقیع

نہیں جس کے جواب کی کوشش کی جائے - مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ اب بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جو علانیہ نہیں تو چھپے دبے ضرور اقبال کی زبان پر اعتراض کرتے ہیں - وہ ترکیب غلط ہے؛ اس محاورہ کو صحت کے ساتھ نظم نہیں کیا؛ یہ مؤنث نہیں مذکر ہے؛ یہاں تعقید معنوی پائی جاتی ہے؛ یہاں شعر معما ہوگیا - آخر ان سب باتوں کی وجہ کیا ہے -

شاعری کے دو اسکول ہیں - ایک تشبیہات و استعارات سے اپنے کلام کو مرصع کرتا ہے - دوسرا محاورات پر جان دیتا ہے - دونوں کی اہمیت بڑی ہے مگر یکسان نہیں - ایک زمانہ تھا جب محاورے کو شعر کی جان سمجھا جاتا تھا اور جب تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، سوز و گداز، لطافت، نزاکت اور اس قسم کے دوسرے رسمی عنوانات کے تحت میں کسی پر تنقید ہوتی تھی تو محاورے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی - ذوقؔ کی شاعری محاورات و امثال سے بھری ہے مگر ذوقؔ کے اچھے شعر صرف اپنے محاورے کی وجہ سے مشہور نہیں - داغؔ کی جو شاعری زندہ رہنے والی ہے وہ اس وقت سے پہلے کی ہے جب انہیں ہر محاورے کو نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا - محاورے کی وجہ سے شعر بلند نہیں ہوتا ہاں اگر اس میں کوئی صداقت موجود ہے تو محاورہ اسے چمکا دیتا ہے - در اصل محاورہ‌بندی شاعری میں اتنی مفید نہیں جتنی تشبیہات و استعارات کی فراوانی - تشبیہات و استعارات اسی لیے شعر میں استعمال ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے معنی آفرینی، حسن آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے - نئی زبان استعارات سے بنتی ہے - کم از کم اس کے سانچے اسی طرح تیار ہوتے ہیں - خیال کو نئی راہیں ملتی ہیں، ذہنی فضا وسیع ہوتی ہے، زبان آگے قدم بڑھاتی ہے - اس طرح دیکھیے تو ہمارے تمام اچھے شاعر دو

گروہوں میں منقسم ہوجاتے ہیں - میر' داغ' ذوق زبان کو محفوظ کرنے والے ہیں - غالب' اقبال' انیس زبان کو آگے بڑھانے والے ہیں - غالب و اقبال کی ترکیبیں ادب و انشا کے چمن میں ان کی حیثیت دیاسلائی کی ہے جس سے پڑھنے والوں کی آتش‌بازی چھوٹتی ہے - جب کوئی استعارے و تشبیہات استعمال کرتا ہے تو کہیں کہیں اس کے انداز میں اجنبیت آ جاتی ہے - ان کے خیال کے سانچوں اور علامتی مترادفات سے لوگ پوری طرح واقف نہیں ہوتے - اسی وجہ سے قواعد کی رو سے اعتراضات پیش کرتے ہیں - حالانکہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال اور غالب کا کام گریمر کی پابندی نہیں - گریمر کا کام ہے کہ ان اشخاص کی مقررکردہ شاہراہوں پر چلے اور ان کے طرز کو دیکھ کر اپنے قوانین مرتب کرے -

حضرت شاہ محدث دہلوی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دفعہ کسی آیۂ کریمہ کے معجزات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرما گئے تھے کہ اس کی تلاوت سے سبکساران ساحل "دام موج و حلقہ‌ہائے نہنگ" دونوں سے اچھی طرح عہدہ‌برا ہو سکتے ہیں - راوی ناقل ہے کہ کسی یتیم و یسیر ذرہ کو یہ نسخہ ایسا ہاتھ آ گیا تھا کہ روز اپنی "ضروریات" کے سلسلے میں اسی اسم اعظم کے زور سے جمنا پار آیا جایا کرتا تھا - کچھ عرصے کے بعد اس نے اظہار عقیدت کے لیے شاہ صاحب موصوف کو مدعو کیا اور اس وقت یہ معلوم ہوا کہ مسیحا بھی کبھی کبھی بیمار ہو جایا کرتے ہیں -

قریب قریب ایسا ہی خیال ایک طبقے کا اقبال کے متعلق ہے - رسالہ 'جامعہ' دہلی میں دو تین سال ہوئے یحییٰ اعظم گڑھی کی ایک نظم شایع ہوئی تھی - اس کا "انجام" کچھ ایسا ہی تھا - اخبار 'مدینہ' بجنور نے اکثر اپنے شذرات میں اس پر افسوس کیا کہ ملک کی بدقسمتی سے مجلس آئین و

اصلاح و رعایات و حقوق" کی تمام جادوگریوں سے واقف‌کار' کلیم سرمایہ‌داروں کی فرعونیت سے مسحور ہو جاتا ہے اور "قفس کو آشیاں" سمجھنے لگتا ہے - یہ لوگ شاعر کے اس قول کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں :—

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

مگر اس شعر کو اپنے جواز میں پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسا رسالہ 'اردو' کے ریویونگار نے ایک دفعہ کیا تھا - سال‌نامہ 'کاروان' کی پہلی اشاعت میں پروفیسر تاثیر نے اقبال کا ایک لطیفہ نقل کیا - تاثیر نے جب اقبال سے 'کاروان' کے لیے اشعار کی فرمایش کی تو انہوں نے کہا کہ "اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوئے" - یہی جملہ اردو کے ریویونگار کی ناراضگی کا باعث ہوا - حالانکہ سیکڑوں باتیں تفریح طبع کے طور پر کہی جاتی ہیں - پر ان کو لفظ بلفظ صحیح سمجھنا ان کی شعریت کا خون کرنا ہے - پھولوں کی خوشبو کو ترازو میں تولنے والے ہی اس شعر سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ "اقبال جرم" ہے -

مگر اس سے قطع نظر یہ بحث بڑی دل‌چسپ ہے کہ اقبال کی زندگی اور شاعری میں تضاد ملتا ہے یا نہیں اور یہ تضاد کہاں تک ان کی شاعری کی صداقت میں خلل‌انداز ہوتا ہے - جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ زیادہ تر ۱۹۲۴ع سے ۱۹۳۲ع تک کے دور پر نظر رکھتے ہیں - ۱۹۲۴ع میں اقبال کو 'سر' کا خطاب ملا - سالک صاحب نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا—ع "سرکار کے دربار میں سر ہو گئے اقبال" - پھر وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے - سنہ ۱۹۲۸ع میں انہوں نے سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر سائمن کمیشن سے تعاون کیا اور سنہ ۱۹۳۲ع میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے سرکاری نمایندے کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئے - اقبال کی ۶۱ سالہ

زندگی میں صرف ۸ سال ایسے نکلتے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی شاعری کے عام رجحان سے ہم آہنگ نہیں ہیں - اسی کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عام طور پر اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے اور تھوڑے سے عرصے کو چھوڑ کر جب ان کے قدم ذرا متزلزل ہو گئے تھے' ساری عمر وہ اُسی راستے پر گامزن رہے جو ان کی شاعری کا تھا - پکارنے والے پکارتے تو ہیں کہ زندگی اور شاعری میں وحدت ضروری ہے' مگر یہ ملتی کہاں ہے - غالب کا وہ شعر دیکھیے :—

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور مکاتیب غالب پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی تو درکنار غالب ضرورت کے وقت طرح طرح سے روپیہ مانگتے تھے اور جب نواب کلب علی خاں سے "آشیاں چیدن" والے مسئلے پر اختلاف ہوا تھا تو کس کس طرح سے انھیں خوش کرنے کے لیے جتن کرتے تھے - دنیا کے اور بڑے بڑے شعرا کو لیجیے - یک‌رنگی کم ملےگی' رنگارنگی زیادہ - اردو میں داغ جیسے لوگ کم ہیں' امیر جیسے زیادہ - مگر میرا تو خیال یہ ہے کہ یہ ہم‌آہنگی مستحسن سہی - مگر ضروری نہیں - شاعری ایک باطنی تجربے کا روشن تخیل ہے - تجربے کا جوہر جتنا قیمتی ہوگا اسی قدر قیمتی اس کی شاعری ہوگی - اس تجربے کا اظہار اشعار میں ہوتا ہے اور اظہار خیال (Expression) کے ذریعے سے ابلاغ خیال (Communication) ہو جاتا ہے - چنانچہ شاعر کا مقصد وہیں پورا ہوگیا جہاں اس کے اشعار مکمل ہوگئے - شاعر صحیح معنوں میں اپنے اشعار میں جلوہ گر ہوتا ہے - جو شخصیت اشعار کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے اسی سے ہمیں سروکار

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی

جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں

محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت‌خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن

تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

کیا وطن کی عظمت ' وطن کے مسائل سے دل‌چسپی ' وطن کے حال زار پر افسوس اس سے بہتر طریقے سے ادا ہوسکتا ہے ؟

وطنیت کا وہ تصور جس میں اپنے ملک کے سوا کسی کی گنجایش نہیں اب ختم ہو گیا - اسے زندہ کرنے کی جتنی کوششیں ہیں بے وقت کی راگنیاں ہیں - اب تو ساری جماعتوں کو ایک عالم‌گیر نظام میں منسلک کرنے کا وقت ہے - ہر تحریک کا نصب‌العین یہی ہے - چاہے وہ سوشلزم ہو چاہے اسلام پھر اقبال پر یہ اعتراض کہاں تک جائز ہے کہ وہ ایک فرقے کا شاعر ہے -

اب بعض ایسے اعتراضات ملاحظہ ہوں جو اس نئی پود کے ہیں جو اپنے زعم میں اقبال سے آگے بڑھ گئی ہے - اردو شاعری کو سب سے پہلے اقبال نے زندگی کے مسائل سے آشنا کرایا - حالی ' اکبر اور چکبست کا کلام نقش اول ہے- اقبال کے یہاں "گریۂ ابر بہار" اور "خندۂ تیغ اصیل" دونوں ملتے ہیں - انھوں نے مسائل مہمہ پر رائے‌زنی بھی کی ہے - کبھی خضر کی زبان سے زندگی' سلطنت ' سرمایہ داری ' مزدور اور دنیائے اسلام کے عقدوں کو حل کیا ہے' کبھی شمع کی زبان سے زندگی ' گرمی اور سوز و گداز کا پیغام سنایا ہے' کبھی نقاب اٹھا کر خود سامنے آئے ہیں - بانگ درا اور بال جبریل کی اشاعت میں بارہ تیرہ سال کا فصل ہے - اس عرصے میں اقبال کی کئی فارسی کتابیں شایع ہوئیں - پیام مشرق'

زبور عجم، جاوید نامہ، مسافر، ان میں حالات حاضرہ پر تبصرے ہیں، کتاب دل کی تفسیریں اور خواب جوانی کی تعبیریں ہیں - جیتی جاگتی، جانی پہچانی زندگی کے مرقعے ہیں - اقبال کی کوششوں سے جدید اردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا - شاعر شباب شاعر انقلاب ہو گئے - اگر اقبال نہ ہوتے تو آپ "نا سزا جوانی" اور "جنگل کی شہزادی" والے جوش کا کلام سنتے رہتے - "نعرۂ شباب"، "بغاوت"، "کسان" والے جوش کا وجود ہی نہ ہوتا 'جامن والیاں'، آپ کو ملتیں، لیکن 'ضعیفہ' اور 'مزدور دوشیزہ' نہ ہوتی - اس طرح دوسرے تمام نوجوان شاعر، روش صدیقی، احسان بن دانش، ساغر، مجاز جمالیاتی احساس کے طلسم میں گرفتار ہوتے - ان سب کے یہاں جو کچھ ہے وہ اس شاعر کی انقلاب‌آفریں نظموں کی آواز بازگشت ہے جس نے سب سے پہلے سرمایہ‌دار اور مزدور کی آویزش کو دیکھ کر مزدور کا ساتھ دیا - جس نے آزادیء ہند کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی اور آزادی کے معنی صرف ہوم رول نہ لیے، جس نے مذہب کے اصولوں پر کارفرما ہو کر مذہب کے رواجی اور کاروباری نقطۂ نظر کے خلاف احتجاج کیا، جس کی حریت فکر نے قدیم سانچوں کو چھوڑ کر نئے سانچے خیال کے بنائے اور آنے والی نسلوں کے لیے سیکڑوں نشان راہ اپنے چھوڑے - اس کے خلاف ایک نام نہاد ترقی‌پسند "آرٹ کے ترقی پسند نظریہ" میں فرماتے ہیں -

"اقبال کی شاعری حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ زوردار ہے، زیادہ خیالی ہے - اس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کا دفن کرچکا ہے، اقبال اسلام کے رنج و محن کے ترانے گاتے ہیں - ایک ناممکن اور بے معنی پین اسلامزم کی دعوت دیتے ہیں اور چھنتے، چلاتے، روتے، دھمکاتے، قدیم گل و بلبل کے گیت گاتے (اکثر بڑی خوش الحانی کے ساتھ) اس مرکز کی طرف آجاتے ہیں جو بڑی

حد تک اس قسم کی شاعری کے وجود اور الہام کا بانی مہانی ہے' یعنی اسرار خودی- لیکن باوجود سیکڑوں شکووں اور جوابات شکووں کے' باوجود آہ و بکا اور آنسوؤں اور التجاؤں کے وہ جو تھا کبھی واپس نہیں آسکتا- (اقبال تو اس میں کامیاب ہوئے نہیں اور حقیقت جو ہے رہے گی)- ٹیگور اور اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بھلانے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے' اور باوجود اپنی خوبصورتی کے محض خواب و خیال ہے- بجائے اس کے کہ یہ ہماری قوت تنقید کو جگائے' بجائے اس کے کہ وہ ترقی کی ان قوتوں کو مدد دے جو سوسائٹی میں کام کر رہی ہیں' یہ ہم کو صرف غیرعملی اور بےحرکتی کی طرف کھینچتی ہے اور اس سے زیادہ رجعت پسندانہ ہے- اس شاعری سے متاثر ہو کر' خاص طور پر ٹیگور کی شاعری' ہمارے دیس کا بیشتر حصہ ایک بےجان ادب سے بھر گیا ہے- ایک ایسا ادب جو زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور بالکل تنگ نظر ہے' اور آرٹ میں بھی یہی مذہبی اور معرفتی رجحان دکھائی دیتا ہے- وہی اپنی زندگی کے اصلی اور اہم مسئلوں سے دور بھاگنا''- (رسالہ اردو)

میں نے اقبال کے متعلق پورا اقتباس اس وجہ سے دے دیا ہے کہ تحریف کا شبہ نہ رہے- اسے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آدمی اپنی دلیل کو منوانے کے لیے کتنا جھوٹ بول سکتا ہے- احمد علی صاحب کو اقبال سے یہ شکایت ہے کہ :—

۱- اقبال کی شاعری خیالی ہے -

۲- وہ ایک ناممکن اور بےمعنی پین اسلامزم کی دعوت دیتی ہے -

۳- بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بھلانے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے -

۴ - یہ ہم کو بے عملی کی طرف کھینچتی ہے -

۵ - رجعت پسندانہ ہے -

اس فرد جرم کو دیکھیے - کوئی بھی اسے تسلیم کر سکتا ہے - اقبال اور ٹیگور کا فلسفہ زندگی اس قدر مختلف ہے کہ دونوں کا نام ایک سانس میں لیا ہی نہیں جا سکتا - ٹیگور کی شاعری خیالی ضرور ہے' اس میں ایک رومانی یا صوفیانہ پہلو پایا جاتا ہے - کسی رتھ کے آنے کا وہ ہمیشہ سے منتظر ہے' مگر اس کا دل درد سے لبریز اور اس کی آنکھ آنسوؤں سے نم ناک ہے' - اپنے گرد و پیش سے' ماحول کے تقاضوں سے' وہ متاثر ہوتا ہے - اس کی شاعری میں باوجود رومانی اثرات کے واقعیت ملتی ہے - اس کی دیوی کا یہ پجاری دنیا کے کرب و تکلیف کا علاج ایک روحانی شانتی میں دیکھتا ہے - اہل نظر جانتے ہیں کہ اس میں گرمی اور حرارت موجود ہے - ظاہربین یہ کہتے ہیں کہ ٹیگور الفاظ کے طلسم میں خیالی دنیا کے خواب دیکھتا ہے - خود شاعر ایسے لوگوں سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے " ہتوڑے کی ضربیں نہیں بلکہ آب رواں کا رقص اپنے نغموں سے سنگ‌ریزوں کو سڈول بناتا ہے - ٹھوکر زمین سے گرد پیدا کر سکتی ہے' اناج نہیں"

مگر اقبال پر تو یہ اعتراض وارد ہو ہی نہیں سکتا - جس نے شاعری کو خیالی فضاؤں سے نکال کر عمل کی دنیا میں سیر کرائی' جس نے زندگی کے مسائل' جہالت' غربت' غلامی کی طرف اپنے سامعین کو متوجہ کیا' جس کے تخیل کی رنگ‌آمیزی سے زندگی کی تصویر اور بھی شوخ ہوگئی' اس کی شاعری کو خیالی کہنا ہرگز صحیح نہیں - یہاں صرف اس قدر اشارہ کافی ہے - اس کی تشریح میں یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی - دوسری چیز چوں‌کہ ایسی ہے جس کے متعلق موافق یا مخالف رائے دی جاسکتی ہے' اس لیے اس پر زیادہ اصرار

مناسب نہیں - پھر اسلامزم ناممکن ہے اور بے معنی ہے یا فطری اور قرین قیاس' اس کا جواب سوائے وقت کے اور کوئی نہیں دے سکتا - لیکن جس طرح ساری دنیا کے مزدوروں کو ایک شیرازے میں منسلک کرنے کی صدا " Workers of the World Unite " بے معنی نہیں کہی جاسکتی ' اسی طرح ایک خدا اور رسول کا کلمہ پڑھنے والوں کو یکجا کرنے کی کوشش بے معنی کیسے ہو سکتی ہے - اسلام کی حقیقی تعلیم پر عرب و عجم ' روم و تتار ' زنگی و خوارزمی کا پردہ پڑ گیا تھا ' وہ اٹھ جائے تو یہ حقیقت پھر سامنے آجائے گی کہ تمام مسلمانوں کے دل الگ الگ ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص حالات میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی ایک ہی طرح دھڑکتے ہیں - فلسطین میں جو چیرہ‌دستیاں ہو رہی ہیں ان پر نہ صرف آزاد ترکی مضطرب ہے بلکہ غلام ہندوستان اور نیم‌آزاد عراق و مصر بھی بےچین ہیں - اس چنگاری کو شعلے بنتے کیا دیر لگتی ہے -

آگے چل کر ہمارے یہ ترقی‌پسند مصنف دعوی کرتے ہیں کہ اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بھلانے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے - اس سے زیادہ ناانصافی کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک طرف سے لڑے اور دوسری طرف اس کا نام لکھا جائے - حقیقت کو بھلانے کی خواہش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے - انسان یا تو تصوف کی یا فلسفہ کی پناہ لیتا ہے اور نہیں تو جذبات‌نگاری کے سیلاب میں غرق ہو جاتا ہے - اقبال ان تینوں گمراہیوں سے واقف ہیں - وہ انہیں وادیء بے راہ کہتے ہیں - ان کا فلسفہ وہ ہے جو " خون جگر سے لکھا جائے "- جس میں " مستیء کردار " نمایاں ہو - ان کا تصوف " مسکینی و محکومی و نومیدیء جاوید " والا تصوف نہیں - ان کی " شرح محبت میں عشرت منزل حرام " ہے اس لیے ان کے کلام کے متعلق یہ کہنا کہ یہ زندگی سے گریز کرتا ہے

(Escapist) ہے ' ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا - اقبال زندگی کو بھلانے کے لیے نہیں ' زندگی کی تلخیوں سے سب کو آشنا کرانے کے لیے اور ہو سکے تو ان کو گوارا بنانے کے لیے آیا تھا - برسوں سے اردو کے شاعر ' ساری دنیا سے الگ اپنی دنیا آباد کیے بیٹھے تھے - زندگی کا تقاضا کچھ تھا اور اِن شعرا کا کچھ اور - خیالی فضاؤں میں پرواز ' نازک اور پر پیچ انداز بیان ' استعارے کے اندر استعارہ اور تشبیہ کے اندر تشبیہ ' یہ ان شعرا کا سرمایۂ کمال تھا ؛ اقبال نے اس بت کو توڑا ' جمالیاتی نقطۂ نظر کے خلاف جہاد کیا ' Art for Art's Sake کے فریب کی قلعی کھولی ؛ پھر بھی انھیں زندگی سے گریزاں کہا جائے تو اس کا کیا علاج -

کیا اقبال کی شاعری بےعملی کی طرف لے جاتی ہے - کیا ان کی تعلیم سے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں - کیا وہ اپنی بانسری کے نغموں سے وابستہ چلتے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں یا ان کی تانوں سے بجھے ہوئے دل جوش میں آجاتے ہیں اور قلب میں گرمی پیدا ہوتی ہے ؟ ان اشعار کو پڑھیے ' ان سے کیا مترشح ہوتا ہے :-

یہی آئین قدرت ہے ' یہی اسلوب فطرت ہے

جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو

خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

ہو مسلمان رگ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا

جو بھروسا تھا اُسے قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا

ہر کوئی مست مئے ذوق تن‌آسانی ہے
تم مسلمان ہو، یہ انداز مسلمانی ہے

تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ‌کنار

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اِسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

پختہ‌تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بےخبر راز دوام زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرکن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کردے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ انسان اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے تیرے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

ضرب کلیم کے ناظرین سے خطاب دیکھیے —

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج نہ ہوسکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام — میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

صرف ایک فارسی قطعہ اور ملاحظہ ہو —

بیا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم‌خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

حرکت عمل' پیکار کا فلسفہ سکھلانے والے کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بےعملی کی تعلیم دیتا ہے' انتہا ہے - ماضی کے گڑے مردوں کو اکھاڑنے والے کا یہ پیغام بھی دیکھیے—

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامان عیش
قصۂ خواب‌آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
ہاں یہ سچ ہے چشم... عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط‌افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ
آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
پردہ اٹھا دوں اگر عالم افکار سے
لا نہ سکےگا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اعتراض کرنے والے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اقبال ماضی کے شاعر ہیں - وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال جتنے ماضی کے شاعر ہیں اتنے حال و استقبال

کے شاعر بھی ہیں - اقبال نے زمانوں کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا ' وہ زمان و مکان کو ایک عارف کی نظر سے دیکھتے ہیں - وہ اپنے سامعین کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں - ماضی کی بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں - اب یہ دیکھیے کہ ان پر رجعت‌پسندی کا الزام کہاں تک عاید ہو سکتا ہے -

رجعت‌پسندی قدامت کی آخری خندق ہے - اقبال جدیدیت کے پیرو نہیں - وہ قدامت‌پسند کہے جا سکتے ہیں مگر وہ تنگ‌نظر ہرگز نہیں - ان کا اصول وہی ہے جو مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے سالانہ جلسے میں بیان کیا تھا کہ کوئی چیز نہ اس وجہ سے اچھی ہے کہ وہ نئی ہے اور نہ اس وجہ سے بری ہے کہ وہ پرانی ہے - افسوس ہے کہ اس انجمن کے اکثر ارکان اسے فراموش کر چکے ہیں - اقبال کے دل میں آزادی کی سچی تڑپ موجود ہے - حریت فکر پر وہ جان دیتے ہیں - سرمایہ‌دار کے دشمن اور مزدور کے حامی ہیں - مولوی اور ملا سے نفرت کرتے ہیں - صوفیوں کی بدمذاقی سے نالاں ہیں اور خانقاہوں کے خلاف - ان کا مذہب رسم و رواج نہیں ' قرون اولیٰ کا اسلام ہے - غلامی کی ذلت کا خیال کرکے انہیں شرم آتی ہے - خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ تو نے مجھے اس دیس میں پیدا کیا جہاں کے بندے غلامی پر رضامند ہیں - پھر بھی ان کو رجعت‌پسند کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے - شاید وہ چیز جس میں اشتراکیت ' مذہب سے بغاوت ' اور مادہ‌پرستی کی تلقین موجود نہ ہو ' رجعت‌پسندانہ ہے - ہمارے نام‌نہاد نقاد خود اسلام کو رجعت‌پسند کہتے ہیں اس لیے انہیں اقبال بھی ویسے ہی نظر آئے - بہر حال میں چند متفرق عنوانات پر کچھ شعر پیش کرکے آگے بڑھنا چاہتا ہوں - دیکھیے ان سے قدامت ٹپکتی ہے یا جدیدیت ' رجعت‌پسندی یا آزادخیالی -

آزادی کی تڑپ دیکھیے :—

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی کوشش سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

رہبانیت ' ملا ' صوفی اور زاہد سالوس کے خلاف اشعار ملاحظہ ہوں :—

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری متاع نظری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خودشکنی ' خود نگری کا

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محکومی و نومیدیء جاوید
جس کا یہ تصور ہے وہ اسلام کر ایجاد

ممکن نہیں تخلیق خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم‌خوردہ سے ٹوٹیے گا شرر کیا

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ‌ہائے کرامات رہ گئے باقی

کرے گی داورمحشر کو شرمسار
کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

صوفی کی طریقت میں فقط مستیء احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار

شاعر کی نوا' مردہ و افسردہ و بےذوق
افکار ہیں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

ایک جگہ اور لکھتے ہیں :-

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں جانتا ہوں انجام اس کا　　جس معرکے میں ملا ہوں غازی

ایک ترقی پسند مصنف کی گہرافشانیاں آپ نے دیکھیں - انہیں کے ایک بھائی بند نے علی‌گڑھ کے ایک جلسے میں اقبال کے کلام پر ایک اور اعتراض کیا

تھا - ان کا خیال یہ تھا کہ اقبال جنگ کی حمایت کرتے ہیں' خوں ریزی کے موید ہیں' جہاد کو ایک اسلامی فریضہ سمجھتے ہیں اور چیتے کا جگر اور شاہین کی نظر پیدا کرنا چاہتے ہیں -

یہ واقعہ ہے کہ شاہین کی حیثیت اقبال کے یہاں وہی ہے جو کیٹس کی "بلبل" اور شیلے کی "Skylark" کی ہے - شاہین اقبال کا محبوب پرندہ ہے - شاہین میں بعض ایسی صفات جمع ہوگئی ہیں جو اقبال کی مرکزی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں - خود اقبال کے الفاظ میں ؛ —

پرندوں کی دنیا کا درویش ہے یہ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

علاوہ اس کے "خوددار و غیرت‌مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا' بےتعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا - بلندپرواز ہے' خلوت‌پسند ہے - تیز نگاہ ہے"- گویا شاہین میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں- دیکھیے اس کا ذکر کس طرح آیا ہے :-

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

---

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال‌خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے جام زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

---

نوا پیدا کر اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

کہا میں نے اس خاندان سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی صحبت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

جھپٹنا ' پلٹنا ' پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

---

آخری شعر ملاحظہ ہو - جس قوم کے دل و دماغ پر بے حسی طاری ہوچکی ہو - جس کی رگوں کا خون منجمد ہوچکا ہو - جو جمالیاتی قدروں کے پیچھے اپنی ساری گرمی اور حرارت کھو چکے ہیں ' ان کے لیے روح میں بالیدگی ' نظر میں بلندی اور بازو میں قوت پیدا کرنا ' انہیں حرکت ' عمل اور پیکار کا فلسفہ سکھانا ' انہیں خوداعتمادی کا سبق پڑھانا ' انہیں مغرب کی خیرہ کُن برق ساماںیوں کے آگے مستحکم رکھنا ' کیوں جرم قرار دیا جائے - اقبال جہاد کے قائل ہیں - مگر ہر جگہ نہیں - صرف دو صورتوں میں اقبال جہاد کو جائز سمجھتے ہیں - محافظانہ اور مصلحانہ - اس کے سوا جہاد کو وہ جائز نہیں کہتے - وہ جنگ کے حامی نہیں - مسلمانوں میں قوت کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں - خود کہتے ہیں کہ جو مزا کبوتر پر جھپٹنے میں ہے وہ کبوتر کے لہو میں نہیں - گویا مقصود بالذات خوں‌ریزی نہیں ' اپنے آپ کو تندرست رکھنا ہے - موجودہ حالات میں جب کہ تن‌آسانی تمام قوم میں عام ہوگئی ہے اور فلسفۂ ویدانت

کے منفی اثرات نے مسلمانوں کو مغلوب کرنا شروع کردیا ہے' یہ جان‌دار فلسفہ جو خون جگر سے لکھا جائے اور جس میں مستی کردار کے سوا کچھ نہ ہو ہر طرح مناسب ہے - اقبال صرف رزم کے نہیں بزم کے بھی مرد میدان ہیں - وہ صرف سپاہی پیدا نہیں کرنا چاہتے وہ انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں - ان کا نصب‌العین ان اشعار سے واضح ہوگا :—

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ‌خواں ہوجا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

---

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

---

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے‌داغ' ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

یہ تعلیم عین اسلام کی تعلیم ہے' جو صلح و آشتی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا' جس کے نام میں امن کا لفظ موجود ہے - مگر جس نے بوقت ضرورت یا بہ وجہ مجبوری مرد غازی کی جگرتابی بھی دکھائی -

جنگ کو بے وقت کی راگنی کہنے والے آج بہت سے موجود ہیں - اقبال جنگ کے ہرگز حامی نہیں نہ ان کے الفاظ میں "کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے"- اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "دین اسلام' نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے - ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے - خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی' قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے - مسولینی نے حبشہ کو محض جوع‌الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا - مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا - فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں' دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے" -

ابھی اقبال کے خلاف اعتراضات ختم نہیں ہوئے - اخترحسین رائے‌پوری اپنے مضمون ادب اور زندگی (مطبوعہ رسالہ اردو جولائی سنہ ۱۹۳۵ع) میں فرماتے ہیں:—

"اقبال فاشسطیت کا ترجمان ہے - اور یہ در حقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ‌داری کے سوا کچھ نہیں.........تاریخ اسلام کا ماضی اقبال کو بہت شان‌دار معلوم ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے - اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں - حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں اور تاریخ کے کسی دور میں بھی کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا.........بہر حال وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی اقبال قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح مسولینی - اگر فرق ہے تو اتنا ہے کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاشسٹوں کی طرح

وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے - فاشزم کا ہمنوا ہوکر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے - ملوکیت و سرمایہ‌داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقہ کا ایک آدمی ہو سکتا ہے - اقبال مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا - وہ اسلامی فاشسٹ ہے" -

اس رائے کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے -

۱- اقبال فاشسٹیت کا ترجمان ہے -

۲- ملوکیت و سرمایہ‌داری کا یونہیں سا دشمن ہے -

۳- جمہور کو حقیر سمجھتا ہے -

۴- مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا -

اقبال کو فاشسٹ کیوں کہا جاتا ہے - کچھ لوگ تو اس وجہ سے یہ دھوکا کھاتے ہیں کہ بال جبریل میں اقبال نے مسولینی کے متعلق ایک نظم لکھی ہے جس میں مسولینی کی تعریف کی ہے اور روما کی مردہ سر زمین میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے پر اسے مبارک‌باد دی ہے - نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

رومتہ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر

ایں‌کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ

نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب

حالانکہ وہ ضرب کلیم کی وہ نظم بھول جاتے ہیں جس میں مسولینی اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے خطاب کرتا ہے - نظم کا آخری شعر ہے :-

پردۂ تہذیب میں غارت‌گری ' آدم کشی

کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اس کے علاوہ چونکہ اقبال نے کہیں کہیں اشتراکیت کے بعض اصولوں پر اعتراض

کہا ہے اس لیے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فاشسٹ ہیں حالانکہ وہ ان تمام چیزوں سے بلند ہیں - میں نے اُن سے ایک خط میں دریافت کیا تھا کہ فاشزم اور کمیونزم کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں - اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ "میرے نزدیک فاشزم اور کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور "ازم" کوئی حقیقت نہیں رکھتے - میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے"- اب اس کے بعد معترضین کی تشفی ہوجانی چاہیے - مگر مزید اطمینان کے لیے میں فاشزم کا تجزیہ کر کے یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ اقبال کو کیوں فاشسٹ کہا گیا اور در حقیقت وہ اس سے کتنے دور ہیں -

فاشزم در حقیقت سرمایہ‌داری کی ایک ترقی‌یافتہ شکل ہے - جب ہر طرف سے سرمایہ‌داروں پر نرغہ ہونے لگا تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے فاشزم کی شکل اختیار کی - اس کی کوئی خاص (Ideology) نہیں - سوشلزم کی مخالفت اس کے تخیل کی اساس ہے - اس کا مقصد جمہور کی فلاح و بہبود نہیں ' جمہور کو اپنے پنجۂ اقتدار میں رکھنا ہے - اس اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے وہ مزدوروں کا ہمدرد بن‌کر سامنے آیا ہے - تشدد کے ماحول میں یہ پھلتا پھولتا ہے - بغیر تشدد کے فاشزم کا وجود ہی ممکن نہیں - جبر و استبداد اس کا حربہ ہے اور موقع بے موقع یہ اپنی طاقت کے استعمال سے نہیں چوکتا - اختلاف آرا اُسے گوارا نہیں - آزادیء رائے کا یہ قائل نہیں - حریت فکر کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے - عوام کو ورغلانے کے لیے وطن یا رنگ یا نسل کا کوئی ڈھونگ کھڑا کرتا ہے - مقصد اس سے اپنے طبقے کے اقتدار کو مستحکم کرنا ہوتا ہے - فاشزم نے ایک چیز سوشلزم سے بھی لی ہے - یہ ہے پیداوار کے ذرایع پر سرکار کا قبضہ - مگر اس کا مقصد مناسب اور موزوں تقسیم نہیں - ایک خاص طبقہ

کے نفع کے لیے تقسیم ہے - اقبال کو ان میں سے کسی اصول سے ہمدردی نہیں
ہاں صرف ایک چیز ایسی ہے جو فاشزم میں پائی جاتی ہے اور اقبال
بھی اس کے حامی معلوم ہوتے ہیں - یہ ہے آمریت (Dictatorship) -
اقبال نے اپنا فلسفہ زندگی نطشے سے اخذ کیا ہے - وہ مرد منتظر کے
قائل ہیں - فرق صرف یہ ہے کہ نطشے کا "فوق‌البشر" اقبال کے ہاں
اکر "خیرالبشر" ہوگیا ہے - اب جہاں کہیں وہ یہ دیکھتے ہیں کہ
ایک زبردست شخصیت نے لاکھوں بےجان روحوں کو دوبارہ زندگی بخشی ہے
اور انہیں سوز آرزو سے مالامال کر دیا ہے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں -
اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ویسا ہی ہونا چاہتے ہیں - میں نے انہیں لکھا
تھا کہ "مسولینی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس میں مجھے تناقض
نظر آتا ہے" - جواب میں ارشاد ہوا کہ "اگر اس بندۂ خدا میں Devil اور Saint
دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں" - میں سمجھتا
ہوں کہ اقبال ایک لحاظ سے ٹھیک کہتے ہیں - وہ چونکہ فاشزم اور کمیونزم
دونوں کو ذرا بلندی سے دیکھتے ہیں اس لیے دونوں کی خامیوں اور خوبیوں
پر ان کی نظر زیادہ صحت سے پڑتی ہے -

اقبال ملوکیت اور سرمایہ‌داری کے دشمن ہیں مگر یوں ہی سے - یہ
ایک عجیب اعتراض ہے - مضمون طویل ہوتا جارہا ہے - بہت سی مثالیں دی
جاچکیں اور یہ اچھی طرح واضح ہوچکا کہ اقبال نے ہمارے یہاں سب سے پہلے
ملوکیت و استعماریت اور سرمایہ‌داری کے خلاف آواز بلند کی اور مزدوروں کی تحریک
سے ہمدردی ظاہر کی - مزید تفصیلات کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - بال جبریل کی
صرف ایک نظم اور یہاں درج کی جاتی ہے - جس جوش و خروش' جس جذبۂ
صادق' جس خلوص کی یہ آئینہ‌دار ہے اس کا اندازہ اہل نظر ہی کرسکتے

ھیں — "فرمان خدا فرشتوں کے نام" -

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ھلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاھیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دھقان کو میسر نہ ھو روزی
اس کھیت کے ھر خوشۂ گندم کو جلا دو

سلطانیء جمہور کا آتا ھے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رھیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے ' صنماں را بطوافے
بہتر ھے چراغ حرم و دیر بجھادو

میں ناخوش و بیزار ھوں مر مر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

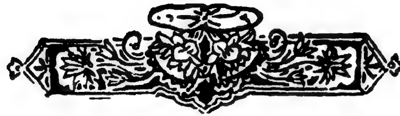
اب اگر کہیں انہوں نے یہ لکھا ھے کہ "از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید" تو کیا اختر صاحب کا یہ دعویٰ ھے کہ یہ ممکن ھے؟ یا کہیں انہوں نے مزدوروں کی حکومت کے متعلق فرمایا ھے کہ "اگر خسرو نباشد کوہ کن ھست" تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ضرور ان کے خلاف ھیں بالکل غلط ھے - مزدوروں کی حکومت میں بھی زیادتیاں ھو سکتی ھیں اور ھوئی ھیں - وھاں بھی اختلاف رائے کی گنجایش نہیں وھاں بھی احتساب ھے اور ایسا احتساب جس پر سرمایہ دار حکومتیں شرمائیں - وھاں بھی آمریت ھے - وھی

آمریت جس کی بنا پر مسولینی گردن‌زدنی ہے - وہاں بھی دور عبوری کو اتنا طول دیا گیا ہے کہ منزل مقصود رہی معلوم ہوتا ہے - اس لیے اگر کوئی شاعر اس افراط و تفریط کی طرف اشارہ کرے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ اس نظام حکومت کے خلاف ہے' ہرگز صحیح نہیں - اختر صاحب مسولینی والی نظم پڑھتے ہیں' لینن والی نظام نہیں پڑھتے - وہ قیصر ولیم کے ارشادات سے برافروختہ ہوجاتے ہیں' 'فرمان خدا فرشتوں کے نام' ان کے ذہن سے اُتر جاتا ہے - اقبال جمہوریت کے خلاف نہیں' لیکن جب آپ جمہوریت کے نام پر ہر ممکن زیادتی کرنے کو تیار ہوں اور اس کا جواز یہ پیش کریں کہ کثرت رائے سے جو بات منظور ہو وہ آخری بات ہے تو ایک حکیم شاعر کا فرض ہے کہ نرمی سے یہ کہے کہ "از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آمد" -

اقبال کیا نہیں ہیں - یہ سب تو میں کہہ چکا' لیکن جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کیا ہیں' یہ بحث ادھوری رہ جائے گی - اس کے لیے میں خود اقبال کے الفاظ پیش کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں :—

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست' نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی' نہ صفاہاں' نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق‌بین و حق‌اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پر سوز و نظرباز و نکوبین و کم‌آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند



# افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

# افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

## ۱- آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں اردو، ھندی اور ھندستانی کا قضیہ

۲۶ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں ڈاکٹر محمد اشرف نے زبان کے مسئلہ پر یہ قرار داد پیش کی :—

"چونکہ سارے ھندستان کے لیے ایک مشترکہ زبان ھونے کا مسئلہ بہت اھم ھے اور چونکہ ھندی اردو کی بحث نے ایک فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لی ھے، اس لیے یہ کمیٹی اس بات کو دھراتی ھے کہ کانگرس ھندستانی زبان کو جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ھے، ھندستان کی قومی زبان مانتی ھے اور کانگرس کے تمام آدمیوں کو ھدایت کرتی ھے کہ وہ ھندستانی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ھندی اردو کی بحث سے الگ رھیں یہ کمیٹی ایک ھندستانی بورڈ مقرر کرتی ھے جو ھندستانی زبان کی ترقی کے واسطے ایک جامع اسکیم مرتب کرے اور کانگرس کے سالانہ اجلاس سے پہلے پہلے اپنی رپوٹ داخل کر دے" -

اسی قرار داد کی تائید میں ڈاکٹر اشرف نے ایک مدلل اور بے لاگ تقریر کی جس کے اقتباسات کانگرس کے اخبار "ھندستان" سے نقل کیے جاتے ھیں :-

"ڈاکٹر اشرف نے تمدنی معاملات اور زبان کے مسئلے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے سیاسی مسئلوں کے علاوہ تمدنی معاملات بھی ہیں اور اِن معاملات میں ہمیں غیر مبہم اور صاف رویّہ اختیار کرنا چاہیے' کیوں کہ یہ معاملات سیاسی مسئلوں سے زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں اور آگے چل کر جو اُلجھنیں اور دشواریاں ہوں گی وہ اور زیادہ درد ناک ہوں گی - صوبوں کے سیاسی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے - یہ ہماری روز مرہ کی ضرورت کی چیز ہے - ہماری زندگی اور ہمارے ماحول کی مانگ ہے - زبان کے معاملے میں ہماری سیاسی پالیسی کی جھلک نظر آتی ہے - زبان ایک تاریخی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور مختلف طبقوں اور نسلوں کے درمیان باہمی رشتہ پیدا کرتی ہے اور اُن کو مستحکم کرتی ہے - ہماری زبان سیکڑوں برس کے میل ملاپ اور ایک جگہ کے رہنے سہنے سے پیدا ہوئی ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنے لیے کسی زبان کو ڈھونڈھیں گے تو ہمیں صرف وہی ایک زبان ملے گی جس کو ہم "ہندستانی" کہتے ہیں اور یہی ایک زبان ہمارے تعلیمی مسئلوں کو حل کر سکتی ہے -

ہندستانی زبان کے ساتھ ایک نئے ادب کا تصور وابستہ ہے اور اِس ادب کے ساتھ ہی ساتھ ہماری جدوجہد اور ہمارے عوام کی مانگیں بھی آگے بڑھیں گی - اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ ہماری زبان کو بھی آگے بڑھنے کا موقع مل رہا ہے - اس سلسلے میں رسم الخط کی بحث بالکل فضول ہے کیوں کہ اِس مسئلے کے متعلق کانگرس بالکل صاف فیصلہ کرچکی ہے -

میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ (جن کا نام لینے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں) اِس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں - لیکن میں صاف طور پر بتا دینا

چاہتا ہوں کہ میں لفظ "ہندی" کو بالکل مہمل خیال کرتا ہوں - میں اپنے دکھنی بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ 'ہندستانی' کا لفظ اختیار کریں کیوں کہ "ہندی" کے لفظ میں اُردو کے مقابلے کی ایک روح نظر آتی ہے اور یہ ایسے لوگوں کا ترکہ ہے جو کسی دقیانوسی تمدن کے لیے بے چین رہتے ہیں -

میں آپ کو آگاہ کردینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ 'ہندی' کا لفظ اسی طرح استعمال کرتے رہے تو یہ ایک بہت ہی خطرناک بات ہوگی - آج کل سامراجی طاقتیں تمدن کی نقاب ڈال کر سامنے آرہی ہیں اور ایسی حالت میں میں اِن تحریکوں کی حمایت نہیں کر سکتا جو ایک ڈوبتے ہوے تمدن کے لیے چل رہی ہیں - جو لوگ اپنی محدود ذہنیتوں کے ساتھ اِس بحث میں پڑتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ایک محدود طبقے سے ہے' میری راے میں وہ پورے اور سچے کانگرسی نہیں ہیں - میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کیوں ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کے دل میں ایک گوشہ ہندی کے لیے بھی رہے -

ہندی اور ویدک تصورات کی بابت میں نے جو کچھ کہا ہے جان بوجھ کر کہا ہے - اور میں آپ کے خیالات سے قطع نظر کرکے کہوں گا کہ ہم نے کانگریس کی قربانیوں اور اس کے فیصلے کے ماتحت جو راستہ اختیار کیا ہے وہ عوام کا راستہ ہے اور آپ کو اس سے ہٹنا نہ چاہیے - جس طرح میرے نزدیک اردو کے لفظ میں کوئی مذہبی تقدیس نہیں ہے اسی طرح سنسکرت کے لفظ کو بھی میں مقدس نہیں سمجھتا - میرے لیے تقدیس کی بات یہ ہے کہ غریب لوگ مل ملا کر اپنا بھلا سوچیں اور تمام فرقوں کے جذبات میں توازن پیدا کریں -

'ہندی' اور 'ہندستانی' کے تذکرے بیکار ہیں - اور اگر آپ ان الجھاوں

کو مٹا کر توازن نہیں قایم کریں گے تو ہم بکھر جائیں گے اور ترقی پسندی کی راہ سے دور ہو جائیں گے اور ہماری بابت کہا جائے گا کہ یہ حصہ 'ہندی' ہے اور وہ حصہ 'ہندستانی' ہے ۔

سن لیجیے' ہماری زبان نہ 'ہندی' ہے اور نہ 'ہندی ہندستانی' ۔ میرے خیال میں یہ باتیں کرنا ایک طرح کی سیاسی رجعت پسندی ہے ۔

آپ کو میرے الفاظ ناگوار ہوئے ہوں گے لیکن میرے سامنے وہ تجربات ہیں جو مجھے مسلمانوں میں کام کرنے میں ہوئے ہیں ۔ یہ معاملہ اگرچہ تمدن سے متعلق ہے لیکن جو لوگ سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کی شکل سیاسی ہو چکی ہے ۔ لوگ 'ہندستانی' کی جگہ 'ہندی' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے درحقیقت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں' اس لیے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ اپنی سرگرمیوں میں 'اردو' کا بھی خیال رکھیں ۔"

کیسی معقول تجویز اور کیسی معقول تقریر تھی' لیکن کانگرس کمیٹی کے پرکھوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ ڈاکٹر اشرف نے اپنی تقریر میں بہت بے لاگ اور کھری کھری باتیں سنائی ہیں ۔ مجھے یا مجھ جیسے کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق نہ تھا لیکن ڈاکٹر اشرف کو یہ حق حاصل تھا اس لیے کہ وہ سالہا سال سے کانگرس کا کام کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنے اس رویّے کی بدولت بہت سی تکلیفیں اٹھائیں' رسوائی سہی اور تھوڑی بہت قربانی بھی کی ۔ انھوں نے جو کچھ کہا اپنے تجربے کی بنا پر کہا اور سچائی اور دل سوزی سے کہا ۔ جب ایسے شخص کی شنوائی نہیں ہوئی تو دوسروں کے لکھنے اور کہنے سننے کا کیا اثر ہو سکتا ہے ۔

لطف یہ ہے کہ اس تجویز سے اختلاف کیا تو کس نے ؟ حضرت مولانا

ابوالکلام آزاد مدظلہ و زاد حریتہ نے - مولانا نے میری درخواست پر کانگرسی حکومتوں کے نام سرکلر جاری کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ ہندستانی کا لفظ استعمال کریں - لیکن مولانا اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ باوجود اس کے کانگرس کے لوگ اور کانگرس کے وزرا کھلم کھلا ہندی کا پرچار کر رہے ہیں - کبھی انہوں نے ان سے پوچھا بھی کہ یہ کیا کر رہے ہو - پھر ایسے سرکلر کا نتیجہ !

مولانا نے اختلاف کی ایک وجہ تو یہ بیان کی کہ "چونکہ حکومت بہار اس قسم کی ایک کمیٹی مقرر کر چکی ہے اس لیے کسی نئی کمیٹی کی ضرورت نہیں" - صوبۂ بہار نے اگر کوئی کمیٹی مقرر کی ہے تو بہت اچھا کیا، لیکن اس کا ڈاکٹر اشرف کی تجویز سے کیا تعلق - یہ ضرور نہیں کہ صوبۂ بہار کے فیصلے کو سارا ہندستان مان لے - یہ تجویز تو کانگرس کی طرف سے ہونی چاہیے تاکہ اس کے فیصلے پر تمام کانگرسی حکومتیں پابند ہوں - مولانا کا یہ کہنا کہ "اس مسئلے پر آج کل بلا وجہ اختلافات پیدا ہوگئے ہیں - ہندی سے دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی زبان مراد لی جاتی ہے اور اردو سے فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی زبان سمجھی جاتی ہے" سراسر غلط ہے - پہلے کبھی ایسا ہوتا ہوگا لیکن اب ہندی زبان وہ زبان نہیں رہی جو آدمیوں کی زبان ہے - حیرت ہے کہ مولانا دیکھتے اور سنتے ہوئے کیسے انجان بن جاتے ہیں -

گاندھی جی نے حال ہی میں اپنے اخبار "ہریجن" میں ہندستانی، اردو اور ہندی کے متعلق کچھ ارشادات فرمائے ہیں - شروع میں اس اختلاف پر افسوس ظاہر کیا ہے جو معمولی بات ہے - اس کے بعد وہی فرمایا ہے جو کانگرس والے اکثر طوطے کی طرح دھرا دیا کرتے ہیں کہ جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے ہندستانی

اس کی انیشنل زبان اور ہندستان کی بین صوبجاتی زبان ہے - پھر فرماتے ہیں کہ ہندی ہندستانی کا مقابلہ تو ہے ہی نہیں' مقابلہ تو ہندستانی اور انگریزی کا ہے - کیا خوب! اب تک جو یہ سب جھگڑے ہوتے رہے اور جن میں گاندھی جی برابر شریک رہے وہ ہندی اردو یا ہندستانی کے جھگڑے نہ تھے بلکہ ہندستانی اور انگریزی کا مقابلہ تھا -

فرماتے ہیں کہ "ہندی اردو قضیے کی کوئی بنیاد ہی نہیں - کانگرس کی ہندستانی نے تو ابھی کوئی صورت ہی اختیار نہیں کی' یہ اُس وقت بنے گی جب کانگرس کی تمام کارروائیاں صرف ہندستانی میں ہوں گی" - لیکن گاندھی جی کو اس کا بھی علم ہے یا نہیں کہ اسی اثنا میں ایک ایسی زبان بنائی جارہی ہے جو نہ ہندستانی ہے نہ ہندی ہے نہ اردو' بلکہ جو انسانوں کی زبان ہی نہیں - اور جب کانگرس کی کارروائیوں کا ہندستانی میں انجام دینے کا وقت آئے گا تو وہ اس نئی زبان میں بولی اور لکھی جائیں گی - شاید گاندھی جی اسی وقت کا انتظار فرما رہے ہیں - اور بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ آپ اس مضمون کے ضمن میں اس بات پر افسوس کا اظہار فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کی کارگزاریوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور افسوس ہے کہ انھوں نے مسرت اور فخر کے ساتھ اس تعریف کو نہیں دیکھا جو ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی زبان کی کی ہے یعنی ہندی وہ زبان ہے جو شمالی ہندستان میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور اردو اور دیو ناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے" - چلیے قصہ ہی ختم ہو گیا - اب ہم اس پر فخر و مسرت ظاہر کریں یا رنج و افسوس - اب اس نئی تعریف کی رو سے ہندی' ہندستانی اور اردو ایک ہو گئیں اور بحث ختم - گاندھی جی کا یہ مضمون اُن کی اکثر تحریروں کے مقابلے میں پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے -

اس میں کوئی قطعی اور فیصلہ کن بات نہیں بلکہ الٹا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے -
ایک الزام یہ بھی ہے کہ بہت ہی کم ایسے مسلمان ہیں جو هندی کے عالم
کہے جاسکیں - حالانکہ هندؤں میں بہت سے اردو کے عالم هیں - اور ان
میں انھوں نے دو نام پیش کیے هیں ایک پنڈت موتی لال کا اور دوسرا سر تیج
بہادر سپرو کا - اصل هندی کے شاعر اور ادیب اب بھی مسلمانوں میں موجود
ہیں لیکن جدید هندی کے نہیں - اس لیے کہ یہ نئی زبان ضد میں بنائی
گئی اور ضد سے سیکھی جاتی ہے - مسلمانوں کو اس میں مہارت حاصل کرنے
کی کوئی وجہ نہیں - هندو اردو دانوں میں دو نام پیش کیے ہیں جن میں سے ایک
انتقال کر گئے اور دوسرے بوڑھے هیں - گاندھی جی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ
نئی پود نئی زبان سیکھ رهی ہے اور اردو سے بالکل ناآشنا ہے - یہ زهر نئی
هندی کے حامیوں اور اردو کے مخالفوں نے پھیلایا ہے - هم سمجھے تھے کہ سرحد
کی خوشگوار اور صحت بخش آب و هوا میں اُن کے دماغ و قلم سے جو افکار
تراوش پائیں گے وہ هماری هدایت اور روشنی کا موجب هوں گے لیکن ایسا معلوم
هوتا ہے کہ سرحد پہنچ کر وہ بھی خان عبدالغفار خاں کے همسر هوگئے هیں -

اِن لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لفظی تعریف کر دینے یا اپنے آئین میں
کوئی دفعہ بڑھا دینے سے لوگوں کے ضمیر اور جذبات کو خاموش اور ملک کو
بے وقوف بنایا جا سکتا ہے - لیکن یہ ابلہ فریبی اور عیاری کب تک اور کہاں تک!
آخر اس کی کوئی حد بھی ہے -

سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ ڈاکٹر اشرف کی تجویز جب مسترد
کر دی گئی تو ورکنگ کمیٹی نے ایک بے معنی قرارداد یہ منظور کی کہ
" ورکنگ کمیٹی کو افسوس ہے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں
هندستانی کے متعلق ڈاکٹر اشرف کی قرارداد بعض الجھنوں کی وجہ سے جو چند

دو چند ترمیموں کی بنا پر پیدا ہو گئی تھیں' مسترد ہو گئی - لیکن اس قرارداد کے رد ہو جانے سے کانگرس کے رویّہ پر جس کی وضاحت کانگرس نے دستورالعمل کی اس دفعہ میں کی گئی ہے' کوئی اثر نہیں پڑتا "-

اس کے بعد دفعہ ۱۹ نقل کی گئی ہے - اس سے زیادہ احمقانہ اور دوسروں کو بیوقوف بنانے والی کوئی تجویز ہو سکتی ہے ؟

ڈاکٹر اشرف کی قرارداد میں یہ امور تھے :—

( ۱ ) ہندی اردو کے معاملے میں کانگرس کے رویہ کو پسند نہیں کیا جا رہا ہے -

( ۲ ) کانگرس ہندستانی زبان کو جو اردو اور دیو ناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے ہندستان کی قومی زبان مان لے -

( ۳ ) کانگرس اپنے تمام آدمیوں کو ہدایت کرے کہ وہ ہندستانی کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ہندی اردو کی بحث سے الگ رہیں -

( ۴ ) ایک ہندستانی بورڈ مقرر کیا جائے جو ہندستانی زبان کی ترقی کے واسطے ایک جامع اسکیم مرتب کرے -

اس ساری تجویز میں کون سی ایسی بات تھی جو نا معقول کہی جا سکتی ہے یا جو کانگرس کے اصول کے خلاف تھی' لیکن باوجود اس کے ایک طویل بحث کے بعد جس میں اجلاس کا آدھا وقت صرف ہوا' یہ تجویز کلیۃً مسترد کر دی گئی - اس کے بعد ورکنگ کمیٹی نے آنسو پونچھنے کی جو کوشش کی ہے وہ محض بے نتیجہ ہے - اس قسم کی کوششیں محض ابلہ فریبی اور سیاسی چالیں ہیں -

# ۲ - آنریبل شری سمپورنا نند وزیر تعلیم یو - پی
اور
# آر - ایس پنڈت صاحب سکریٹری پراونشل کانگرس کمیٹی
کی
# ہندی نوازی

ایک طرف تو کانگرس ورکنگ کمیٹی' مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی زبان کے معاملے میں انڈین نیشنل کانگرس کی قرار داد اور عقیدے کو پیش کرکے اطمینان دلا رہے ہیں کہ کانگرس اور ملک کی زبان ہندستانی ہے اور دوسری طرف اسی کانگرس کے وزیر اور دوسرے ارکان نئی ہندی اور دیوناگری رسم خط کی اشاعت پر زور دے رہے ہیں - یو - پی کے وزیر تعلیم کی تقریر جو سرکاری محکمے کی طرف سے شایع کی گئی ہے اور اکثر اخباروں میں نقل ہوچکی ہے' ایسی زبان میں ہے جو اس ملک کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہو سکتی - عام لوگ تو اُسے کیا سمجھ سکتے ہیں' اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں - وہ یا تو جنّات کی زبان ہو سکتی ہے یا راکشسوں کی -

ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے جو اڈریس شری سمپورنا نند کی خدمت میں پیش کیا اس کے جواب میں انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ "ہندی صرف شمالی ہند کے صوبوں ہی کی زبان نہیں بلکہ سارے ہندستان کی عام زبان ہے اور یہ ایسی ہونی چاہیے کہ بنگال' گجرات اور جنوبی ہند کے لوگ بھی سمجھ سکیں" - اس کے بعد وہ فرماتے ہیں "اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندی جسے ہندستانی بھی کہتے ہیں آسانی سے جنوبی ہند کے باشندوں کی سمجھ میں آسکے تو لازم ہے کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کی کافی تعداد داخل کی جائے" - جب اس مشورے کے متعلق بعض حلقوں میں اعتراض ہوا تو

مسٹر سمپورنانند نے اس کے متعلق گاندھی جی سے فتویٰ طلب کیا اور گاندھی جی نے اس سے پورا اتفاق ظاہر کیا۔

گاندھی جی کا یہ نیا خیال نہیں وہ اور بابو راجندرا پرشاد اور اُن کے دوسرے رفقا یہ بات بار بار کہہ چکے ہیں۔ یہ وہی "ویدک تصورات" ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر اشرف نے اپنی تقریر میں کیا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ جنوبی ہند والے اسی وجہ سے اُن سے بدگمان اور ناراض ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندی کا صرف بہانہ ہے دراصل وہ اِس آڑ میں سنسکرت کو رواج دینا چاہتے ہیں اور ہماری زبان اور تہذیب کو مٹا دینے کے درپے ہیں۔ میں یہ سن کر ہنستا تھا اور مبالغہ سمجھتا تھا لیکن کانگرس والوں کی طرف سے جو عمل در آمد ہو رہا ہے اُسے دیکھ کر مجھے بھی شبہ ہونے لگا ہے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مدراس کی کانگریسی حکومت نے اپنے مدرسوں کے لیے جو ریڈریں لکھوائی ہیں وہ خالص ہندستانی زبان میں ہیں اور اُن میں کہیں سنسکرت کے بوجھل اور ناانوس لفظ نہیں پائے جاتے جس کی تائید گاندھی جی اور اُن کے رفیق کرتے ہیں۔ دکھشنی بھارت ناگری پرچار سبھا نے اپنے ٹریننگ اسکول میں انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کی ریڈریں جاری کی ہیں اور اپنے دوسرے اسکولوں کے لیے بھی وہ انجمن ہی کی ریڈریں مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ صرف رسم خط بدل دیں گے' زبان وہی رہے گی - ان تمام باتوں سے گاندھی جی اور اُن کے حامیوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے۔

مسٹر آر۔ ایس پنڈت سکریٹری پراونشل کانگرس کمیٹی کی تقریر جو انھوں نے کنیا کبج کالج لکھنؤ میں فرمائی' اس میں انھوں نے صاف طور پر طالبات کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ایک قرارداد منظور کرکے وزیر اعظم کی خدمت

میں بھیجیں کہ آیندہ سے تمام سرکاری مراسلات اور کاغذات میں ملک کے باشندوں کی زبان اور رسم خط استعمال کیا جائے - وہ اردو زبان اور اس کے رسم خط کو غیر ملکی خیال کرتے ہیں - ان کے خیال میں یو - پی میں عام طور پر وہی زبان بولی جاتی ہے جسے وہ آج کل هندی کہتے ہیں اور رسم خط بھی دیوناگری ہے - کیوں کہ یہ بہت بڑی اکثریت کی زبان ہے - ان کی راے میں اقلیت کی زبان قابل لحاظ نہیں - حالانکہ جس زبان کو وہ آج کل هندی کہتے ہیں وہ کہیں کی بھی زبان نہیں - کانگرس کی هندستانی کہاں گئی ؟ اور یہ فساد اُس صوبے میں پیدا کیا جا رہا ہے جو هندستانی کا جنم بھوم ہے- مجھے ایک معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے عدالتوں کے نام سرکلر جاری کیا ہے کہ آیندہ سے مدعی، مدعا علیہ، اپیلانت (مرافع) کے لفظ نہ لکھے جائیں اور ان کی جگہ "جھگڑو" اور "پلٹو" استعمال کیے جائیں - مدعی اور مدعا علیہ کے لفظ ایک ان پڑھ دیہاتی بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے اور آج سے نہیں صدیوں سے استعمال کرتا چلا آتا ہے، ایسی صورت میں ان کے خارج کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے - اگر یہ لفظ اس لیے نکالے جا رہے ہیں کہ یہ عربی لفظ ہیں تو یہ بھی غلط ہے، یہ لفظ اب ہماری زبان کے ہو گئے ہیں اور انہیں کوئی خارج نہیں کر سکتا - ان کی جگہ ایسے بھدے اور بے معنی لفظ رائج کرنا کوتہ اندیشی کی دلیل ہے - اصل غلطی یہ ہے کہ سیاسی لوگ حکومت کے غرور میں اپنے آپ کو ماہر زبان بھی سمجھنے لگے ہیں-

# ۳ - صوبۂ متوسط (سی - پی)

صوبۂ متوسط کی حالت سب سے نرالی ہے - ودیا مندر اسکیم نے مسلمانوں میں عجیب و غریب جوش پیدا کردیا ہے - ۱۵ ستمبر کو بیس ہزار مسلمانوں کا مجمع جس شان سے مجلس قانون ساز (لیجس لیٹو اسمبلی) پر اپنی فریاد لے کر پہنچا ہے وہ سی - پی کی تاریخ میں یادگار چیز ہوگی - اس میں بوڑھے' جوان' بچے' امیر غریب سب ہی تھے اور دور دور سے آکر شریک ہوئے تھے - ہاتھوں میں ہزاروں کالے جھنڈے لہرا رہے تھے اور سینوں پر "اردو زندہ باد" کے تمغے لگے ہوئے تھے - جوش کی انتہا یہ تھی کہ عورتوں نے اپنے جلسے کر کے ودیا مندر اسکیم کے خلاف قراردادیں منظور کیں اور مردوں کو کہلا بھیجا کہ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے چوڑیاں اور ساڑھیاں حاضر ہیں - یہ مجمع دہکتی دھوپ میں کامل امن و امان کے ساتھ بارگاہ وزارت پر حاضر ہوا - آنریبل مسٹر شکلا وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ناکافی ہی نہ تھا بلکہ بہت مایوس کن تھا - ان کا سب سے پہلا جملہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس معاملے میں غلط فہمی ہوئی ہے - "غلط فہمی" کا لفظ بھی عجیب و غریب ہے - یہ ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے جو انگریزی تعلیم کی بدولت ہم تک پہنچا ہے - انگریزی زبان سیاست کاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اس لفظ میں سیاست کاری کے سارے انداز موجود ہیں - وہ اپنی ایک ادا سے ایک قوم کی زبان و تہذیب کو مٹانا چاہتے ہیں اور جب وہ بے بسی کے عالم میں فریاد کرتی ہے تو نہایت اطمینان سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے -

ودیا مندر اسکیم کے متعلق اس قدر کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اُس پر کسی زیادہ بحث کی ضرورت نہیں رہی - یہ اب سارے ہندستان کا مسئلہ

ہو گیا ہے - چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ نے بھی اس کے خلاف قرار دادیں منظور کی ہیں - میں نے اسی کے متعلق ایک کھلی چٹھی مہاتما گاندھی کے نام لکھی تھی' اس کا انھوں نے کچھ جواب نہیں دیا - لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی علالت سے گاندھی جی کو ایک بہت ہی معقول خط لکھا اور اس مسئلے کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ اس نام کی وجہ سے بہت شورش پھیلی ہوئی ہے اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت خراب ہوتے جارہے ہیں - اس مشکل کو آپ ہی حل کر سکتے ہیں - گاندھی جی نے حسب معمول ایک مختصر سا جواب دے کر ٹال دیا - جواب یہ تھا کہ - " میرے پاس مولوی صاحب کا خط نہیں ہے - میں ابھی شکلا جی کو لکھ رہا ہوں - آپ ضرورت سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں - میں معقول سمجھوتے کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہوں - میرے دل کو اطمینان ہوگا اگر میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے اس بات سے یاد کریں کہ میں نے دونوں قوموں کی صلح و آشتی میں مقدور بھر کوشش کی " -

معلوم نہیں گاندھی جی نے کیا لکھا اور شکلا جی نے کیا جواب دیا - اس سے قبل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی اس بارے میں مسٹر شکلا کو لکھا تھا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا -

۲۳ ' ۲۴ اکتوبر کو ناگپور میں صوبے کی اردو کانفرنس تھی - تخمیناً دس ہزار کا مجمع تھا اور لوگوں کے جوش کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان کو اپنی زبان سے کس قدر محبت ہے - اس کانفرنس میں بھی ودیا مندر کا ذکر خیر بہت کچھ رہا اور ایک قرارداد بھی اس کے خلاف منظور کی گئی - یہ جوش اب اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ حال میں سی-پی کی مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی نے سول نافرمانی کا تہیہ کر لیا ہے اور وہاں کے ممتاز اصحاب نے اس

میں شرکت کے لیے ایک عہد نامے پر دستخط کیے ہیں۔

کانفرنس کے ایام میں سی۔ پی کے وزرا نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ میں ان سے ملا۔ وہی ودیا مندر کا ذکر خیر۔ آنریبل مسٹر شکلا اور مسٹر مصرا اس بات پر آمادہ ہیں کہ ودیا مندر اسکولوں کے لیے جو چالیس پڑھنے والوں کی شرط ہے مسلمانوں کے لیے کم کرکے بیس کر دیے جائیں گے۔ موجودہ اردو مدرسوں کو بحال رکھا جائے گا۔ جو بند کر دیے گئے ہیں وہ جاری کر دیے جائیں گے۔ لیکن نام نہیں بدلنا چاہتے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نام کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ میں نے کہا نام کے پیچھے تو آپ پڑے ہیں۔ نام آپ کی ایجاد ہے اور آپ ہی اس پر اصرار کر رہے ہیں۔ مسٹر شکلا کو کچھ ضد سی آ پڑی ہے وہ اس مقدس نام میں کسی قسم کی تبدیلی کے روادار نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمیں فرقہ پرست کہتے ہیں اور فرقہ پرستی کا الزام دیتے ہیں لیکن یہ نام کس کی چغلی کھا رہا ہے جس میں سراسر فرقہ پرستی کی بساند آتی ہے۔ سب کچھ کہا مگر وہ نام بدلنے پر رضامند نہ ہوئے۔

سنا ہے کہ اب اس قضیے کے فیصلے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد ناگپور تشریف لانے والے ہیں۔ ان کا منشا ہے کہ اُن کے آنے تک سول نافرمانی ملتوی رکھی جائے۔ دیکھیے اُن کی گفت و شنید کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

ودیا مندر نے تو پہلے ہی آگ لگا رکھی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے ایک ترمیم کے جواب میں آنریبل مسٹر مہتا ممبر فنانس کی تقریر نے اِس جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مسلمان ممبران اسمبلی کی ترمیم یہ تھی کہ اسمبلی کے قواعد میں ہندی اور مرہٹی کو صوبے کی رائج زبانوں میں شمار کیا گیا ہے، اس قاعدے میں بجائے ہندی کے ہندستانی کا لفظ استعمال کیا جائے

اس پر مسٹر مہتا بہت برافروختہ ہوے - انھوں نے اس مطلبے کو نا معقول اور نا قابل عمل ٹھہرایا اور فرمایا کہ جو لوگ کانگرس کو قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے انھیں کانگرس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں - انھیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دے کر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں - کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نا معقول مطالبے منوانے کی کوشش کریں - انھوں نے سی - پی کے مسلمانوں کو Microscopic اقلیت سے تعبیر کیا - یعنی ایسی حقیر اقلیت جو بغیر خورد بین کے نظر نہیں آسکتی - یہ حکومت کے وزیر کی تقریر ہے یا مجذوب کی بڑ - حکومت کے نشے نے دماغ خراب کر دیا - مسٹر مہتا کو یاد رکھنا چاہیے کہ اقلیت اور اکثریت کوئی چیز نہیں - جماعت کی ہمت اور عزم ایک ادنیٰ اقلیت کو اعلیٰ اکثریت میں بدل دیتا ہے - انھیں بہت جلد معلوم ہو جاے گا کہ کون اقلیت میں ہے اور کون اکثریت میں - جب بیس ہزار مسلمان اسمبلی پر پہنچے تھے تو مسٹر مہتا نے انھیں خوردبین سے ملاحظہ فرمایا تھا یا خالی آنکھ سے - یہ ہے کانگرس کی قرارداد کی وقعت !

## ۴-صوبۂ بمبئی اور ہندستانی

' ہندی ' اور ' ہندی ہندستانی ' کے مغالطے سے نکل کر اب حکومت بمبئی نے مدارس میں ' ہندستانی ' کے جاری کرنے کا انتظام کیا ہے - اپر پرائمری مدارس میں اس کی تعلیم تین سال کی ہوگی - یعنی پرائمری مدارس کی پانچویں ' چھٹی اور ساتویں جماعتوں میں اور ثانوی مدارس کے

پہلے، دوسرے اور تیسرے درجوں میں اور انگریزی پڑھائی کے مدارس کی دوسری، تیسری اور چوتھی جماعتوں میں - آیندہ چل کر ہندستانی کی تعلیم تمام مسلمہ مدارس میں لازم کر دی جائے گی اور اُن میں اردو اور ہندی دونوں خطوں کا انتظام ہوگا - یہ طالب علم کی پسند پر موقوف ہوگا کہ وہ کس خط میں پڑھنا چاہتا ہے - جہاں کہیں طالب علم کی زبان ہندستانی نہیں وہاں (جیسا کہ اب ہو رہا ہے) تمام مدارس میں تعلیم طلبہ کی مادری زبان میں ہوگی - ہندستانی کا کام چلاؤ علم ایک زاید قابلیت سمجھی جائے گی لیکن وہ مادری زبان کے بجائے استعمال نہیں کی جائے گی - اس غرض کے لیے حکومت نے ایک جداگانہ اسکول بک کمیٹی بنائی ہے - اس کمیٹی کے ارکان یہ ہیں — پروفیسر دتو وامن پوتدار آنریری سکریٹری بھارت اتہاس سنشودھک منڈل پونا، مسٹر بی - ڈی ورما پروفیسر فارسی و عربی فرگسن کالج پونا، مسٹر سید نوراللہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پونا، مسٹر نرھری بھائی پارکھ سبرامتی آشرم، مسٹر بی - جے اکاڈ ہیڈ ماسٹر تی - وی سروجنک ہائی اسکول سورت، مسٹر این - کے مرزا ہیڈ ماسٹر اینگلو اردو ہائی اسکول ہبلی، مسز حامد علی اور مسٹر کے - جی دھرم دھکاری سکریٹری آکھل مہا راشٹر ہندی پرچار سمتی پونا -

میں نے آنریبل مسٹر کھیر وزیراعظم حکومت بمبئی کو لکھا کہ اس فہرست میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی (اسمعیل کالج) کا نام نہیں حالانکہ تمام صوبے میں وہی ایک اردو پروفیسر ہیں اور اردو تعلیم کا بہت کافی تجربہ رکھتے ہیں - انہوں نے خط کی رسید تو دی مگر اور کچھ نہیں لکھا -

سڈنہم کالج بمبئی میں کچھ طالب علموں نے اردو زبان لی ہے مگر

اِن کی تعلیم کا کالج میں کوئی انتظام نہیں جس کی وجہ سے طلبہ بہت پریشان ہیں - میں نے وزیر اعظم کو اس طرف توجہ دلائی - انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ سنہ ۱۹۳۹ع میں کوئی انتظام کر دیا جاے گا -

ایک طرف تو حکومت بمبئی ہندستانی کی تعلیم کا انتظام کر رہی ہے - دوسری طرف اسکولز کمیٹی بمبئی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ میونسپل اسکولوں کی ملازمت میں امیدوار ملازمت کے لیے مراشٹر بھاشاہ کی سند بزبان ہندی ایک زاید قابلیت متصور ہوگی - اگر بجائے ہندی کے ہندستانی ہوتی تو خیر ایک بات تھی لیکن ہندی کی لیاقت کو قابل ترجیح قرار دینا سراسر نا انصافی ہے - صوبۂ بمبئی کو ہندی سے کوئی تعلق نہیں' وہاں کے کسی علاقے کی زبان ہندی نہیں - میونسپل اسکولوں کو ہندی کی اشاعت کا ذریعہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں - اخبار "خلافت" بمبئی نے اس تجویز پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ہندی کی سند کے ساتھ ہی اردو کی سند کی شرط کیوں نہیں رکھی گئی ؟ اگر کسی مرہٹی یا گجراتی مدرسے میں پانچ یا دس طلبہ نے اردو پڑھنی چاہی تو کیا اسکولز کمیٹی ان کے لیے ایک خاص اردو مدرس مقرر کرے گی ؟ اس کے برعکس اگر اردو مدرسہ میں دس یا پانچ طلبہ ہندی پڑھنا چاہیں گے تو کمیٹی کو کسی خاص مدرس کی ضرورت نہ پڑے گی کیوں کہ تجویز مذکورہ بالا کے مطابق تو اردو کا مدرس پہلے ہی سے "ہندی" کی سند رکھتا ہوگا -

---

## ۵ - اردو کے متعلق دو فاضل یورپینوں کی رائے

کچھ دن ہوے سر رچرڈ ٹمپل نے جو بمبئی ٹاکیز کے ڈائرکٹر ہیں نشرگاہ بمبئی سے ہندستان کی زبان کے متعلق گفتگو کی کیوں کہ زبان کا تعلق 'فلم' سے خصوصیت کے ساتھ وابستہ ہے - انہوں نے اس بات پر

افسوس کا اظہار کیا کہ ہندستان کی عام زبان (لنگوافرینکا) یعنی پورے ہندستان کی زبان کا نام "ہندی" رکھ دیا گیا ہے - انھوں نے "افسوس" کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ اس نام کی وجہ سے خواہ مخواہ اختلاف اور منقشہ پیدا ہو گیا ہے - انھوں نے فرمایا کہ "بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی - لیکن اکثر فضلا کی یہ رائے ہے کہ اس قسم کا امتیاز سراسر غلط ہے" - انھوں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ہر شخص اپنی مادری زبان سننا پسند کرے گا لیکن قطع نظر اس کے ہندستان کی عام زبان یعنی وہ زبان جو مادری زبان کے بعد ہندستان کے کثیر التعداد اشخاص میں مقبول ہو سکتی ہے وہ "ہندستانی" ہے - سر رچرڈ نے ہندستانی کی یہ تعریف کی ہے - ہندستانی "وہ سادہ اردو ہے جس میں ہندی کے لفظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں بمقابلہ خاص اردو کے جس میں ان کی تعداد کم ہے" - سر رچرڈ کی یہ تعریف صحیح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو میں جدید ہندی کے مقابلے میں ہندی لفظ اور محاورے زیادہ ہیں -

سر ڈینی سن راس نے لندن کی انڈیا سوسائٹی میں ہندستان کی زبان پر ایک لکچر دیا جس کے ضمن میں انھوں نے فرمایا کہ "اردو ایک ایسی زبان ہے کہ جس میں ایک خالص آرین زبان کو لے کر مسلمانی زبان بنا لیا گیا ہے تاکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی بات چیت سمجھ سکیں" - اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "یہ ہندستان کی عام زبان یا لنگوافرینکا ہے جو مختلف قوموں کے لوگوں کو ایک شیرازے میں منسلک کرنے والی ہے" - سر ڈینی سن راس نے ان چند الفاظ میں اصلی حقیقت اور ماہیت کو بیان کر دیا ہے -

---

# ۲ - ریاست الور میں اردو کا دوبارہ رواج

محمد بہلول خاں دانا صاحب سکریٹری انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ نے اطلاع دی ہے :-

" آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ کی مساعی بار آور ہو رہی ہیں اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں اردو پھر سے جگہ پکڑ رہی ہے اور سرکاری دفاتر میں قبولیت پا رہی ہے - چنانچہ الور اسٹیٹ گزٹ میں حال ہی میں یہ اعلان ہوا ہے کہ الور میں اردو سرکاری زبان رہے گی اور وہاں کی عدالتوں میں سنہ ۱۹۴۰ع سے اردو میں تمام کار روائی ہوگی اور ہر ایک افسر اور اس کے ماتحت اہل کاروں کو اس عرصے میں اردو زبان میں مہارت حاصل کرکے امتحان پاس کرنا لازمی ہوگا " -

انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ کی یہ کامیابی قابل مبارک باد ہے - محمد بہلول خاں دانا صاحب بہت مستعد اور پر جوش شخص ہیں اور اردو کی اشاعت میں بڑا کام کر رہے ہیں -

پہلے وسط ہند کی تمام ریاستوں کی دفتری زبان اردو تھی ' لیکن پنڈت مدن موہن مالویہ اور ان کی جماعت کی پے در پے کوششوں سے ہندی ہوگئی - اس پر بھی زبان وہی رہی صرف رسم خط بدل گیا - اب جدید ہندی کی تحریک کے بعد بعض ریاستوں میں زبان بدلنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے چنانچہ ریاست گوالیار سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سرکاری اور دفتری زبان میں خالص سنسکرت داخل کی جا رہی ہے اور اردو زبان اور اردو رسم خط کی طرف سے بے توجہی ہی نہیں بلکہ اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے - یوں کہنے کو وہاں اردو پڑھانے کا بھی انتظام ہے لیکن عملاً اردو خواں

طلبہ کو وہ آسانیاں حاصل نہیں جو ہندو والوں کو ہیں - وکٹوریہ کالج میں سنسکرت ' ہندی' مرہٹی کا انتظام ہے اور نہیں ہے تو اردو کا - اگر یہی حال رہا تو ریاست کے مسلمان اردو پڑھنے لکھنے سے محروم ہو جائیں گے -

- - -

## ۷ - جبل پور کی انجمن ترقیء اردو کا قابل تعریف کام

جبل پور کی انجمن جس مستعدی' جوش اور شوق سے کام کر رہی ہے وہ بہت لائق تحسین ہے - اس انجمن نے شہر کے محلوں اور مضافات شہر میں متعدد اردو کے شبینہ مدارس کھولے ہیں ارکان انجمن اپنے شوق سے ان میں تعلیم دیتے ہیں اور یہ مدارس ارکان انجمن اپنے خرچ سے چلا رہے ہیں جناب عطاءالرحیم صاحب ایم - اے ' ایل ایل - بی علیگ)' بی ٹی (ناگ)' ای ٹی (ایڈنبرا) صدر انجمن اسلامیہ ہائی اسکول و صدر انجمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں - یہ بہت پر جوش اور فاضل شخص ہیں اور ملک کے موجودہ حالات کو خوب سمجھتے ہیں - شبینہ مدارس اوماٹی میں محمد ایوب خان صاحب یوسف زئی' بی - اے' ایل ایل - بی' اقبال مرزا غزنوی صاحب' مولانا ادم حسن صاحب انصاری' سید مختار علی صاحب' سید لیاقت علی صاحب اعزازی طور پر خدمت انجام دیتے ہیں - مدرسۂ شبینۂ نفیس گنج (جبل پور) کے تمام اخراجات جان محمد صاحب ٹھیکہدار ادا کرتے ہیں اور حافظ عبدالرشید صاحب اس مدرسے کے نگران ہیں -

مدرسہ شبینہ گڑھا (شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر) قاضی قمرالدین صاحب کی نگرانی میں جاری کیا گیا ہے - اس مدرسے کے تمام مصارف قاضی صاحب ادا کرتے ہیں -

ان مدارس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تعلیم پاتے ہیں -

شفیق مرزا غزنوی شریک معتمد و مہتمم شبینہ مدارس کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ انجمن دیہات میں بھی اردو کی اشاعت کا انتظام کر رہی ہے -

## ۸ - مالیبار میں اردو

ملیبار میں انجمن کے اردو مدارس کامیابی سے چل رہے ہیں- موپلوں میں اردو کا شوق ہو چلا ہے اور وہاں کے مختلف مقامات سے درخواستیں وصول ہو رہی ہیں -

ندوۃ الاسلامیہ سوسائٹی ارکور (شمالی ملیبار) نے اپنا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے کیا ' جلوس نکالا اور کئی ضروری قرار دادیں منظور کیں - یہاں انجمن ترقیء اردو (ہند) کا ایک مدرسہ بھی ہے جو اس مجلس کی نگرانی میں چل رہا ہے -

یہ جلسہ جناب ایم - محمد صاحب کی صدارت میں ہوا - استقبالیہ مجلس کے صدر جناب اے - پی محی الدین صاحب تھے -

## ۹ - اورنگ اباد کی شاخ

اورنگ آباد دکن تقریباً پچیس چھبیس سال سے انجمن ترقیء اردو کا صدر مقام رہا ہے اور اب چونکہ آل انڈیا اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے فیصلے کی بنا پر انجمن دہلی منتقل ہو گئی ہے لہذا وہاں انجمن کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے - اس کے صدر مولوی سید محی الدین صاحب بی - اے ' بیرسٹر ایٹ لا پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد اور نائب صدر راے چھوٹے لال صاحب اور معتمد منشی محمد علی صاحب تجویز ہوئے ہیں - اس شاخ نے بہت مستعدی سے کام شروع کیا ہے - اس وقت تک اس کے ۱۵۰ ارکان ہوچکے ہیں - دو شبینہ

مدرسے بھی قایم ہوگئے ہیں - ایک شہر میں جس کا افتتاح مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد نے کیا - دوسرا چھاونی میں قایم کیا گیا ہے - چھاونی کے فوجی یورپین بھی اردو سیکھنے کے لیے آمادہ ہیں - مجھے قوی امید ہے کہ یہ شاخ قابل قدر کام کرے گی -

## ۱۰ - دو خاص عطیے

ماہ ستمبر میں جب میں شاخ قائم کرنے کے سلسلے میں اورنگ آباد حاضر ہوا تو خان بہادر مولوی سید احمد صاحب مہتمم غارہاے اجنٹہ و ایلورہ نے اپنی عنایت سے میری دعوت کی اور چلتے وقت انجمن کے لیے پچاس روپے کی ایک تھیلی عنایت فرمائی جس کے لیے میں اُن کا بہت شکرگزار ہوں - انھوں نے ایک ایسی اچھی نظیر قایم کی ہے جس سے میرے احباب اور دوسرے احباب کو سبق لینا چاہیے -

دوسرا عطیہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بی-اے سال چہارم کے اردو طلبہ کی طرف سے تھا - حیدرآباد سے رخصت ہونے پر اِن طلبہ نے میری دعوت کرنی چاہی - میں نے انھیں سمجھا بجھا کر اس سے باز رکھا - اس پر انھوں نے دوسرے روز مجھے اپنی طرف سے روپیوں سے بھرا ہوا خوبصورت بٹوا عنایت کیا - میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی - اگرچہ رقم بہت زیادہ نہ تھی (اور غریب طالب علم اس سے زیادہ دے ہی کیا سکتے تھے) لیکن جس جذبے اور نیت سے انھوں نے یہ رقم دی اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں - اور اس کے لیے میں اپنے عزیز طالب علموں کا ممنون ہوں -

# اردو

## فہرستِ مضامین

**اٹھارھویں جلد** — **سنہ ۱۹۳۸ء**

### مقالے

## ادبی معلومات

( مرتبہ 'ناخدا' )

# افکار و واقعات

( از اڈیٹر )

| نمبر سلسلہ | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|



---

## تبصرے

### ادب

## تعلیم



## طب



## مذهب و سیر



## لغت



## متفرقات

نمبر سلسلہ | مضمون | 


---

## اردو کے جدید رسالے



## خاص نمبر اور سالنا[مے]

# سائنس

## انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو داں
میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں
اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ان کو
کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان
صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے
اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت
پیدا کرنا مقصود ہے -

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں -

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک چھ روپے - نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -
طلبا کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب
یا ہیڈ ماسٹر صاحب انھیں چار روپے آٹھ آنے سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے -

اُمید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شایق اس کی سرپرستی
فرمائیں گے -

## انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی

# The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

ABDUL HAQ

# سائنس

رسالہ

# انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہو رہے ہیں ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں۔

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں چار روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی یا پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔



انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن)

VOL. 18 APRIL, 1938 No. 70

# The Urdu

## The Quarterly Journal

OF

## The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

**Abdul Haq B. A., (Alig.)**

HONORARY SECRETARY

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).

# اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

# اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف مضمون اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے -

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب بی-اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقیء اردو نادر منزل - سیف آباد - حیدر آباد دکن سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کو لکھنا چاہیے —

المشتہر : انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

---

## نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

| کالم | ایک بار کے لیے | چار بار کے لیے |
|---|---|---|
| دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ | ۸ روپے سکۂ انگریزی | ۳۰ روپے سکۂ انگریزی |
| ایک کالم (آدھا صفحہ) | ۴ روپے سکۂ انگریزی | ۱۵ روپے سکۂ انگریزی |
| نصف کالم (چوتھائی صفحہ) | ۲ روپے چار آنے سکۂ انگریزی | ۸ روپے سکۂ انگریزی |

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُن کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے —

المشتہر : منیجر انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

---

انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) سے شایع ہوا -

# اردو

| جلد ۱۸ | جولائی سنہ ۱۹۳۸ ع | حصہ ۷۱ |
| --- | --- | --- |

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

# دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

## مرتبۂ

## انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

(۷) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

(ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصول ڈاک

## ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیء اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

# اردو

## فہرستِ مضامین

### بابت جولائی سنہ ۱۹۳۸ ع

# مقالات گارساں دتاسی

## سنہ ۱۸۷۲ ع

### مترجمہ

(از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد)

هندوستانی زبان اور ادب پر جو میری سالانہ تقریظیں شائع ہوتی هیں وہ نہ صرف یورپ میں بلکہ هندوستان میں بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی هیں - چنانچہ دیسی اخبارات میں ان کے بعض حصوں کے ترجمے بھی شائع کیے جاتے هیں- میرے سنہ ۱۸۷۱ ع والے مقالے کے ایک حصے کا ترجمہ مظفرپور کے "اخبارالاخیار" مورخہ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع اور "اخبار انجمن پنجاب" مورخہ ۹ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع میں شائع ہوا ہے - یہ ترجمہ مسٹر ڈرمنڈ کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے - ان دونوں مذکورہ اخبارات میں میری تصویر بھی شائع کی گئی ہے - جو لوگ مجھہ سے ذاتی طور پر واقف هیں وہ میری اس تصویر کو دیکھکر جو "اخبار انجمن پنجاب" میں نکلی ہے پہچان لیں گے لیکن "اخبارالاخیار" میں میری جو تصویر چھپی ہے وہ عجیب سی معلوم ہوتی ہے —

اب سنہ ۱۸۷۲ ع کا سالانہ مقالہ تیار کرتے وقت میری همت بلند ہے اور میں ایرانی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہوں :—

آغاز کردۂ بہ رسانش بہ انتہا     طرحے فگندۂ بہ عنایت تمام کن

یورپ کی طرح ہندستان میں بھی زمانہ اپنی کروٹیں بدل رہا ہے - ہندوستان کے براعظم میں بتدریج تغیرات ظہور پذیر ہورہے ہیں- ہندو اور مسلمان یہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ ایک قوم بن جائیں اور جہاں تک ممکن ہے مغربی تمدن کو اپنی زندگی میں سمولیں' بالکل اسی طرح جیسے مسیحیت کے آغاز کے وقت یہودی اور رومن لوگ گھل مل کر ایک ہوگئے تھے حالانکہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی ایک زبردست دیوار حائل تھی - لیکن باوجود اس خواہش کے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے ' اردو اور ہندی کے متعلق لسانی بحث مباحثہ کا سلسلہ بدستور جاری ہے - ہندوستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا کہ صوبہ شمال مغربی کے دو لاکھہ رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی انگریزی حکومت کے روبرو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسم خط کے جس میں اردو لکھی جاتی ہے' دیوناگری رسم خط میں ہونی چاہییں جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے - میرا خیال ہے کہ اس بیان میں کچھہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - غالباً مذکورہ بالا معروضہ سے وہ یادداشت مراد ہے جو بابو شیوپرشاد نے حکومت کو بھیجی تھی اور جس پر ۵ ہزار اشخاص کے دستخط تھے جن میں مدرسہ کے طلبہ ' بابو شیوپرشاد کے ماتحت اور ان کے احباب شامل تھے - بابو شیو پرشاد مہتمم تعلیمات ہیں اور ہندی کے زبان کے زبردست حمایتی ہیں - ان کی یادداشت کے متعلق مجھے ایک بہاری مسلمان کے مضمون کے ذریعہ اطلاع ملی جو " اخبار انجمن پنجاب " مورخہ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ع میں شائع ہوا ہے - مجھے پوری

توقع ہے کہ سرکار انگریزی اس وقت کے معروضوں کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی اس واسطے کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا جائے جو اپنے رسم خط کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس واسطے کہ قران کریم کا رسم خط یہی ہے - لیکن کوئی چیز نا ممکن نہیں ہے - بہاری مضمون نگار اس ضمن میں یوں رقمطراز ہے :—

" اس خبر وحشت اثر نے سارے ہندوستان میں کھلبلی ڈال دی ہے - بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا ہے وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا ہے - کچھہ عرصے سے مسلمانوں کو کچھہ امید پیدا ہو چلی تھی ' لیکن اب ان کی امید کا درخت جس کی شاخیں کچھہ سر سبز ہو رہی تھیں ' پھر سے خشک ہونے لگا " -

مضمون نگار نے آخر میں یہ سوال کیا ہے کہ " کیا اردو زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں سے خارج کردیا جائےگا اور اس کی جگہ دیوناگری کو دی جائے گی جو مسلمانوں کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہ ہوگی - مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے کی اس واسطے ضرورت ہے کہ یہ حکومت کی زبان ہے - اب کیا ان کے لیے یہ بھی لازمی ہوگا کہ وہ ان کی زبان سیکھیں جو ان کے ایک زمانے میں محکوم تھے ؟ ہندی زبان کا رسم خط بدنما اور بھدا ہے - اس میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں جو ایک مردہ زبان ہے اور جسے مردہ زبان ہوئے ایک ہزار سال سے بھی زائد ہوا - ہندی کو ترقی دے کر اردو کو فنا کیا جارہا ہے جس کی آبیاری عربی اور فارسی جیسی زندہ زبانوں کے سر چشموں سے ہوتی ہے اور جس کا خوش نما

رسم خط آسانی سے سیکھا جاسکتا ھے اور جو سیکڑوں برسوں سے ھندوستان کے ھر گوشے میں قبولیت حاصل کرچکا ھے لیکن ایسا کرنے میں کامیابی حضرت مسیح کے معجزوں سے کم نہ ھوگی - اگر انگریزی حکومت یہ سمجھتی ھے کہ ھندی کو رواج دے کر وہ ھندوؤں کی خواھش کی ترجمانی کر رھی ھے تو اس کو چاھیے کہ اضلاع کے مجسٹریٹوں کے ذریعہ کمیٹیاں قایم کرا کے اس امر کی تحقیقات کرائے کہ آیا واقعی ھندوؤں کی اکثریت دیوناگری رسم خط کو اختیار کرنے کے موافق ھے - لیکن اگر ان چند ھزار اشخاص کے علاوہ جنھوں نے بابو شیو پرشاد کی عرضداشت پر دستخط کیے ھیں، دوسرے ھندو لوگ دیوناگری کی تائید میں نہیں ھیں تو حکومت کو اس کی موافقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - بابو صاحب اور ان کے ھم خیال اشخاص پر یہ ذمہ داری عاید ھوتی ھے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ھندوستان کی ۱۴ کروڑ مخلوق میں سے اکثریت یا کم از کم ۶ یا ۷ کروڑ دیوناگری رسم خط کی حمایت میں ھیں اس لیے کہ صرف مدرسوں کے طلبہ کے دستخطوں سے ایسے اھم معاملہ کا فیصلہ نہیں ھونا چاھیے - بھر حال اس میں شبہ کی گنجایش نہیں کہ اگر حکومت نے دیوناگری رسم خط کی حمایت کا تہیہ کرلیا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا اور وہ جہالت کے دلدل میں پھنس جائیں گے - اردو کے توسط سے وہ عربی اور فارسی کے سرچشموں تک بآسانی پہنچ جاتے ھیں جو ان کے نزدیک نہایت اھم زبانیں ھیں - اور حقیقت تو یہ کہ بہت سے ھندو بھی جو اردو زبان اور اردو رسم خط کے عادی ھیں،

ان درختوں کے مماثل ہوجائیں گے جن کی جڑیں کسی نے اکھاڑدی ہوں -"

" یہ دعویٰ بلند آھنگی کے ساتھہ کیا جاتا ھے کہ دیوناگری رسم خط بہ نسبت اردو رسم خط کے زیادہ واضح ھوتا ھے اور اس میں جعل سازی بہت دشوار ھے - اس کا جواب یہ ھے کہ اگر اردو رسم خط میں ھر طرح کی سہولت نہ ھوتی تو صدیوں سے اس کو استعمال نہیں کیا جاتا - دراصل دیوناگری رسم خط میں طوالت ھوتی ھے اور اس کی تحریر میں بہت زیادہ وقت صرف ھوتا ھے - جس تحریر کے لیے اردو میں ایک منٹ درکار ھوتا ھے اس تحریر کے لیے دیوناگری میں چھے منٹ صرف ھوتے ھیں - اور جو لوگ جعل سازی کرتے ھیں انھیں نہ اردو تحریر میں ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ھے اور نہ دیونا گری میں - اگر اردو کی جگہ دیوناگری رسم خط حکومت نے اختیار کر لیا تو مسلمانوں کے لیے سرکاری دفاتر میں ملازمتیں باقی نہیں رھیں گی - ویسے بھی سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ھے اور جو مسلمان سرکاری ملازمت میں ھیں وہ ادنیٰ خدمات پر فائز ھیں - اگر دیوناگری کی تجویز منظور ھوگئی تو ان کی تعداد سرکاری دفاتر میں اتنی بھی باقی نہیں رھے گی - "

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۷۱ع کو لندن کی انجمن فنون کے روبرو سید امیر علی خاں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ھندوستانی زبان کے مسئلہ پر بحث کی ھے - وہ کہتے ھیں :- " مجھے جن زبانوں کا علم ھے ان

میں ایک بھی ایسی نہیں جو فصاحت و بلاغت میں ہندوستانی کا مقابلہ کرسکے یا جس کا ذخیرۂ الفاظ اس کی طرح مالا مال ہو۔ پنجاب سے لے کر (بھاگلپور) بنگال تک وہ بولی جاتی ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اکثر ہندوؤں کی بھی قومی زبان ہے - بنگال میں بھاگلپور سے بنگالی زبان شروع ہوتی ہے - بنگال میں صوبجات شمال مغربی اور بہار سے آکر جو مسلمان آباد ہوگئے ہیں وہ بنگالی بہت کم سمجھتے ہیں - بنگال کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو زبان بولی جاتی ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کی طرح فصیح نہیں ہوتی - مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اکثر اردو بولتے ہیں - بنگالی ان میں سے بہت بولتے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ بنگالی زبان مسلمانوں کے عہد حکومت کے مقابلے میں آج کل زیادہ استعمال ہونے لگی ہے -" *

کالجوں اور اسکولوں میں ہندوستانی زبان کے رواج کے متعلق مسٹر ایچ جے کارتر کی رائے قابل وقعت ہے - موصوف بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سابق معتمد ہیں - انہوں نے مجھے اپنے ایک خط میں مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع لکھا ہے :- "جہاں تک میرا تعلق ہے میری رائے ہے کہ ہندوستانی زبان سرکاری مدارس میں ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے - انگریزی حکومت کے لیے بھی یہ بات مناسب ہوگی کہ اہل ہند کو بجائے انگریزی میں تعلیم دینے کے ملکی زبان میں تعلیم دی جائے -

سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبجات شمال مغربی بھی متذکرہ بالا رائے سے متفق ہیں - موصوف کو اہل ہند میں بڑی ہردلعزیزی حاصل ہے اور جب موقع ملتا ہے وہ ہندوستانی زبان میں بلا تکلف اپنے خیالات

* اخبار الاخیار - مورخہ ۱۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

ظاہر کرتے ہیں - موصوف کو ہندوستانی زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا ثبوت ان کی حالیہ تقریر سے ملتا ہے جو انہوں نے مرادآباد کے دربار میں تاریخ یکم نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی تھی - اس دربار میں نواب رامپور اور روہیلکھنڈ کے امرا نے شرکت کی - سر ولیم میور نے اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ انگریزی حکومت مذہبی معاملات میں انتہائی رواداری برتتی ہے اور مذہبی آزادی کا اصول جس پر سرکار انگریزی عمل پیرا ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا - تقریر کے دوران میں موصوف نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار برجستہ پڑھے اور ان کے ساتھ ہندی کا ایک دوہا بھی پڑھا - تقریر میں اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ اہل ہند اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کریں اور حتی الامکان مذہبی اور نسلی امتیازات کو آپس میں کم کرنے کی کوشش کریں -

ہندستان کے نئے وائسرائے لارڈ ناتھ بروک نے بھی مختلف موقعوں پر اپنی تقاریر میں مقامی زبانوں اور خاص کر ہندستانی زبان میں تعلیم دینے کے متعلق اظہار خیال کیا ہے —

لیکن بایں ہمہ بعض لوگ مستقل طور پر باقاعدہ ہندستانی زبان کی مخالفت پر کمر بستہ معلوم ہوتے ہیں - اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وول وچ کی شاہی اکاڈمی میں ہندستانی زبان کی تعلیم کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا - ایک بیرسٹر نے انڈین میل کے اڈیٹر کو لکھا ہے اور اس کی نسبت شکایت کی ہے - بیرسٹر موصوف نے لکھا ہے کہ ہندستانی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اس واسطے کہ فوج کے تین چوتھائی افسر جو اس کالج سے نکلیں گے ' ہندستان میں چند سال

تک ضرور رهیں گے - اس سے کیا فائدہ کہ هندستانی کے بجائیے ان افسروں کو جرمن، لاطینی اور یونانی سکھائی جاتی هے جو مطلق ان کے کام نهیں آئیں گی - اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا هے کہ انگریز افسروں کے لیے اس میں زیادہ سهولت هوگی کہ وہ هندستانی زبان هندستان جاکر سیکھیں - لیکن دیکھا گیا هے کہ گرم آب و هوا میں اکثر لوگ سست هوجاتے هیں - اگر فوجی افسروں کو هندستانی زبان کے اصول اس وقت سکھادیے جائیں جب کہ وہ انگلستان میں زیر تعلیم هیں تو وہ مشق سے اور هندستان میں رہ کر اس زبان کی تحصیل مکمل کر سکتے هیں —

اس کی بڑی ضرورت هے کہ سرکاری عهدہ دار مروجہ زبانوں سے واقفیت رکھتے هوں - لیکن اس وقت هندستان میں ایسا نهیں هے - چنانچہ دیسی اخباروں میں ایسے سرکاری عهدہ داروں کے خلاف شکایات شایع هوتی رهتی هیں جو عوام کی زبان سے نابلد هوتے هیں - ان شکایات کے ساتھہ اس خواهش کا بھی اظهار کیا گیا هے کہ سرکاری عهدہ داروں کا اپنی خدمات پر مامور هونے سے پیشتر مروجہ زبانوں میں سے ایک میں باقاعدہ امتحان لینا چاهیے —

لاهور کے یونیورسٹی کالج کی تجاویز کی بدولت کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے اپنی یہ غلطی تسلیم کی هے کہ وسطانیہ کے امتحانات میں مقامی زبان میں جوابات دینے کی طلبہ کو اجازت هونی چاهیے - در اصل مقامی زبان میں امتحان دینے کی اجازت نہ هونے کے باعث بهت سے هندستانی نوجوان شرکت نهیں کر سکتے - یہ ان کے ساتھہ بڑی نا انصافی هے - دنیا کے تمام ممالک میں یہ قاعدہ هے کہ امتحانات یا تو ملکی زبان یا قدیم زبان کے توسط سے هوتے هیں - انگریزی زبان

اهل هند کے لیے نہ تو ملکی زبان هے اور نہ اس کی حیثیت ان کی قدیم زبان کی هے - خوشی کی بات هے کہ کلکتہ یونیورسٹی نے بالآخر هندستان کی مروجہ زبانوں کی حیثیت کو تسلیم کرلیا اور اس باب میں اپنے فرض کو پہچانا - چنانچہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کو سینیٹ کے جلسے میں یہ تجویز منظور هوئی کہ ملکی زبان کے ذریعہ جوابات کی وسطانیہ کے امتحانات میں اجازت هوگی - ملکی زبانوں میں هندستانی کے ماسوا بنگالی، اُڑیا اور آسامی شامل هیں - امیدوار کو اجازت هوگی کہ ان میں سے کسی زبان میں سوالات کے جواب دے - وسطانیہ کے امتحان کے بعد جو صداقت نامے کامیاب امیدواروں کو دیے جائیں گے وہ بھی امیدوار کی مقامی زبان میں هوں گے - اس کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ضروری قواعد و ضوابط نافذ کردیے هیں اور ان کا سرکاری طور پر باقاعدہ اعلان کردیا گیا هے * —

کلکتہ یونیورسٹی کے اس فیصلہ سے ملکی زبانوں کو فروغ حاصل کرنے کا پورا موقع ملے گا - بالخصوص هندستانی زبان کی وسعت میں اس کی وجہ سے بہت مدد ملے گی جو پنجاب، صوبجات شمال مغربی، اودھ، بہار، صوبجات متوسط و دکن اور بنگال کے ایک حصے میں بولی جاتی هے اور جس کو بجا طور پر "قومی زبان" کہہ سکتے هیں - اس طرح هندستانی اور انگریزی میں مقابلہ هوگا کہ کونسی زبان مقبولیت حاصل کرتی هے - وسطانیہ کے امتحان میں امیدوار کی جانچ صرف و نحو اور مادری زبان کی انشا کے علاوہ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ میں کی جائے گی —

* اخبار انجمن پنجاب، مورخہ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع

کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے جو تجویز منظور کی ہے اس سے مسلمان بہت خوش ہیں اس لیے کہ انہیں اب اس کا موقع حاصل ہوگا کہ بغیر انگریزی پڑھے ہوئے وسطانیہ کے امتحان میں شرکت کرسکیں۔ وہ اس امتحان میں انگریزی کی بجاے فارسی یا عربی لے سکتے ہیں جو ان کی قدیم زبانیں ہیں —

بہار کی علمی مجلس (سائنٹفک سوسائٹی) کا صدر مقام مظفرپور ہے - اگرچہ یہ انجمن سنہ ۱۸۶۸ع میں قائم ہوئی ہے لیکن اس کے ارکان کی تعداد پانچ سو ہو چکی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں - چند انگریز بھی اس انجمن میں شریک ہیں- کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے وسطانیہ مدارس کے امتحانات کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس میں اس انجمن کے اثر کو بہت کچھ دخل حاصل ہے - اس فیصلے سے بہت سے اہل ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوگیا ہے جو سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کو لازمی نہیں رکھنا چاہتے تھے - اس سے انگریزی حکومت کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوگا - اودھ کی پولیس کے انسپکٹر جنرل نے اس صوبے کے ناظم تعلیمات سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر سال ۴۰ مسلمانوں کو اپنے محکمے میں ملازمت دے گا بشرطیکہ وہ ہندستانی لکھ پڑھ سکتے ہوں اور ریاضی سے واقف ہوں- مدراس کے لفٹنٹ گورنر لارڈ ہوبرٹ بھی مسلمانان ہند کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہیں - انہوں نے پچاس مسلمانوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کرلی ہے جنھیں سرکاری خدمات خالی ہونے پر فوراً ملازم رکھ لیا جائے گا - موصوف نے حکومت کی ایک تجویز کا بھی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے علحدہ مخصوص مدارس کھولے جائیں گے جن میں ہندوستانی زبان میں تعلیم دی جاے گی تاکہ وہ سرکاری خدمات حاصل کرسکیں —

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے لفٹنٹ گورنر بنگال کی شکر گذاری کے لیے ایک ایڈریس پیش کیا ہے جس میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ وسطانیہ جماعتوں کا مادری زبانوں میں امتحان لینے سے لوگوں کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے *- اس ایڈریس میں اس متذکرہ بالا اصلاح کے یہ فائدے بتائے گئے ہیں :— (۱) دیسی طلبہ کی رسائی سائنس تک ہوسکے گی- (۲) اہل ہند کے دلوں میں ملکۂ معظمہ کی قدر و منزلت بڑھے گی اسواسطے کہ ان محترمہ نے ان کی اس دشواری کو محسوس فرمایا جو انگریزی زبان میں وسطانیہ کا امتحان لازمی رکھنے سے انہیں پیش آتی تھی اور ہندستانی زبان اور ان کی قدیم زبانوں کو ترقی کا موقع عطا فرمایا جن میں ان کے مذہبی علوم ہیں- اس ایڈریس میں سوسائٹی کی جانب سے ان مقاصد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس کے پیش نظر ہیں- یعنی حکومت کی مدد سے دیسی زبانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قایم کرنا- اس کے ساتھ ساتھ ایسے مدارس قایم کرنا جن میں انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو- سوسائٹی کے ایک مجلہ کے ذریعہ عام معلومات کی نشر و اشاعت کرنا- یہ مجلہ ہندستانی زبان میں ہوگا اور اس میں علمی اور ادبی دونوں قسم کے مضامین شائع ہوں گے- سوسائٹی نے توقع ظاہر کی ہے کہ عنقریب وہ پٹنہ میں ایک کالج قایم کرنے والی ہے جہاں ہندستانی کے ذریعہ مغربی علوم پڑھائے جائیں گے—

علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے تعاون عمل سے بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے پانچ نئی کتابیں شایع کی ہیں اور بارہ کتابیں زیر ترجمہ

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار- مورخہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ م-

ھیں - اس کے کتب خانہ میں عربی کی مزید ۷۰ کتب کا اضافہ ہوا ھے جو مصر میں طبع ہوئی ھیں - انگریزی کی ۱۴۰ کتب کا اضافہ ہوا ھے جو مختلف علوم و فنون اور فلسفہ سے تعلق رکھتی ھیں - انجمن کے معتمد نے بعض فاضل انگریزوں کے مشورے سے یہ کتب منگائی ھیں —

مظفر پور کے کالج کے علاوہ جہاں ہر شخص اس امر کی تشفی حاصل کرسکتا ھے کہ مغربی علوم و فنون کس قدر سہولت کے ساتھ ہندستانی زبان کے ذریعہ پڑھائے جاسکتے ھیں' سائنٹفک سوسائٹی بہار نے ترھوت اور دوسرے اضلاع میں متعدد مدارس قایم کیے ھیں - اگر حکومت نے سوسائٹی کی اعانت کی تو توقع ھے کہ بہت جلد وہ اور مدرسے قایم کردے گی - اب تک سوسائٹی کا کل سرمایہ چندوں اور عطیات پر مبنی ھے اور بہت سے امرااورزمیندار لوگ اس کی مالی امداد کرتے رہے ھیں - اس ایڈریس میں جو لفٹنٹ گورنر بنگال کو پیش کیا گیا معطیوں کے ناموں کی فہرست اور ان کے عطیات کی رقوم درج ھیں -

اگرچہ یہ درست ھے کہ جن طلبا نے مغربی علوم کی تحصیل کی ھے انہیں سرکاری ملازمت کو اپنا مقصد حیات نہیں بنانا چاھیے لیکن اس کے ساتھ حکومت کا یہ فرض باقی رھتا ھے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو خدمات دے' چاھے وہ انگریزی زبان سے واقفیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں - اگر حکومت نے یہ حکمت عملی اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت بڑھ جائے گی اوران میں خودبخود انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوجائے گا جس کے ترجموں کے ذریعہ وہ علوم (سائنس) حاصل کرتے ھیں —

مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۷ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع کو بنگال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جی کیمبل نے رکھا - یہ کالج بیچ شہر میں آموں کے جھنڈ میں واقع ہے - اُس روز صبح ہی سے ہزاروں آدمی اس تقریب میں شرکت کے لیے خیموں تلے جمع تھے - اس موقع پر تین تقاریر ہوئیں - مولوی سید امداد علی نے ہندوستانی میں تقریر کی - ڈاکٹر فیلن نے انگریزی میں اور مسٹر جی کیمبل لفٹننٹ گورنر بنگال نے بھی انگریزی زبان میں تقریر کی - لفٹننٹ گورنر بنگال نے دوران تقریر میں کہا کہ میں انجمن بہار کے ان خیالات کی تائید کرتا ہوں جو اس نے پٹنہ کالج کے متعلق ظاہر کیے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تعلیمی ترقی کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور وسطانی تعلیم ملکی زبان کے ذریعہ دی جائے - اس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اس لیے کہ وہ اب تک سرکار کے مدرسوں اور کالجوں سے دور رہے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنی مادری زبان اور اپنی قدیم (کلاسکی) زبانوں سے محبت ہے - موصوف نے کہا کہ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ انجمن بہار نے جو مدارس قایم کیے ہیں ان میں نصف تعداد طلبہ کی مسلمانوں پر مشتمل ہے - موصوف نے یہ بھی کہا کہ میں ہندوستانی زبان کا دل سے ہوا خواہ ہوں جہاں تک کہ اس کی اشاعت کا پنجاب اور صوبجات شمال مغربی سے تعلق ہے - ان علاقوں میں اس زبان کے ذریعہ سب کاروائیاں ہوتی ہیں اور انگریزی کو اب تک کم رواج حاصل ہوا ہے - لیکن صوبۂ بہار کے حالات دوسرے ہیں - اس کا تعلق صوبۂ بنگال سے ہے جہاں انگریزی زبان نے جڑ پکڑلی ہے - اس لیے یہاں بجائے قدیم مشرقی زبانیں سکھانے کے انگریزی

کی تعلیم پر زور دیا جائے تو بہتر ہوگا - بلاشبہہ سنسکرت زبان میں مٹھاس پائی جاتی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت وسیع ہے - اس کا تعلق یورپ کی اکثر السنہ سے ہے اسی طرح عربی زبان بھی ایک جاندار زبان ہے اور اس میں فلسفہ اور تاریخ کے بیش بہا خزانے موجود ہیں - لفٹنٹ گورنر بنگال نے کہا کہ ان زبانوں کے متعلق انکا وہی خیال ہے جو یورپ کی کلاسکی زبانوں کے متعلق ہے - موصوف نے کہا کہ انگلستان میں ان قدیم زبانوں کے سکھانے پر بیکار بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے - موصوف نے آخر میں اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ قدیم زبانوں کی تعلیم اختیاری ہونی چاہیے اور انگریزی اور سائنس کی تعلیم کو لازمی رکھنا چاہیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی مذہبی کتابوں کو سمجھنے کے لیے مسلمان لوگ عربی اور فارسی سیکھیں لیکن ان زبانوں کو ذریعہ تعلیم تو نہیں بنایا جاسکتا - اگر ملک کی کسی زندہ زبان میں تعلیم دینے کا انتظام نہیں ہوسکتا تو بہتر ہوگا کہ انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم رہے - مغلوں کے عہد حکومت میں فارسی سیکھنی پڑتی تھی - اب جبکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے امن و امان قایم کیا ہے تو اگر اہل ہند میں انگریزی زبان کی اشاعت کی جائے تو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیے - پھر انگریزی زبان کے پھیلنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اہل ہند مغربی علوم و فنون سے آگاہ ہوں گے جس سے انہیں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے - اگرچہ حکومت نے وسطانیہ مدارس کی تعلیم کے لیے یہ سہولت بہم پہنچا دی کہ مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن اگر طلبہ انگریزی زبان سیکھیں گے تو انہیں آئندہ یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے میں آسانی ہوگی اس لیے کہ یونیورسٹی میں قدیم مشرقی زبانوں سے واقفیت کام نہ آئے گی -

اور انگریزی کے توسط سے مغربی علوم ( سائنس ) حاصل کرنے میں
بے حد سہولت ہوگی —

ان چند باتوں کا ذکر کرنے کے بعد لفٹننٹ گورنر بنگال نے مولوی امداد علی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں چونکہ زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھہ سکا اور مشکل سے یہ فرق کرسکا کہ ان کی تقریر اردو میں تھی یا فارسی زبان میں ۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال اردو زبان سے ناواقف ہیں لیکن انہوں نے اس قسم کی تنقید کو روا رکھا ۔ اس ضمن میں موصوف نے یہ بھی کہا کہ اردو دیسی زبان نہیں ہے اور تعلیم عامہ میں اس کو رواج نہیں دیا جاسکتا ۔ لیکن ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے نزدیک دیسی زبان سے کیا مراد ہے ؟ کیا دیسی زبان ان کے نزدیک وہ ہے جو فوجی لوگ یا قلی بولتے ہیں ؟ افسوس ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دیسی زبان کا اطلاق جیسا ہندوستانی اردو پر ہوتا ہے کسی اور زبان پر نہیں ہوتا ۔ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے پیدا ہوئی ۔ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بالکل فطری طریقے پر شامل ہوئے ۔ عربی کے لفظوں نے اصل فارسی ہی کی راہ سے اس زبان میں بار پایا ۔ اس زبان میں بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بول چال کے محاورے علمی اور ادبی زبان سے مختلف ہیں ۔ یہ درست ہے کہ مسلمان اردو میں ایسے بہت سے لفظ استعمال کرتے ہیں جو عام بول چال میں نہیں برتے جاتے ۔ ظاہر ہے کہ لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال کو یہ بات ہرگز پسند نہ ہوتی کہ کوئی انہیں ایسی زبان میں خطاب کرے جو رکیک اور بازاری ہو ۔ مولوی امداد علی نے جو طرز

خطاب اس موقع پر اختیار کیا وہ حسب حال اور موزوں تھا۔ مشرق کی اور دوسری زبانوں میں بھی سوائے عربی کے ہمیں یہ بات ملتی ہے۔ چنانچہ ترکی اس باب میں ہندستانی سے بہت کچھہ ملتی جلتی ہے۔ ترکی میں بھی بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو ترکی لفظ کے ساتھہ عربی اسم کے ملانے سے بنائے جاتے ہیں۔ ترکی مصنفین اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تحریر کو لوگ نہیں سمجھتے ؟ - مشرقی زبانوں کی اس خصوصیت کو ہمیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ خود انگریزی زبان میں لاطینی محاورے استعمال ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے جلسوں میں اراکین 'ورجل' اور 'ہوریس' کے اشعار لاطینی زبان میں پڑھتے ہیں اور کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا —

مسٹر جی کیمبل' لفٹنٹ گورنر بنگال نے ہندوستانی اردو کے خلاف جو تقریر کی اور جس میں مولوی امداد علی کی زبان کو معرض بحث میں لایا گیا وہ دراصل ان کے ایک اور اہم بیان کا پیش خیمہ تھی جسے ہم سرکاری کہہ سکتے ہیں۔ ہماری مراد ہے اس یاد داشت سے جو دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کے متعلق ۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع کو شائع کی گئی ہے - کوئی شخص اس کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس قسم کی تحریر خود اعتمادی کے ساتھہ حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ نئے وائسرائے بہادر اس تحریر کو منسوخ قرار دیں گے۔ یہ تحریر اس قدر عجیب و غریب اور غیر متوقع ہے کہ ہم یہاں اس کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں :—

" فارسی زبان کو جو ہندوستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی، کلیتاً ترک کردیا گیا ہے - سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے (لفٹننٹ گورنر بنگال) ہندوستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کردی گئی تھی - میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پورے طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے * - میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہوچکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے - لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھہ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے - بہار میں میں نے جو زبان سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی † ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی - مجھے یہ دیکھہ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان (ورنیکلر) کہا جاتا ہے - مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق

---

* ان الفاظ سے ہندستانی کے الفاظ مراد ہیں - لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود انگریزی زبان کے اکثر الفاظ دوغلے ہیں جیسا کہ گلکرسٹ نے بار بار کہا ہے - اس اعتبار سے انگریزی بھی دوغلی زبان ہوئی —

† مصنوعی سے کیا مراد ہے؟ ہر زبان جو صرف و نحو کے قواعد کے مطابق بولی جاتی ہے ایک حد تک مصنوعی کہی جاسکتی ہے —

ھی نہیں - اس زبان کے لیے "اردو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے - میں سمجھتا ہوں یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے - یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے - کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھہ لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان اهل دربار اور دهلی کی طوائفوں کی زبان ہے - اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے - میں نے پورا ارادہ کرلیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے' روکنے کی کوشش کروں گا - میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں - یہ ایک نفیس اور پر تکلف زبان ہے - اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں - لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندوستانی کے کچھہ تھوڑے سے افعال و حروف ربط (conjunctions) شامل کرلیے گئے ہیں جسے اردو کہتے ہیں' ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جاے - مجھے بنگالی زبان نہیں آتی لیکن مجھے یقین ہے اس زبان میں بھی بہت میل پیدا ہوگیا ہے اور اس میں سنسکرت کے لفظ اور محاورے بے تحاشا شامل کرلیے گئے ہیں * بہار کے مدارس

* غالباً اردو سے نا واقفیت کی بنا پر لفٹنٹ گورنر بنگال نے اس کے متعلق اپنی یہ راے ظاہر کی ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغیر سنسکرت الفاظ کے بنگالی کی کیا حیثیت رہ جاے گی اس کا جواب ریورنڈ جے لانگ اور مسٹر جان بیمز دے سکیں گے —

میں جو مروجہ زبان میں تعلیم دی جاتی ہے وہ تمام تر اس
پر مشتمل ہے کہ ایک مولوی صاحب اردو پڑھادیتے ہیں
اور ایک پنڈت جی ہندی میں لکھے ہوئے چند سورماؤں
کے تاریخی حالات بتادیتے ہیں۔ اس تاریخ میں ہر دوسرے یا
تیسرے صفحے پر سنسکرت کے شلوک ضرور ہوتے ہیں۔ ہندی کے
متعلق میری رائے ہے کہ اس میں خواہ مخواہ سنسکرت کے
لفظوں کی ٹھونس ٹھانس نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہم یہ
کرسکتے ہیں کہ ہندی کا نام لیکر ہر گانوں کی علحدہ بولی
کو تسلیم کریں۔ ایسا کرنا بالکل اس کے مماثل ہوگا کہ
انگلستان میں بچوں کو 'ڈورسیٹ شائر' یا 'یارک شائر' کی
بولیاں سکھائی جائیں*۔ ہندوستان کی ایک زبان کُل ملک
کے لیے ہے جو ہندوستانی کہلاتی ہے بالکل اس طرح جیسے
انگلستان میں انگریزی ہے۔ میری دانست میں اہل بنگال کی
زبان اسی طرح بنگالی کہی جاسکتی ہے، لیکن چونکہ بنگالی
زبان ابھی حال ہی میں وجود میں آئی ہے اس لیے بول
چال کی بنگالی اور تحریر کی بنگالی میں فرق کرنا ہوگا۔ میں
یہ نہیں چاہتا کہ اردو میں سے فارسی الفاظ چن چن کر
علحدہ کردئیے جائیں۔ یہ ہندوستانی زبانوں کی خصوصیت
خاصہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی اجنبی زبان کے محاورے اور
لفظ کسی مطلب کو ادا کرنے کے لیے آسانی سے اپنے میں شامل

---

* اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی بچوں کو نہ ہندی سکھائی جائے اور نہ اردو بلکہ انھیں صرف انگریزی پڑھائی جائے۔

کرلیتی ہیں اسواسطے کہ خود ان میں اس کے ادا کرنے کے لیے لفظ موجود نہیں چنانچہ ہندوستانی زبانوں میں بہت سے فارسی الفاظ نے راہ پائی - اسی طرح انگریزی لفظ بھی اپنائے جا رہے ہیں اور غالباً آئندہ اور زیادہ اپنائے جائیں گے - یہ دوسری زبانوں کے لفظ جو ہندوستانی زبانوں میں اپنائے گئے ہیں بچوں کو سکھانے ہوں گے * - ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کو جو زبانیں سکھائی جائیں وہ ملک کی حقیقی زبانیں ہونی چاہییں جو عام طور پر بولی جاتی ہیں - اور جنہیں عوام الناس سمجھ سکیں † - مصنوعی زبانیں سکھانے سے کوئی فائدہ نہیں جنہیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں اگر جدید تصورات کو ادا کرنے کے لیے جدید الفاظ کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا کہ انگریزی الفاظ رائج کیے جائیں بجائے اس کے کہ کسی اجنبی زبان کے اجنبی الفاظ قبول کیے جائیں - یہ ضرورت اس واسطے پیش آئے گی کہ ہم انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ جدید تصورات کو اہل ہند کے سامنے پیش کر رہے ہیں - ہندی اور ہندوستانی کے متعلق میرا خیال ہے کہ ان

---

* یہ خیال بہت اچھا ہے - ایسے لفظ جو ہندستانی زبانوں میں داخل ہوگئے ہیں اور جن سے لوگ مانوس ہیں عام طور پر عربی اور فارسی کے لفظ ہیں - مثلاً سلام ' صاحب ' شراب ' مختار ' نذر ' رسالہ اور بد معاش - اسی طرح کے سیکڑوں اور دوسرے الفاظ ہیں جو ہندستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی تک میں قبول کرلیے گئے ہیں -

† کاش مسٹر کیمبل ' لفٹننٹ گورنر بنگال کسی ایسی ملکی زبان کے دو ایک صفحے بطور مثال پیش کرسکتے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی مراد کس قسم زبان سے ہے -

دونوں کو اس طرح سکھانا چاہیے گویا وہ دونوں ایک زبان ہوں جو دو مختلف رسم خط میں لکھی جاتی ہیں - میں نے ابھی جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ کر لیا گیا ہوگا کہ میں قدیم اور دقیانوسی ہندی کی ہمت افزائی کے خلاف ہوں - ہندی کی جو کلاسکی کتابیں صوبجات شمال مغربی (یو - پی) میں چھاپی جارہی ہیں ان میں فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنہیں لوگ سمجھ سکیں - اگر انہیں کتابوں کو فارسی رسم خط میں لکھا جائے تو وہ ایسی خالص ہندوستانی زبان بن جائے گی جس کو رائج ہوتے دیکھنے کی میری دلی خواہش ہے" -

"میں ناظم تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کراتا ہوں - (۱) اردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہوچکی ہے - (۲) ناظم تعلیمات اور مہتمان تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جاچکا ہے * - (۳) اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے - مجھے اس میں مطلق

* دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایسی ہندی پڑھائی جاے جس میں فارسی لفظ ہوں اور فارسی رسم خط میں وہ لکھی جائے - یہ عجیب بات ہے کہ اس پر اتنی تنقید کر چکنے کے بعد اس زبان کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام آسکتی ہے -

شبہ نہیں ہے کہ صوبجات شمال مغربی میں ہندی اور ہندوستانی کی جو کتابیں شایع کی جا رہی ہیں وہ نصابی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہندوستانی میں کلاسکی کتب کی کمی ہے تو اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہندی کی کتب کو فارسی رسم خط میں چھاپ دیا جائے جس کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں - لیکن بنگالی میں ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جن سے ہماری ضروریات کما حقہ پوری ہوتی ہیں - اگر ان کتب کو علحدہ کر دیا جائے جن میں سنسکرت کا عنصر غالب ہے یا جن کی عبارت مصنوعی ہے تو بھی ایسی کتابیں ہمارے پاس بچ جائیں گی جو مروجہ بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں جن سے ہماری مقصد برآری ہو سکتی ہے - (۴) اگر تعلیمات کے کسی شعبے میں ایسی کتب موجود نہ ہوں جو مروجہ زبان میں لکھی گئی ہوں تو اس کے متعلق مجھے خاص رپورٹ بھیجنی چاہیے - میں ان کتب کی فراہمی کا انتظام کروں گا" ـــ

" میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عاید ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ ہونے دیں سوائے انگریزی زبان کے - انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہاں وہ علی حالہ رہے گی مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ بھی اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گا - مجھے پورا یقین ہے کہ ہائی کورٹ جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے" ـــ

مسٹر کیمل لفٹننٹ گورنر بنگال کی دیسی زبانوں کے متعلق یہ یادداشت
ہے جو عجیب و غریب نوعیت رکھتی ہے - میں نے اس کو یہاں اس
واسطے درج کردیا تاکہ یورپ میں بھی لوگ اس سے واقف ہوجائیں -
مجھے یقین ہے کہ یورپ میں ان خیالات کو سن کر وہ لوگ جو ہندوستان
کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں ناک بھوں چڑھائیں گے -
معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی اس یادداشت سے لوگ خوش نہیں
ہیں جیسا کہ بنگال کے ناظم تعلیمات کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس
یادداشت کے جواب میں لکھی گئی ہے - بنگال کے ناظم تعلیمات مسٹر
ڈبلوایس ایٹکنسن کے سوا محکمۂ تعلیمات کے دوسرے اعلیٰ عہدہ دار جیسے
مسٹر سٹ کلف ؛ مسٹر فیلن اور مسٹر ہوڈٹ وغیرہ نے بھی اس کے جواب
دیے ہیں - اگرچہ ان جوابات کا لب و لہجہ نہایت مودبانہ ہے لیکن
ان کا مفہوم واضح ہے - ان سبھوں نے مسٹر کیمل کے خیالات کو ناقابل
عمل بتایا ہے اور ان کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے - ان کا
خیال ہے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے تصورات شرمندۂ عمل نہ ہوسکیں گے —

انڈین ڈیلی نیوز نے مسٹر کیمل کے عجیب و غریب لسانیاتی نظریوں
کو زیادہ اہمیت نہیں دی - اس اخبار نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ
ہندوستانی زبان بنائی نہیں جا سکتی اور اس کو سرکاری طور پر ہندوستانی
اردو کی جگہ نہیں رائج کرایا جا سکتا - اسی مسئلے کے متعلق لفٹننٹ
گورنر بنگال اور کلکتہ یونیورسٹی کے درمیان سخت اختلاف رائے پیدا
ہوگیا ہے - لیکن مسٹر کیمل کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستانی اردو
نے جس طرح ہندوؤں کی رجعتی حکمت عملی کا مقابلہ کیا ہے اس طرح
وہ ان کی تنقید و تعریض کا بھی مقابلہ کرلے گی - ممکن ہے مسٹر کیمل

کے احکام کی بلا چون و چرا پابندی کی جائے اور بہار کے مدارس میں اردو کو ختم کردیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا - ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم برابر جاری رہے گی * - ایسے جلسوں میں جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شریک ہوں گے اسی زبان کے ذریعہ مبادلۂ خیالات کیا جائے گا - حکومت ہند کے اس کی بابت احکام موجود ہیں کہ مقامی مجلسوں اور انجمنوں کو مقامی زبان میں اپنی کارروائیاں کرنی چاہییں - ان احکام کے اجرا پر عام طور سے اظہار اطمینان کیا گیا اور بالخصوص لاہور کی ادبی انجمن نے ان کو بہت پسند کیا † - اسی ضمن میں حکومت نے عدالتوں کو بھی یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ بھی اسی زبان کو ترجیح دیں جو ان لوگوں کی عام زبان ہے جو دادرسی کے لیے آتے ہیں - عدالتوں کو چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں حتی المقدور ہندوستانی اصطلاحات کو رائج رہنے دیں - ان کی جگہ انگریزی اصطلاحات سے احتراز کیا جائے ‡ - ان باتوں کے علاوہ انڈیا آفس کا حکم موجود ہے جس کے بموجب سول سروس کے امیدواروں کے لیے ہندوستانی زبان کا سیکھنا لازمی کیا گیا ہے حالانکہ ملک کی کسی دوسری زبان کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی $ —

* بیہپور ضلع علیگڑھ کے مدرسے میں ایک ہندو مدرس نے اردو کی جگہ ہندی کی تعلیم شروع کردی تھی لیکن اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بجاے ۱۸ طالبعلموں کے ہندی کی کلاس میں صرف ۵ رہ گئے - (علیگڑھ اخبار - مورخہ ۹ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع) -

† اخبار انجمن پنجاب - مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

‡ اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار - مورخہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع -

$ ۲۳ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع کے انڈین میل میں اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہندوستانی زبان پر سخت تنقید و تعریض کی گئی ہے اور وہی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو مسٹر کمبل نے پیش کیے ہیں - ان کی یہاں تردید کرنا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے -

بہار کے ایک مسلمان مضمون نگار نے جن کی نسبت میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اس ضمن میں اظہار خیال کیا ہے - پہلے تو موصوف نے مسلمانوں کی تعریف کی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر عنایت پہلے پہل مسلمانوں پر رہی لیکن اس کے بعد حکومت کی نگاہیں بدل گئیں - اس عذر کی بنا پر کہ چونکہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں ہے انہیں سرکاری خدمات سے محروم کیا گیا - مسلمانوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کیا تو حکومت نے وعدہ کیا کہ ان کے لیے ان کی قومی زبان (اردو) میں وسطانیہ کے امتحان لینے کا انتظام کیا جائے گا اور بغیر انگریزی زبان کی واقفیت کے انہیں سرکاری ملازمتیں دی جائیں گی - آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ "وسطانیہ کے امتحان کی یہ رعایت جنوری ۱۸۷۲ء سے منظور کی گئی - اسی وقت سے آنریبل جارج کیمبل لفٹننٹ گورنر بنگال نے تہیہ کر لیا ہے کہ اردو زبان کو بالکل مٹا کے چھوڑیں گے اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کریں گے - وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں اس کا علم خدا کو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کو مٹانا جو چھ سو برس سے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اٹک سے لے کر چین کی سرحد تک بولی جاتی ہے، ناممکن ہے - یہی زبان صوبجات شمال مغربی (یو-پی) اور بہار کے لوگوں کی مادری زبان ہے - مسٹر کیمبل نے اس زبان کے متعلق جو رائے قائم کی ہے کیا وہ صرف ایک شخص کی تقریر سننے کا نتیجہ ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے تھے؟ * دراصل بول چال کی زبان علمی زبان سے مختلف ہوتی ہے -

* مولوی امداد علی کی تقریر -

یہ عجیب بات ہے کہ مسٹر کیمبل نے صرف ایک تقریر سن کر یہ حکم دے دیا کہ لوگوں کی زبان بدل دی جائے - لیکن ہمیں توقع ہے کہ یہ شرمندۂ عمل نہ ہوسکے گا - اگر حکومت کی جانب سے ہر پانچویں سال اسی قسم کے احکام جاری ہوتے رہے تو یہ رعایا کے لیے سخت زحمت کا باعث ہوگا - اگر مسٹر کیمبل کے جانشین نے بھی کہا کہ

دنیا بہت پرانی ہوچکی ؛ اب ایک نئی کائنات درکار ہے تو اس کا نتیجہ معلوم - لیکن چاہے کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے انگریزی زبان ہندوستان کی عام زبان کبھی نہیں بن سکتی " -

مضمون نگار نے ' جس کے مضمون کا اقتباس میں نے اوپر درج کیا ہے ' اس اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ضمن میں مسٹر کیمبل اور کلکتہ یونیورسٹی کے درمیان پیدا ہوگیا ہے - مسٹر کیمبل نے جس ہندوستانی زبان کا ذکر کیا ہے اور جسے وہ ملکی اور دیسی زبان کہتے ہیں ! اس کی شرائط اس قدر دشوار ہیں کہ ان کے مطمح نظر پر کسی زبان کا پورا اترنا ناممکن معلوم ہوتا ہے - مسٹر کیمبل نے ادنیٰ ادنیٰ سرکاری خدمات کے لیے جو شرائط لازمی قرار دی ہیں وہ مضمون نگار کے نقطۂ نظر سے ناقابل عمل ہیں -

مسٹر کیمبل نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ تعلیم عامہ کی زبان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں - موصوف نظام تعلیم میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں - ایک سرکاری قرار داد کے ذریعہ ' جو اتنی ہی عجیب وغریب ہے جیسے کہ زبان والی قرار داد جس کی نسبت اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ' موصوف نے فیصلہ کیا ہے کہ بنگال و بہار کے مدارس کے معائنہ کا کام تعلیمات کے مہتمموں کے ہاتھ سے نکال کر مدرسوں اور مجسٹریٹوں

کے هاتهه میں دیدیا جائے - اب ناظم تعلیمات کی حیثیت محض محرر کی رہ جائیگی - حکومت کی اس قرار داد پر سخت نکتہ چینی هو رهی هے - مجهے پورا یقین هے کہ اس تجویز کو بہت جلد پس پشت ڈال دیا جائیگا * -

میں نے گزشتہ سال کے مقالے میں ذکر کیا تها کہ مشرقی الفاظ جب لاطینی رسم خط میں لکھے جاتے هیں تو بعض اوقات باوجود اختلاف کے وہ یکساں معلوم هوتے هیں - انگریزی حکومت چاهتی هے کہ سرکاری طور پر مقامات کے نام ایک خاص طریقے پر لکھے جایا کریں - یہ مسئلہ بہت نازک هے - چنانچہ سر ولیم میور نے اس کے متعلق وائسرائے بہ اجلاس کونسل کو اپنے خیالات سے مطلع کیا هے † - موصوف نے لکھا هے کہ ایک دم سے مقامات کے نام کے هجے بدل دینا مناسب نہیں هے - یہ بالکل ویساهی هوگا کہ لڑکوں کے نام اور شہروں کے مکانوں کے نمبر ایک جنبش قلم سے تبدیل کردیے جائیں - اس نئے اصول کے مطابق آئندہ سے مندرجہ ذیل نام اس طور پر لکھے جائینگے -

| | | | |
|---|---|---|---|
| Amritsar | بجاے | کے | Umritsar |
| Karachi | " | " | Kurrachee |
| Nilgiri | " | " | Neilghery |
| Aligarh | " | " | Allygurh |
| Amballa | " | " | Umballa |
| Zamindar | " | " | Zameendar |

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع —

† انڈین میل - مورخہ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع - مسٹر ڈبلیو هنٹر نے اپنے گزیٹیر میں اس نئے اصول کے مطابق عمل کیا هے —

ناموں کے ہجے بدلنے سے یورپین لوگوں کو شروع میں سخت دقت پیش آئے گی - مجھے خود اسماء کے ہجے بدلنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے - بہت سے ہندوستانی لوگوں نے نئے نئے اصول کے مطابق اپنے ناموں کے ہجے بدل ڈالے ہیں - چنانچہ ڈبلن کے کرائسٹ کالج کے فاضل پروفیسر اپنے نام کو بجائے Meer Owlad Aleo کے اب Mir Aulad Ali لکھنے لگے ہیں - اسی طرح Moollah Azeez Ooddeen کا نام اب Mulla Azizuddin ہوگیا - لیکن میرے دوست سید عبداللہ نے اپنے نام کی ہجے نہیں بدلے - میں انہیں ان کی اس وضعداری پر قابل مبارک باد سمجھتا ہوں —

میرے خیال میں گلکرسٹ نے مشرقی الفاظ کو لکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس قدر فاضلانہ نہیں ہے جیسا کہ جونس کا طریقہ جسے حکومت ہند اختیار کر رہی ہے - ہمارے خیال میں یہ طریق تحریر مشرقی الفاظ کے لیے اتنا موزوں نہیں ہے جتنا کہ انگریزی الفاظ کے لیے موزوں ہے - گلکرسٹ کے طریقے کو اہل ہند اختیار کر رہے ہیں اور اسے اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے - مسٹر اسٹوڈس ٹن پریچرڈ نے اگرچہ موجودہ لکھنے کے طریق پر اعتراض کیا ہے لیکن ان کی یہ رائے ہے ہندستانی الفاظ لاطینی رسم خط میں لکھنے میں بہت سے فائدے ہیں - ہندستانی الفاظ جب لاطینی رسم خط میں لکھے جائیں تو ہجے کے بہ نسبت تلفظ کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے - موصوف نے اس بات کی بھی سخت مخالفت کی ہے کہ دوسری زبانوں کی علامات انگریزی یا یورپ کی کسی دوسری زبان میں استعمال کی جائیں - وہ چاہتے ہیں کہ خفیف a کی آواز کے لیے u کو باقی رکھنا چاہیے اور اسی طرح i کے لیے ee اور طویل u کے لیے oo رہنے چاہییں-

جن حروف صحیحہ کی آواز مشابہ ہے انہیں ایک دوسرے میں ضم کرنا بہتر ہوگا * —

میں اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ ہندستانی ادب میں ادائے مطالب کے نئے نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں - ہندی زبان کو ہندو لوگ سنوارنے کی کوشش کر رہے ہیں - لیکن میں ان لوگوں کو رجعت پسند خیال کرتا ہوں - خالص ہندستانی جسے اردو کہتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے - دونوں جماعتوں کے ترقی پسند افراد نے اس زبان میں کتابیں لکھی ہیں - اس کے علاوہ ہندستان میں اس وقت دیسی مسیحی ادبیات بھی خاص حیثیت رکھتی ہے - ہم اس ادبیات کو انڈو یوروپین کہہ سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ انگریزی اثر کی مرہون منت ہے - اس ادبیات کے متعلق مرشدآباد کے محمد ارشاد نے "اخبار سرشتۂ تعلیم اودھ" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے † —

"درحقیقت اس وقت دو طرح کی اردو زبان رائج ہے - ایک دیسی اردو ہے اور دوسری وہ اردو ہے جو انگریزی اثر سے پیدا ہوئی ہے - دیسی اردو کو ہندستان کے شہروں کے باشندے اور شرفا و امرا بولتے ہیں - یہ دیسی اردو نہایت صاف ستھری' سادہ اور ایسی فطری ہے کہ مطلب ادا کرنے کے لیے بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی- لیکن انگریزی اثر سے جو اردو نکلی ہے وہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے- اس کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی - یہ زبان سرکاری قواعد و

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۷ جون سنہ ۱۸۷۲ ع —

† ملاحظہ ہو "اخبار انجمن پنجاب" - مورخہ ۱۴ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع —

ضوابط اور احکام کا ترجمہ کرنے اور اخبارات کے ذریعہ وجود میں آئی ہے - اس نئی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے جملے بہت طویل ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بعض اوقات پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں - اس زبان میں آپ کو خالص ہندستانی زبان کے فقروں کی ساخت کہیں نظر نہیں آئے گی - اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسما و صفات، فعل، فاعل، مفعول اور ضمائر دور دور اور آپس میں بے تعلق سے ہوتے ہیں - لفظوں کی ترکیبیں عجیب و غریب ہوتی ہیں - الفاظ اور جملوں کا تعلق بعض اوقات اس قدر مصنوعی ہوتا ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنے والا کہنا کیا چاہتا ہے - حکومت کے احکام کے ترجمے اور اخباروں کی خبریں اس طرز تحریر کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں جو ذوق سلیم کو سخت ناگوار ہوتا ہے - پٹنہ کے ایک بزرگ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہندستانی زبان میں جتنے عربی اور فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں انہیں اس زبان سے خارج کرکے چھوڑیں گے اور ان کی جگہ انگریزی الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کریں گے - چنانچہ اس طرز میں انہوں نے بعض علمی کتب تالیف کی ہیں - لیکن اہل ہند کے لیے ان انگریزی الفاظ کے معنی متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور ان میں ہزارہا لوگ ایسے ہوں گے جو ان کتابوں سے استفادہ نہیں کرسکیں گے - یہ صاحب جن کا میں نے ذکر کیا اور انہیں کی طرح کے دوسرے ہندستانی مصنفین سمجھتے ہیں کہ اہل یورپ کے محاورں کا ہو بہو ترجمہ کرنا اور مکھی پر مکھی مارنا گویا کمال کی بات ہے - ان کا یہ خیال غلط ہے کہ یورپین خیالات کو اس طرح وہ اپنی زبان میں منتقل کرلیں گے - اہل ہند نے ہر بات میں یورپین لوگوں کی نقالی پر کمر باندھی ہے تو انہیں چاہیے

کہ پورے طور پر اہل یورپ کی زبان، لباس اور رسم و رواج اختیار کرلیں - ان جدت پسندوں کا یہ خیال غلط ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ حاکم جماعت کو خوش کر سکیں گے - یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ حکومت چاہتی ہے کہ ہندستانی اور دوسری ملکی زبانوں کو فروغ حاصل ہو تاکہ جدید مغربی علوم کی بہترین کتب کا ان زبانوں میں ترجمہ ہوسکے اور اہل مشرق ان علوم سے استفادہ کرسکیں - حکومت کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان میں انگریزی الفاظ اور غیر ملکی محاوروں کو داخل کرکے اس کے خد و خال کو مسخ کر ڈالیں - لارڈ میو کے عہد حکومت میں جو قرار داد حکومت نے منظور کی ہے اس سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت دیسی زبان کی ترقی کی خواہاں ہے - چنانچہ اس قرار داد کی روسے نہایت دشوار تجریدی مضمونوں میں بھی ہندستانی زبان میں امتحان لینے کی اجازت دی گئی ہے اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ انگریزی کی اعانت کے بغیر ہم اپنی زبان کو مالا مال کردیں - دراصل انگریزی اور ہندستانی زبان میں دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی - بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ انگریزی کی اعانت سے ہندستانی کو فروغ دیا جاے - ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے لیے فارسی، عربی اور سنسکرت کے سرچشموں سے فائدہ اٹھانا سمجھ میں آسکتا ہے * اگر انگریزی الفاظ بلا امتیاز ہندستانی میں داخل ہوتے چلے گئے تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہندستانی زبان بالکل خراب نہ ہوجاے - لیکن اگر فارسی، عربی اور سنسکرت سے ہندستانی زبان فائدہ اٹھائے گی

* بالکل اسی طرح جیسے فرانسیسی زبان لاطینی اور یونانی سے اعانت حاصل کرتی ہے جو اس کی ساخت میں شامل سمجھنی چاہییں -

تو اصطلاحات بنانے میں سہولت ہوگی اور زبان کو حقیقی معنوں میں فروغ حاصل ہوگا جس کی خواہش حکومت کو ہے - میں نے اوپر جن دشواریوں کا ذکر کیا ہے ان کی مثالیں ہمیں ضابطۂ فوجداری و دیوانی کی تدوین میں مل سکتی ہیں - ان قانونی کتب کو سمجھنے کے لیے ہر فقرے کو دس مرتبہ پڑھنا چاہیے تب جاکر اس کا مطلب معلوم ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتب کی تدوین میں انگریزی فقروں کا ہوبہو چربہ اتارنے کی کوشش کی گئی ہے - ان کی زبان کو ہم خالص ہندستانی نہیں کہہ سکتے" —

"اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" کے نامہ نگار نے جن دشواریوں کا اوپر ذکر کیا ہے ہم ان سے انکار نہیں کرتے - لیکن "علیگڑھ اخبار" (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) میں ایک مضمون نگار نے (جن کے متعلق مجھے پوری طرح یقین ہے کہ وہ سید احمد خاں ہیں) اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہندستانی میں انگریزی الفاظ کو رواج دینا چاہیے - چنانچہ موصوف نے اس زبان کی تائید کی ہے جو آج کل ہندستانی اخبارات میں عام طور پر ستعمال کی جاتی ہے - ہم ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو اخبار کے سات کالموں میں چھپا ہے —

مضمون نگار نے پہلے بتایا ہے کہ اس کو "المورہ اخبار" میں ایک مضمون پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندستانی زبان کے اخباروں کے طرز بیان کے متعلق کچھہ لکھا جاے - اس مضمون میں یہ ضرورت بتائی گئی ہے کہ اخباروں کی زبان ایسی صاف اور سادہ ہونی چاہیے کہ ہر بڑا چھوٹا آسانی سے اسے سمجھہ سکے اور جو مطالب بیان کیے گئے ہوں وہ ایسے متعین ہونے چاہییں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں ان کے متعلق شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے - لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ

اخبار نویس حضرات نہ تو اپنے طرز تحریر کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور نہ انہیں اس کی فکر ہوتی ہے کہ اخبار بین طبقے کی سہولت کیا ہے۔ "المورہ اخبار" کے دوسرے مضمون کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جس میں دیسی اردو اور اس اردو کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے جو انگریزی کے اثر سے بن رہی ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند اپنی قومی زبان کو اس کی اصلی حالت میں برقرار رکھنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ زبان اصلی حالت میں برقرار کیوں کر رہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ زبان مالا مال ہو اور اس میں مطالب ادا کرنے کی صلاحیت بڑھے۔ ہمارے زمانے سے کچھ قبل اردو کی خاص حیثیت تھی۔ نظم و نثر میں اس زبان میں ایسی تصانیف موجود ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں اور جن کی شہرت آج تک ہے۔ لیکن ان پرانی کتابوں کا طرز بیان اس سے مختلف ہے جو آج کل پایا جاتا ہے۔ موجودہ طرز بیان قابل ترجیح ہے اس واسطے کہ اس میں ایک طرح کا لطف اور صفائی پائی جاتی ہے جو اس زبان کے شایان شان ہے جو ایک بڑے ملک کی قومی زبان ہے۔ کچھ عرصہ قبل عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اردو میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ ملکی ضروریات کی کفیل ہوسکے لیکن آہستہ آہستہ اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ اس قدر مالا مال ہوگیا ہے کہ اب ہم اس کو ہندستان کی قومی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ذریعہ ہر قسم کے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس سے تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اب وہ زمانہ گیا جب کہ ہم اپنے خطوط اور ابتدائی کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھا کرتے تھے اور اس طرح ایک غیر زبان کے ذریعہ ہمیں

علم و ادب تک رسائی حاصل ہوا کرتی تھی - اس وقت اردو زبان میں اتنی پختگی نہیں آئی تھی کہ وہ ہر قسم کے مطالب ادا کر سکتی، لیکن اب اس زبان کے ذریعہ سے ہر قسم کے مطالب ادا کیے جا سکتے ہیں - اس زبان میں نظم اور شاعرانہ نثر کے علاوہ تاریخ و قصص کے بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے - اس کے سوا قدیم و جدید علوم، فنی مضامین اور حکومت کے احکام سب نہایت چھپی تلی زبان میں صحت و صفائی کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں - اس زبان میں جو اخبارات نکلتے ہیں ان کی کافی اشاعت ہے - فرضکہ زبان سے جو ضروریات پوری ہوتی ہیں وہ سب بدرجہ اتم اس زبان سے پوری ہوتی ہیں—

مضمون نگار محمد ارشاد کا خیال ہے کہ اخباروں اور حکومت کے قوانین کے ترجمے میں جو ہندستانی زبان استعمال کی جاتی ہے وہ ایک طرح کی انگریزی ہندستانی ہے - مضمون نگار کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس زبان میں انگریزی کے الفاظ اور محاوروں کی بہتات ہوتی ہے - اخباروں میں جو زبان لکھی جاتی ہے اس میں عربی اور فارسی کے لفظ بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں لیکن ان اخباروں کے مضمون نگاروں کی عربی اور فارسی کی واقفیت بہت محدود ہوتی ہے - ہندستانی زبان میں انگریزی لفظوں کے استعمال کی حمایت "علی گڑھ اخبار" میں کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزی لفظوں کا استعمال ہندستانی کی ترقی کے لیے ضروری ہے - لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ انگریزی محاوروں کو ہندستانی میں رائج کیا جائے جس کی وجہ سے ہندستانی زبان کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے —

" علی گڑھ اخبار " کے مضمون نگار کا خیال ہے کہ اردو ایک مرکب زبان

ہے - اس میں مختلف عناصر شامل ہیں - اگر اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کردیا جائے تو کچھ مضائقہ کی بات نہیں - مضمون نگار نے لکھا ہے کہ " جس زمانے میں ہندستانی زبان نئی نئی وجود میں آئی اس وقت اگر انگریزی فارسی کی جگہ سرکاری زبان ہوتی تو نئی زبان میں یقیناً بجائے فارسی الفاظ کے انگریزی کے لفظوں کی بھرمار ہوتی - اب ہمیں چاہیے کہ جب کبھی کسی مفید انگریزی لفظ سے ہماری ضرورت پوری ہوتی ہو تو اس کو بلا تکلف اپنی زبان میں داخل کرلیں - ایسا کرنے سے ہماری زبان میں سقم پیدا ہونے کے بجائے دلکشی پیدا ہوگی - اگر بجائے پانچ زبانوں کا مرکب ہونے کے ہماری زبان چھ کا مرکب ہوجائے گی تو کوئی بڑا فرق نہیں پیدا ہوگا - ہم یہ نہیں چاہتے کہ غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ رائج کریں - ہم صرف انہیں الفاظ کو لینا چاہتے ہیں - جو ضروری ہیں اس قسم کے الفاظ میں ہم "پارلیمنٹ ، " کمیٹی " اور " سوسائٹی " کو خیال کرسکتے ہیں - اس طرح کے بہت سے دوسرے لفظ ہیں جن کا ہماری زبان میں داخل کرنا ضروری ہے - شاعری ' مذہب اور خانگی بول چال میں اس قسم کے الفاظ داخل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے - ہم اپنی بیٹی کو " مائی ڈاٹر " یا " مائی ڈیر " نہیں کہیں گے —

اب میں ذیل میں ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو حال میں شائع ہوئی ہیں -

مجموعۂ سخن - یہ اردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے جسے پنڈت شیو نرائن نے مرتب کیا ہے اور لکھنؤ سے شائع کیا ہے - پنڈت جی اپنی متعدد تصانیف کی بدولت شہرت رکھتے ہیں —

مجمع الاشعار - یہ بھی اردو شاعروں کا تذکرہ ہے اور دہلی سے شائع ہوا ہے —

یہ دونوں تذکرے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ باوجود بعض ہندوؤں کی رجعت پسندی کے اردو شاعری کا ذوق ہندستان میں اب تک نشوونما پا رہا ہے - اس کا اظہار ان دیوانوں کے دیکھنے سے بھی ہوتا ہے جو ظہیر محمد گویا لکھنوی اور زمان علی نے شائع کیے ہیں * -
"زیبا فسانہ" میں جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے ایک قصہ نظم میں بیان کیا گیا ہے —

سنہ ۱۸۶۷ ع میں 'مرتھا' (اودھ) میں قرآن شریف کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے - اس کے ہر صفحہ پر دس سطریں ہیں - ہر سطر کے نیچے فارسی اور اردو میں ترجمہ ہے اور حاشیوں پر جلالین کی تفسیر ہے - یہ ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے - جلالین سے مراد محلی اور سیوطی کی تفسیر ہے - انھیں جلالین اس لیے کہتے ہیں کہ ان دونوں کے نام کے شروع میں 'جلال' اتا ہے - فارسی ترجمے کا عنوان "فتح الرحمن" ہے - یہ ترجمہ ولی اللہ عبدالرحیم نے کیا ہے - اس سے قبل بھی قران شریف کا ایک ایڈیشن شائع ہوچکا ہے جس میں اردو ترجمہ موجود ہے اور جلالین کی تفسیر بھی ہے - اس ایڈیشن کا پہلا حصہ میرے پاس موجود ہے - یہ چھوٹی تقطیع پر ۹۳۹ صفحات میں ہے —

حال میں اردو کی جو کتب شائع ہوئی ہیں ان میں سے میں صرف ان کے متعلق یہاں ذکر کروں گا جن سے میرے مقالے پڑھنے والوں کو کچھ دلچسپی ہوسکتی ہے —

تحفۂ تیموریہ - یہ کتاب نقہ میں ہے (اخبار عالم' مورخہ ۲۰ جون سنہ۱۷۷۲ع)

---

* یہ غالباً وہی شاعر ہیں جن کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ " جلد ۳ - ص ۳۶۱ پر زمان شاہ حافظ رامپوری کے نام سے ذکر کیا ہے -

تاریخ گجرات - یہ مرزا اعظم بیگ کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں گجرات کا مفصل حال ملتا ہے * —

سراج الہدایت - مصنفۂ وزیر علی خاں † - اس کتاب میں عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے -

سیرستان انگلینڈ - یہ کرشن داس کا سفر نامہ انگلستان ہے - انہوں نے اس کتاب میں ان خیالات کو ظاہر کیا ہے جو ان کے انگلستان میں قیام کی وجہ سے پیدا ہوئے ‡ - اس ضمن میں مسٹر ٹی ڈی - فورسِتھ ( Forsyth ) کے سفر نامہ ترکستان کا ذکر کردوں - یہ سفر نامہ اہل ہند نے بہت پسند کیا اور اس کا اردو میں لاہور سے ترجمہ شائع ہوچکا ہے —

راحت سالکین - یہ غلام محمد کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو سیالکوٹ سے شائع ہوا ہے - غزلیں تصوفانہ رنگ میں ہیں —

نامۂ منتظر - یہ شیو ناتھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو لاہور سے شائع ہوا ہے - غزلیں عاشقانہ رنگ میں ہیں —

منشی نظام الدین نے فارسی کی مشہور کتاب "اخلاق ناصری" کا، جس میں اصول اخلاق سے بحث کی گئی ہے، اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ لاہور سے شائع ہوا ہے اور ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے - اسی قسم کی دو اور کتابیں منشی غلام سرور نے لاہور سے شائع کی ہیں - ایک کا نام "اخلاق سرور" ہے اور دوسری کا "مخزن حکمت" —

---

* صفحات ٦٠٦ - مطبوعۂ لکھنؤ سنۂ ١٨٧٠ ع -

† میں نے اپنی کتاب "ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ" میں وزیر علی کا ذکر کیا ہے - غالباً یہ وہی وزیر علی ہیں - ( جلد ۳ - ۲۹۳ ) —

‡ صفحات ۱۸۸ مطبوعۂ دہلی ۱۸۷۱ ع -

ہندستانی میں کارآمد کتابیں تالیف کرانے کی ہر طرف ہمت افزائی کی جارہی ہے - مسلمانوں کی ترقیٔ تعلیم کے لیے جو انجمن قائم ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندستانی زبان میں لکھنے والے مصنفین کو پانچ سو، تین سو اور سو روپے کی رقمیں ان کی کتابوں کے معیار کے لحاظ سے بطور معاوضہ دی جائیں —

گورنر جنرل لارڈ میئو نے، جن کی ناگہانی موت سے سارے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی ہے، اہل ہند کی بھلائی کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ہزار روپے کی رقم بطور انعام کے اس شخص کو دی جائے جو مختلف امراض کے علاج کے متعلق بہترین کتاب تالیف کرے - جو اشخاص اس مقابلے میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنے مسودات ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ ع سے پہلے محکمۂ طبابت کلکتہ کو بھیجدیں —

ان مشرقی مصنفین کی پوری کتابیں رکھنے کے بجائے جن کی تصانیف کے بعض حصے مدارس اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہیں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کی کتب کے اقتباسات نصاب میں شامل کیے جائیں - مسٹر جان مردوش کی بھی یہی رائے ہے - اس کا بھی اہتمام کیا جائیگا کہ ایسے اقتباسات نہ رکھے جائیں جن سے مسیحی خیالات کی نشر واشاعت مقصود ہو - ہمارے خیال میں یہ غیر ضروری تھا —

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو لوگ ہندوستانی زبان میں (اردو میں یا ہندی میں) فلسفہ، تاریخ، سیاحت یا سائنس پر کوئی کتاب تالیف کریں گے انہیں ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائیگا بشرطیکہ کتاب کا طرز بیان دلکش اور عام فہم ہو - اس کی بھی اجازت ہوگی کہ کتاب نظم میں لکھی جائے یا نثر میں - اگر کوئی چاہے تو ایسے موضوع پر قلم

اتھائے جو بالکل خیالی ہو بشرطیکہ اس میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے گری ہوئی ہو - سنہ ۱۸۷۱ ع اور سنہ ۱۸۷۲ ع میں ہندی اور اردو کی ۲۲ کتابیں کمیشن نے پسند کیں جو خاص اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا - ان کتابوں کے مصنفین کو ۸ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع الہ آباد میں لفٹنٹ گورنر نے انعامات تقسیم کیے - بعض نے رقمی معاوضہ قبول کیا اور بعض نے اپنی کتاب حکومت کے خرچ پر طبع کرانے کی خواہش ظاہر کی - بعض کتابوں کے نسخوں کی ایک خاص تعداد حکومت کے مدارس کے لیے خریدنے کی منظوری دی گئی - ان کتابوں اور ان کے لکھنے والوں کی فہرست دینا غیر ضروری ہوگا - میں یہاں صرف ان میں سے چند کی نسبت ذکر کروں گا - " تاریخ آگرہ " کے مصنف کریم الدین ہیں - " جغرافیہ راجپوتانہ " پنڈت کرشنا نند کی تصنیف ہے جو بریلی کے رہنے والے ہیں - پنڈت مندولال نے ضلع مراد آباد کا جغرافیہ لکھا ہے - مرزاپور کے پنڈت گدادھر نے ایک سنسکرت کے ناٹک کا ترجمہ کیا ہے - اس ضمن میں منشی ذکاءاللہ کے " سلسلۃ العلوم " کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - منشی ذکاءاللہ دہلی کے نارمل اسکول میں مدرس ہیں - مسٹر کمپسن، ناظم تعلیمات صوبجات شمال مغربی نے " سلسلۃ العلوم " کی بہت تعریف کی ہے * —

ہندوستانی زبان کی ۱۴ ہزار جلدیں سنہ ۱۸۷۱ ع میں حکومت بمبئی کی طرف سے مدارس وغیرہ کو تقسیم کی گئیں - ان میں بعض کو حکومت

---

* اتالیق پنجاب - اگست سنہ ۱۸۷۲ ع ؛ علیگڑھ اخبار، مورخہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع - یہ منشی ذکاءاللہ وہی ہیں جنھوں نے شورش عظیم سے کچھ پہلے سنہ ۱۸۵۶ ع میں میرے مضمون " اردو تذکروں پر تقریظ " کا اردو میں ترجمہ کیا تھا - ان کا ذکر میری کتاب " ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ " میں ہے - جلد ۳ - ص ۳۵۲ —

نے اپنے خرچ سے طبع کرایا تھا اور بعض کو مصنفین سے خریدا تھا * - میرا خیال ہے کہ غالباً سنہ ۱۷۷۲ ع میں بھی حکومت بمبئی نے تقریباً اتنی ہی جلدیں خریدیں - صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل نے اعلان کیا ہے کہ اردو اور سندھی میں جو عمدہ کتابیں تصنیف کی جائیں گی ان کے لکھنے والوں کو حکومت کی طرف سے انعام دیے جائیں گے † —

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہندستانی زبان کی متعدد کتابیں ایسی شائع ہوچکی ہیں جن سے اہل ہند کی تعلیم میں بہت مدد ملے گی - ان میں سے بعض انعام کی مستحق قرار پائیں - علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے تین سال کے عرصے میں بیس کتابیں شائع کی ہیں - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کتب واقعی مفید ہیں اور جس مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں وہ ان سے پورا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر مسٹر لازرس (Lazarus) نے میرٹھ کی مجلس مباحثہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور میرٹھ کے "لارنس گزٹ" مورخہ ۱۴ جون میں ان کی یہ تقریر شائع ہوئی ہے - موصوف کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر کتب نہایت مفید ہیں اور جن کتابوں کا حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا گیا ہے وہ درحقیقت اسی لایق تھیں —

"علیگڑھ اخبار" مورخہ ۲۸ جون میں اس تقریر کا جواب شایع ہوا ہے - اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندستانی کی اکثر کتب جو شائع ہوئی ہیں کچھہ مفید نہیں ہیں اور ان کتابوں میں بھی جن کا معاوضہ دیا گیا ہے کوئی نئی بات نہیں ملتی - ان

* رپورٹ سررشتۂ تعلیم صوبۂ بمبئی بابتۂ سنۂ ۱۸۷۰ ع و سنۂ ۱۸۷۱ ع - ص ۳۱ -

† اخبارالاخیار - مورخۂ یکم جولائی سنۂ ۱۸۷۲ ع -

کتابوں میں زیادہ تر اخلاقیات کے مسائل ہیں اور لفظوں کو ادل بدل کر وہی مطالب بیان کیے گئے ہیں جو دوسری کتابوں میں ملتے ہیں - مضمون نگار نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ہر کتاب میں علم یا فن کے کسی ایک موضوع پر بحث کی جائے اور اس کے متعلق تحقیق ہو تو زیادہ مفید ہوگا - اب حال یہ ہے کہ سب کتابیں موضوع کے اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ان کے پڑھنے سے علم میں مطلق اضافہ نہیں ہوتا - اس پر کسی کو اعتراض نہیں کہ مصنفین کو ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تصانیف کی جانچ سختی کے ساتھ ہونی چاہیے اور صرف وہی قابل ترجیح قرار پائیں جن کی زبان صاف اور پاکیزہ ہو جیسی کہ دہلی کے مصنفوں کی ہوتی ہے - مضمون نگار نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع پر بھی بحث کی ہے - مضمون نگار کو اس بات کا یقین ہے کہ ہندستانی زبان میں نصاب کی جو کتب لکھی جا رہی ہیں ان میں آہستہ آہستہ ترقی ہوگی اور کچھ عرصے بعد بہتر کتابیں لکھی جائیں گی - ظاہر ہے کہ یہ کام بتدریج ہی ہو سکتا ہے - جوں جوں ہندستانی لکھنے والوں کو نصابی ضروریات کے مد نظر لکھنے کی مشق ہوتی جائے گی اسی قدر جلد عمدہ قسم کی کتابیں فراہم ہو سکیں گی —

۲ اگست کے "لارنس گزٹ" میں مسٹر لازرس نے "علیگڑھ اخبار" کے متذکرہ بالا مضمون کا جواب دینے کی کوشش کی ہے - پھر اس جواب پھر اس جواب کا جواب "علیگڑھ اخبار" کے مدیر نے ۱۶ اگست کی اشاعت میں دیا ہے اور اپنے دلائل کو بوضاحت بیان کیا ہے - اس کا خیال ہے کہ جو تصانیف معاوضے کے لیے مقابلے میں پیش کی

جاتی ہیں کی ان کا جانچنا بہت دشوار کام ہے - ان تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ مرکزی کمیٹی جو الہ آباد میں ان کے جانچنے کے لیے منعقد ہوتی ہے وہ ان سب تصانیف کو نہیں پڑھ سکتی- کمیٹی زیادہ تر انفرادی آرا پر بھروسہ کرتی ہے - لیکن کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا جس نے سب تصانیف پڑھی ہوں - اس لیے زیادہ تر قیاس اور اٹکل سے سے فیصلہ کیا جاتا ہے - "علیگڑھ اخبار" نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ ان مصنفین کی مطلق ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے جو ادھر ادھر سے سرقہ کرکے محض معاوضے کی خاطر کتاب تیار کرلیتے ہیں - وہ دوسری کتابوں کی زبان میں تھوڑی بہت تبدیلی کرکے وہی مطالب اپنی کتاب میں شامل کرلیتے ہیں - "تحفۃالعروس" کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو تمام تر "مرأت العروس" پر مبنی ہے *- سوائے زبان کے دونوں کتابوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا —

یہ خوشی کی بات ہے کہ مسٹر جان بیمز (Beames) نے 'چند' کے متعلق اپنی تحقیقات جاری رکھی ہے- موصوف نے اس کے متعلق اس سال کے " جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال " میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس کے ساتھ اصل متن کا بھی کچھ حصہ ہے - " انڈین انٹی کویری " میں مسٹر بیمز نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ ہندی کی بولیوں کو لسانیاتی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت حاصل ہے † - جس طرح مسٹر ایچ ایچ ولسن نے ادب کی اہمیت واضح کی ہے اسی طرح مسٹر 'بیمز' نے

* ملاحظہ ہو میری کتاب " ہندی اور ہندوستانی ادب کی تاریخ " جلد۲- ص ۴۶۰ - (دوسرا ایڈیشن) -

† مسٹر بیمز نے اس موضوع پر ایک اور مضمون لکھا ہے جو " ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی کارروائیوں" میں شائع ہوا ہے - مضمون کا عنوان " گمبھیر رائے کی رزمیہ نظم " ہے - (اگست سنہ ۱۸۷۲ ع) -

بولیوں کے متعلق یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی لسانیاتی اہمیت بہت زیادہ ہے - موصوف سے قبل ریورنڈ ایس ایچ کیلوگ ( Kellogg ) نے یہی خیال پیش کیا تھا اور یہ بات واضح کی تھی کہ اگرچہ ان بولیوں کا سنسکرت سے تعلق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ سنسکرت سے ماخوذ ہیں - میں بھی یہی خیال مدت ہوئی ظاہر کر چکا ہوں - ریورنڈ ڈاکٹر اے ایف آر ہورنل جو بنارس کے جگ نارائن کالج میں ہیں ' چند ' کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں - چونکہ اب مسٹر گروس نے جو ' چند ' کے متعلق کام کر رہے تھے ' اس کام کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لیے ریورنڈ اے ایف آر ' ہورنل ' نے مسٹر ' بیمز ' کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا ہے —

والمیکی کی رامائن کی جو نقلیں کی گئی ہیں یا ہندوستان کی جدید زبانوں میں اسی قسم کی جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے متعلق ایک عقیدتمند ہندو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں صرف تلسی داس کی رامائن ایک ایسی ہے جس میں انسانی نکوکاری کو اجاگر کرکے دکھایا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ عقیدتمند ہندو اس کو بڑے اعتقاد سے پڑھتے ہیں - شمال مغربی ہند میں ہر ہندو چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ہو تلسی داس کی رامائن کے چند اشعار اسے ضرور یاد ہوتے ہیں جنہیں وہ مناسب موقع محل پر پڑھ دیتا ہے * —

یجروید کی برج بھاشا کی تفسیر جسے گوری پرشاد سنگھہ راجہ ' بیسما ' نے کچھہ عرصہ ہوا لکھنا شروع کیا تھا ' اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے - اس کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں جو دیوناگری رسم خط میں

* علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

۶۰۰ صفحات پر آئے ہیں —

سنسکرت کی کتاب راماسوا میدھ کا ہندی ترجمہ دوہے اور چوپائی میں کیا گیا ہے - اس کے متعلق "کبی بچن سدھا" مورخہ ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع میں ذکر کیا گیا ہے - اس میں ہندوؤں کی زبان کی رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے - دھلی میں "مجنوں لیلی" کے عربی قصے کو ہندی میں شائع کیا گیا ہے —

آگرہ میں مہابھارت کا اردو ترجمہ ماہوار برابر شائع ہو رہا ہے اور پنجاب کی "انجمن ادب" نے بھی اس کا نسخہ خریدا ہے * —

یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ دھلی کی "مجلس ادب" کی جانب سے رگ وید کا اردو ترجمہ کرایا گیا ہے اور اس وقت زیر طباعت ہے - لیکن یہ ترجمہ بجائے اصل سنسکرت کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے - ترجمہ کرنے والے لکشمن داس ہیں اور پنڈت بشن ناتھ نے بھی ان کے ساتھ اس کام میں شرکت کی ہے —

بمبئی کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل (Mr. Peile) نے از راہ نوازش جدید کتابوں کی فہرست بھیجی ہے جس سے ہندوستانی، سندھی، مرہٹی اور گجراتی کی کتابوں کا حال معلوم ہوتا ہے - ان کتابوں میں "کامروپ" اور "برہ بارہ ماسا" قابل ذکر ہیں - ان کے علاوہ فلسفۂ ویدانت پر ہندی زبان میں ایک تفسیر ہے جن میں سنسکرت اشعار بھی درج کیے گئے ہیں - اس کتاب کا نام "ودیان نوکا ساتک" ہے - اس کے مصنف کا نام شام داس ہے - ہندی سے انگریزی میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان

* اخبار انجمن پنجاب، مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ ع -

میں " راج نیتی " کا ترجمہ قابل ذکر ہے - یہ ترجمہ سی ڈبلو بوڈلر ( C. W. Bowdler ) نے کیا ہے —

ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے جو کچھہ عرصے سے آدی گرنتھ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، ابھی حال میں ایک حصہ بطور نمونہ " جرنل اف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی " ( جلد ۵ - حصہ ۲ - ص ۱۹۷ ) میں شائع کیا ہے - موصوف نے نہایت تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ آدی گرنتھ کی زبان " دسویں پادشاہ کے گرنتھہ " کی طرح ہندی نہیں ہے بلکہ اس سے مختلف ہے - یہ زبان بڑی حد تک سندھی سے مشابہ کہی جاسکتی ہے جسے ہم قدیم گُرمکھی کہہ سکتے ہیں - ڈاکٹر ٹرمپ نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے مثالیں پیش کی ہیں اور اُن پر تنقید کی ہے - اس فاضلانہ بحث سے جو نہایت دلچسپ ہے، بعض غیر یقینی باتیں پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتی ہیں - اس ضمن میں موصوف نے مجھے ذاتی طور پر گزشتہ ۲ اکتوبر کو ایک خط لکھا ہے جو میں یہاں نقل کرتا ہوں :—

" میں گزشتہ اپریل میں ہندوستان سے واپس آچکا ہوں - وہاں کے دوران قیام میں میں نے سخت محنت کی - سکھہ مذہب کے عالموں کی مدد سے میں نے لاہور میں پورے گرنتھ کا مطالعہ کیا اس سلسلے میں مجھے معلوم ہوا کہ خود ان لوگوں کو اپنی مقدس کتاب کے متعلق بہت کم واقفیت ہے - ان کی تاویلیں اکثر بالکل قیاسی ہوتی ہیں - لیکن یہ دیکھہ کر مجھے اس لیے تعجب نہیں ہوا کہ یہ لوگ سنسکرت نہیں جانتے اور پراکرت سے بالکل ناواقف ہیں جو قدیم ہندی کو

سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے - جوں جوں میں نے آدی گرنتھ کے مطالعہ میں ترقی کی اتنا ہی میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے اس زبان کی ایک لغت اور ایک کتاب صرف و نحو کے متعلق تیار کرنی چاہیے - لدھیانہ کے امریکی میاغین مسیحیت نے جو پنجابی کی لغت تیار کرائی ہے اس سے آدی گرنتھ کے سمجھنے میں مطلق مدد نہیں ملتی - تھامسن کی ہندی لغت بھی اس مطلب کے لیے بیکار ثابت ہوئی - غرضکہ میں نے یہ دونوں کام اپنے ذمہ لیے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ انہیں پایۂ تکمیل کو پہنچایا - اب مجھے جب کبھی فرصت ملی تو پنجابی گرامر کو شائع کروں گا جو مجھے یقین ہے آپ کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگی اس واسطے کہ گرنتھ میں ازمنۂ وسطیٰ کی ہندی بولیوں کا انتخاب ملتا ہے جن سے ہندستان کی موجودہ زبانیں نکلی ہیں - ان قدیم بولیوں کے ذریعے بہت سے لسانی مسائل ہماری سمجھ میں آجاتے ہیں - اگرچہ یہ بولیاں آج مردہ ہیں لیکن ان کی اہمیت باقی ہے - آپ اپنی تصنیف " ہندی اور ہندوستانی ادبیات کی تاریخ " میں گرنتھ کے مصنفین کو بھی شامل کر سکتے ہیں - کبیر داس کے کلام کا بیشتر حصہ گرنتھ میں شامل ہے - اس طرح ہندی کے قدیم لکھنے والوں میں نامداس ' راوی داس ' تریلوچن ' پیپا اور سینا وغیرہ اور دوسرے بھگتوں کا کلام آپ کو اس میں ملے گا - ان مختلف بھگت شاعروں کی زبان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کی زبان کا سمجھنا

بعض اوقات بہت دشوار ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ
اس وقت تک زبان کی شکل میں صحت و تعین نہیں پیدا
ہوا تھا - ہندوستان میں مجھے کبیر کے کلام کا ایک قلمی نسخہ
دستیاب ہوا ہے جس کی میں نہایت احتیاط کے ساتھ نقل
کروا رہا ہوں - قدیم ہندی کے شاعروں میں دادو، بکھونا،
ہری چند اور سندر داس کے کلام کے نسخے بھی میں نے
حاصل کرلیے ہیں" —

اس عرصے میں ان تھک ڈاکٹر ٹرمپ کی "سندھی صرف و نحو"
شائع ہوچکی ہے * - یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے - ہمارے لیے اس میں
اس لیے اور زیادہ دلچسپی موجود ہے کہ سندھی زبان کا ہندوستانی
اور دوسری دیسی زبانوں سے مقابلہ کیا گیا ہے - اس کتاب کی بدولت
ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے - اس کی اشاعت انگریزی حکومت
کی طرف سے کی گئی ہے - اس کا انتساب سر بارٹل فریر ( Sir Bartle Frere )
کے نام کیا گیا ہے جو بمبئی کے لفٹنٹ گورنر تھے - ڈاکٹر ٹرمپ نے پشتو
زبان کی صرف و نحو بھی تیار کی ہے جو زیر طباعت ہے - موصوف نے
عام خیال کے خلاف یہ بات ثابت کی ہے کہ پشتو ہندوستانی زبانوں کے
خاندان سے تعلق رکھتی ہے —

ہندوستانی اردو کی ابتدائی کتابوں کو جو کامیابی اور مقبولیت
حاصل ہورہی ہے وہ دراصل ایک طرح کا رد عمل ہے ان حملوں کے خلاف
جو مسٹر کمبل نے اس زبان پر کیے تھے - اس ضمن میں مسٹر جان ڈوسن

---

* Grammar of the Sindhi Language campared with the Sanscrit-Pracrit and the cognate Indian Vernaculars. ( Leipzig, 1872 ).

(John Dowson) کی اردو صرف ونحو قابل ذکر ہے * - موصوف سلڈھرسٹ کے اسکول میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں - درحقیقت اردو زبان کی صرف ونحو پر نئی کتاب کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی اسواسطے کہ اس موضوع پر پہلے سے متعدد کتب موجود تھیں لیکن مسٹر جان ڈوسن نے اپنے پیشرووں کے مقابلہ میں زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے - اردو صرف ونحو پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں مسٹر ڈوسن کی کتاب سب سے زیادہ مکمل ہے - اس میں "باغ وبہار" سے مثالیں پیش کی گئی ہیں - خط شکستہ اور تقویم کے متعلق نئی معلومات درج کي گئی ہیں - مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ مسٹر ڈوسن نے بھی شکسپیئر کی طرح اردو کے ایرانی - ہندی حروف تہجی مکمل نہیں درج کیے بلکہ صرف ان کی علحدہ علحدہ اصلی شکلیں لکھی ہیں - وہ شکلیں جو دوسرے حروف سے مل کر پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے بعض اوقات اصلی حرف پہچان نہیں پڑتا ' چھوڑ دی گئی ہیں - اگرچہ ان کے متعلق علحدہ ذکر کردیا گیا ہے —

دیبی پرشاد رائے نے ایک لغت کلکتہ سے شائع کی ہے جس میں ہندی اور ہندوستانی کے علاوہ انگریزی ' فارسی اور بنگالی کے الفاظ ہیں - اس کے علاوہ ہندوستانی زبان کی اور متعدد کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن کا ذکر غیر ضروری ہے - الہ آباد کے ریورنڈ جے ڈی بیٹ کی ہندی لغت آج کل زیر طباعت ہے اس لغت میں ۳۷ ہزار الفاظ ہیں - شیکسپیئر ' فوربس اور تھامسن کی لغتوں کے مقابلے میں اس میں بارہ ہزار الفاظ زیادہ ہیں - یہ لغت تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی - اس وقت

* A Grammar of the Urdu or Hindustani Language, (London, 1872).

اس کا نمونہ میرے پیش نظر ہے- ڈاکٹر ایس ڈبلو فیلن کی ہندوستانی انگریزی لغت کا نمونہ بھی میرے سامنے ہے- یہ لغت اور دوسری لغتوں کے بہ نسبت جو اب تک شائع ہوئی ہیں زیادہ مکمل ہے- اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ عورتوں کی زبان کے خاص الفاظ اس میں شامل کیے گئے ہیں جو اور دوسری لغتوں میں نہیں ملتے —

ڈاکٹر جی ڈبلو ایٹنز کی عملی کاوشیں ابھی جاری ہیں- موصوف نے ہندوستانی میں عربی زبان کی گرامر لکھی ہے جس کا نام "مقدمۃ الصرف" ہے- یہ کتاب ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور لاہور میں طبع ہوئی ہے-

میجر ہنری کورٹ نے جنھوں نے کچھ عرصہ قبل 'سودا' کا کُلیات شائع کیا تھا، "نثر بے نظیر" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو سنہ ۱۸۷۱ ع اور سنہ ۱۸۷۲ ع میں الہ آباد میں شائع ہوا ہے- میں ذاتی طور پر خود میر حسن کی نظم کو ترجمہ پر ترجیح دیتا ہوں-'افسوس' کی "آرائش محفل" کا بھی انگریزی میں موصوف نے ترجمہ کیا ہے —

پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کی رپورٹ بابت حالات سرحد شمال مغربی کا اردو ترجمہ کپتان ہولرائڈ نے کیا ہے جو اصل رپورٹ کے شائع ہونے کے ساتھ لکھاؤ سے شائع ہوا ہے یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی ہے —

اردو زبان میں جو مسیحی ادب شائع ہو رہا ہے اس میں اس سال نئی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے- لاہور کے ریورنڈ رابرٹ کلارک کی نوازش سے مجھے ان میں سے چند کتابیں حاصل ہوگئیں اور بعض کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں- ان کتابوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں-

تاریخ محمد- یہ کتاب اردو میں امرتسر کے عمادالدین نے لکھی ہے-

موصوف مشہور عالم ہیں اور مسلمان سے عیسائی ہوگئے ہیں- میں نے اپنے سنہ ۱۸۷۱ ع کے مقالے میں غلطی سے لکھہ دیا تھا کہ عمادالدین "اعجاز قرآن" کے مصنف ہیں حالانکہ اس کتاب کے مصنف رام چندر ہیں جو دہلی کے باشندہ ہیں اور آج کل پٹیالہ میں ناظم تعلیمات ہیں- میں سمجھتا ہوں یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ایسے شخص نے جو کبھی زمرۂ اسلام میں داخل تھا لیکن اب اس سے باہر ہے' اپنی زبان میں لکھی ہے- سیرت نگار نے ان متضاد بیانوں کا ذکر کیا ہے جو قرآن اور حدیث میں ملتے ہیں- قرآن میں معجزوں کو بیکار بتایا ہے اس لیے کہ ان سے حقیقت ثابت نہیں ہوسکتی- حالانکہ حدیث میں جو بذریعہ روایات محفوظ ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب ایسے معجزے منسوب کیے گئے ہیں جو مضحکہ خیز ہیں —

عمادالدین ایک اور دوسری کتاب "تعلیم محمد" کے نام سے لکھہ رہے ہیں- اس کتاب کے لکھنے میں بہترین دیسی ماخذ استعمال کیے گئے ہیں- یہ کتاب ہندوستان کے مسیحی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے- تبلیغ و اشاعت کے کام میں ان دونوں کتابوں سے بہت مدد ملے گی-

نغمۂ زنبوری- اس میں عمادالدین اور لکھنؤ کے ایک مولوی کا مباحثہ بیان کیا گیا ہے —

تحقیق الایمان- اس کتاب میں عمادالدین نے مختلف مذاہب کے متعلق تحقیق کی ہے —

ضرورت ہند- یہ سردار دھیان سنگھہ کا خطبہ ہے جو انہوں نے سکھہ سرداروں کے روبرو پڑھا تھا تاکہ وہ غلط راستے کو چھوڑ کر سیدھا راستہ اختیار

کریں اور وحشت و بربریت کو ترک کر کے تہذیب و تمدن کے سایہ میں پناہ لیں۔ یہ خطبہ امرتسر میں جو سکھوں کا مذہبی مرکز اور تجارت کی بڑی منڈی ہے، طبع ہوا۔

ایک ہندوستانی شخص نے جو عیسائی ہوگیا ہے ایک سو صفحوں کا رسالہ لکھا ہے جو الہ آباد میں طبع ہوا ہے* - اس رسالہ کا نام "مرأت الواعظین" ہے۔ اس میں ان لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے جو دیسی لوگوں میں مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔ مضمون نگار نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ مسیحی مذہب نے ابتدائی تین صدیوں میں نہ صرف رومۃ الکبریٰ بلکہ ایران اور عربی ممالک میں جو ترقی کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یہ ترقی ان حالات میں ہوئی جب کہ مسیحی مبلغوں کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں مسیحی مبلغوں کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں اور ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے تب بھی مسیحیت کی ترقی کو اس ملک میں زور حاصل نہیں ہوا۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ان دیسی عیسائیوں پر عاید ہوتی ہے جو تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ اول تو یہ لوگ جیسے تعلیم یافتہ ہونے چاہییں ویسے نہیں ہیں۔ پھر غلطی سے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کوتاہی کو اپنے جوش و خروش سے پورا کرسکیں گے۔ لیکن حقیقت میں ان کا یہ جوش جھوٹا جوش ہے۔ اس کی تہ میں سچا مذہبی احساس نہیں ہے اور نہ اس کے پیش نظر الوہی مقاصد ہیں۔ یہ لوگ غلطی

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع۔

سے سمجھتے ہیں کہ یورپین طرز کا لباس پہن کر اور یورپین معاشرت کی تقلید کر کے وہ اپنے کام کے لیے کوئی خاص اثر پیدا کرتے ہیں- دراصل ان باتوں کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے- ان باتوں سے اہل ہند کے دلوں میں ناراضی پیدا ہوتی ہے- وہ انہیں حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ روپے پیسے کے لیے تبلیغ کا کام کر رہے ہیں- مضمون نگار نے اپنی صاف اور کھری باتوں کی معذرت کی ہے اور اپنے مضمون کو سینٹ پال کے اس مقولے پر ختم کیا ہے کہ "کیا میں اس لیے تمہارا دشمن ہوگیا کہ میں نے تم سے سچی اور کھری کھری باتیں کہہ دیں" —

میں ان سب کتابوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو مذہبی مسائل کے متعلق یورپین لوگوں نے ہندوستانی زبان میں لکھی ہیں اور جو گزشتہ سال شائع ہوئی ہیں —

ادبی کتابوں کے بعد اخباروں کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں دن بدن ہندوستان میں ترقی حاصل ہو رہی ہے- وہ سیاسی، علمی اور ادبی اخبار جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں بدستور جاری ہیں- ان میں سے بعض مجھے وصول ہوتے ہیں جن کے بھیجنے والوں کا میں شکر گذار ہوں- مجھے پہلی مرتبہ "پنجابی اخبار" کے نسخے وصول ہوئے ہیں جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے —

اس وقت ہندوستانی زبان کے ۹۰ مختلف اخبارات ہندوستان کے چار صوبوں یعنی پنجاب، صوبجات شمال مغربی، اودھ اور صوبجات متوسط سے شائع ہو رہے ہیں * - صوبجات شمال مغربی (یو- پی) کے

* علیگڑھ اخبار- مورخہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع-

ہندوستانی اخبارات کی تعداد سنہ ۱۸۶۹ع میں ۲۶ تھی' سنہ ۱۸۷۰ع میں ۳۳ تھی اور اب اس سے بھی زیادہ ہوگئی ہے- ان ۳۳ اخباروں میں سے ۲۰ اخبار ہندوستانی اردو میں تھے' ۹ ہندی میں اور ۵ ہندی اور اردو دونوں میں تھے- ایک اخبار بنگالی کا تھا- ان اخباروں کے اکثر مضامین انگریزی اخباروں سے ماخوذ ہوتے ہیں لیکن بعض مضامین اصلی ہوتے ہیں اور خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں- ان میں تعلیمی اور معاشرتی مسائل کے متعلق مفید معلومات ہوتی ہیں- ان میں وہ شکایتیں صاف صاف بیان کردی جاتی ہیں جو اہل ملک کو انگریزی حکومت سے ہوتی ہیں- ان تمام اخباروں میں "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" اپنے مضامین کے معیار کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے- اس اخبار میں مولوی سید احمد خاں اور ان کے تنقید نگاروں میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یورپین اداروں کو ہندوستانی اداروں پر فوقیت حاصل ہے یا نہیں- سنہ ۱۸۷۰ع میں صوبہ شمال مغربی میں ۸ رسالے شایع ہورہے تھے جن میں سے ۶ ہندوستانی میں' ایک سنسکرت میں اور ایک انگریزی میں ہے —

اس کے سوا ہندوستان کی مختلف ادبی انجمنیں اپنے اپنے رسالے شائع کرتی ہیں جن میں ان کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں اور ان کے جلسوں میں جو مباحثے ہوتے ہیں ان کا حال درج ہوتا ہے تاکہ رسالے کے پڑھنے والوں کو پوری کیفیت ملتی رہے * —

دہلی کی ادبی انجمن کا اب تک کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا تھا لیکن اب انجمن نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ بھی اپنا رسالہ شائع کرے گی-

* **Report on the administration of the North - West Provinces for 1870 – 71.**

چنانچہ اس کی پہلی اشاعت کے متعلق " اتالیق پنجاب " میں ذکر ہے اور اس کی بہت کچھہ تعریف توصیف کی گئی ہے —

اور دوسرے رسالے جن کی نسبت میں نے پہلے ذکر نہیں کیا مندرجہ ذیل ہیں :—

بودھا سماچار - اس ھندی اخبار کا " اخبار انجمن پنجاب " مورخہ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع میں ذکر موجود ہے —

چشمۂ علم - یہ اخبار پٹنہ کے نارمل اسکول کی طرف سے نکلتا ہے —

کوہ طور - یہ مہینے میں دو دفعہ لاھور سے شائع ھوتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۶ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع کو شائع ھوئی - یہ ۸ صفحوں پر مشتمل ھوتا ہے اور اس میں علمی اور ادبی مضمون ھوتے ھیں —

منشور محمدی - یہ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع سے ھر دسویں روز بنگلور سے شائع ھوتا ہے اور آٹھہ صفحوں پر مشتمل ھوتا ہے - اس کے مدیر منشی محمد قاسم ھیں جو " قاسم الاخبار " کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے ھیں - اس اخبار کے ضمیمے میں ان مضامین کی تردید شائع کی جاتی ہے جو لکھنؤ کے مسیحی مبلغوں کے اخبار " شمس الاخبار " میں نکلتے ھیں * —

مطلع انوار — یہ اخبار اردو اور ناگری رسم خط دونوں میں ھوتا ہے - لاھور سے شائع ھوتا ہے اور اس کے مضامین زیادہ تر ھندوؤں سے متعلق ھوتے ھیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ ھندوؤں کے رسم و رواج اور ان کے عقاید کی حمایت کرے - " اخبار انجمن پنجاب " مورخہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس کے متعلق ذکر ہے —

* دیکھو میری کتاب " ھندی اور ھندوستانی ادبیات کی تاریخ " - جلد ۳ - ص ۳۸۶ -

میئو میموریل گزٹ - اگرچہ اس کا نام انگریزی وضع کا ہے لیکن یہ اخبار اردو کا ہے اور انجمن دہلی کی طرف سے شائع ہوتا ہے * —

پٹیالہ اخبار - اس کے متعلق " اخبار الاخبار " مورخہ ۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع میں ذکر ہے —

رسالۂ انجمن بٹالہ - یہ رسالہ بٹالہ کی انجمن شائع کرتی ہے اور اس کی طباعت لاہور میں ہوتی ہے —

شمشیر بہادر - یہ اخبار ہندوستانی زبان میں نکلتا ہے - اس کے متعلق النس انڈین میل ( Allens Indian mail ) مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع میں ذکر موجود ہے —

عمدۃ الاخبار - یہ اخبار بھوپال سے شائع ہوتا ہے - اسی نام کے دو اخبار ایک مدراس سے اور ایک بریلی سے شائع ہوتے ہیں —

اردو گائڈ - یہ ہندوستانی زبان کا اخبار کلکتہ سے ٹائپ میں شائع ہوتا ہے اور مطبع مظہرالعجائب میں چھپتا ہے - " مظہرالعجائب " مطبع کا بھی نام ہے اور ایک اخبار کا بھی نام ہے جو اسی مطبع میں چھپتا ہے - اس کے مدیر کا نام تریلا کھوناتھہ دت ہے —

دیسی لوگوں کے انگریزی اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں ان میں علیگڑھ کا " محمڈن سوشل ریفارمر " ( تہذیب الاخلاق ) خاص طور پر قابل ذکر ہے —

الہ آباد کے رسالے " مخزن مسیحی " کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۶۸ ع والے خطبہ میں ذکر کرچکا ہوں - یہ رسالہ بدستور جاری ہے - اس کے

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۷۲ ع -

مدیر ریورنڈ جے والش ( Rev. Walsh ) ہیں جو آج کل یورپ آئے ہوئے ہیں - موصوف نے مجھے دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع تک کی سب اشاعتیں ازراہ شفقت بھیج دی ہیں - اس اخبار کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا علمی معیار بڑی بلند ہوتا ہے - اس میں اردو کی بعض نظمیں شائع ہوئی ہیں جو انگریزی وزن کے مطابق لکھی گئی ہیں - لکڑی پر بنائی ہوئی تصویروں کے عکس بھی ان میں شائع ہوئے ہیں - ضمیموں میں بعض مذہبی کتابوں کے ترجمے برابر نکلتے رہتے ہیں - چنانچہ " The Pilgrim's Progress " ' " The Blood of Christ " ' " The Closer Walk " " The Fountain of life " اور " The Missionary Flavel " کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں ان ترجموں کے سوا " عیسائیت کی تاریخ " ' " سینٹ جیک کی تفسیر " اور " القاب المسیح " بھی شائع ہوچکی ہیں —

لاہور سے " Punjab Tract and Book Society " کے زیر اہتمام اردو میں ایک رسالہ جاری ہوا ہے جس کا نام " حقیقی عرفان " ہے —

" کوی بچن سدھا " میں ' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ' ہندی کتابوں کے اقتباسات شائع ہوتے ہیں - اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اخبار اردو اور ہندی کے دوسرے اخباروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے - اس کے مدیر بابو ہری چندر نے اس اخبار کی ۹ مارچ سنہ ۱۸۷۲ع کی اشاعت میں ہندوستان کی رائے عامہ کے متعلق بحث کی ہے - اسی موضوع پر سید محمود نے ایک دلپذیر تقریر کی تھی جس کے متعلق میں سنہ ۱۸۷۱ع کے مقالہ میں ذکر کرچکا ہوں - بابو ہری چندر نے بھی بالکل وہی استدلال پیش کیا ہے جو سید احمد خاں کے قابل فرزند نے پیش کیا تھا - دونوں کی فکر کا انداز بالکل ایک سا معلوم ہوتا ہے - ہندوستان میں

مذہبی اختلاف کی وجہ سے فکر و نظر کی ایسی مشابہت قابل تعجب معلوم ہوتی ہے - بابو ہری چندر نے اپنے مضمون کے اختتام پر اسی قسم کی خواہشات کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر تعلیم یافتہ ہندو ظاہر کیا کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں :- " جب تک عام طور پر یہ خواہش لوگوں میں نہیں پیدا ہوگی کہ وہ توہمات کے بوجھل جوئے کو اتار پھینکیں اس وقت تک ہندوستان کی نجات کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی - ضرورت اس کی ہے کہ فرقہ واری تنگ نظری کے کالے بادل مغربی تہذیب وتمدن کی شعاعوں سے دور ہوں اور پھر ہم اس قابل ہوسکیں کہ عام نقطۂ نظر سے اپنے رسم و رواج پر تنقید کرسکیں - اس وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی قومی ترقی کی عمارت کو اتحاد کی بنیادوں پر کھڑا کرسکیں گے- اور دنیا کی قوموں کی اولین صف میں جگہ پاسکیں گے " —

مذکورہ بالا اخبار کی گزشتہ ۲ اکتوبر کی اشاعت میں ہندی زبان کے متعلق ایک نہایت دلچسپ اور فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہے - میرے قابل شاگرد مسٹر گستاو گارز نے ، جو پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نہایت ممتاز رکن ہیں ، اس مضمون کا مندرجہ ذیل الفاظ میں خلاصہ بیان کیا ہے[۹] :—

" زبان کی تین قسمیں ہیں - (۱) روز مرہ - (۲) شاعری کی زبان - اور (۳) نثر کی زبان - اس بات کا تعین کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ صوبجات شمال مغربی کی روز مرہ کیا ہے - دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں کھتری ، اگروال اور دوسری مغربی ذاتوں کے لوگ ہندی نہیں بولتے - ہر کوس پر بولی بدلتی جاتی ہے - بنارس کے قدیم باشندے

مختلف بولیاں بولتے ھیں - تانبے کے برتن بنانے والوں کی ایک بولی ھے اور کلکتے کے بانیے ایک اور بولی بولتے ھیں - عوام الناس کی بولی کے علحدہ محاورے ھیں - بعض لوگوں کا خیال ھے کہ بنارس کی قدیم ترین زبان وہ ھے جو وھاں کے قوم بولتے ھیں - اس بات کا اچھی طرح یقین ھے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پچھم کی طرف کی ھے - بنارس سے تھوڑے فاصلے پر گنگا پار جائیے تو رام نگر میں بالکل دوسری ھی بولی آپ کو سنائی پڑتی ھے - یہ بولی مرزا پور کی بولی سے بہت کچھہ ملتی جاتی ھے - غرضکہ مختصر طور پر یہ کہنا درست ھے کہ صوبجات شمال مغربی میں مختلف بولیاں بولی جاتی ھیں - اگرچہ چند شہر ایسے ضرور ملتے ھیں جہاں کھڑی بولی بولی جاتی ھے لیکن یہ کہنا درست نہ ھوگا کہ کھڑی بولی صوبجات شمال مغربی کے سب لوگوں کی مادری زبان ھے -

" صوبجات شمال مغربی کی شاعری کی زبان برج بھاشا ھے اور اس میں کچھہ شبہ نہیں کہ برج بھاشا کا استعمال قدیم زمانے سے یہاں چلا آرھا ھے اگرچہ تاریخی طور پر اس کا ذکر اکبر کے زمانے سے ملتا ھے ملک محمد جائسی ، چند اور تلسی داس کے طرز نگارش میں بے قاعدگی پائی جاتی ھے - میں نے ذاتی طور پر کھڑی بولی میں شعر کہنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ھو سکا - اس سے مجھے یہ بات معلوم ھوئی کہ شاعری کے لیے در اصل برج بھاشا ھی موزوں ھے - بعض شاعروں نے بندھیل کھنڈی میں بھی اظہار کیا ھے اور بعض نے پنجابی

اور مارواڑی میں شعر کہے ہیں —

متذکرہ بالا مضمون نگار نے مختلف بولیوں کے مختصر نمونے دیے ہیں۔ کھڑی بولی کا ایک دوہا بطور مثال پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی ہے :- "یہ شاعری کس قدر بوجھل معلوم ہوتی ہے! میں نے اس پر اکثر غور کیا کہ کھڑی بولی میں شعر کیوں نہیں کہے گئے اور مجھ پر یہ راز کھلا کہ چونکہ اس زبان کے افعال اور دوسرے اجزائے کلام لمبے لمبے ارکان تہجی پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے وہ شعر کے لیے موزوں نہیں ہوتے - اس مثال سے سب پر یہ بات روشن ہو جانی چاہیے کہ شاعری کے لیے برج بھاشا خاص طور پر موزوں ہے اور اس کو دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہے" —

"زبان کی تیسری قسم کا اظہار نثر میں ہوتا ہے - اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے پایا جاتا ہے - بعض کہتے ہیں کہ نثر لکھنے میں اردو کے لفظ کثرت سے استعمال کرنے چاہییں اور دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں سنسکرت کے لفظوں کو ترجیح دینی چاہیے - چونکہ اپنے اپنے رجحان کے مطابق لوگ ہندی نثر لکھتے ہیں اس واسطے اس کی کوئی معین شکل نہیں پیدا ہوسکی" —

ہندی نثر لکھنے میں جو رجحان پائے جاتے ہیں ان کی مثالیں مضمون نگار نے پیش کی ہیں اور انہیں مندرجۂ ذیل قسموں میں تقسیم کر دیا ہے —

( ۱ ) ایسی ہندی نثر جس میں سنسکرت کے لفظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہوں —

( ۲ ) ایسی ہندی جس میں سنسکرت لفظ کم ہوں —

( ۳ ) صحیح ہندی —
( ۴ ) ایسی ہندی جس میں دوسری زبانوں کے لفظوں کی آمیزش ہو —
( ۵ ) ہندی جس میں فارسی کے لفظ استعمال کیے گئے ہوں —
( ۶ ) وہ ہندی جس میں ایسے انگریزی کے لفظ استعمال ہوے ہوں جو اہل ہند بلا تکلف بولتے ہیں —
( ۷ ) ایسی ہندی جس میں پوربی یا بنارس کے قریب کی بولیوں کی آمیزش ہو -
( ۸ ) ایسی ہندی جس میں بنارس کے آس پاس کے ان پڑھ لوگوں کے محاورے استعمال کیے گئے ہوں —
( ۹ ) وسط ہند کی ہندی —
( ۱۰ ) بنگالیوں کی ہندی —
( ۱۱ ) انگریزوں کی ہندی —

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ " میں اس موقع پر یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کونسی ہندی قابل ترجیح ہے - لیکن اگر میری رائے دریافت کی جائے تو میں کہوں گا کہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کی زبان میں جو طرز نگارش ملتا ہے وہ یقیناً قابل قبول اور قابل تقلید ہے - اب اگر اس کے متعلق تحقیق کی جائے کہ ہندی کا آغاز کیونکر ہوا تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ زبان پچھم سے آئی - پنجابی، برج بھاشا اور دوسری پچھم کی بولیوں کی آمیزش سے یہ بنی اور آخر میں اس کا سلسلۂ نسب ناگ بھاشا سے مل جاتا ہے * —

* ناگ بھاشا کے معنی ہیں سانپوں کی زبان - برھمن لوگ اپنی مقدس زبان یعنی سنسکرت کے مقابلے میں عوام کی بولیوں کو اس نام سے پکارتے تھے اس لیے کہ بدھ مت اور بعض دوسرے مذہبی فرقوں نے ان عوام کی بولیوں کو ادبی مرتبہ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی ( ژورنال ایسیا تک اگست ستمبر - سنہ ۱۸۷۲ ص ۲۱۷ ) -

علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۸۷۴ ع میں پندرہ اشعار کی ایک مثنوی شائع ہوئی ہے جو نواب رامپور کی فرمائش پر ایک میلے کے متعلق لکھی گئی ہے۔ یہ میلہ ۲۷ مارچ سے شروع ہوتا ہے اور ۳ اپریل تک رہتا ہے - رامپور کے قریب " باغ بے نظیر " میں یہ میلہ لگتا ہے - جوق جوق لوگ وہاں آتے ہیں - رامپور کو مسلمان لوگ مصطفےآباد بھی کہتے ہیں - میلے کا مقام شکار گاہ سے بالکل ملا ہوا ہے اور " درگاہ قدم رسول " بھی وہیں قریب ہے - اس مثنوی میں نواب کی تعریف اور میلے کا حال بیان کیا گیا ہے - ہر سال لوگ میلے کے منتظر رہتے ہیں - بہت سے لوگ درگاہ پر حاضری کے لیے آتے ہیں اور تاجر پیشہ ہندستان کے ہر حصے سے اس موقع پر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے خوب رونق رہتی ہے —

"اخبار انجمن پنجاب" خوب کامیابی کے ساتھ برابر نکل رہا ہے- چونکہ میں اس انجمن کا اعزازی رکن ہوں اس لیے مجھے اس کے سب نمبر پہنچتے رہتے ہیں- اس اخبار کے جاری ہونے کے بعد انجمن کے ماہوار رسالے کی ضرورت باقی نہیں رہی جس میں انجمن کے قواعد اور کارروائیاں شائع ہوا کرتی تھیں- چنانچہ اس رسالہ کو بند کردیا گیا - اس اخبار کے سر عنوان ہما کی تصویر ہوتی ہے جس کے پھیلے ہوے دونوں پروں کے نیچے تاج رکھے ہوے ہیں- عام طور پر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس چڑیا کا سایہ بھی اگر کسی شخص پر پڑجاے تو وہ تخت و تاج کا مالک بن جاتا ہے- چنانچہ ٹیپو سلطان کے تخت کی آرائش میں ہما بنایا گیا تھا- اس اخبار کی ۲۶ اپریل والی اشاعت میں " بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے متعلق ایک دلچسپ مضمون ہے- مسلمان اپنے کام " بسم اللہ ". سے شروع

کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ کتابوں کے شروع میں بھی اس کا لکھنا اچھا ہے۔ اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ سرکاری طور پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کے شروع میں اس کا لکھنا بند کردیا گیا۔ اس اخبار کی ۱۹ جولائی کی اشاعت میں اُن تحقیقات کے متعلق ایک مضمون ہے جو انجیل مقدس کے تخلیق آدم کے نظریہ کے متعلق کی گئی ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ خداوند نے جو چھے دن میں دنیا پیدا کی اس سے مراد تخلیق کے چھے مختلف دور ہیں۔ سب سے آخری دور میں آدم کی تخلیق ہوئی۔ طبقات الارض کے بعض ماہروں کو انسان کی ہڈیاں ان عجیب و غریب جانوروں کی ہڈیوں کے ساتھ ملی ہیں جو قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے۔ یہ ہڈیاں ایسے پتھروں اور ریت کے ڈھیروں میں دستیاب ہوئی ہیں جو تاریخی زمانے سے دس ہزار سال قبل کے ہیں۔ مضمون نگار نے تمام واقعات پیش کیے ہیں اور آخر میں ایران کے فلسفی شاعر حافظ کی طرح وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

اس اخبار کی دوسری اشاعتوں میں پہیلیاں حل کی غرض سے پیش کی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والوں کی ذہانت کی جانچ ہوسکے۔

"علیگڑھ اخبار" مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع میں پنڈت کاشی ناتھ کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سرکاری مدارس میں طلبا کو قومی شاعری کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔ میں اس بات میں پنڈت جی کا ہم خیال ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے

اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-
"ادبیات کی اصناف میں شاعری میں سب سے زیادہ دلپذیری اور اور خوبی پائی جاتی ہے۔ ہر قوم میں ایسے شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام کو قبول عام حاصل ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں شاعری تعلیم کا جزو رہی ہے اور ان شاعروں کے کلام سے طلبا کو واقفیت حاصل کرائی جاتی ہے جنھوں نے زبان کو پاکیزہ بنانے میں حصہ لیا ہے۔ کیا شمالی ہند میں ہمیں ایسے شاعر نہیں ملیں گے جن کا کلام قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ تلسی داس، سورداس، کیشوداس، بہاری لال اور کبیر داس کی حیثیت ہمارے دیس کے لیے وہی ہے جو انگلستان کے لیے ملٹن، شیکسپیئر، ڈرائڈن اور پوپ کی ہے۔ ہندی کے جدید شاعر قدما سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ تشبیہہ و استعارہ اور نازک خیالی میں وہ دوسری قوموں کے شاعروں کا آسانی سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے ہندی شاعر قدیم یونانی شاعروں کی طرح دیوتاؤں اور سورماؤں کے عشق و محبت اور ان کی مہم جوئیوں کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ان شاعروں کا کلام اس قابل نہیں کہ مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ لیکن ہماری رائے میں اگر ان شاعروں کے کلام کی ضخیم جلدوں میں سے انتخاب کیا جائے تو ایسے حصے ضرور دستیاب ہوسکیں گے جو دلچسپ بھی ہوں گے اور مفید بھی اور ان کا اخلاقی اثر طلبا پر اچھا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی شاعری کے جو حصے ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کا اثر اچھا ہوتا ہے تلسی داس اور بہاری لال کے ہاں آپ کو فطرت نگاری، عشق و محبت، خوف، رنج و غم اور خوشی

کے منظر ملیں گے جو اگر کسی انگریزی زبان کے شاعر کے ہاں ہوتے تو قدر کی نظر سے دیکھے جاتے - ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سرکاری مدارس کے نصاب تعلیم میں ہماری شاعری کے ایسے نمونے کیوں شامل نہیں کیے جاتے جن کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہندوستانی طلبا کا حق ہے - یہ سچ ہے کہ جن مدارس کے نصاب میں ہم یہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان میں ریاضی وغیرہ پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ کسی نئے مضمون کی مشکل ہی سے گنجائش نکالی جاسکتی ہے - ہماری یہ خواہش ہے کہ اقلیدس اور جبر و مقابلہ کے بجائے فطرت کی نیرنگیاں' زمین کے طبعی تغیرات اور دنیا کی مختلف اقوام کے رسم و رواج اور ان کے حالات بچوں کو پڑھائے جائیں - شاعری میں صرف ہندی شعرا کے کلام کے نمونے نصاب میں نہ رکھے جائیں بلکہ ساتھ ساتھ اردو شعرا کے کلام کا انتخاب بھی ہونا چاہیے - اردو شاعروں میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے غیر اخلاقی موضوعوں پر لکھا ہے لیکن ایسے بھی بہت سے شاعر ملیں گے جن کے کلام میں یہ عیب نہیں نظر آتا - ان کے کلام میں نازک خیالی اور شاعرانہ ذوق جمال کے بہترین نمونے ملیں گے - ذراسی محنت سے ان شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو اخلاقی اور ادبی اعتبار سے نصاب میں داخل کرنے کے قابل ہو" —

ہندوستانی شاعری کی حمایت میں صرف کاشی ناتھ نے ہی آواز نہیں بلند کی ہے - علی گڑھ اخبار کی ۲۹ مارچ کی اشاعت میں ایک نامہ نگار کا خط چھپا ہے جس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ صوبجات شمال مغربی کے مدارس میں مشرقی شاعری کے حصے نصاب میں داخل نہیں کیے گئے ہیں - نامہ نگار کے خط کے سلسلے میں اخبار کے مدیر نے لکھا ہے کہ " شاعری ایک

صنعت ہے جس کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کا ذوق پیدا کرنا چاہیے ۔ لیکن دشواری یہ آن پڑتی ہے کہ ہندوستانی زبان کی شاعری میں سوائے دورازکار باتوں یا ایسی تشبیہوں اور استعاروں کے کچھ نہیں ہوتا جو اخلاقی سطح سے گرے ہوئے ہوتے ہیں ۔اس وجہ سے محکمۂ تعلیمات نے ہندوستانی شاعری کے نمونے اپنی نصاب کی کتابوں میں نہیں داخل کیے ۔ لیکن کاشی ناتھ کی طرح نامہ نگار کا یہ خیال بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستانی شاعری میں ایسے نمونے مل سکتے ہیں جن میں بیہودہ یا ناپاک خیالات ظاہر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ وہ اخلاق کو بہتر کرنے والے ثابت ہوں گے ۔ اگر کسی یورپین زبان میں ان کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ کیا جائے تو یقین ہے کہ اہل یورپ ہندوستانی شاعری کی قدر افزائی کریں گے * ۔ جب مشرقی شاعری میں ایسے نمونے موجود ہیں جن میں اعلی درجہ کے نفیس خیالات ادا کیے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں نصاب میں نہ داخل کیا جائے اور ہندوستانی طلبہ کو ان سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے ۔ ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ جس طرح نگینہ جڑا جاتا ہے اسی طرح شعر انسانی روح میں نقش ہو جاتا ہے ۔ لوگ اشعار یاد رکھ سکتے ہیں لیکن نثر نہیں یاد رکھ سکتے ۔ شعر اپنے وزن اور دلکشی کے باعث حافظے میں محفوظ رہ جاتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو اس سے دل کو حظ حاصل ہوتا ہے ۔ ان حالات کے مد نظر ہم نامہ نگار کے خیال سے متفق ہیں کہ اگر تعلیم سے شعر

* میرے دوست گراں جیرے دے لا گرانج نے سنہ ۱۸۲۲ ع میں " ژورنال ایسیاتک " ( Journal Asiatique ) میں ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا جس میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے گئے تھے ۔ مضمون کا عنوان تھا " مشرقی شاعری کی حمایت میں " ۔

کو بالکل خارج کر دیا گیا تو اس کا برا اثر بچوں کی ترقی پذیر ذہنی صلاحیتوں پر پڑے گا - چونکہ شعر کے مفید ہونے میں کلام نہیں اس لیے اس کا نصاب میں داخل کرنا ضروری ہے - پھر اس میں بھی شبہ نہیں کہ مشرقی شعراء کے یہاں ہمیں اعلیٰ پایہ کے اور حسین خیالات ملتے ہیں - مشرقی شاعری میں روحانی اور دنیاوی دونوں قسم کے خیالات موجود ہیں - واقعہ یہ ہے کہ مشرقی انشا پردازوں کی نثر میں زبان کا وہ لطف اور فصاحت ہمیں نہیں ملتی جو شعرا کے یہاں ملتی ہے - نثر سے زیادہ نظم میں تصوف کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اور نظم ہی کے ذریعہ ہمیں رسم و رواج کے متعلق بھی زیادہ واقفیت حاصل ہوسکتی ہے - چنانچہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مشرقی شاعری میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا جاننا ضروری ہو - مشرقی شاعری کے نمونے نصاب میں رکھنے سے طلباء کے تخیل میں بلندی پیدا ہوگی اور وہ اپنے شعرا کے کلام کی باریکیاں سمجھہ سکیں گے - ہم نامہ نگار سے متفق ہیں کہ ہندوستانی بچوں کو اپنے شاعروں کے کلام سے محروم رکھنا قابل افسوس امر ہے " —

میں اوپر " منشور محمدی " کے متعلق ذکر کر چکا ہوں - اپنی شاعری کی وقعت بڑھانے کے لیے اس اخبار کے سر عنوان پر دو اشعار درج ہیں جن سے اس کی حکمت عملی واضح ہوتی ہے * —

" اخبار انجمن پنجاب " کی ۲۲ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس میں انگریزوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ اہل ہند کو " نیم متمدن " کہتے ہیں - یقیناً اُس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ قابل ملامت ہیں - اہل ہند کی اپنی تہذیب ہے جو ہماری

* یہاں ان دونوں شعروں کا فرانسیسی ترجمہ ہے -

تہذیب سے مختلف ہے لیکن وہ زیادہ قدیم ہے - اسی طرح مسلمانوں کی بھی اپنی تہذیب ہے - درحقیقت خود ہماری تہذیب کے بعض اجزا مسلمانوں کی تہذیب کے رھین منت ھیں - مسلمانوں کی تہذیب کا اثر ہماری تہذیب پر صلیبی جنگوں کے زمانہ میں پڑنا شروع ہوا - مسلمانوں کی بدولت ھمیں متعدد یونانی تصانیف کا حال معلوم ہوا جن کے متعلق ہم بالکل ناواقف تھے —

لیکن مضمون نگار نے ان باتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا - وہ لفظ " تہذیب " کا وھی مفہوم لیتا ہے جو یورپین لوگوں کا نقطۂ نظر ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اہل ہند ممکن ہے انیسویں صدی کے شروع میں " نیم متمدن " کہلانے کے مستحق ہوں لیکن اب جب یورپ کے علوم و فنون کا اس ملک میں رواج ہو رہا ہے یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ بہت جلد ان کی تہذیب یورپ کی تہذیب کی سطح پر پہنچ جائے گی - وہ کہتا ہے کہ " بلاشبہ ایشیا میں بعض ملک ھیں جنھیں نیم متمدن کہا جا سکتا ہے - مثلاً ایران ' افغانستان ' ترکستان اور چین وغیرہ - لیکن ہندوستان کو اس زمرہ میں داخل کرنا درست نہیں ہے - بعض قومیں ھیں جن میں بربریت موجود ہے ' جیسے تاتاری ' حبشی اور امریکہ کے بعض ملکوں کے قدیم باشندے - لیکن ہندوستان کے لوگوں کو ان کی طرح سمجھنا انصاف سے بعید ہے " —

" دیسی ریاستوں کے امرا بھی مغربی تعلیم و تہذیب اپنے اپنے علاقوں میں پھیلانے میں کوشاں ھیں - پٹیالہ ' جے پور ' بھرت پور ' کپور تھلہ ' بلرام پور اور وزیا نگرم کی ریاستوں میں نہایت عمدہ طریق حکومت رائج ہے - حیدرآباد (دکن) میں سر سالار جنگ

کی شخصیت اور قابلیت کو خود انگریزی حکومت نے تسلیم کرلیا ہے - کشمیر میں جو الاسہائے کی انتظامی قابلیت تعریف و تحسین کی مستحق ہے - نواب مردان علی کی خوبیوں کا حاکم ماننا دشوار ہے ! مہاراجہ پٹیالہ اور نواب علاءالدین احمد خاں کی خوش انتظامی کی دور دور شہرت ہے - دیسی ریاستوں میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے - اس وقت ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے میں ممتاز شخصیتیں موجود ہیں - اہل ہند میں آپ کو قابل انشا پرداز ' لایق فوجی افسر اور نظم و نسق کے ماہر مابیں گے - ہندوستانی کاریگروں اور صناعوں کی بنی ہوئی اشیاء خود اہل یورپ کو اچنبے میں ڈالدیتی ہیں - پیرس اور لندن کی نمائشوں میں ان کاریگروں کی صنعت گری کی داد دی گئی ہے اور بڑے بڑے اخباروں نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی نقل ناممکن ہے - کیا کوئی یورپ کا ایسا فن ہے جس میں ہندی صناع امتیاز نہ حاصل کرسکے - جب اہل ہند میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں تو انہیں " نیم متمدن " کہنا کہاں تک حق بجانب ہوگا - لیکن ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی اہل ہند میں کوتاہیاں باقی ہیں - اہل ہند میں اپنے وطن کی ویسی محبت اب تک نہیں پیدا ہوئی جو یورپ کی قوموں کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کی بدولت انہوں نے اس قدر ترقی حاصل کی ہے " —

" ہمیں صرف اپنے ملک کی کاریگری اور صنعت کاری تک

اپنی نظر کو محدود نہیں کرنا چاہیے - ہمیں اس کی ضرورت
ہے کہ دوسرے ملکوں کی صنعتوں کو سیکھیں اور ان میں کمال
پیدا کریں - ہمیں اہل یورپ کی طرح اپنی تجارت کو دنیا
کے ہر گوشے میں پھیلانا ہے - باہر کے ملکوں سے ہمارا تجارتی
تعلق بہت کمزور ہے جب یہ بات جاتی رہے گی اس وقت
ہندوستان انگلستان کی طرح متمول اور دولت مند ملک ہوسکے گا -
ہمیں اپنی زراعت کو ترقی دینا ہے اس لیے کہ اس پر مملکت
کی خوشحالی کا تمام تر دار و مدار ہے - اس وقت ہمارے
ملک میں سیکڑوں میل زمین بے کاشت اور بنجر پڑی ہوئی ہے
اگر یہ سب زمین زیر کاشت آجائے تو اس سے بے اندازہ نفع
حاصل ہوگا - ہمارے ملک کی ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ
ہم لوگ، نظم و نسق اور امن و آمان قایم کرنے کی طرف زیادہ
توجہ نہیں کرتے - لیکن خود اہل ہند کا اس میں کوئی قصور
نہیں اس واسطے کہ انگریزی حکومت نظم و نسق کے تمام
فرائض انجام دیتی ہے - ہندوستانیوں کو معمولی عہدوں پر
مامور کیا جاتا ہے یا انہیں اعزازی ججی کی خدمت دی جاتی
ہے - ان عہدوں پر ہندوستانی لوگوں نے اپنے فرائض اس خوبی
سے ادا کیے ہیں کہ اس سے صاف ثابت ہوگیا ہے کہ وہ اس
کے مستحق ہیں کہ انہیں ملک کی حکومت میں براہ راست
شریک کیا جائے - ان حالات میں جب کہ یہ بات ثابت
ہوچکی ہے کہ اہل ہند نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی
ترقی کی ہے اور آئندہ ان کی ترقی کی رفتار اور تیز ہوتی

جائیگی تو انھیں " نیم متمدن " کہنا کہاں تک درست ہے ؟ -
اس سے ان کی سخت دل آزاری ہوتی ہے " * —

میرٹھہ کے " اخبار عالم " مورخہ ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۱۲ع میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ہندوستان کی ادبی انجمنوں کا یورپ اور خاص کر انگلستان کی ادبی انجمنوں کے ساتھہ مقابلہ کیا گیا ہے - مضمون نگار نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ بجائے اس کے کہ انگریزی حکومت کے زیر اہتمام ہندوستان کے مختلف شہروں میں انجمنیں قایم ہوں جن کے مقاصد غیر متعین ہوں ' یہ بہتر ہوگا کہ ان انجمنوں کے سامنے مخصوص موضوعوں کی تحقیق ہونی چاہیے جیسا کہ انگلستان میں ہے - اس طرح یہ ہوگا کہ علوم انسانی کے مختلف شعبوں میں ہماری واقفیت بڑھے گی اور ہم متعین نتائج حاصل کرسکیں گے - مثلاً ضرورت ہے کہ جغرافیہ ' آثار قدیمہ اور لسانیات پر تحقیق کرنے کے لیے علحدہ علحدہ انجمنیں قایم ہوں - لیکن ہماری رائے میں مضمون نگار ذرا جلد بازی سے کام لینا چاہتا ہے - ہندوستان کی نشأۃ ثانیہ کی ابھی ابتدا ہوئی ہے - جس قسم کی انجمنوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا قایم کرنا یقیناً ضروری ہے لیکن وہ اسی وقت قایم ہوں گی جب ان کی ضرورت کا پورے طور پر احساس ہوجا ئیگا - اب بھی ہندوستان میں متعدد انجمنیں ایسی ہیں جو مخصوص موضوعوں پر تحقیقات کررہی ہیں - ابھی حال میں بمبئی میں ایک " زرعی انجمن " قایم کی گئی ہے —

" اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ " اور دوسرے اخباروں کے مقابلے

---

* اس مسئلہ کے متعلق اسی اخبار کی ۵ جولائی کی اشاعت میں پھر بحث کی گئی ہے -

میں کسی طرح کم دلچسپ نہیں ہے - اس کی یکم نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع کی اشاعت میں دیوان حافظ کی ساتویں غزل کا نظم میں ترجمہ شائع ہوا ہے - جو بات اس ضمن میں قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ ایک هندو کا کیا ہوا ہے جس کا نام تارا چند اور تخلص اختر ہے —

اهل هند کو انگریزی مدارس میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم بطور لازمی مضمون کے دی جاتی ہے - اس تعلیم کی بدولت نیا هندستانی ادب پیدا ہو رہا ہے جسے ہم هندی یورپین ادب کہہ سکتے هیں - هندستانی زبان کے اخبار اسی ادب کا نمونہ هیں - ایسے مدارس جو کلیتاً اهل هند کے هاتھ میں هیں بالعموم اسلامی مدارس هیں - هندو لوگ قدیم اسلامی حکومت کے مقابلے میں انگریزی راج کو ترجیح دیتے هیں - اور پارسیوں کا بھی یہی حال ہے - جب سے سرکاری درسگاهوں کی تنظیم عمل میں آئی ہے اس وقت سے انھوں نے اپنا علحدہ تعلیمی انتظام کرنے کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں کی - مسلمانوں کی طرح یورپین مدارس میں تعلیم پانے کو وہ برا نہیں سمجھتے - لیکن مسلمانوں کا اس معاملے میں نقطۂ نظر دوسرا ہے - میں پہلے بھی ان کی علحدہ درسگاهوں کی نسبت ذکر کرچکا ہوں - ان میں سے ایک دهلی کا مدرسہ محمدی ہے - یہ مدرسہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے زمانے میں بند ہوگیا تھا - بارہ برس تک بند رهنے کے بعد پھر وہ کھل گیا ہے اور اس میں کام جاری ہے - اس مدرسے میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام ہے - یہ مدرسہ گلی قاسم خاں میں لال کنوئیں کے قریب واقع ہے - جو فاضل لوگ یہاں تعلیم دیتے هیں ان میں ضیاءالدین خاں خاص طور پر قابل ذکر هیں - موصوف متعدد کتابوں کے مصنف هیں اور عربی علوم کا درس

دیتے ہیں * —

شاہ آباد (بہار) میں "مدرسۂ اسلام" میں بھی اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - ہندستانی ادب کی قدیم کتابوں کی بھی یہاں تعلیم دی جاتی ہے —

ہندو لوگ مسلمانوں کے ان علحدہ مدرسوں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ وہ انہیں پسند کرتے ہیں اور ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں - چنانچہ راولپنڈی کے ضلع میں جو متعدد اسلامی مدارس قایم کیے گئے ہیں ان کی ہندوؤں نے مالی امداد کی ہے - یہ مدرسے خوشحال ہیں - ان میں عربی اور سنسکرت کے علاوہ اردو اور انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے † - ہندستان کے ہر گوشے میں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں اور ان میں مذہبی جوش دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے - ہندستان کے ہر حصے میں سندھ تک ہر جگہ آپ کو یہی حال نظر آئے گا - بمبئی کے ناظم تعلیمات نے چار سو روپے کا ایک انعام مقرر کیا ہے جو اس شخص کو دیا جائے گا جو ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق بہترین مضمون لکھے گا - اس مضمون میں ان کی تعداد؛ ان کی تاریخ اور ان کی عام عمرانی زندگی پر تحقیق کے ساتھ تبصرہ ہونا چاہیے - یہ مضمون چاہے ہندستانی میں ہو چاہے سندھی زبان میں ‡ -

وادیٔ کشمیر کی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے - ان میں زیادہ تر تو اہل سنت والجماعت ہیں اور تھوڑے سے شیعہ بھی ہیں - شیعوں

---

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع -

† علی گڑھ اخبار مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع -

‡ Allen's Indian Mail مورخہ ۲۱ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع -

نے سنہ ۱۸۷۲ ع میں سری نگر میں ایک زمین کا ٹکڑا خریدا ہے تاکہ وہاں اپنی مسجد تعمیر کریں - اس جگہ کے قریب سنیوں کی مسجد ہے چنانچہ انہوں نے شیعوں کی مسجد کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کیں - بالآخر جھگڑے تک نوبت آئی اور کئی شیعوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور ان کے مکانات جلا دئے گئے * - یہ طریقہ جو سنیوں نے اختیار کیا قابل ملامت ہے - اس طرح وہ اپنے مخالفوں کو اپنا ہم خیال کبھی نہیں بنا سکتے —

ترکی میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام رو بہ زوال ہے - لیکن چند سال سے اس میں نئی زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں - البانیہ کے مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا ہو رہی ہے - یہ سب کچھ وزیر اعظم محمود پاشا کی توجہ کا طفیل ہے - اُدھر خدیو مصر نے حبشہ میں یورش کی ہے - اس کی وجہ سے بھی اسلام کی توسیع عمل میں آے گی - اسلام پہلے سے افریقہ کے مختلف ممالک میں حاوی ہوتا جاتا ہے - یہ سن کر تعجب ہوگا کہ سیرلیون ( Sierre Leone ) میں ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جس میں ایک ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں اور ان تعلیم پانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں † —

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو عام بیداری پیدا ہوئی ہے اس کی ذمہ داری ایک حد تک وہابی تحریک پر عاید ہوتی ہے - اگرچہ وہابی تحریک سیاسی اعتبار سے ختم ہو چکی ہے لیکن تمام مسلمانوں

---

* علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع -

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۵ نومبر ۱۸۷۲ ع - ( یہ برطانوی نو آبادی افریقہ کے مغربی ساحل پر لائبیریا کے قریب واقع ہے - مترجم ) -

میں اس نے مذہبی جوش پیدا کردیا ہے - وہابیوں کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے عقاید میں متشدد ہوتے ہیں - انہوں نے جب مکہ فتح کیا تو سنگ اسود کو توڑ ڈالا اس لیے کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ تھا - مدینہ میں انہوں نے مسلمان اولیا کے مقبروں کو منہدم کردیا اسواسطے کہ توہم پرست مسلمان ان کا احترام کرتے تھے - تمام مسلمان اور خاص طور پر وہابی لوگ مورتوں کو حرام سمجھتے ہیں اور انہیں مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں —

مسلمانوں کی عام بیداری جس کے پیدا کرنے میں ایشیا کی تمام اقوام مدد دے رہی ہیں، تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے - میرے فاضل دوست اے اسپرنگر کا خیال ہے کہ " نصف صدی کے اندر اہل ایشیا مغربی تہذیب و تمدن پر اپنا اثر ڈالنے لگیں گے اور ذہن انسانی کی ترقی کو اعلیٰ بلندیوں تک پہنچادیں گے - وہ ایسی کتب تصنیف کریں گے جن سے نہ صرف انہیں بلکہ اہل یورپ کو بھی فائدہ پہنچے گا - اہل مشرق ذہانت میں یورپین لوگوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض لحاظ سے ان سے زیادہ تیز فہم ہیں - وہ مستقبل قریب میں انسانیت کی ترقی کے ضامن بن جائیں گے - دوسری صدی عیسوی میں اور اس کے بعد بھی علوم و فنون کے بڑے بڑے محقق شام اور شمالی افریقہ کے لوگ تھے - کیا یہ بات ناممکن ہے کہ ان علاقوں میں پھر بڑے بڑے فاضل پیدا ہوں اور دنیا کو اپنے علم سے مستفید کریں" —

میں نے اپنی کتاب " ہندوستانی زبان اور ادب کی تاریخ " ( ص ۱۰ ) پر یہ ذکر کیا تھا کہ شمالی چین میں نئی اسلامی سلطنتیں قایم ہورہی ہیں - اس کے متعلق اس وقت میں کچھہ قطعی معلومات آپ کے سامنے

پیش کرسکوں گا۔ یونان کے صوبے میں جو چین کے جنوب مغرب میں واقع ہے، مسلمانوں نے ایک نئی مملکت قایم کرلی ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ لوگ پانتھے کہلاتے ہیں۔ ان کے سرگروہ نے ابھی حال میں اپنی سفارت لندن بھیجی ہے۔ یونان کے علاقے میں مسلمانوں کی اتنی زبردست تعداد کے متعدد وجوہ ہیں۔ ایک افسانوی روایت یہ مشہور ہے کہ حضرت نبی کریم کے چچا حضرت امیر حمزہ نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور یہاں عربوں کی ایک نوآبادی بسائی تھی۔ اس قسم کے دوسرے مہم جوئی کے افسانے حضرت امیر حمزہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ لیکن غالباً اس علاقے میں بہت قدیم سے مسلمانوں کی چھوٹی سی آبادی موجود رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تبلیغ و اشاعت دین کے ذریعہ اور لاوارث بچوں کو مسلمان بنا کر تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ بہرحال ہمیں یہ پورے طور پر معلوم ہے کہ چینی حکومت نے اس علاقے کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ لیکن کچھ عرصے سے چینی حکومت نے مسلمانوں کی مخالفت شروع کردی تھی اور ان کے مٹانے کے درپے ہوگئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ مسلمان مزدوروں نے چینی حکومت کی حکم عدولی کرنے کا فیصلہ کرلیا جس پر شہنشاہ چین کل مسلمانوں کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ اس علاقے کے تمام مسلمانوں نے چینی حکومت کے خلاف اپنا متحدہ محاذ قایم کرلیا اور چینی حکام کو قتل کرڈالا جو ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگے تھے۔ بتدریج مسلمانوں میں تنظیم پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے امرا میں سے ایک کو جس کا نام سلیمان ہے اپنا سلطان منتخب کرلیا۔ سلیمان اس وقت مسلمانوں کی سربراہی کررہا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس

نے یونان کے صوبے کے بیشتر حصے پر قبضہ کرلیا - اب سولہ سال سے یونان میں اسلامی شریعت کے مطابق خود مختار حکومت قایم ہے - اس نئی مملکت کا نام تے لی فو ( Talifu ) ہے - یہ مملکت رقبے میں برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے - اس مملکت کے آس پاس کے صوبوں میں بھی چینی حکومت کے خلاف بغاوتیں ہو رہی ہیں اور وہاں کے مسلمان آپس میں اتحاد پیدا کر رہے ہیں —

شہزادہ حسن سلطان سلیمان کے فرزند ہیں - وہ اس سفارت کے صدر ہیں جو انگلستان بھیجی گئی ہے اور جس کی نسبت میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے - شہزادہ حسن نے انگلستان روانہ ہونے سے قبل اپنے والد کی حکومت کو مستحکم کرنے کی تمام ممکن تدابیر اختیار کیں اور شمالی اور مغربی چین کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی - انہوں نے شمال اور مغربی چین کے مختلف علاقوں میں سفر کیا اور اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کی - وہ پوشیدہ طور پر شہر پیکنگ میں کچھ عرصے تک مقیم رہے تاکہ وہاں ایک جماعت قایم کریں جو ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتی ہو - اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی بیس ہزار سے زائد ہے اور وہاں متعدد مساجد بھی ہیں - ممکن ہے شہزادہ حسن کے پیش نظر انگلستان آنے سے یہ مقصد ہو کہ وہ انگریزی حکومت کو اس بات پر رضامند کریں کہ اگر چین کے مسلمان موجودہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کریں تو ان کی مدد کی جائے - چین میں مسلمانوں کی مذہبی تبلیغ و اشاعت اس کامیابی کے ساتھ ہو رہی ہے کہ ممکن ہے کہ وہاں وہ قوت حاصل کرلیں —

چلنگ هان فو' چین سی کے صوبے کا صدر مقام ہے - یہاں مسلمانوں

کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے - کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ان سب کو چینی حکومت نے قید کر رکھا تھا اور ان کو شہر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی - اگر کوئی شخص ان میں سے شہر کی چار دیواری کے باہر قدم رکھتا تو وہ قتل کر دیا جاتا - چین کے اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی مسلمانوں کی کافی تعداد موجود ہے - حکومت وقت کو ان سے بڑا خطرہ ہے اس واسطے کہ ان میں پھر اسی قسم کا مذہبی جوش پیدا ہو رہا ہے جس نے انہیں دنیا کے بڑے حصے کو فتح کرنے پر اکسایا تھا - ان لوگوں میں عام طور پر ایک پیشین گوئی کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں یہ حکم لگایا گیا ہے کہ چین کی موجودہ سلطنت کا تختہ الٹنے والا ہے اور اس کی جگہ مسلمانوں کی حکومت قایم ہوگی * —

گُلجا' اس نام کے صوبے کا صدر مقام ہے - گزشتہ سال روسی سپاہ نے اس شہر پر قبضہ کر لیا تھا - اس شہر کی سات ہزار سات سو آبادی ہے جس میں چار ہزار نو سو مسلمان ہیں - چینیوں کے یہاں صرف دو مندر ہیں اور مسلمانوں کی ۳۶ مسجدیں ہیں - چھہ مدرسے ہیں ' پانچ مسلمانوں کے اور ایک چینیوں کا - اس علاقے کے دوسرے شہروں کے اگر اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی آبادی چینیوں کے مقابلے میں بعض مقامات پر زیادہ ہے —

چینی مسلمانوں کے زیر اہتمام مطابع چل رہے ہیں جن میں عربی کتابیں چھاپی جاتی ہیں - متن کے ساتھ چینی ترجمہ بھی درج کیا جاتا ہے - ہمارے مدرسۂ السنۂ مشرقی میں ان مطابع کی بعض چھپی

* پال مال گزٹ - مورخہ ۲۹ جون سنہ ۱۸۷۲ع —

ہوئی کتابیں موجود ہیں —

سید احمد خاں کے فرزند ارجمند سید محمود نے لندن اور کیمبرج میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرلی ہے اور وہ بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس گئے ہیں - جب وہ واپسی پر پیرس میں ٹھہرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملنے کے متعدد مرتبہ موقعے ملے اور ان سے بہت دلچسپ گفتگوئیں رہیں - اس نوجوان فاضل شخص کی دلی تمنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی درسگاہ قایم کی جائے جو کیمبرج کے نمونے کی ہو - موصوف کی اس خواہش کا چرچا اس وقت ہندوستان میں ہو رہا ہے - چنانچہ "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک نامہ نگار نے اس کے متعلق لکھا ہے* :—

"ہمارا مستقبل یقیناً تاریک ہے اگر ہم ترقی کے راستے میں پیچھے رہ گئے یا اگر ہم نے صرف اس پر اکتفا کیا کہ اپنے شاندار ماضی کی مدح سرائی کرتے رہیں - اس وقت جو تجویز زیر غور ہے اس سے ہماری معاشری حیثیت سدھر جائے گی اور ہمارے نوجوانوں کو اعلی عہدے حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہو جائیں گے - ہمیں چاہیے کہ اس تجویز کے مطابق حکومت سے آزاد ایک اپنی درسگاہ قایم کریں - چونکہ اودھ کے متمول مسلمانوں کے زیر غور بھی اسی قسم کی تجویز ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان دونوں تجویزوں کو ملا دیا جائے - اس درسگاہ میں علوم دین ' اسلامی فقہ قدیم السنہ اور مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے ( مترجم ) -

اور اس کے پہلو بہ پہلو مغربی علوم و فنون کی تعلیم دی جائے گی۔ اس وقت یہ ضروری نہیں کہ پروفیسروں کی بڑی تعداد موجود ہو۔ ہم چھوٹے پیمانے پر اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے منبع کو دیکھو تو چھوٹے چھوٹے چشمے نظر آئیں گے۔ خود آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات ابتدا میں چھوٹے چھوٹے مدرسے تھے۔ اس قسم کی درسگاہ کے لیے لکھنؤ کا شہر نہایت موزوں ہے اس لیے کہ یہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے اور اس کے نواح میں متمول مسلمان آباد ہیں۔ اودھ کا صدر مقام علم و فن کے لحاظ سے دھلی کا مقابلہ کر سکتا ہے "* —

"علیگڑھ اخبار" کے نامہ نگار کی تجویز پر نہایت سنجیدگی سے عمل شروع ہو گیا ہے اور علیگڑھ میں ایک مجلس اس غرض سے قایم کی گئی ہے تاکہ درسگاہ قایم کرنے کے لیے چندہ فراہم کرے۔ اس درسگاہ کا نام "مدرسۃ العلوم مسلمانان" تجویز کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے قدیم علمی مرکز دھلی، آگرہ اور لکھنؤ تھے۔ لیکن ان سبھوں کے مقابلے میں علیگڑھ کو ترجیح دی گئی ہے† ۔ اس مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے گی۔ اس درسگاہ میں مسلمانوں کے لیے دینی اور دنیاوی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ مجلس تعلیمی جو مقرر ہوئی ہے اس نے اپنا تعلیمی پروگرام شائع کیا ہے۔ مولوی سید احمد خاں بہادر اس مجلس

---

* یہ بات قابل لحاظ ہے کہ دھلی کے بعد لکھنؤ وہ شہر ہے جس نے ہندوستانی زبان کے سب سے زیادہ تعداد میں شاعر پیدا کیے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب " ہندوستانی زبان اور ادب کی تاریخ " میں ساڑھے تین ہزار شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ٦ سو کا تعلق دھلی سے ہے اور ۳۲۰ لکھنؤ کے ہیں —

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۵ و ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع —

کے معتقد ہیں- ممدوح نے اس سارے منصوبے کو علمی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا ہے- میرا خیال ہے کہ ذریعہ تعلیم ہندوستانی رکھا جائے گا * - سید احمد خاں نے اپنے پروگرام کی تفصیلات شائع کی ہیں- وہ رقم کی فراہمی کے لیے نہایت موثر ثابت ہوں گی - جب ضروری رقم فراہم ہو جائے گی تو فوراً تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا اور کالج کا افتتاح کر دیا جائے گا- سرکاری طور پر گورنر جنرل اور گورنر صوبجات شمال مغربی نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس منصوبے کی تکمیل میں ہر طرح تعاون عمل کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے- نئے وائسرائے لارڈ نارتھ بروک نے چھ ہزار کا وعدہ کیا ہے- دوسرے لوگ بھی چندے دے رہے ہیں - گزشتہ اگست کے مہینے میں ۳۰ ہزار ایک سو چھبیس روپے جمع ہو چکے تھے —

بنارس کی " انجمن ترقی تعلیم مسلمانان " کی اپیل پر کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے کیوں نہیں جاتے' ملک کے مختلف گوشوں سے ۲۵ مضامین بھیجے گئے ہیں- † ان میں صرف تین مضمون ایسے ہیں جو اشاعت اور معاوضہ کے قابل تصور کیے گئے- باقی مضمون بھی اچھے خاصے ہیں- چنانچہ انجمن کے رکن مولوی احمد شفیع نے' جو وزیرآباد کے رہنے والے ہیں یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان مضامین سے استفادہ کرنے کے لیے اُنہیں محفوظ رکھا جائے اور آئندہ یا توحکومت سے درخواست کی جائے کہ ان کی اشاعت کا انتظام کرے یا انہیں طبع کرانے کے لیے سرمایہ چندہ سے جمع کیا جائے - "علی گڑھ اخبار" کے مدیر کی یہ رائے ہے کہ ان مختلف رسالوں کا

---

* مجھے دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس ضمن میں لاطینی زبان کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے-
† علی گڑھ اخبار - مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ء -

خلاصہ تیار کیا تاکہ جو اہم باتیں ان میں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں آجائیں - اس طرح اس خلاصے کی ایک چھوٹی سی جلد تیار ہو جائےگی۔ اہل ہند اس قسم کے خلاصوں کو بہت پسند کرتے ہیں - چنانچہ ان کے یہاں مثل مشہور ہے کہ "دریا کوزہ میں" - ہم بھی "علی گڑھ اخبار" کے مدیر سے اس باب میں ہم خیال ہیں - اس طرح اہل ہند کو اور ان یورپین لوگوں کو جو ہندوستان کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں ان سب دلائل کا علم ہوسکے گا جو ان رسالوں میں بیان کیے گئے ہیں * -

یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ حکومت ہند حتی الامکان ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش اور ہمت افزائی کر رہی ہے - یہ واقعہ ہے کہ سوائے پنجاب اور صوبجات شمال مغربی کے اور دوسرے حصوں کے مسلمان نہ صرف مغربی علوم میں پیچھے ہیں بلکہ عربی فارسی علوم کی طرف بھی زیادہ راغب نظر نہیں آتے —

ہم نے یہ رائے ان اعداد و شمار کی بنا پر قایم کی ہے جو حکومت کہ شعبۂ نظارت تعلیمات نے مختلف مدارس کا معائنہ اور اس مسئلے کے متعلق تحقیق کر کے قایم کی ہے - اس حالت کے وجوہ معلوم کرنا مفید ہے تاکہ اس میں تبدیلی کی تدابیر اختیار کی جاسکیں - ہم نے ابھی جن مضامین کا ذکر کیا ہے ان میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہوگی -

"اخبار انجمن پنجاب" کے مدیر کی رائے میں اس جگہ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں :- "ہندوستان کے مسلمانوں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں بنیادی فرق ہے جس کو تسلیم کرنا ضروری ہے اور جسے سرسری نظر میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے - ہندوستان کے باہر دوسرے

* انڈین میل - مورخہ ۲۸ اگست سنہ ۱۸۷۲ م -

ملکوں میں مسلمانوں کا اپنے مذہب سے حقیقی تعلق ہے - ہندوستانی مسلمان بھی مذہب کو عزیز رکھتے ہیں لیکن مذہبی احکام سے زیادہ ان پر رسم و رواج کا اثر ہے - یہی فرق ہے جو انہیں باہر کے مسلمانوں سے علحدہ کرتا ہے - اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں - اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ انگریزوں کا اہل کتاب میں شمار ہوتا ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ رسم و رواج کا معاملہ ہے - جو ان کے بزرگوں کے وقت سے غلط خیالات چلے آرہے ہیں انہیں پر وہ کاربند ہیں - لیکن تعزیہ داری کی رسم کو کیا کہا جاے گا جو صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہے - باہر کے مسلمان اس سے ناواقف ہیں - قبر پرستی کی مثال بھی اسی قسم کی ہے - یہ تمام رسوم شریعت اسلامی کے منافی ہیں - ہندوستانی مسلمان اپنی ان رسوم کو بہت اہمیت دیتے ہیں - ان کے بہت سے رواج ان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے پیدا ہوے - انہوں نے ہندوؤں کی بہت سی رسوم اختیار کرلی ہیں - وہ بھی ان کی خاطر شادی بیاہ کے موقع پر بے اندازہ خرچ کرتے ہیں - ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت جو رسوم پائی جاتی ہیں وہ سب دین اسلام کے خلاف ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ رسوم شریعت کے مطابق نہیں ہیں اگرچہ ان پر صدیوں سے عمل ہورہا ہے - ان پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ختنہ کرائیں اور اپنی شریعت کی تعلیم سے اپنے بچوں کو آگاہ کریں - یہی وجہ ہے کہ اپنے بچوں کو انگریزی یا اور کوئی زبان شروع کرانے سے پہلے وہ قران اور فارسی کی بعض کتابیں پڑھاتے ہیں جن کا پڑھنا مذہبی

تعلیم کا جزو تصور کیا جاتا ہے - بچوں کی عمر کا ابتدائی حصہ اس طرح گزرتا ہے - اب جب کہ سرکاری مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو بہ نسبت ہندو طلباء کے جنہیں مذہبی تعلیم میں وقت نہیں صرف کرنا پڑتا ان کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے - اس وجہ سے مسلمان بچے دوسرے مذاہب کے بچوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں - مسلمان بادشاہوں کے زمانے سے عربی اور فارسی علوم کو جو اہمیت حاصل تھی وہ بعد میں باقی نہیں رہی - اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان علوم کو حاصل کرنے کی جانب بہ نسبت اس زمانے کے زیادہ مائل تھے - بہت سے فاضل لوگ ایسے موجود تھے جو اپنے علم کی بدولت فضیلت حاصل کرتے تھے - اس زمانے کے مسلمان اپنی تعلیم سے روحانی اور دنیاوی عقل کی تربیت حاصل کرتے تھے - اگرچہ تعلیم سے دنیاوی فوائد کم حاصل ہوتے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو اس کا اندازہ تھا کہ دنیاوی مفاد کی خاطر کس قدر تعلیم درکار ہے - اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان کس طرح تعلیم میں امتیاز حاصل کرسکتے ہیں - بعض مذہبی رسوم کی وجہ سے جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا، مسلمان بچے جب سرکاری مدرسہ میں پہنچتے ہیں تو ان کی عمر بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ ہوجاتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم میں دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں - یہ سچ ہے کہ ہندو بچوں کو اس قسم کی کوئی خاص دشواری نہیں پیش آتی - وہ بالکل کم عمری میں مدرسے میں داخل ہوجاتے ہیں - مسلمان بچے عمر بڑھنے پر مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں اور جب تعلیم ختم کرنے کی نوبت آتی ہے تو ان کی عمر بہت زیادہ ہوچکتی ہے - وہ اپنے ہم جماعت ہندو

طلبا کے مقابلے میں شاذ و نادر ہی امتیاز حاصل کرسکتے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مدارس علحدہ قایم کریں۔ ان مدارس کے اخراجات نصف حکومت برداشت کرے اور نصف وہ خود برداشت کریں۔ ان مدارس میں قرآن اور مذہبی کتابوں کی تعلیم کا عام تعلیم کے ساتھ انتظام کیا جاسکتا ہے —

ہماری رائے ہے کہ سرکاری مدارس میں بھی قران، تفسیر حدیث اور فقہ کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے — اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ ایسا کرنا حکومت کی حکمت عملی کے خلاف ہے جو ان مدارس کو چلاتی ہے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ نصاب میں وہ کتابیں رکھی جائیں جن میں دوسرے مذاہب کی برائی نہ ہو — اگر اس قسم کا سرکاری مدارس میں انتظام کیا گیا تو صرف ہندوستان کے طلبا ہی جوق جوق نہیں آئیں گے بلکہ بخارا اور دوسرے قریب کے اسلامی مرکزوں سے طالب علم ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا کریں گے — اگر ایسا انتظام کیا گیا تو مسلمان انگریزی حکومت کے بہت شکر گزار ہوں گے کہ اس نے ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کیں۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ مسلمان پادشاہوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کرے تو ضروری ہے کہ عربی اور فارسی علوم کی تعلیم ان لوگوں کے ذریعہ دی جائے جو اپنی قابلیت اور ذاتی وجاہت میں مُسلّم ہیں۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو لوگ اس تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کریں گے — کوئی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ کسی مسجد کا مُلّا ہوجائے یا پیر زادہ کہلانے لگے یا تعویذ گنڈے لکھا کرے — عربی اور فارسی علوم کی تحصیل کے بعد بھی لوگ روٹیوں کو محتاج رہتے ہیں — زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ کسی

مسجد کے مدرسے میں پڑھانے لگتے ہیں - ان تمام باتوں کو دیکھ کر نوجوان مسلمان عربی فارسی کے علوم کو بے سود تصور کرنے لگے ہیں * " -

بھوپال کے " عمدۃ الاخبار " کے مدیر نے اس مسئلے کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے :- " یورپ کے تمام موجودہ ذہنی علوم ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت جلد مقبول ہوسکتے اور پھیل سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ علوم دوسری شکل میں ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں - انہوں نے ان علوم کو یونان سے براہ راست لیا تھا جب ان میں ان کے حاصل کرنے کا شوق تھا - ابو جعفر منصور نے ' جو بنوعباس کا دوسرا خلیفہ ہوا ہے ' اقلیدس کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کرایا تھا - اس سے عربوں میں یونانی علوم حاصل کرنے کا شوق اور زیادہ پیدا ہوا - چنانچہ خلیفہ مامون نے ابونصرفارابی ' بوعلی سینا ' قاضی ابو ولید بن رشید اور ابوبکر بن صالح کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ یونانی علوم کو عربی میں منتقل کریں - عباسیوں اور برامکہ کے عہد حکومت میں یونانی علوم وفنون کی بڑی قدردانی ہوئی - دمشق میں ۲۱۴ ہجری میں مامون کے زمانے میں یحیی بن منصور نے رصد گاہ بنوائی - ناصرالدین طوسی اور علی بن شاطر نے بھی رصد گاہیں بنوائیں - ہندوستان میں بھی مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت میں یہ علوم پھیلے اور مصر میں بھی ان کی اشاعت ہوئی - لیکن ان ممالک میں ان علوم کو زیادہ مقبولیت نہیں حاصل ہوئی - اس وقت اگر چہ ہندوستان میں علمی زوال چھایا ہوا ہے لیکن مصر میں فرانسیسی اور انگریزی زبان سے ترجمے ہورہے ہیں اور علوم کو خوب ترقی حاصل ہورہی ہے اور مدارس میں تعلیم کا انتظام

* یہ فرانسیسی عبارت کا ترجمہ ہے - ( مترجم ) -

ہے - علم نباتات، علم حیوانات، زراعت، فلکیات اور طب پر مصر میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ میری نظر سے گزریں - انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ان علوم کو نئے طرز پر پڑھایا جارہا ہے اور پرانے طریقوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے - مختلف علوم کی بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو ترجمے کے ذریعہ مصر میں روشناس نہ ہوچکی ہوں - مصر میں ذریعۂ تعلیم عربی زبان ہے جو ملکی زبان ہے - لیکن چونکہ یہ ایک مذہبی زبان ہے اس لیے ہندوستان کے مسلمان بھی اسے سیکھتے ہیں - اگر حکومت چاہے تو ان علمی کتابوں کے خلاصے جو مصر میں شائع ہوئی ہیں، ہندوستان میں بھی رائج کردے —

" ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی حکومت کے ساتھ اس باب میں متفق ہیں کہ ہندوستان کی سر زمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کیا جائے - اہل ہند کو مغربی علوم و فنون کی برتری کا احساس پیدا ہوگیا ہے - شروع شروع میں جب اہل ہند سے کہا جاتا تھا کہ وہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کریں تو وہ اس کی مخالفت کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اپنی خوشی سے مغربی تعلیم حاصل کر رہے ہیں - بعض ہندوستانی امرا بھی تعلیم کی اشاعت میں ہر طرح مدد دے رہے ہیں اور حکومت ان کی مدد سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے - باوجود اس کے اکثر انگریزی حکام کا خیال ہے کہ ہندوستانی امرا جو مغربی علوم کی اشاعت میں دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ فی الواقع ان علوم کے قدردان ہیں بلکہ وہ صرف حکومت کی اس طرح خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں - میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی - اس طرح انگریزی حکام مغربی علوم کی برتری اور جدید تعلیم کی برکتوں

کو ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ بات قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی امرا کے ذوق علمی کو اس طرح خوشامد پر محمول کیا جائے - میرے خیال میں ہندوستانی امرا جو اس قدر جوش و خروش مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے ظاہر کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انہیں مفید سمجھتے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں - ضلع 'راجشاہی' کے ایک زمیندار نے ۵ ہزار روپے سالانہ کی آمدنی کی زمین سرکاری اسکول کے نام وقف کر دی ہے بشرطیکہ آئندہ اس مدرسے میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کو اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم پھیلانے کا کس قدر شوق ہے * - میں سمجھتا ہوں مغربی علوم کی اشاعت کا یہ شوق ہندوستان میں دن بدن ترقی کرتا جائے گا - مجھے اس کی بھی پوری توقع ہے کہ ہندوستان کے امرا اس وقت مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے جو شوق ظاہر کر رہے ہیں وہ آئندہ بھی باقی رہے گا —

" پنجاب کے باشندوں نے اپنے امرا کی سر کردگی میں قومی علوم کو ترقی دینے کے لیے ایک جامعہ قایم کرلی ہے - یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس درسگاہ کے قایم ہونے سے نہایت مفید نتائج بر آمد ہوے ہیں - یہ اس وقت تک قایم نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ لوگوں میں واقعی اس کی دلی خواہش موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنے علوم محفوظ کرنے کا انتظار کریں - یہ ایک ننھا سا پودا تھا جو انہوں نے لگایا تھا - اب آبیاری اور توجہ سے یہ پودا بڑا درخت ہوگیا ہے اور اس میں پھل پھول آرہے ہیں جن سے ہر شخص بلا امتیاز اس کے کہ وہ امیر ہے یا غریب

* علیگڑھ اخبار کے مدیر نے اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں غیر ضروری ہے -

مستفیض ہو رہا ہے - اس درخت کی تازگی اور سایہ میں دلوں کی پژمردگی دور ہوتی ہے - اگر خدا کو منظور ہے تو اس کا فیضان پنجاب کی حدود سے نکل کر ہندوستان کے ہر گوشے تک پہنچے گا " * —

لاہور کے حلقے میں ۱۳۹۷۲ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن غیر سرکاری مدارس میں جہاں بغیر حکومت کی امداد سے مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اس کی دوگنی تعداد تعلیم پا رہی ہے † —

۳۰ نومبر ۱۸۷۱ ع کو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کی صدارت میں یونیورسٹی کالج کے طلبا کو انعامات تقسیم کرنے کے لیے لاہور میں ایک بڑا دربار منعقد ہوا - کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار پنجاب میں پہلے کبھی نہیں منعقد ہوا تھا - جلسے کی تاریخوں سے پہلے ہی لفٹننٹ گورنر کی دعوت پر پنجاب کے امرا و رؤسا جمع ہوگئے تھے - عورتوں کے لیے نشستیں خاص طور پر محفوظ رکھی گئی تھیں - ایک طرف انگریزوں کی نشستیں تھیں اور دوسری طرف ہندستانیوں کی - لفٹننٹ گورنر کی نشست سب سے علحدہ تھی اور اس کے دونوں طرف حکومت کے معتمدین ' ڈاکٹر لٹز اور پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر تھے ‡ - ان کے سامنے میزوں پر کتابیں اور دوسری انعامی اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں اور جن طلبا کو یہ انعام ملنے والے تھے وہ بھی وہیں نزدیک بیٹھے ہوے تھے - ٹھیک دس بجے لفٹننٹ گورنر دربار میں داخل ہوا اور اجلاس شروع ہوگیا - سب سے پہلے ڈاکٹر لٹز

---

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار ' مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

† یہ معلومات ڈاکٹر لٹز کے اس خط سے لی گئی ہیں جو انھوں نے مجھے بھیجا تھا -

‡ مسٹر پیرسن پہلے راولپنڈی کے ناظر مدارس تھے - اب وہ لاہور کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر ہیں - (اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع )-

نے گزشتہ سال کی رپورٹ انگریزی زبان میں پڑھی - اس کے بعد چندہ ہوا اور تقریباً تین لاکھ روپے کے قریب وعدے ہوئے - ہمیں توقع ہے کہ آئندہ سال رقم اس سے زیادہ جمع ہوسکے گی - طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے - پنجاب کے ہر ضلع سے ہر عمر کے طالب علم تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے آتے ہیں —

جب ڈاکٹر لٹنر اپنی رپورٹ پڑھ چکے تو انہوں نے اس کا انگریزی سے ہندستانی میں نہایت فصاحت سے ترجمہ ان لوگوں کے لیے کر دیا جو انگریزی زبان سے ناواقف تھے - اس کے بعد لفٹنٹ گورنر نے تقریر کی اور پھر انعامات تقسیم کیے گئے - بعض طالب علموں کو اتنی کتابیں ملیں کہ وہ انہیں اٹھا نہیں سکتے تھے - جب انعامات تقسیم ہو چکے تو حاضرین میں سے ایک ممتاز شخص نے جن کا نام راجہ بہادر ملہدی (؟) تھا، ایک باموقع تقریر کی جس میں اہل پنجاب کو اس امر کی مبارک باد دی کہ انہوں نے عام تعلیم کے لیے ایک نہایت مفید ادارہ قایم کرلیا ہے - اس کے بعد مسٹر لیپل گریفن (Lepel Griffin) نے جو معتمد حکومت ہیں اور جنھوں نے پنجاب کے راجاؤں کے متعلق ایک اہم کتاب ابھی حال میں شائع کی ہے، تقریر کی اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یونیورسٹی کامیاب طلبا کو انتہائی اور اعلیٰ ترین امتحانات کی ڈگریاں دینے لگے گی - جس روز دربار منعقد ہوا اسی روز لفٹننٹ گورنر کے حکم سے ایسے ۱۶ امراے پنجاب کی ایک مجلس بنا دی گئی ہے جو سینیٹ کے ارکان ہیں تاکہ اعلیٰ تعلیم کی تنظیم کے متعلق غور کیا جائے - پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے یونیورسٹی کی ترقی کے لیے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ کامیابی یقینی ہے -

سنہ ۱۸۹۳ ع سے بنارس میں حکومت کی سرپرستی میں ایک کالج قایم ہے جہاں امیروں کی لڑکیاں چاہے وہ یتیم ہوں اور ان کی جائدادوں کا انتظام کورٹ آف وارڈز کرتا ہو اور چاہے ان کے والدین زندہ ہوں، تعلیم حاصل کرتی ہیں - یہاں صوبۂ شمال مغربی اور بنگال کے اُمرا کی زیادہ تر لڑکیاں آتی ہیں - ان میں ۹ سے لیکر ۱۶ برس کی عمر تک کی لڑکیاں ہوتی ہیں - انہیں اجازت ہے کہ دو خدمتگار اوپر کے کام کے لیے، ایک باورچی اور ایک سائیس اپنے ساتھ لائیں - ہر ایک کو رہنے کے لیے علحدہ کمرہ دیا جاتا ہے اور کھانے پکانے کا کمرہ بھی علحدہ ملتا ہے - جہاں سب لڑکیاں پڑھتی ہیں وہ کمرہ مشترک ہوتا ہے - طالبات میں رتبہ اور دولت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا - انہیں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں ہوتی - بالخصوص کھانے کے بارے میں ہر ایک کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح کا چاہے کھانا پکوائے اور کھائے * —

مسٹر کالن براؤننگ ( Colin Browning ) نے اودھ کی ترقی تعلیم پر جو رپورٹ شائع کی ہے اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی - اس قابل اور روشن خیال ناظم تعلیمات کا کرنل نسولیز ( Nassou Lees ) کی طرح یہ خیال ہے کہ مروجہ زبانوں کے ذریعہ اہل ہند کو تعلیم دینا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں ادھوری انگریزی کے توسط سے پڑھایا جاے - بعض اور دوسرے اعلیٰ انگریزی حکام کا بھی یہی خیال ہے - مجھے

---

* ہندوستان میں ذاتوں کے لحاظ سے کھانے پینے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے - اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کھانا پکانے والا شخص کون ہے اور برتن کس قسم کے استعمال کیے جاتے ہیں -

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انگریزوں کو قدیم رومنوں کے مثل تصور کرتے ہیں۔ رومنوں کا دستور تھا کہ جب اپنے سے کم تہذیب یافتہ قوموں کو زیر کرتے تھے تو انہیں اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ لیکن ان صاحبوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل ہند کی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مکمل ہیں اور ان کی ادبیات نہایت قدیم ہیں جس کی قدردانی ہندوستان سے زیادہ اس وقت یورپ میں ہورہی ہے۔ رومن لوگوں نے اگر اپنی زبان اور تہذیب مفتوح اقوام پر مسلط کی تو یہ ان کی غلطی تھی۔ رومن جنہیں وحشی خیال کرتے تھے انہوں نے کچھ عرصے بعد جب انہیں موقع ملا رومن اقتدار کو ملیا میٹ کردیا۔

اودھ میں اردو شہروں کی اور ہندی دیہاتوں کی زبان ہے۔ عام طور پر اردو کے ذریعہ سے یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ لوگ اس تعلیم سے بالکل مطمئن ہیں۔ اودھ میں اردو اور فارسی کی بہ نسبت ہندی اور سنسکرت کی زیادہ ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہاں اردو کو جو ترجیح حاصل ہے اس کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ سرکاری مدارس کے کل طلبا میں سے ۱۷ ہزار ۹۹ طلبا اردو پڑھتے ہیں اور صرف ۴ ہزار ۹ سو ۲۴ طلبا ہندی پڑھتے ہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی نے عام احتجاج سے متاثر ہوکر رعایتاً مڈل کلاس کے امتحان رکھے ہیں جو مروجہ زبان میں ہوتے ہیں۔ یہ امتحان صوبجات شمال مغربی، اودھ اور پنجاب میں ہر سال ماہ اکتوبر میں ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج اب تک قابل اطمینان رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے "اینگلو ورناکلر نارمل اسکول" قایم کیے گئے ہیں جن میں انگریزی زبان کی

تعلیم اختیاری ہے اور خاص توجہ مروجہ زبانوں کی طرف کی جاتی ہے تاکہ عوام الناس تعلیم سے فیض پائیں - ''مڈل کلاس'' کے امتحان میں ایک مشرقی زبان کے ساتھ انگریزی کا بھی امتحان لیا جاتا ہے - انگریزی کی حیثیت کلاسکی زبانوں کے برابر رکھی گئی ہے - میں سر ولیم میور کی راے سے بالکل متفق ہوں کہ ان مدارس میں ہندستان کی جدید ادبیات کے فروغ کے لیے کوشش کرنی چاہیے تاکہ مغربی اثر سے اس میں جدید خیالات سموے جائیں اور وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے ادب کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے —

صوبجات شمال مغربی کی حکومت کی جانب سے ایک مفصل رپورٹ شائع ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۰ ع اور سنہ ۱۸۷۱ ع میں طلبا کی تعداد جو زیر تعلیم تھے دو لاکھ چار ہزار ایک سو تین رہی* - مدارس کی تعداد ۸۱۱۸ اور کالجوں کی تعداد ۳ تھی - طلبا میں گیارہ ہزار دو سو تینتالیس لڑکیاں اور باقی لڑکے تھے - گزشتہ سال کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد میں ۵۱۴ کا اضافہ ہوا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ ان کی تعداد میں دن بہ دن ترقی ہوتی جائے گی - سرکاری مدارس میں ۲۹۸ طلبا نے فوقانیہ کے نصاب کی تکمیل کی اور اب وہ یونیورسٹی میں داخل ہو سکتے ہیں - آٹھ ہزار چھیالیس طلبا نے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اردو اور انگریزی کی کامیابی کے ساتھ تعلیم حاصل کی - صوبجات شمال مغربی کے محکمۂ تعلیمات نے سال مذکور میں ۱۹ لاکھ ۳۹ ہزار چار سو ۹۹ روپے خرچ کیے —

علیگڑھ میں بعض علم دوست حضرات نے عوام کے فائدے کے لیے

* اخبار الاخیار - مورخۂ یکم دسمبر سنۂ ۱۸۷۱ ع -

ایک مدرسہ قایم کیا ہے * - جس مجلس کے زیر نگرانی اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا ہے اس کے معتمد منشی درگاہ پرشاد ہیں - موصوف هندستانی کے عمدہ شاعر ہیں اور شاد تخلص کرتے ہیں —

ضلع کالپی کے ہائی اسکول کی رسم افتتاح ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع کو لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کی صدارت میں منائی گئی - موصوف نے ۳۰ سال قبل اس ضلع کے نظم و نسق کو درست کیا تھا جلسے میں مجلس بلدیہ کے ارکان' ایک نواب اور شہر کے امرا موجود تھے - اس جلسے میں فیض علی نے مجلس بلدیہ کی طرف سے هندستانی زبان میں سر ولیم کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا - لفٹننٹ گورنر نے اسی زبان میں ایڈریس کا جواب دیا - سر ولیم هندستانی زبان نہایت صفائی اور فصاحت سے بولتے ہیں - اس اسکول میں انگریزی کے علاوہ عربی' فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا اور اگر بچوں کے والدین چاہیں تو اپنے بچوں کو ان مضامین کی تعلیم کے لیے داخل کرا سکتے ہیں - ایک علحدہ عمارت میں طلبا کی رہائش کا بھی انتظام کیا جائے گا جو هندستان میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے † —

یکم اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع کو الہ آباد کالج کے کھلنے پر جس کے بانی خود سر ولیم میور ہیں اور یہ کالج انہیں کے نام پر " میور سنٹرل کالج " کہلاتا ہے' سر ولیم نے هندوستانی زبان میں تقریر کی جس میں طلبا کو نصیحت کی کہ وہ اپنی تعلیم میں جوش اور انہماک سے کام لیں - موصوف نے تعلیم نسواں کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا اور بتایا کہ هندستان

---

* مدرسۂ مفید خلائق - ( علیگڑھ اخبار - مورخہ ۹ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع ) -

† علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۳ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع -

کی معاشری ترقی بغیر اس کے ممکن نہیں - الہ آباد میں جو بنگالی لوگ آباد ہوگئے ہیں ان کی تعریف کی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلاتے ہیں - موصوف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ صوبجات شمال مغربی میں مجموعی طور پر تعلیم نسواں نے ترقی نہیں کی* - سر ولیم میور کی تقریر دلپذیر میں مشرقی تشبیہیں اور استعارے بلا تکلف استعمال کیے گئے تھے جن کا دیسی لوگوں پر جنھوں نے یہ تقریر سنی، ضرور اثر ہوا ہوگا -

صوبہ بمبئی کا محکمہ تعلیمات قابل اطمینان طور پر کام کرہا ہے - اس صوبے کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل (Peile) نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اس سے اس صوبے کی تعلیمی ترقی کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے - یہ رپورٹ ۵۰۰ صفات پر مشتمل ہے - اس کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ صوبۂ بمبئی میں ہندوستانی کے دس مدرسے ہیں اور مرہٹی مدارس میں چار مقامات پر ہندوستانی زبان کی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے - جن میں تقریباً ۷۰۰ طلباء ہندوستانی پڑھتے ہیں - پونا کے نارمل اسکول میں بھی ہندوستانی زبان کی علیحدہ جماعت کھول دی گئی ہے جس میں گیارہ طالب علم شریک ہیں - خاندیس میں ہندوستانی کی تعلیم کے لیے ۱۸ جماعتیں اور احمدآباد کے ضلع میں ۴ جماعتیں علیحدہ قایم کی گئی ہیں † —

سنہ ۱۸۷۱ ع کے آخیر میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ فنون میں میٹرک کے امتحان میں ۵۸ طلباء شریک ہوے جن میں سے ۱۴ کامیاب ہوے -

* Allen's Indian Mail مورخۂ ۸ جون سنۂ ۱۸۷۲ ع -

† رپورٹ محکمۂ تعلیمات صوبۂ بمبئی بابتۂ سنۂ ۱۸۷۱ ع -

ان کامیاب طلبا میں دس ہندو ، دو عیسائی ، ایک مسلمان اور ایک پارسی تھے - ملکی زبان کے امتحان میں ۱۳۴ امیدوار شریک ہوے جن میں سے ۳۴ کامیاب ہوے - سول انجینرنگ کے امتحان میں ۱۲ کامیاب ہوے جن میں ۹ ہندو اور ۳ پارسی تھے * -

لاہور کے ماہوار رسالے "اتالیق پنجاب" میں صوبجات متوسط کے صدر مہتمم تعلیمات مسٹر ولموٹ کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۷۱ ع شائع ہوئی ہے - یہ پہلی رپورٹ ہے جو مسٹر ولموٹ نے حکومت کے سامنے پیش کی ہے - موصوف نے رپورٹ میں شکایت کی ہے کہ بعض ناظر مدارس جب دورے پر جاتے ہیں تو اپنے فرائض کو کما حقہ پورا نہیں کرتے - یہ دورے گویا ان کے لیے سیر تفریح کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں - ایسی مثالیں ہمیں یورپ میں بھی ملیں گی - موصوف نے بعض مدرسین کے طریقۂ تعلیم کی بھی شکایت کی ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ نارمل اسکولوں میں صرف ان نوجوانوں کو شریک کرنا چاہیے جو تعلیم و تعلم سے خاص لگاؤ رکھتے ہوں اور صحیح معنوں میں تحصیل علم کے جویا ہوں نہ کہ طوطے کی طرح عبارتوں کو یاد کرنے کے خوگر ہوں - اس رپورٹ کو پڑھنے سے آدمی محسوس کرتا ہے مسٹر ولموٹ اپنے فرض منصبی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھی اور ماتحت افسر بھی انھیں کی طرح فرض شناسی سے کام کریں -

اہل ہند اور یورپینوں کے باہم ملنے جلنے سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں اور ان

* Allen's Indian Mail مورخہ ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

میں سے بعض نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے * - میں لاہور ' علیگڑھ لکھنؤ ' مرزاپور اور کلکتہ کی انجمنوں کے متعلق پہلے ذکر کرچکا ہوں - لاہور کی انجمن کے متعلق پنڈت شیو ناتھ نارائن معتمد انجمن تہذیب ' لکھنؤ نے جو اس کے خاص جلسے میں شریک ہوئے تھے مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی ہے :- " اس انجمن کی مساعی سے بعض نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے ترقی کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں - یہ انجمن دوسری انجمنوں کے لئے بطور نمونہ ہے - اگر چہ اس انجمن کے پیش نظر خالص علمی مقاصد ہیں لیکن وہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتی ہے اور ان کے متعلق اپنی رائے سے کھلم کھلا حکومت ہند اور حکومت پنجاب کو مطلع کرتی رہتی ہے - یہ انجمن خاص طور پر محکمۂ تعلیمات کو تعلیم عامہ کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہتی ہے - "

انجمن لاہور ہر قسم کے مسائل کے متعلق معلوم ہوتا ہے اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے - مثلاً جالندھر کے مددگار سپرنٹنڈنٹ سید ہادی حسین نے انجمن سے دریافت کیا ہے کہ وہ اپنے خطابات کو جو انہیں حکومت نے عطا کیے ہیں ' نام کے ساتھ کس طرح لکھا کریں - چنانچہ انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر نام کے شروع میں پہلے سے خان موجود نہ ہو تو " خان " کے خطاب کو نام کے بعد میں رکھا جائے اور " بہادر " اس کے بعد آئے -

* ان انجمنوں میں راج کوٹ کی انجمن قابل ذکر ہے جو کاٹھیاواڑ کے امرا نے قایم کی ہے - حاجی پور میں مراد علی نے ایک انجمن قایم کی ہے جس کا نام " انجمن تہذیب اخلاق " ہے - مراد علی بڑے جوشیلے مسلمان ہیں اور اصلاحی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں - ایک انجمن جنڈر گڑھ میں قایم ہوئی ہے - اس انجمن کے زیر انتظام پنڈت گوپی ناتھ نے سائنس کے فوائد پر ابھی حال میں تقریر کی تھی —

اور اگر خان پہلے سے نام کے شروع میں موجود ہو تو نام کے آخر میں " بہادر " لکھنا کافی ہوگا - " رائے " کا خطاب ہمیشہ نام کے شروع میں آنا چاہیے —

انجمن لاہور کے صدر ڈاکٹر لیٹنر نے گزشتہ جلسے میں اعلان کیا کہ چونکہ وہ راولپنڈی اور گجرات کے حلقے کے مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر پیرسن مقرر کیے گئے ہیں اس لیے مناسب ہوگا اگر ثانی الذکر کو انجمن کا صدر مقرر کیا جائے - اگرچہ ارکان انجمن اور معتمدین کو ڈاکٹر لیٹنر کی جدائی کا افسوس تھا لیکن انہوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا - ڈاکٹر لیٹنر نے جو انجمن کی خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے - انجمن صاحب موصوف کو ہمیشہ اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھے گی - ڈاکٹر لیٹنر اپنے علم و فضل کے ساتھ اہل ہند کی ہمدردی کے لیے بجا طور پر شہرت رکھتے ہیں - ممدوح نے راولپنڈی میں جیسا کہ بعد کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے ' اپنا کام جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا ہے اور لوگ ان کے کام سے بہت مطمئن ہیں * —

علیگڑھ سوسائٹی نے اپنے گزشتہ اجلاس مورخہ ۴ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع کو اُن تصانیف کے متعلق فیصلہ کیا جو ناظم تعلیمات کی طرف سے انعامات کے تعین کے لیے اس کے سامنے پیش کی گئی تھیں - یہ انجمن لاہور کی انجمن کی طرح برابر کام کیے جا رہی ہے اور اس کا دلچسپ اخبار بدستور نکل رہا ہے - تمام تصانیف پر غور کرنے کے بعد مولوی رحیم بخش کی تصنیف " حدیقۂ وصال " کو اول انعام کے لایق سمجھا گیا - اس کے

* اخبار انجمن پنجاب - مورخہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع ؛ علیگڑھ اخبار مورخہ ۲ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع -

علاوہ چھ اور دوسری تصانیف بھی انعام کے قابل سمجھی گئیں —

" علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کی شاخ کا ایک جلسہ ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع کو " سائنٹفک سوسائٹی " کے ہال میں منعقد ہوا - اس جلسے میں ایسوسی ایشن مذکور کے ارکان کے علاوہ " سائنٹفک سوسائٹی " اور " ریفارم لیگ " کے ارکان نے اور شہر کے امرا نے شرکت کی - مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ برھمو سماج کے قائدین اور بعض انجمنوں کے اصرار پر حکومت نے سول شادی ( میرج ) کی موافقت میں جو مسودۂ قانون پیش کیا ہے وہ کس حد تک قابل قبول ہے - حکومت کے مسودۂ قانون کو عام طور پر ہندوستانیوں نے بنظر استحسان نہیں دیکھا اور بعض برھمو سماج کے حامیوں کو بھی وہ پسند نہیں ہے - " علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کے ایک جلسے منعقدہ ۲۴ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ وائسرائے گورنر جنرل سے ایک معروضہ کے ذریعہ استدعا کی جائے کہ وہ اس مسودۂ قانون کی ان دفعات کو منسوخ کردے جو ایسوسی ایشن کے ارکان کے نزدیک سیاسی ، اخلاقی اور مذھبی حیثیت سے قابل اعتراض ہیں - یہ واضح رہے کہ ایسوسی ایشن کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں - یہ جلسہ بدری پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا تھا - راجہ جے کشن داس معتمد اور بعض دوسرے ارکان نے اس موقع پر تقاریر کی تھیں اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان خطرات کو واضح کیا تھا جو اس مسودۂ قانون کے منظور ہونے سے پیدا ہوں گے - اس ضمن میں جو بحث ہوئی وہ حد درجہ دلچسپ ہے - اس کی تفصیل " علیگڑھ اخبار " مورخہ ۸ مارچ میں ۱۵ کالموں میں درج ہے - بالآخر جلسے میں جو قرار داد منظور

کی گئی اس کی نقل وائسرائے کو بھیج دی گئی * - لیکن مجلس وضع قوانین میں مسودہ قانون منظور کرلیا گیا - اب تک یہ قانون نافذ نہیں ہوا ہے اس لیے کہ انڈیا آفس کی منظوری کا انتظار ہے - میرا خیال ہے کہ ڈیوک آف آرگل جو آج کل وزیر ہند ہیں ابھی تھوڑے دن گزرنے دیں گے تاکہ اس قانون کے خلاف جو احتجاج ہورہا ہے وہ کم ہو اور پھر اس کے بعد اسے نافذ کیا جائے —

مدراس میں دو سو ہندوؤں کا ایک جلسہ ۲۳ اپریل کو منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا قانون کے متعلق اظہار ناخوشی کیا گیا - جلسے نے اس قانون کے نافذ ہونے کے خلاف جو قرار داد منظور کی اس کا خلاصہ وزیر ہند کو بذریعہ تار روانہ کردیا گیا اور اس سے درخواست کی گئی ہے کہ پوری قرار داد کے پہنچنے تک وہ کوئی قطعی تصفیہ نہ کرے † —

بٹالہ (پنجاب) میں ایک ادبی انجمن لاہور اور علیگڑھ کی انجمن کے طرز پر قایم کی گئی ہے - اس انجمن کا ایک اخبار بھی نکلتا ہے جس کے مدیر لکشمی سہائے ہیں جو انجمن کے معتمد بھی ہیں - اس قسم کی ایک انجمن جس کے پیش نظر ادبی اور معاشری ترقی ہے گونڈہ (اودھ) میں قایم ہوئی ہے - اس کے لیے ۴ ہزار ۸۶ روپے بطور چندہ جمع ہوگئے ہیں —

علیگڑھ کی "انجمن تہذیب" سائنٹفک سوسائٹی سے مختلف ہے - اس کا علحدہ اخبار بدستور جاری ہے - ان دونوں انجمنوں کے بانی سید احمد خاں ہیں —

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا ایک عام جلسہ گزشتہ فروری میں مظفرپور میں منعقد ہوا تھا - اس جلسے میں تقریباً دو ہزار اشخاص

* اس قرار داد کی نقل "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع میں شائع ہوئی ہے —

† Allen's Indian Mail - مورخہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع —

نے شرکت کی اس انجمن کی جانب سے جو مدرسہ قایم ہے اس کے طلبا کو پہلے انعامات تقسیم کیے گئے - اس کے بعد انجمن کے معتمد مولوی امداد علی خاں نے اپنے ایک مختصر اور برجستہ خطبے میں ان تمام کارروائیوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیر انصرام سر انجام پائیں اور جو انجمن کے مقاصد میں شامل تھیں - یہ خطبہ نہایت سلیس زبان میں تھا - مولوی امداد علی خاں کا مظفرپورر میں یہ آخری خطبہ تھا اس لیے کہ بعد میں ان کا تبادلہ کیا ہو گیا ممدوح نے 'صاحب گنج' میں مظفرپور والی انجمن کی ایک شاخ قائم کی جس کے دستور کی تفصیل "اخبارالاخیار" میں شائع ہو چکی ہے —

مولوی امداد علی خاں نے مظفرپور کی سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے جو خطبہ پڑھا اس میں پابند مذہب مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ اہل یورپ کے سائنٹفک علوم کو ھندوستانی یا کسی اور دیسی زبان میں منتقل کرنے میں کوئی بات مذھب کے خلاف نہیں تصور کرنی چاھیے - مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنی چاھیے اس واسطے کہ اس زبان کے ذریعہ سے ان کے ھاتھ میں علوم کے خزانے کی کنجی آجائے گی - اس کے بعد موصوف نے ان کتابوں کی تفصیل بیان کی جن کے ترجمے ہوچکے ھیں یا ہونے والے ھیں - پھر ان مدرسوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیر انصرام قایم کیے گئے ھیں اور ان طلبا کا حال بیان کیا جنھوں نے کامیابی حاصل اور کلکتہ یونیورسٹی میں شریک ہوئے اور انگریزی کے امتحانات میں ممتاز رہے - آخر میں انجمن کی آمدنی اور اخراجات کے گوشوارے پیش کیے گئے * —

* اخبار انجمن پنجاب ' مورخہ یکم مارچ سنہ ۱۸۷۲ م -

نینی تال کا انسٹیٹیوٹ اپنا کام خوب اچھی طرح کر رہا ہے - اس کے پیش نظر خاص کر زراعت کی ترقی کے لیے وسائل اختیار کرنا ہے - ہندوستان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ زراعت ہے - انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایسے مدارس قایم کیے جا رہے ہیں جہاں زراعت کے اصول سکھائے جائیں تاکہ ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو * —

" پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن " کا مرکز بھی لاہور ہے - یہ انجمن بھی اچھی طرح سے چل رہی ہے † —

" اسلامک سوسائٹی " کا سالانہ جلسہ گزشتہ جنوری میں منعقد ہوا - اس میں شاہ سیام، وائسرائے ہند اور متعدد امرا اور انگریز حکام نے شرکت کی - مولوی عبداللطیف خاں معتمد اسلامک سوسائٹی نے جو انتظامات کیے ان کی وجہ سے اس جلسے کی بہت شہرت ہوئی ‡ —

کلکتہ کے اسلامیہ کالج کی انجمن مباحثہ کا چھٹا سالانہ جلسہ گزشتہ اگست کی ۳ تاریخ کو منعقد ہوا - جلسے کی صدارت پروفیسر بلوخ مان ( Blochmann ) نے کی - سالانہ رپورٹ پڑھے جانے کے بعد ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل نے رسول اکرم کے بعد سے اس وقت تک کی اسلامی تاریخ پر تبصرہ کیا اور خاص طور پر مسلمانان ہند کی موجودہ حالت کو اجاگر کر کے بتایا - اس کے بعد اصول اسلام کے متعلق بحث شروع ہوئی - ایک نوجوان مقرر نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن میں جنت کا ذکر بطور تمثیل ہے - جس طرح عیسائیوں کو مرنے

* علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -
† اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۶ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع -
‡ علیگڑھ اخبار مورخہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ ع -

کے بعد روحانی خوشیوں کا وعدہ کیا گیا ہے اس طرح جنت کی لذتیں روحانی ہوں گی نہ کہ مادی * —

نیشنل ایسوسی ایشن کی ایک نئی شاخ لیڈز (Leeds) میں قائم ہوئی ہے - اس کا مقصد یہ ہے کہ اہل ہند کی معاشری ترقی کی تدابیر اختیار کرے - اس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جن سے مجھے اس وقت شرف ملاقات حاصل ہوا جب کہ موصوفہ بمبئی جاتے ہوئے پیرس سے گزری تھیں - اس ایسوسی ایشن کی شاخیں پہلے سے لندن ' برسٹل برمنگھم ' مانچسٹر ' اڈنبرا ' گلاسگو اور شفیلڈ میں موجود ہیں - ہمیں امید ہے کہ انگلستان کے اور دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قایم ہو جائیں گی - لیڈز کی شاخ ریورنڈ جے ای کارپنٹر کی سربراہی میں نہایت مفید کام کر رہی ہے - اس کا تعلق علیگڑھ کے سائنٹفک انسٹیٹیوٹ کے ساتھ قائم ہوگیا ہے —

ہندستان کے موجودہ حالات میں علمی ادبی انجمنوں کو اتنی اہمیت نہیں حاصل ہے جتنی کہ اصلاح معاشرہ کی انجمنوں کو ہے جو ایک طرح سے مذہب سے بھی تعلق رکھتی ہیں - اس لیے برہمو سماج کو ہمیں خاص اہمیت دینی چاہیے - اس سال ۱۴ فروری چہار شنبہ کے روز بابو کیشب چندر سین نے کلکتے میں اپنا سالانہ خطبہ پڑھا - جس جلسے میں یہ خطبہ پڑھا گیا اس میں ہزاروں اشخاص شریک تھے جن میں انگریز بھی کافی تعداد میں تھے - "اخبار انجمن پنجاب" کے مدیر نے اپنے اخبار کی ۱۶ فروری کی اشاعت میں اس ضمن میں لکھا

* The Friend of India - مورخہ ۸ اگست سنہ ۱۸۷۲ م -

ہے کہ " ان کے (کیشب چندر سین کے) خطبے اس قدر دلپذیر ہوتے ہیں اور وہ اپنے دلائل سے اس قدر اچھا اثر پیدا کرتے ہیں کہ ان کی تقریر سننے والا ان کے عقاید کی برتری کا قائل ہوجاتا ہے اور ان کی شخصیت کی عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے - ان کی ذات سارے ہندستان اور خاص طور پر بنگال کے لیے مایۂ صد افتخار ہے - ان کے عقاید میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ ذات پات کو بالکل مٹانے کے موید نہیں ہیں - ان کا خیال ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہندو جاتی درہم برہم ہوجائے گی - کیشب چندر سین کا خیال ہے کہ ذات پات کی بدولت عوام کے اخلاق اور ہندو امارت کا قیام ممکن ہوا - ہم نے یہ کہتے سنا ہے کہ برہمو سماجی اپنے طور پر خدا کی وحدانیت میں یقین رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے - لیکن وہ ہندو سماج کو مٹانا نہیں چاہتے بلکہ نئی بنیادوں پر اس کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں - کنٹربری کے اسقف اعظم اور ریورنڈ ڈاکٹر ٹیٹ ( Tait ) نے ٹھیک کہا کہ برہمو سماج ہندو دھرم سے بھی زیادہ بت پرستی کی طرف لے جانے والی تحریک ہے *—

" برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کو برہمو سماج کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے - یہ انجمن بت پرستی کی بالکل مخالف تو نہیں ہے - ہاں، اس کے ارکان یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے مندروں میں جس بے حیائی اور عریانی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کو روکا جائے - اس انجمن کے ایک اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا بابو راجندر لال متر

---

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے - ( مترجم ) - اس سلسلے میں ملاحظہ ہو لندن ٹائمز کا خط جو ۲ ستمبر سنہ ۱۸۲۲ ع کو شائع ہوا -

نے جو مشہور عالم اور ماہر آثار قدیمہ ہیں، اس قسم کی تجاویز کی مخالفت کی اس لیے کہ اگر ہندو دھرم کی خارجی نشانیوں کو مٹادیا گیا تو خود ہندو دھرم مٹ جائے گا اور عوام کے مذہب کو سخت ٹھیس لگے گی۔ ہمیں انگریزی حکومت کی اس باب میں تقلید کرنی چاہیے جس نے مذہب کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ اگر عوام کے معاملات میں دخل اندازی کا یہی حال رہا تو کل یہ کہا جائے گا کہ فقیر سنیاسی ننگے نہ پھریں اور بچے بھی گھرسے باہر نکلیں تو اسی طرح کپڑے پہنے ہوئے ہوں جس طرح یورپ میں ہوتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں اہل ہند کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وہ اس وقت تک دخل اندازی نہیں کرتی جب تک کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو فطری قانون کے بالکل ہی خلاف ہو۔ اس ضمن میں میں "نسیم جونپور" کا ایک اقتباس اس جگہ نقل کرتا ہوں:۔ "ابھی حال ہی میں بنارس میں ایک فقیر ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ وہ نہ ہلتا ہے، نہ حرکت کرتا ہے۔ لوگوں کو اس سے عقیدت پیدا ہوئی اور ایک رسی کے ذریعہ سے جو درخت پر باندھ دی گئی تھی اسے کھانے پینے کی چیزیں اوپر چڑھانے لگے" *۔ انگریزی حکومت اس قسم کے فقیروں کو جو ان کا جی چاہے کرنے دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپ میں بھی بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنہیں دانش مند لوگ معیوب سمجھتے ہیں لیکن حکومتیں انہیں منع نہیں کرتیں —

برھمو سماج کی سب سے قدیم شاخ "ادی سماج" ہے۔ یہ اپنے مخصوص

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے (مترجم)۔

انداز میں هندو دهرم کی تاویل پیش کرتی هے - کلکته کی نیشنل سوسائٹی کے ایک جلسے میں اس شاخ کے ایک سرگرم رکن بابو واج نارائن بوس نے "ادی سماج" کے اصول پر تقریر کی - موصوف نے بارہ دلائل پیش کیے جن کی بنا پر هندو دهرم کی دنیا کے دوسرے مذاهب کے مقابلے میں فضیلت ثابت هوتی هے - ان دلائل میں سے بعض ایسے هیں جنهیں سن کر یہ نتیجه نکالا جاسکتا هے که بابو صاحب کو دوسرے مذاهب کا علم بہت کم هے - بابو صاحب کے دلائل یه هیں - (۱) هندودهرم کسی ایک شخص کے نام کے ساتھ وابسته نہیں هے جیسا که دوسرے مذاهب میں هے - اس لیے یه بہ نسبت دوسرے مذاهب کے زیادہ عالمگیر مذهب هونے کی صلاحیت رکھتا هے - (۲) هندو دهرم میں پرستش کرنے والے اور جس شئے کی پرستش کی جاے کوئی واسطه نہیں هوتا - هندو براہ راست شیو ' وشنو یا درگا کی پوجا کرتے هیں اور انهیں اپنا معبود حقیقی سمجھتے هیں - (۳) هندو دهرم میں خدا اصل روح هے جو انسان کی ذات سے بالکل قریب هے اور انسان اس کے نزدیک محبوب هے - اپنشدوں کے زمانے سے لے کر آج تک هندو دهرم میں یه تخیلات ملیں گے - (۴) انسان باوجود اپنی دنیاوی زندگی کے خدا کی ذات میں ضم هوسکتا هے - (۵) دوسرے مذاهب میں نیکی کی تعلیم کے عوض ابدی مسرت کے وعدے کیے گئے هیں حالانکه هندو دهرم میں نیکی نیکی کی خاطر اور خدا کی پرستش خدا کی خاطر کی جاتی هے - (۶) دوسرے مذاهب میں صرف انسانوں پر رحم کرنے کا حکم هے حالانکه هندو دهرم میں تمام زندہ مخلوق کے ساتھ رحم کرنے کا حکم هے - (۷) هندو دهرم میں آخرت کا جو تصور پیش کیا گیا هے وہ اس سے اعلیٰ هے جو دوسرے مذاهب میں پیش کیا گیا

ہے - ہندو دھرم میں تناسخ کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے حالانکہ مسیحیت اور اسلام میں جو جہنم میں جائے گا وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا - آخرت کی زندگی کا جو تصور ہندو دھرم میں ہے وہ انسان کی اس ترقی کا ضامن ہے جو وہ دنیا میں کر سکتا ہے - (۸) ہندو دھرم دوسرے مذہبوں کے ساتھ روا داری کا سلوک کرتا اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کرکے نجات حاصل کر سکتا ہے - (۹) ہندو دھرم میں ایسے عقاید بھی قابل قبول ہیں جو ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جن کی ذہنی تربیت کافی طور پر نہیں ہوئی ہے - پیشتر اس کے کہ وہ اعلیٰ عقاید تک پہنچیں انہیں ادنیٰ درجے کے عقاید کی منزل سے گزرنا ضرور ہے، یہاں تک کہ آخر میں ہر شخص ذات الوہیت کا جزو بن سکتا ہے - (۱۰) ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ مذہب زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے - چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ "ہندو کا کھانا، پینا رہنا سہنا اور سونا مذہب کے مطابق ہوا کرتا ہے" - (۱۱) ہندو دھرم کے مطابق سائنس، سول دستور اور معیشت کے ہر مسئلہ کی توجیہہ ممکن ہے اس لیے کہ وہ مذہب کے اثر کو زندگی کے ہر گوشے پر مسلط کر دیتا ہے - (۱۲) ہندو دھرم انسان کا قدیم ترین مذہب ہے - وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذہب فطرت انسانی کی مستقل بنیادوں پر قائم ہے * - "

کوکا لوگوں نے جو علم بغاوت بلند کر دیا ہے اس کی وجہ سے پبلک اس فرقے کے معاملات میں دلچسپی لے رہی ہے - اس فرقے کے بعض افراد پر

---

* Allen's Indian Mail مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۸۸۲ ع -

جو مظالم کیے گئے ہیں اور ان کو طرح طرح سے جو اذیتیں دی گئی ہیں۔ اس کے خلاف حکومت کارروائی کر رہی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ اس فرقے کے متعلق یہاں کچھ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - بابو کاشی ناتھ نے "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۳ مئی سنہ ۱۸۷۲ع میں اس فرقے کے متعلق جو کچھ لکھا اُس کی معلومات کا ماخذ ایک جوگی ہے - وہ لکھتے ہیں :-
"یہ فرقہ صرف چھے سات سال ہوئے وجود میں آیا ہے - اس کے بانی کا نام گرو رام سنگھ ہے جو آج کل الہ آباد میں قید ہے - گرو رام سنگھ کے پیرو 'کوکا' اس لیے کہلاتے ہیں کہ یہ اپنی عبادت میں 'کوک' کا لفظ بہت استعمال کرتے ہیں - اس فرقے میں زیادہ تر بڑھئی' لوہار اور معمار لوگ شامل ہیں جو پنجاب کے جنوب مغرب میں آباد ہیں - اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ شخص نے اتنی تھوڑے عرصے میں اس قدر اثر پیدا کر لیا ہے اور اچھی خاصی تعداد کو اپنے فرقے میں داخل کرلیا ہے - حالانکہ مسیحی مبلغین کو باوجود انتہائی مشقت کے نسبتاً بہت کم کامیابی حاصل ہوئی ہے - اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان نیکی کے مقابلے میں بدی کی جانب جلد راغب ہوجاتا ہے - 'کوکا' لوگ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے - وہ سکھوں کے بھی دوست نہیں ہیں اگرچہ گرو گوبند سنگھ کو وہ مانتے ہیں اور گرنتھ کو مقدس کتاب سمجھتے ہیں - چنانچہ امرتسر کے بڑے مندر کے نگہبان 'کوکا' لوگوں کو اندر نہیں جانے دیتے - اس لیے کہ 'کوکا' لوگوں نے نہ صرف مساجد کو بلکہ بعض جگہ دھرم شالوں اور پگوڈوں کو بھی مسمار کر ڈالا ہے - انہیں پورا یقین ہے کہ ان کا فرقہ کچھ عرصے بعد سارے ہندستان میں حاوی ہوجائے گا اور دوسرے مذاہب پر اسے فوقیت حاصل

ہو جائے گی - 'کوکا' لوگوں میں ذات پات کی تقسیم نہیں ہوتی - نہ وہ برہمنوں کی عزت کرتے ہیں - ہندووؤں کی مقدس جاتراؤں' دریاؤں سنگموں اور گئو ماتا کا ان کے نزدیک احترام ضروری نہیں ہے - گرونانک نے اپنی تعلیم میں ہندو دھرم کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی رکھے تھے انہیں بھی کوکا فرقے نے نکال پھینکا - چنانچہ اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ سکھوں سے علحدہ ہیں - لیکن ان میں اور سکھوں میں سلام کا طریقہ ایک ہی ہے یعنی دونوں " اکال پرش " کے الفاظ استعمال کرتے ہیں -

" کوکا لوگ عام طور پر مہمان نواز ہوتے ہیں اور آپس میں مل جل کر محبت سے رہتے سہتے ہیں - ان میں بغاوت کی آگ مشتعل کرنے والے چند ڈاکو ہیں جو بدامنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں - اس فرقے کے اکثر لوگ امن پسند پیشہ ور ہیں جو بغاوت کو پسند نہیں کرتے - ۴۹ باغیوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے جو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس سے نہ صرف اس فرقہ کے افراد میں بلکہ سارے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی ہے - کوکا لوگوں کی عادات سادہ ہوتی ہیں - ہندوؤں کی طرح بچوں کے پیدا ہونے اور شادی اور موت کے موقع پر بھی یہ رسوم کی پابندی نہیں کرتے - ان رسوم کے لیے کوئی خاندانی پروہت نہیں طلب کیا جاتا جو شاستروں کے مطابق رسوم بجالائے - کوکا لوگ اپنے مُردوں کے متعلق بھی کوئی مقرر قاعدے نہیں رکھتے - ان میں سے بعض اپنے مردوں کو مسلمانوں کی طرح دفن کرتے ہیں ' بعض ہندوؤں کی طرح جلاتے اور بعض پارسیوں کی طرح ہوا اور دھوپ میں چھوڑ

دیتے ھیں * — "

سب سے پہلے علمائے دینیات نے یورپ میں مشرقی سامی زبانوں کی تحقیق کی طرف توجہ کی ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح انجیل مقدس کے خاص خاص محاوروں اور ان رسوم و روایات کا پتہ لگایا جائے جن کی نسبت اس میں ذکر ملتا ھے - چونکہ یہ رسوم یورپ کے رواجوں سے بالکل مخالف ھیں اس لیے سامی زبانوں کا کھوج لگایا گیا تاکہ ان کی اہمیت واضح ھوسکے - بہ نسبت کیتھولکوں کے پروتستنتوں نے مشرقی زبانوں کی تحقیق میں زیادہ کام کیا اس لیے ان کے عقاید تمام تر انجیل مقدس ھی پر مبنی تھے - چنانچہ مشرقی زبانوں کے متعلق انگلستان ' ھالینڈ ' جرمنی ' ناروے اور سویڈن میں بہ نسبت فرانس کے زیادہ کام کیا گیا - مشرقی زبانوں کی تحقیق سے انجیل مقدس کے سمجھنے میں جو مدد ملی ھے اُسے ریورنڈ جیمز لانگ ( James Long ) نے تسلیم کیا ھے - † موصوف نے اپنی تصنیف میں ان استعاروں کا ذکر کیا ھے جو انجیل میں ملتے ھیں اور پھر ان کا مقابلہ ھندوستانی ( اردو ) ' عربی ' فارسی ' بنگالی اور اسی کے محاوروں اور استعاروں سے کیا ھے - یہ کتاب اس قدر دلچسپ ھے کہ میں اس کے اکثر حصوں کو یہاں نقل کرسکتا ھوں لیکن چونکہ ایسا کرنا طوالت کا باعث ھوگا اس واسطے میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا - مصنف نے اس کتاب کے تیار کرنے میں بہت جاں فشانی کی ھے اور تبحر علمی کا ثبوت دیا ھے - اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ مسیحیت کی خدمت ھو سکے -

---

* میٹر نے اپنے سنہ ۱۸۷۱ ع کے مقالے میں بھی اُن کے متعلق ضمنی طور پر ذکر کیا تھا -

† ملاحظہ ھو ممدوح کی تصنیف " Scriptural Truth in Oriental dress " کلکتہ ' سنہ ۱۸۷۱ ع -

اس کتاب میں بعض ایسی رسوم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کے متعلق انجیل میں بھی ذکر ملتا ہے - مثلاً انجیل میں "کھاری سمندر" کا ذکر ملتا ہے (بحر ملح) اسی طرح جیسے عربی میں بحر اور فارسی میں دریا کہتے ہیں - اور اگر کھلے سمندر سے مقصد ہوتا ہے تو عربی میں مالح اور فارسی میں شور کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے - حضرت موسیٰ نے جب مقدس سر زمین پر قدم رکھا تو اپنے جوتے اتار دیے - مشرق میں اب بھی یہ دستور موجود ہے کہ مسجد میں لوگ جوتے اتار کر جاتے ہیں - عربوں میں "نمک" وفاداری کے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور انجیل میں بھی یہی خیال اسی محاورہ سے ادا کیا گیا ہے - انجیل میں اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے کہ "تم مجھے جانتے ہو" یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہے - "تم میرا بیٹھنا اور اٹھنا جانتے ہو" - فارسی میں بالکل یہی محاورہ استعمال کرتے ہیں - انجیل میں مطلع صاف ہونے کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوا ہے - "آسمان کھل گئے" - بالکل یہی محاورہ ہندوستانی زبان میں بھی مستعمل ہے - انجیل میں ہے کہ "زندگی کا دروازہ چھوٹا ہے اور جو راستہ اُس کو جاتا ہے وہ تنگ ہے" - یہی خیال یجروید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ جنت کا راستہ پل صراط پر سے ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے - انجیل میں دو عورتوں کا ذکر ہے جو چکی میں گیہوں پیس رہی ہیں - مشرقی ممالک میں یہ رواج ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور اب بھی موجود ہے - مشرق میں چکی میں گیہوں اسی طرح سے پیستے ہیں جیسے ہمارے یہاں قہوہ یا کالی مرچ پیسی جاتی ہے - انجیل میں مختلف مقامات

پر مذکور ہے کہ حضرت مسیح اور ان کے حواری خانۂ خدا میں جا کر تلقین کرتے تھے - لیکن وہ آخر کس طرح تلقین کرسکتے تھے جب کہ انہیں ستانے والے موجود تھے - مسلمانوں میں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ مسجد ہر ایک کے لیے کھلی ہوتی ہے - بغیر رکاوٹ کے اس میں ہر مسلمان داخل ہو سکتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے - حضرت مسیح اور حواریوں نے بھی یہی کیا ہوگا کہ چونکہ خانۂ خدا میں ہر شخص جاکر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے انہوں نے بھی بلا روک ٹوک اپنی تعلیم کی اس طرح تلقین کی ہوگی - انجیل میں ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی پیشانی پر خدا کا نام لکھا ہوتا ہے - یہ وہی بات ہے جس طرح ہندوؤں میں ماتھے پر تلک لگاتے ہیں اور اس کے ذریعہ مختلف ذاتوں کو ظاہر کرتے ہیں - انجیل کے بہت سے محاورے ایسے ہیں جو آج بھی ہندوستانی زبان میں بولے جاتے ہیں - ہم ان میں سے چند ذیل میں لکھتے ہیں :—

(۱) خدا جسے بچائے اس کا بال بیکا کرنے والا کون ؟ —

(۲) اپنا منہ آئینہ میں دیکھو —

(۳) کپڑوں کا حسن الماری میں ہوتا ہے اور آدمی کا ذاتی حسن اس کی شخصیت سے وابستہ رہتا ہے —

(۴) دولت ڈھلنے والی چیز ہے جیسے دوپہر کا سورج —

(۵) نیم کڑوا ہی رہے گا چاہے آبیاری بجائے پانی کے دودھ ہی سے کیوں نہ ڈالا کرو —

(۶) درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے —

(۷) اگر کانٹے بوؤگے تو گلاب نہیں کاٹو گے —

( ۸ ) سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کا گزرنا ( انجیل کے محاورے میں بجائے ہاتھی کے اونٹ ہے ) —

مسیحیت کے مبلغین جو انجیل کے تمام حصوں پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں ہندوستان کے مختلف مراسم سے بعض ایسے حصوں کی تشریح کرسکتے ہیں جو اب تک مبہم رہے ہیں اور جنہیں خود سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی وہ سمجھا سکیں گے —

کولونیل چرچ کرانیکل ( Colonial Church Chronicle ) کی مئی کی اشاعت میں لکھا ہے کہ " غیر مسیحی ممالک میں جو لوگ حضرت مسیح کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ان کی نظر سب سے پہلے ہندوستان پر پڑتی ہے جو ان کی دلچسپی کا مرکز ہے - اس زبردست سلطنت کے آٹھ صوبوں میں صرف شمال مغربی صوبہ اتنا وسیع ہے جتنا کہ برطانیہ عظمیٰ - اس صوبے کی آبادی ۳ کروڑ سے زائد ہے - پنجاب کا رقبہ اٹلی کے برابر ہے - صوبجات متوسط بھی رقبے میں برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کے مساوی ہیں - باوجود اس قدر وسعت کے اس پورے ملک میں انگلستان کی طرف سے صرف تین اسقف مقرر کیے گئے ہیں حالانکہ روم کے کلیسا کے ۱۶ اسقف ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ یہ تینوں اسقف نہایت جوشیلے ہیں اور وہ اپنے کاموں سے اپنے اپنے علاقے میں زندگی پیدا کر رہے ہیں * —

کیتھولک مشن ہندوستان میں خوب کامیابی حاصل کر رہے ہیں - ان کے وسائل نہایت وسیع ہیں - مسیحیت کی اشاعت کے لیے صرف فرانس میں ۴۷۴۸۹۰۲ فرانک کی رقم فراہم کی گئی لیکن یہ رقم دنیا

---

* تین اسقف یہ ہیں :- ڈاکٹر ملمین ( Milman ) اسقف کلکتہ ؛ اسقف ڈگلس ( Daglas ) اسقف بمبئی ؛ اور اسقف گل ( Gell ) اسقف مدراس -

کے مختلف حصوں میں تقسیم کی جائے گی جیسا کہ اسقف ہیبر (Heber) نے ایک جگہ لکھا ہے:—

"گرین لینڈ کے برفیلے پہاڑوں سے لیکر ہندوستان کے ساحلوں اور افریقہ کے دریاؤں تک جو اپنی سنہری ریت آفتاب کی روشنی میں بہاکر لاتے ہیں وہ (مسیحی مبلغین) غلط روی کی زنجیر سے ملکوں کو رہا کرتے ہیں- ان کی آواز قدیم دریاؤں کے ساحلوں اور کھجور کے درختوں سے بھرے ہوئے میدانوں میں سنائی دیتی ہے"—

سنہ ۱۸۶۲ ع میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے ان کے مطابق ہندوستان میں کیتھولکوں کی تعداد ۸۷۸ ۶۹۱ تھی لیکن اسقف ملمین (Milman) کا خیال ہے کہ ان کی تعداد میں کچھہ تخفیف ہوگئی ہے- وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں*:- "یسوعیوں کے مدارس نہایت عمدہ خدمات انجام دے رہے ہیں- کیتھولک مشن کے سرگروہ ہندوستان میں اسقف اعظم استینس (Steins) ہیں جو نہایت فاضل شخص ہیں اور ساتھہ ہی ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کلیسا کے ایک اعلیٰ عہدہ دار میں ہونی چاہئیں- وہ نہایت خلیق اور صاحب وجاہت ہیں اور ان کی شخصیت سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے- کیتھولک کلیساؤں میں یورپین اور ہندوستانی لوگ بلا کسی نسلی امتیاز کے شرکت کرتے ہیں- کیتھولک لوگوں میں مذہبی اقتدار کو بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے"—

مذکورہ بالا رائے ایک اینگلی کن (Anglican) اخبار کی ہے جس نے بلا رو رعایت کیتھولک مشن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے- لیکن

* Colonial Church Chronicle بابت جون سنہ ۱۸۷۲ ع -

کیتھولک مشن کو پروٹسٹنٹ مشن سے یہ شکایت ہے کہ خواہ مخواہ اس نے رقابت پیدا کرلی ہے دراصل دونوں مشنوں میں مقابلہ کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا - اس کا اظہار "سال نامۂ اشاعت دین" میں کیا گیا ہے —

کلکتہ کے اسقف اعظم ملمین نے' جن کے تحت ہندوستان اور لنکا کے تمام مسیحی حلقے ہیں' مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع میں اپنے احکام کی دوسری قسط شائع کی ہے - پہلی قسط کے متعلق میں اپنے سنہ ۱۸۶۸ ع کے خطبے میں ذکر کرچکا ہوں - ہندوستان کے اسقف اعظم نے مذہبی جلسے اپنے سفر کے دوران میں ملک کے ہر حصے میں منعقد کیے - موصوف نے اس ضمن میں تذکرہ لکھا ہے کہ جنوبی ہند میں بہ نسبت شمالی ہند کے مسیحیت کے حلقے میں زیادہ تعداد میں لوگ شامل ہوے - جنوبی ہند میں بعض اضلاع میں خاص طور پر مسیحیت کو خوب فروغ حاصل ہوا ہے - اینگلی کن کلیسا کے پیرو اس وقت تمام ہندوستان میں ۱۸۰۰۰۰ ہیں - اب دن بدن ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مسیحیت کے زمرہ میں شریک ہوگئے ہیں - "اودھ اخبار" میں حال میں شہزادۂ سلیمان کے متعلق ذکر تھا جو مغل شہنشاہ کے پوتے ہیں اور اپنے والد کی طرح مسیحیت کے حلقے میں شامل ہوگئے ہیں - اسقف اعظم نے مسیحی مبلغین کے جوش دینی کو بہت کچھ سراہا ہے کہ ان کی بے لوث خدمت کی بدولت نہایت عمدہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں - ان کے مدارس میں نوجوان ہندوستانی روحانی زندگی کے ابتدائی سبق لیتے ہیں اور ان کے دلوں میں تعلیم کے ذریعہ اخلاقی حس پیدا ہوجاتی ہے اور وہ مقدس حقائق

کو قبول کرنے کی اپنے میں صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں —

اسقف ہند نے پچھلے تین سال میں ایک ہزار دو سو ستر دیسی اور ایک ہزار یورپینوں کو بپتسما دیا' ۱۹ کلیساؤں کا افتتاح کیا اور ۲۹ قبرستان بنانے کا انتظام کیا۔ موصوف نے دیسی زبانوں کے مطالعہ کے شوق کو مبلغین مذہب میں بڑھانے کی کوشش کی - وہ خود اردو' ہندی اور بنگالی میں بلا تکلف وعظ کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ موصوف ایک منکسر المزاج شخص ہیں اس لیے وہ خود اپنے کارناموں کے متعلق کوئی ذکر نہیں کرتے * —

اڈنبرا کے اسقف کے تحت اسکاٹلینڈ کے کلیسا نے ایک خاص شعبہ قایم کیا ہے جس کا مقصد غیر مسیحی ممالک اور خاص طور پر ہندوستان میں تبلیغ کرنا ہے۔ چنانچہ اس کا انتظام ہوگیا ہے کہ 'چاندہ' کو مرکز بنا کر گوالیار کے آس پاس کے علاقے میں تبلیغ کی جائے - کلکتہ کے اسقف اعظم نے اس کام کی ہمت افزائی کی ہے اور اس میں کچھ ہرج تصور نہ کیا کہ مسیحیت کی اشاعت ایک دوسرے کلیسا کے ذریعہ انجام پائے اور اپنے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے اس کے ساتھ تعاون عمل کیا جائے۔ وسط ہند کا تمام علاقہ اسکاٹلینڈ کے کلیسا کے سپرد کر دیا گیا ہے - چنانچہ 'اندور' کے قریب 'مئو' ایک مرکز بنایا گیا ہے اور وہاں کا کام ایک ہندوستانی شخص کے سپرد کیا گیا ہے جو پہلے پنڈت تھا اور اب عیسائی ہے - بھوپال اور بندیلکھنڈ کے علاوہ سندھیا اور ہلکر کی ریاستیں اسی مشن کے سپرد کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بہ نسبت دوسری دیسی

* Colonial Church Chronicle بابت مارچ سنہ ۱۸۷۲ ء -

زبانوں کے ھندی زیادہ مفید ثابت ھوگی - اسی وسیع علاقے میں ھندوستانی 'اردو' بھی بولی اور سمجھی جاتی ھے * —

اسقف ھند نے جب جنوبی ھند کا دورہ کیا تو وھاں بمقام کتاگم ( Cattagam ) سینٹ جان "سیرین کرسچین" لوگوں کے اسقف سے ملاقات ھوئی - ان کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ ھے - اس نے دن کی عبادت میں بھی شرکت کی - تمام حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ھے کہ کلیسا بھی بڑی خدمت انجام دے رھا ھے اور دیسی لوگوں کے دلوں سے اپنی تعلیم و تلقین کے ذریعہ توھمات کے دور کرنے میں ساعی ھے - اس کلیسا نے یہ اصول بھی تسلیم کرلیا ھے کہ اپنی عبادات میں دیسی لوگ اپنی مادری زبان حتی الامکان استعمال کریں —

گزشتہ ستمبر میں اسقف ھند کلکتہ سے روانہ ھو کر پنجاب پہنچے جہاں وہ مختلف علاقوں کا چار ماہ تک برابر دورہ کریں گے † —

چھوٹا 'ناگپور' کے علاقے کے متعلق جو رپورٹ شائع ھوئی ھے وہ ھر طرح قابل اطمینان ھے - سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس علاقے میں سات سو انیس اشخاص کا بپتسما ھوا جن میں پانچ سو سترہ ھندو تھے جو پہلے بت پرستی کیا کرتے تھے - ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں رانچی میں ایک کلیسا کا سنگ بنیاد رکھا گیا - وھاں عرصے سے ایک کلیسا کی ضرورت محسوس کی جا رھی تھی - عبادت بجائے اردو کے ھندی میں ھوتی ھے اور گریگری کا گیت بھی دعاؤں میں شامل کرلیا گیا ھے - عیسائی مزارعین

---

* یہ تفصیلات مجھے اسقف ملمیین کے اس خط سے حاصل ھوئیں جو موصوف نے اسکاٹلینڈ کو لکھا تھا - ملاحظہ ھو Colonial Church Chronicle - جون سنہ ۱۸۷۲ ع —

† Colonial Church Chronicle - اگست سنہ ۱۸۷۲ ع —

کی درخواست پر فصل تیار ہونے کے موقع کے لیے علحدہ دعائیں تیار کی گئی ہیں جن میں خدا سے التجا کی جاتی ہے کہ ان کی محنت اکارت نہ جائے - 'رانچی' میں مسیحی دینی علوم کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا گیا ہے لیکن ابھی اس میں طلبہ کی تعداد صرف پانچ ہے - گزشتہ فروری میں اسقف ہند نے رانچی میں ۲۶۲ دیسی لوگوں کو بپتسما دیا ' ایک مذہبی پیشوا اور مقرر کیا اور ۸۰ اشخاص کو عشاے ربانی سے سرفراز کیا * —

کشمیر میں دیسی عیسائیوں پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے جاتے ہیں - اس ریاست میں مسیحی مذہب کے ساتھہ رواداری کا برتاؤ نہیں کیا جاتا - گرمی کے موسم میں سرینگر کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے اور بہت سے یورپین تبدیل آب و ہوا کے لیے وہاں اس زمانے میں چلے جایا کرتے ہیں - گرمی کے موسم میں مسیحی مبلغین کو اجازت ہے کہ وہ سرینگر کی سڑکوں پر تلقین و وعظ کے لیے جلسے منعقد کریں - یہاں وعظ و تلقین اردو میں کی جاتی ہے —

میں نے اب تک پرتگیزی کلیسا کی نسبت کچھہ ذکر نہیں کیا - اس کے تعلقات کیتھولک کلیسا کے ساتھہ کشیدہ رہتے ہیں —

مدراس کے ریورنڈ راجگوپال نے یہ بات واضح کردی ہے کہ ہندوؤں کی موجودہ نسلیں اپنے بزرگوں سے بہت مختلف ہیں - اپنے بزرگوں کے عقاید کے خلاف ان میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنے کا رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے جو اس دنیا کا خالق اور اس کو محفوظ رکھنے والا ہے - دن بدن یہ حقیقت بھی ہندو لوگ تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ مسیحی

* Colonial Church Chronicle - ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع -

مذہب آسمانی ہے - اس کے متبعین کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے - نوجوان ہندوستانی ذات پات کی جکڑ بند سے اُکتا گئے ہیں اور اس جوے کو اپنے کاندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں - انہیں اپنے رسوم پر جو توہمات پر مبنی ہوتی ہیں' مطلق بھروسہ نہیں رہا - ہم اب یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ اب وہ زمانہ بہت دور نہیں رہا جبکہ سارا ہندوستان مسیحیت کے زمرہ میں شامل ہوجائیگا اور ہندو چلا اٹھے گا :—

" میں اپنے روحانی دیس سے دور گم کردہ راہ ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا - مجھے اس راستہ کا علم نہ تھا جو حقیقی مسرت کی منزل کی طرف جاتا ہے - لیکن خدا نے میری جلاوطنی پر ترس کھایا - اب وہی میرا راستہ ہے اور وہی میری منزل - اس سیدھے راستہ پر چل کر میں پھر کبھی نہیں بھٹکوں گا " * —

میں گزشتہ سال کے مقالے میں ریورنڈ چارلس فورسٹر کے انتقال پر ملال کے متعلق ذکر نہ کرسکا اس لیے کہ مجھے اس کی اطلاع بہت بعد میں موصول ہوئی - مرحوم Stisted کے پادری اور کینٹربری کے کلیسا کے واعظ تھے - ان کا انتقال ۱۰ اگست سنہ ۱۸۷۱ع کو ہوا - ان کی عمر انتقال کے وقت ۸۲ سال تھی - ان کی بیٹی اور ان کے عزیز دوست رچارڈ جب ( Richard Jebb ) ان کے پاس موجود تھے جب ان کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کی تو بقول شاعر : -

" مرتے وقت پختہ عقیدہ اس کی گھڑیوں کو مسرور کررہا تھا - اس کے بل پر انسان موت کی خوفناک قوت پر فتحمند ہو سکتا ہے " -

چارلس فورسٹر کے سات بیٹے تھے' حضرت یعقوب کی طرح' اور تین

* پیرس کی دعا ( Parisian Liturgy )

لڑکیاں تھیں - چار بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے اور بیوی کا بھی انتقال ہوگیا - تین لڑکیوں میں باپ کے انتقال کے وقت صرف ایک زندہ تھی - مرحوم کا ایک فرزند جب فورسٹر ' اپنے باپ کی طرح اینگلی کن کلیسا میں پادری کی خدمت انجام دے رہا تھا - اس کا سنہ ۱۸۶۸ ع میں انتقال ہوا - اس کے انتقال پر اس کی یاد میں جو کلیسا کے ایک اعلیٰ عہدہ دار نے خط لکھا ہے اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس معاشرہ میں ان خوبیوں کے اشخاص ہوں وہ کتنا بلند معیار رکھتا ہے - یہ خط مجھے لکھا گیا تھا - ذیل میں میں ناموں کو نکال کر اصل خط نقل کیے دیتا ہوں : —

۲۱ جون سنہ ۱۸۶۱ ع

پیرس

مکرمی -

آپ نے جو ڈاکٹر فورسٹر کا خط مجھے بھیجا وہ اس قدر دل پر اثر ڈالنے والا اور مسیحی جذبات سے معمور ہے کہ اس کو پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا - آپ کی اس توجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں - میں نے اور 'پ' نے اس کو ساتھ ساتھ پڑھا - ہم دونوں کے دلوں پر جو اثر مترتب ہوا وہ اس قسم کا تھا جو فطرت سے بالاتر کسی قوت کے ساتھ تعلق سے پیدا ہوتا ہے - آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ایسے لوگوں کا کلیسا کے زمرہ میں ہونا در اصل ہم سبھوں کے لیے باعث صد فخر ہے - اگر چہ مرحوم کا ویسے خارجی طور پر کلیسا سے تعلق تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو " روح کلیسا " کہا جائے تو درست ہوگا - سینٹ آگسٹائن کا قول ہے کہ خارجی طور پر کلیسا سے متعلق ہونا انسان کی

زندگی کو پاکیزہ بناتا ہے لیکن توفیق الہیٰ ایسے کلیسا کے بطن سے بھی روحانی اثرات پیدا کرسکتی ہے جو بالکل صحیح راستہ پر نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں کسے شبہہ ہوسکتا ہے کہ انگلی کن کلیسا کے ارکان کو وہ عقیدہ حاصل نہیں ہوتا جو نجات دلانے کا ضامن ہو لیکن بعض نہایت قابل احترام اشخاص کا بیان ہے جو ہمارے عقاید کو ماننے والے ہیں کہ اینگلی کن کلیسا کے بعض ارکان کے عقاید کے متعلق انہیں مطلق شبہہ نہیں ہوا کہ وہ راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ حضرت مسیح کے نام کی خاطر ہمیں اس بات میں مطلق تامل نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر فورسٹر اور ان کے لائق فرزند جیسے اشخاص کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کریں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں باپ زیادہ قابل تحسین ہیں یا فرزند۔ آپ کا خط پڑھنے کے بعد میرے اور 'پ' کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مرحوم کی یاد میں مقدس قربانی کی رسم پوری کریں گے۔ ہم نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تا کہ مرنے والے کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ باقی رہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں ایسے عالی مرتبہ احباب پیدا کیے جو مسیحی مقاصد کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے" —

چارلس فورسٹر نے متعدد ادبی یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ ممدوح نے دینیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ سینٹ جان کے متن کے متعلق بعض نہایت اعلیٰ درجہ کی تحقیقات شائع کیں۔ ان کی کتاب " قدیم زبان " (Primeval language) معرکۃ الآرا تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اسی طرح کوہ سینا کی تحریروں کے متعلق بھی بہت عرق ریزی سے کام کیا۔ ان کی دوسری مشہور کتابیں " عرب کا تاریخی جغرافیہ " Historical Geography

( of Arabia ) اور " اسلام بے نقاب " ( Mahometism Unveiled ) ہیں جنہیں مقبولیت حاصل ہوئی —

مرنے سے کئی ماہ قبل مرحوم کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی - آخری زمانے میں انہیں سب سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ آئرستان میں اینگلی کن کلیسا کو موقوف کیا جارہا ہے اور کہیں اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ اور دوسرے مقامات میں بھی کیتھولکوں کی مرضی کے مطابق اینگلی کن کلیسا کی بنیادیں کمزور ہو جائیں - ایسی صورت میں رومن کیتھولک کلیسا دنیا میں حاوی ہو جائے گا - وہ لوگ جو کسی مذہب کی صداقت میں یقین نہیں رکھتے وہ یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ حکومت جس کلیسا کی پشت پناہی پر تھی وہ کمزور ہو گیا - لیکن مرنے والے کے عقاید آخر دم تک غیر متزلزل رہے - اور وہ مشہور دعا کے الفاظ دہرا تا رہا :—

" اپنی امید کی سرگرمی قایم رکھتے ہوئے اپنے مسلک پر جما رہ - اس مسلک پر تیری نظر سے زیادہ تیرا عقیدہ تجھے ٹھیک راستہ پر رکھے گا - پھر تو دیکھے گا کہ جو وعدہ تھا وہ پورا ہوا - شام کے وقت تجھے روشنی نظر آئے گی " —

اس سال ( سنہ ۱۸۷۲ ع میں ) ہندوستان میں ایک نہایت انسوس ناک قتل کا حادثہ پیش آیا جو اسی نوعیت کا واقعہ ہے جو گزشتہ سال جج نارمن کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور جس سے سارے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی تھی - میری مراد ہے گورنر جنرل وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل سے - وہ جزائر انڈمان گئے ہوئے تھے تاکہ بہ نفس نفیس وہاں جو مجرم بھیجے جاتے ہیں ان کا حال معلوم کریں - درۂ خیبر کے ایک

باشندے نے جس کا نام شیر علی تھا جسے سنہ ۱۸۶۷ ع میں موت کی سزا کا حکم دیا گیا تھا لیکن بعد میں جلا وطنی بہ عبور دریائے شور کی سزا کا اس کے حق میں فیصلہ ہوا ' اس شخص نے خاندانی جھگڑے کے سلسلے میں ایک آدمی کو قتل کر ڈالا تھا - اس کو ۱۲ مارچ وائپر آئیلنڈ (Viper Island) میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا - جج نارمن کے قاتل عبدالله کی طرح شیر علی نے بھی اقبال جرم کیا اور کہا کہ کوئی اس کا شریک جرم نہ تھا - میں یہاں لارڈ میو کے سیاسی کارناموں پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا - صرف یہاں اتنا ذکر کروں گا کہ ہندوستانی لوگوں میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی بالکل اسی طرح جیسے لارڈ ولیم بنٹنگ اور لارڈ لارنس کو حاصل تھی - وہ ہندوستان میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا چاہتا تھا - اس نے ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیا میں بڑی ہمت افزائی کا رویہ اختیار کیا - عربی ' فارسی اور سنسکرت کے فروغ کے لیے اس نے ہر ممکن کوشش کی - میں نے اپنے پچھلے مقالے میں مسلمانان ہند کی جن شکایات کا ذکر کیا تھا انہیں رفع کرنے کی طرف بھی لارڈ میو نے توجہ کی تھی —

لارڈ میو ڈبلن میں سنہ ۱۸۲۱ ع میں پیدا ہوئے اور ٹرنیٹی کالج میں تعلیم پائی - یہ وہی کالج ہے جہاں آج کل میر اولاد علی جیسا عالم فاضل شخص عربی ' فارسی اور ہندوستانی کی تعلیم کے لیے مقرر ہے - لارڈ میو سنہ ۱۸۵۷ ع میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور سنہ ۱۸۶۸ ع تک رکن رہے جب کہ وہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل نامزد کیے گئے - ان کا تعلق ایک قدیم شریف خاندان سے تھا - ان کے پر دادا توام (Tuam) کے اسقف تھے اور دادا واٹرفورڈ اور لسمور کے اسقف

تھے - لارڈ میو کی تجہیز و تکفین بڑے تزک و احتشام سے ہوئی - لیڈی میو اس موقع پر موجود تھیں - اینگلی کن دعاؤں کے ساتھ کیتھولک کلیسا کے اعلیٰ عہدہ داروں کی دعائیں بھی سنائی دیتی تھیں - افسوس ہے کہ اس موقع پر اسقف ملمین دورے پر گئے ہوئے تھے اور کلکتہ میں موجود نہ ہونے کے باعث شرکت نہ کر سکے —

لارڈ میو کی جگہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوئے - سنہ ۱۸۵۹ ء میں موصوف نائب وزیر ہند کے عہدہ پر سرفراز تھے - ان کے بعد اس اہم خدمت پر سر اسٹرافرڈ نارتھ کوٹ اور پھر مسٹر گرانٹ ڈف مامور ہوئے - یہ دونوں میرے عزیز دوستوں میں ہیں —

میں مرنے والوں میں الگزنڈر گویلے من (Guillemin) کا ذکر کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں - وہ میرے پرانے دوست تھے - وہ مشہور وکیل ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور انہوں نے متعدد تصانیف بھی چھوڑی ہیں - ایک تصنیف کا نام "آسمان" ہے جس کا اردو میں ترجمہ لے پوئروِن (Le Pocr Wynn) نے کرنے کا ارادہ کیا تھا - الگزنڈر گویلے من کا انتقال پیرس میں ۳ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع کو ہوا - مرحوم نے ۸۳ سال کی عمر پائی —

تھیوڈر گولڈ سٹکر (Goldstucker) اپنے زمانے کے سنسکرت کے زبردست فاضلوں میں سمجھے جاتے تھے ۶ مارچ کو لندن میں یکایک ان کا انتقال ہوگیا - وہ سنہ ۱۸۲۱ ع میں کونگز برگ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں انہوں نے مشرقی زبانوں کی تحصیل کی - پھر وہ سنہ ۱۸۴۵ ع میں پیرس چلے آے - مجھے فخر حاصل ہے کہ میرے ہندوستانی زبان کے درسوں میں جو حضرات آتے تھے ان میں وہ بھی تھے اور ان کے علاوہ

سویڈن کے مشہور عالم کل گرن بھی تشریف لایا کرتے تھے جن کا سنہ ۱۸۲۹ ع میں انتقال ہوا * - سویڈن کی پارلیمنٹ کے مشہور رکن چارلس دے برگ ستڈ (Charlede Bergstedt) بھی میرے درسوں میں آیا کرتے تھے۔ اس وقت سے برابر گولڈ ستکر سے میرے تعلقات قایم تھے اور انھوں نے بارھا میرے ساتھ اپنی عنایت اور خلوص کا ثبوت دیا - وہ سنہ ۱۸۵۰ ع میں لندن چلے گئے جہاں ایچ ایچ ولسن سے انھیں بڑی مدد ملی - شہزادہ البرٹ سے بھی جو ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے' انھیں بڑی امداد ملی - بالآخر یونیورسٹی کالج میں وہ سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہوگئے - اس کے بعد انجمن لسانیات کے صدر اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن مقرر ہوے - اگرچہ انھوں نے ہندوستانی زبان پر زیادہ وقت نہیں صرف کیا لیکن وہ ان السنۂ ہند کے ماہروں میں سے نہیں تھے جو ہندوستانی زبان کو لچر پوچ تصور کرتے ھیں - انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سنسکرت زبان پر صرف کیا اور اس زبان کے متعلق جو تحقیقاتیں انھوں نے کیں ان کے باعث انھیں بڑی شہرت نصیب ہوئی - سنسکرت کی ضخیم لغت کا کام انھوں نے نامکمل چھوڑا جس میں وہ کئی سال سے منہمک تھے - ان کی تصنیف "سنسکرت کی صرف و نحو" بھی ابھی طبع نہیں ہوئی بلکہ قلمی شکل میں موجود ہے - ہمیں پوری توقع ہے کہ بہت جلد یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوگی اسواسطے کہ اس میں ہمیں یقیناً نئی معلومات ملیں گی - یہ فاضل شخص جوان مرا - لاطینی کے شاعر

---

* اس نو جوان محقق نے پروفیسر فلشر کے ساتھ مل کر ابن ملک کی صرف و نحو کا ترجمہ کیا تھا - اس کا ارادہ تھا کہ سویڈش ترجمہ کے ساتھ جرمن زبان میں بھی اس کو شائع کرے لیکن موت نے اس کی مہلت نہ دی -

نے علماء کے متعلق جو لکھا ہے وہ اس پر اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔
وہ کہتا ہے :—

"جو لوگ ذہنی کام میں انتہائی محنت کرتے ہیں ان کی عمر کم ہوتی ہے اور بوڑھاپے تک شاذو نادر ہی پہنچتے ہیں" —

کرنل فریڈرک لیارڈ کا اپریل کی ۲۷ تاریخ کو ۴۸ سال کی عمر میں بمقام وینس انتقال ہوگیا۔ ان کے بھائی آج کل اسپین میں حکومت انگلستان کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور میرے دوست مارکوئس آف بوٹے بھی آج کل اسپین میں ہیں۔ کرنل فریڈرک لیارڈ سنہ ۱۸۶۹ ع میں نواب بنگال کے ساتھ یورپ آئے تھے اور مجھے ان سے پیرس میں شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ مرحوم کا تعلق ایک قدیم فرانسیسی خاندان سے ہے جس نے انگلستان میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ یہ خاندان نانت کے احکام کے منسوخ ہوجانے کے بعد ترک وطن کرکے فرانس میں آباد ہوگیا تھا* ۔ کرنل فریڈرک لیارڈ بنگال کی فوج کے ایک صاحب حیثیت افسر تھے۔ ان کی قبل از وقت موت سے ان کا خاندان اور ان کے احباب سب متاثر ہوے۔ انگریزی حکومت کو اس قابل افسر کے انتقال سے سخت نقصان ہوا —

کرنل ڈبلو ایچ سائکس کا ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۲ ع ۸۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ سنہ ۱۷۹۰ ع میں پیدا ہوے اور سنہ ۱۸۰۴ ع سے سنہ ۱۸۳۱ ع تک

---

* یہ احکام هنری چهارم والیء فرانس نے سنہ ۱۵۹۸ ع میں جاری کیے جن کی رو سے پروٹسٹنٹ لوگوں کے شہری حقوق تسلیم کیے گئے۔ لوی چہاردهم نے سنہ ۱۶۸۵ ع میں پروٹسٹنٹ لوگوں کو ان حقوق سے محروم کردیا جس کی وجہ سے ان کے بہت سے خاندان دوسرے ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے (مترجم) ۔

بمبئی کے صوبے میں فوجی ملازم کی حیثیت سے کارگزار رہے - سنہ ۱۸۴۰ ع میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظما کے رکن بن گئے اور سنہ ۵۸ ع - ۱۸۵۷ ع میں مجلس نظما کے صدر مقرر ہوے - وہ ایبرڈین یونیورسٹی کے امیر جامعہ تھے اور ۱۵ سال سے برابر اس شہر کی طرف سے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے منتخب ہو رہے تھے - رائل سوسائٹی کے علاوہ اور دوسری علمی انجمنوں کے بھی رکن تھے - رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مجلس اعداد و شمار اور لندن کی مجلس فنون لطیفہ کے اجلاسوں کی صدارت بھی کرچکے تھے - ان کی تعلیم گہری اور متنوع ہوئی تھی - انہیں ہندوستانی زبان سے خاص لگاؤ تھا اور مجھ پر ان کی خاص نظر عنایت تھی ــــ

مدراس کے ہندوستانی زبان کے شاعر خواجہ محمد پادشاہ کا جن کا تخلص 'عبرت' تھا ۱۵ ربیع الاول مطابق ۲۲ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع انتقال ہوگیا - وہ " مظہرالاخبار " کے مالک اور مدیر تھے - ان کی موت کا ذکر کرتے ہوئے " اخبارعالم " کے مدیر نے ٹھیک کہا ہے کہ " انسان کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے جو سمندر کی سطح پر تھوڑی دیر کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے " ــــ

ٹیپوسلطان کے فرزند ارجمند غلام محمد نے ۱۲ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع ۷۰ سال کی عمر میں کلکتہ میں وفات پائی - شاہی خاندان کے اس فرد کے متعلق میں پہلے ذکر کرچکا ہوں اور اس کے اوصاف بیان کرچکا ہوں جن کا اعادہ غیر ضروری ہے - ان کی موت کا ہر شخص کو سخت افسوس ہوا اور بالخصوص وہ لوگ جو ان سے واقف تھے یا ان کی فیاضی سے مستفیض ہوئے تھے اس واقعہ سے سخت ملول تھے - لارڈ میو کے قتل کا مرحوم کو

بہت صدمہ ہوا تھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے —

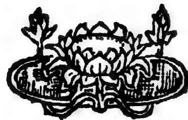
۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع کو میرے قدیم دوست ہومر اسمتھ کا لندن میں انتقال ہوگیا - وہ عرصہ تک بیت المقدس میں سفارت (قونصل) کے فرائض انجام دے چکے تھے - وہیں ان کے ایک فرانسیسی موسیو دے باریر کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات پیدا ہوگئے - انہیں یہودیوں کے مسائل سے خاص شغف تھا اور اس کے متعلق انہوں نے متعدد کتب تصنیف کی تھیں - ان کتابوں میں یہودیوں کے حالات، یورپ اور مشرقی ممالک میں ان کا پھیلنا اور چین تک پہنچنا، غرضکہ سب تفصیل یہودیوں کے متعلق دستیاب ہو سکتی ہے - اس تحقیق میں انہیں عبرانی زبان کی واقفیت سے بہت کچھ مدد ملی —

پنجاب کے پرانے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ کا ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع بمقام لندن ریل پر سے گر کر انتقال ہوگیا - وہ نہایت قابل ماہر نظم و نسق تھے اور ہیلی بری کے کالج کے قدیم طالب علم تھے - اسی کالج میں انہوں نے ہندوستانی زبان سیکھی تھی - وہ اس زبان پر اتنی قدرت رکھتے تھے کہ بلا تکلف گفتگو کرسکتے تھے —

ایڈون نارس (Edwin Narris) جو عرصے سے لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد تھے، اس جہان کو خیر باد کہہ گئے - ان کے انتقال سے نہ صرف مستشرقین کا ایک بڑا شخص کم ہو گیا بلکہ ایک محقق ہم میں سے جاتا رہا - اپنے علم و فضل کے ساتھ موصوف کے منکسرانہ اخلاق کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے - میرے تعلقات ان کے ساتھ ۴۰ سال سے تھے - وہ لسانیات کے متبحر عالم تھے اور ہندوستانی زبان میں بھی

ڈرک رکھتے تھے - مرتے دم تک وہ برابر "سریانی زبان کی لغت" کی تیاری میں مصروف و منہمک رہے - یہ ایک نہایت مہتم بالشان کام ہے جس کی وجہ سے ایڈون نارس کا اُس صدی کے بڑے فاضلوں اور محققین میں شمار کیا جائے گا - انھوں نے سر ہنری رالنسن کے ساتھہ اس کام کی ابتدا کی تھی اور سریانی زبان کی تحقیق کا کام ان کے ساتھہ شروع کیا تھا - دونوں نے مل کر لغت کا کام شروع کرنے سے قبل، پیکانی خطوط کی بعض تحریروں کے متعلق نہایت محنت سے تحقیقات شائع کی تھیں - یڈون نارس کی واقفیت دنیا کی مختلف زبانوں سے انسان کو تعجب میں ڈال دیتی تھی - انھوں نے ایشیا اور افریقہ کی بعض بولیوں کی صرف و نحو پر کتابیں لکھیں - ان بولیوں کے متعلق اس وقت تک اہل یورپ بالکل نا واقف تھے - انھوں نے انجیل مقدس کا تبتی زبان میں ترجمہ کیا اور کورنویل ( Cornouailles ) کی بولی میں ایک قدیم ناٹک کا ترجمہ کیا - انھوں نے ۷۷ سال کی عمر پائی - کچھہ عرصے سے ان کی صحت خراب ہو چلی تھی اور انھیں معلوم تھا کہ :—

" دن ، مہینے اور سال ختم ہونے والے ہیں - صرف ابدیت ہی کبھی ختم نہ ہوگی - وہ ہمیشہ ہمیشہ یوں ہی چلی جائے گی جس طرح ازل سے اس کی ابتدا ہوئی " —



# کالیداس کی "مالویکا"

از

(پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار لکچرار جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

کالیداس علم ہیئت کے ایک باکمال پنڈت اور سنسکرت زبان کے شاعر اعظم ہی نہیں تھے بلکہ علم رقص وسرود میں بھی بلند پایہ استاد تھے اور رقص کو اپنی فن کارانہ ذہانت کی مہارت کے ذریعہ بڑی نزاکت، شیرینی اور موسیقانہ جذبات کے ساتھ اسٹیج پر نمایاں کرسکتے تھے۔ اس کا پتہ ان کے "مالویکا گنئی متر" ناٹک کے مطالعہ سے چلتا ہے۔ کالیداس کی مالویکا انسانی باغ کی بہار کی وہ پرشباب، نازک ترین اور دل ربا پھول ہے جو اوپر سے نیچے تک نوشگفتہ، خوشبودار، رنگین حسین اور دلکش پھولوں کے کھلے پھلے محبت کی پرکیف ہواؤں کے لطیف جھونکوں سے دلوں کی محفل میں گونا گوں معنوں سے لبریز نغمہ ریز اور اشاروں بھرا ناچ ماہرانہ انداز میں کر رہی ہے۔ وہ ایسے حالات میں پیش کی گئی ہے جہاں صرف اپنی سریلی صداؤں سے اپنے دل کے اندرونی خفیہ جذبات پورے طور پر نمایاں نہیں کرسکتی۔ اس لیے وہ آنکھ، ہاتھ، پھر جسم کے ہر حصے کی جذبات انگیز اداؤں سے دل کی ساری کائنات کو ماہرانہ رقص کے اشاروں میں مجسم کردیتی ہے۔ کلام کا

خاتمہ دل کے اندرونی جذبات کو ظہور میں لانے اور بیدار کرنے ولے نغمہ پر ہوتا ہے ۔ اور جب انہیں جذبات آفریں کلموں کی بے انتہا سریلی لہریں اپنے آپ کو آنکھہ ، ہاتھہ ، پیر اور تمام جسم وغیرہ کی انداز بھری خاموش حرکات میں نمایاں کرنے لگتی ہیں تو رقص کا آغاز ہوتا ہے ۔ اسی رقص کی حسین مجسم شکل کالیداس کی " مالویکا " ہے ۔

* " ساھتیہ درپن " کے مصنف نے پر لطف کلام کو شاعری کے نام سے تعبیر کیا ہے ۔ لیکن شاعری ہی کیا ہر ایک روحانی فن کا پر کیف ہونا بے حد ضروری ہے ۔ کلام الفاظ کے مجموعے کا نام ہے جب اس مجموعے میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ شعر بن جاتا ہے ۔ تصویر لکیروں اور رنگوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب اس میں دل کے اندرونی جذبات جھلک اٹھتے ہیں تو وہ جاندار ہوجاتی ہے ۔ سنگیت (موسیقی) میں آواز کا میٹھا اور خوشگوار ارتعاش ہوتا ہے اور جب اس میں دل کے جذبات مل جاتے ہیں تو اس کے اندر انسان کا دل ویسے ہی چمکنے لگتا ہے جیسے بادل کے پانی کی بوندوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے قوس قزح نمودار ہوجاتی ہے ۔ رقص بھی آنکھہ ، ہاتھہ ، پیر اور تمام جسم کی جنبش کی اداؤں سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب اس میں اندرونی جذبات جھلکیاں دکھانے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کا دل خود باہر آکر اپنی فطرتی خاموش زبان میں اپنے آپ کو نمایاں کررہا ہے۔ شاعری میں جب تک جذبات کا رس نہو تو وہ صرف لفظوں کا کھیل ہی معلوم ہوتا ہے ۔ اگر تصویر میں جذبات انگیز انسانی دل کا جلوہ نہ

---

* سنسکرت ادب میں اس کتاب کو اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے ۔

ہو تو وہ صرف رنگ اور لکیروں کی بے جان شکل معلوم ہوتی ہے - اگر سنگیت میں انسان کے دل کے رس کا میل نہ ہو تو مٹھاس کے باوجود اس کا اثر دل کش نہیں ہوتا - اور اگر ناچ میں دلی جذبات کے رس کی جھلک نہ ہو تو وہ صرف جسم کی لرزش اور ایک قسم کی ورزش معلوم ہونے لگتی ہے - ''ساھتیہ درپن'' کے مصنف نے جس چیز کو رس کے نام سے یاد کیا ہے وہ اصل میں انسانی دل کے اندرونی جذبات کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے - جب یہی دل کے جذبات اپنے نام سے اصلی شکل میں لفظوں کے روپ میں نمایاں کرتے ہیں تو شاعری میں ایک ایسی چیز پیدا ہوجاتی ہے جو الفاظ سے بھی بالاتر ہوتی ہے - جیسے الفاظ اپنی بندشوں میں مقید کرتے ہوے بھی قید نہیں کرسکتے - تصویر کی لکیروں سے بنی ہوئی شکلوں میں جب یہ جذبات اپنے رنگ کو منعکس کرتے ہیں تو وہ لکیریں اپنے اندر اپنی حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں - سنگیت کے نغموں میں جب دلی جذبات کی لطیف لہریں اُٹھنے لگتی ہیں تو ان لہروں میں سمندر کی موجوں جیسی لاانتہائی کا نہلے لگ جاتی ہے اور جب رقص میں آنکھیں ' ہاتھ پیر ' لباس اور تمام جسم کی حیرت انگیز ادائیں دل کے اندرونی جذبات کو متحرک کردیتی ہیں تو اس ہر ایک متحرک انداز اور اشاروں میں بے انتہا جذبات کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے - دل کے جذبات پرور رس کے بغیر کوئی بھی حسن کارانہ چیز تھوڑی دیر کے لیے دل بہلائی کی چیز ہوسکتی ہے لیکن وہ کسی طرح ہماری زندگی کا ایک جیتا جاگتا عنصر نہیں ہوسکتی —

انگریزی زبان کے مشہور مصنف کارلائل نے اپنے ایک مقالے میں لکھا

ہے "موسیقی * دیوتاؤں کی زبان ہے"- یہ الفاظ اُسے اس لیے لکھنے پڑے کہ گانے والوں کو اکثر اعلیٰ سوسائٹی میں خاص عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا اور اس وجہ سے معزز لوگوں کی نظروں میں موسیقی کی اهمیت بھی بہت کم رہ جاتی ہے - سنگیت کو تو پھر بھی بہت کچھہ وقعت حاصل ہے لیکن ناچ کا ساتھہ ایسے ماحول سے ہوگیا ہے کہ اس کا نام سنتے ہی اعلیٰ طبقے کے لوگ، ایک دم ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں - رقص کو عزت کی نگاہوں سے دیکھنا تو در کنار اس کا نام سنتے ہی لوگوں کے دلوں میں ایسا تنفر آمیز تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جو بیان نہیں کیا جاسکتا - گویا یہ اس قابل نہیں کہ مہذب حضرات کے خیال میں بھی لایا جاسکے - شاعر اعظم کالی داس کو شاید اسی لیے ناچ کے استاد "گن داس † " کی زبان سے یہ کہنا پڑا کہ " رشی فرماتے ہیں کہ رقص دیوتاؤں کی آنکھوں کی سرور آگیں عید ہے "( یعنے دیوتاؤں کے لیے جشن شادمانی کا درجہ رکھتا ہے ) - اگر سنگیت دیوتاؤں کی زبان ہے تو ناچ دیوتاؤں کی آنکھوں کے لیے حسین اور عیش سامان عید ہے - اس سے زیادہ کالیداس جو کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے " بھگوان مہادیو خود رقص کیا کرتے ہیں "- اس طرح وہ رقص کی بڑی تعریف کرتے ہیں —

هندوستان میں جتنے "اُپ وید ‡" تھے ان میں ایک رقص کا بھی وید تھا - رقص کی اهمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کو وید کے مقدس نام سے موسوم کیا گیا - پھر اس وید کی تخلیق کیسے ہوئی ؟

---

* Music is the Language of gods.

† ناٹک کا ایک کردار - مالویکا کا استاد رقص -

‡ ایسی الہامی کتابیں جو چاروں ویدوں سے ملحق تھیں -

اس کے بارے میں سنسکرت کی کتابوں میں یہ لکھا ہے —

सर्वशास्त्रार्थसम्पन्नं, सर्वशास्त्रविचक्षणम्
नाट्यसंज्ञमिमं वेदं, सेतिहासं करोम्यहम् ।
एवं सकल्प्य भगवान्, सर्ववेदाननुस्मान्,
नाट्यवेदं ततश्चक्रे, चतुर्वेदाङ्गसंभवम् ॥

یعنی "میں تمام شاستروں کے معنی سے لبریز تمام فنون کو نمایاں کرنے والے علم رقص کی پورے تسلسل کے ساتھ تخلیق کرتا ہوں - اس طرح خدا نے بالارادہ تمام ویدوں سے رقص کا وید پیدا کیا - پھر علم رقص کا پھل کیسا شاندار ہے ... ... ...

جو ناچ دکھلاتا ہے اور جو بڑے انہماک سے دیکھتا ہے ان دونوں کو وہی رتبہ حاصل ہوتا ہے جو چاروں ویدوں کو جاننے والوں' هون کرنے والوں اور بڑے متخیر آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے - مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں رقص کو کتنی بڑی اہمیت حاصل تھی لیکن اس وقت علم رقص نہ صرف بہت کچھ مفقود ہوگیا ہے بلکہ اس کی اہمیت ہمارے ملک میں صفر کے برابر رہ گئی ہے —

کسی چیز کی لرزاں حرکت کی تصویر کوئی بڑا باکمال اور ماہر مصور ہی کھینچ سکتا ہے - اسی طرح ناچ اور اس کے اشاروں کو الفاظ کے جامے میں محسوس طریقہ سے پیش کرنا کسی باکمال شاعر ہی کا کام ہوسکتا ہے - مہا کوی کالیداس نے " مالویکا " کے ناچ کا اپنی زبان میں ایسا ٹھیک اور سندر نقشہ کھینچا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا مالویکا زبان کے روپ میں خود اسٹیج پر ناچ رہی ہے' بعض مغربی عالموں نے " مالویکا " ناٹک کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ یہ ناٹک اس

کالیداس کا نہیں ہوسکتا جس نے "رگھونش" "میگھدود" اور شکنتلا جیسی کتابیں لکھی ہیں - جو علماء "مالویکا" کو کالیداس کی تصنیف مانتے بھی ہیں وہ خود اسے ایک معمولی درجے کا ناٹک سمجھتے ہیں - ہندوستان کے بہت سے سنسکرت کے پنڈتوں نے بھی ان کی اس ہاں میں ہاں ملادی ہے - اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کالیداس کا پہلا ناٹک تھا اس لیے اگر اس میں ان کے قلم کی معجز نگار خاصیت نہیں پائی جاتی جو ان کی بعد کی لکھی ہوئی ناٹکوں اور شاعرانہ تصانیف میں پائی جاتی ہے تو کونسی تعجب کی بات ہے ؟ پروفیسر رائڈر (Prof. Ryder) اس ناٹک کو کالیداس کا لکھا ہوا مانتے ہیں لیکن وہ اسے کچھہ خاص اہمیت نہیں دیتے - وہ لکھتے ہیں کہ "اس * ناٹک کے پلاٹ میں کوئی اپچ نہیں ہے اور نہ اس میں جذبات کی گہرائی پائی جاتی ہے" - ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان عالموں نے کس طرح مذکورہ بالا باتیں لکھہ ڈالیں؟ اس ناٹک میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو کالیداس کی دوسری تصانیف میں پائی جاتی ہیں - بھلا کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سورج کی کرن ہو اور وہ پہچانی نہ جائے کہ وہ سورج کی ہے؟ اور پھر اس میں وہ روشنی نہ ہو کہ اس کے سامنے دنیا کی ساری تجلیاں پھیکی نہ پڑجائیں ؟ - اس ناٹک میں کالیداس کا وہی اسلوب بیان وہی ' استعاروں بھری میٹھی میٹھی چٹکیاں ' وہی اندرونی جذبات کی لطافتیں اور موسیقی بھرے سادہ الفاظ کی تصویریں اور وہی حسن کارانہ سرور پایا جاتا ہے جو صرف اُنھی کے کلام میں حاصل ہوتا ہے - اس ناٹک کے کئی مصرعے زبان زد خلائق ہو کر

* The Priey

آمر ہوگئے ہیں —

آج ہمیں جو چیز بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے صرف اس لیے کہ وہ بہت عام ہوگئی، اور اس میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی وہی چیز پہلے پہل جب انسانی دلوں کے سامنے آتی ہے تو اس میں کتنا نیاپن اور وہ کس قدر حیرت خیز ہوتی ہے! آج مغربی علما اس ناٹک کے جس انداز بیان میں کسی قسم کی جدت محسوس نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ تو صرف رسمی ہے وہی جب پہلے پہل اہل بصیرت کے آگے آئی ہوگی تو اس میں نہ صرف غیر معمولی جدت بلکہ قوت تخیل کی نزاکت کا حیرت انگیز سراغ ملا ہوگا۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کی پلاٹ کو شاعر نے کسی دوسرے ناٹک سے یا کسی دوسرے ماخذ سے تو حاصل نہیں کیا۔ اگر اس نے پلاٹ کو کہیں لیا ہے تو تب اسے رسمی کہا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ تمام اس کے ذہن کی پیداوار ہے تو اس کا رسمی ہونا اس پلاٹ کی خوبی کو ثابت کرتا ہے۔ ادبی تنقید کرنے والے بہت کھوج کرنے کے بعد بھی اس کا پتہ چلا سکے کہ اس کہانی کا ڈھانچا شاعر نے کہاں سے لیا ہے۔ بعض نے اس میں تاریخی واقعات کا پتا لگایا ہے لیکن یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کا پلاٹ شاعر نے کہاں سے لیا ہے۔ کالیداس نے اپنے دوسرے ناٹکوں کی کہانیوں کے خاکے پرانوں اور مہابھارت سے لیے ہیں۔ اگر اس ناٹک کی بنیاد تاریخی واقعات کو مان لیا جائے تو اس میں یہ بھی ایک نئی بات ثابت ہوگی۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اس ناٹک کے خاکے کا تخیل شاعر کا اپنا ہے اور اس کا رسمی ہوجانا ثابت کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی ہے۔ پھر اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ

شاعر نے اس پلاٹ کو اپنے پیشروؤں سے حاصل کیا ہے تو بھی ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس نے اپنی ذہانت سے اس کے اندر کوئی اپج پیدا کر کے اسے اپنا تو نہیں بنالیا ہے! لکھنے کے موضوع عام طور پر وہی ہوتے ہیں' وہی چیزیں ہوتی ہیں' وہی پلاٹ ہوتے ہیں لیکن یہ مصنف کا ذاتی اسلوب نگارش ہوتا ہے جو اس کے احساسات کو نمایاں کرتا ہے اور اس کا دل' اس کی حسن کارانہ گہری ذہانت ہوتی ہے جو اس میں دلکش جدت پیدا کردیتی ہے اور موضوعات کو اشیا کو اور پلاٹ کو ہر طرح سے شاعر ہی بنادیتی ہے —

اس ناٹک میں دو بڑے پنڈتوں کا ایک دوسرے سے علم میں اپنے کو بڑا ثابت کرکے دکھانے کا نظارہ ' بسنت کے دنوں میں "اشوک" درخت کو کنواری لڑکیوں کے ٹھوکر مارنے کا اور اس درخت کی ٹہنیوں پر فوراً پھولوں کے نکل آنے کا اور خود ٹھوکر لگانے والے نازک پیروں کا سنگار کرنے کا سماں' اراوتی کے حسد بھرے دل کا نقشہ' راجہ اگنی سترِ کی چال بازانہ جھینپ' مسخرے کی ظرافت آفریں ذکاوت اور باریکی اور آخر میں رانی کا خود ہی "مالویکا" کو شادی کے لیے پیش کرنا' یہ تمام مناظر بڑی فن کاری سے کھینچے گئے ہیں - آخر میں رانی کا خود ہی "مالویکا" کو بیاہ دینا شاعر بہاری لال کے اس دوہے کی یاد دلا دیتا ہے —

"ساس * نہ ہو منہ دکھ راونی دل ہنسنی کری انو راگ"
ساس سدن من للن بہنوں سوتن اے سہاگ "

* گویا رونمائی کی رسم میں دلہن کی ساس نے گھر تحفتاً دیا' شوہر نے اپنا دل اور سوت نے اپنا سہاگ پیش کیا!

یہاں (منہ دکھ راونی) رونمائی میں نہیں لیکن اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لیے رانی اپنے سہاگ کو مالویکا کی نذر کردیا ہے —

لیکن سارے ناٹک میں ہمیں سب سے سندر سین دوسرے ایکٹ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس سین میں شاعر نے "مالویکا" کے ناچ کا مظاہرہ کرایا ہے۔ یہ سین اس قدر دلکش ' اتنا حیات آفریں اور پھر اس میں اتنی حیرت میں ڈالنے والی جدت طرازی ہے کہ اسے جتنی دفعہ پڑھا جائے اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ ناچ مطالعہ کرنے کی چیز نہیں اگرچہ کالیداس نے اِسے اپنی گہری فن کاری سے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ جب وہ ناچ آنکھوں کے سامنے اسی متحرک انداز میں آجائے تو یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ کالیداس نے اس ناٹک کے اندر دیوتاؤں کے دیکھنے کے قابل کیسی حیرت انگیز چیز پیدا کر دی ہے۔ ہمیں تو کئی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر نے اسی منظر کو خاص طور پر پیش کرنے کے لیے اس ناٹک کو تیار کیا ہے۔ شاید دوسرے ایکٹ میں مالویکا کے رقص کو دیکھنے کے بعد شاعر خود مسخرے کی زبان سے کہہ رہا ہے *—

" न केवलं रूपे शिल्पेऽप्याद्वितीया मालविका "

راجہ اگلی متر "مالویکا" کے ناچ کو دیکھ کر کہتا ہے —

" अव्याजसुन्दरीं तां विज्ञानेन ललितेन योजयत
परिकल्पितो विधात्रा बाणः कामस्य विषदग्धः "

"اس سادہ حسین دوشیزہ کے ساتھ فن لطیف (موسیقی اور ناچ) کو ملا کر خدا نے گویا 'کام دیو' کے پھولوں سے بنے ہوئے تیر کو

* "مالویکا" صرف حسن ہی میں نہیں بلکہ ناچ گانے میں بھی بے مثال ہے!۔

زهر * میں بجها هوا بتا دیا هے پهولوں کا تیر اور وہ بهی زهر میں بجها هوا !
" مالویکا " کا اس سے سندر بیان نہیں هو سکتا - آج کل هم اکثر پڑهتے هیں
کہ کسی ناٹک کی ایکٹرس یا رقاصہ سے کسی بڑے اور مالدار آدمی نے
اس کے بے مثال حسن اور کمال فن پر فریفتہ هو کر شادی کر لی هے '
اگنی متر جیسے مہاراجہ کے ایک رقاصہ سے اس کے بے نظیر حسن اور
رقص پر فریفتہ هو کر شادی کرنے کے لیے بے چین هو جانے کی تصویر جو کالیداس
نے اپنے اس ناٹک میں پیش کی هے گویا راجہ کی عظمت سے شاعر نے
رقص کی عظمت پر مہر لگا دی هے - اگر چہ بعد کو پانچویں ایکٹ میں یہ معلوم
هو گیا هے کہ " مالویکا " راج گهرانے کی هے تو بهی راجہ نے اس کا علم
هونے سے پہلے هی اپنے دل اور دماغ کو اس کی نذر کر دیا تها —

معلوم هوتا هے کہ هندوستان میں برار کا علاقہ حسن خوبی اور فن آفرینی
میں کسی زمانے میں ضرور مشہور رها هوگا - راجہ " نل " کی بیوی " دمینتی "
نے اسی ملک میں جنم لیا تها - مہاراج سری کرشن کی بیوی " رکمنی " بهی
اسی علاقے میں پیدا هوئی تهیں - راجہ رام چندر کے دادا " اج " کی
بیوی " اندومتی " بهی اسی دیس کی تهی - کالیداس کی مجسمہ یعنی
یہ " زهر بجها پهولوں کا تیر " بهی اسی ملک کی رهنے والی تهی - کئی شخص
مالویکا نام سے یہ مطلب نکالتے هیں کہ وہ شاید " مالوہ " کی رهنے والی
تهی لیکن یہ ٹهیک نہیں - پانچویں ایکٹ میں صاف طور پر یہ پتہ چل
جاتا هے کہ مالویکا برار کے راجہ کے چچا کی بیٹی تهی - پهر اسی آخری

---

* " زهر میں بجها هوا پهولوں کا تیر " یہ الفاظ کتنے لطیف جذبات سے بهرے هوئے هیں
جو کالیداس هی ادا کرسکتے تهے - شاعر بہاری لال کی شاعری کو " ناوک کے تیر " کہا جاتا هے -
کالیداس کے اشعار کو زهر بجهے پهولوں کے تیروں سے تشبیہہ دینا بالکل مناسب هو گا -

ایکٹ میں " مالویکا کا سنگار بھی برار دیس کے رسم و رواج کے مطابق کیا گیا ہے - اس بیان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگار میں کچھ خاص رونق تھی - پانچویں ایکٹ میں مسخرہ راجہ سے کہ رہا ہے کہ رانی نے پنڈتا کوشکی سے کہا -

" भगवति ! यत्वं प्रसाधनगर्वं वहासि तद्दर्शय

मालविकायाः शरीरे वैदर्भं विवाहनेपथ्यम् ।

तया च सविशेषालङ्कृता मालविका "

" شریمتی جی آپ کو اگر سجانے اور سنگھار کرنے کا بڑا گھمنڈ ہے تو " مالویکا " کو برار دیس کی ریتی سے شادی کے کپڑے پہنا کر سجا کر دکھلاؤ " - چنانچہ اس نے بڑی تزئین کے ساتھ " مالویکا " کا سنگار کیا - اس کی توضیح کرتے ہوئے راجہ " کاٹ یویم " لکھتا ہے کہ برار کے علاقے کے رہنے والوں کا سنگار سجانے کا طریقہ مشہور ہے - اس کے سوا سنسکرت زبان میں لکھنے کے ایک اسلوب کو " براری اسلوب " کہتے ہیں - اس اسلوب کی تعریف ساہتیہ درپن کے مصنف نے یوں کی ہے -

माधुर्यव्यञ्जकैर्वर्णैः रचना ललितात्मिका

अवृत्तिरल्पवृत्तिर्वा वैदर्भी रीतिरिष्यते ।

شیریں اور سادہ الفاظ نیز چھوٹے چھوٹے جملوں والی عبارت کو " براری اسلوب " کی تحریر کہتے ہیں - شاید سنسکرت کے اس اسلوب نگارش کا وجود بھی برار سے متعلق ہے -

برار کے علاقے کی اس حور تمثال دوشیزہ کے رقص کا منظر دوسرے ایکٹ میں بڑی خوبی سے دکھلایا گیا ہے - پنڈال ( ناٹک گھر ) میں ایک جانب راجہ، مسخرہ، رانی اور اس کا خاندان بیٹھا ہوا

ہے اور دوسری طرف باجا بج رہا ہے اور رقص کے دونوں استاد جنہیں شاعر "جذبات مجسم" کہتا ہے، موجود ہیں - رقص کا امتحان لینے کے لیے تارک دنیا سنیاسن پنڈتا "کوشکی *" کو حکم بنایا گیا ہے - سنیاسن کو ناچنے کا حکم چن کر گویا شاعر نے ناچ کی معصومیت کو ثابت کر دیا ہے - دونوں رقص کے استاد اپنے شاگرد کے ذریعہ یہ دکھاتے ہیں کہ وہ رقص کے کتنے بڑے ماہر ہیں - اس رقص کے لیے جسم کے اعضا کے سڈول ہونے، اُن میں خوش گوار تناسب، لوچ اور خوشنمائی کی ضرورت بتلائی گئی ہے - علم رقص میں سے "چلت" نام کے رقص کی نمائش کی جاتی ہے کیونکہ "چلت" ناچ ہی سب سے زیادہ مشکل سمجھا جاتا ہے -

---

* سنیاسن پنڈتا کوشکی کو بہت سے محققوں نے بدھ بھکشن (Budhist nun) لکھا ہے - بہت کھوج کرنے کے بعد بھی ہمیں یہ پتا نہیں چلا کہ یہ خیال کس طرح پھیل گیا - اس سارے ناٹک میں پنڈتا کوشکی کے کردار سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ وہ بھکشن تھی - اس نے ایک بار بھی کہیں بدھ بھکشنوں کی طرح بدھ کا نام نہیں لیا - لیکن دوسرے سنسکرت کے ناٹکوں میں جب بدھ بھکشو آتا ہے تو وہ بدھ کو سلام کرتا ہوا اور اس کی مدح کرتا ہوا نمودار ہوتا ہے - بدھ بھکشو پراکرت میں بولتے ہیں لیکن یہ سنیاسن ہمیشہ سنسکرت زبان میں بولتی ہے - کالیداس نے کوشکی کو "آریہ کوشکی" "پنڈتا کوشکی" اور "مجسم روحانی علم" جیسے با عزت ناموں سے یاد کیا ہے - اس ناٹک کے شارح راجہ "کاٹے دیوم" نے بھی اپنی شرح میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ بدھ بھکشن تھی -

پانچویں ایکٹ میں پنڈتا کوشکی نے جب اپنا پورا تعارف کرایا ہے تو اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ مجھے اپنے بڑے بھائی "آریہ سومتی" کی موت سے بڑا صدمہ پہنچا اور میرے دل میں اپنے بیوہ ہونے کا دکھ پھر جاگ اٹھا - اس لیے میں نے دنیا کو ترک کر کے بھگوے کپڑے اختیار کر لیے ہیں - کوشکی نے کبھی یہ نہ کہا کہ وہ بدھ ہوگئی ہے - صرف گیروے کپڑے پہننے سے یہ قیاس قایم کرنا کہ وہ بدھ ہو گئی تھی ؛ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ ہمارے ہاں سنیاسی اسی رنگ کے کپڑے پہنتے تھے اور سنسکرت کی کتابوں میں بیوہ عورت کو "گیروے کپڑے پہننے والی" کہا گیا ہے - ہمیں کوشکی کے تمام کردار کا مطالعہ کرنے سے کہیں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بدھ بھکشن تھی - ہماری رائے میں یہ تنقید نگاروں کی خیال آرائی ہے -

اس ناچ میں ناچنے والا اپنے جسم، زبان، کھڑے اور یہاں تک کہ پسینے وغیرہ کی کیفیت سے اور اشاروں سے دوسروں کے دلی جذبات کو نمایاں کرتا ہوا اپنے اندرونی جذبات کو پیش کر دیتا ہے - اس کو سنکرت زباں میں "جھلک" بھی کہتے ہیں - مالویکا نے اسی "چلت" ناچ کو ناچ کر دکھایا ہے -

ناچ سے پہلے وہ ایک چھوٹا سا تعارفی گانا گاتی ہے - اس کے بعد اصلی ناچ والا گانا شروع کرتی ہے —

" दुर्लभः प्रियतास्मिन् हृदय भव निराशम्,
अहो अपाङ्गको मे स्फुरति किमपि वामः ।
एष स चिराद् दृष्टः कथमुपनेतव्यो,
नाथ मां पराधीनां त्वयि गणय सतृष्णाम् ॥ "

مالویکا نے سنسکرت کا بلکہ پراکرت زبان کا گیت گایا ہے - ہم یہاں اس کا ترجمہ جو شاعر نے خود سنسکرت زبان میں کیا ہے، پیش کرتے ہیں - اس کا ترجمہ یہ ہے "پیارے کا ملنا کٹھن ہے: اس لیے اے دل تو نراس ہو جا - ہیں! یہ میری * بائیں آنکھہ کیوں پھڑک رہی ہے؟ میں نے اپنے پیارے کو بہت دنوں پہلے دیکھا تھا - اس کے پاس کیسے جاؤں - اے ناتھہ میں پرادھین ہوں (پرادھین کے معنی اپنے آپ پر قدرت کا نہ ہونا ہے) میں تمہارے پاس نہیں آسکتی لیکن تم تو مجھے اپنی چاہنے والی ہی سمجھنا!" —

* سنسکرت میں ایک علم" ہے جس کا نام " شگون کا علم " ہے - اس میں لکھا ہے کہ عورت کی بائیں آنکھہ اور مرد کی دھنی آنکھہ کا پھڑکنا بہت مبارک ہوتا ہے اسی طرح عورت کا بائیں ہاتھہ اور مرد کے داھنے ہاتھہ کا پھڑکنا بھی مبارک ہے -

اس کے بعد وہ اپنے ناچ میں اس گیت کے تاثرات کو دکھاتی ہے۔
ہم نہ تو سنگیت کو جانتے ہیں اور نہ ناچ کو' لیکن اس نظم کی ترکیب
کچھ ایسے الفاظ میں ہوتی ہے کہ ہمیں اس میں ناچ جھلکتا ہوا معلوم
ہوتا ہے جو مالویکا نے ناچ کے دکھایا ہے۔ اس گیت کی پہلی سطر میں
نراشا ہو رہی ہے' دوسری سطر میں ایک دم آشا پھوٹ رہی ہے اور
تیسری سطر میں ملنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور لاچاری سامنے آتی ہے'
اس پر بھی وہ اپنی چاہ کے درشن کرادیتی ہے! ان متغیر جذبات
میں معلوم ہوتا ہے کہ مالویکا نے اپنے ناچ سے ہم آہنگی پیدا کرلی ہوگی۔
اس ناچ کی تنقید پنڈتا کوشکی کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناچ
کی تشریح اور اس کے حقیقی اصول کی توضیح کرتے ہوئے شاعر نے
"مالویکا" کے اس سندر ناچ کی تصویر کو لفظوں میں اُتار دیا ہے۔
نیتاسن پنڈتا کوشکی کہتی ہے —

"अङ्गैरन्तर्निहितवचनैः सूचितः सम्यगर्थः,
पादन्यासो लयमुपगतस्तन्मयत्वं रसेषु ।
शाखायोनिर्मृदुरभिनयस्तद्विकल्पानुवृत्तौ,
भावो भावं नुदति विषयाद्रागबन्धः स एव ॥"

"آنکھ ہاتھ پیر وغیرہ جسم کے اجزاء نے جن کے اندر زبان سمائی
ہوئی تھی (جو اشاروں کی زبان سے بول رہے تھے) دل کے جذبات کو
اچھی طرح نمایاں کردیا۔ پیروں کی ضربیں لے کی بالکل ہم آہنگ تھیں۔
اور جیسے جذبات تھے ویسی ہی اس کی اداکاری تھی۔ یعنی وہ جن
جذبات کو ناچ کر دکھاتی تھی انہی کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھوں
کا تھرکنا نہایت نازک تھا اور جیسے جیسے ایک جذبہ کے بعد دوسرے

جذبے کا ناچ ہوتا تھا تو وہ دوسرا جذبہ پہلے کی جگہ بالکل قدرتی طور پر مجسم ہوجاتا تھا- ہر ایک جذبہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ناچ کے اشاروں میں جلوہ دکھاتا تھا- لیکن دل کی لذت اور خوشی کا وہی عالم تھا، یعنی جدا جدا اداؤں میں فرق تو پڑجاتا تھا لیکن دل یکساں طور پر محظوظ ہوتا جاتا تھا- پہلے جذبے کے ناچ میں دل جس قدر لذت اور حظ محسوس کرتا تھا ویسے ہی دوسرے جذبات سے لذت اندوز ہو رہا تھا- "مالویکا" نے اپنے جسم کے اجزا کی حرکت سے دل کے جذبات کا کیسا اچھوتا ناچ ناچا ہے!"—

مذکورہ بالا اشلوک کے پورے اور ٹھیک ٹھیک معنی تو علم رقص کا کوئی استاد ہی سمجھ سکتا اور سمجھا سکتا ہے لیکن اتنا تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ جس ناچ کا پنڈتا کوشکی نے ایسا بے مثل بیان دیا ہے وہ خود عملی شکل میں کتنی گہرائی سے اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا ہوگا- اس اشلوک میں کالیداس نے خود رقص کی جیتی جاگتی ناچ کرتی ہوئی تصویر پیش کردی ہیں- ویسے تو ہر ایک ناٹک میں ناچ ہوا ہی کرتے ہیں لیکن ناچ نہ صرف بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں بلکہ ان سے لوگوں کے مذاق پر برا اثر پڑتا ہے- ان ناچوں میں بہت ہی کم ایسے ناچ ہوتے ہیں جنہیں علم رقص کے کسی دور کے معنوں میں بھی کھینچ کھانچ کر رقص کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے- ایسے ہی ناچوں سے تہذیب یافتہ طبقوں میں ناچ وہ درجہ حاصل نہ کرسکا جو دوسرے فنون لطیفہ کو حاصل ہے- ان ناچوں میں صرف جسم کا ہی ناچ ہوتا ہے، دل کے جذبات کے ناچ کی اداکاری نہیں ہوتی- "مالویکا" کے اس ناچ میں اور اُن ناچوں میں وہی فرق ہے جو خالی تک بندی

اور جذبات سے بھری شوریں اور موسیقی سے لبریز شاعری سے ہوتا ہے -
یہ وہ ناچ ہے جسے دیکھ کر دیوتاؤں کی آنکھیں بھی ستایش کریں گی -
صرف ہاتھوں کی حرکت اور پازیب کی چھم چھم اور اس کے ساتھ
سریلے سروں میں گا دینا ہی ناچ نہیں، جب تک ہاتھوں کی حرکت،
پازیب کی جھنکار میں دل کے اندرونی جذبات متحرک ہو کر چھما چھم
نہ کرنے لگیں تب تک اس قسم کے ناچ سے شاید کچھ تھوڑی بہت
دل بہلائی ہوجائے تو ہوجاے لیکن اس کا کچھ خاص دیرپا اور گرویدہ
کرنے والا اثر نہیں پڑسکتا - جذبات سے خالی ناچ ایک قسم کا دل بہلانے
والا جسمانی کھیل ہوسکتا ہے لیکن اس میں دل کے اندرونی جذبات
ملے ہوئے نہیں ہوتے اس لیے وہ زندگی پر کوئی لطف اور حیات پرور
اثر نہیں ڈالتا - ایسا ناچ انسانی زندگی کے دل کا جز نہیں بن سکتا -
اس ناٹک میں مالویکا کا ناچ کچھ تھوڑے سے لمحوں کے لیے دل کو
بہلانے والی چیز نہیں ہے بلکہ وہ انسانی زندگی کے اندرونی جذبات
کے اظہار کی ایک، حقیقت ہے جو خود انسانی زندگی کی طرح طلسماتی،
عظیم الشان اور ہمیشہ زندہ رہنے والی شے ہے - بعض ناٹکوں میں کسی
خاص خیال کو یا پر جذبات واقعہ کو آہستہ آہستہ مکمل کیا جاتا ہے
اور اس تدریجی تکمیل میں ہمیں اس کی اندرونی خصوصیات کا
علم ہوتا ہے - لیکن کئی ایک ناٹکوں میں کسی ایک سین کو خاص اچھوتے
پن سے دکھا دیا جاتا ہے اور وہی اس ناٹک کی جان ہوتی ہے - یہ بات
سچ ہے کہ اس "مالویکا" ناٹک میں شاعر نے ناٹک کے آخر تک اندرونی
محبت کہ جذبے کے اظہار کے سوا اور کسی خاص خیال کو اس پریم
کے ساتھ شروع سے آخر تک نہیں دکھایا ہے - اسی لیے شاید بہت سے

تلقین کرنے والے اس ناٹک میں کسی انسانی جذباتی خصوصیت کو محسوس کرنے میں قاصر معلوم ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی اس ناٹک کے دوسرے ایکٹ میں کالیداس نے "مالویکا" کے اچھوتے ناچ کی جس قابل قدر فن کاری سے نمایش کی ہے وہ بیان کرنے کی نہیں بلکہ دیکھنے کی ہی چیز ہوسکتی ہے - وہ دیوتاؤں کی آنکھوں کا نشاط افروز جشن ہے - اگرچہ اس ناچ کی لفظی تصویر بھی کالیداس نے ناچ کو بیان کرتے ہوے مجسم شکل میں آنکھوں کے سامنے رکھہ دی ہے - تاہم اس سے اس کی خوبیوں کا کافی اندازہ نہیں ہو سکتا - پورے طور پر تو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اسے عملی طور پر دیکھا جائے - علم رقص میں تو ناچ کو عملی طور پر پیش کرنے ہی کی اہمیت ہے - اس لیے اس ناچ کی قیمت کو کامل طور پر سمجھنے کے لیے ناٹک میں اس سین کو پڑھ لینا کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا - اس کی خصوصیت، اس کا کامل اچھوتا پن تب ہی معلوم ہو سکتا ہے جب کہ یہ سین آنکھوں کے سامنے شاعر کی بیان کی ہوئی صورت میں رقص کرنے لگے اور تب یہ ایک ہی سین اس ناٹک کی اس لطف آفریں عظمت کو دکھا سکتا ہے جو سنسکرت زبان میں کالیداس کے سوا شاید ہی کوئی اور شاعر دکھا سکے! اس ایکٹ کو پڑھنے سے ہندوستان میں علم رقص کی عظیم الشان تکمیل کی ایک حسین جھلک آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہی جھلک کالیداس کی "مالویکا" معلوم ہوتی ہے —



# معزز الفاظ کی توہین

## اردو زبان میں

## از

(جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پت)

قوموں کی ترقی و تنزل اور عروج و زوال کے اسباب و محرکات پر غور کرنے والے اور ملکوں کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ کے ماہر اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کوئی قوم بام عروج سے پستی کی طرف گرنی شروع ہوتی ہے تو اُس کی ہر حرکت اور اُس کے ہر قول میں عام طور پر دنائت ' کمینگی اور سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے - اُس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں - اس کی مالی حالت بدتر ہو جاتی ہے - اس کی جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے - اس کی اولوالعزمی اور ہمت جاتی رہتی ہے - علم کا شوق اس میں باقی نہیں رہتا - زمانہ بھر کی بدکاریاں' بدتمیزیاں اور بیہودگیاں اس میں آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتی ہیں - اور سب سے زیادہ بول چال اور زبان اس قدر خراب ہو جاتی ہے جس کی انتہا نہیں - بات بات پر مردوں کا گالیاں بکنا اور عورتوں کا کوسنے دینا اس قوم کا روز مرہ کا معمول ہو جاتا ہے - اور پھر گالیاں بھی اتنی فحش اور گندی کہ ایک سنجیدہ آدمی تو ان کو سن کر لرز اٹھے - یہ دیوانگی یہاں تک بڑھتی ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر اس قسم

کے وحشی انسان جانوروں یہاں تک کہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی متعفن گالیاں دیتے ہیں کہ آدمی سن کر حیران ہو جائے - مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ میں نے بوڑھے بوڑھے مہذب انسانوں کو اپنے لڑکوں اور دوسرے کے بچوں کو نہایت پیار میں "بدمعاش" کہتے سنا ہے - اور جو سچ پوچھو تو یہ بھی بہت ہی معمولی لفظ ہے - سامعین میں سے سیکڑوں اصحاب نے لوگوں کو محض پیار میں اپنے شیرخوار بچوں اور گرد میں کھیلنے والے لڑکوں کو بہت بڑی بڑی گالیاں دیتے دیکھا اور سنا ہوگا - اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری گالیاں کھاتے کھاتے اور سنتے سنتے ہمارا معصوم لخت جگر خود بھی اپنے ہمجولیوں کو گالیاں دینے لگتا ہے - اب چونکہ ہمارا بویا ہوا درخت پھل لانے لگتا ہے لہذا ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی - بہت سی مائیں اس بات کی آرزو کیا کرتی ہیں کہ ہمارا ننھا کب بڑا ہو اور کب وہ باہر سے کسی بچے کو گالیاں دے کر آئے اور ہمارا دل ٹھنڈا ہو - اور درحقیقت وہ دن ماں کے لیے عید کا دن ہوتا ہے - اس سلسلہ میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والد بزرگوار بڑے شوق سے بیٹے کو سکھا رہے ہیں کہ " ہاں بیٹا! اپنی ماں کو یہ گالی دو " - اور جب بچہ اپنی توتلی زبان میں باپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو سارا گھر مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتا ہے - بچے کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے بار بار وہی گالی ماں کو دلوائی جاتی ہے - انصاف اور غور کیجیے کہ اس سے زیادہ اخلاق کو تباہ کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

معاملہ صرف اسی حد تک نہیں رہتا بلکہ ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور زبان کے وہ الفاظ جو نہایت مقدس و متبرک یا بیحد معزز اور

محترم تھے آج کل ہم نے اُن کو ایک نیا لباس پہنایا ہے - جس کے بعد ان لفظوں کی شکل بالکل مسخ اور برعکس ہوگئی ہے - اور ہمارے اخلاق کی خرابی اور مذاق سلیم کی بدذوقی کی وجہ سے جو لفظ جتنا زیادہ مقدس تھا وہ اب اتنا ہی بدترین سمجھا جاتا ہے - اور جو لفظ جس قدر زیادہ معزز تھا آج کل وہ اتنے ہی ذلیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے - مثلاً چند الفاظ عرض کرتا ہوں : —

( ۱ ) " حضرت " - اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مقدس لفظ کی توہین اور بے عزتی کی جا رہی ہے وہ لفظ " حضرت " ہے - ظاہر ہے کہ یہ لفظ خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں ' اولیاء اور مقدسین مذاہب کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا - مگر اردو زبان کی بدقسمتی اور ہماری کور ذوقی دیکھیے کہ آج کل یہی مقدس ترین لفظ بدترین شریر ' نہایت اوباش اور چھٹے ہوئے بد معاش ' بے حد چالاک ' عیار اور مکار انسان کے لیے بولا جاتا ہے - افسوس صد افسوس —

( ۲ ) " خلیفہ " - یہ لفظ مذہب اسلام کی نہایت مقدس اصطلاح ہے - اللہ تعالیٰ یا انبیائے کرام کے نائبین کو اِس معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے - جیسے خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسول - خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا " اِنی جاعلٌ فی الارض خلیفہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے جانشینوں کو " خلفائے راشدین " کہتے ہیں - لیکن آہ کس قدر افسوس ہے کہ اس قدر متبرک لفظ ہماری زبان میں آکر اپنی تمام عزت و وقعت کھو بیٹھا - اور آج کل نائی اور حجام یا پہلوان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ہے —

( ۳ ) " صلواۃ " - اس لفظ کو دیکھیے اور ہماری اخلاقی حالت پر روئیے -

کون نہیں جانتا کہ اس کے حقیقی اور واقعی معنی "نماز، دعا، درود، بخشش اور خدا کی رحمت و سلامتی" کے ہیں - مگر درحقیقت رونا آتا ہے جب ہم کسی سے یہ فقرہ سنتے ہیں "خواہ مخواہ اُس نے مجھے ہزارہا صلواتیں سنائیں" - مطلب یہ ہے کہ بہت سی گالیاں دیں - اب بتلائیے - نماز و دعا اور گالی و دشنام میں کتنا فرق ہے؟ مگر ہم روز مرہ یہ لفظ بولتے ہیں اور کبھی قطعاً ہمیں خیال نہیں آتا کہ کس قدر پاک اور متبرک لفظ کو کتنی بری اور بیہودہ جگہ استعمال کر رہے ہیں —

(۴) "علامہ یا علامۂ دہر" - فاضل یگانہ اور عالم بے مثل اس لفظ کے معنی ہیں - جو ظاہر ہے کہ بہت بڑا لفظ ہے مگر ہماری قدردانی دیکھیے کہ آج کل یہ لفظ بڑی حرّافہ، نہایت چالاک، بڑی عیارہ اور نہایت دھوکہ باز عورت کے لیے بولا جاتا ہے —

(۵) "مُلا" - اس لفظ کا بھی حشر اردو میں آکر علامہ جیسا ہوا - اس کے معنی بھی بہت بڑے عالم اور فاضل ادیب کے ہیں - اس سے زیادہ اس لفظ کی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ لفظ فیضی، ابوالفضل اور جامی جیسے فضلائے یگانہ کے ناموں کا جز تھا اور آج کل جاہل، بیوقوف، کودن اور احمق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - نیز ان فقیر نما انسانوں کے لیے جو مسجدوں کے حجروں میں رہتے اور محلہ کے گھروں کی روٹیوں پر جو بطور خیرات وہ دونوں وقت مانگ کر لے آتے ہیں، گزر کرتے ہیں —

(۶) "مولوی یا مولانا" - اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو خدا کا ہو رہے - یا صاحب علم - مگر اس لفظ کی آج کل وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ - مسلمانوں میں ہر وہ شخص جو تحریک خلافت، تحریک

ہجرت اور ترک موالات میں شامل تھا - یا جس نے ذرا سی ڈاڑھی رکھ لی بس وہ مولوی ہے - خواہ کندۂ ناتراش اور جاہل محض ہی ہو - یہ لفظ جہلا کے لیے اب اس قدر کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے کہ اصلی اور حقیقی عالم اپنے آپ کو مولوی کہلاتے ہوئے شرمانے لگے ہیں -

(۷) "قبلہ" - مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس مقام کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں - یعنی جدھر منہ کرکے سب مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں - مگر آج کل اخلاق اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کو قصداً نہایت برے معنوں میں ڈھال لیا گیا ہے - چنانچہ قبلہ آج کل نہایت عیار مکار اور چالاک آدمی کے متعلق بولتے ہیں -

(۸) "اللہ" - اب بھلا بتائیے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ مقدس ہستی ایک مسلمان کے لیے اور کون سی ہو سکتی ہے - مگر افسوس ہے کہ اس قادر و قیوم ذات کو بھی ہم نے خالی نہ چھوڑا - وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمینوں کی مالک اور ان کی خالق ہے' وہ شہنشاہ جو دونوں جہانوں کا مالک اور آقا ہے ہم نے اس کے متعلق جو فقرے اور محاورے ایجاد کر رکھے ہیں وہ انتہائی غریبی اور مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں - چنانچہ جب ہم کہیں گے کہ " گھر میں اللہ ہی اللہ ہے" یا "اللہ کا نام ہے" تو ہمیشہ اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گھر میں نہایت مفلسی' غریبی اور محتاجی ہے اور اس وقت محتاج یا سائل کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں - کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے ہم نے نام بھی چھانٹا تو اس ذات اقدس کا جس کے قبضہ قدرت میں تمام جہان کے خزانے ہیں اور بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو دم کے دم میں خاک میں ملا سکتا ہے - کیا ہمیں دنیا

جہاں میں کوئی اور لفظ اللہ کے سوا اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں مل سکتا تھا؟

(۹) "انشاءاللہ"۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا تاکیدی حکم ہے کہ جب تم کسی کام کا وعدہ کرو تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیا کرو کہ "اگر خدا نے چاہا"۔ اگلے زمانے میں مسلمانوں کا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اور مخاطب "انشاءاللہ" کا لفظ سنتے ہی پورے طور پر اپنے کام کی طرف سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ اور وعدہ کرنے والے شخص پر بھی انشاءاللہ کہنے کے بعد (یعنی خدا کو اپنے وعدے پر گواہ کرلینے کے بعد) اس وعدے کا پورا کرنا بے حد ضروری ہو جاتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ پہلے زمانے کی باتیں ہیں جو قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ آج کل کے مہذب اور روشن زمانے میں جب انشاءاللہ کا لفظ کسی کے منہ سے نکلتا ہے تو مخاطب کو معاً اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں اور یہ شخص ہرگز ہرگز میرا کام نہیں کرے گا۔ میں نے اکثر لوگوں کو انشاءاللہ کے جواب میں یہ کہتے سنا ہے کہ "انشاءاللہ نہیں، پکا وعدہ کرو"۔ مطلب یہ ہے کہ انشاءاللہ کہنا وعدہ خلافی اور کام نہ کرنے کا آج کل یقینی ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ افسوس—

(۱۰) "اُستاد"۔ ماں باپ کے بعد تعظیم و تکریم کے لحاظ سے اُستاد کا درجہ اخلاق کی قدیم کتابوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر ہماری بول چال میں آکر اس لفظ کے معنی نہایت چالاک، فریبی اور دغا باز کے ہوگئے۔ زمانے کا انقلاب ہے—

(۱۱) "گرو"۔ اس لفظ کی قسمت بھی بالکل لفظ اُستاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے—

(۱۲) "مرشد" - اس لفظ کے معنی عربی میں ہادی، رہنمائے مذہبی، ہدایت کرنے والا، راہ بتانے والا اور پھر طریقت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ کس قدر مقدس اور محترم ہے - مگر اردو کے سانچے میں ڈھلا اور بازاری آدمیوں کی زبان پر چڑھا تو اس کے معنی بڑے چلتے پرزے اور عیار و مکار اور چالاک انسان کے ہوگئے - نہ معلوم تمام اقسام کے بدترین اور بیہودہ مطالب کو ظاہر کرنے کے لیے مقدس ترین الفاظ کی فوج پر کیوں ڈاکہ ڈالا گیا - میں نہایت ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس کی معقول اور مدلل وجہ بتائیں گے —

(۱۳) "ولی" - اس لفظ کے معنی ہیں خدا کا خاص مقرب بندہ اور اس کے عشق میں سرشار - مگر ہمارے ہاں آن کر یہ لفظ مرشد سے بھی زیادہ بدترین معنوں میں استعمال ہونے لگا - آپ نے مشہور مصرع سنا ہوگا —

هم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

(۱۴) حافظ جی - کیسا سیدھا سادہ اور عام فہم لفظ ہے - اس کے معنی ہیں وہ شخص جس نے قرآن پاک حفظ کرلیا ہو - مگر یار لوگوں نے اس کے معنی اندھے کے بنالیے یا پھر مسجد کے ملا کے - چاہے وہ دونوں الحمد بھی پڑھے ہوئے نہ ہوں —

(۱۵) "جہاد" - یہ ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت اور خداوندکریم کی رضا کی خواہش میں اپنی جان لڑا دینا - لیکن وائے بدقسمتی کہ آج کل یہی مقدس لفظ ہر بغاوت، ہر سرکشی اور ہر فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکانے کے وقت بہت فخریہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے - ہندوستان کے موجودہ

دور میں کون ہے جس نے " جہاد آزادی " اور " جہاد حریت " کے لفظ نہیں سنے ؟

(۱۶) " معجزہ " - ہندوستان میں آکر جس قدر اس مقدس لفظ کی بے عزتی ہوئی ہے شاید ہی کسی کی ہوئی ہو - یہ خالص مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں وہ عظیم الشان غیر معمولی نشان جو سوائے نبی اور رسول کے دنیا میں کوئی اور شخص نہ دکھا سکے - مذہبی اصطلاح میں یہ لفظ صرف نبی کے لیے بولا جاتا ہے - کسی اور کے لیے ہرگز نہیں - یعنی اگر کسی ولی یا قطب یا غوث یا ابدال سے کوئی نشان ظہور میں آئے تو اُسے بھی معجزہ نہیں کہیں گے - مگر یہ مقدس مذہبی اصطلاح آج کل بہت ہی معمولی معمولی کاموں کے لیے استعمال ہونے لگی ہے - امراض خبیثہ اور شرمناک بیماریوں کے اشتہارات پر جو ہر اخبار میں بیسیوں ہوتے ہیں آپ اکثر لفظ " معجزہ " موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا پائیں گے - للہ مجھے کوئی شخص بتائیے کہ کیا یہ حرکت اس مقدس لفظ کی صریح توہین نہیں ؟

(۱۷) " مومن " - اس لفظ کے معنی ہیں نہایت سچا اور پکا مسلمان اور نیک مرد - لیکن اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ آج کل اس لفظ سے نہایت احمق اور بیوقوف مراد لی جاتی ہے - اور جلا ہے جو بدقسمتی سے بیوقوفی میں ضرب المثل ہو چکے ہیں ' اس نام سے پکارے جاتے ہیں —

(۱۸) " بہشتی " - یہ بھی مومن کے ٹائپ کا لفظ ہے - لفظی معنی ہیں بہشت میں رہنے والا یا جنت میں جانے والا - لیکن ہماری زبان میں سقے اور ماشکی کو کہتے ہیں - اور اس کی ایک نہایت بیوقوفانہ تاویل یہ

بنا رکھی ہے کہ چونکہ سقا پانی بھرتا ہے اور پانی پلانا چونکہ ثواب کا کام ہے اور ثواب کا کام کرنے کا نتیجہ جنت ہے لہذا اس مناسبت سے سقہ کو بہشتی کہا جاتا ہے - چاہے وہ صرف ایک ڈول مشک میں ڈال کر پھونک سے ہی ساری مشک پھلالے مگر کہلائے گا بہشتی ہی - ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۱۹) "قلندر" - آج کل کے زمانہ میں کون یقین کرسکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی تارک الدنیا اور باخدا انسان کے ہیں جبکہ یہ لفظ موجودہ عہد میں بے غیرت اور بے حیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہو اور ریچھ اور بندر نچانے والے قلندر پکارے جاتے ہوں - اگر مشہور بزرگ حضرت بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کو پتہ ہوتا کہ میرے بعد اس معزز لفظ کی یہ گت بنے گی تو ہرگز اپنے آپ کو قلندر نہ کہلواتے —

(۲۰) "مجذوب" - یہ لفظ بھی قلندر کا بھائی ہے - اس کے معنی ہیں خدا کی محبت اور اُس کے عشق میں ڈوبا ہوا - لیکن آج کل اردو لغت کی کتابیں کھول کر دیکھہ لو صاف لکھا ہوا پاؤگے کہ مجذوب ' سڑی ' پاگل ' بیوقوف اور احمق آدمی کو کہتے ہیں —

(۲۱) "مصلی" - عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نماز پڑھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا - لیکن نہ معلوم لوگوں پر کیا مصیبت پڑی کہ اُنہوں نے ہر اُس چوڑھے اور خاکروب کو مصلی کہنا شروع کردیا جو اسلام قبول کرلے - کیا دنیا بھر میں نومسلم چوڑھوں کے تعارف کے لیے لوگوں کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا ؟ مسجد کے ملاؤں پر بھی یہ لفظ اکثر استعمال کیا جاتا ہے - جیسے " آج میں نے بیس مصلیوں کی دعوت کی " —

(۲۲) "شہید" - یہ بھی ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے اور اُس شخص کو شہید کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اُس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان فدا کر دیتا ہے۔ نیز یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے۔ مگر اپنے ہم مشرب اور ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ اس مقدس لفظ کی بھی آج کل کے زمانے میں بڑی بے توقیری ہو رہی ہے - پچھلے دنوں قطب جنوبی کی تحقیقات کرتا ہوا سیاحوں کا ایک گروہ برف میں دب کر ہلاک ہوگیا تو ایک بہت بڑے مشہور مولوی صاحب نے اپنے بہت مشہور اخبار میں "شہدائے راہ کشف و سیاحت" کے فصیحانہ عنوان سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا اور مطلق اس امر کا خیال نہیں کیا کہ شہید ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے اور اُس کو بے محل استعمال کرنا کسی طرح موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اس لفظ کی بڑی مٹی پلید ہوئی ہے - مقدس بانیان مذاہب کو جو ناپاک انسان اپنی ہر تحریر اور تقریر میں عمر بھر گندی سے گندی گالیاں دیتے رہے آج بڑے فخر کے ساتھ "شہید" کے نام سے پکارے جاتے ہیں - وہ شریر انسان جو مذہبی پیشواؤں کی نہایت گندی توہین کے جرم میں باغیرت مگر کم عقل لوگوں کے ہاتھوں دوسرے جہاں میں پہنچا دیے گئے فوراً "شہید" کے اعزاز سے معزز کر دیے گئے - یہی نہیں بلکہ جو مفسدہ پرواز اور باغی انسان حکام پر بم کے گولے پھینک کر پھانسی پر چڑھے فوراً "شہید" بن گئے - اب بتلائیے اس ذہنیت کا کیا علاج ہے؟ —

(۲۳) "غازی" - یہ معصوم اور مظلوم لفظ بھی بہت ہمدردی کا مستحق ہے - اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے جنگ کرنے والا - جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنے سر کی بازی لگا دی ہو یقیناً

نہایت تعظیم کا مستحق ہے - مگر بوالعجبی دیکھیے کہ لغت تک میں اس کے معنی بازیگر اور نٹ کے لکھے ہوئے ہیں - اس کے علاوہ ہر وہ شخص جو ہر قسم کی بد اعمالیاں اور بدکاریاں کرتے رہنے کے باوجودہ ترک موالات کی تحریک میں والنٹیر رہ چکا ہے یا احرار کا سپاہی ہے " غازی " بنا پھرتا ہے —

(۲۴) " ذات شریف " - اس لفظ کے لفظی معنی ہیں نہایت شریف ' نیک اور اچھا آدمی - لیکن ہم اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کا حلیہ ضرور بگاڑنا ہے - چنانچہ حسب معمول اس لفظ کے ساتھہ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور آج کل ذات شریف نہایت چالاک ' ہوشیار اور چالباز انسان کو کہتے ہیں ' جس سے شریفوں کو بہت بچ کر رہنا چاہیے —

(۲۵) " دہقان " - اس لفظ کے معنی ہیں ' گاؤں کا مالک ' سردار اور حاکم - دہقان خلد جنت کے داروغہ یعنی رضوان کا نام ہے - مگر آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل اس بدقسمت لفظ کے معنی جاہل ' گنوار ' وحشی اور اکھڑ آدمی کے ہیں —

(۲۶) " مہتر " - اس سے زیادہ بدسلوکی شاید ہی اُردو زبان میں کسی اور لفظ کے ساتھہ کی گئی ہو - کسی زمانہ میں یہ لفظ جس قدر زیادہ معزز ' محترم اور مکرم سمجھا جاتا تھا آج اُسی قدر ذلیل حقیر اور بے عزت خیال کیا جاتا ہے - اس کے معنی ہیں بڑا بزرگ ' قوم کا سردار ' لشکر کا امیر ' نواب ' شہزادہ ' رئیس اعظم - اسی مناسبت سے والیء چترال کو " مہتر چترال " کہتے ہیں - لیکن مہتر چترال کو کسی قدر شرم و غیرت آئے اگر وہ یہ سنیں کہ اردو دنیا میں یہ لفظ بھنگی ' خاکروب اور فضلہ اُٹھانے والے ادنیٰ ترین انسان کے

لیے بولا جاتا ہے - یہ لفظ ان معنوں میں اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے کہ اب عوام کے وہم میں بھی یہ بات نہیں گزر سکتی کہ یہ لفظ کس قدر معزز اور مکرم ہے اور اگر ان کو یہ بات بتائی جائے تو ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہے —

(۲۷) "سسرا" - ہماری زبان کی حالت آج کل واقعی بڑی قابل رحم ہے جس میں خسر جیسا معزز اور قابل عزت لفظ کھلی ہوئی گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو - افسوس —

(۲۸) "سالا" - یہ لفظ بھی سسرے کی قسم کا ہے - اور نہایت محبت اور پیار کے رشتہ کو ظاہر کرتا ہے - مگر آج کل کسی شخص کو ذرا کہہ کر تو دیکھو - جوشیلا ہوگا تو فوراً تھپڑ کھینچ مارے گا - سنجیدہ ہوگا تو آپ سے بولنا چھوڑ دے گا —

(۲۹) "چچا" - نہایت مکرم و معظم لفظ ہے - سعادتمند لوگ چچا کی تعظیم و تکریم باپ کے برابر کرتے ہیں ہیں - مگر آج کل جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے - کون ہے جس نے یہ محاورہ نہ سنا ہوگا کہ "چچا ہی بنا کے نہ چھوڑا تو کہنا" - چچا بیچارے کے متعلق یہ شعر بھی آپ نے بارہا پڑھا ہوگا:

چچا کے چچا ہم تو مشہور تھے
بھتیجا ہمارا چچا ہو گیا

دیکھا آپ نے! یہ صرف چند الفاظ ہیں جو معمولی اور سرسری طور پر جمع کر دیے گئے ہیں - اگر اس قسم کے الفاظ کی مکمل فہرست مرتب کی جائے تو غالباً سینکڑوں تک پہنچ جائے گی - مگر کیا ان محترم اور معزز الفاظ کے اتنے بڑے اور بیہودہ معنی کرنے کسی بھی زبان کے

لٹریچر میں مفید اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ گالیاں دینے اور مذاق اُڑانے کے لیے جن پرانے الفاظ کو ہم نے نئے سانچے میں ڈھالا ہے بلاشبہ وہ انسانیت اور اخلاق کا گلا کاٹنے کے لیے ایک تیز تلوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مقدس الفاظ کی قدر کریں اور ان کو ہمیشہ انہی معنوں میں استعمال کریں جن کے لیے وہ ابتدا میں وضع کیے گئے تھے۔ جب زبان ہی ٹھیک نہ ہوگی تو ہمارے اخلاق و عادات کس طرح مہذب و شایستہ اور متین و سنجیدہ بن سکتے ہیں۔ پس آؤ اور آج کے دن سے عہد کر لو کہ عمدہ الفاظ کو برے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کروگے۔ اگر تم ایسا کرنے پر قادر ہو سکے تو تم یقیناً محسوس کروگے کہ زبان کی درستگی کا اثر تمہاری دوسری عادات و اخلاق پر بھی بہت گہرا پڑا ہے کیونکہ دوسرے اخلاق و عادات عموماً زبان کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔ زبان اگر اچھی رہی تو سب چیزیں اچھی رہتی ہیں؛ زبان بگڑی تو سب کچھ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ کاش ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے اور ہم اپنی زبان میں سے اس قسم کے الفاظ قطعاً خارج کردیں —

# ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات

( یہ مضمون جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب نے پٹنے کے جلسے میں پڑھا تھا لیکن اخباروں میں بہت غلط سلط چھپ گیا تھا ' لہذا حضرت کیفی کی تصحیح کے بعد چھاپا جاتا ہے ... ) —

حضرات - متمدن قومیں ایک دوسرے سے میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتیں - سب قوموں کے جغرافی حالات ' ان کی زمین کے خواص اور آب و ہوا ایسی چیزیں ہیں جو یکساں نہیں ہوا کرتیں - اسی وجہ سے ان کے ہاں کی پیداوار اور صنعت کاری بھی مختلف ہوا کرتی ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں اول اول اجناس یعنی ملک کی پیداوار اور صنعت کاری کی چیزوں کی ادلا بدلی کرتی ہیں اور یہ مبادلہ کسی نہ کسی شکل میں قایم رہتا ہے خواہ وہ تمدن کی کسی منزل میں ہو —

یہ میل جول یا مبادلہ جب مادی دنیا سے نکل کر قوموں کی شایستگی اور تہذیب کی رفتار کی نسبت سے ذہنی مبادلہ کی شکل اختیار کرتا ہے تو بین الاقوامی کلچر کے نام سے پکارا جاتا ہے - اسی کلچر اور اس کے بین الاقومی تاثر سے متعلق آج چند باتیں آپ کے پیش کی جائیں گی —

کلچر کو تہذیب یا سبھیتا وغیرہ خواہ کوئی نام دیں لیکن یہ لفظ

اصلی حیثیت ہی میں اتنا جامع واقع ہوا ہے کہ اسے چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا - اس لیے آج کی گفتگو میں اسی لفظ سے کام لیا جائے گا ـــ

### قدیم تہذیب

قدیم آریہ لوگ جب اس ملک میں آئے تو انھوں نے یہاں ایک اچھی اور ترقی یافتہ تہذیب پائی جس کے آثار اب 'ہڑپہ' اور 'موہن جداڑو' میں ملتے ہیں - یہ لوگ مفتوح تھے اور ہمارے آریہ بزرگ فاتح - لیکن بہتر ہتھیار اور جنگ کے فن کی اعلیٰ قابلیت قومی میل جول اور کلچرل ارتباط کو روک نہ سکی - دیوبانی اب وہ بانی رہی جس کو مقدس وید کی زبان ہونے کا امتیاز حاصل تھا - زبان میں تبدیلیاں دیکھتے ہوئے رشی 'پانِنی' نے ضروری سمجھا کہ اس مقدس زبان کی حفاظت اس کی تنظیم سے کی جائے - اس ضرورت نے 'اشتادھیائی' کی شکل اختیار کی - اس کے ساتھ آرین فاتحوں کو اپنے مفتوحوں کا جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا - اس کا ثبوت 'وراُرچی' کی پراکرت گریمر ہے - بالکل ایسی ہی ضرورت پچھلی صدی کے اوایل میں انگریزوں کو پیش آئی جسے گلکرسٹ اور ڈنکن فاربس وغیرہ کی ہندوستانی گریمروں نے پورا کیا ـــ

کلچر کے بین الاقوامی عمل کے سلسلے میں آپ کے سامنے انسان کی تاریخ کے پراچین دفتر کھولنے فضول ہیں کیونکہ وہ آپ کے علم میں ہیں - اس لیے میں گفتگو کو وطن مالوف ہی تک محدود رکھوں گا - اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا تواریخی اعتبار سے درست ہوگا کہ ہندوستان میں تین عظیم الشان تصادم یا کہیے اتصال کم و بیش پختہ کلچروں کے ہوچکے ہیں - ان میں سے ایک کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے اور اسی

کو کافی سمجھنا چاہیے - دوسرا تصادم یا اتصال وہ ہے جو مسلمان فاتحوں کے اس ملک کو اپنا وطن بنالینے کے وقت سے پیدا ہوا - تیسرا تصادم یا اتصال وہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی پروگرام ترک کردینے اور ملک گیری کے پروگرام کو سامنے رکھہ لینے کے وقت سے ظہور میں آیا - آج کی صحبت میں اس نمبر ۲ کے بارے میں کچھہ عرض کیا جاے گا اور آج کے موضوع کی علت غائی بھی یہی ہے —

ایک معنی خیز نکتہ

حضرات - آپ جانتے ہیں کلام الفاظ کا دست نگر ہوا کرتا ہے - میں نے اب تک کلچروں کے لیے متبادل لفظ یعنی تصادم اور اتصال استعمال کیے ہیں جب کہ صرف آخر کا لفظ یعنی اتصال ہی کافی تھا - تصادم اسے کہتے ہیں کہ دو چیزیں مخالفانہ شدت کے ساتھہ آپس میں ملیں کہ ایک دوسرے کو شدید صدمہ پہنچاے - جب دو ریل گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں تو وہ تصادم ہے - اتصال یہ ہے کہ ایک ریل گاڑی ایک طرف سے آکر ٹھیری ہوئی ہے اور دوسری آگ پھانکتی اور انگارے اگلتی دوسری طرف سے آتی ہے اور اس کے برابر ٹھیر جاتی ہے - دونوں کے مسافر اور پارسلوں کی ادلا بدلی ہوتی ہے - مسلمانوں کے یہاں آنے سے ایسا ہی ہوا - اس کی نظیر ہم کو یونان میں اہل روما کی آمد میں بہت کچھہ ملتی ہے - یاد رکھیے کہ بہت کچھہ کا کلمہ بہت سوچ سمجھہ کر استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بالکل یا قطعاً - نہیں —

یہ واقعہ اب تک تشریح اور استدلال کا محتاج ہے کہ سندھ میں عربوں کی آمد سے قطع نظر جو مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ آئے اور

یہیں کے ہو گئے وہ کون تھے ؟ کس تہذیب و تمدن کے علمبردار اور کس کلچر سے بہرہ ور تھے ؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آپ کو ان نصابوں میں نہیں ملے گا جو اسکول اور کالج میں ہمارے نو جوانوں کے ذہن پر لادے جاتے ہیں۔ بحث اس سے نہیں کہ وہ سلجوقی تھے یا غوری پٹھان، چنگیزی مغل تھے یا کون ؟ بحث اس سے ہے کہ ان کی کلچر کیا تھی ؟ وہ کونسی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ؟ محض مسلمان کہہ دینا یا قبیلہ کا نام لے دینا اصل مبحث پر روشنی نہیں ڈالتا —

## مسلمانوں کی آمد

تاریخ اعظم کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ جو مسلمان شمال مغربی دروں کے راستے ہندوستان میں آئے وہ خواہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں ایران کی تہذیب اور کلچر میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کا تخیل اور ان کی زندگی اس کلچر سے متاثر تھی جس کا ابتدائی خاکہ شاہنامہ میں پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایرانی کلچر اور لٹریچر کا رنگ ان کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا تھا اور چونکہ ایرانی اور انڈو آرین یعنی ہندوستان میں آنے والے آرین ایک ہی تنے کے دو ٹہنے تھے جس کی تشریح غیر ضروری ہے اس وجہ سے ان مسلمانوں کی کلچر اور ہندوستانیوں کی کلچر میں بہت ہم آہنگی اور اپنایت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان رہ کر اس خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہو گئے کہ رواداری اور سبھیتا کا اوتار بن گئے۔ یہ جملے جھگڑے اور فتنے اٹھانے کے ہیں کہ مفتوح اپنے فاتحوں پر غالب آگئے یا یہ کہ فاتح اپنی فاتحانہ خود اعتمادی اور انفرادیت سے محروم ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں کلچروں کے مزاج کچھ ایسے واقع ہوئے

تھی کہ ان کا روبرو ہونا ہی ارتباط کا قایم ہو جانا تھا - یہ ارتباط نگاہ اولیں کی اشتیاق انگیزی سے کم نہ تھا - کلچروں کے اس ارتباط کے کارنامے ایک نہیں دو نہیں بہت سے اور گونا گوں ہیں - قوموں کے تعلقات کے ارتقا میں یہ ہوا کرتا ہے کہ پہلے ایک کیفیت اپنے آپ پیدا ہوجاتی ہے اور پھر اہل غرض اس کو سیاسی رنگ دیتے ہیں اور اس سے فایدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ کلچروں کا اتحاد پہلے ناگزیر صورتوں میں اپنے آپ پیدا ہوا ' بعد میں اس سے سیاسی استفادہ کیا گیا - آپ ادبی زاویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر نظر ڈالیں اور فرمائیں کہ نئی زبانیں اور لٹریچر جو اس کلچرل ارتباط سے پیدا ہوئے کیا اس کے متعلق کسی کا معہود ذہنی سیاسی مصلحت پر مبنی کہا جا سکتا ہے ؟ مہابھارت یا گیتا وغیرہ کے ترجموں کی نسبت جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے ایسا گمان ہوسکتا ہے - لیکن خانخاناں رحیم اور رس خاں کا اتنا اچھا ہندی کا شعر کہنا اور ملک محمد جائسی کا ہندی میں پدماوت تصنیف کرنا کونسی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی بتایا جائیگا - ایک طرف یہ ہوا تو دوسری طرف وارستہ اور ٹیک چند بہار نے وہ جید کتابیں فارسی میں لکھیں جو ایران میں سند مانی گئیں - اگر یہ ہندو یا مسلمان اپنی انفرادیت گنوا بیٹھتے تو " دو کلچروں کا ارتباط " یہ فقرہ ہی بے معنی تھا - مگر یہاں ایسا ہوا ہی نہیں - لوگوں کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے - خاصکر قومی اور اجتماعی معاملوں سے متعلق ان کی یادداشت بہت سست ہوا کرتی ہے - اس صورت میں کبھ بھٹی کی آڑلی جاتی ہے ' خوف دلایا جاتا ہے کہ اگر ان میں اور ہم میں ارتباط ہوگیا تو ہماری ملی انفرادیت اور دھارمک سوتنترتا پھر کہاں ! ہم کیوں اپنی قدیم روایات گنوا بیٹھیں ؟ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہوا نہیں - سنیے - جب

کلچرل ارتباط کی تنظیم نسل، زبان اور قومیت کے محدود احاطہ کے باہر عمل پیرا ہو تو اخلاقی اور ملی معیار سے متعلق نتیجہ یہ ہؤا کرتا ہے کہ انسانوں کا ذہن غیر مقامی ہوجاتا ہے یعنی اس کے شعور کا نفسیاتی محور وسیع اور زاویۂ نگاہ فراخ ہوجاتا ہے - اس میں شک نہیں کہ اگلے وقتوں میں ایسا ہؤا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے ملی تو اپنی قومی انفرادیت کھو بیٹھی - لیکن یاد رکھیے اور خوب یاد رکھیے کہ یہ نتیجہ تھا مذہبی میل کا —

مذہب کے نقاط نظر بھی اور چیزوں کی طرح اب بدل گئے ہیں - آج کتنے مسلمان ہیں جو سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہیں کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ

لبیں بڑھ رہی ہوں نہ ڈاڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

اور کتنے ہندو ہیں جو اونچے گلے سے یہ کہیں کہ ہندو وہ ہے جو غیر ہندو ہی نہیں بعض ہندوؤں سے بھی روٹی بیٹی کا پرہیز رکھتا ہو - وہ دہلی کا ایک مسلمان ہی تو تھا جس نے اس کا اعلان کیا کہ معرکۂ کربلا کبھی واقع ہؤا ہی نہیں - اور وہ ایک ہندو عالم ہی تو تھا جس نے یہ دعویٰ کیا کہ وید میں شکھا سوتر کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے - قصہ مختصر اب نہ ہندو وہ ہندو ہیں جن کا دھرم کچے دھاگے کی مانند ہو اور نہ اب مسلمان وہ مسلمان ہیں جو غیر مسلم سے میل جول یا تشابہ کی علت میں کفر کے فتوے کے مستوجب ہوں —

## عہد حاضر کی تہذیب

آج کل کا کلچرل اتحاد زیادہ تر دو (کچھ ایک) مختلف روایات کا

میل جول ہے - روایات کا بہترین نتیجہ ان کا باہمی آزادانہ ملاپ ہو اس لیے عہد حاضر میں کلچروں کا باہم مبادلہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں کہیے سمونا ایسا ہے جیسے ایک پہاڑی نالہ سے نہر نکال کر میدانی علاقے کو سیراب کرنا - وہاں زمین کم تھی، پتھر تھے یا پانی، اس لیے زراعت برائے نام تھی - جب کہ یہاں زمین زیادہ تھی اور پانی ندارد، امیدیں بادلوں کے رحم کی منتظر رہتی تھیں یا لوہے کے چنے چباکر چپہ بھر زمین ہل کے سپرد کی جاتی تھی - اب یہ ہوا کہ ان کو غلہ مل گیا اور ان کو پانی - دونوں کا کام نکل گیا - میں کہتا ہوں کہ ہندوانی روایات اور کلچر میں کچھ خوبیاں ہیں تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ ان خوبیوں کو عام کریں، ڈبیا میں بند کرکے نہ رکھیں - اسی طرح اگر اسلامی روایات اور کلچر میں کچھ محاسن ہیں تو وہ انہیں عالمگیر بنائیں، مقفل اور محدود کرکے نہ رکھ چھوڑیں - یہ جب ہی ممکن ہے کہ تبصرہ اور موازنہ سے کام لیا جائے - ایسا کام کھلے خزانے ہوا کرتا ہے حرم سرا یا رنواس کے تہ خانوں میں نہیں —

آپ بھولتے ہوں تو اور بات ہے ورنہ یہ کام ہوچکا ہے - ہم ہندو مسلمانوں کو خصوصی طور پر اور کل برادران وطن کو عام طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب ہمارے بزرگوں کی دیدہ وری کی بدولت ہوچکا ہے - اسی آپ کے وطن میں جزیہ لگا اور پھر منسوخ کردیا گیا - اسی انڈیا میں البرٹ بل کا جو طوفان پچھلی صدی میں فتنہ سامانی کرگیا وہ کل کی بات ہے - اور آج کیا ہو رہا ہے - زمانہ بدلتا رہتا ہے اس کے ساتھ ہی قوموں کے رسم و رواج اور طرز ماند و بود اور ان کی ذہنیت بھی بدلتی رہتی ہے - اساسی اعتقاد جوں کے توں رہتے ہیں

لیکن ان کے نفسیاتی ذریات کی پرداز بدل جاتی ہے - انسانی شعار کا اصلی جوہر خلوص اور راستبازی ہے - اسی طرح اجتماعی زندگی کا جوہر موالات اور رواداری ہے - اور ان جوہروں کو جلا دینے میں کلچرل اتحاد اور ادبی و لسانیاتی ارتباط کی تشکیل ہؤا کرتی ہے —

ہو سکتا ہے کہ آپ کے اور میرے قول میں جنبہ داری یا عصبیت کا لوث بتایا جاے - اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک یورپین مسٹر جوڈکی تازہ تصانیف "دی سٹوری آف انڈین سویلزیشن" سے استفادہ کروں - لکھا ہے :-

"قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے تخیل کا اسلامی خیالات سے تصادم ہؤا - ہندوستان میں مختلف نظاموں کی یہ مڈ بھیڑ دیسی کلچر کے غلبہ میں صورت پذیر ہوئی اور اسلامی ذہنیت بہت کچھہ ہندوانیت میں جذب ہوگئی" - (صفحہ ۵۶)

اصل الفاظ مصنف کے بھی سن لیجیے جو یہ ہیں :-

" During the Middle Ages Hindu thought came in conflict with the ideas of Islam in India. The clash between these two opposite systems resulted in the preponderance of the native culture, and Islamic thought was largely absorbed in Hinduism."

یہ تحقیق ایک غیر ہندو اور غیر مسلم کی ہے - اس غیریت کے باوجود بھی ممکن ہے کہ اس مصنف کی تحقیق اور دریافت ذاتی پسند یا شخصی رجحان کا رنگ لیے ہوے ہو جس سے وہ بے خبر رہا - یہ کچھہ بھی ہو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تاثر کے غلبہ سے قطع نظر ہؤا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت فکر و تخیل باوجود ان کے مذہبوں

کے اختلاف کے شیر و شکر ہوگئی - فلہٰذا ہندوانہ کلچر کا رہا یا اسلامی کا؟ یہ امر تنقیح طلب نہیں - نہ اس کا اثر اس تاریخی نتیجے پر پہنچتا ہے جس کی مولود ہماری ہندو مسلم یا ہندیرانی کلچر ہے -

اس کلچرل ہم آہنگی میں جو حصہ ہماری ورنیکولر یعنی دیسی زبانوں اور ادب کا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا - چنڈی داس - چیتنیہ - ودیا پتی - کبیر - امیر خسرو - نامدیو - تکارام - نرسنگہ مہتہ اور گرونانک کے نام اس ضمن میں ذکر کے قابل ہیں - ایسے اور بہت سے بزرگوں کے نام آپ کو بھگت مالاؤں میں ملیں گے - ان کی تلقین اعتقادی فراخ دلی سے شروع ہوکر کلچر اور معاشرت کی وسیع نظری میں نتیجہ پذیر ہوئی - اردو یا ہندوستانی اپنی تنظیم اور تدوین سے پہلے اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ کرتی رہی اور اب تک کر رہی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - اردو والوں نے اپنا کوئی پنتھ یا مت قایم نہیں کیا لیکن وہ کام کرگئے جو قوموں کے کلچرل اتحاد میں بے نظیر ہے - انہوں نے دیر و حرم اور شیخ و برہمن کو ایک جگہ لا بٹھایا - ان کا فکر استقرائی تھا اس لیے معاشرت اور روزانہ زندگی پر چھا گیا - یہ بدیہی امور واقعہ ہیں جو تشریح و تاویل کے محتاج نہیں - عمارات کی ملکہ یعنی تاج محل میں ہندو ہاتھ کہاں کہاں نمایاں ہے؟ پراکرت اور آپ بھرنشی بھاشاؤں کے لغات پر کیا اثر ہوا؟ مغل یعنی ایرانی نقاشی اور راجپوت پینٹنگ کے باہم کیا اخذ و ترک ہوا؟ ہمارے قدیم سنگیت کے موسیقی میں کیا جدت آفرینی یا کہد بجیے بدعتیں ہوئیں اور کتنی نئی سنکیرن راگنیاں پیدا ہوگئیں؟ یہ اور ایسی بہت سی چیزیں ہندو مسلم کلچروں کے ارتباط اور اتحاد

کے پھل ہیں - ان میں سے ایک ایک شق ایک علحدہ ذکر چاہتی ہے -

## ایک عالمگیر نظریہ

مفکرین اور شاعروں نے، جو اس ارتباط کے سب سے بڑھ کر علمبردار تھے، وہ کام کیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا - میں سمجھتا ہوں کہ مثال کی طور پر متقدمین و متوسطین اور عہد حاضر کے چند شعرا کے کلام سے استفادہ بے محل نہ ہوگا:

ولی مرحوم کا قول ہے :—

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بند مت ہو سبحۂ و زنار کا

آبرو مغفور کا قول ہے :-

کیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبی (تسبیح) کرے فرامش زنار بھول جاوے

میر تقی نے فرمایا :-

نغمۂ عشق سے ہیں سبحۂ و زنار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

منشی مادھو رام جوہر کا ارشاد ہوا :-

دیر و مسجد پر نہیں موقوف کچھہ اے غافلو
یار کو سجدے سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

استاد ذوق کا یہ گلہ ہے :-

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند ؟
سارے بشر ہیں بندے حق کے - سارے جھگڑے شر کے ہیں

امیر مینائی نے یہ تلقین کی :-

مشرب صلح کُل ہے اے زاہد
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے

فصیح الملک داغ اس مقام پہنچے :-

سر نیاز سلامت رہے پئے تسلیم
نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے

چکبست مجرور نے یہ فیصلہ کیا :-

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

حضرت جلیل مانکپوری نے فرمایا :-

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر
کیا کہیں گے تمہیں سب گبرو مسلمان دل میں

ثاقب بدایونی کا مشاہدہ ہے :-

تمہارا بول بالا ہر جگہ اللہ والوں میں
یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جپ تپ شوالوں میں

اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جائے گا نہ اس سے بحث کی جائے گی کہ مسلمان اور ہندو شعرا کے ان اور ایسے ملفوظات نے جمہور کی ذہنیت کو کیا رنگ دیا - اتنا کہنا کافی ہے کہ شاعر قوم کی زبان اور اس کی معاشرت اور کلچر کا ترجمان ہوا کرتا ہے - صرف دو شعر اور پیش کروں گا پیشتر اس سے کہ موضوع کے اور شعبوں پر نظر ڈالوں - ہندو شاعر نے دعویٰ کیا :-

ذات پات پوچھے نا کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

یہ دعویٰ دلیل کا محتاج نہیں - مسلمان شاعر نے اس کا اعلان کیا : —

وفاداری بہ شرط استواری شرط ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

حضرات - آپ نے کلچرل اتحاد کے کارنامے ملاحظہ فرمائیے - آپ نے اسلاف کے شاہکاروں کو اپنے حافظہ میں ٹٹولا - آپ ہندو مسلمان حضرات میرے وطنی بھائی جس طرح رہتے ہیں کیا اس کے ملاحظہ کے لیے آپ کو کسی شیش محل یا آئینہ خانہ میں لے جاؤں؟ یہ معاشری صلاحیت، یہ سمجھوتا، یہ کلچرل اتحاد، یہ سوشل یگانگی اور یہ رواداری کسی معجزے یا چمتکار، کسی شاہی حکم یا فتوے سے وقوع میں نہیں آئی - یہ نتیجہ ہے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے مدت العمر کے حسن عمل کا اور جلب منفعت اور خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کا - جماعتوں کا طرز عمل نتیجہ پیدا کرنے کو ایک خاص مدت اور استقلال چاہتا ہے - یہ جو کچھ ہوا کئی نسلوں کی انتھک اور لگاتار کوششوں کا ثمرہ ہے - جب ہی تو انگلستان کے مفکروں اور مورخوں کو یہ کہنا پڑا جس کی تفصیل بالاجمال آگے پیش کی جاتی ہے - سنیے جو یورپ کی تازہ ترین تصنیف آپ کی نسبت رائے رکھتی ہے : —

" ہندوستان کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ زاویۂ نظر پر نسلوں کے ملاپ کے اہم نتیجے پیدا ہوئے ہیں - ان میں سے اولین نتیجہ اساسی یگانگی ہے - یہ یگانگی یا یونٹی اس سے کہیں زیادہ بین اور مستقل ہے جو ایک ہی جغرافی رقبہ میں قربت کی وجہ سے ہوتی ہے - یوروپین یعنی اہل فرنگ بھی تو ایک ہی جغرافی رقبہ میں اکٹھے رہتے ہیں جو رقبہ

هندوستان سے بہت مختلف نہیں ہے - لیکن جیسا کہ وہ جنگیں جنھوں نے یورپ کی تاریخ کو بدنام کر دیا ہے اور تنازعے اور باہمی رقابت کے جھگڑے جو اس وقت لیگ آف نیشنز کی کمر توڑ رہے ہیں - صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ یورپ کے باشندے اتفاق اور یکجہتی کے احساس کی اس اثر پذیری سے محروم ہیں جس کا امتیاز هندوستان کے باشندوں کا حصہ ہے - غرض کہ اُس معنوی صحت کے ساتھہ ایک یوروپین کا ذکر نہیں کر سکتے جس کے ساتھہ ہم ایک انڈین کا ذکر کر سکتے ہیں جو رنگ ' جاتی اور مذہب کے اختلافوں کے باوجود تمام دوسرے اہل هند کو اپنا هموطن اور همجولی سمجھتا ہے اور هندوستان کو اپنا وطن " —

( اے ستوری آف انڈین سویلزیشن - سنہ ۱۹۳۶ ع صفحہ ۴ - ۲۳ )

حضرات - آپ کے اور آپ کے ہم وطنوں کے حق میں یہ قطعی رائے اور موازنہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کا مستحق ہے - یہ اسی کلچرل یونٹی کا ظہور ہے جس نے ہماری معاشری اور سیاسی قسمتوں کو ایک کر دیا - لیکن معاف فرمائیے عہد حاضر کے واقعات سے چشم پوشی اور سہل انکاری ناممکن ہے - سنیے اور غور سے سنیے کہ کچھہ تو ہے جو آج یہاں اس کلچرل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے - کچھہ بات تو ہے جس نے مدراس اسمبلی کو اور اس کے اصحاب بست و کشاد کو ملی مناقشوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی تحریک کی - کوئی بات تو ہے جس نے ملک کے دوسرے سرے میں پنجاب کی اسمبلی اور اس کے سرگرم دستور اعظم کو یونٹی کانفرنس کے قایم کرنے کی ترغیب دی جس نے گرم جوشی سے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے - یہ وہ جہد اور بدیہی واقعات ہیں

جنہیں کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا؛ جن سے کوئی صحیح دماغ رکھنے والا انکار یا بے اعتنائی نہیں کر سکتا —

تو پھر کیا اب یہ سمجھا جائے کہ ہمارا وطن کایا پلٹ ہوگیا اور صدیوں کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا جیسا کہ فارسی کا شعر ہے:

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

کوئی حزنیت کا پجاری یہ کہے تو کہے لیکن کیفی ایسا نہیں کہہ سکتا - آپ اس کے اعتقاد میں اس کے ہم یقین و ہم نوا ہوں گے جو یہ ہے:-

ہنوز آن ابر رحمت درفشان است
مے و میخانہ با مہر و نشان است

اپنا قول تو یہ ہے:-

قیس کا تجھہ میں جانوں - جذبۂ منصور نہیں
ورنہ منزل گہہ دلدار تو کچھہ دور نہیں

جو عوارض اس وقت ہمارے گرد و پیش ہیں وہ اپنی نوعیت میں اگلے وقتوں کے عوارض اور ماحول سے مختلف ہیں - ہندوؤں اور ہندوؤں کے، مسلمانوں اور مسلمانوں، سکھوں اور سکھوں کے، غیر مسلم اور مسلم کے باہمی تعلقات جیسے کچھہ عریاں مناظر پیش کر رہے ہیں وہ ہماری عہد حاضر کی تواریخ کے چہرے پر خوشنما نقش ہرگز نہیں - لیکن سوال پھر بھی وہاں کا وہیں رہتا ہے کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟ وہ گزشتہ عہد کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کس قبیل میں آتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے - اسی کے گرد

دوسرے تمام مسایل طواف کرتے ہیں - وطن کے ہر ذی ہوش - ہر حریت شعار اور ہر مفکر کا اہم فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس سوال کے حل پر غور کرے - غور کرنا ہے کہ آیا موجودہ عوارض کی اصلیت اقتصادی اور معاشی ہے یا ملّی اور قومی؟ اگر آپ مجھہ سے اس سوال کا جواب طلب فرمائیں تو میں اسے آپ کی ستم ظریفی کہوں گا- معاف فرمائیے اس کلمے کے لیے - ایسے مہتم بالشان اور دور رس مسئلے ایک لفظ یا ایک جملے کے کہہ دینے سے طے نہیں ہوا کرتے - جب تک ہر نقطۂ نظر کے اصحاب اس نیت سے مل کر نہ بیٹھیں کہ اس مسئلہ کو حل کر ہی ڈالنا ہے کچھہ فایدہ قیل و قال سے نہ ہوگا—

اس ضمن میں ایک بات آپ سے اور کہنی ہے - شروع میں تین کلچرل تصادم یا اتصال آپ کے پیش کیے گئے ہیں - اب تک نمبر (۳) کے بارے میں کچھہ نہیں کہا گیا جس کا تعلق مغربی کلچر سے ہے - یہ کل کی بات ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ۰ اس بارے میں صرف یہ عرض کیا جاے گا کہ مغرب کا جذبۂ حب وطن اور شخصی انفرادیت کو مضبوطی سے قایم رکھتے ہوئے اجتماعی مفاد کو مد نظر رکھنا اور آزادی اور جمہوریت کا احساس وہ چیزیں ہیں جو ہر قوم کی ترقی کیا زندگی کی پہلی شرط ہیں اور ان امور میں ہم اہل مغرب کے شعار سے بہت استفادہ کر سکتے ہیں - رہیں وہ باتیں جن سے خود مغرب کا ناک میں دم ہے ان کی اندھا دھند تقلید ہم کو کہیں کا نہ رکھے گی—

## امید افزا صورت حال

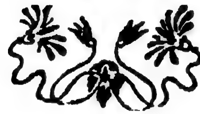
حضرات - میں دیکھہ کر باغ باغ ہوں کہ ان مسایل پر غور و فکر

کی خواہش آپ کے دل میں پیدا ہوئی ہے - مجھے یقین ہے کہ اس خواہش کی محرک خلوص اور بہبود وطن ہے - اگر میں صرف یہی یقین لےکر بہار سے واپس گیا تو اس سفر کو حج اکبر سے کم مبارک نہ سمجھوں گا - جب ایک کام کرنے کی ٹھن جائے تو کامیابی کے سو راستے نکل آتے ہیں - فلسفۂ نفسیات جماعتوں کی ذہنیت اور جدت عمل کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب ایک امر جماعت کے ذہن میں استواری کے ساتھ جاگزیں ہوجاتا ہے تو وہ اس کے سر انجام اور تکمیل کی تدبیر خود ہی نہایت سرعت سے نکال لیا کرتی ہے - اور اپنے فیصلے پر فوراً عمل پیرا ہوجاتی ہے - کمی ہوتی ہے تو احساس اجتماعی کی - لیکن اجتماعی احساس میں اس معزز مجمع میں بدرجۂ اتم دیکھ رہا ہوں -

ایک اور عرض کروں گا اس سے پہلے کہ بیٹھ جاؤں - اور وہ یہ ہے کہ موجودہ صورت حال سے متعلق ہندوستانی قوم کا خواہ کوئی فیصلہ ہو لیکن ایک حقیقت ہے جو اس سوال اور اس کی اہمیت سے بالا تر ہے - وہ ہے کلچرل ہم آہنگی - مغربی اتصال نے چاہے کوئی شکل اختیار کی ہو کلچرل یونٹی جو ہم میں پہلے سے موجود ہے اس کے رنگ کو مدھم نہیں پڑنے دینا چاہیے - اس کی ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کبھی حد سے زیادہ نہیں ہوسکتی - یہی ہماری وطنیت کی روح و رواں، یہی ہماری نجات کی شاہراہ اور یہی حریت کے خزانے کی کنجی ہے - اس بارے میں ہمارا لائحۂ عمل کاش وہ ہو، کاش ہمارا وفور شوق ویسا ہی ہو جس کا چربہ اس تاریخی عظمت رکھنے والے متھلا کے مہا کوی ودیا پتی نے اپنے ان اشعار میں نہایت خلوص اور جذبے سے کھینچا ہے - ان الہامی اشعار کے ترجمے کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا

ہوں - فرمایا ہے :-

دیکھتا ہوں - جب سے اس جگ میں ہوں میں اس کا سروپ
چین پھر بھی میری آنکھوں کو نہیں اک پل ہوا
ہے جُگوں سے من کو میرے میل اس کے من کے ساتھ
اس پہ بھی ہے شانتی کی پیاس ہی من کو سدا



# افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

# افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

## ۱ - بنگال

آخر اپریل میں مجھے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے ممتاز اور روشن خیال اصحاب سے ملنے کا موقع ملا - کلکتہ میں اردو زبان کا عام رواج ہے، تقریباً ہر طبقے کے لوگ اس زبان کو بولتے یا سمجھتے ہیں - بنگال نے ایک زمانے میں اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور وہاں اردو کے بہت اچھے ادیب اور شاعر ہوے ہیں اور اب ہیں - فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کو بہت کچھہ فروغ دیا، کلکتہ ہی میں تھا - کلکتہ کے علاوہ بنگال کے بعض دوسرے شہروں مثلاً مرشدآباد، ڈھاکہ، چاٹ گاؤں وغیرہ میں بھی اردو کا خاصا رواج ہے - لیکن زمانے کے تغیرات اور حالات کی وجہ سے مسلمانان بنگال کی توجہ اس طرف کم ہوگئی تھی اور وہ دیگر اہل بنگال کی طرح اردو یا ہندوستانی زبان کی کوئی خاصی ضرورت نہیں سمجھتے تھے - لیکن جدید حالات اور انقلابات نے انہیں خود بخود اس طرف متوجہ کردیا ہے اور قومی نقطۂ نظر سے وہ اس زبان کی اہمیت اور ضرورت کو خوب سمجھہ گئے ہیں - چنانچہ ملک کی دوسری سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں بھی اس ضرورت کو محسوس کررہی

ہیں اور اس امر کی کوشش کر رہی ہیں کہ ملک بھر کی ایک زبان ہوجائے - خوش قسمتی سے ہمارے پاس پہلے سے ایک ایسی زبان موجود ہے جو اس خدمت کو انجام دے رہی ہے اور اس لیے اس کی اشاعت و ترقی ' کسی فرقے یا جماعت کی خاطر نہیں بلکہ قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے —

اس خیال کی بنا پر جناب عبدالرحمن صدیقی ایم - ایل - اے اور جناب مولانا اکرم خاں صاحب اڈیٹر محمدی و آزاد و دیگر احباب نے اپنے حلقے میں نیز کے طور پر اس مسئلے پر غور اور مشورہ کیا اور سب کی یہ رائے قرار پائی کہ صوبۂ بنگال کے لیے کلکتہ میں انجمن ترقیء اردو کی ایک شاخ قائم کی جائے اور اردو کی اشاعت اور تعلیم کے متعلق مناسب تدابیر اختیار کی جائیں - اس کے بعد ان صاحبوں نے مجھے دعوت دی اور ۳۱ مئی کو ایک عام جلسہ مسلم انسٹیٹیوٹ ہال میں آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا - اس جلسے کی روئداد کلکتہ کے اردو انگریزی بنگالی اخبارات میں شایع ہوی - اخبار "ہند" کلکتہ سے اس کی نقل درج کی جاتی ہے —

جلسۂ مسلم انسٹیٹیوٹ

صوبۂ بنگال میں انجمن ترقیء اردو کا قیام

"ایک عام جلسہ زیر صدارت آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب کل شام مسلم انسٹیٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا - جناب مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ و سکرٹری انجمن ترقیء اردو نے اپنی عالمانہ تقریر میں اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کا ہندستان کے مختلف صوبوں مثلاً دکن ' مدراس ' بنگال سے تعلق اور اس کی تدریجی ترقی

کو نہایت دلنشین پیرایہ میں بیان فرما کر ثابت کیا کہ ہندستان میں متحدہ قومیت کے لیے ایک عام زبان کی ضرورت ہے اور اردو میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر مقام پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر جماعت نے اردو کو کسی نہ کسی شکل میں عام زبان تسلیم کیا ہے۔ صوبۂ بنگال نے اردو کی ہمیشہ خدمت کی اور اس کے ابتدائی دور میں جس قدر کام بنگال میں ہوا ہے وہ بہت زیادہ اور نہایت اہم ہے۔ اب ہندستان میں عظیم الشان تبدیلیاں اور انقلاب ہونے والے ہیں اس دور میں بنگال کے لیے ایک عام ہندوستانی زبان سے غفلت برتنا کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ مولانا کی اس تقریر کا حاضرین نے پر زور خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد اکرم خاں صاحب اڈیٹر آزاد نے فصیح و بلیغ اردو میں تقریر کی اور بنگال کا اردو زبان سے تعلق واضح کرنے کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ انجمن ترقیء اردو (ہند) کی ایک مرکزی شاخ صوبۂ بنگال میں قایم کی جاے۔ اس تجویز کی تائید مسٹر بدرالدجیٰ نے اپنی تقریر میں کی۔ اور تائید مؤید شمس العلما کمال الدین احمد صاحب نے فرمائی جو بہ اتفاق راے منظور کی گئی —

اس کے بعد خان بہادر بدرالدین صاحب نے تجویز پیش کی کہ انجمن ترقیء اردو صوبۂ بنگال کے صدر جناب آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب اور معتمد مولانا اکرم خاں صاحب اور جناب عبدالرحمن صدیقی اور نائب معتمد جناب بدرالدجیٰ صاحب اور جناب نورالرحمن صاحب قرار پائیں اور یہ حضرات مجلس انتظامی کے ارکان کا انتخاب اور اعلان کریں۔ اس تجویز کی تائید مظہر توحید صاحب اور ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب

نے فرمائی جو باتفاق رائے منظور کی گئی —

آخر میں جناب صدر نے ایک برجستہ تقریر میں اردو کی عالمگیر حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے حاضرین کو مولانا عبدالحق صاحب کے خیالات پر توجہ دلائی اور فرمایا کہ زبان کا مسئلہ ہندوستان کے لیے نہایت اہم ہے اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنی قدیم روایات اور تہذیب کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے اور صوبۂ بنگال میں انجمن ترقیء اردو کی شاخ کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش ہونا چاہیے —

جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب نے آخر میں جناب صدر کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تقریر میں اردو کی یہ خصوصیت کہ نہ صرف وہ ہندوستان میں بلکہ ہندستان سے باہر دیگر ممالک میں بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے' بیان کی اور اس کی سیاسی اہمیت کی وضاحت فرمائی۔ ان کی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا " —

## ۲ - بہار کا دورہ

کلکتہ سے میں پٹنے آیا - قاضی عبدالودود صاحب معتمد انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار نے مجھے خاص طور پر پٹنے بلایا تھا تاکہ انجمن کے بعض معاملات کا فیصلہ جو ایک مدت سے الجھن میں پڑے تھے' میری موجودگی میں ہو جائے - اس میں کئی روز لگ گئے - اس سے فارغ ہونے کے بعد مولوی ضمیرالدین احمد صاحب جائنٹ سکرٹری انجمن ترقیء اردو

صوبۂ بہار نے یہ مشورہ دیا کہ مناسب ہوگا کہ میں مضافات بہار کے چند مقامات کا دورہ کرکے وہاں کے حالات کا بچشم خود معائنہ کر لوں۔ اور انہوں نے از راہ عنایت خود بھی میرے ہمراہ چلنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ۹ جون کو چھپرے روانہ ہوگئے۔ چھپرے اور مظفرپور کے سفر میں پروفیسر نجیب اشرف بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ چھپرے میں ہم نے مولوی عبدالماجد صاحب ایڈوکیٹ کے مکان پر قیام کیا۔ شام کو کچھ اصحاب جمع ہوگئے اور ان سے ترویج و ترقیٔ اردو کے متعلق گفتگو رہی۔ شب کو ٹاؤن ہال کے میدان میں مختصر سا جلسہ ہوا جس میں انجمن کے مقاصد بیان کیے گئے اور چند ضروری قرار دادیں منظور ہوئیں۔ یہاں انجمن کی شاخ پہلے سے موجود ہے لیکن کام بہت کم ہوا ہے۔ حافظ احمد کریم صاحب سکرٹری انجمن اور سید صالح حسین صاحب کو اس کام میں خاص دلچسپی ہے۔ چھپرے کے بعض محلوں میں شبینہ مدرسے جاری ہیں اور رضاکار پڑھاتے ہیں —

۱۰ جون کو چھپرے سے مظفرپور پہنچے۔ اسٹیشن پر مولانا شفیع داؤدی صاحب اور شہر کے سر برآوردہ مسلمان، مسلم لیگ کے والنٹیر اور کا رکن اور کانگرس کے نمایندے موجود تھے۔ مولانا شفیع داؤدی صاحب کے دولت کدے پر قیام کیا۔ مولانا پرانے قوم پرست اور قومی کارکن ہیں اور انہوں نے بہت کچھ ایثار کیا ہے۔ ان میں اب بھی وہی مستعدی اور جوش موجود ہے جو پہلے تھا۔ وہ تمام دن ہمارے کام میں مصروف رہے اور اُن کی بدولت مظفرپور کا سفر خاطر خواہ کامیاب رہا۔ سہ پہر کو ہم نے سعد پورہ لائبریری اور وہاں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسوں کا معائنہ کیا۔ شام کو ذکی حسن صاحب کے مکان پر ایک مشاورتی جلسہ

ہوا اور کھانا کھانے کے بعد مسلم کلب کے میدان میں ایک عام جلسہ مولانا شفیع داؤدی صاحب کی صدارت میں ہوا - یہ بہت بڑا جلسہ تھا اور ہر طبقے کے لوگ شریک تھے - میں نے اور پروفیسر نجیب اشرف نے تقریر کی - ضروری تجاویز پیش ہوئیں جن پر پہلے سے کامل غور ہو چکا تھا - انجمن کی شاخ کو از سر نو مضبوط کیا گیا - خان بہادر سید ظہیر الدین پرنسپل ٹریننگ کالج انجمن کے صدر اور مولوی سید مجتبیٰ ایڈوکیٹ سکرٹری منتخب ہوئے - یہ جلسہ گیارہ بجے شب کے ختم ہوا اس کے بعد تین مرکزوں کا معائنہ کیا جہاں بچوں اور بالغوں کی پڑھائی کا انتظام کیا گیا ہے - ایک مدرسے میں پندرہ ہندو لڑکے بھی اردو پڑھ رہے تھے - باقی دو میں مسلمان بالغ اور بچے تعلیم پاتے ہیں - پروفیسر نجیب اشرف بعض مجبوریوں کی وجہ سے پٹنے واپس چلے گئے —

ہم مولانا شفیع داؤدی اور دیگر اہل مظفر پور کے بہت شکر گزار ہیں کہ وہ بڑے خلوص اور گرم جوشی سے پیش آئے، ہمارے کام میں ہر طرح کی مدد دی اور آیندہ انجمن کے مقاصد کو زیادہ مستعدی سے عمل میں لانے اور موجودہ کاموں کو ترقی دینے کا وعدہ کیا —

دوسرے روز مظفر پور سے لہریا سرائے ( دربھنگہ ) پہنچے - مولوی مصلح الدین صاحب ڈاکٹر محمد فرید اور مولوی عبدالحفیظ صاحب سکرٹری انجمن ترقیء اردو دربھنگہ اور بعض سربرآوردہ حضرات سے اسٹیشن ہی پر ملاقات ہوئی - ڈاکٹر محمد فرید صاحب بہت مخلص اور پر جوش کام کرنے والے ہیں - انہوں نے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا ہے جس کے ساتھ دارالاقامہ بھی ہے - مدرسے اور دارالاقامہ کی عمارت بہت وسیع اور خوشنما ہے - ہمارا قیام مولوی مصلح الدین صاحب وکیل

کے مکان پر ہوا - شام کو مجلس مشاورت ہوئی اور بعض تجاویز پر غور ہوا - شب کو ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ مدرسہ کے میدان میں جلسہ ہوا - بہت اچھا مجمع تھا اور ہندو مسلمان اور ہر طبقے کے لوگ شریک تھے - تجویزوں پر بہت گرم اور پر جوش تقریریں ہوئیں - ڈاکٹر محمد فرید اور مولوی عبدالحفیظ صاحب سے کامل توقع ہے کہ وہ دربھنگے میں اردو کی ترویج و ترقی میں پوری کوشش فرمائیں گے -

۱۲ جون کی سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کٹیہار پہنچے - وہاں کے بعض سربرآوردہ اصحاب اور کارکنوں سے گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ ۱۳ جون کی صبح کو کشن گنج چلے جائیں اور ۱۴ جون کو کٹیہار واپس آکر یہاں کام کریں - چنانچہ ہم دوسرے روز علی الصبح کشن گنج پہنچے - وہاں تمام دن اور رات مسلسل بارش رہی - تاہم وہاں کے وکلاء مختار، کار پرداز، عمال اور عام مسلمان مسجد میں جمع ہوگئے اور وہیں انجمن ترقیء اردو کا جلسہ قرار پایا - مولوی امام علی صاحب ایڈوکیٹ نے کشن گنج کے حالات سنائے اور مولوی عبدالغنی صاحب وکیل نے لوکل بورڈ کے تعلیمی اعداد و شمار دیے - میری تقریر کے بعد انجمن ترقیء اردو کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کے صدر مولوی فضل الرحمن صاحب ایم - ایل - اے اور سکرٹری مولوی محمد سلیمان صاحب بی - اے، بی - ایل منتخب ہوے - مولوی فضل الرحمن صاحب اس زمانے میں کشن گنج میں نہ تھے، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی - لیکن یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ وہ بہت مخلص کام کرنے والوں میں ہیں - ہمیں امید ہے کہ ان صاحبوں کی کوشش سے کشن گنج میں انجمن کی شاخ ضرور مفید کام کرے گی -

دوسرے روز ہم کٹیہار واپس آئے - شب کو مسجد میں بہت بڑا

جلسہ ہوا - میری تقریر کے بعد حاضرین نے حتمی وعدہ کیا کہ وہ ایک مہینے کے اندر ہر ہر محلے میں اردو مدرسے خاص کر شبینہ مدرسے جاری کردیں گے اور انجمن کے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے پوری کوشش کی جائے گی - اور دیہات میں برسات کے بعد کام شروع کیا جائے گا - اسی وقت انجمن کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کے صدر مولوی رضی الدین صاحب وکیل اور سکرٹری ڈاکٹر مظفر صاحب منتخب ہوے -

ان تمام مقامات میں جو تجویزیں پیش ہوئیں وہ بہت کچھ مشترک تھیں - خصوصاً ایک بات ایسی تھی جس کے متعلق ہر جگہ شکایت سننے میں آئی - بہار گورنمنٹ کا ایک سرکلر اس مضمون کا اس سے قبل دو وزارتوں میں لوکل باڈیز کے نام شایع ہوا تھا کہ جہاں کہیں لوئرپرائمری اور اپر پرائمری مدرسوں میں چھ اردو پڑھنے والے ہوں وہاں ایک اردو داں معلم کا تقرر کیا جائے - موجودہ حکومت نے بھی اس سرکلر کو شایع کیا لیکن اس کے ساتھہ ہی یہ تشریح بھی کر دی کہ لوکل باڈیز خود مختار ادارے ہیں ان کے معاملات میں ہم مداخلت نہیں کرنا چاہتے یہ صرف بطور مشورے کے لکھا جاتا ہے - اس تشریح سے اصل سرکلر کا مقصد فوت ہوجاتا ہے - اس بنا پر ہر جگہ بالاتفاق یہ قرارداد منظور کی گئی کہ بہار گورمنٹ اس سرکلر کی تعمیل پر اصرار کرے اور اگر وہ عمل نہ کریں تو ان کی امداد بند کردی جائے - اردو داں طبقے کا یہ مطالبہ بالکل جائز ہے ' ایسے سرکلر کے نفاذ سے کیا حاصل جس کی تعمیل کی کوئی توقع نہ ہو بلکہ جس میں عدم تعمیل کا اشارہ ہو —

# ۴ - انجمن کے دو نمایندوں کا دورہ سی پی اور برار وغیرہ میں

میری تحریک پر علی شبر صاحب حاتمی بی - اے نے تعطیلات موسم گرما میں سی پی اور برار وغیرہ کے دورے کا قصد کیا - حاتمی صاحب بہت پر جوش اور مستعد کام کرنے والے نوجوان ہیں - انہوں نے اپنے ساتھ ایک اور طالب علم اسرار حسین صاحب کو بھی لے لیا - ان دونوں نے شدید گرمی کے زمانے میں دن رات بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا اور ایسا کام کیا کہ دوسروں کے لیے نمونہ ہوسکتا ہے - میں ان کی ہمت پر آفریں کہتا ہوں - اگر ایسے چند سرگرم اور بے نفس کام کرنے والے مل جائیں تو ہماری کامیابی یقینی ہے - اس دورے کی مفصل رپوٹ زیر ترتیب ہے اور عنقریب شایع کی جاے گی ' یہاں اس کی بہت مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ہے —

دورے کا آغاز ناگپور سے ۱۷ اپریل کو ہوا اور ۱۰ جولائی کو ختم ہوا - اس عرصے میں انہوں نے سی پی اور برار نیز دیگر مقامات کا معائنہ کیا جس کی تفصیل یہ ہے —

(الف) صوبۂ متوسط و برار کے ۱۹ اضلاع کے صدر مقام ' ۹۰ تحصیلیں ' ۳۵ قصبات اور دیہات اور اس کے علاوہ صوبے کی دو ریاستیں راج ناندگانو اور ڈونگر گڑھ (کھیراگھڑھ) —

(ب) خاندیس میں جلگانو ' بھوساول ' دھولیہ ' چالیس گانو —

(ج) سنٹرل انڈیا ایجنسی میں اندور ' مئو چھاونی —

(د) ان کے علاوہ حاتمی صاحب نے ممالک متحدہ میں الہ آباد ' فتحپور ' تحصیل کھاگا کے دیہات شاہ پور ' ایرایاں ' ہتگام ' مہلیا اور

ناتھوپور کا دورہ کیا —

ان مقامات میں انہوں نے مفصلۂ ذیل انجمن کی شاخیں اور شبینہ مدرسے قائم کیے —

(۱) ناگپور کمشنری میں انجمن کی ۳۳ شاخیں اور اسی قدر شبینہ مدرسے قائم کیے —

(۲) جبل پور کمشنری میں انجمن کی ۲۳ شاخیں اور اسی قدر مدرسے -

(۳) چھتیس گڑھ میں انجمن کی ۲۳ شاخیں اور اسی قدر مدرسے -

(۴) برار میں انجمن کی ۳۱ شاخیں اور اسی قدر مدرسے -

چھتیس گڑھ اور جبل پور کمشنری کی ڈسٹرکٹ کونسلوں کا ایک بھی اردو مدرسہ نہیں اور مسلمان بچوں کو جن کی زبان اردو ہے ہندی پڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں —

اضلاع بیتول اور منڈلہ میں اردو کا ایک مدرسہ بھی نہیں ' نہ میونسپیلٹی کی جانب سے اور نہ ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے —

سونسر' لکھنا دون ' امرواڑہ' رام ٹیک' بیتول ' منڈلہ ' ملتائی ' منگیلی ' وارہ سیونی اور بعض دوسرے مقامات میں جہاں ارد و پڑھنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں -

صوبے کے مسلمانوں میں اردو پڑھنے کا زبردست احساس موجود ہے - جن مقامات میں حکومت ' ڈسٹرکٹ کونسل اور میونسپیلٹی کی طرف سے کوئی انتظام نہیں وہاں انہوں نے خانگی مکتب کھول رکھے ہیں - منگیلی کے خانگی اردو مکتب میں ۴۵ فی صدی ہندؤں کے بچے بھی پڑھتے ہیں —

سرکاری حکام' ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپیلٹیوں کے ذمہ دار

اصحاب کا رویہ اردو کے ساتھہ اچھا نہیں - اردو اسکولوں کے رجسٹر ہندی اور مرہٹی میں لکھے جاتے ہیں اور مدرسین کو اردو میں مراسلت کرنے کا اختیار نہیں - ناگپور جیسے مرکزی مقام میں بھی اردو مدارس کا کوئی اردو داں نگراں نہیں —

باوجود اردو پڑھنے والے طلبہ کی کافی تعداد کے گزشتہ سالوں میں متعدد اردو مدارس بند کردیے گئے —

پانڈھرنا میں مسلمان بچے جو ہندی اسکول میں پڑھتے ہیں اور جن کی تعداد (۴۰) ہے سرسوتی دیوی کے سامنے کھڑے ہوکر پرارتھنا کرتے ہیں - جو مسلمان بچے ہندی اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ عام طور پر بجائے سلام کے نمستے اور جے رام جی کی کہتے ہیں —

ہندی اسکولوں میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کو رامائن ' مہابھارت ' اور ساوتری اور شیواجی کی سوانح زندگی پڑھنی پڑتی ہے - اس میں کچھہ مضائقہ نہ ہوتا اگر اس کے ساتھہ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کے سبق بھی ہوتے بلکہ یہ قومی اتحاد کے لیے مفید ہوتا —

ودیا مندر کے خلاف صوبے بھر کے مسلمان ہم آواز ہیں اور ان کی مخالفت کا سلسلہ اب تک جاری ہے —

## ۳ - مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی اردو

اپریل کے آخری ہفتے میں جب میں کلکتے میں تھا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا - اور یہ عرض کیا کہ کانگرس حکومتوں کے اکثر ارکان اور وزرا اپنی سرکاری اور غیر سرکاری

تقریروں اور تحریروں میں ہندی کی اشاعت پر زور دے رہے ہیں اور یہ کانگرس کے فیصلے کے صریحاً خلاف ہے - خصوصاً جب اس قسم کے الفاظ کسی حکومت کے وزیر تعلیم کی زبان اور قلم سے نکلتے ہیں تو اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانگرس حکومت اردو کے مٹانے اور ہندی کے رواج دینے کی کوشش کر رہی ہے - چونکہ آپ کی رائے اس معاملے میں کانگرس کے حلقوں میں زیادہ مستند سمجھی جائے گی لہذا اگر آپ ان کو ہدایت فرمادیں گے تو مناسب ہوگا - مولانا نے وعدہ فرمایا کہ وہ گشتی چٹھی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرمادیں گے - لیکن غالباً انہیں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا یا بھول گئے - اس لیے میں نے انہوں خط لکھا اور اس وعدے کی یاد دھانی کی - چنانچہ اس کے بعد انہوں نے ساتوں صوبوں کے وزیر اعظموں کے نام خط لکھے اور ہندی اور اردو کی بجائے "ہندستانی" کے استعمال کی ہدایت کی —

مولانا نے اپنے خط میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور بہت بچ بچ کو لکھا ہے - ان کا کہنا یہ ہے کہ مدراس، بمبئی، سی پی، بنگال والے ہندی اردو کے نازک فرق سے واقف نہیں اس لیے اس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں - میرا تجربہ اس کے خلاف ہے - مجھے اس معاملے میں کانگرس حکومتوں کے بعض وزرا سے ملنے کا موقع ملا اور گفتگو کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ ہندی کا دم بھرتے رہے - مثلاً جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بمبئی کی حکومت نے اپنے بجٹ میں کئی لاکھ روپے ہندی کی اشاعت کے لیے منظور کیے ہیں تو میں فوراً بمبئی پہنچا اور وہاں کے وزیر اعظم مسٹر کھیر سے ملا

اور ان کو اس طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ اصلاح کا وعدہ فرمایا اور جو میں نے کہا اسے لکھ لیا لیکن اس کے چند روز بعد ہی اپنی تقریر میں ہندی کی اشاعت کی پر زور حمایت کی اور پہلے سے زیادہ اصرار کیا- اسے کیا کہنا چاہیے؟ بھولا پن یا مکرا پن؟ - کانگرس نے صاف اور صریح الفاظ میں ہندستانی کو ملک کی زبان قرار دیا ہے پھر اس میں غلط فہمی کی گنجائش ہی کہاں ہے- گاندھی جی کے پاس تو بڑا بنایا عذر موجود ہے کہ وہ تو کانگرس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں ہیں اس لیے اُن پر کانگرس کے فیصلے کی پابندی لازم نہیں' حالانکہ ہندستانی کا رزولیوشن خود انہیں کا تجویز کیا ہوا ہے - لیکن کانگرس کے وزرا کے پاس کیا عذر ہے؟- اصل یہ ہے کہ چونکہ گاندھی جی ہندی سمیلن کے صدر اور ہندی کے سرپرست اور مربی ہیں اس لیے سب کانگرس والے انہیں کی پیروی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے- قول کچھ ہی ہوا کرے اصل چیز تو عمل ہے- لہذا جب تک "سرچشمہ" کی اصلاح نہ ہوگی یہ گدلا پن یونہیں باقی رہے گا—

---

## ۴ - اخبار مدینہ کی راے

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس گشتی چٹھی کے متعلق اخبار مدینہ کی راے قرین انصاف اور قابل غور ہے—

"ہم خود ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ اردو ہندی کے مسئلے کے بارے میں کانگرس نے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت صائب ہے اور اس

سے بہتر اور معقول فیصلے کی بحالات موجودہ کوئی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ ہندؤں کا متعصب اور تنگ نظر طبقہ اس مسئلے کے بارے میں جو خیال رکھتا ہے اور عملاً اسے جس طرح حل کرنا چاہتا ہے وہ یقیناً اردو کے لیے خطرناک ہے اور اس کی بنا پر مسلمانوں کے دلوں میں خود کانگرس کی طرف سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور انہیں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کہیں اردو کو آسان بنانے کی تحریک ہندی کی ترویج عام کا زینہ سمجھ کر تو نہیں اختیار کی گئی ہے؟ مثلاً حکومت یوپی ہی کی طرف سے جو سرکاری بیانات و اعلانات وغیرہ فارسی اور ہندی رسم الخطوں میں الگ الگ شایع ہو رہے ہیں' اُن کی زبان بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ حالانکہ کانگرس کے فیصلے کے مطابق زبان ایک ہونی چاہیے تھی اور صرف رسم الخطوں کا فرق ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح بہت سے کانگریسی لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اب ایسے الفاظ بہ کثرت استعمال کرنے لگے ہیں جن کا پنڈتوں کی مدد کے بغیر مسلمانوں کے لیے اور شاید عام ہندؤں کے لیے بھی سمجھنا دشوار ہے۔ درانحالیکہ اُن الفاظ کے ہم معنی سہک اور سادہ الفاظ روزمرہ کی زبان میں مستعمل ہیں اور خود یہ لوگ اپنی پہلے کی تقریروں اور تحریروں میں ان کے استعمال کے عادی رہ چکے ہیں۔ بہت سے ہندو اخبارات مثلاً تیج وغیرہ جو کانگریس کے علم بردار خیال کیے جا رہے ہیں' اردو کے عام اور مستعمل الفاظ کے ساتھ محسوس طور پر تعصب برت رہے ہیں اور اُن کی بجاے سنسکرت کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کو روز بروززیادہ کثرت کے ساتھ استعمال کرنے لگے ہیں۔

ایسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ خواہ کتنا ہی معقول اور صائب ہو، مسلمانوں کو بدگمانی سے کسی حال میں بچایا نہیں جا سکتا - بنا بریں ہم کانگریسی ارباب حل و عقد سے التجا کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی حکومتوں اور لیڈروں کے ان اعمال کی پوری شدت کے ساتھ نگرانی کریں، جن میں ممکن ہو بدنیتی کو دخل نہ ہو لیکن جو مسلمانوں کی بدگمانی کو تقویت پہنچانے والے ہیں - اور ہندو اخبارات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کرکے ملک کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائیں اور سمجھ بوجھ سے کام لیں" - (۷ جون سنہ ۳۸ ع)

## ۵ - ہندستان کا ایک نادان دوست -

سی پی کانگرسی حکومت کے وزیراعظم مسٹر کھرے نے ایک بڑے جلسے میں جو "یوم چین" کے نام سے کیا گیا تھا، یہ فرمایا کہ چین کے سب مسلمان چینی زبان بولتے ہیں - اسی طرح ہندستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اردو کو ترک کردیں اور ہندی اختیار کرلیں - مسٹر کھرے کانگرسی حکومت کے وزیر اعظم ہیں اور بڑے قابل سمجھے جاتے ہیں اور اس پر اُن کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ وہ اردو کو کسی غیر ملک کی زبان سمجھتے ہیں - اِس کانگرسی بوزرجمہر کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اردو خالص ہندی زبان ہے اور سوائے ہندستان کے کسی دوسرے کی زبان نہیں - یہیں پیدا ہوی اور پھیلی اور اس کے بنانے اور پھیلانے میں زیادہ تر ہندوؤں کا حصہ تھا - یہی وہ نادان دوست ہیں جو اپنے نامعقول اور بے محل مشوروں سے ملک میں نفاق

کا بیج بوتے اور قوموں میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں —

## ۶ - مسٹر ساورکر اور قومی زبان

مسٹر ساورکر نے ارشاد فرمایا کہ ہندستان کی قومی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہونی چاہیے کیونکہ ہندستان کی اکثریت کی یہی زبان ہے - اگر کوئی نیویارک کا باشندہ ایسی بات کہتا تو ہمیں تعجب نہ ہوتا بلکہ ہنسی آتی ' لیکن مسٹر ساورکر کا یہ قول سن کر نہ تعجب ہوتا ہے اور نہ ہنسی آتی ہے بلکہ ان کی سمجھ پر افسوس ہوتا ہے - وہ سنسکرت آمیز ہندی جسے وہ خود بھی نہیں جانتے ہندستان کے کسی مقام کی زبان نہیں - اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ یہ تجویز کرتے کہ اس ملک کی زبان سنسکرت ہونی چاہیے - یہ ایک زبان تو ہے گو مردہ ہی سہی -

اسی ضمن میں اخباروں سے یہ معلوم ہوا جب کہ امرتسر میں ۱۱ مئی کو مسٹر ساورکر کے سامنے اردو زبان میں اڈریس پڑھا جانے لگا تو ہندوؤں نے شور مچایا کہ ہم ملیچھوں کی زبان سننا نہیں چاہتے - یہ اڈریس ہندی زبان میں پڑھا جائے چنانچہ اردو اڈریس کا ترجمہ ہندی میں کر کے سنایا گیا —

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ساورکر نیا ہندستان اور نئی زبان اور نئی تہذیب پیدا کرنی چاہتے ہیں - اگر یہ ہے تو اُن کی یہ کوشش اور یہ جرأت مجنونانہ قابل تحسین ہے —

——*——

# ۷ - مدراس اور هندی دشمنی

جب سے مدارس کی کانگرسی حکومت نے هندی کو وهاں کے مدرسوں میں جبری طور پر رائج کرنے کا تہیہ کیا ہے اُسی وقت سے تمام دروازی قوموں اور خاص کر تامل‌ناڈ والوں کی طرف سے سخت مخالفت شروع هوگئی ہے - اخباروں سے اس کا پورا اندازہ نہیں هوتا ' وهاں جاکر اصل کیفیت معلوم هوتی ہے - میں حال هی میں مدراس گیا تھا اور وهاں مجھے کانگرسی ' غیر کانگرسی اور تامل والوں سے ملنے کا اتفاق هوا - منجملہ ان کے ایک مسز میلم بال سیوراج تھیں - یہ دبلی پتلی ' نکیلی ' سوکھی الفن بہت هی پرجوش اور مستعد خاتون ہے - هندی کی مخالفت میں جب وہ مجھ سے باتیں کررهی تھی تو یہ معلوم هوتا تھا کہ اُس کے منہ سے لفظ نہیں بلکہ انگارے نکل رہے هیں - اگرچہ اس کی گفتگو بہت تیز و تلد تھی مگر بہت دلچسپ تھی - مجھے اس کی پوری گفتگو تو یاد نہیں رهی اور یاد رهتی بھی تو میں لکھنا پسند نہ کرتا ' لیکن اس کے بعض بعض جملے اور ٹکڑے ضرور سننے کے قابل هیں - وہ کہتی یہ تھی کہ اگر هندی هی پڑھنی هوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ برهمن هندی کے ذریعہ سے سنسکرت پھیلانی شروع کریں‌گے اور هماری زبان و تہذیب کو مٹا ڈالیں گے - برهمن چاهتا ہے کہ هم وہ نامعقول ( wretched ) کتاب راماین پڑھیں ؟ هم هرگز نہیں پڑھیں گے اور آخر تک اس کا مقابلہ کریں گے - وہ هم میں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاهتا ہے مگر هم اور مسلمان ایک هیں اور یہ برهمن ( آریا ) غیر ملکی ہے - میں نے پوچھا کہ تم اور مسلمان ایک کیوں کر هوئے تو کہنے لگی کہ همارے علاقے میں جو مسلمان هیں وہ کہیں باهر سے تھوڑا

ہی آئے ہیں' ہمارے ہی بھائی بند تھے جو مسلمان ہوگئے' اور اب بھی بھائی بندوں کی طرح رہتے ہیں - اگر یہ برہمن ہم پر زیادہ جبر کریں گے تو ہم مسلمان ہوجائیں گے' ہم دونوں جنگی قومیں ہیں' برہمن ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے - میرا نام میلم بال ہے پھر میں میراں بائی ہو جاؤں گی - مجھے اس پر بے اختیار ہنسی آئی اور وہ بھی خوب ہنسی —

غرض تامل ناڈ کا ایک ایک فرد مخالفت پر تلا ہوا ہے اور ان سب کے خیالات اسی قسم کے ہیں جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں - مسٹر سی راج گوپال چاریار جہاں جاتے ہیں' کالے جھنڈوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے - روزانہ ان کے مکان کے سامنے کئی کئی شخص دھرنا دیتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں - وہ جلسوں' جلوسوں' کانفرنسوں' دھرنا دینے' فاقے کرنے اور کالے جھنڈوں سے اپنی مخالفت کا اظہار کررہے ہیں - اس میں لڑکے' جوان' ادھیڑ سب قسم کے لوگ شریک ہیں - مخالفت کی یہ سب ترکیبیں خود کانگرس کی سکھائی ہوئی ہیں اور آج وہ کانگرس کے خلاف انہیں ترکیبوں سے کام لے رہے ہیں - فاقے کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام مسٹر استالن جگدیسن ہیں - میں بھی انہیں دیکھنے گیا تھا' اُس دن (۱۶ جولائی کو) اُن کا ۷۸ واں فاقہ تھا - وہ ایک کوچ پر خاموش پڑے تھے' ان کے اوپر ایک سفید چادر پڑی تھی اور چہرہ اور سر کھلا تھا - لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا' آتے تھے اور چپ چاپ دیکھ کر چلے جاتے تھے - دو ایک ہمدرد اُن کے پاس کرسیوں پر بیٹھے تھے - ضعف اور نقاہت کا غلبہ تھا' رنگ زرد پڑگیا تھا' بڑی بڑی کھلی آنکھیں بے کسی ظاہر کر رہی تھیں - اس شخص کو دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا اور افسوس بھی ہوا -

ان کی شکایت یہ ہے کہ (۱) حکومت اقلیتوں کی زبان اور تہذیب

کی پروا نہیں کرتی - (۲) کانگرس نے کبھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہندی جبراً پڑھائی جائے اور نہ انتخاب کے وقت تقریروں اور تحریروں میں اس کا اظہار کیا - (۳) وزیر اعظم کا ایک مقصد اس جبری تعلیم سے ایک خاص جماعت کو فائدہ پہنچانا ہے - یعنی ہندی پرچار سبھاؤں کے لوگوں کو جو کانگرس کے رضاکار بھی تھے روزگار پیدا کرنا ہے - (۴) ہندی کے رائج کرنے سے فرقہ واری تفرقہ اور زیادہ بڑھے گا - کیونکہ وزیر اعظم کا اصل مقصد غیر برہمنوں کو دبانا اور پائمال کرنا ہے - پولٹیکل برہمن اب تک اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ آریا ہے اور غیر برہمن دراوڑی ہے - (۵) شمالی ہند کے سیاست کاروں کا منصوبہ یہ ہے کہ جب انگریزوں کا قدم درمیان میں نہ رہے تو جنوبی صوبے پر اپنی حکومت جمائیں - ہندی کی جبری ترویج اس منصوبے کو عمل میں لانے کا صرف پہلا قدم ہے - (۶) سب سے ضروری اور اہم مسئلہ جہالت کا رفع کرنا ہے - اس لیے جو مصارف ہندی کی جبری تعلیم پر کیے جا رہے ہیں وہ اگر جہالت رفع کرنے پر کیے جائیں تو زیادہ مفید ہوگا - (۷) ہندی اگر رائج ہی کرنی ہے تو اختیاری ہونی چاہیے - اسے جبری قرار دینا کسی حال میں مناسب نہیں —

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اعتراض پیش کیے گئے ہیں - ان میں کسی قدر مبالغہ اور بدگمانی پائی جاتی ہے جو درست نہیں - البتہ ان کا یہ کہنا کہ مدرسوں میں ہندی ایک اختیاری مضمون رکھا جائے بہت معقول ہے - جبری رواج کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ ہرگز جائز نہیں ہے - لیکن وزیر اعظم کا اصرار ہے کہ میں اسے جبراً رائج کر کے چھوڑوں گا اور مخالفین کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گا -

دوسری نازیبا بات جو اس نزاع میں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ وزیر اعظم کے مکان یا بعض مدرسوں کے سامنے (جن میں ہندی جبری تعلیم رائج کی گئی ہے) دھرنا دیتے ہیں، انہیں بہت سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ ایسی معمولی حرکتوں کے لیے چھ چھ مہینے اور سال سال بھر کی قید بامشقت کی سزا انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ مخالفت کی روک تھام نہ ہوئی بلکہ اچھا خاصا انتقام ہوا۔ اس پر مخالفوں کا یہ کہنا کہ جس حکومت کو کانگرس والے شیطانی کہتے تھے یہ تو اس سے بھی زیادہ شیطانی نکلی، کچھ زیادہ بیجا نہیں ہے —

اس تمام تنازع میں ایک بات اچھی ہوی کہ اب وزیر اعظم بجائے ہندی کے ہندستانی کہنے لگے ہیں۔ اس میں انجمن ترقیء اردو کی کوشش کو بھی کچھ دخل ہے۔ مخالف یہ کہتے ہیں کہ یہ محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس بارے میں کانگرس رزولیوشن کا صاف اور صریح الفاظ میں موجود ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مخالفت دونوں کی طرف سے ہورہی ہے تو انہوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ہندی کو چھوڑ کر ہندستانی کہنے لگے ورنہ آنریبل راج گوپال چاریار جو گاندھی جی کے ہر ارشاد کو الہام و وحی سمجھتے ہیں، ویسے اس پر مشکل سے رضامند ہوتے —

---

# ۹ - ایک نہایت خطرناک تجویز

اخباروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیا صدر کانگرس کمیٹی علاقۂ آندھرا نے بیان کیا ہے کہ مہاتما گاندھی جدید تقسیم ہندستان کے متعلق ایک مفصل اور جامع اسکیم تیار کر رہے ہیں- یہ تقسیم زبانوں کی رو سے ہوگی - یعنے ہر زبان بولنے والوں کے صوبے الگ الگ کردیے جائیں گے اور ہر صوبے کی کوئی خاص زبان قرار دے دی جائے گی - مثلاً بنگال کی بنگالی، صوبۂ متحدہ اور صوبۂ بہار کی ہندی ' پنجاب کی پنجابی، مہاراشٹر کی مرہٹی ' گجرات کی گجراتی اور جنوبی علاقہ توڑ کر اور اس کے الگ الگ حصے کرکے تلنگی ' تامل ' کنڑی ' ملیالم وغیرہ بولنے والوں میں تقسیم کر دیا جائے گا - اور اس وقت جو تقسیم ہے وہ زبان کی بنیاد پر بدل دی جائے گی - اب ذرا آپ غور کیجیے کہ اردو کس خطے کی زبان ہوگی —

اس سے پہلے انگریزوں نے تقسیم کی تھی ' وہ مسلمانوں سے ناراض تھے ' اس لیے دلی کو نکال کر پنجاب سے ' سندھ کو بمبئی سے ' بہار کو بنگال سے ملا دیا - اب کانگرس کی حکومت آئی ہے وہ بھی مسلمانوں سے کچھہ خوش نہیں معلوم ہوتے ' یہ جو تقسیم کریں گے تو اس سے اردو زبان اور اسلامی تہذیب کا خاتمہ ہی ہوجائے گا - زبانوں کی بنا پر جو تقسیم کی سوچی گئی ہے یہ بڑی گہری چال ہے - جنوبی ہند کے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے - ریاست حیدرآباد کا کیا حشر ہوگا - اس تجویز کی رو سے تلنگانہ آندھرا صوبے میں جا ملے گا' مرہٹواڑی کا علاقہ مہاراشٹر کو مل جائے گا اور کنڑی کا علاقہ صوبۂ کرناٹک کو دے دیا جائے گا —

مدت ہوئی کانگرس نے بھی اس قسم کا ایک رزولیوشن منظور کیا لیکن اس وقت وہ محض کاغذی قرارداد سمجھی گئی تھی - اب اتفاق زمانہ سے کانگرس کو حکومت بھی مل گئی ہے ' بہت ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس پر عمل کرنا شروع کریں - اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی ایسا منصوبہ سوچا جا رہا ہے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے ملک میں نئے نئے جھگڑے اور فساد نہ پیدا ہو جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اس اسکیم پر اصرار کریں جو پاکستان کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور جو اب تک ایک خیالی چیز سمجھ کر قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی - اس نئے منصوبے کے بانیوں کو ان تمام باتوں پر پوری طرح غور کرلینا چاہیے —

---

# تبصرے

# تبصرے

# ادب

## واقعات اظفری

(مترجمہ مولوی محمد حسین صاحب محوی، لکچرار اورینٹل ری سرچ انسٹیٹیوٹ مدراس یونیورسٹی - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے - اردو میں ایسی کتابیں جن میں دلچسپی کے ساتھ معلومات بھی ہوں اور معلومات بھی ایسی جو دوسری کتابوں میں نہ ملتی ہوں، بہت کم شایع ہوتی ہیں —

اس کتاب کے مصنف میرزا محمد ظہیرالدین علی بخت اظفری دہلوی گورکانی ہیں - یہ شاہ عالم بادشاہ کے ہم جد اور انہیں کے عہد میں تھے - شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر خلد مکان کی پوتی نواب عفت آرا بیگم کے نواسے ہوتے ہیں - اظفری قلعۂ معلی میں پیدا ہوے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی - تیس سال تک وہ قلعہ میں رہے جسے وہ قید سلاطینی سے موسوم کرتے ہیں اس لیے سلاطین (یعنی بادشاہ کے ہم جد

لوگوں ) پر سخت پابندیاں تھیں اور ان پر بڑی نگرانی رکھی جاتی تھی - ان کی ڈیوڑھیاں تین پھر کو دن ڈھلے بند ہو جاتی تھیں اور ہر دروازے میں اندر اور باہر تین تین قفل لگا دیے جاتے تھے - اسی لیے اسے سلاطینی قید کہتے تھے - غلام قادر خاں نمکحرام کا واقعہ اظفری کی آنکھوں سامنے ہوا - قلعہ کے حالات ایسے خراب ہوگئے تھے اور اس پر شب و روز کی قید ' کہ اظفری نے نکل بھاگنے کی ٹھان لی - علاوہ اس کے ان کی جان نثارانہ خدمات کے صلے میں بادشاہ نے بہت سے وعدے کیے تھے مگر ایفا نہ کیے - اس سے بھی وہ بہت بد دل ہوگئے - آخر قلعے کے بعض ملازموں سے سازش کر کے نکل بھاگے - جے پور اور جودھ پور وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے - سات سال وہاں قیام کیا - نواب آصف الدولہ نے بیحد عنایتیں فرمائیں - مگر دکن کی لولگی ہوئی تھی - حیدرآباد کے نواب آصف جاہ بہادر اور مدراس کے امیر الہند والا جاہ سے ملنے کا اشتیاق تھا - آخر لکھنؤ سے چل کھڑے ہوے اور سنہ ۱۲۱۲ ھ میں مدراس پہنچ گئے - یہاں اُن کی بڑی قدر ہوئی اور آخر دم یعنے سنہ ۱۲۳۴ ھ تک یہیں رہے —

اگرچہ اُس زمانے میں بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار اور بے بس تھے مگر اظفری جہاں کہیں گئے ان کی قدر و منزلت بادشاہوں کی سی ہوئی - چنانچہ جے پور کے راجہ کی ملاقات کے ضمن میں لکھتے ہیں :—

" اس مہینے کی تیرھویں تاریخ ' چودھویں کی آدھی رات کو خود راجہ نے ہمارے ہاں آکر نہایت شایستہ طریقے پر ملاقات کی - ہمارے خاندان کے آداب کے مطابق سلام گاہ میں جاکر مجرا ادا کیا - پھر نزدیک آکر ایک سو ایک اشرفیاں نذر

گزرانیں- پھر آداب گاہ میں جا کر آداب بجا لایا- میں نے
اشارے سے پاس بلایا- مگر جب دیکھا کہ بہت دیر سے کھڑا ہے
اور طول طویل داستان چھیڑ دی ہے تو بیٹھ جانے کا
اشارہ کیا مگر وہ نہ بیٹھا" —

اس کتاب میں اظفری نے اپنی سیر و سفر کے علاوہ قلعۂ مبارک کے بھی بہت سے حالات لکھے ہیں - یہ باتیں تاریخوں کے صفحات میں نہیں ملتیں' لیکن اصل تاریخ یہی ہیں- اس حیثیت سے یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے- اس کے علاوہ جہاں جہاں وہ گئے ہیں وہاں کی عجیب چیزوں' رسم و رواج وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے- رستے میں جو دشواریاں پیش آئی ہیں وہ بھی لکھتے جاتے ہیں اور جن قابل قدر لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں انہیں بھی بیان کر دیا ہے - اہل مدراس کے طور طریق' آب و ہوا' عادات و اخلاق پر بھی تبصرہ کیا ہے —

اظفری صاحب ذوق اور ذی علم شخص تھے - علم طب' رمل' عروض و قافیہ میں پوری مہارت رکھتے تھے- فارسی' اردو' ترکی کے بہت اچھے ادیب اور شاعر اور تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے- علاوہ دیوانوں کے کئی کتابوں کے مصنف تھے- ہماری نظر سے ان کا اردو کلام گزرا ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر زبان کی خاطر شعر کہتے تھے اور خاص کر قلعۂ معلیٰ کی زبان اور محاورے نظم کرتے تھے—

مولوی محمد حسین صاحب محوی نے ترجمہ بہت سلیس اور فصیح زبان میں کیا ہے - یہ مدراس یونیورسٹی کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو کی پہلی کتاب ہے جو شایع ہوئی ہے اور ہم

یونیورسٹی کو اس عمدہ انتخاب پر مبارک باد دیتے ہیں - کتاب ٹائپ میں بہت صاف ستھری چھپی ہے —

---

## دیوان بیدار

(مرتبہ مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی
لکچرر اردو مدراس یونیورسٹی - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

یہ مدراس یونیورسٹی کے اور ینٹل ری سرچ انسٹیٹیوٹ شعبۂ اردو کی دوسری کتاب ہے - میر محمدی بیدار اردو کے ممتاز شعرا میں سے ہیں - خواجہ میر درد کے عقیدت مند احباب میں سے تھے اور انہیں اپنا کلام بھی دکھایا ہے - میر تقی میر سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے - انہوں نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے - صاحب ذوق صوفی منش تھے - کلام میں ان کے سادگی لطف اور درد پایا جاتا ہے - زبان کی صحت اور صفائی میں بیدار نے بھی دوسرے اساتذہ کی طرح کام کیا ہے —

محوی صاحب نے یہ نسخہ دو نسخوں سے مرتب کیا ہے - ایک نسخہ تو انہیں خان بہادر آنریبل عبدالقدوس بادشاہ مدراس سے ملا اور دوسرا نسخہ سکرٹری انجمن ترقیٔ اردو نے دیا - مدراس والا نسخہ پورا نہیں بلکہ انتخاب ہے دوسرا نسخہ کامل ہے ' اس میں ان کا فارسی دیوان بھی شامل ہے —

محوی صاحب نے اسے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور شروع میں

ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے —

---

## آئی - سی - ایس

(مولفہ سید علی عباس حسینی صاحب - انڈین پریس الہ آباد -
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ چودہ فسانوں کا مجموعہ ہے جو سید علی عباس حسینی صاحب کے طبعزاد ہیں - اس قسم کے فسانے ہمارے ادب میں بالکل جدید ہیں اور اس زمانے میں اس کا چرچا زیادہ ہوگیا ہے' اچھے برے سب ہی طرح کے لکھنے والے ہیں - لیکن سید صاحب کے یہ فسانے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی - وہ لکھنے کے گُر سے خوب واقف ہیں - ادبی خوبیوں کے ساتھہ زبان میں سلاست اور روانی ہے اور قصے کے لکھنے کا ڈھنگ بہت اچھا ہے - ان میں نقالی نہیں جیسا کہ اکثر فسانوں میں پائی جاتی ہے بلکہ انہوں نے ایسی چیزیں لکھی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اور جن کا تعلق ہمارے وطن اور معاشرت سے ہے - وہ ہر قسم کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں - رنج و الم' مسرت و انبساط' مزاح و ظرافت' جھگڑا ٹنٹا عشق و محبت غرض ہر قسم کی واردات کو سلیقے سے نبھالے گئے ہیں - یہ فسانے پڑھنے کے قابل ہیں اور بعض ان میں ایسے ہیں جو انتخاب کے قابل ہیں -

ایک آدھ جگہ کتابت کی غلطی یا سہو قلم ہوگیا ہے' مثلاً حجر (بمعنی پتھر) کو ہجر' نقیہ کو نقیہ لکھہ دیا ہے یا نذر کی بجائے نذری

جو صحیح نہیں ہے —

## میخانۂ الہام

( دیوان شاد عظیم آبادی، مرتبۂ حمید عظیم آبادی صاحب۔
مطبوعۂ برقی مشین پریس بانکی پور، پٹنہ )

شاد عظیم آبادی اردو کے نہایت نامور شعرا میں سے تھے اور بہت پرگو تھے۔ چھپنے اور شائع ہونے سے پہلے ہی ان کا کلام ہندوستان بھر میں پھیل گیا تھا اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس سے قبل سنہ ۱۹۲۴ ع میں یعنی تقریباً تیرہ چودہ برس سے پہلے انجمن ترقیء اردو پٹنہ کی سعی سے ان کے کلام کا مجموعہ "کلام شاد حصۂ اول" کے نام شایع ہوا تھا۔ اس پر "اردو" بابت ماہ جنوری ۱۹۲۵ ع میں مفصل تبصرہ لکھا گیا تھا۔ اس لیے اب اس پر کچھ لکھنا لا حاصل ہے۔ البتہ جناب حمید عظیم آبادی کی کوشش اور محنت کی داد دینی ضروری ہے۔ انہوں نے حق شاگردی ادا کردیا ہے اور اس مجموعے کو بڑی نفاست اور خوبی سے طبع کرایا ہے۔ کلام بھی اس میں پہلے مجموعے سے زیادہ ہے۔ شاد کے قدردان اس کی ضرور قدر کریں گے —

## خطبات صدارت

( آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ )

گزشتہ سال مارچ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ

جوبلی بڑی شان سے منائی گئی تھی - علاوہ اور باتوں کے اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ بارہ مختلف شعبوں کے الگ الگ اجلاس ہوئے - یہ گیارہ شعبے یہ تھے :

(۱) شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت - (۲) شعبۂ تعلیم نسواں (۳) شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارس اردو - (۴) شعبۂ اعلیٰ تعلیم (۵) شعبۂ اردو پریس کانفرنس - (۶) شعبۂ اسلامی علوم و فنون - (۷) شعبۂ مدارس اسلامیہ - (۸) شعبۂ خواندگی و تعلیم بالغاں - (۹) شعبۂ اردو کانفرنس - (۱۰) شعبۂ صنعتی تعلیم - (۱۱) شعبۂ تعلیم ثانوی -

ان تمام خطبوں کی تعداد بارہ ہے' اردو پریس کانفرنس کے دو اجلاس ہوے اور دو خطبے الگ الگ پڑھے گئے - ہر شعبہ کا صدر اپنے فن کا ماہر تھا - اس لیے یہ خطبے بہت بصیرت افروز اور مطالعہ کے قابل ہیں - اور امید کی جاتی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کثرت سے ہوگی اور خاص کر وہ اصحاب جو تعلیم اور زبان کا شوق رکھتے ہیں اس کی پوری قدر کریں گے —

## Hali's Poetry

(حالی کی شاعری - مولفہ جناب محمد طاہر جمیل ایم - اے - ٹی بی تارا پوری والا اینڈ سنز بمبئی)

اگرچہ اردو میں مولانا حالی کے کلام پر بہت کچھہ لکھا جا چکا ہے اور انگریزی میں بھی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ان کا ذکر آتا

ہے لیکن اب تک انگریزی میں کوئی مستقل کتاب ان کی شاعری پر نہیں لکھی گئی تھی - محمد طاہر جمیل صاحب کی یہ سعی بہت قابل تحسین ہے —

دراصل ان کا یہ ایک مقالہ تھا جو انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے گرفتھہ میموریل پرائز کے لیے لکھا تھا جو یونیورسٹی نے منظور کیا - بعد ازاں انہوں نے اس کی نظر ثانی کی اور اس میں بہت کچھہ اضافہ کیا اور کتاب کی صورت میں شایع کیا —

یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے - پہلے باب میں حالی کی زندگی کے مختصر حالات اور ابتدائی کلام کا ذکر ہے - دوسرے باب میں مسدس پر بحث ہے - تیسرے باب میں ان کی دوسری نظموں کا ذکر ہے - چوتھے میں مرثیوں کا بیان ہے اور پانچواں خاتمۂ کلام ہے جو صرف چار صفحے کا ہے —

شاعر کے خیالات اور مقصد کی تشریح کے ضمن میں قابل مولف نے جابجا اصل اشعار نقل کیے ہیں اور ان کے ساتھہ انگریزی ترجمہ بھی دے دیا ہے - مولف نے نہ صرف حالی کے کلام کے سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کا جو اثر ملک اور قوم پر ہوا اور اس نے زبان کے بنانے اور قوم کی اصلاح میں جو کام کیا ہے اُسے بھی سمجھا اور بیان کیا ہے - اگرچہ یہ کتاب اُس اعلیٰ پایہ کی نہیں جس کی توقع حالی کے قدردان کرتے ہیں لیکن مولف کے شوق اور خلوص اور محنت میں مطلق شبہ نہیں - ان کا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے یہ ہے کہ وہ جو لوگ اتنی اردو نہیں جانتے کہ اصل کو پڑھ کر اس سے مستفید ہوسکیں وہ حالی کے حالات اور اس کے کلام کی خوبیوں سے واقف ہوسکیں اور یہ معلوم

کرسکیں کہ اس نے اردو زبان کے بنانے اور قوم کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے اور اردو شاعری کی اصلاح میں کیسا عظیم الشان کام کیا ہے - اس مقصد کو اس کتاب نے پوری طرح انجام دیا ہے —

# طب

## کلیات ادویہ

(حکیم محمد کبیر الدین صاحب کی تالیف ہے- جسے دفتر المسیح قرول باغ دہلی نے شائع کیا ہے - کتاب $\frac{۲۲\times۲۰}{۸}$ سائز کے ۹۵۰ صفحات پر مشتمل ہے - لکھائی چھپائی بھی اچھی اور کاغذ بھی اچھا ہے - کتاب کی قیمت پانچ روپیہ رکھی گئی ہے جو حجم اور اس کی خوبصورت جلد کو دیکھتے ہوے کچھہ زیادہ نہیں ) —

حکیم محمد کبیرالدین صاحب اُن لوگوں میں ہیں' جو ہمیشہ کچھہ نہ کچھہ لکھتے ہی رہتے ہیں - آپ کی متعدد کتابیں طبیہ کالج دہلی اور ہندستان کے دوسرے طبی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں- علم الادویہ کے متعلق عربی' فارسی اور اردو کی طبی کتابوں میں متفرق طور پر جو کچھہ موجود تھا' حکیم صاحب موصوف نے یہ سب نہایت عمدگی اور قرینے کے ساتھہ اپنی اس تالیف میں جمع کردیا ہے - کتاب کے آخر میں چند صفحات معالجات کے لیے بھی مخصوص کردیے گئے ہیں- اگر حکیم صاحب آئندہ اپنی تالیفات و تصنیفات کو غیر مانوس

اور ثقیل عربی اصطلاحوں سے آلودہ نہ کریں تو اچھا ہو۔ حکیم صاحب کی یہ کتاب موضوع اور اپنی افادی حیثیت سے اس قابل ہے کہ کسی طبیب کا مطب اس سے خالی نہ رہنا چاہیے۔

## دیسی فارما کو پیا موسوم بہ علاج بالمرکبات

(حکیم سید محمد اکبر علی زیدالبھری فاضل الطب والجراحت کی یہ تالیف $\frac{۳۰\times۲۰}{۱۶}$ سائز کے ۱۶۰ صفحوں میں چھپی ہے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ خوبصورت جلد مضبوط اور خوبصورت لیکن قیمت دو روپیہ بہت زیادہ اور غیر مناسب ہے)۔

حکیم صاحب نے اپنی اس فارماکوپیا میں صرف وہی نسخے درج فرمائے ہیں جن کا تجربہ وہ خود کر چکے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب صاحب زادہ ممتاز حسین زیدی البھر ضلع سیال کوٹ سے طلب فرمائیں۔

## مذہب و سیر

### تابعین۔

مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ قیمت چار روپے حجم ۵۰۸ تقطیع $\frac{۲۶\times۲۰}{۸}$)

مجلس دارالمصنفین اعظم گڈھ نے سیرۃ النبی اور سیر صحابہ پر اچھی کتابوں کا ایک سٹ شائع کیا ہے - اس سلسلہ میں ان کے بعد ان بزرگوں کا درجہ ہے جو والذین اتبعوھم باحسان کے آسمانی خلعت سے مفتخر و مکرم ہیں - اس لیے اب دارالمصنفین نے بزرگ تابعین کا تذکرہ شائع کرنا شروع کیا ہے - یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو دارالمصنفین کے سلسلۂ نشریات کی ۶۲ ویں کتاب ہے —

اس کتاب میں مرتب نے متداول کتب رجال سے ۹۶ تابعین کا تذکرہ درج کیا ہے اور دلچسپ بناکر درج کیا ہے - یہ کتاب اس لائق ہے کہ مسلمان اس کو پڑھ کر اپنے بزرگوں کے کارناموں سے سبق حاصل کریں اور دیکھیں کہ پچھلے بزرگوں نے جنھیں صحابہ کرام کا فیض تربیت میسر آسکا تھا کس طرح زندگی بسر کی اور ان میں کس قدر آھنگ عمل پایا جاتا تھا —

مرتب کی محنت کی داد ملنی چاھیے - مگر کیا اچھا ھوتا کہ روایات پر تنقیدی نظر بھی ڈالی جاتی اور ھر تذکرہ کو تحقیق کے بعد درج کیا جاتا - بعض ایسی باتیں درج ھوگئی ھیں جن کا مرتبہ افسانہ سے زیادہ نہیں - کچھہ تسامح اور فرو گزاشتیں بھی ایسی رہ گئی ھیں جو دارالمصنفین کے شایان شان نہیں - مثلاً اس کتاب میں حضرت مسعر بن کدام المتوفی سنہ ۱۵۳ کا تذکرہ بھی غلطی سے درج ھوگیا ہے - حالانکہ کسی تذکرہ نویس نے ان بزرگ کو تابعی نہیں لکھا اور نہ خود مرتب نے کسی صحابی سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے - غالباً مرتب کو ابن سعد کی طبقہ داری تقسیم سے غلط فہمی ھو گئی ہے - حالانکہ ابن سعد اگر کسی بزرگ کا طبقۂ تابعین میں ذکر کرتے ھیں تو اس کا مطلب ان کو تابعی ثابت کرنا نہیں

ہوتا - حضرت ایوب سختیانی کے ذکر میں مرتب نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے حضرت انس کو دیکھا تھا - حالانکہ ابن حجر نے تہذیب میں اس کا ذکر کیا ہے —

اسی طرح بعض طباعتی غلطیاں بھی ایسی رہ گئی ہیں جن سے غلط فہمی ہوتی ہے - اگرچہ آخر میں غلط نامہ بھی لگا دیا گیا ہے مگر بعض غلطیاں اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں - مثلاً صفحہ ۲۸ میں حضرت جعفر صادق (رض) کا نسب نامہ اس طرح لکھا گیا ہے " حضرت جعفر بن محمد بن علی بن ابی طالب " حالانکہ صحیح نسب نامہ " جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب " ہونا چاہیے - اسی طرح صفحہ ۹۲ پر حضرت بکر بن عبداللہ المزنی کی وفات سنہ ۱۸۰ لکھی ہوئی ہے حالانکہ صحیح سنہ ۱۰۸ ہے - غلط نامے سے بھی اس کی تصحیح نہیں ہوئی -

اس قسم کی بعض اور غلطیاں بھی ہیں جن کی احتیاط کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہونی چاہیے —

کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں بالکل نئی چیز ہے - اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی - کتابت و طباعت دیدہ زیب دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے —

(ع - ق)

## تفسیر سورۂ والعصر

(ملنے کا پتہ منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر - اعظم گڈھ - قیمت ۲ آنے)

یہ تفسیر، سلسلۂ دائرۂ حمیدیہ کی آٹھویں کتاب ہے - مولانا حمید الدین صاحب فراھی مرحوم کی تالیف ہے جن کو خدا نے قرآنی معارف و حکم کی تفہیم کا خاص سلیقہ عطا کیا تھا - جو توقعات فاضل مولف کی شخصیت سے وابستہ ہو سکتی ھیں یہ کتاب انہیں بوجہ احسن پورا کر رھی ہے - مولوی امین احسن صاحب اصلاحی نے اس کا ترجمہ کر کے نہ صرف استاذ مرحوم سے عقیدت کا حق ادا کیا ہے بلکہ اردو ادب کی ایک شایستہ خدمت انجام دی ہے - در اصل مسلمانوں میں فہم قرآن کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے - یہ حقیقت اس کتاب کے مطالعہ ھی سے روشن ہو سکتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی تین چار آیتوں کی سورۃ بھی اپنے اندر اتنے حکیمانہ اسرار کو پنہاں کیے ہوئے ہے جن کے بیان کے لیے ٦٦ صفحات درکار ھیں - کتاب ١٢ عنوانات میں تقسیم ہے اور ہر عنوان ایک جامع بحث پر حاوی جس کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اس کے پڑھنے کے بعد ھی ممکن ہے —

(م - ز)

## تسہیل العربیۃ

(مرتبہ مولانا محمد حسین صاحب مولوی فاضل و چودھری غلام محمد صاحب بی - اے (علیگ) حجم ۱۹۸ صفحات - قیمت مجلد چار روپے اور غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے)

یہ عربی اردو لغت ہے - اردو داں اصحاب کو ایسے لغت کی بہت ضرورت تھی خوشی کی بات ہے کہ وہ ضرورت ایک حد تک اس کتاب کی تدوین سے پوری ہوگئی ہے - لیکن پھر بھی یہ مزید اصلاح کی محتاج ہے —

عربی زبان و ادب میں اعراب و اشتقاق کو جو اہمیت ہے وہ پوشیدہ نہیں - اگرچہ الفاظ پر حتی الوسع اعراب لگائے گئے ہیں لیکن پھر بھی غلطیاں رہ گئی ہیں - جب تک ابواب معلوم نہ ہوں عربی زبان کے کسی ماضی یا مضارع کے صحیح اعراب کا پتا لگنا بہت دشوار ہے - افسوس ہے کہ لائق مؤلفین نے اس بارے میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا - بعض الفاظ کے ترجمے اصلی مفہوم سے الگ ہوگئے ہیں مثلاً (صفحہ ۲) "ابن الرجل" کا ترجمہ پانو کی رگیں کیا گیا ہے - یہ مغالطہ انہیں پانو کی اس بھدی تصویر سے ہوا ہے جو 'المنجد' میں دی ہے - وہ عربی لغت کی دوسری کتابیں بھی دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس سے مراد گلتی یا ڈنیل ہے نہ کہ پانو کی رگیں - بعض جگہ ترجمے میں زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں - مثلاً (صفحہ ۳) "فرس اثیر" کے نعت میں لکھا ہے "گھوڑا جس کے کُھروں کے نشان بڑے ہوں" - گھوڑے کے کُھر نہیں ہوتے سم ہوتے ہیں —

اگرچہ اس کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ المنجد کا ترجمہ ہے —

ہمیں امید ہے کہ لائق مؤلفین آئندہ طبع کے وقت اس پر غور کے ساتھ نظر ثانی کریں گے تاکہ جو نقص باقی رہ گئے ہیں وہ رفع ہو جائیں —

باوجود اس کے ان کا کام قابل شکریہ ہے اور اس کتاب سے اردو داں اصحاب کو بہت بڑی مدد ملے گی —

## ہندی اردو لغت

مولفہ راجہ راجیسور راؤ اصغر صاحب بڑی تقطیع ' صفحات - ۴۹۱ - قیمت سات روپے آٹھ آنے )

یہ ہندی اردو کا مبسوط لغت ہے اور اس کی ترتیب میں موجودہ ہندی لغات سے کام لیا گیا ہے - ہر ہندی لفظ کے مقابل میں صحیح اردو مترادف درج ہیں - الفاظ پر اعراب بھی صحت کے ساتھ لگائے گئے ہیں - لیکن بعض الفاظ پر بلا وجہ بھی اعراب کی بھر مار کردی ہے - مثلاً "کاری" کے 'ی' پر زبر اور یاے معروف کے نیچے زیر کی مطلق ضرورت نہ تھی - پیش کے استعمال میں بھی مروجہ قاعدے کے خلاف کیا ہے - یعنی اُلٹا پیش واؤ مجہول کے لیے اور سیدھا پیش واؤ معروف کے لیے استعمال کیا ہے —

اگر ہندی لفظ جیسا کہ اردو میں لکھا ہے دیوناگری حروف میں بھی لکھ دیا جاتا تو ہندی داں اصحاب کو جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں ' بہت آسانی ہو جاتی - شاید لیتھو کی طباعت کی وجہ سے یہ بات عمل میں نہ آسکی —

راجہ صاحب ایک مشہور مولف ہیں - اور اردو زبان میں اُن کی متعدد تالیفات شایع ہوچکی ہیں - اُن کی یہ جدید تالیف بہت مفید ثابت ہوگی - جس کے لیے ملک کے تمام اردو اور ہندی داں طبقے کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے —

# متفرقات

## الکتاب الوحید

مولانا حافظ قاری محمد اسمعیل مدنی مجددی نے علم قرأت کی ایک عربی کتاب مفتاح التجوید کا ترجمہ مع اصل متن اس نام سے کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کئی بڑے بڑے قاریوں اور عالموں کی تقریظیں بھی ہیں۔ کتاب $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۸}$ سائز کے ۱۱۲ صفحات پر چھپی ہے۔ کتابت، طباعت عمدہ اور کاغذ بھی کافی اچھا لگایا گیا ہے۔ فن قرأت و تجوید سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اتحاد بک ڈپو بیرون حضور تحصیل ریاست رامپور سے آٹھ آنے میں طلب فرمائیں —

## عربوں کی جہاز رانی

(مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی - لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - تقطیع خورد - حجم ۲۰۰ صفحات - ملنے کا پتہ : اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نمبر ۳۴ چوپاٹی روڈ بمبئی ۷ سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں ہے )

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی کے ان چار خطبوں کا مجموعہ ہے جو مارچ سنہ ۳۱ ع میں انہوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں دیے تھے۔ اس میں عربوں کی جہازرانی کے حالات زمانۂ جاہلیت

سے شروع کر کے اس عہد تک بیان کیے گئے ہیں جب کہ ان کی بحری ترقی کا خاتمہ ہوا ہے —

عرب ایک طرف بحیرہ قلزم بحر عرب اور بحر ہند سے گزرتے ہوئے چین اور جاپان تک جہاز رانی کرتے تھے - اور دوسری طرف شامی سواحل سے بحر روم میں اندلس اور افریقہ کے ساحلی بندرگاہوں میں ان کے جہاز چلتے تھے - اس کتاب میں ان کے جہازوں کی ساخت - جہاز سازی کے کارخانوں - بحری معلومات - جہاز رانی کے آلات - اور بندرگاہوں - نیز جنگی بیڑوں - بحری لڑائیوں وغیرہ کے حالات اور ان کے عہد بعہد کی کیفیات بیان کی گئی ہیں - واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا راستہ بتانے والے عربی ناخدا ابن ماجد کی تفصیلی کیفیت مستند ماخذوں سے درج کی گئی ہے - فن جہاز رانی پر عربوں کی تصانیف کا بھی مفصل ذکر ہے —

لیکن مولانا نے عربی الفاظ اور قدیمی اشعار سے عہد جاہلیت میں عربوں کی جہاز رانی پر جو استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان الفاظ اور اشعار سے صرف ان کی واقفیت کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ جہاز رانی کا - آج طیران - طیارہ اور بعض اصطلاحی الفاظ بھی اس کے متعلق عربی زبان میں داخل ہو چکے ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عرب ہوائی جہاز بناتے اور اڑاتے ہیں - علیٰ ہذا قرآن کی آیتیں جو درج کی گئی ہیں وہ بھی اس کا ثبوت نہیں دیتیں کہ اس عہد میں عرب جہاز رانی کرتے تھے بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کشتی اور سمندر سے واقف ہے اصل یہ ہے کہ جس طرح دیگر ممالک ساحلی باشندے کشتیاں چلاتے تھے وہی حال ان کا تھا - حضرت عمر (رض)

کے عہد تک کوئی خاص توجہ عربوں کو جہاز رانی کی طرف نہ تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے جب کوفہ آباد کرایا تو تاکید لکھی کہ ایسی جگہ آباد کرنا کہ میں آؤں تو بیچ میں دریا نہ پڑے۔ یہی عمر ابن العاص کو لکھا جب انہوں نے مصر فتح کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اسکندریہ کو اسلامی مرکز نہ بناسکے اور دریائے نیل کے اس پار ہی خطاط کو آباد کیا —

دراصل عربوں میں جہازرانی کا آغاز امیر معاویہ کی بدولت ہوا جن کو والی شام ہونے کی وجہ سے رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی سخت ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ عہد فاروقی میں اس کی اجازت کہاں مل سکتی تھی۔ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے چند شرائط کے ساتھ امیر موصوف کو اجازت دی جس کے بعد انہوں نے جنگی بیڑہ تعمیر کیا جو یوماً فیوماً ترقی کرتا گیا —

آیات جو اس کتاب ان میں مندرج ہیں ان میں سے ایک آیت کی تشریح میں سید صاحب فرماتے ہیں :—

"ایک جگہ دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں سے ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور دونوں سے مچھلیاں اور ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں صفحہ ۳۴" —

آخری فقرہ یعنی "ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں" نہ قرآن کا مفہوم ہے نہ سوائے سید صاحب کے کسی نے ایسا سمجھا ہے۔ آیت یہ ہے

ومن کُل تاکلون لحماً طریاً وتستخرجون حلیۃً تلبسونہا۔ اور ہر ایک (سمندر) سے تم تازہ گوشت کھاتے اور زیور نکالتے ہو۔ یعنی دونوں سے مچھلیاں پکڑی جاتی اور موتی مونگے نکالے جاتے ہیں نہ کہ "ایک سے"

تعجب یہ ہے کہ اس کے بعد سید صاحب نے سورہ الرحمن کی یہ آیت بھی نقل کی ہے —

یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان — دونوں (سمندروں سے) موتی اور مونگے نکلتے ہیں —

مگر باوجود اس تصریح کے بھی ان کو اپنی اس غلطی پر کہ "ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں" تنبہ نہ ہو سکا —

## فہرس

(کتب خانہ سٹی کالج حیدر آباد دکن - مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب مددگار کالج قیمت دو روپے)

یہ انٹرمیڈیٹ سٹی کالج حیدر آباد کے کتب خانے کی موجودہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جو قابل مرتب نے جدید اصول پر ترتیب دی ہے - اس میں اردو فارسی اور عربی کی ہر فن کی کتابیں ہیں - علاوہ اس کے اردو کے اکثر مشہور رسالے جو کالج میں آتے ہیں ان کا اندراج بھی کردیا گیا ہے - آخر میں اشاریہ یعنی انڈکس ہے - کتابیں سب مطبوعہ ہیں - فہرست بہت خوشنما چھاپی گئی ہے —



# اُردو کے جدید رسالے

## برهان

یہ ندوۃ المصنفین دھلی کا ماھوار رسالہ ھے جس کے مرتب سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ایم - اے، فاضل دیوبند ھیں - اس وقت تک اس کے دو نمبر شایع ھوچکے ھیں - اس کا مقصد مذھب اسلام کی حمایت اور اسے مادی علوم کے اثر اور ری سرچ کے پردے میں مستشرقین یورپ کے حملوں سے بچانا، وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر پیش کرنا اور اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ کی خدمت انجام دینا ھے - اس مقصد کو یہ رسالہ پورا کرنے کی کوشش کر رھا ھے - اگرچہ اس اعلی مقصد کی تکمیل جو اس کے پیش نظر ھے فی الحال مشکل ھے کیونکہ اس کے لیے بڑے سامان اور مشرقی و مغربی علوم کے ماھرین کی ضرورت ھے تاھم جو کچھ اب تک اس نے کیا ھے وہ قابل قدر ھے - سالانہ چندہ پانچ روپے ھے اور منیجر برھان قرول باغ، نئی دھلی سے مل سکتا ھے —



## جدید اردو

یہ ماھانہ رسالہ کلکتہ سے شایع ھونا شروع ھوا ھے جس کے اڈیٹر پرویز شاھدی ایم - اے ھیں - کلکتہ بنگال میں پھر اردو کا مرکز ھوتا

جاتا ہے - وہاں سے اردو کے متعدد اخبار اور رسالے شایع ہوتے ہیں - لیکن اردو کی اشاعت میں جیسی کوشش ہونی چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوئی - امید ہے کہ انجمن ترقیء اردو کی شاخ جو حال ہی میں وہاں قائم ہوئی ہے اس طرف توجہ کرے گی - قابل اڈیٹر کو شکایت ہے کہ کلکتہ کے سے شہر میں کتابت و طباعت کی وہ سہولتیں میسر نہیں جو دہلی لاہور وغیرہ میں ہیں - یہ شکایت بھی اسی وقت رفع ہوگی جب اردو لکھنے پڑھنے کا چرچا عام ہوجاے گا —

رسالے میں زیادہ تر ادبی مضمون ہوتے ہیں - فسانے' ڈراما نظمیں بھی شایع ہوتی ہیں - اب نیا نیا ہے' غنیمت ہے - اسے زیادہ بہتر اور مقبول بنانے کی ضرورت ہے —

## کارنامہ

یہ ماہانہ رسالہ الہ آباد سے شایع ہوتا ہے - اس کے عنوان پر لکھا ہے "علمی اور عملی معلومات کا ماہانہ جریدہ" - اس کا مقصد اردو دانوں کے لیے دلچسپ اور مفید مضامین کا (خصوصاً ایسے مضامین کا جو صنائع اور فنون یا علم صحت سے تعلق رکھتے ہیں) فراہم کرنا ہے - اس مقصد کے پورا کرنے میں رسالہ نے حتی الامکان کوشش کی ہے - کاغذ اور چھپائی معمولی ہے - سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے ہے - مسرور قنوجی صاحب کی ادارت میں سبزی منڈی الہ آباد سے شایع ہوتا ہے —

---

# اردو رسالوں کے خاص نمبر

## علی گڑھ میگزین کا اقبال نمبر

یہ نمبر اقبال کی وفات کے بعد ہی فوراً شایع ہوا تو خیال ہوا کہ علی گڑھ والوں نے کمال کیا کہ اتنی جلدی اقبال مرتب کر کے شایع کر دیا لیکن شذرات پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ۲۹ جنوری کو علی گڑھ یونیورسٹی میں جو یوم اقبال منایا گیا تھا اور اس میں جو مقالے ' نظمیں پڑھی گئیں اور جو تقریریں کی گئیں وہی جمع کر کے اقبال نمبر کی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے - کسے معلوم تھا کہ اجل سر پر کھڑی ہوئی ہے —

یہ اقبال کے کلام اور خیالات پر نظم و نثر کا بہت نفیس مجموعہ ہے اور ان تمام مضامین کے لکھنے والے علی گڑھ ہی کے ہیں - یہ نمبر مطالعہ کے قابل ہے اور بہت پاکیزہ چھپا ہے اور اس قابل ہے کہ اردو کے ہر کتب خانے میں رکھا جاے —

## سب رس اقبال نمبر

یہ ایک سو ساٹھ صفحے کا مجموعہ ہے جس میں اقبال کی حیات و کلام کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے - حیدرآباد میں بھی مثل دوسرے شہروں کے یوم اقبال بڑی شان سے منایا گیا تھا - اس میں جو پیغامات وصول ہوے یا مضامین اور نظمیں پڑھی گئیں وہ سب اس میں درج ہیں - اس کے بعد جب اقبال کی وفات کی خبر آئی تو ایک بڑا تعزیتی جلسہ کیا گیا - اس میں جو پیام آئے اور تقریریں ہوئیں یا نظمیں اور مضمون پڑھے

گئے وہ بھی اس میں درج کردیے گئے ہیں ۔ ان کے علاوہ اور مختلف مضامین بھی داخل کیے گئے ہیں شروع میں نامور مصور چغتائی کی ایک رنگین تصویر ہے جو اقبال کی ایک رباعی کی تفسیر ہے —

یہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور بہت کم وقت میں بڑی محنت اور شوق سے مرتب کیا گیا ہے —

## ہمدرد صحت دق و سل نمبر

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے زیر نظر نمبر کو مرتب کرکے نہ صرف ایک ملی اور علمی فرض کو ادا کیا ہے بلکہ رفاہ عام کا ایسا مفید کام کیا ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے - اگرچہ حکیم صاحب موصوف اپنے نیک نام اور مشہور عالم "ہمدرد دواخانہ" دہلی کے ذریعہ سے بھی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن "ہمدرد صحت" کی افادی حیثیت سب پر فائق ہے —

دق و سل کی یہ اشاعت خاص ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے - اس نامراد بیماری کا کوئی پہلو ایسا نہیں، جس پر نہ صرف ہندوستان کے بڑے بڑے حکیموں، تجربہ کار ڈاکٹروں، ہوشیار ویدوں بلکہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے دق و سل کے ماہرین و متخصصین نے بھی پر از معلومات بحث نہ کی ہو - گویا یہ نمبر ہماری زبان میں مشرق و مغرب کے مایۂ ناز اطبا کے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ اور ان کی طبی کاوشوں کا مرقع ہے —

مضمون نگاروں کی تصویریں تو ان گنت ہیں ہی، لیکن ماؤف پھیپھڑوں

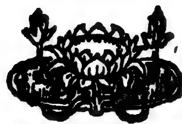
اُن کے غار، گلٹیوں، خون چوسنے والے جراثیم اور پسووں پر اُن کے مہیب اور تباہ کن اثرات کی بھی بھیانک تصویریں دے دی گئی ہیں - چند جدول اور نقشے بھی ہیں - غرض ایک اعلیٰ اور معیاری رسالہ کے لیے علم و فن کی اس نئی روشنی میں جن جن لوازم کی ضرورت ہے وہ سب اس نمبر میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں - اگر فاضل مرتب نسخوں کے اندراج میں ذرا احتیاط سے کام لیتے تو اچھا ہوتا - اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت ۱۴ آنے اور معمولی کی صرف آٹھ آنے رکھی گئی ہے جو بہت کم ہے —

---

## دی مسلم یونیورسٹی میگزین

یہ انگریزی میگزین ۲۰۸ صفحے پر ہے اور اس کے علاوہ آخر میں ۴۰ صفحے کا ضمیمہ ہے جس میں یونیورسٹی کے حالات اور خبریں ہیں —

مضامین مختلف نوعیت کے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور علمی ہیں - دو ایک سیاسی اور تاریخی بھی ہیں - سب سنجیدہ اور غور سے پڑھنے کے قابل ہیں - میگزین کے اڈیٹر محمد نعمان صاحب ایم - اے قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ایسے اچھے لکھنے والے اور ایسے اچھے مضامین فراہم کرلیے —

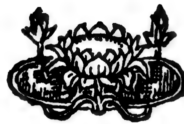


اُن کے غار، کلتھوں، خون چوسنے والے جراثیم اور پھپھڑوں پر اُن کے مہیب اور تباہ کن اثرات کی بھی بھیانک تصویریں دے دی گئی ہیں - چند جدول اور نقشے بھی ہیں - غرض ایک اعلیٰ اور معیاری رسالہ کے لیے علم و فن کی اس نئی روشنی میں جن جن لوازم کی ضرورت ہے وہ سب اس نمبر میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں - اگر فاضل مرتب نسخوں کے اندراج میں ذرا احتیاط سے کام لیتے تو اچھا ہوتا - اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت ۱۴ آنے اور معمولی کی صرف آٹھ آنے رکھی گئی ہے جو بہت کم ہے —

## دی مسلم یونیورسٹی میگزین

یہ انگریزی میگزین ۲۰۸ صفحے پر ہے اور اس کے علاوہ آخر میں ۴۰ صفحے کا ضمیمہ ہے جس میں یونیورسٹی کے حالات اور خبریں ہیں —

مضامین مختلف نوعیت کے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور علمی ہیں - دو ایک سیاسی اور تاریخی بھی ہیں - سب سنجیدہ اور غور سے پڑھنے کے قابل ہیں - میگزین کے اڈیٹر محمد نعمان صاحب ایم۔ اے قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ایسے اچھے لکھنے والے اور ایسے اچھے مضامین فراہم کرلیے —



# اطلاع

انجمن ترقیء اُردو (ھند) کے ذخیرۂ کتب میں ذیل کتابوں کا حال میں اضافہ ہوا ہے ، شائقین دفتر انجمن یہ کتب طلب فرما سکتے ہیں —

## مکتبۂ جامعۂ ملیہ دھلی کی تازہ ادبی و علمی کتب

(۱) میری کہانی مکمل - (پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی - (ہر دو حصہ قیمت چار روپے

(۲) میدان عمل - (منشی پریم چند آنجہانی کا شاندار ناول) قیمت دو روپے آٹھ آنے

(جوش ملیح آبادی کی نظمیں)

(۳) فکر و نشاط " " ایک روپیہ آٹھ آنے

(۴) شعلہ و شبنم " " تین روپے

(۵) نقش و نگار " " دو روپے

(۶) تاریخ فلسفۂ اسلام - قیمت دو روپے

(۷) المدینۃ الاسلام - دو روپے

(۸) خطبات خالدہ ادیب خانم' دو روپے

(۹) نغمات - (ال - احمد اکبر آبادی کے مضامین کا مجموعہ) - بارہ آنے

(۱۰) مضامین رشید (پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ) دو روپے

(۱۱) معاہدۂ عمرانی - (انقلاب فرانس کے بانی روسو کی شہرۂ آفاق تصنیف سوشل کنٹر کٹ کا ترجمہ - دو روپے

(۱۲) جاپان (ایشیا کے انگلینڈ یعنی جاپان کے سبق آموز حالات) - دو روپے

(۱۳) ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ - چار آنے

(۱۴) دیہی صنعتیں - دو آنے

(۱۵) شاعر نہات - ایک روپیہ آٹھ آنے

(۱۶) کلام جوہر - (ہندوستان کے محبوب رہنما مولانا محمد علی کے کلام کا مجموعہ) آٹھ آنے

(۱۷) مقدمۃ الصحوازالقرآن کی تاریخ - ۵ آنے

(۱۸) تعلیمات قرآن -

(۱۹) پسکالوجی - از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب) ایک روپیہ آٹھ آنے

---

بچوں کے لیے (مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی)

شہزادی گلنار - چار آنے

ننھی مرغی دو آنے

بچوں کی کہانیاں - دو آنے

تانبیل خاں - دو آنے

کائنات - چار آنے

بھکاری - تین آنے

شہد لا - تین آنے

نیت کا پھل - دو آنے

مرغی اجمیر چلی - دو آنے

چھدو - تین آنے

---

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

میکفرن اور لوسی - دو آنے

مکاتب - ایک روپیہ

ترجمہ سفر نامۂ شاہ ایران - ایک روپیہ آٹھ آنے

افراط کا سہہ - چار آنے

مجاھدین مراکش - ایک روپیہ بارہ آنے

مضامین مہاتما گاندھی - دس آنے

دیوان ذوق مرتبہ آزاد - دو روپے

ترک موالات در ممالک غیر - دس آنے

تذکرۂ کاملان رامپور - تین روپے

اتحاد اسلام - چار آنے

وکرم اروسی - ایک روپیہ آٹھ آنے

---

## دختر فرعون

مصر و ایران کے تہذیب و تمدن اور رفعت و عروج کا تذکرہ اس کے مطالعہ سے ایران و مصر کی عظمت رفتہ کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے قیمت حصہ اول دو روپے قیمت حصہ دوم دو روپے

---

شاد بک ڈپو پٹنہ عظیم آباد

فکر بلیغ (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ایک روپیہ آٹھ آنے

داستان عجم - (شاہنامۂ فردوسی پر سیر حاصل تبصرہ) - (نواب نصیر حسین

خیال عظیم آبادی مرحوم کے قلم سے) ایک روپیہ

یادگار عشق - ایک روپیہ چار آنے

مثنوی مادرِ ہند (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ۸ آنے

ظہورِ رحمت (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ۸ آنے

رموز العروض (از حمید عظیم آبادی) ۸ آنے

نظام الملک آصفجاہ اول

(بانیٔ سلطنت آصفیہ کے سبق آموز حالات)

یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ نے انگریزی زبان میں نہایت دلکش انداز میں تحریر فرمائی ہے - قیمت چھ روپے

انجمن کی بعض زیر طبع تصانیف

## کلیات فانی

اُردو کے مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کے مکمل اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ' یہ کتاب انجمن کی طرف سے نہایت اہتمام سے دہلی میں طبع ہو رہی ہے —

## حیات جاوید

مولانا حالی مرحوم کی مشہور تصنیف جو تقریباً نایاب ہو چکی تھی انجمن کی طرف سے بہترین طباعت و کتابت اور نہایت عمدہ کاغذ پر عنقریب شائع کی جائے گی —

نوٹ : اِن دونوں کتب کے لیے شائقین ابھی سے آرڈر بھیج دیں تاکہ چھپتے ہی یہ کتب ان کی خدمت میں ارسال کی جا سکیں —

المشتہر : منیجر انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد (دکن)

# خطوط شبلی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے وہ نادر دلکش خطوط جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام انتہائی اخلاق و محبت سے تحریر فرمائے تھے - اس مجموعہ کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیء اردو (ھند) نے ایک نہایت لطیف و دلکش مقدمہ تحریر فرمایا ہے قیمت ایک روپیہ —

---

# حقیقت اسلام

نواب سرامین جنگ کی مشہور تصنیف 'نوتس آن اسلام' کا با محاورہ و سلیس ترجمہ قیمت ۱۲ آنے —

---

# عروس ادب

مولوی سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ادبی' تاریخی' اخلاقی اور سیاسی مضامین کا قابل قدر مجموعہ قیمت دو روپیے —

---

# پروفیسر منہاج الدین کی تصانیف

**نظریۂ اضافیت** — اس کتاب میں آئین اسٹائین کا نظریہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے - سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے قیمت غیر مجلد چار روپیے مجلد چار روپیے بارہ آنے —

**زینت آسمان** — ستاروں کو پہچاننے کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی کتاب موجود نہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے -

**ریڈیو** — اس کتاب میں بے تار پیام رسانی اور اس کے متعلق تمام ضروری مسائل نہایت شرح و بسط سے بتادیے ہیں قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے -

المشتہر:- انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد ( دکن )

# جگ بیتی

پنڈت برجموہن صاحب کیفی کی پر اثر اور دلکش مثنوی، طباعت و کتابت دیدہ زیب، نہایت اعلیٰ قسم کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸ آنے مجلد ۱۴ آنے —

# چند ہمعصر

مصنفہ جناب مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

سکریٹری انجمن ترقیء اردو (ہند)

اس کتاب میں مولانا کے وہ مضامین نہایت کاوش سے جمع کیے گئے ہیں جو مولانا موصوف نے اپنے بعض ہمعصروں کی وفات کے بعد تحریر فرمائے تھے۔ مولانا کی اس تصنیف میں کیرکٹر اسکیچ کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں جو اپنی نظیر آپ کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب نہایت اہتمام سے لطیفی پریس دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ کلدار مجلد ایک روپیہ چھ آنے کلدار —

المشتہر ——————— مشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

## فاؤست

جرمنی کے الہامی شاعر گوئٹے کے ڈرامے " فاؤست " کا دنیائے ادب و تخیل کا وہ کارنامہ ہے جو ایک صدی سے تمام عالم میں مشہور اور دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے ' مبسوط محققانہ مقدمے کے ساتھ اسے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب' ایم ' پی ' ایچ ' ڈی ( برلن ) نے ترجمہ کیا ہے - قیمت مجلد چار روپے ' غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے —

## مقالات حالی حصۂ دوم

اس میں مولانا حالی کی تمام تقریریں اور مشہور نامور کتابوں پر تبصرے اور تقریظیں ہیں - اردو ادب کی بے مثل کتاب ہے - کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہے - قیمت مجلد دو روپے غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے —

## سودا

یہ کتاب نہایت تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے - سودا کے متعلق اس سے بہتر اور کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی - کاغذ اعلیٰ - طباعت دیدہ زیب - انجمن کے خوشنما اور خوبصورت ٹائپ میں رنگین بارڈر کے ساتھ خاص اہتمام سے چھاپی گئی ہے - صفحات - ۳۹۷ - تقطیع $\frac{1}{2}$۷ × $\frac{1}{2}$۱۰ - قیمت غیر مجلد ڈھائی روپے کلدار اور مجلد تین روپے کلدار -



## اطلاع

ملک کے دوسرے اشاعت خانوں کی اعلیٰ درجے کی تصانیف کے علاوہ حسب ذیل اداروں کی بلند پایہ اردو کتب بھی انجمن ترقیٔ اردو کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہو سکتی ہیں :—

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ - نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں - شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور - دارالاشاعت پنجاب لاہور - قومی کتب خانہ لاہور - دارالمصنفین اعظم گڑھ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن - کتابستان الہ آباد - شاد بک ڈپو پٹنہ - ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد - مسلم ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ - ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ —

المشتہر :- منیجر انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

# مطبوعات انجمن ترقیء اردو

| نام کتاب | مجلد روپے | مجلد آنے | غیر مجلد روپے | غیر مجلد آنے |
|---|---|---|---|---|
| فلسفۂ تعلیم | ۲ | ۰ | ۱ | ۱۲ |
| القول الاظہر | ۱ | ۰ | ۰ | ۸ |
| رہنمایان ہند | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| امرائے ہنود | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ |
| التمر | ۱ | ۰ | ۰ | ۱۰ |
| تاریخ تمدن حصہ اول | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| تاریخ تمدن حصہ دوم | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| فلسفۂ جذبات | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| البیرونی | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| دریائے لطافت | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| طبقات الارض | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| مشاہیر یونان و روما حصہ اول | ۳ | ۰ | ۳ | ۰ |
| مشاہیر یونان و روما حصہ دوم | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| اسباق النحو حصہ اول | ۰ | ۰ | ۰ | ۹ |
| اسباق النحو حصہ دوم | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ |
| علم المعیشت | ۵ | ۸ | ۵ | ۰ |

| نام کتاب | مجلد روپے | مجلد آنے | غیر مجلد روپے | غیر مجلد آنے |
|---|---|---|---|---|
| تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| تاریخ یونان قدیم | ۲ | ۰ | ۰ | ۰ |
| نکات الشعرا | ۲ | ۴ | ۱ | ۱۲ |
| وضع اصطلاحات | ۳ | ۱۲ | ۳ | ۴ |
| بجلی کے کرشمے | ۱ | ۱۲ | ۱ | ۴ |
| تاریخ ملل قدیمہ | ۱ | ۱۲ | ۰ | ۰ |
| محاسن کلام غالب | ۱ | ۰ | ۰ | ۱۰ |
| قواعد اردو | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| تذکرۂ شعرائے اردو | ۱ | ۱۴ | ۱ | ۹ |
| جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| تاریخ ہند ہاشمی | ۰ | ۰ | ۱ | ۱ |
| مثنوی خواب و خیال | ۱ | ۸ | ۱ | ۰ |
| کلیات ولی | ۵ | ۰ | ۳ | ۰ |
| چمنستان شعراء | ۵ | ۸ | ۴ | ۸ |
| ذکر میر | ۰ | ۰ | ۲ | ۰ |

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ملنے کا پتہ : انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

# مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو

| نام کتاب | مجلد روپے | مجلد آنے | غیر مجلد روپے | غیر مجلد آنے |
|---|---|---|---|---|
| سہ نظم هاشمی | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ |
| بزم مشاعرہ | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| دیوان اثر | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| مخزن نکات | ۱ | ۸ | ۱ | ۲ |
| دیوان یقین | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| باغ و بہار یا قصۂ چہار درویش | ۰ | ۰ | ۲ | ۰ |
| گوئٹے کا فاؤسٹ | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| ریاست | ۵ | ۰ | ۴ | ۸ |
| تذکرۂ هندی (از مصحفی) | ۲ | ۰ | ۱ | ۱۰ |
| ریاض الفصحا (از مصحفی) | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| عقد ثریا (از مصحفی) | ۱ | ۲ | ۰ | ۱۲ |
| تاریخ ادبیات ایران (ترجمہ از براؤن) | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ |
| سب رس | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| ترکوں کی اسلامی خدمات | ۰ | ۰ | ۱ | ۸ |
| داستان رانی کیتکی | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ |
| تذکرۂ شعرائے گجرات (گردیزی) | ۱ | ۴ | ۰ | ۱۲ |
| گلزار ابراهیم | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| سوهتی زبان پر فارسی کا اثر | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| اردو اور صوفیائے کرام | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| مرحوم دهلی کالج | ۰ | ۰ | ۱ | ۸ |
| حقیقت جاپان | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ |
| مقالات حالی حصہ اول | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| کلیات تاباں | ۲ | ۴ | ۱ | ۱۲ |
| خطبات گارساں دتاسی | ۵ | ۰ | ۴ | ۸ |
| حبش اور اطالیہ (رمایتی) | ۰ | ۰ | ۰ | ۱۰ |
| گل عجائب | ۱ | ۱۰ | ۱ | ۲ |
| جنگ نامہ عالم علی خاں | ۰ | ۰ | ۰ | ۹ |
| ارتقا | ۱ | ۹ | ۱ | ۰ |
| لغت اصطلاحات علمیہ | ۹ | ۰ | ۰ | ۰ |
| انتخاب کلام میر | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں هیں)

ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

# اردو کا شاندار ادبی رسالہ
# " ہمایوں "

۱ - " ہمایوں " اتنا پابند وقت ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۲۲ ع سے لے کر ( جب یہ جاری ہوا تھا ) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی - اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی —

۲ - " ہمایوں " آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب " ہمایوں " مرحوم جج ہائی کورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے - اس لیے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لیے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مد نظر نہیں رکھی جاتی —

۳ - " ہمایوں " کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا - اس میں فحش اشتہارات ، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں - یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جا سکتا ہے —

۴ - " ہمایوں " کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی - اے ( آکسن ) بیرسٹر ایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے - اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ " ہمایوں " کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لیے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے —

۵ - " ہمایوں " کے مضامین محض پر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں - اس لحاظ سے " ہمایوں " اپنی نظیر آپ ہے —

۶ - "ہمایوں" صحت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے —

۷ - " ہمایوں " میں علمی و ادبی تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں ، مزاحیہ مقالے ، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں —

۸ - " ہمایوں " ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے —

۹ - " ہمایوں " کے کاغذ ، کتابت طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے —

۱۰ - " ہمایوں " کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لیے کوئی زاید قیمت نہیں لی جاتی —

چندہ سالانہ پانچ روپے چھہ آنے اور شش ماہی تین روپے ( مع محصول ) ہے

خاکسار
سید عبداللطیف
منیجر رسالہ " ہمایوں " لاہور

# مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی

## مئی سنہ ۱۹۳۸ ع کی مطبوعات جامعہ

### بیوہ

منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات درد ناک پیرایہ میں لکھے ہیں - ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں اور اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے - ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہیے - قیمت مجلد ایک روپیہ -

### بنی اسرائیل کا چاند

مصنفہ رائنر ہیگرڈ - مترجمہ عبدالمجید حیرت بی - اے - ملیک فرعون کا دور حکومت شاہزادہ سیٹی ولی عہد سلطنت کی انصاف و عدل کے لیے معزولی - عبرانیوں پر مظالم - ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے - مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی و بائیں - بنی اسرائیل کی آزادی - فرعون کی مع لشکر غرقابی سیٹی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان قیمت مجلد دو روپے -

---

### ضرب الامثال

از خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی - یہ ۷۸ ضرب الامثال کا مجموعہ ہے - اس میں ایسے ضرب المثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کما حقہ سمجھ میں نہیں آتا - اب تک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شایع نہیں ہوئی - قیمت ۸ آنے -

---

### دلی کی دو سو برس کی تاریخ

یہ اردو اکاڈمی کا ایک مقالہ ہے - اس میں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے - اُن کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائی فنون میں اُن کی جگہ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے - قیمت ۵ آنے -

### عقاب

از رقیہ ریحانہ - یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے - ذرا ابو خاں کی بکری کو تو دیکھو یہ بھی غلام اپنا پسند نہیں کرتی - لڑتے لڑتے مر جاتی ہے - لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا گوارا نہیں کرتی - قیمت ۴ آنے -

---

### چنبیلی

یہ چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان میں ایک دلچسپ کہانی ہے - قیمت ۲ آنے -

مکتبۂ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ

# سائنس

## انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے ' دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ' ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھہ بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھہ روپے سکۂ انگریزی ( سات روپے سکۂ عثمانیہ ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے سکۂ انگریزی ( یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ ) طلباء کے ساتھہ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں ( چار روپے آٹھہ آنے سکۂ انگریزی یا پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ( دکن )

VOL. 18 JULY, 1938. No. 71

# The Urdu

## The Quarterly Journal

OF

## The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

**Abdul Haq, B. A., (Alig.)**

HONORARY SECRETARY

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).

# اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر


عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری





انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

# اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —
۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے -
۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —
۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو نادر منزل - سیف آباد - حیدر آباد دکن سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کو لکھنا چاہیے -

المشتہر : انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

---

## نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

| کالم | ایک بار کے لیے | چار بار کے لیے |
|---|---|---|
| دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ | ۸ روپے سکۂ انگریزی | ۳۰ روپے سکۂ انگریزی |
| ایک کالم (آدھا صفحہ) | ۴ روپے سکۂ انگریزی | ۱۵ روپے سکۂ انگریزی |
| نصف کالم (چوتھائی صفحہ) | ۲ روپے چار آنے سکۂ انگریزی | ۸ روپے سکۂ انگریزی |

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُن کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے —

المشتہر : منیجر انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

---

انجمن اردو پریس، اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) سے شایع ہوا

# اردو

جلد ۱۸ || اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع || حصہ ۷۰

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

# دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اُردو ( ہند )

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

( ۱ ) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

( ۲ ) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح اَن قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

( ۳ ) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھہ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

( ۴ ) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھہ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

( ۵ ) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

( ۶ ) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

( ۷ ) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

( ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳ ) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیء اردو ( ہند ) اورنگ آباد ( دکن )

# حسب ذیل کتابیں بھی انجمن کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوسکتی ہیں

— ( نظامی پریس بدایوں ) —

| | |
|---|---|
| خطوط سر سید | تین روپے |
| لیتھو گرافی | دو روپے آٹھ آنے |
| دیوان غالب مع شرح | دو روپے آٹھ آنے |
| دیوان غالب اردو | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| قاموس المشاہیر | چھ روپے |
| غزلیات ذوق | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| دیوان جان صاحب مجلد | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| انتخاب زریں مجلد | دو روپے |
| مراثی میر انیس جلد اول مجلد | دس روپے |
| مراثی میر انیس جلد دوم قسم دوم | پانچ روپے |
| مراثی میر انیس حصہ سوم قسم اول آرٹ پیپر | آٹھ روپے |
| مراثی میر انیس حصہ سوم قسم دوم | چھ روپے |
| انقلاب دہلی | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| رباعیات شاد | ایک روپیہ |
| دیوان درد | ایک روپیہ چار آنے |
| قصائد ذوق | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| سکہ اور شرح تبادلہ | ایک روپیہ |

-( تصانیف نور الہی و محمد عمر صاحبان )-

| | |
|---|---|
| تین ٹوپیاں | آٹھ آنے |
| قزاق | آٹھ آنے |
| ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ) مجلد | تین روپے |
| غیر مجلد | دو روپیہ آٹھ آنے |
| ناٹک کتھا | آٹھ آنے |

- ( مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی الہ آباد ) -

| | |
|---|---|
| عرب و ہند کے تعلقات | چار روپے |
| کبیر صاحب | دو روپے |
| اردو زبان و ادب | ایک روپیہ |
| ناتن | دو روپے آٹھ آنے |
| فریب عمل | دو روپے |
| قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب | چار روپے |
| ہندی شاعری | دو روپے |
| فلسفۂ نفس | ایک روپیہ |
| عالم حیوانی | چھ روپے آٹھ آنے |
| معاشیات ، مقصد اور منہاج | ایک روپیہ |

— ( کتابستان الہ آباد ) —

| | |
|---|---|
| مثنوی ناسخ | بارہ آنے |
| بس کا روکھا | ایک روپیہ |
| تاریخ اسلامی حصہ اول | آٹھ آنے |

---

## انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

کا

## کتب خانہ

انجمن ترقیء اردو (ہند) اورنگ آباد دکن نے اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ حیدرآباد دکن میں عابد شاپ پر قائم کیا ہے ؛ ہندوستان کے مشہور و معروف اردو کے اشاعت خانوں کی جملہ مطبوعات اور انجمن کی تمام کتابیں اس کتب خانے سے دستیاب ہوسکتی ہیں -

# اردو

## فہرستِ مضامین

### بابت اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع

# اقبال مرحوم

اقبال کی موت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے - ایسا بلند خیال اور عالی فکر شاعر صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ساتھہ ہی ہندستان سے شاعری بھی اُٹھہ گئی - مولانا 'حالی' کے بعد شاعری سے اگر کسی نے حقیقی کام لیا تو وہ اقبال تھا —

اس کے کلام نے دلوں میں گرمی اور خیالات میں انقلاب پیدا کردیا تھا - اس نے قومی اور ملّی مسائل میں خیال و فکر کی رو بدل دی تھی - بیسیوں لفظ' خاص خاص ترکیبیں اور بعض خاص خیال اور افکار ہندستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں محض اقبال کے کلام کی بدولت سکۂ وقت کی طرح رائج ہوگئے تھے —

اس کے کلام نے اردو زبان کا رتبہ بڑھا دیا اور یہ ثابت کردیا کہ اس میں کتنی وسعت و قوت اور صلاحیت ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کا کلام زندہ رہے گا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ولولہ' فکر میں بلندی' جذبات میں درد اور تخیّل میں پرواز پیدا کرتا رہے گا —

عبدالحق

# کنول پھول، اور تمدن میں اس کی اهمیت

از

(جناب امین الدین خاں صاحب بی اے)

انسان، باوصف اپنے دعوائے همه دانی و همه گیری کے ابھی تک ویسا هی چلا آتا هے، جیسا که حضرت آدم کے وقت میں تھا - وہ اپنی پیش پا افتادہ چیزوں کو ٹھکراتا چلا جاتا هے، اور حملے کرتا هے تو آسمان کے ستاروں پر - اس سے کہا جاتا هے که

برگ درختان سبز در نظر هوشیار

هر ورق دفترے است معرفت کردگار!

مگر وہ اپنے غرور عالم گیری میں ایک نہیں سنتا؛ دوڑتا چلا جاتا هے اور نہیں دیکھتا که کتنی بیش بہا دولتیں اس کی غفلت اور اس کے تمخثر پر نثار هوی چلی جاتی هیں - وہ چیزیں، جن کو وہ حقیر و ذلیل سمجھتا هے، دست حال سے اس کا دامن پکڑ کر اس کو متوجه کرتی هیں، مگر اسے اتنی فرصت کہاں که نگاہ بھر کر بھی ان کو دیکھ لے - دنیا کی لاتعداد چیزوں میں سے کسی نے اسے جب ایسا پکڑا که اسے متوجه هوتے هی بنا تب تو اس نے اس چیز کی طرف توجه کی، اس کی ماهیت پر غور کیا، اور اس سے کام لینا شروع کردیا - پھر اسی پر بس نہیں کرتا - اکثر ایسا هوا هے که اس سے کام لیتے لیتے انسان خود اسی کا غلام بن

جاتا ہے - ان ہی چیزوں میں سے ایک وہ نباتی چیز ہے جو ہمارا زیب عنوان ہے، یعنی کنول پھول —

کنول ایک مشہور و معروف پھول ہے، اہل ایران اسے نیلوفر، نیلوفل، نیلفر، نیلوپر، نیلوپل اور نیلوپرگ * کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ "نیلوفر" ہندی لفظ نیلوپھل + ہی کا معرب ہے، کیوں کہ "نیل ہندی زبان میں پانی ‡ کو کہتے ہیں اور پھل ثمر ہے" - صاحب غیاث اللغات نے رسالۂ § معربات کے حوالے سے لکھا ہے کہ نیلوفر لفظ نیلوپل کا معرب ہے - ایک اور قول یہ ہے کہ نیلوفر ایک فارسی اسم ہے $ جس کے معنی ہیں نیلے پروں والا (نیل، پر) - یہ قیاس غالباً اس قیاس پر مبنی ہے کہ فر اور پر میں صوتی مناسبت ہے، اور فرکو فارسی پر کی معرب صورت سمجھ لیا گیا ہے - صاحب ہفت قلزم کا خیال ہے کہ نیلوفر وہی چیز ہے جسے عربی میں قاتل النحل کہتے ہیں ¶ - ابن سیرین نے نیلوفر کا نام لیلوفور لکھا ہے، ** ہندی میں اس کو کنول اور کمل کہتے ہیں، مگر کنول

---

* آئندہ صفحوں میں ہندی متھیا کے سلسلے میں "نیلوت پل" ( नीलोत्पल ) کا ذکر ہوگا - یہ لفظ اسی ایرانی تلفظ سے متعلق معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے کہ یہ ایرانی تلفظ اسی ہندی ( دراوڑی ؟ ) لفظ ہی کی ایک صورت ہو! —

† مخزن الادویہ از میر محمد حسین خراسانی سنہ ۱۱۷۸ ھ، نیلوفر -

‡ اصلی سنسکرت میں نیر (ی معروف سے नीर ) ہے - اسی سے "نیرا" ہے - جنوبی ہند کی تامل زبان میں پانی کو نّیر (اور مخفف کر کے نی) کہتے ہیں -

§ غیاث اللغات، نیلوفر -

$ جامع المفردات از ابن بیطار، نیلوفر -

¶ ہفت قلزم از مولوی مقبول محمد، نولکشور کانپور سنہ ۱۸۹۱ م، نیلوفر -

** منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام ( تعطیر الانام کے حاشیے پر ) از محمد ابن سیرین، ص ۲۳۲ -

(ی سے) غلط ہے - مولوی رشید احمد * سالم کا خیال ہے کہ کھول اصل میں (بقول ان کے "حقیقتاً") کھوا (ی مجہول سے) ہوگا - اس کی شہادت میں مولوی صاحب نے جائسی (ملک محمد ؟) کا یہ قول نقل کیا ہے :-

سورگ سور بھوئیں سرور کھوا    بن کھنڈ بھنور ہور ہوے رس لیوا

صاحب تاج العروس کا بیان ہے کہ اہل مصر کے ہاں بھی اس پھول کا نام نوفر ہے † —

**ماہیت** یہ پھول جھیلوں، تالابوں اور دلدلوں میں گرمی کے زمانے میں، جب کہ بارش کا موسم ہوتا ہے، پیدا ہوتا ہے - اس کے پودے کی جڑیں چھوٹی، سیدھی، گول اور نلکی دار ہوتی ہیں - اس کا تنا نرم، چکنا، مجوف اور طولانی ہوتا ہے، زیادہ موٹا نہیں ہوتا - اس کی ٹہنیاں پانی میں ڈوبی ہوئی لمبی لمبی ہوتی ہیں، پتے چوڑے اور دو سے چھ فٹ تک لمبے ہوتے ہیں - پتوں کے کنارے پیچ دار اور کٹے ہوے ہوتے ہیں اور پانی کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں - اس کے پھول دو سے دس انچ تک کے قطر ‡ کے ہوتے ہیں - کنول کی ایک قسم § کو انگریزی میں (Nelumbium Speciosum) کہتے ہیں اور اس میں پچیس سینٹی میٹر کے قطر کے پھول لگتے ہیں - پھول کی پنکھڑیاں بیضوی شکل کی اور مجوف ہوتی ہیں، اس میں ایک وقت میں صرف ایک ہی پھول لگتا ہے —

---

* جواہر خسروی از امیر خسرو مصححہ رشید احمد سالم (علی گڑھ سنہ ۱۹۱۸ ع)، نزھتہ خالق باری، ص ۳۱ -

† تاج العروس، مصر سنہ ۱۳۰۶ ھ لفظ نیلوفر -

‡ Glossary of Batanic Terms by R. L. Heining، بیان Nymphaeceae -

§ The Natural History of Plants by kerner and Oliver، ج ۲، ص ۱۸۵

کہتے ھیں کہ * یہ پھول طلوع آفتاب کے ساتھہ پانی سے سر باھر نکلتا ھے اور پھر غروب آفتاب کے ساتھہ پانی میں ڈوب جاتا ھے - ایک اور روایت ھے کہ نیلوفر کے پانی میں ڈوبتے وقت ایک پرند آتا ھے اور اس کے بیچ میں بیٹھہ جاتا ھے - صبح کو جب نیلوفر پانی کے اوپر آتا ھے اور منہ کھولتا ھے، تو وہ پرند اڑ جاتا ھے اور رات کو پانی سے کوئی زحمت نہیں اٹھاتا - یہ تو عام روایت ھے جو صاحب "برھان" نے بیان کی - اتفاق ملاحظہ ھو کہ کاوش کرنے والوں نے حضرت شاہ جہاں بادشاہ شاھنشاہ ھند کے سوانح میں بھی ایک نیچ کا واقعہ ڈھونڈھ نکالا ھے، جس میں کسی شاعر نے اس نوعیت کی مضمون آفرینی کی ھے - مہر جی بھائی کوکا نے فارسی زبان کے لطائف وظرائف بیان کرتے ھوے بادشاہ موصوف کے حرم کا ایک واقعہ یوں قلمبند کیا ھے کہ: ایک بار ا حرم شاھی کی ایک خاتون کے لب کا مصنوعی تل شاہ جہاں بادشاہ کے بوسے سے محو ھوگیا - اس نے ظریفانہ طور پر کہا کہ 'زاغ ازدھاں پرید' دوسرے دن بادشاہ نے درباری شعرا سے اس جملے کو موزوں کرنے کی فرمایش کی - ایک بدیہہ گو نے کہا:

نیلوفری چو دوش دھن گرد آورید زنبور مست بود کہ آمد دراں خلید
چوں آفتاب دید دھن خندہ واکشاد درعین خندہ بود کہ زاغ ازدھاں پرید

صاحب بہارعجم کا قول ھے کہ نیلوفر کی دو قسمیں ‡ ھیں : آفتابی

---

* نیلوفر در برھان قاطع ' مطبع افضل المطابع ' کلکتہ ' سنہ ۱۲۵۱ ھ مطابق سنہ ۱۸۳۶ ع -

† Wit, Humour and fancy of Persia از مہر جی بھائی نوشیرواں جی کوکا ' بمبئی سنہ ۱۹۲۳ - ۱۲

‡ بہار عجم ' نیلوفر

یا شمسی، اور ماہتابی یا قمری - آفتابی نیلوفر سرخ ہوتا ہے، اور طلوع آفتاب کے وقت کھلتا ہے - ہندی میں اسے کنول کہتے ہیں - ماہتابی کی دو قسمیں ہوتی ہیں : ایک سفید محض ہوتا ہے اور دوسرا نیلاہٹ کے ساتھہ سفید ہوتا ہے - یہ دونوں قسمیں شام کے وقت کھلتی ہیں - شاعر حسین ثنائی نے اس کو خوب بیان کیا ہے :

ہوائے سیلئی حلم تو گر برو بوزد کبود رنگ شود ہمچو نیلوفر آتش

اسی شاعر کا ایک اور قول ہے :

زبسکہ بے تو بتن نیلوفر ہمی کارم فضاے سینہ با طراف آسماں ماند

محقق پٹری * ( Petrie ) نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں :

( ۱ ) گلابی نیلوفر ( Nelumbium Speciosum ) ' جس کی پنکھڑیاں کلی کی حالت میں تہ بہ تہ اور محراب دار ہوتی ہیں —

( ۲ ) سفید ( Nymphaea Lotus ) ' جس کی پنکھڑیاں نس دار ' اور کھل جانے پر گول ہوتی ہیں —

( ۳ ) نیلا ( Nymphaea Caerulae ) ' جس کی پنکھڑیاں چکنی اور نوک دار ہوتی ہیں - صاحب مخزن الادویہ نے اس کی ایک اور قسم زرد رنگ کی بھی بیان کی ہے لیکن وہ بہت کمیاب ہے - سفید کنول بکثرت پایا جاتا ہے ' اس سے کم نیلے رنگ کا ' اور اس کے بعد سرخ ارغوانی بہترین کنول سفید اور نیلا ہوتا ہے —

کنول کے پودے میں سیب † کے برابر گول سا پھل لگتا ہے - اس کے

* Encyclopaedia of Religion and Ethics' لفظ Lotus

† مخزن الادویہ ' نیلوفر -

اندر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیج ہوتے ہیں - بیج کے اوپر کا حصہ سرخی مایل ہوتا ہے، اور نیچے کا حصہ سیاہ لمبا، بعض گول اور کڑوا ہوتا ہے - جب پھل میں کیڑے نہیں لگتے تو وہ پک جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاسکتا ہے —

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیلوفر ایک پھل * بھی ہوتا ہے - خان آرزو نے چراغ ہدایت میں لکھا ہے کہ † نیلوفر علاوہ اس مشہور و معروف پھل کے، جو پانی میں ہوتا ہے، ایک دوسرا پھول بھی ہے جس کی بیل دوسرے درخت پر لپٹی ہوتی ہے، اور وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے - صاحب غیاث نے قاسم گون آبادی کا یہ قول ( شاہنامہ اسمعیل صفوی سے ) نقل کیا ہے :

پسر محکم بدوش نیک بختاں چو نیلوفر کہ پیچد بر درختاں

یہ پھول ہندوستان، فارس اور مصر میں بکثرت پایا جاتا ہے - ہندوستان کے لیے سرخ کنول مخصوص ہے - مصر میں سرخ آج کل سوا ان چند مقامات کے جہاں خاص طور پر اس کی کاشت ہوتی ہے، کہیں نہیں ملتا - اہل روما جب مصر میں پہنچے ہیں، اس زمانے میں یہ پھول وہاں پایا جاتا تھا چنانچہ اس کا ثبوت یونانی مصنفوں کی تحریروں میں ملتا ہے - علاوہ اس کے یہ پھول اب بھی ہوارا کے قبرستان میں نظر آتے ہیں اتھنے اوس ( Athenaeus ) کا بیان ہے کہ " کنول دلدلوں میں اُگتا ہے، اور گلاب کی طرح کا ہوتا ہے - اس کے گوندھے ہوے مالے کو انٹی نس ( Antinous ) کا مالا کہتے ہیں - ایک دوسری قسم نیلے رنگ کی ہوتی ہے، اور اس کے مالے کو کنول کا مالا کہتے ہیں - " اس وقت سے قبل ہیرو.ت

* غیاث اللغات، نیلوفر

† Encycl. Relig. Eth. تحت، Lotus

کے زمانے میں بھی یہ پھول موجود تھا - چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " کنول دریا میں اُگتا ہے - اس کا پھل ایک پوتلی میں ہوتا ہے - اس کے اندر بہت سی بھریاں ہوتی ہیں ' جو کھائی جاتی ہیں " - تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سرخ کنول کبھی مصر میں پیدا ہوتا تھا - گو بعض مصنفوں نے اس کی نظیریں پیش کی ہیں ' مگر وہ عموماً صحت سے دور ہیں - مثلاً ' سہاح لورے (Loret) لکھتا ہے کہ وہ کنول ' جو ' هوروس دیوتا ' کی مورت میں سہارا دیے ہوئے نظر آتا ہے ' سرخ رنگ کا ہے - لیکن اس کی پنکھڑیاں صاف کنارے کی ہیں - وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ وہی کنول بادشاہ نفرتوم ( Nefertum ) کی تصویر کے سر پر بھی بنا ہوا ہے - لیکن وہ سفید رنگ کا معلوم ہوتا ہے - وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ سرخ کنول مصری مقبروں یا روضوں میں کہیں نہیں ہے - جو ستون ممفس ( Memphis ) میں ملا ہے ' اس میں قدیم تر ستونوں کے کنولوں کی طرح سفید کنول ہی بنا ہوا ہے —

علاوہ ہند ' فارس اور مصر کے یہ پھول چین ' جاپان ' جاوا ' جزائر ملایا ' جزائر فلپائن وغیرہ ممالک میں بھی پیدا ہوتا ہے ' لیکن بہت کم - یورپ میں ہنگری میں اس کی ایک قسم پائی جاتی ہے - آسٹریلیا میں بھی یہ پیدا ہوتا ہے - شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی ہوتا ہے ' مگر شاذ ہے —

**افعال و خواص**

کنول ایک بہت ہی فائدہ مند شے ہے - اس کے ڈنٹھل ' پھول اور بیج کھائے جاتے ہیں - بیج گرم بالو میں بھون کر کھایا جاتا ہے - بھوننے کے بعد بیج سفید رنگ کا اور کھیلوں کی طرح ملائم ہوجاتا ہے - اس کو ہندی میں تال مکھانا کہتے ہیں - اس کے پودے

کے بہت سے حصے ویدک اور یونانی ادویہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اطبا کا عقیدہ * ہے کہ کنول کا مزاج سرد اور تر ہے، اور اس بارے میں وہ بفنشے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی جڑ گرم اور خشک، اور اس کا بیج سرد ار خشک ہے۔ اس کی قوت ایک برس تک باقی رہتی ہے۔

کنول دل اور دماغ کے لیے مقوی ہے۔اور نہ صرف ان کی حرارت کے لیے مُسکن ہے، بلکہ سر اور سینے کی تشنگی کو بھی تسکین دیتا ہے۔ اس کے پھول کو سونگھنا گرم مزاج مریض کے دل و دماغ کے لیے مقوی ہے، اور نیند لاتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے درد سر اور خشکی دماغ کے لیے بھی مُسکن ہے۔اس کا پینا امور مذکور کے لیے اور نیز نزلہ، خشونت سینہ، گرم کھانسی ( سرفہ حار ) اور بیرونی و اندرونی زخموں کے لیے بہت مجرب ہے۔ اگر اس کو زعفران اور دار چینی میں ملا کر پیا جائے تو تقویت دل اور خفقان کے لیے موثر ہے۔ اس کی جڑ کو منہ میں رکھنا حلق کے ورموں کو کم، اور خناق کو رفع کرتا ہے۔ سر پر اس کی متی کا لیپ اس کی جلن اور بخار کے لیے مُسکن ہے۔ اس کی متی کو یا اس کی جڑ کو پینا پرانے اسہال کو روکتا ہے، اور آنتوں کے زخم کو اچھا کرتا ہے۔ اگر اس کی جڑ کو روغن زفت کے ساتھ پیس کر پیا جائے تو داءالثعلب یعنی، بال خورے کو مفید ہے؛ اور تیز بخار کو ہلکا کرتا ہے۔ اس کی متی کو تنہا یا مناسب قسم کی پکی ہوئی دوائیوں یا اس کے عرق کے ساتھ پینا۔ چیچک اور پتھری کے واسطے مفید ہے، اور جگر اور دل کی گرمی اور بخار کی تپش کے لیے مُسکن ہے، مثانے کے لیے

* طبی خواص و افعال کا یہ بیان جامع‌المفردات ابن بیطار، اور مخزن‌الادویۃ پر مبنی ہے۔

مضر ہے' اور اس کا مصلح شہد اور مصری ہے - باہ کے لیے بھی مضر ہے' اور اس کے مصالح شہد اور لبوبات ہیں - اس کا بدل بنفشہ اور خطمی سفید ہے - اگر اس کی جڑ کو پانی میں ملاکر پیا جائے تو پرانی پیچش کو' آنتوں کے زخم کو' اور طحال کے ورم کو نفع ہوتا ہے - اس کا لیپ معدے اور مثانے کے درد اور ورم طحال کے لیے مفید ہے - صاف پانی میں ملاکر لیپ کرنا برص اور بہق کو دور کرتا ہے - اس کو سرکے میں ملاکر گرم ورموں کو دھونے سے فائدہ ہوتا ہے - اس کا لیپ نزف الدم اور درد مثانہ کے لیے نافع ہے - نیلوفر کا شربت طبیعت کو نرم کرتا ہے اور گرمی کی وجہ درد سر' گرمی اور صفراء کے پت' کھانسی ذات الجنب ذات الریہ اور سینہ کے کھرکھرے پن کے لیے نافع ہے - اس کے تیل کا مزاج بنفشے کے تیل سے زیادہ سرد اور تر ہے —

**کنول خواب میں**

یہاں یہ بیان کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کنول کو خواب میں کیا درجہ حاصل ہے - بعض جید عرب مصنفوں نے نباتات اور حیوانات کے احوال و خصائص میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگر اس کو خواب میں دیکھا جائے تو دیکھنے والے کے لیے اس کے کیا معنی ہوں گے - گو یہ بذات خود ایک جدا اور ضخیم موضوع ہے' مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ مطالعہ بہت کچھ دلچسپ ہے - نیلوفر کے بارے میں عرب مبصر ابن شاہین نے لکھا ہے * کہ اگر کوئی عورت خواب دیکھے کہ اس نے نیلوفر کو توڑا ہے اور اپنے خاوند کو دیا ہے' تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے گا -

---

* نیلوفر' الاشارات فی علم العبارات' از ابن شاہین مصر سنہ ۱۳۰۷ ھ' (تعطیر الانام از عبدالغنی النابلسی کے حاشیے پر) جلد ۲ ص ۱۷۱ -

اسی طرح اگر کوئی دیکھے کہ اس نے نیلوفر توڑ کر اپنے غلام کو دیا ہے تو دلالت یہ ہے کہ وہ اس غلام کو آزاد کردے گا۔ اور اگر کوئی نیلوفر کی جڑ دیکھے تو اس سے بد خلق باندی مراد ہے - ابن سیرین + نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نیلوفر دیکھے تو اس سے مراد مال حلال ہے - یہ مال حلال ذریعے سے جمع کیا گیا ہے، اور حلال طور پر ہی خرچ بھی ہوگا —

**کنول مذہب اور متھیا میں**

انسان اپنی زندگی کے آغاز میں کائنات کی اکثر اشیا میں خدا کا جلوہ دیکھتا تھا، اور اسی بنا پر ان کو خدا یا خدا کا براہ راست نمائندہ سمجھتا تھا - ایک طرف اجرام فلکی اور دوسری طرف خود اس کے وطن یعنی زمین کے پہاڑ، دریا، نباتات اور حیوانات، کوئی اس کے اس ہمہ گیر تخیل سے نہیں بچا - خود ہمارے وطن میں آج تک نباتات اور حیوانات کے اکثر انواع کی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے - لیکن اس میں کچھ ہندوستان ہی کی خصوصیت نہیں ہے - قدیم تاریخ و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی ملک جہاں کبھی انسان آباد تھا اس "ہمہ اوست" قسم کے عقیدے اور اس ہمہ پرستی کے عمل سے خالی نہیں رہا - کنول بھی ان خوش نصیب نباتات کے زمرے میں شامل ہے، جسے نہایت نہایت قدیم زمانے سے (الاماشاءاللہ) اب تک خدائی یا خدا کی نمائندگی کا بلند رتبہ حاصل ہے —

ابھی اوپر ہم نے مصر قدیم کے بعض آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے جس میں کنول کا وجود بتایا جاتا ہے - جیسا کہ اوپر تربیلے ہی سے ظاہر ہے،

+ منتخب الکلام فی تفسیرالاحلام (تعطیرالانام کے حاشیے پر) از ابن سیرین جلد اول، ص ۲۳۴۔

یہ ایک مشکوک امر ہے کہ کنول اس قدر پرانے زمانے میں فی الواقع مصر کی سر زمین میں موجود تھا - جیسا کہ ان قدیم عمارات کے ملاحظے سے معلوم ہوا ہے ' یہ تو ضرور ممکن ہے کہ کنول پھول کو اہل مصر نے آرائش کے لیے استعمال کیا ہو ' لیکن اس کا باور کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس پھل کو مصر قدیم کی متھیا سے کوئی خاص تعلق یا رابطہ تھا - اوپر کے بیان میں بادشاہ نفرتوم ' جو کنول اپنے سر پر پہنے ہوے ہے ' بعد کے زمانے کا دیوتا ہے - اسی طرح هوروس * جو کنول پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے ' محض حبشہ اور اس کے بعد کے زمانے میں ملتا ہے - ولکنسن † ( Wilkinson ) نے لکھا ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ مصریوں کے نزدیک کنول ایک معزز اور متبرک شے ہے —

مصر سے چل کر کنول غالباً بحر روم میں سے ہوتا ہوا ہسپانیہ اور اندلوسیہ پہنچا ' جہاں عیسائیوں نے اس کا اس زور سے استعمال کیا کہ یہ ان کے عقاید کا ایک جزو ہو کر ان کی عبادت گاہوں میں دخیل ہو گیا - ' برن ہارت ' اور ' دھیشا ' نے اپنی کتاب " عربی ہسپانیہ " میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مضمون سے بحث کی ہے - اس کی دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے :—

" اب ہمیں اس اشبیلی مذہب کو فن لطیف کی تاریخ کی اس خصوصی کیفیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جس کے سبب سے اس میں

* (۱) Mytho. of Ancient Egypt از L. Spence ' ص ۲۹۹ '
اور (۴) Encycl. Relig. Eth. میں Lotus کا بیان -
† حسب (۲) اوپر -

اور مصر میں ایک قرابت قریبہ پیدا ہو جاتی ہے - زمانۂ قدیم سے ہم یہاں اس وضع کو رائج پاتے ہیں جو مریم عذرا کا خاص نشان کہلاتی ہے - یہ ایک برتن یا گھڑا ہے ' جس میں سے ایک پودا اگتا ہے اور اس کے دونوں طرف ایک پھول قرینے سے متوازی طور پر رکھا نظر آتا ہے - دیگر ممالک ( مثلاً اطالیا ) کی فنی صناعتوں میں یا تو اس کنول کو جبرئیل فرشتہ اٹھائے ہوتا ہے یا یہ مریم کے قریب ہی ایک برتن میں رکھا ہوتا ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اس لڑکی کے کنوارپن کی پاک دامنی پر محض ایک شاعرانہ دلالت ہے جس کو فرشتے نے اس نجات دلانے والے کی بشارت دی تھی —

لیکن اشبیلیہ میں یہ علامت خود مریم عذرا کے تصور کی طرف اشارہ کرتی ہے کیوں کہ سانتاکلارا * کی خانقاہ کے گرجے میں ایک منّبت پتھر ہے جو اس اونچے مذبح کے پشت کی دیوار کا ایک حصہ ہے جس میں سانت انّا اور سانت جوخم کو ایک تمالیے ہوئے دکھایا گیا ہے جو ہر ایک کے سینے سے لگا ہے اور جس کے سرے مل کر کنول کی طرح کا ایک پھول بناتے ہیں اور اس پھول کے اندر مریم عذرا متمکن ہیں - ہم نے صوبۂ اشبیلیہ کے دیہات کے ایک سے زیادہ گرجوں میں اسی قسم کی شکلیں دیکھی ہیں —

فردنند اور ازابلا کے زمانے کے بعد سے نقش کی یہ وضع ہمیں برابر ملتی چلی جاتی ہے ' اور اسے کنواری کا جرہ ( یعنی گلدان ) کہتے ہیں - لیکن

---

Arabic Spain, Sidelights on Her History and Art, by Bernhard and Ellen M.Whishaw.*

لندن سنہ ۱۹۱۲ م -

یہ امر کہ ' یہ خیال بہت ہی پرانا ہے ' اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کے آخر تک یہ پھول ایسے رسمی سے ہوگئے تھے کہ ان میں سے اکثر کسی نباتاتی نمونے سے مشابہت نہیں رکھتے - اور اس بات کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ یہ علامت بہت کچھہ پرانی ہے کیوں کہ یہ لکھا ہے کہ ۱۴۰۳ میں ' انتی کویرا ' کے فرنندونے ' جو بعد میں اراغون کا بادشاہ ہوگیا تھا ' اشبیلیہ کی سانت ماریا ( حضرت مریم ) کی یادگار میں میں فروسیت ( نائٹ ) کی ایک جماعت قائم کی تھی جو کنول کے گلدانوں یا آنکھہ کی پتلیوں کی جماعت کہلاتی تھی ' جس کے نشان کو اشبیلیہ کے پادریوں کی جماعت نے اختیار کرلیا تھا —

اشبیلیہ کے بڑے گرجے میں کنولوں کا یہ مٹکا کئی جگہہ دکھائی دیتا ہے - اونچے مذبح کے نیچے کے مرمری فرش کے تمغوں میں یہ مٹکا موجود ہے اور اس کنواریوں کے گرجے کے پھاٹک کے اوپر بھی کچے لوھے میں بنا ہوا رکھا ہے جس کی بنیاد سولھویں صدی کے شروع میں پڑی تھی اور جس میں غریب لڑکیوں کے لیے جہیز مہیا کرنے کا سرمایہ جمع کیا گیا تھا - اس پھاٹک کے اوپر بشارت کی لوھے کی ایک تمثیلی تصویر ہے جس کے ساتھہ کنولوں کا مٹکا کنواری اور فرشتے کے درمیان رکھا ہوا ہے - اسی طرح یہ سترھویں صدی کے تمام خوبصورت بیل دار لباسوں میں ' جو بڑے تہواروں کے موقع پر استعمال کیے جاتے تھے ' یہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا ہے —

مصر میں دریاے نیل کا سوسن ' جسے علم نباتات داں نہیں تو شعرا ضرور کنول کہتے ہیں ' ہر درجے کے زیور میں شامل ہے - پروفیسر فلنڈرس پٹری کا قول ہے کہ " یہ اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ

بعض لوگوں نے اس کو ہر نوع کے زیور کا ماخذ خیال کیا ہے" - مصر قدیم میں کنول 'خیم' کی ایک نشانی ہے' جو عنصر زندگی ہے اور جو وہ شراب ہے جس سے اوسیریس ( Osiris ) نے دنیا کو زر خیز کیا - اس واسطے یہ مصری مذبحوں پر رکھا گیا تھا' جہاں اس کی نوک دار پنکھڑیاں مرجع عبادت کی طرف شعلے کی طرح اٹھتی تھیں اور اس طرح اس کو 'مذبح کا چراغ' بنایا گیا' کیوں کہ یہ اس ابدی آگ کی علامت ہے' جس سے اوسیریس دیوتا زمین کو از سر نو زرخیز بناتا ہے —

شاید کنول کو زر خیز کرنے والی شراب کی علامت سمجھنے میں س پرانی 'اندلوسیہ' کی روایت کی ابتدا ہوئی ہو کہ جو عورت کنول کی جڑ کو کھائے وہ کراماتی طور پر حاملہ ہو جائے گی * - اسی لیے روایت یہ ہے کہ کنول کو کنواری ماں مریم کا' جو خود بغیر انسانی وسیلے کے پیدا ہوئی تھیں' نشان قرار دیا گیا تھا - لیکن یہ مخصوص مصری کنول اور خیم کی روایت اگر قبطیوں کے ہاں سے نہیں تو کہاں سے آئی کیوں کہ قبطی ہی اپنے پرانے مصری اعتقادات کو عیسائی ناموں کا باریک سا لباس پہنا کر لائے تھے —

... دریاے نیل کا تاریخی کنول' جو کہ مصریوں کے مذبح کا چراغ تھا' آہستہ آہستہ پندرھویں صدی کے کنول کے منکے میں موسوم ہوگیا اور پھر ... اس نے ان پھولوں کی شکل اختیار کر لی جو کسی قدرتی پھول سے مشابہت نہیں رکھتے - ایسے نمونے موجود ہیں جن سے اندلوسیہ کی موجودہ دست کاری میں کنول سے نفرت ( Nefert ) کے سر پیچ کی نمود کا حال کھلتا ہے - لیکن ہو "روایت" کے غیر معمولی ثبات کی مثال کے طور پر یہ کہہ سکتے

* ہم اوپر ابن شاہین اور ابن سیرین کی تعبیریں بیان کر چکے ہیں -

ہیں کہ ہم نے حال ہی میں سنا کہ اشبیلیہ کے ایک بھلے مانس نے
اٹھارھویں صدی کی ایک گل نما چیز کو پورے یقین کے ساتھہ 'کنول'
بتلایا اور دریافت کرنے پر اس نے یہ کہا کہ خود میری سمجھہ میں
نہیں آتا کہ میں نے اس کا یہ نام کیوں رکھا - واقعہ یہ ہے کہ یہ پھول
کسی قدرتی پھول سے مطلق مشابہ نہ تھا ... ...

ممکن ہے ہمارا یہ خیال غلط ہو کہ کنواری نشان' جو اس کے حمل
باکرہ کی طرف اشارہ ہے' شاید ہسپانیہ کے اس حصے سے مخصوص ہے کیوں کہ
ہمیں اشبیلیہ میں مسیحی بتوں کے تذکرے اور ان کی علامات کی کتابیں
دستیاب نہیں ہوتیں - لیکن شاید ہمارا یہ فرض کرلینا درست ہے کہ
لیس اور ریشمی کپڑوں میں "جرہ" کے ان نقوش کی مصری اصل کو
لوگ عموماً تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ جتنی مستند کتابیں ہماری نظر
سے گذری ہیں ان میں سے کسی میں ان کا اس طرح سے ذکر نہیں
ہے' اور اس کی اصلیت پر بہت بحث و تکرار ہونے پر یہ طے پایا ہے
کہ اس کی ابتدا نا معلوم ہے - سترھویں صدی کے آنت ورپ پوتن کانت
( Antwerp Potten Kant ) کے نقش' مع ان کی دو جدا شاخوں کے'
اور پندرھویں اور سولھویں صدی کے اشبیلیہ میں ملنے والے کنواری کے
متکوں میں قریبی مشابہت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پہلا خیال ان
نشیبی ملکوں میں اس وقت پھیلایا گیا جب وہ ہسپانیہ کی حکومت میں
تھے - مس شارپ لکھتی ہے کہ "بعض مصنف پوتن کانت کو ایک پرانے
نقش کی یادگار سمجھتے ہیں جس میں کنواری اور بشارت کی تصویر
شامل ہے -" جیسا کہ مس شارپ کی رائے ہے' یہ یقیناً ایک رسمی نقش
ہے جو کنواری سے متعلق ہے؛ لیکن اشبیلیہ میں اس نے خود مریم ہی

کی معجزانہ پیدائش ھونے کی وجہ سے ' نہ کہ بشارت کی تصویر میں شامل ھونے کے سبب سے' بہت زیادہ اھمیت حاصل کی ھے —

دریاے نیل کا کنول اندلوسیہ کے اس حصے میں عموماً نہیں دکھائی دیتا - زرد رنگ کا چھوٹا کنول وادی آرا * ( Guadaira ) میں ' جو اشبیلیہ سے دو یا تین میل دور ھے ' ایک محدود تعداد میں پیدا ھوتا ھے - لیکن سفید کنول یقیناً اس خطے کا ملکی پھول نہیں ھے ' اور نہ یہاں کے باغوں میں اس کی کاشت ھوتی ھے - پس اس پھول کے نقاشیوں میں استعمال ھونے کو ھم کسی مقامی اثر پر محمول نہیں کر سکتے - اور نہ یہ فرض کرنا چاھیے کہ اس کا ابتدائی مطلب ان لوگوں کے دماغ میں موجود ھے جو مصری مذہب کی شمع کے خاکے اب بھی بناتے ھیں - ان لوگوں کے نزدیک تو پھول ... ... خصوصی طور پر پھول ... ... صرف اسی کا نام ھے - ان کو اس بات کی تحقیق کرنے کا کبھی گمان بھی نہیں ھوتا کہ ایسا کیوں ھے - وہ اس پھول کو اب اپنی مصنوعات میں محض اس وجہ سے ظاھر کرتے ھیں کہ ان کے آبا و اجداد نے ان سے پہلے ایسا کیا - اندلوسیہ کا دھقانی رسوم کا بہت احترام کرتا ھے - وہ گذشتہ لوگوں کی عزت کرنے کے لحاظ سے گویا مصری ھے ... ... ... ... جن لوگوں نے ھمارے کنول ' کنول کے پودے اور کنول کے مذہبی شمع کی صنعتی تصویروں کے ذخیرے کو دیکھا ھے جو تعداد میں ایک سو سے زیادہ اقسام کے ھیں وہ ھماری ھی طرح روایت کے حیران کن ثبات سے متاثر ھوتے ھیں کیوں کہ یہ پھولوں کی رسمی یا غیر رسمی اقسام میں سے ایک بھی نہیں ھے - شاید یہ کہنا

---

* وادی آرا یا وادیارا ایک چھوٹا سا دریا ھے جو شہر اشبیلیہ کے قریب وادی الکبیر میں شامل ھو جاتا ھے ( عنایت اللہ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ' ص ۴۸۸ ) -

مبالغہ نہ ہوگا کہ "وہ پھول" پھولوں کے تمام اقسام میں' جو اشپیلیہ' 'حلوا' قادیس کے صوبہ جات میں اور المغرب کے ضلع میں پائے جاتے ہیں' تقریباً نوے فی صدی ہے خواہ وہ مادہ' جس سے تصویر بنائی جاتی ہے' کچھہ بھی ہو - اور یہ قدیم و جدید مصنوعات میں یکساں ہے - یہ اپنی خالص شکل میں ہمیشہ مصری کنول ہوتا ہے یونانی کبھی نہیں ہوتا۔ زندگی کے قدیم تصور کی اس مسلسل ساخت میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم اس کو پچاس یا سو برس قبل کی بنی ہوئی چیزوں' مثلاً فرنیچر' میں پوری شکل میں مگر الٹا رکھا ہوا پاتے ہیں - جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصور کو اس شکل کے بنانے کی غرض کا' جس سے وہ اس قدر محظوظ ہوتا ہے' قطعی علم نہیں ہے ... ... ..."

ایران قدیم کے مذہب اور متھیا بھی کنول کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے - البتہ اہل ایران جشن نیلوفر کے نام سے ہر سال ایک جشن مناتے تھے - یہ جشن عموماً ماہ تیر کی چھٹی تاریخ کو ہوتا تھا - یہ امر محقق نہیں ہے کہ اس جشن کا یہ نام کیوں رکھا گیا - قیاس چاہتا ہے کہ یہ جشن نیلوفر کے پھولنے کی رت میں ہوتا رہا ہوگا —

کنول پھول کو جو عظمت اور اہمیت اس کے سب سے بڑے اور غالباً اصلی وطن ہندوستان کی سرزمین میں حاصل ہوئی وہ کہیں اور نظر نہیں آتی - ہندی متھیا * میں دیوتاؤں اور دیویوں کو کنول پھول سے براہ راست تعلق ہے - ہمارے قدیم بتوں اور مجسموں میں برہما' شیو اور وشنو اور ان کی دیویاں سرسوتی' پاروتی اور لکشمی کنول پر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - قدیم ہندیوں کے ہاں کنول گویا

* Encycl. Relig. Eth.

ناراین اور برهما کا رحم مادر تها - شاید یهی وجه هے که برهما جی اکثر مورتوں میں کنول پر جهکے یا اس پر بیٹهے هوے نظر آتے هیں - وشنو دیوتا کی اکثر مورتوں میں یه بهی دیکها جاتا هے که اس کے کسی ایک هاتهه میں ایک کنول هے - آگ کا دیوتا اگنی ' هوا کا دیوتا پون ' خداے عقل گنیش ' وشنوجی کے اوتار سری رام چندر جی اور ان کے حریف بد بخت ' راون راکشس بهی اسی حالت میں نظر آتے هیں - اس طرح اندر ' وشنو اور ان کے تمام اوتار ' اور سورج دیوتا بهی کنول پر کهڑے دکهائی دیتے هیں - لنکا میں بهی شیو اور پاروتی ' اور دولت کا دیوتا کُبیر ' اور تبت میں علم کی دیوی سرسوتی کی مورتیاں بهی اسی انداز میں پائی جاتی هیں - اسی طرح جین مذهب کی پرانی عمارتوں اور مندروں میں بهی کنول پهول کو خداؤں سے قریب ترین قربت حاصل هے - عام طور سے مورتوں میں وشنو کے چار هاتهه دکهائے جاتے هیں جن میں سے ایک میں وه کنول لیے هوتا هے ؛ اور اس کی سواری کا جانور* گرڑ ( गरुड़ ) بهی جو آدها پرند هے ' اسی کنول کے سامنے جهکا هوا دکهائی دیتا هے - کنول وشنو کے ان چار اسلحه میں سے بهی ایک هے جو اس کو دیووں کے خلاف بچاتے هیں† وشنوجی‡ کی تسبیح بهی کنول کے بیجوں کی بنی هوئی هے — قسمت کی دیوی لکشمی وشنو دیوتا کی بیوی ' اور کام کی ماں هے-

---

* Iconography of Buddhist and Brahmanical sculptures in the Dacca Museum, by N. K. Bhattasali. ص ۷۸ -

† The Rites of the Twice-Born, by Mrs. S. Stevenson. ص ۲۲۴ -

‡ The Religions of India, by E. W. Hopkins. ص ۵۰۲ -

رامائن میں لکھا ھے کہ جب دیوتاؤں اور دیوتاؤں اور اسوروں نے منتروں کی جاپ کی تو وہ ھاتھہ میں کنول لیے ھوے اپنے پورے جمال کے ساتھہ سمندر سے ظاھر ھوئی - ایک دوسری روایت کے مطابق وہ پیدائش کے وقت کنول پھول پر تیر رھی تھی - کنول ھی کی مناسبت سے اس کو پدم کہتے ھیں - پرانوں کا بیان ھے کہ وہ بھرگو کی بیٹی ھے - وشنو پران میں لکھا ھے کہ جب ھری ایک بونے کی شکل میں پیدا ھوا تو لکشمی ایک کنول سے ظاھر ھوئی - لکشمی کے چار ھاتھہ ھوتے ھیں جن میں سے ایک میں کنول ھوتا ھے * —

سفیدی مائل سیاہ پتھر پر بنی ھوئی چھہ فٹ چار انچ اونچی وشنو کی ایک مورت، جس کی لکشمن کاتی، صوبۂ بکر گنج میں پوجا ھوتی ھے، بابو گرو پرسام گھوش کے مکان پر ملی ھے - یہ مورت اب تک بالکل صحیح و سالم ھے - اس میں وشنو کی سواری کا جانور گرڑ ایک کنول پر ایک پیر کے بل ھاتھہ جوڑے ھوے کھڑا ھے - وشنو اس کے پھیلے ھوے بازوؤں پر بیٹھا ھوا ھے، اور اس کے داھنے ھاتھہ میں ایک کنول ھے جس میں "کملا" دیوی بیٹھی ھوئی اپنے داھنے ھاتھہ سے خیرات کر رھی ھے اور بائیں ھاتھہ میں ایک کنول لیے ھوے ھے - اس کے دونوں طرف دو ھاتھی کنولوں پر کھڑے ھوے اپنی سونڈوں میں گھڑے لیے اس دیوی پر پانی برسا رھے ھیں - اسی طرح سے دیوتا کے بائیں ھاتھہ میں بھی ایک کنول ھے جس پر سرسوتی دیوی بیٹھی ھوئی ستار بجا رھی ھے † -

لکشمی نارائن کی سیاہ پتھر پر ایک مورت 'بسته' کے بھاو مکاس کے

---

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion, by J. Dawson. ص ۱۷۲ -

† Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۶ -

مکان میں ملی ہے - اس مورت میں نارائن جی ایک کنول پر بیٹھے ہوے ہیں، اور ان کے ایک ہاتھہ میں پدم ہے - لکشمی دیوی اپنی داہنی ٹانگیں دہرائے ہوے وشنو جی کے زانو سے لگی بیٹھی ہیں اور ان کا داہنا ہاتھہ وشنو جی کی گردن میں پڑا ہوا ہے - گرز جھکا ہوا اس کنول کو اٹھائے ہوے ہے جس پر یہ دونوں بزرگ بیٹھے ہوے ہیں * -

"سور جلم" کی ایک خوبصورت سیاہ پتھر پر بنی ہوئی مورت ڈھاکہ میں دستیاب ہوئی ہے جس کی وشنوی خانقاہوں میں پوجا ہوتی ہے - اس دیوتا کے چار ہاتھوں میں سے ایک میں کنول ہے، اور اس کے نیچے دو "ناگ" جن کے سر انسان کی طرح کے ہیں، پیروں میں لپٹے ہوئے ہیں - ان میں سے ایک کنول لیے ہوے ہے † —

وشنو‡ دھرم تار میں لکھا ہے کہ ورن کو ایک ایسے رتھہ پر سوار ہونا چاہیے جس کو سات ہنس کھینچتے ہوں - اس کا رنگ ویدریا (ایک قیمتی جوہر) کے رنگ کا ہوتا ہے، اور اس کو سفید پوشاک پہنے ہوے، موتیوں کے زیور اور مالے سے مزین، اور اس کا پیٹ کسی قدر لٹکا ہوا ہونا چاہیے - اس کے چار بازو ہوتے ہیں؛ اس کے سر پر ایک سفید چتر اور بائیں طرف مچھلی کا جھنڈا ہوتا ہے - ورن کے داہنے ہاتھوں میں ایک پدم اور پاس اور بائیں ہاتھوں میں سنکھہ اور رتن پتر ہوتا ہے - اندر $ دیوتا کے ہاتھہ میں وجر اور انکوش یا نیلوت پل ہوتا ہے - بعض لوگ

* Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۸ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۶ -

‡ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راؤ، ص ۵۳۰ -

$ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راو - ص ۵۱۹ - ۵۲۰ -

کہتے ھیں کہ اندر کا رنگ سفید ھوتا ھے - اس کے چار بازو، اور پیشانی کے بیچ میں ایک تیسری آنکھہ بھی ھوتی ھے - اس کے داھنے ھاتھوں میں سے ایک میں وجر اور دوسرے میں پدم ھوتا ھے؛ اور اس کے بائیں ھاتھوں میں سے ایک اندر رانی کے گرد ھوتا ھے اور دوسرے میں انکوش ھوتا ھے - نیل کنٹھہ * کی ایک مورتی 'ہری سال' سے چند میل کے فاصلے پر کاشی پور میں پائی گئی ھے - اس مورت میں نیل کنٹھہ کی بیویاں، گنگا اور گوری، اس کے دونوں طرف کھڑی ھیں اور دونوں کے بائیں ھاتھوں میں ایک ایک کنول ھے - گوری دیوی † کی پوجا دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے کی جاتی ھے - روپ منڈن ‡ نے ساوتری کا حال یوں لکھا ھے کہ اس کے چار سر اور چار ھاتھہ ھوتے ھیں - ھاتھوں میں اکش مالا (अक्षमाला)، (پستک کتاب)، پدم اور کمنڈل (कमण्डलु) ھوتی ھے —

جنوبی ھندوستان میں بھی کنول کو بڑے زور شور سے نوازا گیا ھے - وھاں کے متعدد دیوتاؤں کی مورتیاں کنول کی کسی نہ کسی صورت اور وضع سے مزین ملتی ھیں - سبرامنی $ کی بچپن کی تصویر کو بال سوامی (बालस्वामी) کہتے ھیں - اگر مورت میں ان کو ان کے والدین کے بغل میں کھڑا دکھانا منظور ھو، جیسا کہ شوجی کی سوما سکند (सोमास्कन्द)

* Iconography of Buddhist and Brahmanical Sculptures in the DaccaMuseum
از نلنی کانت بھٹا سالی، ص ۱۱۶ – ۱۱۷ -

† ایضاً، ص ۱۹۹ –

‡ Elements of Hindu Iconography از گوپی ناتھہ راو - ص ۵۰۶ -

$ Elements of Hindu Iconography، ص۴۳۹، Subrahmanya
by T. A. Gopi Nath Rao.

مورت میں ہے، تو ان کو ایک ایسے بچے کی طرح بناتے ہیں جس کے ہر ہاتھہ میں ایک کنول ہو اور جس کا بایاں ہاتھہ پٹھے پر رکھا ہو۔ اس تصویر کا رنگ بھی لال ہوتا ہے - برھم چاری سبرامنی کے دو آنکھیں اور دو بازو ہوتے ہیں اور وہ پدم پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے سر پر گھنے بال، یجنو پویت * ( यज्ञोपवीत ) ، مونجی ، ( مونج کا کمر بند ) اور کوپن ( कौपिन ) ہوتا ہے - داھنا پیر پدم پر مضبوطی سے ٹکا ہوتا ہے اور بایاں کسی قدر خم دار اس پر رکھا ہوتا ہے - داھنے ہاتھہ میں ایک ڈنڈا اور بائیں میں ایک وجر ( वज्र ) ہوتا ہے - اس کا رنگ بھی لال ہوتا ہے - سبرامنی کی دیویوں کا بیان کمارتنتر † میں اس طرح سے ہے کہ مہاولی ( महावल्ली ) کو کالے رنگ کی اور ھنس مکھہ ہونا چاھئے - اس کو داھنے پیر کے بل زمین پر کھڑا ہوا اور اس کا بایاں پاؤں داھنے پاؤں پر ٹکا ہوا ہونا چاھیے - اس کے بائیں ہاتھہ میں ایک پدم (کنول) اور داھنا ہاتھہ لٹکا ہوا ہونا چاھیے —

شاستان کاٹ تی ‡ ( تراونکور میں ) کے مندر میں شاست ( Sasta ) کی ایک مورت ہے جس میں اس کے دو بازو ہیں جن میں دھنش ( کمان ) اور بان ہیں: اور وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے - پر بھاولی ( प्रभावल्ली ) کے دو مزین ستونوں پر شاست کی دو دیویاں بھی بنی ہوئی ہیں ان میں سے داھنی والی کے ہاتھہ میں ایک پدم اور بائیں والی کے ہاتھہ میں نیلوت پل ( नीलोत्पल ) ہے - جین $ مذھب کے ایکیسویں تیرتھنکر،

* Elements of Hindu Iconography، ۳۲۲

† ایضاً، ص ۳۲۵ —

‡ ایضاً، ص ۴۹۲ ؛ Sastankattai

$ The Heart of Jainism، ص ۵۷ -

نامی ناتھہ، کی علامت نیلا کنول ہے - چھٹے تیرتھنکر کی ماں، سوسانہ *
( सुसामा ) ، کو لال کنول کے بستر پر لیٹنے کا بہت شوق تھا جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ اس کے بیٹے نے سرخ کنول اپنی علامت رکھی - شری چکر سانبھار†
تنتر میں چکر مہاسکھہ کی مورتی کا حال یوں لکھا ہے کہ وہ ایک
آٹھہ پنکھڑیوں والے کنول میں بند ہے - اس کنول کی چار پنکھڑیوں پر ڈاکنیوں
کی مورتیں بنی ہوئی ہیں اور باقی چار پنکھڑیوں پر آب حکمت سے بھرے
ہوے ظرف ہیں جن پر کھوپری کی وضع کے پیالے ہیں - ان پیالوں میں
پانچ قسم کے آب حیات ہیں - خاص دیوتا کے پاؤں کنول پر ٹکے ہوے
ہیں - ان آٹھہ متحرک پنکھڑیوں کے نیچے کئی چھوٹی چھوٹی ساکت
پنکھڑیاں بھی بنی ہوئی ہیں - یہ پھول ایک موٹے سے تنے نکلا ہے اور
اس کے دونوں طرف دو جوان دو ہری ناگ لڑکیاں بنی ہوئی ہیں
جن کے بدن ایک ہی اُٹھی ہوئی دم سے نکلے ہیں - یہی لڑکیاں کنول
کی چھوٹی پتیوں کو سنبھالے ہوے ہیں ...... اس سورت کی مجموعی ہیئت
میں چند اور جانور — نیولا، بندر، ہاتھی، ہرن، خرگوش اور ایک شیر — بھی
نظر آتے ہیں ؛ اور ہر چیز کی تہ میں کنول پھول اپنی مختلف حالتوں میں
آشکارا ہے —

زمانہ قدیم میں اکثر بندگان خدا "کنول پوجا" ‡ کیا کرتے تھے
( اور اب بھی کرتے ہیں ! ) جس میں انہیں اپنی جان تک کو قربان کرنا
پڑتا تھا - کہا جاتا ہے کہ اس قربانی کے اثرات کی کوئی انتہا ہی نہ تھی -

---

* The Heart of Jaianism ؛ ص ۵۲ -

† Tantric Tents by Avalon ، جلد ۷، ص ۲۱ - ۳۱، مذکور در Icon. of Buddhist and Brah. Sculp. in Dacca Museum. از نلنی کانت بھٹاسالی -

‡ The Rites of the twice-Born by Mrs. S. Stevenson ، ص ۳۹۸- ۴۰۰

پدم شلا * ( पद्मशिला ) ( کنول کی سل ) ہر اس عمارت کے سنگ بنیاد کو کہتے ہیں جو ہندو مراسم کے مطابق تعمیر کی جاتی ہے؛ کیونکہ اس پر ایک آٹھ پنکھڑیوں والا کنول کندہ ہوتا ہے۔ اس کنول پر زعفرانی رنگ کا ایک سواستیک بنایا جاتا ہے۔

زرد تارا † کی ایک قسم وجرتارا ہے۔ اس کی مورتیں کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ایک آٹھ انچ اونچا کنول ہے' جو ایک پایدان' ایک پھول اور ایک ٹوپی نما سی چیز سے مل کر بنا ہے۔ پایدان کے اوپر آٹھ پنکھڑیوں کا ایک کنول ہے جس کی ہر پنکھڑی پر ایک دیوی بنی ہے۔ بیچ میں بھی ایک ایک دیوی بیٹھی ہوئی ہے' جو شاید بودھ مت کی دیوی تارا ہے۔ اس کے آٹھ بازو ہیں اور اس کے سر پر ایک استوپ بنا ہوا ہے۔ یہ کنول ایک مشین کے ذریعے سے بند ہوجاتا ہے اور اسی سے کھل بھی سکتا ہے۔ جب تمام پنکھڑیاں سمٹ کر بند ہوجاتی ہیں تو وہ ایک کنول کی کلی معلوم ہوتی ہے —

پوجا کرنے میں جو مختلف ارکان عبادت ہیں' ان میں بھی کنول کو دخل ہے۔ چنانچہ کمل مدر حالت میں "پجاری ‡ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک کھلے ہوئے کنول کی شکل بناتا ہے"۔ اہل ہند نے اسی سب پر اکتفا نہیں کی' بلکہ انسان کے جذبات میں سے ایک کا نام' کنول کے نام پر'

---

* The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۳۵۵ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۳۵ - ۳۶ -

‡ The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۲۲۳ -

پدم لیسیا ( पद्मलेश्या ) رکھا ہے - اس نام کی وجہ استعمال یہ بتائی جاتی ہے کہ اس حالت میں انسان ہر اچھی شے کی طرف اسی طرح راجع ہوتا ہے جس طرح کہ کنول سورج کی طرف کھلتے ہیں * —

کنول بدھ مذہب کا بھی ایک مقدس پھول ہے - چونکہ یہ پھول کیچڑ میں اُگتا ہے، پانی میں بڑھتا ہے اور ایسے غلیظ اور گندے مبدا سے پیدا ہونے کے باوجود ایسی عمدہ خوشبو دیتا ہے؛ اس لیے اس کو ایک نیک بندے سے تشبیہہ دیتے ہیں جو اس دنیاے دنی میں رہتا ہے - سر مونیر ولیمز نے لکھا ہے کہ "اس پھول کا علامتی استعمال اس وجہ سے ہے کہ اس کی ساخت بالکل ایک پہیے کی طرح کی ہوتی ہے - اس کی پنکھڑیاں تیلیوں کی جگہ لیتی ہیں اور اس طرح سے ہستی کے ابدی چکر کی تعلیم دیتی ہیں" - ہم اکثر مہاتما بدھ کو ایک سنہرے کنول پر بیٹھا یا کھڑا ہوا دیکھتے ہیں؛ اور اس سے ہمیں وہ بودھی سوتر یاد آتا ہے جسے اصطلاح عام میں "شریعت حقہ کا کنول" کہتے ہیں —

بودھ مت کی سکھاوتی کی جنت میں جہاں عورتوں کا بالکل وجود ہی نہیں ہے، ہر شخص ایک دیوتا کی شکل میں کنول کے پھول سے پیدا ہوتا ہے جسے سد دھرم پانڈریک ( सद्धर्मपुण्डरीक ) کہتے ہیں - بدھ مذہب کا ایک اور عقیدہ ہے کہ زمین پر جہاں جہاں مہاتما بدھ کا قدم پڑتا تھا ان کے قدم کے نشانات کنول کی شکل کے ہوتے تھے - پالی شرع میں اس کے بے شمار حوالے ملتے ہیں؛ مگر مہا پدن سُتانت میں جس میں، مہاتما کے پہلے سات قدموں کا ذکر ہے، اس کا

* The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۲ - ۱۰۳ -

کوئی ذکر نہیں ملتا، یہ سب تفصیل بعد کی کتابوں اور تحریروں کی ہے -

زمانہ قدیم میں کنول اور سورج میں ایک علاقہ وحدت مانا جاتا تھا -
بہت ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ قانون فطرت تھا کہ کنول طلوع آفتاب کے ساتھ
سر پانی سے نکالتا ہے اور پھر اس کے غروب کے ساتھ غائب ہوجاتا ہے -
اس سے پرانے زمانے کے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ پھول سورج کا
شبستان ہے، یا یہ کہ وہ سورج کو روزانہ از سر نو روشنی بخشتا ہے اور
سطح فلک پر چڑھاتا ہے - کنول کی تصویر سورج کے ساتھ ہم گندھار
کی عمارتوں میں پاتے ہیں -

ہاتھ میں کنول ہونے سے نہ محض یزدانی پیدائش بلکہ حیات
جاودانی پر قابو رکھنا بھی مقصود ہے - اس کی مثال آریوں کی آسمانی
ملکہ، ہندوؤں کی دیوی شری اور بودھ مذہب والوں کی تارا ہیں -
جیسا کہ اوپر تحریر ہوا بودھ مذہب سے قبل ویدوں کے زمانے میں
کنول رحم مادر کا نشان تھا اور غالباً بودھ مذہب کی دعا "اوم منی
پدم ہوم" میں اس معنی کا بھی لحاظ کیا گیا ہے؛ اور بہت ممکن ہے
کہ تارا کے منگیتر اولوکتا کے ہاتھ میں کنول ہونے سے اس معنی کا
بھی کوئی تعلق ہو —

ذیل میں بودھ مذہب کے ان دیوی دیوتاؤں کی تفصیل ہے
جن کے ہاتھ میں کنول ہے:

(۱) ہاتھ میں کسی قسم کا کنول ہونا تارا، اولوکتا، پدم پنی اور
کبھی کبھی میتریے کی علامت ہے -

(۲) کنول کے اوپر ایک تلوار کا ہونا اموگھ پاش، کھکر بھہ، سمبھناد،
تارا، پدماپنی، اولوکتا اور میتریے کا نشان ہے —

(۳) کنول اگر بجلی کے ہمراہ ہو تو منجسری اور وجر پان (वज्रपाणि) کی علامت ہے—

(۴) کنول اور کتاب ساتھ ہوں تو منجسری اور پرجن پرمت (प्रज्ञापमित) کا نشان ہے—

(۵) گوہر کی صورت میں کنول کشتی گربھ اور ایکجات (एकजात) کی علامت ہے' اور—

(۶) سورج کے ساتھ سامنت بھدر (सामन्तभद्र) کا نشان ہے۔ تبت کے سادھوؤں کے واسطے کنول لاما کے طایفہ کے بانی کا خاص نشان ہے اور پدم کار (पद्मकार) (یعنی' کنول سے پیدا شدہ) سونگ کھاپ (زرد ٹوپی والے مصلح فرقہ کے بانی) اور گلوگ لاما کا نشان دو کنول ہے—

بردھ متھیا میں پالی شرع کے بدھ نام کے پہلے چوبیس مہاتماؤں میں سے دو کے نام کنول پر ہیں' یعنی پدم اور پدو متر! اور بہت سے ناگ سورماؤں کے نام' مثلاً پدو متر اور پانڈریک' اور بدھ مت کی دگی دوزخ' پدم' مہاپدم اور پانڈریک کے نام بھی کنول پر ہیں۔

آئیے اب جاپان اور چین کی بھی سیر کریں اور دیکھیں کہ وہاں کنول پھول کس رنگ میں جلوہ گر ہے۔ جاپانیوں کے ہاں یہ روایت* بہت مشہور ہے کہ بدھ جی ڈنڈک پہاڑ پر اپنا مراقبہ ختم کرنے کے بعد پہاڑی راستوں سے گذرتے ہوئے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ رات سخت تاریک تھی۔ ہر طرف ہر چیز پر خاموشی طاری تھی۔ اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ کر مہاتماجی نے کسی کی آواز سنی جو یہ کہتا تھا " شوجیو موجیو'

* Myths and Lengeds of Japan by F. H. Davis. ' ص ۸۰ - ۸۲-

(یعنی ' ظاہری اطوار باطنی کیفیات کی ہمیشہ ترجمانی نہیں کرتے)-
یہ الفاظ سن کر بدھ جی بہت خوش ہوے- بار بار یہ الفاظ سن کر
ان کا جی چاہا کہ معلوم کریں کہ ایسی عاقلانہ باتیں کون کہ رہا ہے-
اسی دھن میں آگے بڑھے- ایک چٹان کے کنارے پہنچ کر انہوں نے
نیچے وادی میں دیکھا کہ ایک بد صورت اژدھا غضب آلود نگاہوں سے ان
کو گھور رہا ہے- مہاتما جی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اژدھے سے دریافت
کیا کہ "تو نے بدھ مذہب کی یہ نفیس تعلیمات کہاں سے سیکھیں" پھر
بدھ جی نے اس سے اسی قسم کے اور عمدہ اقوال اور نصائح دریافت
کیے- اژدھے نے چٹان کے گرد لپٹ کر بلند آواز سے کہا: زی شیو مٹسو یو
(یعنی ' تمام جاندار بدھ جی کی شریعت کے خلاف ہیں)- اس کے بعد
اژدھا تھوڑی دیر تک خاموش رہا ' اور مہاتما جی کی درخواست پر
پھر یوں گویا ہوا کہ "شیو مٹسو مٹسوای" (کل نفس ذائقۃ الموت) یہ
کہنے کے بعد اژدھا پھر خاموش ہوگیا- اس کی شکل سے بھوک کے آثار
ظاہر ہورہے تھے- اس نے کہا کہ میری آخری نصیحت اس قدر بیش بہا
ہے کہ میں اس کو اس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک کہ میرا
پیٹ نہ بھر جاے- یہ سن کر بدھ جی نے فرمایا کہ "میں تیرے واسطے
کسی چیز سے دریغ نہ کروں گا ' مگر مجھے چوتھی نصیحت بتادے"- پھر
آپ نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ "تجھے کس چیز کی حاجت ہے"؟
جب مہاتما جی کو یہ معلوم ہوا کہ اپنے چوتھے قول کے بدلے میں اژدھا
انسان کے گوشت کا خواہاں تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "گو مذہب میں
جیو ہتیا کی سخت ممانعت ہے تاہم میں اپنی اُمت کے واسطے اپنی
جان تک قربان کروں گا"- اژدھے نے اپنا منہ کھولا اور یہ کہتے ہوے کہ

" جاکو، متسوای راکو" (یعنی، سب سے بڑی خوشی اس وقت حاصل هوتی هے جب روح تن سے جدا هوتی هے) مہاتما کو اپنا نوالہ بنا لیا۔ جوں هی مہاتماجی اژدھے کے منہ میں پہنچے ان کے آٹھہ حصے هوگئے اور چشم زدن میں وہ سنہرے کنول کی آٹھہ پنکھڑیاں بن گئے!

ذیل کی روایت سے معلوم هوتا هے کہ اس پھول میں جادو کی طاقت بھی هے جس کی مدد سے یہ بد ارواح کو دور رکھتا هے* :-

ایک دفعہ شہر کیوتو میں ایک وبا پھیلی جس نے هزاروں آدمیوں کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ وبا ادزومی (Idzumi) تک پھیل گئی جہاں کوریاما کا بادشاہ بود و باش اختیار کیے هوئے تھا؛ اور کوریاما اپنی بیوی اور بیٹے سمیت اس مرض میں مبتلا هوگیا۔ اس کے محل کے ایک افسر اعلیٰ تادا سامون (Tada Samon) نے ایک سنیاسی سے ملاقات کی جو بادشاہ کی علالت کے وجہ سے بہت متفکر تھا۔ اس نے سامون سے کہا کہ یہ تمام مصیبت یہاں بد ارواح کے آجانے سے پیدا هوگئی هے اور وہ یہاں اس لیے آگئی هیں کہ اس عمارت کے گرد کی نہریں خشک هوگئی هیں اور ان میں کنول نہیں رهے۔ اگر ان نہروں میں پھر وهی مقدس پھول لگا دیے جائیں تو یہ بری ارواح یہاں سے چلی جائیں گی، اور همارے بادشاہ، مع بیوی بچے کے، صحت یاب هوجائیں گے۔ سامون یہ سن کر بہت خوش هوا اور اس سنیاسی کو اجازت دلا دی کہ وہ اس محل کے گرد کنول کی کاشت کرے۔ اس کام کے ختم هونے پر سنیاسی غائب هوگیا؛ اور ایک هفتے کے اندر هی کوریاما، اس کی بیوی اور بیٹا اس قابل هوگئے کہ اپنے فرائض حیات انجام

* Myths and Legends of Japan. ص ۱۷۰ -

دینے لگے، کیونکہ اس وقت تک دیواروں کی مرمت کی جا چکی تھی اور صاف پانی پہنچایا جا چکا تھا جس پر جھومتے ہوے کنولوں کا عکس پڑتا تھا —

کئی سال کے بعد، جب شاہ کوریاما مرچکا تھا، اتفاق سے ایک سموارئی (Samurai) اس محل کے قریب سے گذرا - ابھی وہ حیرت سے ان پھولوں کو دیکھہ ھی رہا تھا کہ اس نے پانی کے کنارے دو حسین لڑکے کھیلتے ہوے دیکھے - وہ چاھتا ھی تھا کہ ان کو کسی محفوظ جگہ میں پہنچا دے کہ یکایک دونوں لڑکے اچھل کر پانی کے اندر گر پڑے - متحیر سمرائی یہ سوچ کر، کہ میں نے کاپا (Kappas، دریائی ارواح) دیکھی ھے، فوراً محل کو واپس گیا؛ اور وھاں سارا واقعہ بیان کیا - اس کا بیان سن کر نہر کو صاف کروایا گیا لیکن فرضی ارواح کا کہیں پتہ نہ ملا - کچھہ عرصے کے بعد ایک دوسرے سمرائی، مورت اپائی (Murata Ippai) نے بھی اسی کنول کے پاس کئی خوبصورت لڑکے دیکھے - اس نے اپنی تلوار کھینچ کر ان کا سر قلم کر ڈالا - اپنے قتل کا شمار کرنے کے واسطے جب اپائی نے اپنے گرد دیکھنا چاھا تو اس کے گرد رنگین بادل چھا گئے اور وہ کچھہ نہ دیکھہ سکا - مجبوراً تمام رات اپائی وھیں پڑا رھا - صبح کو جب آنکھہ کھلی تو اسے معلوم ھوا کہ اس نے محض کنول کے پھول توڑ ڈالے تھے - اسے یہ معلوم کرکے اور بھی افسوس ھوا کہ انھیں پھولوں نے کوریاما، اس کی بیوی اور بچے کی جان بچائی تھی - اپائی سخت نادم اور پشیمان ھوا اور دعائیں پڑھ پڑھ کر توبہ و استغفار کیا —

لفکیڈیو ھرن (Lafcadio Hearn) نے جاپان کے بہشتی کنول کا حال

یوں بیان کیا ہے کہ "یہ دل پسند عستیاں باغ لگاتی ہیں، کنول کی کلیوں کی حفاظت کرتی ہیں؛ اور ان کی پنکھڑیوں پر ایسی آسمانی شے چھڑکتی ہیں جس سے ان کو کھلنے میں مدد ملتی ہے۔ کلیاں کسی قدر خوبصورت ہیں: ان کے رنگ اس دنیا کے نہیں ہیں۔ ان کے روشن دلوں کی صبح کی سی چمک میں چھوٹے چھوٹے ننگے بچے بیٹھے ہوئے ہیں، اور ہر ایک کے گرد ایک چھوٹا سا ہالہ ہے - یہ ارواح نئے نئے بدھ اور 'ہوتوکے' (Hotoke) ہیں، جو خوشی میں پیدا ہوگئے ہیں - کچھ بہت ہی چھوٹے ہیں اور کچھ بڑے بھی۔ ہر ایک ظاہرا بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی دایائیں آب حیات کا سا اثر رکھنے والی چیزیں ان کو کھلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا کنول کا ہنڈولہ چھوڑ دیا ہے اور ایک جیزو (Jizo) کی رہنمائی میں عالم بالا کی روشنی کی طرف جارہے ہیں" —

اہل چین * کی متھیا میں تو،مو، شمالی ستارے کی دیوی ہے - بدھ مت اور تاؤ مت دونوں کے پیرو اس کی پوجا کرتے ہیں - تو،مو، دیوی کی مورتی میں دیوی کے سر پر ایک تاج ہے - اور وہ کنول کے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے - اس کے تین آنکھیں اور اٹھارہ بازو ہیں - یہ دیوی موت و حیات کی کتاب پر موکل ہے اور جو لوگ عمر طویل کے خواہشمند ہیں وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ -

اہل چین کنول نوازی میں کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں - انہوں نے اپنے بعض مقامات کے نام کنول کے نام پر رکھے ہیں - چنانچہ ان کی متھیا †

---

* چین کی متھیا، ورنر؛ ص ۱۴۴ -

† چین کی متھیا، ورنر؛ ص ۳۴۴ - ۳۴۵ -

میں بندر دیوتا کے متعلق ( جو ایک مہتم بالشان هستی هے ) ایک طول طویل کہانی هے ' اس کی واردا توں کے مقامات میں سے ایک پہاڑ هے ' جس میں ایک غار هے جسے ' کنول غار ' کہتے هیں ؛ اور اس غار میں دیووں کا ایک جتھا رهتا هے —

چین * میں بدھ مذهب کے دیوتاؤں میں ایک مسئلۂ تثلیث بھی هے میں مہاتما بدھ ' ان کی تعلیم اور پوجا شامل هے ؛ اور جیسے وہ لوگ شیکیا فو ( شاکیہ ) ' اومی توفو ( امیت ) اور جولائی فو ( تتھا گاتا ) ؛ اور کبھی کبھی فوپاؤ ' فے پاؤ اور سہاگ پاؤ ( سہن پاؤ یعنی ' تین نادر هستیاں — مہاتما بدھ ' جو اس دنیا میں دھرم بتانے کے لیے آئے ؛ دھرم اور سنگھ ) کہتے هیں - پروهتوں کے واسطے یہ محض بدھ جی — گذشتہ ' موجودہ اور آئندہ — هیں - ان تینوں بزرگوں کو نقش یا مورتی میں اس انداز سے دکھایا جاتا هے کہ وہ کنول پر بیٹھے هوے هیں —

اهل یونان بھی کنول کی عالم گیر اور سخت گرفت سے آزاد نہ تھے - چنانچہ قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جنگل † اور سڑکوں کے کنارے پر کا هر درخت ایک خاص دیوتا کی حفاظت میں رهتا هے جس کو وہ همدریاد ( Hamdryad ) کہتے تھے - اور یہ بھی کہا جاتا هے کہ وہ دیوتا اسی درخت پر رهتا تھا اور اپنی جان بھی اسی پر قربان کر دیتا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بعض انسانی هستیاں اپنی وفات کے بعد همدریاد کی شکل اختیار کر لیتی تھیں - چنانچہ روایت هے کہ

---

* چین کی متھیا ' ورنر ص ۱۱۹ - ۱۲۰ -

† یونان اور روم کی متھیا مصنفہ ' ا ' گربر ( H. A. Guerber ) ص ۲۶۱ - ۲۶۳ -

ایک نوجوان شہزادی، جس کا نام دریوپ ( Dryope ) تھا، سن بلوغ کو پہنچتے ہی اپنے واسطے ایک مناسب شوہر کی متلاشی ہوئی؛ اور بڑی جد و جہد کے بعد اس کی شادی اندریمان ( Andraeman ) نامی ایک شاہزادے سے قرار پائی - قصہ مختصر، شادی ہوئی اور خدا نے اس کو ایک بیٹا بھی دیا - شہزادی دریوپ ہر روز اس بچے کو محل کے قریب ہی ایک تالاب پر لے جایا کرتی جس میں رنگ برنگ کے پھول اُگے ہوئے تھے - ایک دن جب وہ حسب معمول وہاں خرام ناز میں مشغول تھی، اس نے ایک کنول کا پھول دیکھا، اور اپنے بچے کو بھی دکھایا - پھول کو دیکھتے ہی بچے نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا - اس کو خوش کرنے کے لیے دریوپ نے پھول توڑ کر بچے کو دے دیا - پھول کے توڑتے ہی ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے اور دریوپ نقش حیرت بن کر رہ گئی - دفعتاً اس نے ایک آواز سنی جس نے اس پر لوتس ( Lotis ) نامی ایک ارواح کو مار ڈالنے کا الزام لگایا جس نے سایہ کے دیوتا پرائی پوس سے بچنے کے واسطے ایک پھول کی شکل اختیار کرلی تھی - دریوپ نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے قدم زمین میں گڑے رہ گئے - اس کی حیرت و یاس کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ درخت کی چھال اس کے پیروں پر بہت تیزی سے چڑھتی جا رہی ہے؛ یہاں تک کہ اس کا پورا جسم چھال اور پتوں سے ڈھک گیا اور انسانی ہیئت کا کوئی اثر تک باقی نہ رہا؛ وہ ایک درخت میں منتقل ہوگئی ــ

یونان کی قدیم تاریخی روایات میں شہر صور ( ترواے ) اور ہیلن کے واقعے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ذکر اور تکرار سے مستغنی ہے - لطف

یہ ہے کہ اس تمام واقعے میں بھی کنول کار فرما ہے - راوی جادو بیان روایت کرتا ہے کہ ترائے سے واپس ہوکر یولی سیس * اپنے ہمراہیوں کے ساتھہ سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا ایک ملک میں پہنچا جن کی خاص خوراک کنول کا پھل (تال مکھانا ؟) تھی؛ اور اسی سبب سے اس کو "کنول خوروں" کا ملک کہتے تھے - یولی سیس نے اول اپنے تین ہمراہیوں کو وہاں کے باشندوں سے ملاقات کرنے کے لیے روانہ کیا - اندر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے چند بے فکرے اپنے محبوب درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اسی کے پھل کھا رہے ہیں - انھوں نے نہایت ہی احترام سے اجنبیوں کا خیرمقدم کیا؛ اور کنول کے پھل سے ان کی خاطر تواضع کی۔ اس پھل کے کھاتے ہی ان کے دماغ سے اپنے وطن اور اہل وطن کا خیال بالکل جاتا رہا ان پر مدھوشی سی طاری ہوگئی —

یولی سیس نے بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کیا اور آخر کار کسی نئے حادثے کے وقوع سے خوف زدہ ہوکر وہ چند مسلح آدمیوں کو ساتھہ لیتا ہوا آگے بڑھا - اپنی امید کے برخلاف زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے کے بجائے، اس نے ان لوگوں کو کنول خوروں کے ساتھہ رنگ رلیاں مناتے پایا - اُن کی نظروں سے مدھوشی ٹپک رہی تھی - ان کی یہ حالت دیکھہ کر اس کو شبہہ ہوا - اسی وقت چند کنول خوروں نے نووارد مہمانوں سے بھی دعوت میں شامل ہونے کی درخواست کی - فوراً ہی یولی سیس نے اپنے رفیقوں کو اس سحر آمیز غذا کو کھانے سے روکا اور اپنے دوستوں کو زبردستی گرفتار کرکے جہاز پر لے گیا - تھوڑی دیر بعد ان کا نشہ ہرن

* یونان اور روم کی متھیا، باب ۲۸، ص ۳۰۱ - ۳۰۳؛ یولی سیس کی مہمات۔

ہوگیا اور سب لوگ استقلال کے ساتھہ مغرب کی طرف چلے گئے —

ہندوستان کے ہتھہ یوگی فلسفے میں بھی کنول کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے شت چکر نروپلم (षतचक्रनिरुपम) نام کے تن تری رسالے میں لکھا ہے کہ آدھار کنول کا بیرونی پردہ ایک مثلث ہے اور اس مثلث کے اندر لنگ ہے جسے سویمبھہ کہتے ہیں۔ انسان کے بدن میں سر سے زیر ناف تک چھہ نقاط ایسے ہیں جن کی باقاعدہ اور صحیح ورزش و نگہداشت سے نہ صرف یہ کہ صحت قائم رہتی اور ترقی کرتی ہے بلکہ انسان لیل و نہار کے عدد و شمار سے آزاد ہوکر حیات ابدی بھی حاصل کرسکتا ہے اور اس کائنات میں دانائے کم و کیف اور واقف اسرار موت و حیات بن سکتا ہے۔ ان نقاط کو عموماً چکر کہتے ہیں اور کنول سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چکر کی تربیت اور صحیح ورزش سے مختلف اور متعدد حیران کن نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے انسان اپنی جسمانی اور روحانی زندگی میں نامحدود اور بے انتہا ترقی کرسکتا ہے۔ ہتھہ یوگ میں جسمانی ریاضت اور ورزش کی متعدد تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ جسمانی صحت کے حصول، قیام اور دوام کے لیے جو ریاضتیں مقرر ہیں ان کو مجموعی طور پر پرانا یام (प्राणायाम) کی ریاضت کہتے ہیں۔ پرانایام میں طرح طرح کے آسنوں میں یعنی نشستوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان آسنوں میں ایک کا نام پدم آسن (पद्मासन) یعنی نشست نیلوفری ہے۔ پدم آسن بناکر سانس کو زور سے اندر کھینچنے کی تلقین کی جاتی ہے اور اس بارے میں ہتھہ یوگ پر دیپک (हठयोग प्रदिपिका) میں یہ تاکیداً بتایا گیا ہے کہ سانس کے ساتھہ ہوا کو دل کے کنول تک بھر لینا چاہیے۔ اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ " جب پیٹ ہوا سے پوری

طرح بھر جاتا ہے تو بدن گہرے پانی میں اس طرح تیرنے لگتا ہے جیسے کنول کی پتی * " —

پر دیپک میں جسم کے چھ " چکروں " (یعنی ' مرکزوں ) کو کنول کے پھولوں سے تشبیہہ دی گئی † ہے - اہل شاستر کا عقیدہ ہے کہ سوم ( یا چندر सोम ) انسانی دماغ میں ایک ہزار پتیوں والا کنول ہے اور یہ وہی چیز ہے جو تصویروں میں شیو دیوتا کے سر پر لگا نظر آتا ہے - اس کنول میں سے ایک قسم کا عرق ہر وقت ٹپکا کرتا ہے ؛ اور اگر کوئی شخص اس عرق کے روک لینے پر قادر ہو جائے تو وہ ابد تک زندہ رہ سکتا ہے ‡ چنانچہ پردیپک کے پچاسویں دوہے میں یہ الفاظ ملتے ہیں : —

" جو کوئی چاند ( چندر یا سوم ) کی شراب کے ان صاف شفاف قطروں کو پیتا ہے جو دماغ سے دل کے اندر سولہ پتیوں والے کنول پر ٹپکتے ہیں اور جن کو پران ( प्राण ) کے ذریعے اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ زبان کو حلق کے کوّے سے لگا دیا جائے اور اس حالت میں اس بڑی طاقت پر مراقبہ کیا جائے وہ ہر مرض سے آزاد ہوجاتا ہے اور اس کا بدن کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک اور ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے ؛ اور ایسا کرنے والا یوگی بہت بڑی عمر پاتا ہے $ " —

اصل یہ ہے کہ ایشیا کی آریہ اقوام کے عقیدے میں کنول کو قدیم الایام سے بذات خود ایک خدا ' یا کم از کم ایک فوق الانسان

---

* ہتھ یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ ( الہ آباد ' ۱۹۱۵ ع ) ' ص ۲۶ —
† ہتھہ یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ ( الہ آباد ۱۹۱۵ ع ) ص ۲۸ -
‡ ایضاً ' ص ۳۴ - $ ایضاً ' ص ۳۶ -

اور پھر فانی ہستی ' تسلیم کیا گیا ہے - اسی پران کا یہ عقیدہ بیان کرتا ہے کہ کنول تخم زمین سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ پانی کی سطح پر سے اُگتا ہے اور ہمیشہ پاک و صاف رہتا ہے ' خواہ جھیل کا پانی کتنا ہی گدلا ہو - اس سے اس کی فوق العادت پیدائش کا اظہار ہوتا ہے ! —

**کنول ادبیات میں**

کنول کو مشرقی ادب و صنعت اور دست کاری میں بھی بہت کچھ دخل ہے - ہندوستان نے جو جو اہمیت اور عزت کنول کو دی ہے شاید ہی کسی دوسرے پھول کو کسی ملک میں حاصل ہو - لیکن دیگر ممالک ' مثلاً مصر اور فارس' نے اس کی اس قدر عزت افزائی نہیں کی - شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ پھول ان ممالک میں بہ نسبت ہندوستان کے کم یاب ہے' مثلاً سرخ کنول مصر میں کہیں نہیں ملتا - البتہ اس کی دیگر دو قسمیں " سفید اور نیلی " کہیں کہیں پیدا ہوتی ہیں - لورے ( Loret ) نے اس پھول کے کئی ایک مصری نام لکھے ہیں - سرخ کنول کا نام نھیب ہے' جس کو دوسرے تلفظ کے ساتھ نخوب اور نشیب بھی کہتے ہیں؛ سفید کا نام ساشنی اور نیلے کا سرپت ( شربت ؟ ) ہے - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرخ نیلوفر ایران یا ہندوستان سے مصر میں پہنچا تھا ' اور اسی سبب سے اس کا کوئی عام نام نہیں ہے' اور نہ اس کا حوالہ مصری ادب میں کہیں ملتا ہے - ایران میں علاوہ ان تشبیہات اور استعارات کے' جو فارسی ادیبوں نے نیلوفر سے اخذ کیے ہیں ' اس کا نام اور کسی سلسلے میں ادب سے منسوب نہیں ہے —

البتہ ہندوستانی ادب میں اس کے حوالے بکثرت ملتے ہیں -

ہندی شاعری میں معشوق کے بدن کو حسن کے لحاظ سے کنول سے تشبیہہ دیتے ہیں ؛ مثلاً : —

کونول * کنول سوگندھ سریرو سمندر لہر سو ھی تن چیرو

بدن کی تشبیہہ کنول سے بلحاظ کیف کے ہے نہ بلحاظ صورت کے چہرے کے حسن کو کنول کے پتے کے حسن سے مشابہ بتاتے ہیں - مثلاً : —

نین چتر دے روپ چتر سے کنول پتر پر مدھ کر پھیرے

معشوق † کے آنکھیں کھولنے کو کنول کے کھلنے سے تعبیر کرتے ہیں - اس کے اعضا کو کنول کا ڈنٹھل ، اور دست نازک ‡ کو کنول بتاتے ہیں - اس کے علاوہ ہندو مذہب کی کتابوں میں جا بجا اس کے تذکرے آئے ہیں - رگ وید $ میں اس کا ذکر ہے اور اس سے بعد سمہتاؤں ( संहिता ) میں بھی اس کا بیان موجود ہے - رگ وید میں سفید کنول کو پنڈریک کے نام سے یاد کیا گیا ہے - اتھرون وید میں انسان کے دل کا کنول سے مقابلہ کیا ہے - پنچ ونس براہمن ( पंचवंश ब्राह्मण ) میں اس کو تارا منڈل کی روشنی سے پیدا شدہ لکھا ہے - یجر وید کے تیتری ( तैत्रीय ) نسخے میں اس قسم کے کنول کے گندھے ہوے ایک مالے کا ذکر ہے جس کا نام پنڈری سرج ( पुण्डरीकस्रज ) ہے - نیلے رنگ کا کنول ، جس کا نام پشکر ہے ، رگ وید اور اس کے بعد کے ویدوں میں کئی جگہ آیا ہے ، اور اول الذکر میں لکھا ہے کہ یہ پھول جھیلوں میں پیدا ہوتا ہے - پرانے زمانے میں لوگ اسے سنگار کے لیے بھی استعمال کرتے تھے - صبح کے

---

* جذبات بھاشا از نیاز فتح پوری ( مطبوعہ چے اینڈ سنز الکٹرک پریس دھلی ، ۱۹۱۵ م ) -
† وکرم اروسی ، اردو ترجمہ از محمد عزیز مرزا ( الناظر پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۳ م ) ، ص ۷ -
‡ وکرم اروسی ، ص ۵۱ -

$ Encycl. Relig. Eth. ۱۴۴ - ۱۴۲ ص -

دیوتا اسون کو نیلے کنولوں کا مالا پہنے ہوے دکھایا گیا ہے - اس مالے کا نام پشکر سرج ہے - کنول کی ایک اور قسم کو اتھرون وید میں کمد ( कुमुद ) کہا گیا ہے - وہ یقیناً سفید کنول ہے - براھمنوں میں کنول پہلے پرجاپتی کے ساتھہ ملتا ہے - تیتریا براھمن میں لکھا ہے کہ جب پرجاپتی نے دنیا کو، جو پانی کی طرح مائع تھی، پیدا کرنے کی خواہش کی تو اسے ایک کنول پانی کی سطح پر دکھائی دیا - اس نے یہ خیال کیا کہ یہ ضرور کسی چیز پر ٹکا ہے - یہ سوچ کر اس نے سور کی شکل میں پانی پر غوطہ لگایا - نیچے پہنچ کر اس نے پاؤں تلے زمین پائی - اس نے ایک شاخ توڑی اور اسے لے کر سطح پر آیا، اور پھیلا دیا - پھر تیتریا ارنیک ( आरण्यक ) میں لکھا ہے کہ جب دنیا پانی کی طرح تھی تو صرف پرجاپتی کنول کے پتے پر پیدا ہوا - مہابھارت * میں لکھا ہے کہ خالق کائنات برھما وشنو جی کے مراقبے کے وقت میں اس کنول سے پیدا ہوا تھا جو وشنوجی کی ناف میں سے اگتا تھا - اسی وجہ سے برھما کا ایک لقب ابجج یا ابججن، یعنی کنول سے پیدا شدہ، ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنول کا تعلق اصل میں وشنو دیوتا سے ہے، اسی وجہ سے اس کا ایک نام پدم نابھہ، یعنی کنول کی ناف والا، بھی ہے - اس کے علاوہ کنول کو وشنو کی بیوی لکشمی سے بھی نسبت ہے جو قسمت اور حسن کی دیوی ہے - مہا بھارت میں لکھا ہے کہ وشنو کی پیشانی سے ایک کنول پیدا ہوا جس سے شری ( لکشمی کا دوسرا نام ) پیدا ہوئی، اسی لیے لکشمی کا ایک لقب پدم بھی ہے - مہابھارت میں جہاں دولت کے دیوتا کبیر ( कुबेर ) کی جاے قیام کوہ کیلاش کا ذکر

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion از جے' ڈاسن، ص ۵۸ -

ہے ، وہاں اس کی جھیل نللنی ( नलिनी ) اور اس کے دریا مُندکنی کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ سنہرے کنولوں سے ڈھکے ہوئے ہیں —

کنول کے پتوں پر پانی اور شبنم کے قطرے دھوپ کی روشنی میں چمکتے ہوئے بڑے بڑے آبدار موتیوں کی آب کو شرماتے ہیں - کیا عجب ہے کہ چین اور تبت کے مہاتماؤں نے ان ہی قطروں سے متاثر ہوکر 'اوم منی پدم ہوم' (یعنی' خدا کنول پھول میں ایک گوہر ہے ) کا عقیدہ قائم کیا ہو - اس کے علاوہ بودھ مذہب والوں کے اعداد و شمار پدم اور پنڈریک' جو کنول کے نام ہیں ؛ سب سے بڑے اعداد ہیں - مہایانا بودھ مذہب والوں کی ایک شرعی کتاب کا نام بھی کنول پر ہے جس کو سد دھرم پنڈریک ( सद्धर्म पुण्डरीक ) کہتے ہیں -

ایران کی سر زمین میں کم یاب ہونے کے باوجود نیلوفر نے فارسی ادب پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا - ایرانی شعرا نے بھی نیلوفر کی تشبیہات سے کام لیا ہے - سحاب اصفہانی کا شعر ہے :—

• بچشم قطرہ بارم مردم چشم چو در دریا یکے نیلو فرستی

خواجو کرمانی نے لکھا ہے :—

† اے خط سبز تو ہمچوں برگ نیلوفر در آب
قند مصر از شور یاقوت توچوں شکّر در آب
برگ گل خود روی رویت کآب روے حسن از وست
سبزۂ سیراب را بنگر چو نیلوفر در آب

---

• منقول از Wit, Humour and Fancy of Persia از مہر جی بھائی کوکا ' بمبئی سنہ ۱۹۲۳ ع ' ص ۵۴ —

† خواجوی کرمانی ' باہتمام ح ' کوہی کرمانی ' طہران چاپخانۂ ' خاور ' تیر ماہ ۱۳۰۷ ' ص ۱۰ - ۱۱

**کنول صنعت اور دست کاری میں**

صنعت اور دست کاری میں بھی کنول نے خاص اہمیت حاصل کی ہے - سفید کنول کے مالے آمس، امن ھتپ اول اور رامیزز ثانی کی مومیائیوں پر رکھے ہوے تھے، اور، جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے، یہی پھول ہے جس پر ہورس بیٹھا ہوا نظر آتا ہے - یہ مورت آٹھویں صدی قبل مسیح کی بنی ہوئی ہے - مصر میں بہ نسبت سفید کے نیلے کنول زیادہ ملتے ہیں - عام طور پر وہاں کے پرانے مقبروں میں ان کی تصویریں نظر آتی ہیں - ستونوں کے اوپر کے حصے کو کنول کی شکل کا بنانے کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوتی ہے - م، ا، اسٹائن ( M. A. Stein ) کا بیان ہے کہ اس نے ایران میں ایک ایرانی بودھی ستو کی مورت دیکھی ہے، جس میں بدھ کو ایک کنول سے سجی ہوئی نشست پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے - یہ تصویر ایک چوبی دروازے پر بنی ہوئی ہے * ایرانی دست کاری میں کنول کے استعمال کی ایسی اور کوئی قابل ذکر مثال نہیں ملتی —

ہندوستانی صنعت میں ہم کنول کو سنہ ۲۰۰ ق م کے بعد کی بنی ہوئی عمارتوں میں پاتے ہیں - سانچی، برہت، امراوتی، اجنتا اور بودھ گیا کی عمارتوں میں کھلے ہوئے کنول جا بجا کندہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں - مغربی ہندوستان میں چٹانوں پر بنے ہوئے بودھ مندروں کے ستونوں، دروازوں اور چھتوں میں بھی کنول زینت و زیبائش کے لیے تراشے گئے ہیں - لنکا میں زینوں پر آدھے کنول بہت ہی صفائی سے بنے ہوئے ہیں - تھمبوں پر کھلے ہوئے کنول گندھار اور متھرا کی عمارتوں میں جا بجا بنے ہوئے ہیں، اور سانچی کے ستونوں اور امراوتی کے دروازوں پر نہایت خوبصورت

Encycl. Relig. Eth. *

کنول کندہ کیے ہوئے بکثرت ملتے ہیں —

اس کے علاوہ قدیم زمانے کی مورتوں اور مجسموں میں ہندی دیوی دیوتا اکثر کنول کے اوپر بیٹھے یا کھڑے دکھائی دیتے ہیں - اس کی سب سے پرانی اور عمدہ مثالیں اودے گری ' برہت ' اور خاص کر سانچی میں ' جہاں بڑے اسٹوپ کے دروازوں پر ہندو دیوی لکشمی کی مورت کندہ ہے ' ملتی ہے - ان مقامات کی نقاشیوں میں لکشمی کنول پر یا تو کھڑی یا بیٹھی ہوئی بنی ہے اور اس کے ہر ہاتھ میں کنول کا ایک پھول ہے ' جس پر دو ہاتھی اپنی سونڈیں اٹھائے ایک برتن سے پانی برسا رہے ہیں - اس قسم کی مورتیں ہندوستان میں ہر جگہ ملتی ہیں ' اور لنکا میں پولن روا کی پرانی عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہیں - جب سے مہاتما بدھ کی مورتیں عمارتوں میں بنائی جانے لگی ہیں ' اکثر کنول پر بیٹھے یا کھڑے نظر آتے ہیں - اس قسم کی مورتیاں ہمیں راجگیر ( بہار ) ' کنھیری غار ( بمبئی کے قریب ) ' اور گندھار ( شمال مغرب میں ) ملتی ہیں - آہستہ آہستہ یہ رواج غیر ممالک میں بھی پھیل گیا اور اس قسم کی مورتیں نیپال ' برما ' چین اور جاپان میں بھی تراشی جانے لگیں - اگر کسی تصویر میں مہاتما بدھ کنول پر بیٹھے یا کھڑے نہیں ہیں تو اس حالت میں دو یا تین اور کبھی کبھی چار کنول ان کے سامنے پڑے ہوئے ہیں جیسے گندھار میں - مہاتما بدھ کے علاوہ دیگر بودھی ستو بھی کنول پر بیٹھے یا کھڑے ' نہ محض ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی ' ملتے ہیں - مثلاً منجسری کو کنول پر بیٹھے ہوئے ہم علاوہ سارناتھ ( بنارس کے قریب ) کے جاوا اور تبت میں پاتے ہیں - تبت کی ایک نئی تصویر میں ہم میترے کو کنول پر بیٹھے ہوئے پاتے ہیں - چین میں بودھی ستو اولوکتیشور

( बोधसत्व अवलोकितेश्वर ) بھی کنول ہی پر براجمان دکھائی دیتے ہیں۔ اس بودھی ستو کو کنول سے ایک خاص تعلق ہے' کیونکہ بودھ مذہب کے عقیدے کے مطابق وہ کنول سے پیدا ہوا تھا اسی وجہ سے اس کا لقب پدم پنی ہے - مزید برآں بودھ مذہب والوں کی دعا 'اوم منی پدم ہوم' اسی سے متعلق ہے - کنول کا ہردلعزیز ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم پیتل کی مورتوں میں نہ محض ہندو دیوی دیوتا بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے بڑے بڑے مہاراجاؤں کو بھی کنول پر بیٹھے ہوے پاتے ہیں —

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حالانکہ مسلمانوں نے نیلوفر کو اپنی عمارتوں میں جگہ نہیں دی' تاہم گور میں ایک مسجد ہے جس کو سنہری مسجد یا خواجہ سراؤں کی مسجد کہتے ہیں اور اس کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں خوبصورتی سے تراشے ہوے ہندوستانی * کنول بنے ہوے ہیں - شاید یہ ہندوستانی صنعت کے اثر کا نتیجہ ہے —

مختصر یہ کہ کنول پھول ایک نہیں کئی وجوہ سے نہایت اہم پھول ہے' اور یہ کہنا تو کسی طرح غلط نہیں ہے کہ وہ مقدس ہے !

---

* Medieval India از ایشوری پرشاد ( انڈین پریس الہ آباد ) ' ص ۶۱۱ -

# اردو زبان کے قدیم کتبے

(۱)

(از - اڈیٹر)

اسلامی عہد کی قدیم عمارتوں پر اکثر کتبے فارسی زبان میں ہیں اور قدیم عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے، بہت سی حال کی عمارتوں پر بھی فارسی کتبے نظر آتے ہیں - عموماً کتبے اس وقت تک کسی زبان میں نہیں لکھے جاتے جب تک اس کا رواج عام نہ ہو- فارسی کا رواج اس ملک میں جیسا کچھہ تھا اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں- ہمارے ہاں کے طبیب اب تک اپنے نسخے فارسی میں لکھتے ہیں - رواج بہت سخت جان ہوتا ہے، یہ مٹتے ہی مٹتے مٹتا ہے - میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے بعض قدیم عمارتوں پر قدیم اردو یا ہندستانی زبان کے کتبے نظر آئے - اس زبان کا سب سے قدیم کتبہ مجھے احمدآباد کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ملا ـــ

سب سے پہلے شمالی ہند سے ہندستانی زبان گجرات اور دکن میں پہنچی اور وہیں اسے ادبی حیثیت حاصل ہوئی - علاءالدین خلجی نے سنہ ۶۹۶ ھ میں گجرات پر تسلط کرلیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کردیا - صوبیداری کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا، یہاں تک کہ جب دھلی

پر تیمور کا لشکر پہنچا اور وہاں کی حکومت میں ضعف آگیا تو صوبیدار ظفر خاں کے تاتار خاں نے خود اپنی حکومت قائم کرلی اور محمد شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھ گیا (سنہ ۸۰۹ ھ) - خلجیوں کے تسلط اور تغلقوں کے زمانۂ حکومت میں علاوہ لشکر کے ہر پیشے اور ہر مشرب کے لوگ دلی سے گجرات پہنچے اور ان کی زبان دکن کی طرح گجرات میں بھی رائج ہوگئی - شاہان گجرات کی حکومت اکبر کے عہد تک رہی، اس کے بعد گجرات کا صوبہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہوگیا - غرض دھلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے زمانے سے لے کر آخر تک رہا —

لیکن حکومتوں اور بادشاہوں سے بڑھ کر فقرا اور صوفیا نے کام کیا جو اس زمانے میں، بلکہ اس سے قبل، وہاں پہنچ گئے تھے - صوفیا کا کا مسلک صلح کل ہوتا ہے اور وہ اپنے پیغام کی تلقین اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی طرف ایک کشش سی ہوتی ہے - منجملہ اور طریقوں کے جو وہ اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے ایک یہ بھی تھا کہ باوجود صاحب علم و فضل ہونے کے وہ تلقین و تعلیم عام لوگوں کی زبان میں کرتے تھے - اگرچہ زبان و ادب کی اشاعت سے براہ راست انہیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن چونکہ ان کی تعلیم کسی خاص فرقے یا طبقے سے مخصوص نہیں ہوتی اور ان کا فیض عام ہوتا ہے بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور طالب فیض ہوتے ہیں، اس لیے ان کے سمجھانے کے لیے انہیں کی زبان میں ان سے باتیں کرتے اور انہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے - گجرات و دکن میں ان کی بدولت اس زبان کو، جسے ہم آج کل اردو یا ہندستانی کہتے ہیں، بہت کچھ فروغ ہوا —

گجرات کے ان بزرگوں میں سے بعض کا کلام اور حالات ہم تک پہنچے ہیں - مثلاً حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ ھ' وفات سنہ ۸۵۰ ھ) اور اُن کے فرزند حضرت شاہ عالم (ولادت سنہ ۸۱۷ ھ' وفات سنہ ۸۸۰ ھ) اپنے زمانے کے اولیاءاللہ میں سے تھے - ان کے متعدد ہندی اقوال اب تک محفوظ ہیں —

شیخ وجیہ الدین احمد علوی احمد آباد کے بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے (سنہ ۹۱۰ ھ - سنہ ۹۹۸ ھ)۔ ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں جس کا نام بحرالحقائق ہے - اس میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں —

سید شاہ ہاشم (متوفی ۱۰۵۹) گجرات کے مشہور اولیا میں سے ہیں - آپ کے ایک خاص مرید نے آپ کے اقوال وغیرہ ایک کتاب میں جس کا نام مقصودالمراد ہے' جمع کیے ہیں - اس میں جا بجا کثرت سے شاہ صاحب کے ہندی اقوال و ابیات و نظمیں درج ہیں —

ایسے اور بہت سے بزرگ ہیں جن کے ہندی اقوال وغیرہ ہم تک پہنچے ہیں - لیکن ان بزرگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا مستقل مرتب کلام بھی موجود ہے - مثلاً قاضی محمود دریائی کا مکمل دیوان محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی ابتدائی صورت کیا تھی - قاضی صاحب کا سنہ وفات ۹۴۱ ہجری ہے - دوسرے بزرگ شاہ علی محمد جیو گام دھنی ہیں جن کے دیوان کا نام جواہر اسرار اللہ ہے - دیوان کے مرتب شاہ صاحب کے ایک معتقد ہیں جو اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "بطریق نظم بالفاظ گوجری بزبان مبارک خود فرمودہ" - گوجری سے یہاں وہی زبان مراد ہے جو دلی



سے آکر گجرات میں رائج ہوئی اور اس میں گجراتی کی آمیزش ہوئی- قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو کے کلام میں خاص گجراتی زبان کے الفاظ اکثر جگہ آتے ہیں- ان دونوں بزرگوں کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں وہ ہندی اور گجرات کی آمیزش ہے جس میں کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ بھی آجاتے ہیں - شاہ صاحب کا سنہ وفات ۹۷۳ ہجری ہے -

ایک تیسرے صاحب تصانیف بزرگ میاں شیخ خوب محمد چشتی ہیں - وہ اپنی زبان کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ " من بزبان گجرات کہ بہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است' گفتہ ام " ان کی زبان قدیم گجراتی اردو کا اچھا نمونہ ہے - قطع نظر اس کے کہ کہیں کہیں کوئی خاص گجراتی لفظ آجاتا ہے وہ اچھی خاصی پرانی اردو ہے جس میں ہندی کے ساتھ فارسی عربی کے لفظ بلا تکلف استعمال کیے گئے ہیں - نسبتہً ان کا کلام بہت صاف اور سلیس ہے ان کا سنہ وفات ۱۰۲۳ ہجری ہے -

یہ مختصر سی تمہید میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ زبان کی ابتدائی صورت ذہن میں رہے - دوسرے جو کتبہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق بھی ایک گونہ انہیں بزرگوں میں سے ایک سے ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے - یہ کتبہ جس کا چربہ آپ کے سامنے ہے احمد آباد کی مسجد رائے کھڈ میں ہے - یہ مسجد شاہ علی محمد جیوگام دھنی کے مزار کے مغرب جانب کم و بیش پچاس قدم کے فاصلے پر اسی احاطے میں ہے- اس مسجد کی تعمیر بالکل مختصر سی ہے - مینار اچھے طرز کے اچھے ہیں - مسجد میں چھوٹا سا صحن ہے اور اس کی قبلہ رو دیوار میں تین محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک

ایک کتبہ ہے جن کی تفصیل یہ ہے —

۱ - درمیانی کتبے پر یہ آیت ہے : -

"وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً" -

۲ - داھنی جانب کا کتبہ :-

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

یہ شجرۂ طیبہ معلوم ھوتا ہے - اس کے آخر میں سنہ احدی و ستین و تسعمأتہ یعنی ۹۶۱ ھجری ثبت ہے -

۳ - تیسرا کتبہ جو بائیں طرف ہے وہ اصل مقصود ہے - اس کے اوپر کے حصے میں احمد شاہ بادشاہ گجرات کا شجرہ ہے جس کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی ' اور اس کے نیچے دو شعر پرانی اردو یا ھندستانی میں ھیں جن کے آخری مصرع سے تعمیر مسجد کا سنہ تاریخ نکلتا ہے - اوپر کی تین سطروں میں بادشاہ کا شجرہ یہ ہے :-

۱ - المعتصم باللہ الرحمن غیاث الدنیا والدین ابوالمحامد احمد شاہ -

۲ - ابن عم محمود شاہ بن لطیف شاہ اخ بہادر شاہ بن مظفر شاہ بن محمود شاہ -

۳ - ابن محمد شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد ملکہ'

آخری دو سطروں میں یہ دو شعر ھیں -

فنا دنیں سمجھائکر باندھے شاجی پال     بانو مسجد کے تئیں ھیجھیں ملک جلال

تاریخ اس مسجد کی ہوئی سو یوں مشہور     مسجد جامع کے بیچ دتھایا پے نور

آخری مصرع سے سنہ ۹۶۳ ھ نکلتا ہے —

احمد شاہ گجرات کے آخری بادشاہ سلطان بہادر مظفرثالو کا پیشرو تھا - اس کے بعد سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے - یہ دونوں اپنے امرا کے ہاتھ میں مثل کٹھ پتلی کے تھے - احمد شاہ سنه ۹۶۱ ھ میں تخت نشین ہوا اور سنه ۹۶۸ ھ میں قتل کردیا گیا - یہ مسجد اُسی کے زمانے میں تعمیر ہوئی اور اس پر جو کتبہ ہے اُس زمانے کی اردو کا نمونہ ہے - اس لحاظ سے یہ کتبہ بہت قابل قدر ہے اور اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ زبان جسے ہم اردو یا ہندستانی کہتے ہیں ملک کے اطراف و جوانب میں صدیوں پہلے پوری طرح پھیل چکی تھی - یہاں تک کہ اس میں کتبے تک لکھے جاتے تھے -

# بنگالی اور اردو

از

( جناب محمد اجمل خاں صاحب - ایم - اے- ایل ایل- بی - محقق اسلامیات- شانتی نکیتن ( بنگال )

غریب اردو کے سوا ہر زبان کے بولنے والے اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں - اور اس غلط فہمی میں سب مبتلا ہیں کہ اُن کی زبان سے بہتر دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو - دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اپنی زبان سے انسان کو فطرتاً محبت ہوتی ہے - اور فراوانیء محبت یقیناً ' جذبات کی شدت کی وجہ سے' انداز نگاہ پر اثر ڈالتی ہے - حب الشیء یعمی و یصم -

لیکن اردو بولنے والے ' یعنی وہ جن کی مادری زبان اردو ہے ' کیوں اس فطری میلان سے محروم ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات محبت کی لذتوں اور الفت کی کیفیتوں کو کسی نہ کسی ترکیب سے عقل کی ماتحتی میں لایا جاسکتا ہے ' اور محبت کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ بدل دیا جاسکتا ہے - یعنی یہ نہیں کہا جاتا کہ اپنی زبان سے محبت نہ کرو - بلکہ ایسی زبان سے کرو جو " اپنی " تو ہو - سوال ہوتا ہے کہ اردو اپنی نہیں تو کس زبان کو اپنی سمجھیں - جواب ملتا ہے کہ " اپنی " زبان وہ ہے جس میں اپنا مذہب ہے ' اپنا تمدن ہے ' اپنی روایات ہیں - غرضکہ جس میں اپنا سب کچھہ ہے - بہت سے سادہ لوح

اس فریب میں آجاتے ہیں اور اردو کی بجاے مذہب سے محبت کرنے لگتے ہیں یعنی اردو سے بہت دور ہوجاتے ہیں - اسی قسم کی منطق ہوتی ہے جس سے اکثر "والدین" اپنی اولاد کو دوسرے مشاغل کی محبت سے باز رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میاں چند روز کی بات ہے' بی - اے - پاس ہوجاؤ پھر دل کھول کے زندگی کی دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہو لینا" - اور ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ اکبر کا قول اکثر صادق آتا ہے - یعنی :—

امتحان پیش نظر اور عاشقی بالاے طاق

لیکن کہاں وہ مصحف روئے یار' اور کہاں یہ اوراق تیرہ و تار

کہاں وہ زندگی و تابندگی' کہاں یہ مردنی و پژمردگی - وہ بہار کی صورت' یہ خزاں کا نمونہ' وہ جان بخش یہ جان ستان - بیچارہ طالب علم دیکھتا تو کتاب ہی کو ہے مگر حروف کی شکلیں کسی کے چہرے سے بدل جاتی ہیں - اور کانٹ اور ارسطو کی موشگافیوں میں اُسے کسی کے الجھے ہوے گیسو نظر آنے لگتے ہیں - اور آخرکار جب لیلا کی ماں کو مجنوں کے بی - اے پاس کرنے سے ناامیدی ہوتی ہے تو دیکھنے والے بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم نہ کہتے تھے کہ —

کہاں عاشق' کہاں کالج کی بکواس !

ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس !

منشا اس گزارش کا صرف یہ ہے کہ زبان کی محبت ہو یا مذہب کی' اگر اُسے غیر فطری طریقوں سے غلط راستوں پر ڈالا جاے گا تو یقیناً نتیجہ وہی ہوگا جو ہندستانی زبان کو ہندی بنانے اور اُلٹی گنگا بہاکر مذہبی خدمت کرنے کے نام سے آج کل ہورہا ہے - یعنی ترقی معکوس !

کوئی ان نقل محبت کرنے والوں سے پوچھے کہ زبان اساس مذہب و تمدن ہے یا مذہب اساس و بنیاد زبان؟ جاننے والے بتائیں گے کہ زبانوں کے ذریعہ سے مذاہب نے ترقی ہے لیکن کسی مذہب نے آج تک کوئی زبان نہیں بنائی۔ آوستا مردہ ہوگئی لیکن مذہب زرتشت باقی ہے۔ عبرانی کے سمجھنے والے دنیا میں خال خال ہیں لیکن یہودیت کے نام لیوا جرمن اور روسی زبانیں بول رہے ہیں اور احیاے مذہب و تمدن کے پردے میں جامع فاروقی کی اذان کو "دیوار گریہ" کے نقار خانہ کے شور و ہنگامہ میں طوطی کی آواز سے بھی کم وقعت کردینا چاہتے ہیں۔ نصرانیت کا غلبہ جیسا کچھہ ہے ظاہر ہے۔ لیکن آج کون ہے جو دعوے کرسکے کہ میں یسوع مسیح کی زبان سمجھتا ہوں' جب کہ خود ناصرہ میں سیکڑوں سال سے عربی رائج ہے اور آرامی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ بدھ اور ہندو مذہب کے متعلق بعد میں عرض کروں گا۔ اس لیے زرا اسلام کا بھی قصہ سن لیجئے —

لاریب کہ قرآن کی زبان عربی ہے۔ اور ہندستانی مسلمانوں کو دنیا میں سب سے زیادہ اس زبان اور اپنے مذہب سے محبت کا دعوے ہے۔ ایک حد تک ہندوستان میں عربی کی تعلیم بھی رائج ہے۔ حتیٰ کہ بنگال کے اسکولوں میں اردو اور عربی کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ فارسی کا کہیں تذکرہ نہیں۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں عربی کی طرف خاص توجہ تھی۔ لیکن اکثر کتابوں کی تعلیم فارسی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہاں اب آزاد مدارس بہت کم رہ گئے ہیں' اور جو ہیں بھی اُن طرف عامۃ الناس کی توجہ کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جب سے عربی اور فارسی تعلیم کی حمایت سرکار دولت مدار نے شروع کی ہے اور منشی ودبیر

عالم و فاضل کے امتحانات رائج ہوئے ہیں اُس وقت سے تعلیم کا مقصد تعلیم نہیں رہا - بلکہ مقصد ملازمت ہوگیا ہے ' کیفیت کم ' کمیت زیادہ ہوگئی - لیکن وہ طبقہ جو انگریزی مدارس کی طرف رجوع ہوا اور اُس میں سے کسی نے زبان ثانوی کے طور پر عربی لے لی تو گویا اُس نے عالم اسلام پر ایک احسان عظیم کا بوجھ ڈال دیا - اللہ اللہ ! ! مقصد نوکری ' مولوی صاحب کے احسان و مروت سے پاس ہونے کا یقین! اور پھر یہ غرور !

بہرحال ہوا یہ کہ ان ناکارہ مدارس کی پیداوار نے سفتی بلبلے کی سند تو گویا لے لی ' لیکن نہ حقیقت میں اُنہیں صحیح تعلیم ملی نہ وہ ملک و ملت کے مفاد کے لیے عربی زبان کے ذریعہ سے اب تک کچھ کر سکے - کیا تو اتنا کیا کہ خدمت قرآن کی جگہ خدمت کعبہ کے نام سے چند روز ولایت ہو آئے اور پورا ہندوستان خلافت کے مرکز میں بین الاسلامیت کے " خواب " دیکھنے لگا - ترکی نے نہ صرف خلافت کو ختم کر کے عربوں کی صحیح گوشمالی کی بلکہ اس نے عربی قبائل کی غداری کا جواب اس طرح دیا کہ عربی زبان کو بھی اپنی قومی لغت سے خارج کردیا - اب مصطفیٰ کمال کی شخصیت تو وہی ہے جو پہلے تھی ' لیکن ترک اسے اتا ترک کہتے ہیں - قومی عصبیت یہی رنگ ایران میں لائی ہے - اور اگرچہ ان دونوں ممالک کے خمیر میں عربی زبان داخل ہے لیکن پور داؤد اور اسی کے مثل دوسرے لوگوں کی مسلسل کوشش ہے کہ ماضی کو ' حالانکہ زندہ ہے ' درگور کردینا چاہیے ' اور "حال" قال کی کیفیت پیدا کرنا چاہیے - گویا کہ یہ قومیں مستقبل میں زندہ ہیں - ماضی دفن حال غائب اور صرف مستقبل کا خواب موجود - عربی

ممالک کو دیکھیے تو ان کی حالت ہی زار ہے - صرف مصر کچھ زندہ ہے - وہاں کے ازہری علما ' جن کے سرگروہ علامہ رشید رضا مرحوم تھے ' عربی زبان کی محبت میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ قرآن کا غیر زبانوں میں ترجمہ کرنا ہی حرام قرار دیتے ہیں اور باوجودیکہ محمد مارماڈیوک پکھتال مرحوم نے مجلس علمائے مصر کے سامنے یہ کہا کہ میں نے انگریزی میں قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ترجمہ نہیں کیا ( یعنی یہ Rendering ہے Translation نہیں ہے ) لیکن ان کا ترجمہ مصر میں ممنوع قرار پایا ' * حالانکہ نصرانیوں کے ترجمے کھلم کھلا فروخت ہوتے ہیں - اس لیے کہ ان کے فروخت کرنے والے اپنی دلیلوں کو زبان شمشیر سے بیان کر سکتے ہیں —

اب ہندستانی مسلمانوں کو صرف مغرب کی طرف دیکھنا باقی ہے ' اس لیے نہیں کہ ادھر کعبہ ہے یا مسلمان مغرب کو آسانی سے پہنچا سکتا ہے - نہ اس لیے کہ مغرب زدہ انگریزی داں طبقہ اُدھر اپنا کعبہ نہیں پاتا - بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مسلمان ادھر بستے ہیں - اگر قبلۂ اولیٰ کے باشندوں کے لیے فلسطین کانفرنس وجود میں آئی ہے تو قبلۂ ثانی کے ماننے والے بھی تو کسی تحریک "شرق الہند" کے محتاج ہیں - چین کا ایک پورا صوبہ مسلمان ہے - کروروں مسلمان ملایا اور جزائر شرق الہند میں آباد ہیں - نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۵ ع سے انہوں نے ملائی وجاوی زبان کو عربی رسم خط میں لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور لیٹن حروف اختیار کر لیے ہیں - پردے کا نام نہیں - اسلام بہرحال وہاں ہے - اور اس کا اثر بھی ہے - لاکھوں حاجی بھی ہیں - لیکن باوجود

* رسالہ رشید رضا پکھتال مرحوم

ہندوستان کے اجارہ داران اسلام کی عدم توجہی اور ڈچ حکومت کی "عنایات" کے اُنھوں نے اپنی قومی تعلیم کا ایک زبردست جال ملک بھر میں پھیلا دیا ہے - اور تعلیم کا ذریعہ ہے ان کی اپنی زبان اور لاطینی ( Latin ) رسم خط —

شاید آپ کو حیرت ہوکہ پورے ہندستان کے مسلمانوں کی نصف آبادی مشرقی بنگال میں ہے - اور باوجودیکہ سرکار کمپنی بہادر سے حقوق دیوانی کی تفویض کے سلسلے میں دربار دہلی سے یہ شرط قرار پائی تھی کہ زبان عدالت فارسی اور رسم خط بھی فارسی ہی رہے گا، لیکن خود بنگال میں نواب سلیم اللہ خاں مرحوم اور ان کے رفقاء کار پر وہ لے دے ہوئی کہ فارسی تو درکنار یہاں کے مسلمان اردو سے بھی نا آشنا ہوگئے - اور کثیر تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو بجا طور پر بنگالی کے مداح ہیں اور اسی زبان اور اسی رسم خط کو اپنا سمجھ کو استعمال کرتے ہیں - حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کا کرم ہے کہ بنگالی زبان اس درجے پر پہنچی' ورنہ یہاں کے برہمن تو اس کا گلا کب کا گھونٹ چکے ہوتے - بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ترقی اردو کے لیے بنگال سے جزائر شرق الہند تک ایک ایسی تحریک شروع کی جاے جو مستقل اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو —

بنگال میں اور اسی کے ساتھہ ساتھہ مشرق ادنی میں اردو کی ترقی کے عظیم الشان امکانات پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہاں کی ادبی و سیاسی تاریخ کے اوراق کو گردش میں لانا چاہیے - بدھ مذہب کا حال تو ظاہر ہی ہے' یہ ہندوؤں کی فرقہ پروری اور تنگ نظری کے خلاف ایک جہاد بھی تھا اور بغاوت بھی - شاید جہاد کا مفہوم بغاوت ہی

کے لفظ سے زیادہ ادا ہوسکتا ہے - مسلمان فقیہہ اعلاء کلمة اللہ کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں لیکن گوتم بدھ نے سماج کی چھوت چھات' جاتی کے بندھنوں' اور داسیوں کی زندگی کا رخ بدلنے کا نام جہاد رکھا تھا - اور بنگال میں اس کا خاصا اثر بھی ہوگیا تھا - ہندوؤں کا سب سے پہلا قانون ساز منو تھا' جو زمانہ قبل تاریخ میں پیدا ہوا تھا - اُس کے قوانین کا مجموعہ منو کا دھرم شاستر کہلاتا ہے - لیکن وہ اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں - سنی سنائی باتیں اور رسم و رواج کے مجموعہ کو بھرگوسنگھتا میں جمع کر دیا گیا ہے - یہی منو کے نام پر رائج ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ جو بہت بعد میں پیدا ہوے اور اُن کے ماننے والے کافی تعداد میں بنگال میں تھے ' اس قانون کے مطابق اچھوت قرار پائے - یہ بھی ممکن ہے کہ آریوں نے بدھ سے پہلے ہی اس ملک کے جنگلات اور جنگلی اقوام کا لحاظ رکھتے ہوے اسے مردود قرار دے دیا ہو - ڈی - سی - سین نے "تاریخ ادبیات بنگال" کے صفحہ ۴ پر لکھا ہے "قوانین منو کے مطابق ہر ایک ہندو پر واجب ہے کہ وہ اس ملک (بنگال) سے کوئی تعلق نہ رکھے - اس میں نجس و ناپاک (بدھ دھرم) ہوجانے کا خطرہ ہے - آنند تیرتھہ کے سے مشہور شارح کا قول ہے کہ بنگال راکھشسوں اور پیشاچوں کا مسکن ہے" اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک شمال مغربی ہندستان کے ہندوؤں کے نزدیک بنگالی قوم کا درجہ ہندو سماج میں بہت ہی ادنی ہے —

سب سے پہلے بدھ مذہب والوں نے سنسکرت کو چھوڑا' اور ملکی زبانوں میں مذہبی لٹریچر کو رائج کیا - بنگالی زبان کے پہلے محسن وہی ہیں - یہ دسویں صدی مسیحی کی بات ہے - لیکن جب برہمنوں نے

قتل عام اور جلا وطنی کے ذریعہ سے بودھوں کو برما اور چین کی طرف بھگا کر ملک کو صاف کردیا، تو کرشنا پنڈت نے بارھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان کا نام پیشاچی پراکرت (بھوتوں کی زبان) قرار دے کر ایک گرامر (قواعد زبان) لکھی، سنسکرت کے حامیوں نے اسے قبول نہیں کیا، اور بنگالی بولی تحریری زبان ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مذہب، عبادت و قربانی کے اجارہ داروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بودھوں کی زبان، مذہب اور رسوم کو مٹاتے بلکہ کمال یہ کیا کہ خود اپنے لٹریچر کے کسی حصے میں اس واقعہ کا تذکرہ بھی نہیں آنے دیا۔ لیکن بودھ گیا کا وہ عظیم الشان بدھ مندر زبان حال سے اس کی شہادت دے رہا ہے کہ مذہب کے نام پر اہنسا کے ماننے والے جب ہنسا پر اُتر آتے ہیں تو سیکڑوں بتوں کے نہ صرف ناک کان کاٹ لیتے ہیں، بلکہ زندہ آدمیوں کے ساتھ ایسے مندروں کو بھی دفن کردیتے ہیں جن کی شکست و ریخت اُن کی اُستواری کی وجہ سے ناممکن ہوتی ہے۔ سیکڑوں سال کے بعد آج گیا کا مندر، جو چار مینار سے دونا بلند ہے، زمین کی گہرائیوں سے اس طرح برآمد ہوا ہے کہ گویا ہندوستان کے فرنگی حکمران حضرت مسیح کے سچے جانشین ہیں کہ مردوں میں جان ڈال رہے ہیں۔ بہر حال ہندوؤں نے اس غم و غصہ کا بنگال میں جس طرح اظہار کیا وہ بزدلانہ انتقام کی مکروہ تصویر ہے۔ ایک نمونہ راجہ سودھنوا اس طرح پیش کرتا ہے کہ جب وہ بودھوں اور جینوں کے ہم خیال راجاؤں کو گرفتار کرتا تھا تو حکم دیتا تھا کہ "اُن کے سر کلہاڑیوں سے کاٹے جائیں اور اوکھلیوں میں ڈال کر موسلوں کی مار سے ان کا بھرتا بنایا جائے"۔ (تاریخ ادبیات بنگال صفحہ ٦) —

عام حالات بنگال

عام حالات سے میرا منشا بنگال کا مختصر جغرافیہ اور تاریخ بیان کرنا ہے - جغرافیہ اس لیے، کہ طبعی اور جغرافی کیفیتوں کا ہر ایک زبان پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے، اس کے بغیر زبان کا صحیح ارتقا سمجھنا نا ممکن ہے - حقیقت یہ ہے زبان نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک پوری تاریخ پوشیدہ رکھتا ہے جو اس کے طبعی ماحول، تمدن اور فلسفہ کا آئینہ ہوتا ہے - تاریخ اس لیے، کہ سیاسی حالات کا انسان کے تمدن و معاشرت سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر اس کا علم نہ ہو تو کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ شمالی افریقہ کی زبان عربی کیوں ہے، امریکہ میں انگریزی کیوں رائج ہے - حالانکہ نہ سندھ میں عربی بولتے ہیں نہ افغانستان میں فارسی - ایک طرف قدیم تمدن و زبان مٹ گئی، دوسری طرف ملکی بولیوں کو زبان بننے کا فخر حاصل ہوا -

جغرافیہ

موجودہ بنگال کا رقبہ چوراسی ہزار مربع میل سے کچھ زیادہ یعنی برطانیہ سے کسی قدر کم ہے - لیکن اس کی آبادی پورے جزائر برطانیہ و آئرستان سے زیادہ ہے - یہاں ہمیشہ ہرے بھرے سدا بہار درخت دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ زمین زر خیز ہے اور پانی کی کثرت ہے - اتنی کثرت کہ سیلابوں کی وجہ لاکھوں آدمی خانماں برباد ہوجاتے ہیں، مویشی مرجاتے ہیں اور بونے کا غلہ اور آلات کشاورزی تک تباہ ہوجاتے ہیں - نتیجہ قحط ہوتا ہے - لیکن بسا اوقات یہی سیلاب مفید بھی ثابت ہوتے ہیں جن سے ہر سال نئی قسم کی کھاد کی ایک تہ زمین پر چڑھ جاتی ہے جس میں دھان، کیلا اور اسی قسم کی چیزیں اچھی پیدا ہوتی ہیں - سیلابوں کی وجہ علاوہ بارش کے یہ بھی ہے کہ

اس ملک میں پورے شمال مغربی ہندوستان کا کیچڑ اور مٹی دریاؤں کے ذریعہ جمع ہوتا رہتا ہے اور دریا اکثر اپنا رخ بدل دیتے ہیں یا مختلف ندیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں - یہ حالت پٹنہ سے شروع ہوجاتی ہے - قدیم شہر پٹالی پتر دریائے گنگا کے کیچڑ میں بیس فٹ نیچے دفن ہے - اب نیا شہر اُسی پر آباد ہے - لیکن جہاں جہاں دریاؤں نے اپنا راستہ بدل دیا ہے اُس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ وہ بستیاں جو اُن کے کنارے آباد تھیں، تباہ ہوگئیں - یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم تمدن ہند دریاؤں کا مرہون منت ہے - اور اب بھی دریاؤں سے سیکڑوں صنعتوں اور حرفتوں کو نہ صرف مدد ملتی ہے بلکہ ان کے ذریعہ سے بہت کم خرچ میں زیادہ مال ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتا ہے —

پانی کی کثرت کا لازمی نتیجہ تالابوں کی کثرت ہے - کنویں بھی ہیں لیکن اُن کی ضرورت ہی نہیں - اس لیے کہ یہاں کوئی ایسی چیز مثل گیہوں یا جو کے کاشت نہیں کی جاتی کہ اُس کے لیے آب پاشی کی ضرورت ہے - عموماً سب کاشتکاری بارانی ہے چاہی کا وجود نہیں - آبادی کا تین چوتھائی حصہ زراعت پر گزران کرتا ہے - مشرقی بنگال میں صرف چاول اور جوٹ کی کاشت کی جاتی ہے - اور مؤخرالذکر دنیا میں سوائے بنگال کے کہیں پیدا نہیں ہوتا - تلہن، نیشکر اور تمباکو کی بھی کاشت کی جاتی ہے، اور کہیں کہیں روئی بھی پیدا ہوتی ہے - اور زیادہ تر چاول، مچھلی، تیل پر پوری آبادی کی زندگی کا انحصار ہے —

فرنگیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ دیہی مصنوعات کی مانگ گھٹ گئی ہے اور کارخانوں کا تیار کیا ہوا مال، خصوصاً کپڑا، فروخت ہونے لگا

ہے۔ چاء، کان کنی، جوٹ مل، لوہے کی صنعت اور ریلوے کے کارخانوں میں ہندوستانیوں کو مزدوری مل رہی ہے، جن کے سرمایہ دار اور ناظم زیادہ تر یوروپین ہیں۔ بعض چھوٹی صنعتوں میں ہندوستانی کمپنیاں بھی کام کر رہی ہیں۔ مثلاً صابون، دیا سلائی، چھتری، ٹین کے صندوق، پنسل اور سگرٹ سازی کا کام شروع ہوگیا ہے۔ مرشدآباد میں خالص ریشم اور مالدہ میں تسر (روئی اور ریشم کو ملاکر) کپڑا تیار کرتے ہیں۔ چونکہ بنگالی تمدن کا انحصار یہاں کی معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بہت سادہ ہے یعنی صرف ایک دھوتی اور ایک چادر کے سوا مرد وزن کو کسی لباس کی ضرورت نہیں ہوتی' اور کثرت باران کی وجہ سے ننگے پاؤں رہنے کا عام دستور ہے۔ کپڑوں کا سینا اور دیگر لوازم تمدن کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ترقی پذیر ہوئی۔ اس لیے جتنی عمدہ صنعتیں یہاں ترقی کرسکیں وہ سب مسلمان امرا کے درباروں کی فن نوازی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ریشمی کپڑوں کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ تمدن اسلامی کا اثر کس طرح مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا تھا۔ یہاں چندری کا نام " بلبل چشم " ہے۔ جس کپڑے میں چاند تارا بناتے ہیں اُسے " چاند تارا " کہتے ہیں۔ " آب رواں " باریک کپڑا ہوتا ہے۔ مرشدآباد میں ہاتھی کا دانت کا بے مثل کام ہوتا ہے۔ کٹک، ڈھاکہ اور مرشدآباد میں سونار اور سادہ کار اس کثرت سے پائے کے ہیں کہ بہت کم ممالک ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ڈھاکہ کی کشیدہ کاری اور سوزن کاری کا مال اب تک ترکی جاتا ہے۔ اور جامدانی اور چکن دور دور مشہور ہے۔ پورنیہ اور مرشدآباد میں تھوڑا سا بدری کام بھی ہوتا ہے —

ضروری التماس

اس سلسلے میں ضروری عرض یہ ہے کہ ماہرین علم الالسنہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان اپنے فطری ماحول سے اثر پذیر ہوکر الفاظ بناتا ہے - جو نیا لفظ بنتا ہے وہ یا تو مقامی احوال کا مظہر ہوتا ہے یا کسی دوسری قوم کے تمدن کے اثر سے مستعار لیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ مقامی زبان کا جز بن جاتا ہے - اس قسم کی ہزاروں مثالیں اُن اقوام میں پائی جاتی ہیں جن کا دوسری قوموں سے سیاسی ' تجارتی یا مذہبی تعلق ہوتا ہے - جن قوموں کا تمدن پست ہوتا ہے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ خصوصیت سے اسما (Names) اور صفات (Adjectives) کی کمی کو دوسری زبانوں سے لے کر پورا کریں - اس نظریہ کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے حتی کہ رشتے ناتے اور موسم و وقت کے متعلق بھی سیکڑوں الفاظ اردو زبان کے بنگال میں رائج ہیں - اس طرح اردو نے ہندوستان کی مختلف قوموں میں جو اتحاد و اتفاق پھیلانے کی مضبوط بنیاد ڈالی وہ نہ تو کسی مذہب سے ہوسکی اور نہ کسی حکومت کے دباؤ سے - اس بنیادی اتحاد میں رخنہ ڈالنا یقیناً ہندوستان کی متحدہ قومیت کو تباہ کرنا ہے —

تاریخ

بنگال کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں کے اصلی باشندے دراوڑ تھے جو اب تک چھوٹا ناگپور ' اوڑیسہ اور سنتھال پرگنوں میں پائے جاتے ہیں - ان کا تعلق زبان اور شکل و صورت کے اعتبار سے ملکا ' پیگو ' انڈو چائنا اور جزائر شرق الہند سے لے کر آسٹریلیا کے باشندوں تک قائم کیا جاسکتا ہے - کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا عظیم الشان تمدن تھا - آریوں نے مٹادیا - اور اب نہ ان کے پاس زمینیں ہیں

نہ مستقل جاے قیام - زیادہ تر مزدوری پر بسر اوقات ہوتی ہے - سنتھالوں کی ایک خصوصیت یہ باقی ہے کہ ان میں چوری، بھیک اور بدکاری کا قطعی وجود نہیں - یہ لوگ عام بنگالیوں سے بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں اور سنتھالی بولی بولتے ہیں جس کی ڈکشنری بھی مشنریوں کی بدولت بن گئی ہے اور باوجودیکہ ان میں سے اکثر عیسائی بنالیے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے قدیم تمدن و طرز زندگی کو نہیں چھوڑتے- آسام کی طرف 'کھاسی' بولی رائج ہے - یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے مغربی چین سے آسام، اور وہاں سے بنگال آئے ہوں گے —

آریوں نے گنگا کی وادی میں فتوحات شروع کیں - اور جنوبی بہار تک چلے آئے - مسیح سے چھہ سو سال پہلے مگدھ (جنوبی بہار) کا راج قائم ہوگیا تھا - یہ ملک موریہ سلطنت کا مرکز تھا - اس کا مرکز پٹنہ کے قریب شہر راجگیر میں تھا - اسی کے قریب سیسنگا راجاؤں کا راج تھا، جس کا دارالسلطنت 'ویسالی' تھا - یہ مقام ضلع مظفر پور (بہار) کا موجودہ گاؤں بسار ہے - اسی راج کے زمانے میں جین مذہب کے بانی مہابیر پیدا ہوے تھے، جنھوں نے پٹنہ کے قریب وفات پائی - یہ ویسالی کے راجاؤں کے خاندان سے تھے - گوتم بدھ، بھی اگرچہ مگدھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن بہار ہی میں بودھ گیا کے ایک پیپل کے درخت کے نیچے اُنہیں فراغت کاملہ (نروان) کا روشن خواب دکھائی دیا تھا - اشوک (۲۷۲ سے ۲۳۱ قبل مسیح) کے زمانے میں بدھ مذہب کافی عروج پر تھا - اس لیے سلطنت مذہب کے ساتھہ تھی اور خود اشوک نے ڈیڑھ لاکھہ باشندگان کالنگا و اوڑیسہ کو غلام بنانے اور ایک لاکھہ سے زیادہ کو قتل

کرنے کے بعد خون ریزی سے توبہ کرلی تھی اور بدھ مذہب کا پیرو بن گیا تھا۔ اب باورچی خانے کے صرف کے لیے ہزاروں جانوروں اور چڑیوں کے بجائے صرف چند جانور کاٹے جاتے تھے —

ٹھیک اُس وقت جب کہ عرب سے آفتاب حریت و مساوات طلوع ہو رہا تھا، بنگال بہار اور اوڑیسہ میں بنگال کے شاشنک راجاؤں نے مذہب کے نام پر قتل عام جاری کر رکھا تھا۔ پتالی پتر (پٹنہ) نذر آتش ہوچکا تھا۔ مقدس پیپل برباد، اور بدھ مندر (وہار) زیر زمین کیے جا رہے تھے۔ لیکن راجہ ہرش نے ان مظالم کو روک دیا اور بہت جلد خانقاہ 'نالندہ' (متصل پٹنہ) میں دس ہزار سے زیادہ بھکو اور طالبان علم جمع ہوگئے۔ یہ ہندوستان کی عظیم الشان یونیورسٹی صرف بدھ مذہب والوں کی مرہون منت ہے۔ 'ہرش' کے بعد طوائف الملوکی رہی۔ نویں صدی مسیحی میں شمالی بنگال اور بہار پر 'پال' خاندان کے راجاؤں نے راج شروع کیا۔ بارھویں صدی میں 'سین' راجاؤں نے پورے بنگال پر قبضہ جمالیا اور پال خاندان کو نکال باہر کیا۔ یہ خاندان متعصب قسم کے ہندوؤں کا خاندان تھا جنھوں نے زبان سنسکرت کی کافی سرپرستی اور اشاعت کی —

جہاں تک بنگالی زبان کا تعلق ہے اس زمانے میں کوئی کام نہیں ہوا۔ سنسکرت کے مقابلہ میں اسے علمی زبان بننے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ یہ فخر مسلمانوں کو ہے کہ اُنھوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا۔ اور اب تو وہ ہندوستان کی بہترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور کی ایک کتاب "شنیسہ پران" ہے۔ اس میں پران کے خداؤں یعنی شیو، وشنو اور برھما وغیرہ کا حال نئے انداز میں بیان

کیا ہے جس میں ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جن سے بدھ کے نروان کی جھلک آتی ہے۔ اس میں خلق عالم سے لے کر دھرم پوجا کے طریقوں تک کا حال ہے۔ اس میں نثر بھی ہے۔ اور آخری باب، جو بہت بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، "نرنجن کے غضب" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے ایک جزو کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :-

"جاج پور اور مالدہ میں سولہ سو مضبوط برہمنوں کا اجتماع ہوا۔ یہ ویدک دھرم کے ماننے والے تھے۔ ان کا دس دس بارہ بارہ آدمیوں کا جتھا اُن ست دھرمیوں (بدھ مذہب والوں) کو قتل کرنے لگا جو اپنے مذہب پر لعنت اور گالیاں دینے سے انکار کرتے تھے۔ جب وہ ویدوں کے منتر پڑھتے تھے تو اُن کے منہ سے شعلے نکلتے تھے۔ ست دھرمی اُنہیں دیکھ دیکھ کر لرزتے تھے اور 'دھرم' سے دعائیں کرتے تھے کہ وہ انہیں بچائیے۔ دھرم کے سوا اُنہیں کون بچانے والا تھا؟ (اس لیے کہ بدھ مذہب میں خدا کے متعلق خاموشی ہے۔ وہ صرف تین لفظ جانتے ہیں۔ بدھ، دھرم، سنگھ) اس طرح برہمنوں نے اس زمین پر ظلم کیا اور مخلوقات کو تباہ کیا۔ دھرم، جو بیکنٹھ (بہشت) میں تھا، یہ دیکھ کر رنجیدہ ہوگیا وہ دنیا میں مسلمان بن کر چلا آیا۔ اس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی اور ہاتھ میں ایک کمان وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا نام خدا تھا۔ نرنجن نے بہشت میں اپنا یہ اوتار لیا۔ سب دیوتاؤں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ پاجامے پہنیں گے۔ برہما نے محمد کا اوتار لیا۔ وشنو پیکام ور (پیغام بر یعنی جبریل؟) بنا اور شیو آدمفا (آدم) - گنیش غازی کے روپ میں نمودار ہوا۔ کارتک قاضی بنا۔ نارد نے شیخ اور اِندر نے مولانا بننا پسند کیا۔ بہشت کے رشی فقیر بن گئے۔ سورج، چاند اور دوسرے دیوتا سپاہی بن گئے

اور ڈھول بجانے لگے - دیوی چنڈی نے حیا بی بی اور پدماوتی نے بی بی نور کی صورت میں ظہور کیا - اب یہ سب دیوتا متفقہ طور پر جاج پور کی طرف روانہ ہوئے - اس میں داخل ہوکر انہوں نے مندروں اور مٹھوں کو توڑ ڈالا - ہر طرف شور تھا : " پکڑو! پکڑو! '

" رامائی پنڈت " اپنا سر ' دھرم ' کے قدموں پر رکھہ کر عرض کرتا ہے کہ آپ نے کتنا اچھا ہنگامہ بپا کیا ہے ! "

( دیکھیے : History of Bengali Language & Literature
By D. N. Sen B. A., Calcutta University 1911. pp. 36 and 37. )

معلوم نہیں یہ کس لڑائی کی طرف اشارہ ہے - لیکن اتنا ضرور ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو دیوتا مانا جاتا تھا اور اب بھی مقابلۃً زیادہ جری اور جفاکش ہیں - یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعر نے اِندر کو مولانا کیوں بنایا - حالانکہ اِندر کے متعلق حضرت جانعالم واجد علی شاہ مرحوم نے ایک حد تک صحیح نظریہ قایم کیا تھا کہ وہ ناظم بہشت و نغمہ و سرور ہے - ممکن ہے کہ مولاناؤں کی مجالس میں حال و قال ، چنگ و رباب کی موجودگی سے شاعر کو یہ سوجھی ہو کہ یہ مسلمانوں کے اِندر ہیں - بیچارے غازیوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ صرف قول و قوال تک محدود رہیں اور عمل جہاد اور نغمۂ شمشیر کو چھوڑ سکیں —

غرضکہ مسلمانوں کی بنگال میں اس طرح آمد آمد ہوتی ہے کہ "اندر سبھا" (امانت) میں گویا اِندر تشریف لارہے ہیں - اس سے پہلے کا زمانہ ہماری نظروں سے اس تیزی سے گزر جاتا ہے کہ سوائے مہابیر ، بدھ ، فاهیان ، اشوک ، ہیون سانگ کے قصوں کے اور کچھہ نظر نہیں آتا -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جس کی تعبیر کہیں کسی لاٹھ سے ہوتی ہے کہیں کتبہ سے ' کہیں کوئی مدفون مندر نکل آتا ہے یا کسی شاعر کا بھوج پتر پر لکھا ہوا کلام ––

بنگال کا تاریخی زمانہ جنرل بختیار خلجی کے نام سے شروع ہوتا ہے جس کے سامنے بلا مبالغہ موجودہ زمانے میں کوئی سپہ سالار نظر نہیں آتا - اس نے ڈیڑھ درجن سواروں کے ساتھ' اپنی پوری فوج کو بہت پیچھے چھوڑ کر لکھنوتی پر ( جو بعد میں گور کہلایا ) حملہ کردیا - اور سین راجہ کو جس کی راجدھانی بنارس سے سمندر تک تھی' شہر سے فرار ہونے پر مجبور کیا - بختیار خلجی نے اُس کی جائے پناہ بکرم پور بھی لے لی اور غریب راجہ نے مع اپنے خاندان کے چتا پر جل مرنا پسند کیا - آخر کار فاتح نے ڈھاکہ کے قریب سنار گاؤں میں دم لیا' جسے اپنا دارالسلطنت بنا کے اس نے غلام بادشاہ قطب الدین ایبک سے آزاد ہوکر بنگال میں پہلی مسلمانوں کی سلطنت قائم کی - یہ واقعہ رائے پتھورا کی شکست اور شہاب الدین غوری کے دہلی فتح کرنے کے چھہ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۹۸ ع کا ہے - اب مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں شروع ہوگئیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان حمایت دین کے لیے ہمیشہ جنگ کیا کرتے ہیں اب ان کی حالت ملاحظہ فرمائیں -

باوجودیکہ بنگال کی آب و ہوا ایسی نہ تھی کہ کوئی یہاں رہنا پسند کرتا' لیکن دولت و جاہ کی طمع نے سنہ ۱۲۲۵ ع میں التمش کو مجبور کیا کہ خود بدولت بنگال کے صوبہ دار کی گوشمالی کریں - لیکن اس کے مرنے کے بعد پھر بنگال میں خود سری کا دور دورہ شروع ہوگیا - جب بلبن فرمانروا ہوا تو اس نے طغرل خاں والیء بنگالہ کو خود جاکر

شکست دی - اور نہ صرف طغرل کو قتل کیا بلکہ گور کے باغیوں کے لیے دو میل تک پھانسیوں کی قطاریں کھڑی کرکے وہ سبق پڑھایا جس کا آموختہ دُھرانے کی نوبت اس عالم فانی میں پھر نہیں آئی - سنہ ۱۳۳۳ ع میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا اور شاہان تغلق کو اس کی سرکوبی کرنی پڑی - لیکن پھر پانچ سال بعد فخرالدین مبارک شاہ نے بنگال کو مرکزی حکومت سے آزاد کر ھی لیا —

اس دور حریت و آزادی میں چار خاندانوں کے ۲۴ بادشاھوں نے بنگال پر دو سو سال تک حکومت کی - آخری خاندان حسین شاھی کا بانی ایک شخص علاءالدین عربی نسل سے تھا جسے شیر شاہ نے ختم کردیا اور وہ خود سنہ ۱۵۴۰ ع میں دھلی کا بادشاہ بن بیٹھا —

پٹھانوں کو زمانے نے زیادہ مہلت نہ دی - اور اگرچہ انہوں نے اوڑیسہ کو بھی سنہ ۱۵۶۸ ع میں اپنے زیر نگیں کرلیا تھا لیکن آخر کار سنہ ۱۵۷۲ ع میں اکبر کی فوجوں نے داؤد خاں تاجدار بنگال کو راج محال میں شکست دے کر بنگال کو فتح کرلیا - اب اُس زمانہ کی چند شکستہ عمارتیں اور شہسرام میں شیر شاہ ( المتوفی سنہ ۱۵۴۵ ع ) کا مقبرہ باقی رہ گیا ھے —

مغلوں کے ابتدائی سو سال کے زمانے میں بنگال میں بائیس صوبہ داروں نے حکومت کی - سولھویں صدی کے آخیر میں ٹانڈہ سے راجمحال میں دارالحکومت تبدیل ھوا - شائستہ خاں نے سنہ ۱۶۶۶ ع میں اُن پرتگیزوں کا صفایا کردیا جو لوٹ مار کرنے اور غلاموں کی تجارت کے سلسلے میں بحری ڈاکو بن گئے تھے اور ساحل ھی نہیں بلکہ ڈھاکہ تک تباھی پھیلا چکے تھے - چاٹگاؤں ان کا بحری مستقر سا ھوگیا

تھا - اس زمانے میں راستوں میں کافی امن و امان ہو گیا تھا - صنعت و حرفت و تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی - حتیٰ کہ برنیر کہتا ہے کہ :—

" بنگال نہ صرف ہندوستان یا مغلیہ سلطنت کا خزانۂ مال و دولت ہے، بلکہ ملحقہ ممالک اور یورپ کے لیے بھی یہیں سے مال مہیا ہوتا ہے - مجھے حیرت ہے کہ صرف ولندیزی تاجر اتنا سوتی سامان جاوا اور یورپ کو روانہ کرتے ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہے - انگریز، پرتگیز اور ہندوستانی سوداگروں کا تو کہنا ہی کیا ہے - یہی حال ریشمی کپڑوں کا ہے - پٹنہ کی طرف سے شورہ کشتیوں میں آتا تھا، جسے بارود بنانے کے لیے ولندیز اور انگریز یورپ لے جاتے تھے - چاول مدراس، لنکا، اور جزائر مالدیپ ( دیپ = دویپ=دوآب = جزیرہ ) کی طرف جاتا تھا - غرضکہ بنگال ایسا ملک تھا جو سب کا داتا تھا " -

سنہ ۱۷۰۴ ع میں جب مرشد قلی خاں نے مرشد آباد میں دارالحکومت منتقل کیا تو ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ دہلی بھیجنا شروع کیا - تجارت کی ترقی نے ملو کے اس قانون کو توڑ دیا جس کی وجہ سے بنگال کو چڑیلوں اور بھوتوں کا ملک کہا جاتا تھا - شہر شاہی سڑکوں پر سرائیں، مسجدیں، کنویں اور ہندو مسلمانوں کے لیے علحدہ علحدہ خدمت گزاروں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ سونا اچھالتے چلے جاتے تھے - دریاؤں سے بھی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی - اور آخر کار مصنف ریاض السلاطین کو لکھنا پڑا کہ اس دور حکومت سے پہلے " نہ صرف مغل امرا بنگال کی آب وہوا کو مہلک سمجھتے تھے بلکہ واقعی اسے بھوتوں کا مسکن تصور کرتے تھے - لیکن اب یہ ایسا باغ ہے جس میں

کانتا نہیں - اب ان کی دلی خواہش ہے کہ وہاں کوئی عہدہ ملے "-
عالمگیر (رح) کے بعد یہاں کے نواب وزیر موروثی ہوگئے - سنہ ۱۷۴۰ ع
میں علی وردی خاں کا زمانہ تھا - یہی زمانہ ہے جب کہ مرہٹوں نے
سر اُٹھایا تھا - اور ہر طرف لوٹ مار شروع کردی تھی - حتیٰ کہ انہیں
اُڑیسہ دے کر پیچھا چھڑایا گیا - یورپین سلطنتوں کی تجارتی کوٹھیاں
سبھی قلعوں اور میگزینوں میں تبدیل ہونے لگی تھیں - حتیٰ کہ جب
نواب سراج الدولہ تخت وزارت پر متمکن ہوئے تو اُنہوں نے انگریزوں
کو مار بھگایا اور کلکتہ پر قبضہ کرلیا - لیکن مرشد آباد میں اُن کے
خلاف ایک سازش ہوئی جس میں کلایو بھی شریک تھا اور سنہ ۱۷۵۷ ع
میں سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریز سوداگروں نے میر جعفر کو
نواب بنادیا - یہ انگریزوں کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا - اور
جب فوجوں کے لیے روپیہ نہ فراہم کرسکا تو نالائق کر کے نکال دیا گیا -
اور میر قاسم نواب بنائے گئے - انہوں نے مونگھیر کو دارالحکومت بنایا -
اور جب انہوں نے حسب معاہدہ وینسٹارٹ (Vansittart) منعقدہ جنوری
سنہ ۱۷۶۳ ع اپنے وصولیء محاصل چنگی کے جائز حقوق استعمال کرنا شروع
کیے تو کونسل کے دیگر افراد نے گورنر کے معاہدہ کو منسوخ کرکے ایلس
(Ellis) کو نواب پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا - غرضکہ پھر میر جعفر
۲۳ جولائی سنہ ۱۷۶۳ کو مرشد آباد لایا گیا - اور میر قاسم شکست
خوردہ الہ آباد کی طرف چلے گئے - فروری سنہ ۱۷۶۵ میر جعفر مرگیا -
لیکن اسی زمانے میں شاہ عالم نے انگریزی کمپنی کو بنگال کے حقوق
دیوانی عطا کردیے اور میر جعفر کے بیٹے کی نوابی بھی انگریزوں نے
ختم کردی - غرضکہ جو فتح پلاسی میں (سنہ ۱۷۵۷ ع) میں ہوئی تھی

اس پر بکسر کی لڑائی (سنہ ۱۷۶۴ ع) نے مہر تصدیق ثبت کردی، اور شاہ عالم سے معاہدہ ہوکر بنگال کی قسمت کا کچھہ دنوں کے لیے فیصلہ ہوگیا - دارالحکومت مرشدآباد سے کلکتہ میں سنہ ۱۷۷۲ ع میں بدل دیا گیا - اور سنہ ۱۷۹۰ ع میں حقوق دیوانی کے علاوہ فوجداری کو بھی لارڈ کارنوالس نے مغلیہ حکومت سے آزاد کرلیا - یعنی ایک طرح کی نام نہاد حکومت جو نواب کے ہاتھوں میں تھی وہ بھی ختم کرا دی گئی —

مذاہب

بنگال میں ہندو مسلمان اس طرح آباد ہیں کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی کثرت ہے - اور مجموعی طور پر مسلمان ہندووں سے چند فیصدی زیادہ ہیں - صرف مسلمان یہاں اتنے ہیں کہ جنگ بلقان سے پہلے کی ترکی، ایران اور افغانستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہیں - لیکن ان کی عام تعلیمی حالت اور تمدنی زندگی زوال سلطنت کے بعد بہت پست ہوگئی ہے - انگریزوں نے جب یہاں نیا نیا انتظام کیا تو یہاں کے مسلمان زمینداروں کے جو ہندو "کارندے" اور "سرکار" تھے وہ سب زمیندار بن بیٹھے - یعنی مالگزاری کی ادائگی ان کے ذمہ قرار پائی - اس طرح یہاں تقریباً سب زمیندار ہندو ہیں اور مسلمان کاشتکار یا مزدوری پیشہ ہیں - جوٹ کی پیداوار جن علاقوں میں ہوتی ہے وہ تقریباً مسلمان کاشتکاروں کی محنت کا نتیجہ ہے، جوٹ (جس سے بورے وغیرہ بنتے ہیں) کا کاروبار سب انگریز اور اسکاچ سرمایہ داروں کے ہاتھہ میں ہے - یہ چیز بنگال کے علاوہ دنیا میں کہیں پیدا نہیں ہوتی اس لیے اگر معقول قیمت پر فروخت ہو تو کسانوں کو بہت نفع ہوسکتا ہے - لیکن سرمایہ دار کمپنیاں بھی اب ایک طرف تو کسانوں اور مزدوروں کے اتحاد سے پریشان ہورہی ہیں -

اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے ممالک کی نئی ترکیبوں سے ان کی تجارت پر اثر پڑ رہا ہے - کہتے ہیں کہ وہاں کاغذ کے مضبوط بورے تیار ہونے لگے ہیں - روئی اب یہاں بہت کم پیدا ہوتی ہے، البتہ ریشم کی پیدا وار بڑھ رہی ہے —

مذہب ہنود رسم و رواج کے مجموعوں کا نام ہے، ان میں سیکڑوں فرقے ہیں جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں - عجائب پرستی اور فطرت پرستی عام ہے - اسی کے ساتھ ساتھ ویدانتی اور فلسفی بھی ہیں جو ہمہ وست و ہمہ از وست کی بحثیں کرتے ہیں - عام طور پر مندر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ ہر ایک شخص بیک وقت پوجا کرسکے - جماعتی پرستش صرف مسلمانوں کی امتیازی چیز ہے - شیو کی پرستش کرنے والے بھی ہیں اور وشنو کی پوجا کرنے والے بھی - پہلا گوشت خور ہے دوسرا نہیں - شکتی یا شیو کی بیویوں کی قوت تانیث کی بھی پرستش ہوتی ہے - یہ درگا، کالی اور پاربتی ہیں - انہیں خوش کرنے کے لیے بکروں کے تازہ خون کی بھینٹ چڑھانا ضروری ہے - پہلے آدمیوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی - اس کی ایک شاخ اس حد سے گزر کر تانترک دھرم کے مطابق برہنہ عورت کی پرستش بھی کرتی ہے - گرو (مرشد) کی پوجا بھی ہوتی ہے جسے خدا سے بلند رتبہ دیا جاتا ہے —

راجہ رام موہن رائے سنہ ۱۷۷۴ع - سنہ ۱۸۳۳ ع) نے اسلام سے اثر پذیر ہو کر نہ صرف لباس و خوراک میں مغلوں کے اثر کو قبول کر لیا تھا، بلکہ مغلیہ تاجدار کی طرف سے ولایت سے واپسی کے بعد بھی انگریزی مذہب سے مرعوب نہیں ہوئے - انہوں نے توحید باری تعالیٰ کی تعلیم کے لیے ایک معقول مذہب (برہمو سماج) رائج کیا تھا - بیواؤں کی شادی کے حامی

تھے - اور چھوت اور کو دور کرنا چاہتے تھے - کیشب چندر سین (سنہ ۱۸۳۸ ع - ۱۸۸۴ ع) نے اور دوسرے پڑھے لکھے ہندوؤں نے اس کی ترویج کی - لیکن اب ان کی مجموعی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے - ان میں دو مسلمان بھی داخل ہیں - اور سب بت پرستی کے خلاف ہیں —

ہندو تصوف یعنی ویدانت کو رام کرشن پرم ہنس (سنہ ۱۸۰۴ ع - ۱۸۸۶ ع) کے مشن نے ترقی دی - یہ کلکتہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے - ان کے شاگرد رشید سوامی ویکانند اور سسٹر نویدیتا (Sister Nivedita) نے یورپ اور امریکہ میں اس کو کافی شہرت دی - یہ مشن اب دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا ہے - ایک روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہے اور گوشت نہیں کھاتا - اور دوسرا خدمت خلق و خدمت مریضاں کی طرف رجوع ہے اور گوشت کھانے پر معترض نہیں - مؤخرالذکر جماعت کو نومبر سنہ ۳۷ ع میں ایک امریکن عورت نے سات لاکھ روپے مندر بنانے کے لیے دیے ہیں جس میں رام کرشن پرم ہنس کا مجسمہ بھی ہوگا - "پرستش کے لیے نہیں" بلکہ یادگار کے طور پر - جس طرح لینن کی قبر روس میں ہے اور باوجود لادینیت کے جوشیلے روسی اس کو دیوتا سمجھنے لگے ہیں - لیکن اسے ان کی عقل کا قصور کہا جاتا ہے - آریہ سماج کا اثر بنگال میں نہیں ہے - اور دیانند سرسوتی (سنہ ۱۸۲۷ ع - سنہ ۱۸۸۳ ع) کی تعلیم کا زور بہار تک آتے آتے ختم ہوگیا ہے —

باوجود ان فرقوں کے بھکتی کی تعلیم کے ماننے والے بہت زیادہ ہیں - یہ لوگ کالی یا شکتی کی پوجا نہیں کرتے اور ایک قسم کے موحد ہیں - جس طرح کبیر اور نانک نے شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر سے جات پات کو توڑ کر توحید باری تعالیٰ پر زور

دیا تھا - اسی طرح بھگتی کے حامی خدائے واحد کی محبت کو ذریعۂ نجات تصور کرتے ہیں - 'چیتن' دیو نے' جو کرشن کے اوتار مانے جاتے ہیں' جب بھگتی کی تعلیم دینی شروع کی تو وہ بنگال سے بندرابن گئے اور وہاں جاکر انہوں نے قدیم بزرگوں کے استھانوں (مقامات) کو کشف کے ذریعہ سے معلوم کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند اور خصوصاً بندرابن اور متھرا کی طرف کثرت سے بنگالیوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی - اور بنگالی زبان پر اردو کے نقش و نگار بننا شروع ہوگئے —

گذشتہ صدی میں جن مسلمانوں کے نام احیائے ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں لیے جاتے ہیں ان میں حضرت سید احمد بریلوی اور مولوی کرامت علی جونپوری کا شمار صف اول کے لوگوں میں ہے - بنگال میں جو اثر ہے وہ انہی بزرگوں کا ہے - اور تقلید کی جکڑ بند سے نکلنے میں ان حضرات کی کوششوں نے بہت کچھ کار فرمائی کی ہے - یہی وجہ ہے بنگال کے عام مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ روشن خیال ہیں - یعنی نہ تو وہ اتنے عجائب پرست ہیں' نہ ہندوؤں کی سی رسموں میں بندھے ہوے ہیں - ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مشرکانہ رسوم کے ترک کرنے کی وجہ سے وہابی کہلاتے ہیں - ان کی کئی قسمیں ہیں - بعض اہل حدیث کہلاتے ہیں اور بعض فرائضی - لیکن قدامت پرستی اور ہندوستانی بدعتوں کے ماننے والے پیر پرست' قبر پرست' اور سماع و مولود کے قائل بھی موجود ہیں - موجودہ زمانے میں تقلید و تجدید کے پھیروں میں مختلف جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں - مثلاً مولانا سید ابوبکر صاحب موضع فرفرا' تاکھانہ دکھشن دیہی ضلع ہگلی کے باشندے ہیں' حنفی ہیں یعنی اہل حدیث کے

مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ تصویر کے خلاف ہیں۔ مولوی کرامت علی جونپوری کے پوتے ابوالفرح زندہ ہیں، کلکتہ میں بھی رہتے ہیں اور رنگپور میں بھی۔ یہ محمدی کہلاتے ہیں، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز سمجھتے ہیں اور پیری مریدی کرتے ہیں۔ ابا خالد رشیدالدین عرف بادشاہ میاں، فرید پور (مشرقی بنگال) کے با اثر شیخ ہیں۔ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے تیس لاکھ مرید ہیں۔ اور خلافت کے سلسلے میں جیل بھی جاچکے ہیں، یہ فرائضی ہیں۔ فرائضی جماعت کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت کو یہ حق نہیں کہ اُس پر کسی قسم کا لگان یا ٹیکس عاید ہوسکے۔ اس لیے وہ لگان و مالگزاری وغیرہ ادا کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب یہ "حیلۂ شرعی" اختیار کیا گیا ہے کہ مالک زمین خود مالگزاری ادا نہیں کرتا بلکہ اس کا کوئی رشتہ دار دے آتا ہے۔ یہ لوگ کاشتکاری کے ذریعہ معاش حاصل کرنا بہتر تصور کرتے ہیں اور نوکری کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ خواہ کسی کی بھی ہو۔ پیر پرستوں کی ایک جماعت وہ بھی ہے جو سجدۂ مرشد کو جائز سمجھتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ 'باؤل' فقرا کی جماعت میں نظر آتا ہے۔ یہ زیادہ تر ضلع 'ندیا' میں رہتے ہیں اور دوسرے اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نماز بھی پڑھتے ہیں اور بعض بالکل آزاد ہندو فقیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ پنجاب کے کسی شیخ کے خاندان سے ہے۔

جس طرح ہندوستان (سرہند تا پٹنہ) میں ہندی اردو کا اختلاف پیدا ہورہا ہے، اسی طرح بنگال میں بھی ہندو بنگالی اور مسلمانی بنگالی

موجود ہیں- یعنی ایک میں سنسکرت کی زیادتی اور دوسری میں تمدن اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے- رابندرا ناتھ ٹیگور نے تیس سال کی محنت کے بعد بنگالی زبان کو سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ و محاورات سے آزاد کیا ہے اور عوام کی بول چال سے زیادہ قریب کردیا ہے۔ اسی طرح قاضی نذرالاسلام نے حافظ و سعدی کی زبان کو فارسی بحروں میں بنگالی زبان کے لیے رائج کرنا شروع کیا ہے اور زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے —

## بنگالی زبان پر مسلمانوں کا احسان

جس طرح بودھوں کی فراخ دلی اور عدم عصبیت نے عوام کی بولیوں کو زبانوں کی صف میں لانے کی کوشش کی تھی اور ہندوؤں کی تنگ نظری یا قدامت پرستی نے اُنھیں مجبور کیا کہ اس تحریک کو کچل دیں، اُسی طرح، بلکہ اُس سے زیادہ انہماک اور فراخ دلی سے مسلمانوں نے مقامی بولیوں کو ترقی دی- جہاں وہ گئے ملکی بولی کو سلطنت کے طول و عرض میں رائج کرنے لگے- اب تک گجراتی، اودھی، بہاری اور بنگالی کو ہندوؤں نے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس میں ویدوں کو نہ سہی توکم از کم رامائن اور مہابھارت ہی کو ترجمہ کرکے عوام کے قریب لے آتے- حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر ملک میں چند مذہبی اجارہ دار علم کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اسی طرح ہندوستان کی بھی حالت تھی- یورپ کی حالت تو صرف تھوڑے دن پہلے یہ تھی کہ تعلیم کلیسا کی ماتحتی میں تھی اور سائنس کی روشنی

کو' حتی کہ ریاضی و نجوم کو بھی' عوام تک پہنچانے والوں کو نہ صرف قید کردیا جاتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر ملک عدم کو پہنچا کر دم لیا جاتا تھا - یہ تھی مذہب کے نام پر " ملحدون " کی خونریزی - اس سفاکی کی مثالیں اتنی طویل ہیں کہ ایک مکمل کتاب نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی اسی مذہبی ہٹ دھرمی اور اجارہ داری کی خون آشامیوں کے واقعات سے تیار کی جاسکتی ہے - بہرحال ہندوستان میں یہی ہوا - اور اب مسلمانوں کی سلطنت کے جانے کے بعد پھر ان مذہبی مجنونوں کو سر اُٹھانے کا موقعہ ملا ہے - مگر ہیں یہ سب رنگے سیار' مصنوعی مجنون - ان کا مقصد صرف دوسری ترکیب سے اپنی اقتصادی قیادت کو قائم رکھنا ہے - اس سلسلے میں مذہب بھی استعمال ہوسکتا ہے اور سیاست بھی - منشا دونوں کا ایک ہے یعنی ایک مخصوص علمی جماعت کے لیے روٹی دال —

دنیش چندر سین نے مجبوراً دبی زبان سے مسلمانوں کی اس روا داری کو اس طرح بیان کیا ہے - ' بنگالی کو ادبی معیار تک پہنچنے کے لیے بہت سی چیزوں سے مدد ملی - اس میں بلا شبہ اسلامی فتح کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے - اگر ہندو راجا آزاد رہتے تو بنگالی کو راجاؤں کے درباروں تک پہنچنا بہت مشکل تھا - پٹھانوں نے تیرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال پر قبضہ کرلیا تھا - وہ بہت دور سے یعنی بلخ' آکسس اور اُس بھی آگے کے ملکوں سے آے تھے' لیکن اُنہوں نے بنگال کے میدانوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اپنے پہاڑی وطنوں کو واپس جانے کا ارادہ ترک کردیا - پٹھان شہنشاہوں نے بنگالی سوکھی' اور ہندوؤں کی اس کثیر آبادی کے ساتھ رہنے لگے جن پر وہ حکومت کرتے

تھے - ان کی مسجدوں کے مینار و گنبد آسمان سے باتیں کرتے تھے ' اور ھندوؤں کے مندروں کے درش بدوھن قائم تھے - جب نووارد اپنی شام کی نماز کے لیے جمع ھوتے تھے تو مندروں سے سنکھہ اور گھنٹے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں - ھندوؤں کے شاندار جلوس اور مذھبی رسمیں — درگا پوجا - راسا اور دول اُتسو — اتنا ھی جوش و خروش کا اظہار کرتی تھیں جو مسلمانوں کے محرم ' عید ' شب برات اور دوسرے تہواروں سے ظاھر ھوتا تھا - ان شہنشاھوں نے سنسکرت کی رزمیہ کتابوں کی شہرت سنی - اور وہ فطرتاً مہابھارت اور رامائن کو جاننے کے خواھش مند اس لیے ھوے کہ ان کا ھندوؤں کی خانگی اور مذھبی زندگی پر گہرا اثر ھے - پٹھان شہنشاھوں اور سرداروں کو ھندو راجاؤں کا سا صبر نہیں تھا کہ مذھبی جوش کی وجہ سے برھمن عالموں کی سنسکرت کو سنتے' اُن کی علمی تفسیریں سمجھتے اور برسوں میں رامائن اور مہابھارت کا دورہ ختم کرتے - پٹھانوں نے ایسے عالموں کو مقرر کیا جو سنسکرت سے ان کتابوں کا ترجمہ اس بنگالی میں کریں جنھیں وہ بولتے تھے اور سمجھتے تھے - مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیرا شاھا (نصیر شاہ) شہنشاہ گور کے حکم سے سنہ ۱۳۲۵ ع میں ھوا - دوسرا ترجمہ پراگل خاں صوبہ دار چاٹگاؤں کے حکم سے 'کوندر پر میشور' نے کیا - نصیر شاہ بنگالی زبان کا اتنا حامی تھا کہ شاعر ودیا پتی نے اپنا ایک قصیدہ اُس کے نام سے معنون کیا ھے - اور سلطان غیاث الدین کا بھی نہایت احترام سے نام لیتا ھے" (Bengali Language and Literature pp 10 - 11) —

یہ سلسلہ اتنا طویل ھے کہ ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ھے - مختصر یہ کہ حسین شاہ نے مالا دھر باسو اور اپنے ایک مصاحب کے

ذریعہ سے سنہ ۱۴۸۰ع میں بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرایا اور اسے گن راج خان کا خطاب عطا کیا - اب تک انھی خطابات کے مطابق بہت سے بنگالی معظم دار سرکار' ملک وغیرہ کہلاتے ھیں - پراگل خاں اسی بادشاہ حسین شاہ کا جنرل تھا - چھوتے خاں ولد پراگل خاں نے بھی سنت پدری پر عمل جاری رکھ' اور جب وہ چاٹگام کا صوبہ مقرر ھوا - تو' ننّدی ' سے بھارت کے ایک باب کا ترجمہ کرایا جسے عرصہ ھوا ساھتیہ پریشد کلکتہ شائع کر چکی ھے - سترھویں صدی میں شاعر علاؤل ( علاء الدین ) نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا نہایت ھی سنسکرت آمیز بنگالی میں ترجمہ کیا - یہ ترجمہ مانگن ٹھاکر کے حکم سے ھوا جو مسلمان تھا اور اراکان کے رئیس کا وزیر تھا - علاؤل نے امیر سلیمان کے حکم سے ایک فارسی کتاب بھی بنگالی میں ترجمہ کی تھی - حکام کی قدر دانی ھمیشہ برھمنوں اور پنڈتوں کو اپنے خیالات بدلنے پر مائل کرتی رھی ھے - آخر کار یہی ھوا کہ وہ بھی بنگالی میں لکھنے لگے اور راجاؤں نے بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس زبان کی سرپرستی شروع کردی - کمپنی کی حکومت کے زمانے میں ان - پی - ہال ھڈ ( Nathaniel Prassy Halhead ) نے سب سے پہلے بنگالی گرامر اٹھارھویں صدی میں لکھی اور یورپین مشنریوں نے بنگالی نثر کو کافی ترقی دی —

یہ ھے مختصر سی تاریخ اس علمی کوشش کی جو مسلمان بادشاھوں اور نوابوں نے شروع کی اور بنگالی بولی کو زبان بنادیا - بعض موجودہ زمانے کے فرقہ پرور اپنی اپنی تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتے ھیں کہ ھندو دھرم اور سنسکرت زبان کو زندہ کرنے کے لیے ھندو مسلم سوال پیدا کرنا اور مذھبی طبیعت کو ترقی دینا مفید ھوگا - لیکن جاننے والے جانتے ھیں کہ ھمیشہ یہ آلہ

کارگر نہیں ہوسکتا - اگر کوئی یہ کہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے' مسلمان بادشاہوں نے اُسے ترقی دی' اگر مسلمان چاہیں تو اُسے زندہ رکھیں' عام ہندوستانیوں کو اس زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ سخت غلطی کرتا ہے - جس طرح اردو عام ہندوستانیوں کی زبان ہے اور یقیناً مسلمان امرا و سلاطین و شعرا و ادبا نے ایک عام ملکی زبان بنانے میں ضرورت سے زیادہ حصہ لیا ہے' بالکل اسی طرح اُنہوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا اور برہمنوں کے اقتدار سے علوم و فنون کے خزانوں کو چھین کر عامۃ الناس کو مستفیض ہونے کا موقعہ دیا - یہ کام اُنہوں نے اُس وقت کیا تھا جب عام طورپر برہمنوں نے اُنہیں بھی ملیچھ اور اچھوت سمجھ رکھا تھا —

شاید دنیا میں اس عدیم المثال رواداری اور عدم تعصبی کا ثبوت ملنا مشکل ہے جو نووارد' پر جوش اور تازہ ولایت مسلمانوں نے ہندوستان کے مذہبوں' زبانوں اور رسوم و رواج کے ساتھ کیا - آج جو کچھ ادبی جواہر ریزے ہیں' خواہ وہ ہندی میں ہوں یا گجراتی میں' بنگالی میں ہوں یا پنجابی میں' سب مسلمانوں کی بے نظیر کوششوں کی داد دے رہے ہیں - سمجھ دار ہندوستانی' خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کا جو سرمایہ آگیا ہے اسے صرف تعصب کے بدلے میں فروخت کرڈالیں - یہ صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ' اور لاکھوں محبت بھرے دلوں کی یادگاریں ہیں جو مختلف ہندوستانی زبانوں میں نظر آرہی ہیں اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں —

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

# بنگالی زبان میں اردو الفاظ

ذیل کے صفحات میں بنگالی زبان کی صرف و نحو سے بحث نہیں کی گئی اس لیے افعال و حروف کی فہرست نہیں دی گئی - گویا کہ یہ فہرست صرف اسما تک محدود ہے - لیکن باوجود اس حد بندی کے جو الفاظ درج کیے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں کس کثرت سے اردو اسما کا بنگالی زبان میں استعمال ہوتا ہے - اگر کوئی غیر بنگالی تھوڑی سی نحوی ترکیبوں سے واقف ہوجائے اور الفاظ کی بنگالی طرز ادا یا لہجے کو سمجھ لے تو اسے اردو اور بنگالی میں بہت کم فرق نظر آے گا - میرا اندازہ ہے کہ بنگالی زبان میں پچاس فی صدی سے زیادہ ایسے اردو الفاظ ہیں جو لہجے کی تبدیلی کی وجہ سے بنگالی معلوم ہوتے ہیں ' لیکن حقیقتاً وہ خالص اردو الفاظ ہیں - اس کے علاوہ بیس فی صدی ایسے فارسی الفاظ ہیں جو بنگال میں رہتے رہتے بنگالی ہوگئے ہیں - باقی تیس فی صدی الفاظ میں زیادہ حصے میں سنسکرت اور کم حصے میں دراوڑ' مثلاً ' تبتی ' آسامی ' برمی اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ مل جل گئے ہیں —

مختلف عنوانوں کے ماتحت جو مختصر فہرست درج ذیل ہے وہ پوری بنگالی لغات پر حاوی نہ ہونے کے باوجود ہمارے اس دعوے کو کو پورے طور پر ثابت کرتی ہے کہ بنگالی زبان اردو زبان سے بہت ہی قریب کا رشتہ رکھتی ہے :—

# دنیا اور فطرت

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| اکاش | آکاش - آسمان |
| امابوشے | اماوس - شب هلال |
| اوگنی | اگنی - آگ |
| اندهر | اندهیرا |
| اتر | اتر |
| برشتی | بارش |
| پرتهبی | پرتهوی - زمین |
| پربو | پورب |
| پهینا - فینا | پهین - کف |
| پالا - برپهہ | پالا - برف |
| بجلی | بجلی - برق |
| پورنما | پورنماشی - شب بدر |
| پوش چم | پچهم |
| تاپ | تپ - گرمی |
| تارا | تارا |
| تهلتا | تهلتک |
| جل - پانی | جل - پانی |
| جوگت | جگت - دنیا |
| چاند | چاند |

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| درکھن | دکھن - جنوب |
| رام دھونک | رام دھنک - قوس و قزح |
| شجو - شر جو | سورج |
| میگھہ | میگھہ - بادل |
| ہوا | ہوا |

## خشکی (جل) اور تری (ستھل)

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| اترائی | اترائی (پہاڑ سے) |
| إندارا | اندارا (بڑا کنوان) |
| بلی | بالو - ریت |
| بھاٹا | بھاٹا (جذر) |
| پہاڑ | پہاڑ |
| پاتھور | پتھر (چٹان) |
| پرونالی | پرنالی |
| پوربوت | پربت |
| تیر - کنارا | تیر - کنارہ |
| جھورنا | جھرنا - آبشار |
| چھوٹو ندی | ندی |
| چوڑھائی | چڑھائی (پہاڑ پر) |
| دیپ | دیپ - جزیرہ |
| دگھی | ڈگی - تالاب |



| بنگالی | اردو |
|---|---|
| شومدرو۔ شاگر | سمندر - ساگر |
| کوا | کلوان |
| طفردی | دریا (ندی) |

## معدنیات = دھاتو

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اشپات | اسپات - فولاد |
| برونز دھاتو | برنج |
| پی تول | پیتل |
| پارا | پارا |
| تانبا - تاما | تانبا |
| تین | تین |
| چون | چونا |
| دھاتو | دھات |
| دوستہ | جستہ |
| روپا | روپا چاندی |
| سیمنٹ | سیمنٹ |
| شیشہ | سیسا |
| شونو | سونا |
| کاتھہ | کاتھہ |
| کوئلہ | کوئلہ |
| کانکور | کنکر |
| کھڑی | کھریا مٹی |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| کانچ | کانچ |
| مور مور | مر مر (سنگ مر مر) |
| موتی | موتی |
| متی | متی |
| نیلا | نیلم |
| هیرا | هیرا |

## چرند و پرند وغیره

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اود براال | عود بلاؤ |
| اؤت | اونٹ |
| باچهر | بچهیرا |
| برال - بهرال | بلار - بلی |
| باج پکهی | باز |
| بهیرار باچا | بهیر کا بچه - میمنا |
| باندور | بندر |
| بلبل | بلبل |
| بوتهر | بتهر |
| باگهه | باگهه |
| باگهنی | باگهنی |
| پشو جنتور | پشو - جانور |
| پاکهی | پنکهی - چڑیا |

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| پانٹھا | بکرا |
| پھرو | پھرو ( ترکی مرغی ) |
| بھیا بھیا کورا | بھین بھین کرنا |
| تی تر | تیتر |
| ٹٹو | ٹٹو |
| جنور | جانور |
| چوہا | چوہا |
| چورئی | چڑیا |
| دول | دل ( گلہ ) |
| راج ھنس | راج ھنس |
| رواں ۔ پشم | بروان ( بال ) |
| شاپ | سانپ |
| شانڑ | سانڑ |
| شاروش | سارس |
| شیال | سیار ۔ شغال |
| شنگھہ | سنگھہ ( شیر ) |
| ککر | کوکر ۔ کتا |
| کھوچر | خچر |
| کٹھ ٹھوکرا | ھد ھد |
| کٹھہ بڑالی | کٹھہ بلی ( گلہری ) |
| کھورر | کھر |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| گورو گائے | گائے |
| گورور باچھر | بیل |
| گادھا | گدھا |
| گھگھو | فاختہ |
| گھوڑا | گھوڑا |
| موش - مہوش | بھینس |
| مرگ | مرغ |
| مرگی | مرغی |
| مو میو کورا | میوں میوں کرنا |
| میویور | مور |
| مکوڑ شا | مکڑی |
| ہورن | ہرن |
| ہورنی | ہرنی |
| ہانس | ہنس (بطخ) |
| ہاتی | ہاتھی |

## نباتات

اسپ

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| ابلس | ابلوس |
| ادا | ادرک |



| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| انگور | = |
| اکھروٹ | اخروٹ |
| بدام | بادام |
| بھل | = |
| بالنھس | بانس |
| بے گُن | بینگن |
| باندھا کوپی | بند گوبھی |
| پان | = |
| پھول | = |
| پھولھر توڑا | ھار |
| پھول گوبی | پھول گوبھی |
| پھل | = |
| پاتا | پتہ |
| پھٹی | پھوٹ |
| پدیلہ | پود ینہ |
| پیانج | پیاز |
| تماکو | تمباکو |
| تورمُج | تربوز |
| ٹماٹو | ٹماٹر |
| جوب | جو |
| جھاؤ | ...=... |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| جوئین | جوهی ( چهلی ) |
| چهال | |
| چهنا بدام | مونگ پهلی |
| دا روچهنی | دارچهنی |
| ڈال - شاکها | ڈالی - شاخ |
| روشن | لهسن |
| سهو پهل | سهب |
| سپاری | |
| شهم | سهم |
| شونٹهه | سونٹهه |
| شون | سن |
| شے گُن | ساگون |
| شال گوم | شلغم |
| شاکهه | شاخ |
| شوب جی | سبزی |
| کپاش | کپاس |
| کهے جر | کهجور |
| کان ٹهل | کٹهل |
| کاجور | کاجر |
| گهاش | گهاس |
| گوم | گندم |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| لیبو - نیبو | لیمون - نیبو |
| مالا | مالا - ہار |
| نرکل | ناریل |

## رنگ

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اشمانی نیل | آسمانی |
| بدامی | بادامی |
| بیگنی | بینجنی |
| پھیکے - ہلکا | ہلکا رنگ |
| پھیکے لال - گلابی | گلابی |
| دھانی | ... = |
| شوبج | سبز |
| فیروجہ | فیروزئی |
| کالو | کالا |
| لال | ... = |
| نیل | نیلا |
| نارنگی رنگ | نارنجی |
| گاڑھو - گیہلو | گہرا - گاڑھا رنگ |
| گاڑھو نیل | بنفشی |
| شادہ | سفید |
| ہلدے | زرد |

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |

## وقت اور موسم

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| آج کل | |
| بوزودن | بوادن |
| بھورے بیلا | علی الصباح |
| بار | وار - دن |
| شوم بار | سوموار |
| مونگل بار | منگل |
| بدھ بار | = |
| برھپتی بار | جمعرات |
| شکر بار | جمعہ |
| بورشا | موسم برشکال |
| بوشونتو | بسنت - بہار |
| بیلا | وقت |
| بوچھر | برس |
| پرشون | پرسوں |
| تاریکھہ | تاریخ |
| دن | = - = |
| دوپہر | دوپہر |
| روج | روز |

| باںگالی | اردو |
| --- | --- |
| رتو | رت - موسم |
| رات - راتری | رات |
| شانجھہ | سانجھہ - شام |
| شرو | شروع |
| کال | کل |
| گھونٹا | گھنٹہ |
| ماش | ماہ - مہینہ |
| بوئے شاکھہ | بیساکھہ |
| اشارہ | اسارہ |
| سرابون | ساون |
| بھادر | بھادوں |
| کارتک | کاتک |
| اُگھرن | اگھن |
| پش | پوس |
| ماگھہ | ماگھہ |
| ھوپتہ | ھفتہ |

## شہر اور دیہات

| | |
| --- | --- |
| اڈا | اڈا (گاڑیوں کا) |
| آنگن | آنگن |
| بے ڑا | باڑا (مویشوں کا) |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| باجر - ہاٹ | بازار ہاٹ |
| پل | |
| تھانہ | |
| جونگل | جنگل |
| جیل کھانہ | جیل خانہ |
| دیش - پرگنہ | دیہات |
| دوکن | دوکان |
| ڈاک گھور | ڈاک گھر |
| ڈاک بنگلہ | = |
| ڈاکٹر کھانہ | دوا خانہ |
| رستہ - شوڑک | رستہ - سڑک |
| شوہور - نوگور | شہر - نگر |
| کھیت | = |
| کھیت باڑی - گولا باڑی | کھیت |
| کٹیر | کٹی - چھونپڑی |
| کول | کل - کار خانہ |
| کار کھانہ | |
| گرجا | |
| گور استھان | گورستان |
| گور - کوبور | گور - قبر |
| گرام | گاؤں |



| بنگالی | اردو |
|---|---|
| گھاٹ | = |
| گولی | گلی |
| موڑ | چوراھا |
| موشجد | مسجد |
| موکتب - مودرشہ | مکتب مدرسہ |
| موندر | مندر |

## رشتے ناتے

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| استری | عورت |
| بابا - پتا | باپ |
| بالک | بچہ |
| بور | بر - دولھا |
| بیاھو | بیاہ |
| بون | بہن |
| ۱ بوڑو بھائی | بڑا بھائی |
| ۲ میجو " | منجھلا " |
| ۳ شیجو " | سنجھلا " |
| ۴ نوتن " | (نیا) " |
| ۵ پھول " | (پھول) " |
| ۶ چھوٹو " | سب سے چھوٹا " |
| دادا (بھائی) | بھائی (جو کوئی اپنے سے بزرگ ھو) |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| پکرو | بیٹا - بچہ |
| جونٹھا | جونٹھے |
| چھوکرا | لڑکا |
| دیور - دیہور | دیور |
| دوھتا | دختر |
| دی دی | بڑی بہن |
| شالا | سالہ |
| شامی | سوامی - شوہر |
| شالیج | سرھج |
| شالی | سالی |
| شوشر | سسر |
| ششری | ساس |
| کاکی | چچی |
| کماری | کنواری |
| ماشی | موسی - خالہ |
| مامی | ممانی |
| منش | آدمی |
| ماماتا | ماں - ماتا |
| ماما | ماموں |
| نون دئی | نندوئی |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| ناتی | ناتی - نواسہ |
| نونود | نند |

## اعضائے جسم انسانی

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| آنگل | ا پور |
| انگشتھو | انگوٹھا |
| باھو - ھات | بانہہ - ھاتھہ |
| بوگول | بغل |
| بھرو | ابرو |
| پیلا | تلی |
| پیٹ | |
| پیٹھہ | |
| پا | پاوں - ٹانگ |
| تھن تی | ٹھڈی |
| ٹھونٹ | ھونٹ |
| جیب | جیبھہ - زبان |
| چھاتی | ... ... |
| چوربی | چربی |
| چمرا | کھال - جلد |
| دیھو | دیلھہ - بدن |
| دانت | ... ... |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| روان | بال (علاوہ سر کے) |
| کان | |
| کلے جا | (کلیجہ) بمعنی دل |
| کاندہ | کاندھا - کندھا |
| کوبجی | تبضہ - کلائی |
| گال | |
| گورو | گورا (رنگ) |
| گلا | گلا |
| ماتھا | سر |
| موگوج | مغز سر |
| مکھہ | منہ |
| ناک | ... ... |
| نوکھہ | ناخن |
| اھار | ھڈی |
| ھات | ھاتھہ |

## امراض ادویہ وغیرہ

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| آون دھو | اندھا |
| آرام کورا | صحت دنیا |
| آنتو ھوتے | اتماھتیا (خودکشی) |
| بپود | بپت - مصیبت |



| بنگالی | اردو |
|---|---|
| بود ہجم | بد ہضمی |
| لش | بس - زہر |
| بو شونتو | ( لہسلنت ) چیچک |
| پھولا | آماس - سوجن |
| پھوتکری | پھٹکری |
| پوتی | پٹی |
| پوش دی | ( تصدیع ) تکان |
| تھنڈا - شوردی | تھنڈک - سردی |
| جولونی | جلن |
| جوکھان | ( زکام ) - دق |
| دائی | ... ... |
| داگ | داغ |
| روگ - روگی | |
| شرو پیرا | سر کا درد |
| شوردی گورمی | ( سردی گرمی ) لون لگنا |
| کاشی | کھانسی |
| کوش رت | کسرت - ورزش |
| کوبی راج | کویراج - ( وید ) |
| کملا | کنول - یرقان |
| کرمی | کرم - کیڑا |
| کانا | ... ... |



| بنگالی | اردو |
|---|---|
| کوپ پر | کافور |
| مہاماری | ( وبا ) |
| مولوم | مرهم |
| مچکانو | موچ |
| هلپلی | دمہ - ضیق النفس |

## اشیائے خورد نوش

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اچار | |
| آٹا | |
| برفی | |
| بوروف | برف |
| بھاجا | بھنا هوا |
| پونر | پنیر |
| پھلیر مربا | مربہ |
| تیل | |
| تورکاری | ترکاری |
| چپاتی | |
| چٹنی | چٹنی |
| دودھ | |
| دوئي | دهی |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| رتی | روتی |
| شوجی | سوجی - روا |
| شورلوت | شربت |
| شرکا | سرکہ |
| کورمہ - کلیا | قورمہ - قلیا |
| کھابر | کھانا - غذا |
| کھچڑی | |
| کاباب | کباب |
| کھیر | پکا ہوا دودھ |
| گڑ | |
| لچی | لچوئی - پوری |
| ماکھون | مکھن |
| ماچھہ | مچھلی |
| مورچ | مرچ |
| موہن بھوگ | (حلوہ) |
| موشلا | لہ |
| متھائی | |
| مود | مدھ - شراب |
| نون - لون | نون - نمک |
| ہاجری | حاضری - ناشتہ |

# مکان اور اسباب خانہ داری

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| آرام کرسی | |
| الماری | |
| آئے نا - آرشی | آئینہ - آرسی |
| برانڈا | بر آمدہ |
| بابرچی کھانا | باورچی خانہ |
| بلش | بالش - تکیہ |
| باشن | Basin باسن - برتن |
| بھنڈار | نعمت خانہ |
| بکشو | بکس |
| بتی | بتی - لمپ |
| بتی دان | شمعدان |
| بالش - گودی - | ( بالش ) گدی |
| پائے کھانا | پیخانہ |
| پیالہ | |
| پوردہ | پردہ |
| پکھا | پنکھا |
| تالا - کلپ | تالا - قفل |
| تھالا | تھالی |
| توا | |



| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| ٹکری | ٹوکری |
| جلا | جلگلہ ( کھڑکی ) |
| جھلملی | |
| چادان | چاء دان |
| چابی | |
| چمٹا | |
| چھاتا - چھاتی | چھاتا - چھتری |
| چابک | |
| چھت | |
| چھوبی | شبیہ ( تصویر ) |
| چھری | |
| چلی | چولھا |
| دیا شولائی | دیاسلائی |
| دالان | دالان ( Hall ) |
| دیال | دیوار |
| دوات | |
| دراج | دراز |
| ڈولا | ھنڈولا |
| ڈوری | |
| ڈھکنی | |
| رکابی | رکابی |
| شنان | اشنان - غسل |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| شورائی | صراحی |
| شیلڑی | سیڑھی |
| کمرہ | |
| کوئلہ | |
| کافی دان | |
| کانٹا | Fork |
| کالی | روشنائی - سیاھی |
| کیتلی | |
| کاگوج | کاغذ |
| کولوم | قلم |
| کلیچا | قالیچہ |
| گھوڑی | گھڑی |
| گھور - | کمرہ ( گھر ) |
| گوشول کھانا | غسل خانہ |
| لون تھون | لال ٹین |
| لفافا | لفافہ |
| میج | میز |
| موشوک | مشک ( بہشتی کی ) |

## لباس و زیور وغیرہ

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اوس تور | استر |



| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| آنگٹی | انگوٹھی |
| اوڑنا | نقاب |
| بوٹ جوتا | بوٹ |
| بوگ لش | بغلس - بکسوا |
| بونٹ | بانات |
| برش | برش |
| بوتام | |
| بورشاتی جاما | برساتی - باران کوٹ |
| بچھانا | بچھونا |
| پاجامہ | |
| پھیٹہ | فیتہ |
| پوشوم | پشم - اون |
| پوشاک | لباس |
| جاما یا پنجابی | کرتہ |
| جوتا | |
| جھپ | |
| جھالور | جھالر |
| چادر | چادر |
| چول - چولی | = |
| چوڑی - بالا | چوڑی |
| چھوڑی | چھڑی |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| دوستانا | دستانہ |
| رے شوم | ریشم |
| شال | شال |
| شابن | صابون |
| شتی | سوتی |
| کاچ - گہور | (بٹن کا) کاج |
| کرتا | = |
| کوٹ | = |
| کالر | = |
| کرم بل | کمبل |
| کنکن | کنگن |
| کلکھاب | کمخواب |
| کانچی | تہمچی |
| کمیج | قمیص |
| کھوڑوم | کھڑاؤں |
| کاپڑ | کپڑا |
| گھاگرا - شایا | سایا (انگریزی) |
| گوھونا | گہنا |
| گولا بوندھو | گلوبند |
| لاٹھی | = |
| ماجن | منجن |

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| موجہ | مورہ |
| موکہہ مل | مخمل |
| مول مول | ململ |
| نمدہ | = |
| ھار | = |

## پیشے

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| اُکیل | وکیل |
| اُمیدار | امیدوار |
| بھاٹ | بھاٹ - گویا |
| بابرچی | باورچی |
| باجی گور | بازی گر |
| پہرا والا | پولیس مین |
| پھول والا | پھل والا |
| پھول والا | پھول والا |
| پادری | = |
| جوتشی | = |
| جوھری | = |
| جریب کرتا - امین | پیمائش کرنے والا امین |
| چاکور | چاکر - نوکر |
| چھاپا کھانا والا | طابع |

| بنگالی | اردو |
| --- | --- |
| چترو کار | ر |
| دورجی | درزی |
| دھوبا - دھوبی | |
| چوکیدار | |
| دوروان | دربان |
| دوکن دار | دکاندار |
| دائی | = |
| دو بھاشی | ترجمان |
| دلال | دلال |
| ڈاک پیادہ | ہرکارہ |
| ڈھولی | ڈھولچی |
| روپوکار | مصور |
| رونگ ریج | رنگریز |
| سپائی | سپاہی |
| شوھس | سائیس |
| کاری گور | کاریگر |
| کل وت | کلانوت - گویا |
| کوبی | کوی - شاعر |
| کمار | کمہار |
| کرشان - چاشی | کسان - کاشتکار |

از چاشت بمعنی کاشت

| بنگالی | اردو |
|---|---|
| کوشیء | قصائی |
| کھلاشی جوھاجی | خلاصی - جہازی قلی |
| گرنتھوکار | مصنف |
| گوالہ | = |
| نال بوند | نعل بند |
| نائب | ایجنٹ |
| نوٹ | نٹ - اکٹر - اداکار |
| نٹی | نٹنی - اکٹرس |
| موجور | مزدور |
| میش پالک | گڈریہ |
| موچی | = |
| موھاجون | مہاجن |
| مُدی | مودی بنیا |
| ھلوئی کار | حلوائی |

## متفرق الفاظ

ذیل میں متفرق بنگالی الفاظ کی فہرست درج ہے - اور جہاں جہاں ضرورت سمجھی گئی ہے ان کا صحیح اردو تلفظ یا ترجمہ قوسین کے اندر دے دیا گیا ہے - تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو - بنگالی الفاظ کے

تلفظ میں صحت کی بہت زیادہ پابندی نہیں ہو سکی اس لیے کہ اعراب کے استعمال کرنے میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو ان الفاظ کے سننے میں ہو سکتی ہے —

## الف

آپ واس (فاقہ روزہ)
آبکاری
آپ نی (آپ)
آتما (روح)
آئین (قانون)
آئین انوسار (حسب قانون)
آشا (امید)
آسامی (ملزم)
اختیار
اقرار
آدم شماری
آمدنی (آنے والا مال Import)
آمدنی (معمولی معنی)
آنند
اللہ - ایشور
آواز کرنا (گولی چلانا)
اوتار
ایک جن (ایک شخص)
ایک ٹا (ایک ٹھو - ایک تا - بمعنی ذرا یا کچھ
احمق
اناڑی
انصاف
اجلاس
اظہار (بیان عدالت)
اندھار (اندھیرا)
اونچا
الگ

## ب

باقی - ہاتھہ جمع (میزان)
بازار
بڑا
باجنا (گانا)
بچار (خیال)

بے قصور خلاص (ملزم کا صاف بری ہونا)
بحث
برخواست
بدھی (عقل ضمیر - وجدان)
بکری (فروخت)
بدیشی
بے جوڑ (فرد واحد) جوڑا (دو)
بھیک
بھاڑا
بھاڑا گاڑی
بندوبست
بندر (بندرگاہ)
بشواش (یقین)
بیمہ
بندوق
بھاؤ (جذبہ)
بھول (غلطی)
بھوکا
بھاری
بھلا
بھیانک
بھیجا (بھیکا)

بے آئین (غیر قانونی)
بلام
بوھو (بہت)
بوڑھا
بیشی (زیادہ)
بہانہ (بہانہ)

پ

پاپ
پرانا
پورا
پال (بادبان)
پوتر
پریک (پریگ - کیل - میخ)
پریم
پرارتھنا (عرض - گزارش - دعا)
پھانسی
پیکاری (تھوک Wholesale)
پکا
پیش کار

ت

تاریخ

ٹ ر
تازہ
تپتا ( گرم )
تمادی ( قانون )

ٹھیکہ کاری
ٹھکانا ( پتہ )
ٹھلتا

ج

جائداد ( سرمایہ )
جال
جہاز
جرح ( قانونی )
جمع بندی تشخیص لگان
جبر دستی ادائی ( استحصال بالجبر )
جرمانہ ( جرمانہ )
جمع
جنس ( شے - قسم )
جوتی ( روشنی )
جوگی

جواری
جواب
جے کہو ( جو کوی )
جے ( جو )
جھوٹ
جیون ( زندگی )
جعلیت ( جعلساز )

چ

چارا ( شکار ماھی کے لیے )
چاتو
چورا
چوٹ پٹے ( جھٹ پٹ )
چورس ( پوربی میں ھموار زمین
بنگالی میں مربع زمین )
چکر لگنا ( چکر آنا )
چلتی
چلتا ( فکر - خیال )
چھوترہ ( چھرہ کارتوس کا )
چالانی ( جانے والا مال )
چھری
چھڑی

ح = (ہ)

حساب

حساب چکانا

حفاظت

حاجت ( حوالات )

حاکم ( جج )

حق - دابی

حصہ

خ ( = کھ )

خدا

خبر

خرچ

خرچہ بعد ( خرچہ چھوڑنے کے بعد )

خرید

خریدار

خالی

خاص ( خانگی - Private )

خانساماں

خدمتگار

خون ( قتل )

خلاص ( مقدمے سے بری ہونا - ختم ہونا - آزاد ہونا )

خسارت ( خسارہ )

خزانہ ( مالگزاری - ٹکس )

خوشی

دام

دان ( خیرات )

دابی ( دعویٰ - حق )

دائرہ سپرد ( عدالت سشن سپرد کرنا )

دھار ( اُدھار )

دستوری

دیوانی عدالت

دیوتا ( فرشتہ )

دیا ( کرم - عنایت )

دور

دیندار ( قرضدار )

دیوالہ

دلیل ( دستاویز )

دستخط کرنا - صحیح کرنا ( دستخط کرنا

دو نالہ (دو نالی بندوق )

دنگا

دھرم
دشت (پاجی - شریر)
درکار (ضرورت)
درکاری (ضروری)
دردر (دلدر - غریب - مفلس)
دھرمی (دین دار)
دفتر
دکھ
درخوا

ڈانٹر (چپو)
ڈورا - ڈوری (موٹی رسی)

ر

راس (لگام)
ریتانی (باہر جانے والا مال - رفتنی)
Export.
رشی
رسید
رس (جذبہ)
رد کرنا
رقم (طرح - مانند - قسم)
رجوع کرنا - پیش کرنا (عدالت میں مقدمہ داخل کرنا)
روگی (بیمار)

ز

زخم (زخمی)

س

سامنے
سب
سب کچھو (سب کچھ)
سستا
سہیتا
ست (حق)
سادھو - سنت
سبالک (بالغ)
سربراھکار (ایجنٹ)
سوجا (سیدھا)
سہج (آسان)
سود
سیوا
سہائتا (مدد)
سورگ

سندر

سہاگہ چوڑی

## ش

شکار

شکاری

شکتی : رسپ ؟ !)

شکتہ

شیطان

شریک

شرط ( اقرار )

شناخت

کپتان - سارنگ

کچہری

کبتا ( شاعری )

کاربار

کارخانہ - کل

کارتوج ( کارتوس )

کٹھن

کرپا

اکوا

کرکس ( سرکش )

کرتا ( مہلیچر )

کھچرا ( خوردہ فروشی )

کوچوان

کوڑی ( ۲۰ عدد )

کیٹو ( کوئی )

کیو نہ کیو ( کوئی نہ کوئی )

کچھو ( کچھہ )

کی ( کیا - پنجابی بھی یہی ہے )

کے ( کون )

گھاٹ

گھائل

گھوڑا

گھن

گودام

گولی

گول

گوئندہ ( جاسوس )

گرم

گرفتاری پروانہ ( وارنٹ )
گھان
گنت ودیا ( حساب )
گرفتار
گھٹی ( گومت )
گھنا ( موٹا )

مان ( عزت )
مارپیٹ
مرن ( موت )
مورتی ( بت )
موٹا
میلا
میٹھا

لمبا
لابھہ ( نفع )
لنگر
لگام
لون دین

ن

ناستک ( ملحد )
ناٹک
نہا ( نوا = نیا )
نہالک ( نابالغ )

م

مال ( پونجی - سرمایہ )
مانجی

ہ

ھلپھہ ( حلف )
ھلکا -

## بنگالی پر اردو کے اثرات کے اسباب

بنگالی زبان پر اردو ، ھندی اور دیگر شمالی مغربی زبانوں
کے اثرات کے کئی اسباب ھیں -

( ۱ ) تیرتھہ یاترا — شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بنگال کے لاکھوں جاتریوں نے اُن مقدس زیارت گاھوں اور تیرتھہ استھانوں سے

بہت کچھہ "ھندوستانی" تمدن اور زبان حاصل کیا جو شمالی و شمال مغربی ھندوستان میں واقع ھیں - کاشی و پریاگ (بنارس و الہ آباد) میں اب بھی ہر سال کئی کئی دفعہ لاکھوں ھندوؤں کا مجمع ھوتا ھے اور مقدس گنگ وجمن کی ھم آھنگی سے جو وحدت وجود کا سبق الہ آباد کے سنگم سے ملتا ھے وہ اپنے ساتھہ زبان ' تمدن اور رسم و رواج کی ھندو مسلم یکتانگت کو مشرق سے مغرب تک اُستوار بنا دیتا ھے - سیکڑوں الفاظ اور محاورے یہاں سے جاتریوں کے ساتھہ ساتھہ ملکوں ملکوں پھیل جاتے ھیں - اور خود بخود ایک مشترک زبان جسے ریختہ یا اردو کہہ سکتے ھیں تیار ھوتی رھتی ھے - بنارس اور الہ آباد میں تو اب بنگالیوں کی مستقل آبادیاں قائم ھوگئی ھیں اور روز بروز بڑھتی جاتی ھیں - یہی حال برندرابن کا ھے ' جہاں کے آٹھہ ٹھاکروں میں سے سات ٹھاکر بنگالی ھیں اور سب اردو بولتے ھیں - اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ھے کہ چیتن دیو پندرھویں صدی میں برندرابن گئے تھے اور چونکہ وہ صاحب کشف وکرامات تھے لہذا اُنھوں نے مٹے ھوئے آثار اور مقدس استھانوں کو اپنی بصیرت سے معلوم کیا اورعوام کو بتایا - نتیجہ یہ ھوا کہ اب وھاں بارہ ھزار بنگالی آباد ھیں اور لاکھوں ھر سال آتے جاتے رھتے ھیں - چیتن دیو کرشن کے اوتار مانے جاتے ھیں - اس طرح وشنو کے پرستاروں نے جتنی کتابیں لکھیں وہ سب "برج بولی" میں لکھیں اور اب تک یہی "برج بولی" بنگال میں گھر گھر پڑھی اور سمجھی جاتی ھے - یہ بولی در حقیقت برج بھاشا ھے جو بنگالی مصنفوں کی زبان سے ادا ھوکر کسی قدر بنگالی آمیز ھوگئی ھے - اور بنگال میں اسے "برج بولی" کہتے ھیں - اسی طرح بندرابن کے بنگالی اور غیر بنگالی شاعروں نے جو

گانے برج بولی میں تصنیف کیے وہ بھی بنگال میں رائج ھیں - اور " برج بولی " کے ذریعہ سے اردو کی ترقی کا باعث ہوتے ھیں —

اسی سلسلے میں ودیاپتی شاعر کا ذکر ضروری ھے - یہ چودھویں صدی مسیحی کا شاعر تھا - اُس کی تصنیفات میتھلی یعنی بہاری بولی میں موجود ھیں - بنگال میں اس کا کلام بہت مقبول ھوا حتیٰ کہ وہ بنگال کا شاعر مانا جاتا ھے - اور عام طور سے اس کی شاعری ہر شخص سمجھہ لیتا ھے اور داد دیتا ھے - آج کل " ودیاپتی " نامی ایک فلمی کہانی بھی بن گئی ھے اور سینماؤں میں چل رہی ھے —

ملک محمد جائسی کی پدماوت اتنی مقبول عام ہوئی کہ رائے بریلی (اودھ) کے ایک قصبے کے شاعر کا کلام سو سال کے اندر اندر سولھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان میں ترجمہ ھوگیا - اس کا باعث بھی ایک مسلمان راجہ مانگن ٹھاکر والئی اراکان و آسام ھوا - اور ترجمہ کرنے والا بھی بنگال کا مشہور مسلمان شاعر علاؤل شیخ تھا - اگرچہ یہ ترجمہ سنسکرت آمیز بنگالی میں ھے لیکن بہت سی فارسی کی اصطلاحات تصوف بھی اس کے ذریعہ سے بنگالی میں داخل ھوگئی ھیں —

بنگال میں نابھا داس ھندی شاعر کی تصنیف موسومۂ " بھگت مال " بھی ترجمہ کی گئی اور ھندی زبان سے بنگالی کا رشتہ قائم کرنے میں مفید ثابت ہوئی - یہ شاعر تلسی داس کا ھمعصر تھا - یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ھے کہ تلسی داس اور میرا بائی کے ھندی گانے اب تک بنگال میں مقبول ھیں اور عام طور سے گائے جاتے ھیں —

سترھویں صدی مسیحی میں شاعر برند کی " ست سئی " ھندی زبان میں ڈھاکہ میں لکھی گئی اور بنگال میں رائج ہوئی - بہار اور ممالک

متحدہ کے مشرقی اضلاع میں اس کتاب کے دوہے بچے بچے کی زبان پر ہیں - اس کے دوہے ایسی ہندی میں ہیں جو بنگالی اور اردو سمجھنے والے دونوں سمجھہ لیتے ہیں - مثلاً :—

سبے سہائے سہل کو کوؤ نہ نہل سہائے

پون جگاوت آگ کو ' دیوک دیت بجھائے

**(۲) دارالسلطنت دہلی سے تعلقات**

بنگالی زبان پر اردو کے اثر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جب تک ہندوستان کی سلطنت کا مرکز دہلی رہا ' اُس وقت تک مسلسل سرکاری اور غیر سرکاری افراد و افواج و تجار کی آمد و رفت برابر قائم رہی - عام قاعدہ ہے کہ رعایا اپنے حکام کے طرز بود و ماند اور تمدن و زبان کو اختیار کرنے یا کم از کم نقل کرنے کی کوشش کرتی ہے - بنگال اس سے مستثنیٰ نہیں تھا - یہاں مرشدآباد ' ڈھاکہ ' عظیم گنج اور دوسرے مرکزوں میں امرا و رؤسا نے نہ صرف دہلی دربار کی نقل اُتاری تھی بلکہ اُس میں کافی کامیابی بھی حاصل کی تھی - دہلی کے اثر سے یہاں کی سرکاری زبان فارسی ہوگئی تھی - اور جو لوگ صوبہ کے دربار یا انتظامات ملکی میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ فارسی سیکھنا فخر سمجھتے تھے - اسی طرح شہنشاہ کے زمانے سے جو فوجی آبادیاں قائم کی گئی تھیں وہاں سب اچھی خاصی اردو بولتے تھے حتیٰ کہ آج تک وہ لوگ اردو بولتے ہیں ' باوجودیکہ کہ اپنے وطن کو چھوڑے ہوئے اُنھیں صدیاں گزر گئیں - اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان کی عورتیں بھی اردو بولتی ہیں اور شاید ان کے ساتھہ ہی یہاں آئی تھیں - شانتی نکیتن سے ۳ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کاشی پور ہے - یہ پٹھانوں کی بستی ہے ' جن کا پیشہ کاشت کاری ہے - میں نے خود جاکر

وہاں دیکھا کہ وہ بنگالی مسلمانوں سے بنگالی زبان میں بات چیت کرتے ہیں - لیکن آپس میں اردو بولتے ہیں اور اُن کی عورتیں اور بچے بھی اردو بولتے ہیں - لیکن ان کے دیہی مدرسہ کا مدرس دوسرے گاؤں کا بنگالی مسلمان ہے اور اردو نہیں بول سکتا - اسی طرح کی بہت سی بستیاں پورے بنگال میں موجود ہیں —

بنگال کے صوبہ داروں کے یہاں کثرت سے ہندوستانی سپتھہ اور شمالی ہندوستان کے رہنے والے سپاہی ور منشی ملازم رہتے تھے - مرشد آباد میں اب تک خالص اردو کے بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں - اور محلہ ضیاء گلنج تو پورا اُن مارواڑیوں سے بھرا ہوا ہے جن کے آباؤ اجداد کلائو کے زمانے سے پہلے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے - نواب مرشد آباد کے یہاں انشاءاللہ خاں کے والد ملازم تھے' اور یہیں یہ پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی —

**۳ - تجارت**

تجارت کے سلسلے میں علاوہ مارواڑیوں کے' دوسری قومیں بھی برابر آمد و رفت رکھتی تھیں - خود بنگال میں کپڑے اور ریشم کی بے مثل مصنوعات نے اتنی ترقی کی تھی کہ انگلستان' فرانس' ہالینڈ وغیرہ تک ان کی رسائی ہوگئی تھی - اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں یہاں سے ڈھاکہ کی ململ' سلکہٹ کی چوڑیاں' سیندور اور دوسری چیزیں بنگالی لے جاتے تھے - بنجاروں اور تاجروں کی آمد و رفت سے اردو کو بہت ترقی ملتی تھی - اور صرف اسی زبان کے ذریعہ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کے رہنے والے سے گفتگو کر سکتا تھا —

۴ - هندوستانی مزدور ار اور ج کل مغربی بنگال میں کثرت سی نظر آتے هیں - اس کی
ممالک متحدہ کے
وجہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کے باشندے فطرتاً کمزور هیں اور جسمانی محنت کے لائق نہیں هیں - کثرت سے مزدوری کرنے والے دوسرے صوبوں کے هیں - جو آدھے منافع میں شریک هوکر یا تو کاشتکاری کرتے هیں یا دوسرے قسم کی مزدوریاں کرتے هیں - ملیریا بخار اور چاول اور تیل کے استعمال نے غریب بنگالی کسانوں کو بہت کمزور کردیا ہے - بہرحال باهر سے آنے والے مزدور سب اردو بولتے هیں اور بنگالی بولنے والوں کو بھی بہت سے الفاظ سکھا جاتے هیں —

## تبدیل معنی

ذیل میں هم چند فارسی الفاظ درج کرتے هیں جن کا تلفظ تو بدل هی گیا ہے لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ اکثر الفاظ ان معنوں میں بولے جاتے هیں جو هم عموماً اردو میں نہیں بولتے - بالکل یہی حال بہت سے فارسی اور عربی الفاظ کا اردو میں هوا ہے - یعنی ان کے اصلی معنی هماری زبان میں کچھہ سے کچھہ هوگئے هیں - اور اگر وہ خالص لغوی معنوں میں استعمال کیے جائیں تو محاورہ کے خلاف معلوم هوتے هیں - بنگالی زبان میں اردو کے بعض حروف تہجی نہیں هیں - اس لیے ان کی جگہ جو حروف مستعمل هیں وہ یہ هیں - ث - س - ص کے لیے شین استعمال هوتا ہے - شاذ و نادر سین بھی سننے میں آجاتا ہے - هاے هوز اور حاے حطی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، حالانکہ

اردو میں بھی یہی حال ہے ' لیکن بہرحال لکھنے میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے - جس کی وجہ ہم آواز الفاظ کے معنوں میں آسانی سے تمیز ہوسکتی ہے - ع کے لیے کہ - ( ذ ' ز ' ض ' ظ ) کے لیے جیم ' عین کے لیے الف ' غ کے لیے گ ' ف کے لیے پھ ' قاف کے لیے کاف کا استعمال ہوتا ہے - کبھی کبھی باے عربی کی جگہ باے فارسی ( پ ) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے - مثلاً گلاب کو گلاپ اور جلاب کو جلاپ کہتے ہیں - لیکن اگرچہ سنسکرت کی نقل میں اس زبان کے حروف تہجی میں زاے ہوز داخل نہیں ہے لیکن گفتگو میں اکثر غیر بنگالی الفاظ کی جیم کو " زے" سے اور زے کو جیم سے بدل دیتے ہیں - مثلاً پوست مین بھی حازی محمد ازمل نہیں کہتا ' بلکہ انگریزی پڑھا لکھا ٹائپ نویس بھی ہمیشہ حاجی کو Hazi اور اجمل کو Azmal ٹائپ کرتا ہے اگرچہ اس کے سامنے دونوں لفظوں میں بجاے J کے Z کبھی نہیں لکھا جاتا - بہر حال وہ چند الفاظ جن کے معنی تبدیل ہوگئے اور جو مجھے بہ مشکل دستیاب ہوئے ہیں - درج ذیل ہیں - الفاظ کے سامنے ان کے اصلی معنی لکھہ دیے گئے ہیں -

| بنگالی الفاظ | تبدیل شدہ معنی |
| --- | --- |
| بہار ( باهار ) | حسن |
| بہادر | شاباش |
| برات | حاجت |
| بیگانہ ( بگانہ ) | لا معلوم |
| زیر بار ( جیر بار ) | تھک جانا |
| خالی ( کھالی ) | صرف |
| دادن ( دادون ) | پیشگی دینا |

| بنگالی الفاظ | تبدیل شدہ معنی |
|---|---|
| داخل | پہنچنا |
| دخل ( دکھول ) | علاقہ |
| درکاری | مفید |
| رجوع دینا | مقابلہ کرنا |
| روشنائی | روشنی |
| دلدار | بہادر - دل والا |
| ربط ( ربٹو ) | مشق |
| طبق ( تابوک ) | تہ |
| فرمائش ( پھر ماچ ) | حکم |
| گوشہ | غصہ |
| کشتی | قسط |
| گھیرے | گرہ |
| مطلب ( مطلوب ) | نقشہ |
| مقابلہ ( مکابلا ) | ملاقات |
| هنگام ( هنگامہ ) | فساد |
| ناراض ( ناراج ) | انکاری (جو کسی کام کے کرنے پر راضی نہ ہو) |

## فارسی الفاظ

ذیل میں وہ فارسی الفاظ درج کیے جاتے ہیں جو بنگالی زبان میں اب تک رائج ہیں - اور تھوڑے سے اختلاف تلفظ کے بعد ہر وہ شخص جو ہندوستانی ہے انہیں سمجھہ سکتا ہے - بنگالیوں میں ان الفاظ کو

جو لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ ہیں - بلکہ بعض الفاظ تو اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ اچھی خاصی فارسی جاننے والے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا ماخذ فارسی تھا اور اب یہ بنگالی ہو گئے ہیں - مثلاً چھوبی اصل میں شبیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور تصویر کے لیے استعمال ہوتا ہے - اس قسم کی مثالیں پہلے لکھی جا چکی ہیں - اب صرف فارسی الفاظ، فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں - بنگالی میں ز، ذ، ض، ظ کے لیے صرف ز یا ج کا استعمال کیا جاتا ہے - اسی طرح غ کے لیے گ، ق کے لیے ک، ث، ص، س کے لیے س رائج ہے:

## الف

اُستاد - آئینہ - آستین - آسامی - آتشبازی - افیون - آسان - اسباب - آبنوس - اِزار - آرام - اکثر - آب ہوا - آخر - آفت - اگر - اشتہار - ادا - امیر - امرا - اصول - آواز - انجام - الجتہ - اردو - آسمان - الائچی - امین - اطلاع - آبخورہ - آبادی - ابر - آبلہ - اثر - اجیر - احمق - احوال - اخبار - آفتہ - اختیار - آنکس - اذان - ارضی - استر - آستان - استعفی - استعمال - آشنا - اصیل - اظہار - افسوس - آلو بخارا - الوان - الہی - آمادہ - آمدنی - انتظار - انتظام - انتقال - انصاف - انعام - اولاد - ایمان - آتشی - اجارہ - اجلاس - افطار - امام - امروز - آبادی - اعتبار - آئندہ - آشوب - آشنائی - اوقات -

## ب

باطل - باغ - برداشت - بک بک - بے وقوف - بوتام - بندوق - باورچی -

بھشی - بخشی - بالش - بازو بند - باقی - باد - بخشش - بندگی - بغل -
بغچہ - برج - برات - بابت - بارود - بندہ - بہشتی - بلا - بانات - بادام
بارہا - بز - بند و بست - بستہ - بیشتر - برخواست - برقنداز - بارگاہ - بازی
باشندہ - باغبان - بافتہ - بالکل - بانگ - بچہ -

## پ

پیالہ - پیادہ - پاپوش - پلنگ - پشم - پانچہ - پرگنہ - پیغمبر - پیچ -
پروانہ - پلاؤ - پیل خانہ - پادشاہ - پرواز - پیاز - پنیر - پوش - پوشاک
پیشاب - پری - پا - پیرہن -

## ت

تعلق - تمادی - تحصیل - توپچی - تفاوت - تصویر - تعویذ - تدارک
اریخ - تلوار - توپ - تفنگ - تختہ - تنخواہ - تقاضا - تدبیر - ترکیب
تازہ - تکمہ - تیر - تاج - توشک - تنور - توقع - ترکاری - تخت پوش -
تار - تعجب - تائید - ترازو - تفسیر - تنگ - تعلیم - تا -

## ج

جور - جمع - جریب - جرح - جامہ - جوان - جیب - جان -
جنس - جوش - جگر - جدا - جواب - جائکہ - جادوگری - جانور -
جاگیر - جلوس - جعل - جبہ - جلدی -

## چ

چشمہ - چغلی - چغہ - چراغ - چربی - چہرہ - چلم -
چرخہ - چاکر - چست - چابک - چالاک -

## ح

حاضر - حضور - حرامی - حرامزادہ - حساب - حال - حکم -
حاشیہ - حور - حدیث - حکمت - حاجت - حد - حجام -
حق - حاصل - حیا - حلا - حلوہ -

## خ

خام خیالی - خوشبو - خوبصورت - خاکی - خاک - خاص - خراب -
خریدار - خون - خوب - خالی - خام - خوش نویس - خطاب -
خبر - خوشی - خبر - - خیال - خرگوش - خانگی - خیرات -
خدا - خاطر - خط - خزانہ - خود - خوانچہ - خوار - خواب گاہ -
خواجہ - خیرخواہ - خستہ - خواہ مخواہ - خواہش - خزانچی -
خرچ - خنجر - خارج - خدمت - خلیفہ - خانساماں - خضر - خبردار -
خیانت - خشکی —

## د

دوات - دلخوش - دروازہ - دار - دنیا - دماغ - دلیل -
دستاویز - دائر - دیوار - دم - دعوی - دکان - دق - دواخانہ -
دستور - دام - دیوان - دیو - دربان - درگاہ - درخواست - دیوانہ -
درکار - دیگ - دیگچی - دجال - دفعہ - داغ - دین - دراز -
دارو - دوربین - - دغاباز - درد - دولت - دشمن - دور —

## ذ

## ر

رنگ - رجوع - راہ - رکاب - رومال - رسد - ردی - روشنائی - روزگار - رگ - رفو - رعیت —

## ز

زین - زبان - زمین - زمیندار - زری - زنجیر - زیرہ - زعفران - زراعت - زنانہ —

## س

سبز - سپرد - سپید - سوال - سزا - سود - سرکار - ستار - سادہ - سرہنگ - سخت - سراغ - سیر - سن - سرشتہ دار - سردار - سرمہ - ساز - سرخی - سوداگر —

## ش

شرم - شال - شہنائی - شرط - شیخ - شناخت - شائستہ - شمعدان - شیشہ —

## ص

صبر - صدر - صف - صرف - صراف - صوبہ - صندوق - صیقل - صحیح —

## ض

ضبط - ضد - ضامن - ضلع - ضرور - ضروری —

## ط

طاق - طاؤس - طبق - طبلہ - طلاق - طاقت —

## ظ

ظلم —

عرض - عرضی - عرق - عزت - عدالت - عمارت - عطر - عهد - علیحدہ -

## غ

غل - غلط - غلام - غازی - غسل - غزل - غصہ - غالیچہ - غیبی —

## ف

فاضل - فتیلہ - فرق - فرش - فرد - فریادی - فراری - فرار -
فکر - فوارہ - فیصلہ - فیروزہ - فیتہ - فوجداری عدالت -
فرمائش (پھرماچ) —

## ق

قتل - قلم - قبضہ - قبضی - قدم - قلمدان - قلب - قفل -
قلندر - قواعد - قورمہ - قید - قیلچی - قصور - قاعدہ - قانونگو -
قائم (صحیح) - قرق - قسط (کشطی) —

گرہ - گردن - گریبان - گرد - گرفتار گرم - گرمی - گز
گزران - گلاب - گم - گناہ - گور - گورستان گوش مالی - گواہ

لگام - لاجورد -

م

منشی - مالک - مکان - مقام - مشق - مغز - ملک - مصالہ - مرد - مزہ - میدان - مشکل - موزہ - مجلس - معنی - مشغول - مسطول - محصول - مختار - موضع - مسودہ - معمولی - مست - ماہ - مطلب - مصاحب - مسجد - موت - معرفت - مفت - مضبوط - مدد - میوہ - موافق - مشعلچی - منصب - مہلت - موسم - مسافر - معاف - ملتوی - معاملہ - مقدمہ - منظور - محل - مقابلہ - مرضی - مع -

ن

نقل - نرخ - نائب - ناظر - ناخن - نالہ - نالش - ناخدا - ناشپاتی - نابالغ - نام - نقد - نقشہ - نزدیک - نہر - نشہ - نشہ خور - نواب - نواب زادہ - نظیر - ناقص - نرخ - نقد - نیلام - نقل نویس - ناراض - نشان (جھنڈا) - نقصان - نمونہ - نشانہ - نرم -

واپس - وکیل - وکالت - وزن - وقت - وجوہات - ولایت -

ہ

ہمیشہ - ہوبہو - ہوا - ہضم - ہنگام (بمعنی ہنگامہ)

ی

یار - یخنی —

# بنگالی مثلیں اور کہاوتیں

المثل فی الکلام ' کالملح فی الطعام

مثلیں اور کہاوتیں اُس وقت بنتی ھیں جب زبان اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے - اکثر تاریخی استعارے ' بہت سے فطری مشاھدے ' لا تعداد روزمرہ کے تجربے خاص معنوں میں استعمال ہونے لگتے ھیں - اگر ان کہاوتوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں لغوی ترجمہ کیا جائے تو خاک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے - اسی لیے یہ نتیجہ یقیناً صحیح ہے کہ ہر ایک زبان اپنے مخصوص محاورات رکھتی ہے اور ضرب الامثال کی بنا پر ہم ایک زبان کو دوسری سے تمیز کرسکتے ھیں - بنگالی میں جو کہاوتیں استعمال ہوتی ھیں وہ تقریباً سب اردو زبان سے مستعار لی گئی ھیں - بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ بنگالی زبان میں لہجے کے اختلاف سے قطع نظر کرنے کے بعد جو چیز بنگالی اور ہندوستانی زبانوں میں مشترک ہے وہ اردو کہلانے جانے کی مستحق ہے - ذیل میں چند بنگالی کہاوتیں درج کی جاتی ھیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ بنگالی زبان اردو سے کس قدر قریب ہے - یہ مثلیں مسٹر اس - سی - مترا کی بنگالی لغت موسومۂ " شرول * بانگلا ابھیدان " کے چھٹے باب سے لی گئی ھیں - یہ باب تمامتر " شلوک بولی " یا کہاوتوں پر مشتمل ہے - اور اس میں پندرہ بیس ہزار کہاوتیں ھیں —

۱ - تمی پھیرو ڈالے آمی پھری پاتے پاتے - یعنی تم ڈال ڈال

* See. Subal Chandra Mitra's : The Studets Bengali Dictionary, New Bengal Press, 66 - 67 College Street Calcutta, 6th. Chapter page 1419.

هم پات پات —

۲ - اجگرے داتا رام - یعنی اجگر کا داتا رام

۳ - آدھک سنیاسی تے گاجن نشت - ترجمہ : بہت سے فقیروں سے خانقاہ برباد ہو جاتی ہے - اردو میں کہا جا سکتا ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام —

۴ - سات کھون ماپھہ - یعنی سات خون معاف ہیں —

۵ - کاکے لئے گیلو کان ، کا کیر پیچھونے پیچھونے چھوٹو -

(ترجمہ) کوا لے گیا کان ، کوے کے پیچھے پیچھے دوڑو -

۶ - کاجے کوم ، کھیتے جوم - (ترجمہ) کام کم کرنا ، لیکن کھانا جم کے کھانا - اردو میں اس کہاوت کی هم معنی ایک اور کہاوت ہے یعنی : کھانے میں شیر ، کمانے میں بھیڑ - هندی میں اسی طرح کی کہاوت ہے : رام بھجن میں آلسی ، بھوجن میں هُسیار -

۷ - کارشدھو کیوا مارے ، کھودا جار راجی - یعنی جس سے خدا راضی ہو اس کو کوئی نہیں مار سکتا - کبیر کہتا ہے :-

جا کو راکھے سائیاں مار سکے نا کوئے - بال نہ بانکا کرسکے جو جگ بیری ہوئے -

۸ - اے بھی جائیے گا - یعنی موجودہ حالت بھی باقی نہ رہے گی اور مصیبت راحت سے بدل جائے گی - چنیں نماند و چناں نیز هم نخواهد ماند -

۹ - سب لال هوجاے گا - یہ ضرب المثل قصہ طلب ہے - راجہ رنجیت سنگھہ کا ایک بنگالی کلرک تھا - اس کے پاس ایک هندوستان کا نقشہ تھا جس میں انگریز کمپنی کی حاصل کردہ اراضی کو سرخ رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا - رنجیت سنگھہ نے پوچھا یہ سرخ رنگ کیسا ہے تو منشی نے کہا یہ کمپنی کی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے - اس پر

راجہ نے کہا کہ باقی جگہ جو باقی ہے وہ بھی کچھہ دنوں میں لال ہوجائے گی یعنی کمپنی کا اس پر قبضہ ہوجائے گا۔

۱۰۔ کمیر بر شُنگ باد کُرے' جُل باش کورا
(ترجمہ) مگر کے سنگ بیر کرے' پانی میں رہے
یہ کہاوت "پرند" کی ست سئی سے لی گئی ہے جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اردو کی کہاوت ہے "پانی میں رہنا اور مگر سے بیر"۔

۱۱۔ کھاے نا' دے نا پاپی' سانچوے کُرے۔ تار دھن کھاے چورے اور پورے یعنی کنجوس آدمی نہ خود کھاتا ہے' نہ کسی کو دیتا ہے بلکہ جمع کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت کو چور اور پرایا آدمی کھاتا ہے۔ فارسی مثل ہے:۔ نہ خود خورد نہ بہ کس دہد' گندہ کند بہ سگ دہد۔

۱۲۔ کرج بور بلاے۔ قرض بڑی بلا ہے۔

۱۳۔ آکاش دھول چھوڑے' آپن چوکھے پورے۔ یعنی آسمان پر دھول ڈالنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی آنکھہ میں پڑتی ہے۔ اسی طرح کی کہاوت اردو کی ہے چاند پر خاک ڈالے سے خاک تھوڑے پڑتی ہے—

## بنگالی زبان کا نمونہ

اب تک ہمارا مطالعہ صرف ان اسماء و صفات تک محدود رہا ہے جو اردو اور فارسی سے بنگالی نے مستعار لیے ہیں۔ افعال سے ہم نے اس لیے بحث نہیں کی' کہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔ اور مضمون شاید زیادہ طویل ہوگیا ہے۔ لیکن دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اگر هم رابندر ناتهہ ٹیگور کے مشہور ڈرامے "ڈاک گھر" کے پہلے منظر کے چند جملے اصل زبان میں پڑھیں - ترجمہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ بنگالی کتابیں اگر اردو رسم الخط میں لکھی جائیں تو کس آسانی سے هم ان کا مفہوم سمجھہ سکتے هیں -

۱

| ڈاک گھر | ڈاک خانہ |
| --- | --- |
| ۱ | پہلا ایکٹ |
| ( مادھودت ایر گھر ) | ( مادھودت کا گھر ) |
| مادھب دت : | مادھودت :- |
| مشکلے پوڑے گے چھی ! | ( کتنی ) مشکل پڑ گئی ہے ! |
| جا کھن او چھلا نا ' تا کھن چھولائی | جب تک وہ نہیں تھا ' تب تک تھا هی |
| نا — کونو بھاؤ ناوی چھیلا نا - | نہیں — کوئی فکر هی نہیں تھی- |
| ایکھوں او کوتھا تھیکے ایشے - | اب وہ کہاں سے آ گیا - |
| آمار گھر جوڑے بوشلو - | همارے گھر (پر) قبضہ کیے بیٹھا (ہے) ' |
| او چلے گیلے آمار اے گھر - | اس کے چلے جانے (کے بعد ) همارا یہ گھر |
| جانو آر گھری تھا کبے نا - | گویا پھر گھر هی نہ رہے گا - |
| کبیراج موشائے آپنی کی منے | کبیراج صاحب آپ کیا من (میں) |
| کرین ؟ او کے ... ... ... | کر رہے هیں ؟ اس کو ... ... |
| کبیراج :- أور بھاگے جدی | کبیراج :- اُس کے بھاگوں میں اگر |
| آیو تھاکے ' تا حال دیر گھا | زندگی ہے ' تو دیر تک |
| بانچتیو پارے ؛ کنتو آیور بیدے | زندہ رہے گا ؛ لیکن ایوروید |
| جے رکم لکھہ چھے تاتے تو...... | جس رقم (طرح) لکھتی (ہے) اُس سے تو... |
| مادھب دت :- بولن کی ؟ ! | مادھودت :- کیا کیا ؟ ! |

| | |
|---|---|
| کبیراج :- شاسترے بولچھن ... ... ... | کبیراج :- کتابیں کہتی ہیں... |
| مادھب دت :- ٹھاک، ٹھاک ! | مادھوت :- ٹھہرو - ٹھہرو |
| آپنی آراونی اشلوک گولو آوڑا | آپ اور وہ اشلوک وغیرہ مفید |
| بھن نا — اوتے آرو آمار | نہ ہوں گے۔ اُس سے اور ہمارا |
| بھائے بیڑے جاے - | خوف بڑھ جاے (ہے)- |
| ایکھن کی کرتے ہوبے، شُنی | اب کیا کرنا ہوگا۔ یہی |
| تے بولے دین — | چیز بول دیجیے - |
| کبیراج :- (نس لوئیا) کھوب | کبیراج :- (نسوار لیکر) خوب |
| شبدھانے رکھتے ہوبے - | حفاظت رکھنا ہوگا - |
| مادھب دت :- شے تو ٹھیک کتھا - | مادھودت :- یہ تو ٹھیک بات (ہے). |
| کلتو کی لبھے شبدھان ہوتے ہوبے | لیکن کس طرح حفاظت ہوگی |
| شے ای تے سکھیر کرے جان - | یہی بات صاف کر جائیے : |
| کبیراج :- آمی تو پوہٹی بولے چھی - | کبیراج :- میں تو صاف بول چکا |
| اوکے بالڑے ایک بارے | اس کو باھر ایکبار (یعنی بالکل) |
| جیتے دیتے پار بن نا - | جانے دینا نہیں (چاہیے)- |
| مادھب دت :- چھیلے مانش ! | مادھودت :- بچہ ہے ! |
| اوکے دن رات گھریر مُدھے | اس کو دن رات گھر کے اندر |
| دھرے ریکھا، چے بھاری سکتو | دھرے رکھنا، یہ بھاری سخت (ہے) |

## بنگال میں ترقی اردو کے راستے

صراط مستقیم یا سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ موجودہ حکومت بھی

اُس عہد کی پاسداری کرتی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے دیوانی عدالت کی زبان کے متعلق سلطنت مغلیہ سے ہوا تھا - لیکن زمانہ بدل گیا - انگریزی زبان کی گرفت مضبوط ہو گئی - اور فارسی نہ صرف عدالتوں سے مٹ گئی بلکہ مدارس سے بھی نام نہاد طریقہ پر اردو اور عربی پر زور دیا جاتا ہے - فارسی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا - جہل کی حد یہاں تک پہنچ گئی ہے کی اچھے خاصے پڑھے لکھے ہندوؤں کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ عربی فارسی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں اور جاہلوں کا ذکر ہی کیا' وہ تو عربی فارسی تو کیا اردو کو بھی " نوبی کا جوبن " ( نبی کی زبان ) یعنی مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں - معلوم نہیں کس نبی نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا ــــ

بنگال میں نہ صرف فرقہ پروری کی وبا عام ہے بلکہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کو یہ مغالطہ بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے زیادہ بہتر دماغ رکھتے ہیں - یعنی سوچتے زیادہ ہیں لیکن آب و ہوا کی کمزوری کی بنا پر اپنے نظریات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تحریکوں میں جوش و خروش تو بہت ہوتا ہے لیکن عملی اقدام ہونے تک سرد ہو جاتا ہے ــــ

آج کل کانگرس کی تجویز کے نام پر شہر شہر قصبہ قصبہ "راشٹریہ بھاشا پرچارنی سبھا" کے دفتر قائم ہو رہے ہیں - یہ ہندوستانی زبان پھیلانے والی انجمنیں اس چیز کو بھول گئی ہیں کہ ہندوستانی زبان خود اپنے زاد بوم میں اتنی قدامت پرست اور تنگ نظر نہیں ہے' جتنا بنگالی خادمان ملک نے اسے سنسکرت سے قریب تر لانے میں اپنا نام نہاد فرض ادا کرنا شروع کیا ہے - یہاں " ہندی پرچارنی " سبھائیں بھی

ہیں اور اس جماعت کے لوگ بھی اگرچہ ثقیل ہندی کی تعلیم دے رہے ہیں لیکن اول الذکر جماعت کے مقابلہ میں زیادہ جبری اور سچے معلوم ہوتے ہیں کہ جو کرنا چاہتے ہیں اُس پر محض دکھاوے کے لیے " راشٹری " یا وطنی رنگ نہیں دیتے اور صاف اور سیدھے طریقے سے جس زبان کو وہ ہندی سمجھتے ہیں اُس کی تعلیم دیتے ہیں - اور جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوجاتے ہیں اُنہیں سندیں اور انعامات بھی دیتے ہیں - ہندی زبان کا رسم خط دیوناگری ہوتا ہے اور اس تحریک کی اعانت بنگال کے غیر بنگالی تاجروں یعنی مارواریوں اور گجراتیوں کی طرف سے ہوئی ہے —

اس سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ بنگالی زبان ہندی کے ذریعہ سے اردو کے قریب تر آرہی ہے - اور ہمیں امید ہے کہ جلد ایک عام ملکی زبان جو " راشٹریہ " نہیں ' بلکہ ہندوستانی ہوگی ' بنگال میں رائج ہو جائے گی - بنگالی زبان میں مذکر و مونث میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا - اسی طرح واحد اور جمع کے لیے واحد ہی صیغہ مستعمل ہے - یہی حال جاوی اور ملائی زبانوں کا ہے - اب ہندی کے رواج سے بنگالیوں میں اردو کی یہ دو خصوصیتیں پیدا ہوجائیں گی —

بنگالی اور دیوناگری رسم خط بہت کچھ ملتے جلتے ہیں - لیکن یہاں کے باشندوں میں بنگالیت اتنی غالب ہے کہ وہ اس پر تیار نہیں کہ بنگالی کے بجائے دیوناگری استعمال کرنے لگیں - اِن کا خیال صحیح ہے کہ ہندی لٹریچر سے کہیں زیادہ بنگالی ادب وسیع و عمیق ہے - لیکن میکس ملر ( Max Muller ) نے برہمی کی بجائے اتفاقیہ طور پر دیوناگری کو ویدوں کی کتابت کے لیے تجویز کرلیا - اس حسن یا سوء اتفاق کا یہ نتیجہ

ہے کہ ناگری رسم خط کو ہندو مقدس ماننے لگے ہیں اور پورے ہندوستان پر اسے عاید کرنا چاہتے ہیں —

حامیان اردو کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ملکی یکجہتی اور اردو کی ترقی کے خیال سے ہندی تحریک کی مخالفت نہ کریں - البتہ اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھی خیال رکھیں کہ اردو کی ترقی اردو رسم خط کے ذریعہ سے زیادہ تیزی سے ہوسکتی ہے - دنیا کا کوئی معقول انسان اس رسم خط کی زود نویسی اور اختصار سے انکار نہیں کرسکتا - اور جب کہ کراچی کانگرس نے اقلیتوں تک کے رسم خط کو بطور بنیادی حق کے تسلیم کرلیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اردو رسم خط جو ہندوستان کے ہر صوبہ میں رائج ہے اور دنیا کے ہر حصہ میں پڑھا جاسکتا ہے وہ بنگال میں رائج نہ ہو - اس رسم خط کو زیادہ وسعت دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے مناسب ہوسکتے ہیں —

۱ - محکمۂ تعلیمات بنگال کا فرض ہونا چاہیے کہ ممالک متحدہ کی طرح ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے لیے ایک ہی ( Common ) زبان کا کورس مقرر کرے - اور ہر طالب علم کے لیے ہندی اور اردو دونوں رسوم خط سیکھنا لازمی قرار دیے جائیں —

۲ - ہندی اور اردو جاننے والوں کے لیے عدالت میں یہ سہولت ہونی چاہیے کہ جس رسم خط میں چاہیں درخواست دے سکیں اور نقل لے سکیں —

۳ - عام طور پر سرکاری محکمہ میں نہ صرف اردو اور ہندی میں مراسلت کرنے کی اجازت ہو بلکہ اس کی بھی اجازت ہو کہ جو شخص جو اردو یا ہندی نہیں جانتا بلکہ صرف بنگالی جانتا ہے وہ بھی

اردو یا ہندی رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھوا کر مراسلت کرسکے -

اس آخری تجویز کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوگی جب وہ لوگ جو بنگالی رسم خط نہیں جانتے اور اردو یا ہندی رسم خط جانتے ہیں ان میں سے کسی رسم خط میں بنگالی زبان لکھنے لگیں گے - نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ بنگالی زبان اردو اور ہندی سے بہت قریب ہو جائے گی اور خصوصیت سے وہ پابند مذہب مسلمان جو اپنے بچوں کو قرآن کریم پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں نہایت آسانی سے اردو رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھنے لگیں گے - یعنی جو مشکل اُن بچوں کو بنگالی رسم خط سیکھنے میں ہوتی ہے وہ رفع ہوجائے گی —

اس کے علاوہ ان کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے وہ بنگالی ترجمے جو اب تک بنگالی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں اردو خط میں لکھے جائیں گے - اور عربی متن کے نیچے بنگالی ترجمہ اردو خط میں ہوگا جو زیادہ آسانی سے سمجھہ میں بھی آئے گا اور اردو سے اجنبیت کو بھی دور کردیگا - مجھے یقین ہے کہ اگر صرف ترکیب نماز وحج و زکواۃ اور چند ضروری سورتیں معہ بنگالی ترجمہ کے اس طرح اردو رسم خط میں شائع کردی جائیں تو نہ صرف شائع کنندہ کو مالی فائدہ ہوگا بلکہ مشرقی بنگال میں دس سال کے اندر اندر اردو رائج ہو جائے گی - اس کام کے لیے اگر اُن بنگالی طالب علموں کو جو یو - پی ' بہار اور مختلف ریاستوں میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے چلے جاتے ہیں ' منظم کیا جائے تو غالباً ترقی اردو کا کام زیادہ سرعت سے ہو سکے گا —

# فارسی غزل

از

جناب فضل احمد کریم صاحب، فضلی بی - لٹ (آکسفورڈ) ، آی ۰ سی ایس

## حصہ دوم

## باب اول

فارسی غزل کے ارتقا کی تاریخ حسب ذیل چھہ دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے:-

(۱) ابتدا سے اُس شاعر تک جس نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا یعنی حضرت احمد جام —

(۲) احمد جام سے سعدی تک جب غزل سب سے زیادہ ہر دلعزیز صنف سخن بن گئی —

(۳) سعدی سے حافظ تک جب غزل اپنی معراج کمال کو پہنچی —

(۴) حافظ سے فغانی تک جب غزل میں ایک نئی طرز ظہور پذیر ہوئی۔

(۵) فغانی سے مرزا عبدالقادر بیدل تک —

(۶) نیا دور —

ان ادوار سے بالترتیب بحث کی جائے گی —

### پہلا دور

### خصوصیات

یہ وہ دور ہے جس میں موجودہ فارسی ادب نے جنم لیا۔ اس

دور میں ایرانیوں نے از سر نو اپنی آزادی و خود مختاری حاصل کی؛ دلوں میں ولولے تھے ' سر افتخار بلند ہو رہا تھا - لہذا انھیں اپنی جداگانہ قومی تہذیب و تمدن اور روایات کو زندہ رکھنے اور اپنی مادری زبان یعنی فارسی کو ترقی دینے کی قدرتاً خواہش پیدا ہوی - بادشاہوں اور رئیسوں نے کچھہ سیاسی مصلحت اور کچھہ رجحان طبیعت کی بنا پر اس جذبے کی تربیت اور نشونما کا بار اُٹھایا - اس لیے اس دور میں دو اصناف سخن نے سب سے زیادہ ترقی کی یعنی ایک تو مثنوی جس میں قومی تاریخ و روایات نظم کی گئیں؛ دوسری قصیدہ ' جس میں ممدوح کی شان میں رطب اللسانی کی گئی - غزل پس پشت پڑی رہی مگر اس کا اصل موضوع یعنی عاشقی و مے نوشی متذکرہ بالا ہر دو اصناف سخن اور رباعیات میں ترقی پاتا رہا —

اس دور کے ابتدای زمانوں ہی میں غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ صنف سخن کے موجود پای جاتی ہے - اگرچہ لفظ غزل کا اطلاق عموماً ایسی نظموں پر بھی کیا جاتا ہے جو کسی تُک سے غزل نہیں کہی جاسکتیں تاہم اس زمانے کے قریب قریب ہر شاعر کے کلام میں چند خالص غزلیں پای جاتی ہیں - اس دور کے متوسط زمانے میں (اگر اس سے قبل نہیں تو) مطلع لوزامات غزل میں داخل ہوجاتا ہے - مقطع کا استعمال بھی زیادہ کثرت سے ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ دوسرے دور کے ابتدائی زمانوں میں وہ بھی جز و غزل بن جاتا ہے —

غزل کے لیے مناسب زبان ابھی تک نہیں پیدا ہوئی - کرخت و ثقیل الفاظ عموماً اشعار میں پائے جاتے ہیں - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی زبان اس زمانے میں اسی قسم کی تھی ' دوسری یہ

کہ شعر و سخن کا مرکز فارسی زبان کے اصل وطن یعنی فارس سے بہت دور تھا - مصرعوں کی ترکیب بھی چست نہیں ہوتی - غیر ضروری الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں - عروض کی پابندی کا بھی چنداں خیال نہیں کیا جاتا —

اس دور کی غزل میں عموماً ذاتی واردات و جذبات بیان کیے جاتے ہیں - شعرا آپ بیتی سناتے ہیں اور اپنے اشعار میں اس مادی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہیں جیسے وہ اپنی گوشت پوست کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں - بعد کے زمانوں کی خیالی دنیا اور اس دنیا کی شاعری ابھی وجود میں نہیں آئی —

معشوق کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جاتا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صنف مذکور کا فرد ہے - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعرا اصلی واقعات بیان کرتے ہیں - دوسری یہ ہوسکتی ہے کہ یہ زمانہ زمانہ قدیم سے قریب ترین ہے جب بقول ابن رشیق اور مولانا حالی کے شعرا اپنے آپ کو عورت اور محبوب کو مرد فرض کرتے تھے اس لیے اس زمانے میں اس پرانی رسم کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے —

چونکہ غزلوں میں ذاتی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اس لیے ان میں عموماً تسلسل اور ہم آہنگی ہوتی ہے - یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کیونکہ مولانا شبلی شعرالعجم میں فرماتے ہیں " قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا (یعنی مسلسل غزلوں کا) بہت کم رواج ہوا " (شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۸۲) - ان صفحات سے ظاہر ہوگا کہ صورت معاملات برعکس ہے - غیر مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں مگر مقابلتاً کم —

خیالات میں عموماً سادگی ہوتی ہے اور ان کا انداز بیان بھی سادہ

ہوتا ہے - تکلف و تصنع کو بہت کم دخل ہوتا ہے - یوں ہی کہیں کہیں لطافت خیال و حسن بیان بھولے بھٹکے نظر آجاتا ہے - تشبیہات و تمثیلات بھی عموماً سطحی ہوتی ہیں' ان میں بعد کے زمانوں کی لطافت و نفاست نہیں پائی جاتی - اکثر جنگ و شکار کے مصطلحات استعمال کیے جاتے ہیں' کچھ تو اس وجہ سے کہ اس زمانے میں اِن چیزوں کا دور دورہ تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ محبوب خود فوجی سپاہی ہوتے تھے —

اخلاقی مضامین بھی کبھی کبھی غزل میں بیان کیے جاتے ہیں - یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے کیونکہ مولانا شبلی فرماتے ہیں "خواجہ صاحب سے پہلے غزل عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص تھی اس کے سوا اور کوئی خیال غزل میں ادا نہیں کیا جاسکتا تھا " ( شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳۹ ) - ہم دیکھیں گے کہ دامان غزل خواجہ حافظ کی ولادت سے پہلے بھی اسی قدر وسیع تھا جس قدر کہ ان کی وفات کے بعد - اس وسعت کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے —

اس دور کے اواخر میں تصوف کو لوگوں کی زندگی میں کافی دخل ہونے لگتا ہے - بہت سے صوفی شعرا پیدا ہوتے ہیں اور ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر اس مقالے کے حصہ اول میں کیا جاچکا ہے' ان کے اقدام سے غزل کی اہمیت بڑھنے لگتی ہے - مدت دراز تک صوفی شعرا ہی بہترین غزل گو نظر آتے ہیں اور جس شاعر نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا وہ ایک عظیم المرتبت صوفی بزرگ تھا' یعنی حضرت احمد جام جن سے ہمارے دور دوم کی ابتدا ہوتی ہے - غزل نے جو اہمیت اس دور کے آخر زمانوں میں حاصل کرلی تھی اس کا ثبوت

اس امر سے ملتا ہے کہ خالص قصیدہ گو شاعر بھی اسے ممدوح کی تعریف کے لیے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ اس بات نے اس کی اہمیت اور بڑھادی ہوگی (مثال بعد میں مناسب موقع پر بیان کی جائے گی) —

## باب دوم

عام خیال ہے کہ غزل کی ایجاد کا سہرا سعدی کے سر ہے - سرگور اوزلی Ouseley اُس مقدمے میں جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے نسخۂ دیوان حافظ مکتوبۂ میر علی کے شروع میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں (یہ مقدمہ ان کی کتاب Notices of Poets میں شامل ہے) —

The origin of lyric poetry may certainly be ascribed to Shaykh Sadi

ان کی یہ رائے متعدد فارسی مصنفین کی تحریرات پر مبنی ہے اور مشرق و مغرب کے اہل علم بالعموم اسے تسلیم کرتے ہیں - مولانا جامی بہارستان میں فرماتے ہیں "ہیچ کس پیش وے طریق غزل نورزیدہ" صاحب ریاض الشعرا یوں رقمطراز ہے * "مخترع فن غزل حضرت شیخ است چہ قبل از شیخ احدے از استادان طریقہ غزل نہ پیمودہ اگرچہ در دیوان بعضے از قدما غزلے یافت میشود' لیکن غزلیات آنہا بطریق قصیدہ است' اختصار دادہ نامش را غزل کردہ اند حالانکہ غزل گوی را طریق علحدہ است کہ مطلق مشابہت بہ طریق قصیدہ ندارد - از جملہ واضع و مخترع این فن خود شیخ اند" مخزن کے الفاظ یہ ہیں † "اشعار غزل را شیخ رونق دادہ و بانیء غزل اوست و پیش از وے غزل بطور قصیدہ بود" اسی قسم کے الفاظ دوسرے فارسی مصنفین کی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں - انھی نے مولانا شبلی کو دھوکے میں ڈال دیا - وہ

* ص ۱۳۸ - † ص ۱۵۳ -

متعدد مقامات پر اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس وثوق کے ساتھہ کہ بے اختیار ان کی ذہانت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے - ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں " غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی - محبت عشق کے جذبات اس میں ادا نہیں کیے جاتے تھے بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت ... کی مدح کرتے تھے غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے" (شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۹) - ایک اور جگہ رقمطراز ہیں "غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی' شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کیے " ( شعر جلد دوم صفحہ ۹۹ ) - مولانا کو بحیثیت زمانہ حال کے مورخ و مبصر کے اس کی وجہ بھی دینی ضروری تھی - انگریزی مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے - ادھر ضرورت محسوس ہوی ادھر ان کے ذہن کی جدت طراز قوت خلاقی نے فوراً ایک وجہ گڑھ دی - چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "شیخ کے زمانے سے پہلے جو شعرا گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے " (شعر جلد دوم صفحہ ۹۹) - اس آخری جملہ کے متعلق کچھہ لکھنا تحصیل ہے - ایک تبسم زیر لب کافی ہے —

اس مقالے کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ مندرجہ بالا بیانات یا تو سرے سے بے بنیاد ہیں یا جہاں ان میں کسی قدر حقیقت کی جھلک ہے وہاں بے انتہا مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - واقعہ یہ ہے کہ سعدی نے غزل پر اتنا احسان کیا اور ان کی شخصیت ایسی زبردست تھی کہ اس نے ان کے پیشروؤں اور ہم عصروں کو پس پشت ڈال دیا اور لوگوں نے حسب عادت غلو سے کام لے کے انہیں بمنزلہ بانی کے سمجھا اور اپنی راے کی تائید میں متعدد وجوہ پیش کرنے شروع کیے جنہیں حقیقت سے کوئی

سروکار نہ تھا - جب ایک بات ایک دفعہ تسلیم کرلی گئی تو بعد کی نسلوں نے اسے بغیر کسی جرح قدح کے مان لیا - اس میں شک نہیں کہ سعدی غزل کے عظیم ترین محسنین میں هیں - لیکن محسن هونا ایک چیز هے اور بانی هونا دوسری - یہ کہنا بھی کہ سعدی نے غزل میں بجاے معشوق کے اعضا کی تعریف کے جذبات دل کو بیان کرنے کی ابتدا کی' اصلیت سے دور هے - جیسا هم دیکھیں گے سعدی سے پہلے بھی غزل عمیق ترین جذبات انسانی سے مملو تھی - جہاں تک اس کی ساخت کا تعلق هے وہ شیخ کی وفات کے بعد بھی بجنسہ ویسی هی رهی جیسی کہ ان کی ولادت سے پہلے تھی - مرأت الخیال کا یہ بیان کہ " از عہد مصلح الدین سعدی شیرازی علیہ الرحمہ ذکر تخلص نیزلازم غزل شدہ'' حقیقت پر مبنی نہیں - هم دیکھیں گے کہ دور اول هی میں شعرا نے تخلص کا استعمال شروع کردیا تھا - اگرچہ شروع میں یہ رسم بہت عام نہ تھی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور سعدی سے بہت پہلے استوار هوگئی تھی - اسی طرح یہ بھی غلط هے کہ سعدی نے مطلع کو لازمۂ غزل گوی قرار دیا - صاحب مخزن الغرائب لکھتا هے ( صفحہ ۱۵۳ ) '' پیش ازوے مطلع و مقطع لازم نبودہ''- یہ بات' ممکن هے کہ غزل کے بہت ابتدائی زمانوں' صحیح رهی هو ( مناسب موقع پر اس کا ذکر کیا جائیگا ) مگر مطلع و مقطع دونوں سعدی سے بہت پہلے جزو غزل بن چکے تھے - اس طرح سعدی نے غزل کی ساخت و ماهیت تک میں کوئی تبدیلی نہ کی اس کے بانی هونے کا کیا ذکر —

## باب سوم

## ( غزل کی ابتدا )

غزل کی ابتدا پر عہد قدیم کی خاموش تاریکیوں کا پردہ پڑا هوا

ہے - جہاں تک اس کے اصل موضوع یعنی داستان حسن و عشق کا تعلق ہے ہم اسے قدیم ترین فارسی اشعار میں موجود پاتے ہیں - ایسا ہونا قدرتی امر ہے - علاوہ اس امر کے کہ ہر شاعری کا اصل موضوع عشق ہی ہوتا ہے اہل ایران کی زود مشتعل فطرت بھی اسی بات کی مقتضی تھی کہ ان کی شاعری میں یہ شعلہ بداماں جذبہ سب سے پہلے کارفرما نظر آئے —

فارسی کے قدیم ترین اشعار میں حکیم ابو حفص سُغدی سمرقندی کا یہ شعر ہے (مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۶۵) -

آہوے کوہی در دشت چہ گونہ دودا او نہ دارد یار بے یار چگونہ رودا

چونکہ صرف یہی ایک شعر ہم تک پہنچا ہے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تن تنہا وجود میں آیا یا اس کے ساتھ اور بھی اشعار تھے - ظاہر ہے کہ یہ بہ آسانی کسی پرانی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے -

بلحاظ قدامت حنظلہ باد غیسی کے حسب ذیل دو شعر اس کے بعد آتے ہیں (لباب صفحہ ۲)

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند از بہر چشم تا نہ رسد مرو را گزند

او را سپند و آتش ناید ہمی بکار با روے ہمچو آتش و با خال چون سپند

اس کے بعد ابو سالک گورگانی کے یہ اشعار ہیں (لباب صفحہ ۳)

بہ مژہ دل ز من بدزدیدی اے بلب قاضی و بہ مژگان دزد

مزد خواہی کہ دل ز من بہ بری این شگفتی کہ دید دزد بہ مزد

یہ مثالیں اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فارسی کے قدیم ترین اشعار بھی غزل کے اصل موضوع ہی کے متعلق تھے - جب بعد میں آل سامان اور آل سبکتگین کے زر افشاں دربار شعرا کے ملجا و ماوا بنے اور

انھوں نے زور شور کے ساتھہ قصیدہ خوانی شروع کی تو اس وقت بھی انھیں مجبوراً قصیدہ کے ابتدائی اشعار میں داستان حسن و عشق ھی چھیڑنی پڑتی تھی تاکہ ممدوح ان کے اشعار کو برغبت سنے - زبدۃالاشعار کے الفاظ میں (صفحہ ۹۰) " نسیب غزلے باشد کہ شاعر علی‌الرسم ان را مقدمۂ مقصود خویش سازد تا بہ سبب میلے کہ بیشتر نفوس را بہ استماع احوال محب و محبوب و اوصاف مغازلت عاشق و معشوق باشد طبع ممدوح بشاود - آن رغبت نماید و حواس را از دیگر شواغل باز ستاند وبدین واسطہ آنچہ مقصود قصیدہ است بخاطر مجتمع و نفس مطمئن ادراک کند " - اس میں شک نہیں کہ نسیب یا تشبیب کی ابتدا عربی شعرا کی تقلید کی وجہ سے ھوئی مگر یہ امر بھی مسلمہ ھے کہ فارسی شعرانے جس قدر تشبیب میں تغزل پیدا کیا وہ ان کے استادوں کے بس کی بات نہ تھی - تشبیب کے علاوہ عشق و مے پرستی کے مضامین رباعیوں' قطعوں اور مثنویوں کو بھی رونق بخشتے تھے - اس طرح جہاں تک غزل کے اصل موضوع کا تعلق ھے ھم دیکھتے ھیں کہ اس صنف سخن کے باضابطہ ظہور پذیر ھونے کے بہت پہلے سے وہ رفتہ رفتہ دوسرے اصناف سخن میں تربیت و ترقی پارھا تھا - اسی کا نتیجہ تھا کہ غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ اور اھم صنف سخن کے نمودار ھوئی اور جلد شاہ راہ ترقی پر گام زن ھونے لگی —

## غزل کی موجودہ ساخت کی ابتدا اور ارتقا

ھمیں اس بات کا صحیح علم نہیں کہ غزل کی ابتدا کیونکر ھوئی- صاحب مجمع‌الفصحا رقمطراز ھے (صفحہ ۴۴)

" پس از وے (عباس مروزی) چون دولت بہ آل طاھر و آل لیث

رسید، شعراے عجم بناے غزل و قطعہ و ترانہ گوی نہادند" -
ہم تک اس ابتدائی زمانے کے شعرا کا کلام اتنی مقدار میں نہیں پہنچا
کہ ہم اس بیان کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی رائے قائم
کرسکیں - یہ امر کہ حنظلہ بادغیسی نے ایک دیوان چھوڑا تھا چہار مقالہ
کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے "احمد بن عبداللہ الخجستانی گفت بہ
بادغیس در خجستان روزے دیوان حنظلہ بادغیسی همی خواندم" -
ہمارے پاس اس امر کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اس دیوان میں
کیا تھا - اگر مجمع الفصحا کا مندرجہ بالا بیان صحیح ہے تو اس میں
شائد کچھہ ٹوٹی پھوٹی غزلیں بھی رہی ہوں - اس کے علاوہ بھی ہمارے
پاس چند شہادتیں ایسی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غزل کسی
کسی نہ صورت میں رودکی سے پہلے بھی پائی جاتی تھی —

خود رودکی کا ایک شعر لغات فرس میں حسب ذیل ہے
(صفحہ ۳۴) —

دریغ مدحت چون زرو آبدار غزل که چابکیش نیاید همی بہ لفظ پدید

ابوسالک گورگانی کے بھی یہ اشعار غالباً کسی غزل کے ہیں
(لباب صفحہ ۳) —

خون خود را گر بریزی بر زمین بہ کہ آب روے ریزی در کنار
بت پرستیدن بہ از مردم پرست پند گیر و کاربند و گوش دار

ان اشعار کا ایک دوسرے سے غیر متعلق ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے
کہ وہ غالباً کسی غزل کے جزو ہیں اور اگر صرف یہی دو اشعار مصنف
نے نظم کیے تھے (جس کا امکان کم ہے) تو انہیں وہ تخم خیال کرنا چاہیے
جس سے غزل کا تناور درخت پیدا ہوا —

فرالاوی کا بھی جس کی رود کی نے تعریف کی ہے ایک شعر ہے جو یا تو کسی غزل کا معلوم ہوتا ہے یا کسی بہت غزل نما تشبیب کا —

ز چشم مست تو عالم خراب است به بند زلف تو دلها گرفتار *

اس کے بعد شہید بلخی † کا ایک شعر لغات فرس اسدی طوسی میں ملتا ہے ( صفحہ ۱۱ ) —

دهان دارد چو یک پسته لبان دارد به مے شسته

جهان بر من چو یک پسته بدان پسته دهان دارد

اس شعر کی بحر، اس کا لہجہ اور اس کا مضمون اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ غالباً کسی غزل کا ہے - شہید کے تین اور اشعار بھی غزل کے معلوم ہوتے ہیں ( لباب صفحہ ۴ ) —

دانشا چون دریغ ای از انک بے بہای و لیکن از تو بہا ست

بے تو از خواسته مبادم گنج هم چنین زار وار با تو رواست

با ادب را ادب سپاه بس است بے ادب با هزار کس تنها ست

ان اشعار کا بذات خود مکمل اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ہونا ان کے جزو غزل ہونے پر دلالت کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ خلاصة الافکار نے

---

* یہ شعر مجمع الفصحا کے صفحہ ٦٥ پر مندرج ہے ' دوسرے تذکروں میں بھی پایا جاتا ہے - ظاہرا اس پر براؤن کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ فرالاوی کا ایک قطعہ مندرج کرنے کے بعد یہ نہ لکھتے کہ The following fragment alone survives of his poems (vol. I. p. 455 )

† شہید بھی رود کی سے پہلے گذرا ہے - اخرالذکر اس کا بہت بڑا مداح تھا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے —

کاروان شهید رفت از پیش وان ما رفته گیر و می اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم وز شمار خرد هزاران بیش

آخری شعر کے پہلے غزل * لکھا ہے - اگر صرف اتنے ہی اشعار مصنف نے کہے تھے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخزن الغرائب کے اس قول کے مطابق جسے ہم اوپر لکھ آئے ہیں شروع شروع میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا شمار نہیں کیے جاتے تھے - چند مثالیں ہمیں اور بھی ایسی ملی ہیں (ان کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں شاید ایسا ہی رہا ہو —

ہمارے پاس اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کہ رودکی سے پہلے بھی غزل کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی صرف مندرجۂ بالا اشعار ہیں - اصل سوال یہ ہے کہ وہ وجود میں کیسے آئی - آیا مثل رباعی کے وہ ایک جداگانہ صنف سخن بن کے حیز وجود میں آئی یا مولانا شبلی کے خیال کے مطابق قصیدہ کی تشبیب نے بتدریج ترقی کر کے غزل کی صورت اختیار کی -

پہلے آخرالذکر امر سے بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ قصیدے کی تشبیب کو ابتدائی زمانے میں اکثر غزل بھی کہتے تھے - عوفی ادیب صابر کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ ۱۱۹) "ہم او راست در مدح مجدالدین رئیس خراسان - در ہر بیتے

---

* عوفی ان اشعار کا کوئی نام نہیں دیتا ' صرف ولہٗ کہہ کے ٹال دیتا ہے ' عوفی نظموں کا نام عموماً بے تک لکھتا ہے ' کبھی تو ان نظموں کو جو صاف غزلیں ہیں صرف نظم و شعر کہتا ہے اور کبھی ان نظموں کو جو کسی غزل کے نام سے موسوم نہیں کی جاسکتیں غزل کہتا ہے مثلاً فرخی کے حسب ذیل اشعار کو غزل قرار دیتا ہے (صفحہ ۳۹) -

شہ زاولستان محمود غازی سر گردن کشان ہفت کشور
بہ نیزہ گردن را ہر کند شاخ بہ زوبین بشکند سیمرغ را پر

لباب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کے نمونے ان صفحات میں بہت جگہ نظر آئیں گے -

از غزل سرو و یاقوت لازم دارد و در هر بیتے از مدح آفتاب و آسمان"-
یہاں ظاہر ہے کہ لفظ غزل بمعنی تشبیب استعمال کیا گیا ہے- عوفی نے سلجوقی شاعر خالد طولانی کی ایک اٹھارہ شعر کی نظم مندرج کی ہے اور اسے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے- مگر اس کے حسب ذیل دو شعر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ در حقیقت کسی قصیدے کی تشبیب ہے (لباب صفہ ۱۴۴)

من چو در مدح شہ در افشانم　　برمن از عارضم زر افشانی
شہ حسن انکہ از جلالت یافت　　تاج شاہی و تخت سلطانی

عنصری اپنے ایک قصیدے کی تشبیب کے آخر میں کہتا ہے* —

ترا کہ ماہ زمینی پس ارمن انکہ کلم
تخلص از غزل تو بہ مدح شاہ زمن

ایسی مثالیں بکثرت پیش کی جاسکتی ہیں- ان سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تشبیب کو اکثر غزل بھی کہتے تھے؛ مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہی تشبیب بعد میں علحدہ ہو کے غزل کہلانے لگی یا غزل جداگانہ طور پر ظہور پذیر ہوی اور تشبیب کو اس وجہ سے غزل کہتے تھے کہ دونوں کا موضوع ایک تھا- ہمارے پاس جو مواد ہے وہ اس مسئلہ کے قطعی فیصلہ کے لیے ناکافی ہے لیکن اخرالذکر امر حسب ذیل وجوہ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے —

مولانا شبلی کی رائے کو تسلیم کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ قصیدہ غزل سے اتنے عرصے پہلے وجود میں آئے کہ تشبیب کو ارتقائی منازل طے کرکے غزل کی صورت اختیار کرنے کا وقت ملے؛ لیکن

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۴ —

صورت حال ایسی نہیں - قدیم ترین فارسی شاعر جس کا معتدبہ کلام ہم تک پہنچا ہے رودکی ہے اور وہی فارسی شاعر کا بابا آدم مانا جاتا ہے - جیسا ہم بعد میں دیکھیں گے رودکی کے وقت تک غزل نے بہ حیثیت صنف سخن کے ایک جداگانہ حیثیت حاصل کرلی تھی - خود مولانا شبلی اسے ان الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں (شعرالعجم جلد ۵ صفحہ ۴۳) —

"اس کے (رودکی کے) زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آچکی تھی" رودکی سے پہلے کے اشعار اس قدر کم* تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ ان سے اس مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی - ان سے قصیدہ کا وجود† بھی اسی قدر ثابت ہوتا ہے جس قدر کہ غزل کا - الغرض ہمارے پاس کوی شہادت اس امر کی نہیں کہ فارسی زبان میں قصیدہ غزل سے پہلے ظہور پذیر ہوا - برخلاف اس کے قدیم ترین زمانے سے ہم دونوں اصناف سخن کو موجود پاتے ہیں - ہاں غزل کی اہمیت بمقابلہ قصیدے کے کچھہ عرصے تک کم ضرور نظر آتی ہے —

یہ سچ ہے کہ قصیدہ و تشبیب دونوں نے عربی میں موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا سے بہت پہلے متعدد منازل ترقی و ارتقا طے کر لیے تھے - لیکن اس بات سے ہمیں اس وقت تک کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم یہ نہ تسلیم کریں کہ فارسی شعرا نے جیسے ہی قصیدہ کو عربی سے لیا ویسے ہی انہوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ وہ اپنی زبان میں

* ہم اس قصیدے کو جو عباس مروزی کی طرف منسوب ہے' قابل قبول نہیں خیال کرتے - پروفیسر براؤن نے اس کی اصلیت پر بجا طور سے شبہ کیا ہے -

† عوفی لباب صفحہ ۲ پر شہید بلخی کے متعلق لکھتا ہے "در قصیدہ میگوید" -

تشبیب کو ایک جداگانہ صنف سخن قرار دیں گے - اس میں کوئی شک نہیں کہ مدت دراز تک قصیدوں کی تشبیبیں اصل غزلوں سے زیادہ عمدہ غزلیں ہوتی تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ شعرا اپنا سارا زور قلم قصیدوں پر صرف کرتے تھے- مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ہی تشبیبوں سے غزل پیدا ہوی —

اس سوال کا جواب بھی، کہ آیا غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ صنف سخن کے اپنی موجودہ صورت میں شروع ہی سے پیدا ہوئی یا اس نے یہ صورت بتدریج اختیار کی، آسان نہیں - ہمارے پاس مواد اس قدر کم ہے کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے - مگر آخرالذکر امر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے شروع شروع میں مفرد خیالات مفرد اشعار میں نظم کیے گیے ہوں - اگر یہ خیالات تھوڑے عرصہ کے اندر پیدا ہوے تو انہیں قافیہ کی فراوانی اور اس کے موسیقی اثر کی وجہ سے ہم قافیہ الفاظ اور ایک ہی بحر میں نظم کیا گیا ہو- اس کا نتیجہ ایک ایسی نظم ہوئی ہوگی جس میں چند اشعار بحر و قافیہ کی یکسانی کے رشتہ میں پروئے ہوے ہوں گے اور اس کی صورت مخزن الغرائب کی تحریر کے مطابق غزل کی اس پرانی شکل کی رہی ہوگی کہ جس میں مطلع و مقطع نہ ہوتا تھا - بعد میں قصیدہ کے اثر سے مطلع کا اضافہ کر دیا گیا ہو اور اس کے کچھہ عرصے کے بعد مقطع کا - شعرائے آل سامان کی غزلوں میں مطلع و مقطع دونوں نظر آتے ہیں اگرچہ اس عہد میں وہ غالبا غزل کے لازمی اجزا نہیں خیال کیے جاتے تھے —

## باب چہارم
## (شعراے آل سامان)
### رود کی

جس شاعر کے کلام میں سب سے پہلی مکمل غزل پائی جاتی ہے اور جس سے موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے' رود کی ہے - وہ متفقہ طور پر فارسی زبان کا پہلا بڑا شاعر ہے - اس نے سنہ ۹۴۰ ع میں وفات پائی - کہا جاتا ہے کہ اس نے دس لاکھ سے زیادہ شعر کہے بقول رشیدی (لباب صفحہ ۷) —

شعر او را من شمردم سیزدہ صد سی هزار
هم فزون آید اگر چو نانکہ باید بشمری

زمانے کے دست تطاول نے ان میں سے صرف چند سو اشعار باقی چھوڑے ہیں' کچھ قصیدوں کے ملتقطات' کچھ قطعات رباعیات اور غزلیں - بہ حیثیت غزل گو کے اس کی عظمت کا اعتراف عنصری نے ان الفاظ میں کیا ہے - (لباب صفحہ ۹) —

غزل رود کی وار نیکو بود غزل هائے من رود کی وار نیست

خوش قسمتی سے رود کی کے کلام میں چند خالص غزلیں پائی جاتی ہیں ورنہ اس عہد میں لفظ غزل جن وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا اس کی بنا پر ہمیں شبہہ ہوتا کہ آیا عنصری کا مقصد غزل سے وہی ہے جو اب ہم سمجھتے ہیں یا صرف قصیدے کی تشبیب —

کتب خانہ باڈلین میں ایک قلمی نسخہ ہے (اوزلی ایک ۱۲۷) جس میں رود کی کا قریب قریب جملہ موجودہ کلام یک جا کر دیا گیا ہے اور مشکل اشعار کے معنی بھی سہل فارسی میں بیان کیے گیے ہیں -

نسخے پر کوئی تاریخ ترتیب مندرج نہیں، مگر مقدمے میں حسب ذیل جملہ پایا جاتا ہے " در زمانۂ ما کلیات مرزا صائب مرحوم کہ یک صد هزار وکسرے بالابیت میشود، کس نہ نویسد "- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ صائب کے سال وفات یعنی ۱۰۷۸ کے بعد کا لکھا ہوا ہے - اس کے علاوہ رودکی کے بہت سے اشعار اُس بےبہا نسخہ یعنی بتخانہ میں پائے جاتے ہیں - Ethe نے انہیں دو ذرائع سے رودکی کے موجودہ کلام کا بیشتر حصہ جمع کرکے اپنے مضمون Rudagi der Samanidendichter مطبوعہ Gottinger Nachrich 1873 میں شائع کیا ہے - ان صفحات میں ہمیں اس مضمون کا اکثر حوالہ دینا پڑے گا - مندرجہ بالا منبعوں کے علاوہ ہم نے اسدی طوسی کی لغات فرس سے بھی مدد لی ہے جو Ethe کے زیر مطالعہ نہ تھی - اس تحقیق و تلاش کا نتیجہ آیندہ صفحات میں پیش کیا جاتا ہے —

رودکی کی صرف ایک مکمل غزل ہم تک پہنچی ہے - اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں* -

زہے فزودہ جمال تو زیب و آرا را		شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را
قسم بزار دل آہن خورم کہ از سختی		هزار طرح نہادہ است سنگ خارا را
کہ از تو هیچ مروت طمع نمیدارم		کہ کس ندیدہ ز سنگین دلاں مدارا را
تو رودکی بہ غلامی قبول اگر نہ کنی		بہ بندگی نہ پسندد هزار دارا را

* اوزلی ایڈ ۲۷، فولیو ۱۴ ( بی ) - مولانا شبلی نے اس غزل کی اصلیت پر، اس کی زبان اور اس میں مقطع کی موجودگی کی وجہ سے شبہہ ظاہر کیا ہے - جہاں تک زبان کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ رودکی کے بقیہ کلام کی زبان بھی اسی قسم کی ہے - یہی دوسرے سامانی شعرا کے کلام کا حال ہے - مقطع بھی اس زمانے کے شعرا کے کلام میں کمیاب نہیں -

اشعار ۲ اور ۳ قطعہ بند ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار کا استعمال اسی زمانے سے شروع ہوگیا تھا - جملہ خیالات سادہ و سطحی ہیں اور بغیر کسی تصنع کے بیان کردیے گئے ہیں —

رودکی کی ایک اور غزل حسب ذیل ہے ( بنگالہ ' فولیو ۲۹۹ بی ) -

اے جان من از آرزوے تو رنجاں بنمائے یکے روے و بہ بخشائے برین جان

دشوار نمائی رخ و دشوار دھی بوس آسان بربائی دل و آسان بہ بری جان

نزدیک من آسانی تو باشد دشوار نزدیک تو دشواریء من باشد آسان

خیالات اور طرز ادا کی سادگی کے علاوہ ان اشعار میں کئی اور باتیں قابل توجہ ہیں - ایک تو مطلع کے قوافی کا نقص' دوسرے آخری شعر کی بحر کی ناہمواری - جملہ اشعار میں تسلسل ہے - چونکہ صرف یہی تین شعر پائے جاتے ہیں اس لیے ہم نہیں کہ سکتے کہ آیا وہ کسی بڑی نظم کا حصہ ہیں یا رودکی نے تین ہی کہے تھے - اگر آخرالذکر صورت ہو تو مقطع کی عدم موجودگی قابل لحاظ ہے —

تیسری غزل یہ ( اوزلی ایک ۱۹۸ فولیو ۱۷۵ ) —

صرصر هجر تو اے سرو بلند ریشۂ عمر من از بیخ بکند

پس چرا بستۂ اویم همہ عمر گر نہ آں زلف دوتائیست کمند

بہ یکے جان نہ تواں کرد سوال کز لب لعل تو یک بوس بہ چند

بفگند آتش اندر دل حسن انچہ هجران بود از سینہ فگند

دوسرے شعر کی تشبیہہ قابل لحاظ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا نے جنگی تشبیہات کا استعمال شروع کردیا تھا - تیسرے شعر میں لطافت خیال پیدا کرنے کی کوشش کا ثبوت ملتا ہے - چوتھے شعر میں تعلق حسن و عشق پر شاعر نے فلسفیانہ نظر ڈالی ہے جو اس ابتدائی دور کے لیے خاص چیز ہے - ان اشعار کے آخر میں بھی مقطع نہیں —

اس کے بعد ان نو اشعار کی باری آتی ہے جو حسب ذیل بحر و قافیہ میں ہیں اور جن کی ترتیب مختلف نسخوں میں مختلف طور پر پائی جاتی ہے —

فغان من ہمہ زان زلف تابدار سیاہ　　که گاہ پردۂ لالہ و گاہ معجر ماہ

Ethe نے انہیں دو الگ الگ ٹکڑوں میں ترتیب دیا ہے اور دونوں کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - پہلا ٹکڑا مذکورہ مطلع سے شروع ہوتا ہے اور اس میں چھ شعر ہیں - یہ چھ شعر نسخہ اوزلی ایک ۱۲۷ اور دوسرے نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں - یہ اشعار دیوان قطران برٹش میوزیم کے نسخہ (OR 3317) میں ملے اس لیے ہم ان سے قطع نظر کرتے ہیں - ایسا کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے ' یعنی اگر بالفرض انہیں رودکی ہی کا کلام تسلیم کیا جائے پھر بھی بھی وہ صاف طور سے کسی قصیدے کے اشعار ہیں جن کا یہاں ذکر غیر متعلق ہے - اس بحر کے بقیہ اشعار کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئے اور وہ " صورت و سیرت " میں بدیہی طور پر کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں - انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں - (اوزلی ایک فولیوہ ۱۵ اے) -

سماع و بادۂ رنگین و ساقیان چوں ماہ　　اگر فرشتہ ببیند ہمی رود از راہ

نظر چگونہ بدوزم کہ بہر دیدن دوست　　ز خاک من ہمہ نرگس دمد بجائے گیاہ

کسے کہ آگہی از ذوق عشق جاناں یافت　　ز خویش حیف بود گر دمے بود آگاہ

یہ اشعار بلحاظ خیال و بیان گزشتہ اشعار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس عہد کے معلوم ہی نہیں ہوتے —

آخری شعر صوفیانہ انداز میں ہے اور اگر وہ واقعی رودکی ہی کا کہا ہوا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف اس ابتدائی زمانے میں بھی غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

ان کے بعد وہ پانچ اشعار ہیں جن کا پہلا شعر

شادزی با سیاہ چشماں شاد کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ہے اور آخری

باد و ابر است ایں جہاں افسوس بادہ پیش آر ہر چہ باداباد

Ethe نے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کو "شادزی با سیاہ چشمان شاد" لکھا ہے اور ان جملہ اشعار کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے، مگر عوفی نے شاد کی جگہ شاہ لکھا ہے اور "در قصیدہ میگوید" لکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ قصیدے کے اشعار ہیں۔ عوفی کو قدامت کا فخر حاصل ہے اس لیے ہمیں مجبوراً اس کے قول کو Ethe کی رائے پر ترجیح دے کر ان اشعار سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال ان میں ایک بات قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ فارسی شاعری میں 'ابونواس' کا فلسفہ اسی عہد سے داخل ہونا شروع ہوتا ہے جس سے بعد میں خواجہ حافظ نے گنبد افلاک میں غلغلہ پیدا کردیا۔ رودکی کے نام سے ایک اور غزل منسوب کی جاتی ہے جس کا مطلع یہ ہے —

یک بار بود عید بہر سال بہ یک بار ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار

یہ غزل کلام رودکی کے مذکورہ بالا نسخے میں مندرج ہے اور Ethe حسب معمول اسے بغیر چوں و چرا رودکی کا کلام سمجھتا ہے۔ لیکن یہ غزل لفظ بلفظ دیوان اسامی کے نسخہ برٹش میوزیم (OR 3713, fol. 79 b) میں موجود ہے اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں —

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ رودکی کے چند ایسے متفرق اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو صاف کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں —

۱ - کار بوسہ چو آب خوردن شور

چوں خوری بیش تشنہ ترگردی *

تشبیہہ کی سادگی اور آخری ادوار کے معیار نفاست کے مطابق اس کی ناخوش گواری قابل لحاظ ہے —

۲ - ملم خوکردہ بربوسش چناں چوں بازپر بستہ

چناں بانگ آرم از بوسش چناں چوں بشکنی پستہ †

اس شعر میں خیال اور تشبیہ کی "دهقانیت" اور زیادہ پائی جاتی ہے - زبان بھی ثقیل ہے اور غزل کے لیے قطعاً ناموزوں —

۳ - ناز اگر خوب را سزا ست بہ شرط

نہ سزد جز ترا کرشمہ و ناز ‡

رودکی کی غزل گوئی کے متعلق جو کچھہ سرمایہ اس وقت تک ہمارے پاس ہے وہ پیش کیا جاچکا - فارسی شاعری کے اس ابوالآبا کا ذکر چھوڑنے سے پہلے ہم اس کی تغزل سے لبریز تشبیہوں کی ایک مثال پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے (بت خانہ فولیو ۴۳۰) —

بخندد لالہ بر صحرا بسان چہرۂ لیلی

بگرید ابر بر گردوں بسان دیدۂ مجنوں

ز آب جوے ہر ساعت ہمی بوے گلاب آید

دوا و شست است پنداری نگار من رخ گلگوں

---

* اوزلی ایڈ ۱۲۷ میں بجاے "چوں خوری بیش" کے "بخوری بیش" تحریر ہے - اول الذکر ریاض الشعرا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے ترجیح دی -

† لغات فرس صفحہ ۳۸ -

‡ لغات فرس صفحہ ۹۲ -

اگر یک زلف بفشاند ازاو صد دل رها گردد

اگر یک چشم بگمارد دو صد دل را کند پر خون

ظاہر ہے کہ ان غزل نما تشبیہوں سے، خصوصاً جب وہ رودکی جیسے مسلم الثبوت استاد کی کہی ہوئی ہوں، غزل کی نشو و نما میں کس قدر مدد ملی ہوگی —

ابوشعیب

رودکی کے بعد جس شاعر کی غزل ہم تک پہنچی ہے وہ ابوشعیب بن محمد ہروی ہے - عوفی نے تو اسے رودکی سے بھی پہلے کا شاعر قرار دیا ہے مگر مجمع الفصحا کے مطابق وہ رودکی کے آخری زمانے کے شاعروں میں ہے * اور ہم اسی کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں - عوفی نے ابوشعیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے (صفحہ ٥)

"شعر ابوشعیب لطیف و بے بدل و ذات او نادرہ دہر"- اس کے بعد لکھتا ہے "در حق ترسا بچۂ میگوید - غزل" اور حسب ذیل پانچ شعر درج کیے ہیں —

دوزخی کیشی بہشتی روے و قد　　آہو چشمی حلقہ زلفی لالہ خد

لب چنان کز خامۂ نقاش چین　　برچکد از سیم بر شنگرف مد

گربہ بخشد حسن خود بر زنگیاں　　ترک را بوشک ز زنگ آید حسد

بہلیء آں نارک † ابریشمین　　بستہ بر تارے ز ابریشم عقد

از فروسو گلبن و از برسو بہشت　　سوزنے سیمین میان ہر دو حد

* آخر زمان رودکی را دریافتہ - صفحہ ٦٦ —

† براؤن نے "نازک" لکھا ہے - "نارک" مجمع الفصحا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے مقابلتاً بہتر معنی نکلتے ہیں اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا -

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے. کہ شاعر نے بیان میں جدت اور مبالغہ سے کلام لینے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی خیالات سادہ وسطحی رہ جاتے ہیں اور متاخرین کے معیار کے مطابق طفلانہ ـــ

## جوئباری

یہ بھی عہد آل سامان کا شاعر ہے۔ عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (صفحہ ۱۱) "شاعرے کامل واین غزل کہ از کعب غزل شیرین تراست از گفتہ ہاے او شنیدہ آمدہ" اس کے بعد حسب ذیل غزل درج کرتا ہے۔

به ابر پنهاں کرد آفتاب تاباں را　　　بر سبزہ بنهفت ان برگ لالہ * خنداں را

بہ سوے هر دو میش بر دو† شاخ ریحان بود　　　بشاخ موروله پوست شاخ ریحاں را

بتے کہ خستہ دلان را بدر درمانست　　　دریغ دارد ازیں درد دیدہ درماں را

به ابر نیسان مانم کنوں من از غم او　　　سزد کہ صلعت خوبست ابر نیسان را

بہ یک گذر کہ سحر گاہ در گلستاں کرد　　　بهشت کرد سراسر همہ گلستاں را

اس غزل میں بھی حسب معمول خیالات صاف و سادہ ہیں۔ پہلے دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب صنف قوی کا فرد ہے۔ پہلے اور چوتھے میں بحر کی نا ہمواری بھی قابل توجہ ہے ـــ

ابوالمؤید بلخی کے دو شعر محبوب کی انگلیوں کی تعریف میں ہیں جنھیں عوفی نے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے. وہ اشعار اور عوفی کی عبارت درج ذیل ہے (لباب صفحہ ۲۹) ـــ

"در صفت انگشت معشوقہ می گوید - غزل

---

* براون نے لالہ برگ لکھا ہے مگر میرے خیال میں برگ لالہ ہونا چاہیے۔

† براون نے "برد و شاخ" لکھا ہے مگر چونکہ اس سے معنی صاف نہ نکلتے تھے اس لیے میں نے اسے "بردو شاخ" پڑھا۔

انگشت را بہ خون دل من کند خضاب کفے کزو بلائے تن و جان ہر کس است
عناب وسیم اگو نبود ھاں روا بود عنایت بر سپیکۂ سیمین او بس است

اسی طرح یہ دو شعر ابوشکور بلخی * کے بھی ھیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بہ آسانی کسی غزل کے ہوسکتے ھیں (لباب صفحہ ۲۱) —

از دور بدیدار تو اندر نگریستم مجروح شد آن چہرۂ پر حسن و ملاحت
وز غمزۂ تو خستہ شد آزردہ دل من وین حکم قضائیست جراحت بہ جراحت

ان اشعار سے مضمون میں جدت و لطافت پیدا کرنے کی کوشش صاف تپکتی ھے —

خسروانی

خسروانی بھی آل سامان کے بڑے شاعروں میں گذرا ھے - صاحب مجمع الفصحا اس کے متعلق یوں رقمطراز ھے (صفحہ ۱۹۹) "از استادان ایام سلف است واز شعراے آل سامان - فردوسی شعرے ازاو تضمین کردہ" اس کے بعد سات شعر دیتا ھے جن میں مقطع تو ھے مگر مطلع نہیں ' جو ایک غیر معمولی بات ھے - ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ھے اور صاف غزل کا معلوم ہوتا ھے - ممکن ھے مطلع کسی وجہ سے نقل نہ کیا گیا ہو - لیکن اگر یہ بات نہیں اور خسروانی نے اس غزل میں صرف یہی سات شعر کہے تھے تو ان سے بھی اس امر کا مزید ثبوت ملتا ھے کہ اس زمانے میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا خیال نہیں کیے جاتے تھے - وہ اشعار حسب ذیل ھیں † —

* مجمع الفصحا نے ابوشکور کو رودکی کے آگے کا شاعر قرار دیا ھے مگر عوفی کی راے اس کے خلاف ھے اور زیادہ وقیع -

† خلاصۃ الافکار نے صرف شروع کے تین شعر لکھ کے انہیں قصیدے سے منتخب بتایا ھے مگر اشعار کی نوعیت اور مقطع کی موجودگی اس امر کی تائید نہیں کرتی -

فغاں زاں درنگت بہ ہنگام صلح　　فغاں زاں شتابت بہ ہنگام جنگ

دژ نگم بہ راحت ہمہ زاں شتاب　　شتابم بمردن ہمہ زاں درنگ

نہنگے ست ہجران و دریاست عشق　　بہ دریا بود جاودانہ نہنگ

رخت دید نتوانم از آب چشم　　سخن گفت نتوانم از بس غرنگ

رخ تست خور شید و خور شید خاک　　لب تست یاقوت و یاقوت سنگ

نہ چون خسروانی نہ چون توبتا　　بت و برہمن ویک و مشکوے وگنگ

پہلے دو شعر قطعہ بند ہیں - تیسرے سے جدت تشبیہ پیدا کرنے کی کوشش ظاہر ہے - آخری شعر فخریہ انداز میں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسروانی اپنے عہد کے بڑے شاعروں میں ضرور رہا ہوگا —

دقیقی

قدامت کے لحاظ سے رود کی کے بعد فارسی کا دوسرا بڑا شاعر دقیقی ہے - اس کی اہمیت بالخصوص اس وجہ سے ہے کہ اسی نے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی اور اس کی شاعرانہ عظمت کے سب قائل ہیں - اس بات کا ثبوت' کہ دقیقی نے ایک دیوان چھوڑا تھا' اس امر سے ملتا ہے کہ قطران ناصر خسرو سے اس کا سبق لیتا تھا * - اس کی چند غزلوں سے جو اب تک پائی جاتی ہیں اور نیز اس امر سے کہ وہ عشق و عاشقی کا دلدادہ کیا جاندادہ تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دیوان میں بہت سی اور غزلیں بھی رہی ہونگی - بد قسمتی سے اس کتاب کا اب پتہ نہیں چلتا - اگر کبھی مل گئی تو اس عہد کی غزل گوئی پر غالباً اس سے قابل قدر روشنی پڑے گی - دقیقی کی چند غزلیں جو مختلف تذکروں میں پائی جاتی ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں —

* ملاحظہ ہو سفر نامۂ ناصر خسرو ( پیرس ایڈیشن ) صفحہ ۸ -

پہلی غزل (آتشکدہ - صفحہ ۱۹۴ بی)

در انگلہ اے صنم ابر بہشتی جہاں را خلعت اردی بہشتی
بدان ماند کہ گوئی از مے و مشک مثال دوست بر صحرا نوشتی
ز گل بوے گلاب آید بدینساں کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدست جہاں را از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ مے خوں رنگ و دین زر دھشتی

دوسرے شعر کی لطافت تشبیہہ قابل داد ہے - ایک بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تخلص بجاے آخری شعر کے اس سے پہلے کے شعر میں پایا جاتا ہے —

دوسری غزل (لباب - صفحہ ۱۲)

کاشکے اندر جہاں شب نیستے یا* مرا ہجران آں لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جان من گر ورا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیر لب مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی جانم از عشقش مرکب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن زندگانی کاش یارب نیستے

اس غزل میں ہم آہنگی و تسلسل مضامین قابل توجہ ہے - دقیقی کی زندگی کے حالات اور اس غزل کے انداز بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالباً وہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے - اس امر کا ثبوت اس کی مندرجہ ذیل غزل سے جو آخری غزل ہے زیادہ پر زور طریقے سے ملتا ہے (لباب صفحہ ۱۲ - ۳)-

---

* لباب میں بجاے "یا" کے "تا" ہے - مگر چونکہ اول‌الذکر سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا —

| | |
|---|---|
| اے ابر بہمنی نہ بچشم من اندری | دم زن زمانکے و بر آسائے کم گری |
| این روز و شب گریستن زار بہر چیست | نے چون منی غریب و غم عشق برسری |
| دردا جدا بماندم و در غم زعشق یار | من زین تونگرم کہ مباد این تونگری |
| یارے گزیدم از ہمہ خلقاں پری نژاد | زاں شد زپیش چشم من امروز چون پری |
| لشکر برفت و'ں بت لشکر شکن برفت | ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری |

آخری شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ معشوق صنف قوی کارکن ہے اور سپاہی بچہ —

دقیقی کی غزلیں اس کے پہلے کے شعرا کی غزلوں سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہیں - ان میں مقابلتاً اظہار جذبات زیادہ ہے ' خیالات میں زیادہ لطافت ہے اور انداز بیان میں زیادہ نفاست —

## عمارہ

عہد آل سامان کا آخری شاعر جس نے غالباً غزلیں کہی تھیں اور جو اس عہد کو عہد غزنویہ سے ملاتا ہے ' عمارہ ہے - ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی مگر بہارستان میں مولانا جامی کے یہ الفاظ اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ضرور غزل کہتا تھا - " در مقالات شیخ ابو سعید ابوالخیر مذکور است کہ روزے قوال در پیش ایشان این بیت بخواند —

اندر غزل خویش نہاں خواہم گشتن

تا برلب تو بوسہ زنم چونش بخوانی

شیخ را وقت خوش آمد - پرسید کہ این شعر کیست - گفتند عمارہ "

اس شعر میں خود ندرت و لطافت ہے - اس کی خوبی اور نیز یہ امرکہ قوال اسے شیخ ابوسعید کے سامنے گا رہا تھا اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ عمارہ اپنے زمانے کا مقبول عام شاعر تھا اور غزلیں محفل سماع

میں گائی جانے لگی تھیں - عوفی نے اس کی شاعرانہ عظمت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے (لباب- صفحہ ۲۴) "شعراے عصر آخر او را مقتداے خود دانستند" - اب ہم عہد آل سبکتگین میں قدم رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے کو پہلے کی طرح نادر ہوا نہیں پاتے اور جہاں ہمیں اپنے موضوع کے متعلق مقابلتاً بہت کافی ذخیرہ ملتا ہے —

## باب پنجم

### (شعراے آل سبکتگین *)

### فردوسی سنہ ۱۰۲۵ ع

فردوسی نہ محض فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں ہے بلکہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں اس کی جگہ ہے - اسے حسن و عشق کے موضوع سے جو قدرتی لگاؤ تھا اس کا ثبوت شاهنامے کے ان حصوں سے ملتا ہے جن میں اس نے یہ دلچسپ داستان چھیڑی ہے' مثلاً زال و رودابہ اور بیژن و منیژہ کے قصے - اِس کے علاوہ اس نے اس موضوع پر ایک مستقل مثنوی 'یوسف و زلیخا' بھی تصنیف کی' اس سے اور نیز اس امر سے کہ اس کی ایک آدھ غزلیں اب بھی پائی جاتی ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے غالباً کافی تعداد میں غزلیں کہی ہوں گی' اس کی ایک غزل نمونتاً درج ذیل کی جاتی ہے † —

---

* ان ابواب میں شعرا کا ذکر تاریخ وفات کی قدامت کے لحاظ سے کیا جاے گا -

† تاریخ گزیدۃ اور مخزن‌الغرائب میں مندرج ہے' براؤن نے اسے J. R. A. S. بابت جنوری سنہ ۱۹۰۱ ع کے صفحہ ۸ پر شائع کیا' مخزن‌الغرائب میں فردوسی کی ایک اور غزل کے چند اشعار اس بحر میں پاے جاتے ہیں -

اگر بدکنی کیفرش خود بری     نہ چشم زمانہ بخواب اندرست

شبے در برت گر بہ آسودمے　　سر از فخر بر آسماں سودمے
قلم در کف تیر بشکستمے　　کلاہ از سر مہر بربودمے
بقدر از نہم چرخ بگذشتمے　　بہ پے فرق کیواں بفرسودمے
جمال تو گر زانکہ من دارمے　　بجائے تو گر زانکہ من بودمے *
بہ بیچارگان رحمت آوردمے　　بہ درماندگان بر بہ بخشودمے

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، ایک تو اس کا تسلسل، دوسرے آخری شعر کے آخری مصرعے کی زبان۔ زائد 'بر' کا استعمال مثنوی میں تو جائز ہے مگر غزل کے لیے نازیبا ہے۔ اس کی موجودگی فردوسی کی مثنوی نویسی کی عادت کے علاوہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں غزل کی مناسب زبان پیدا نہیں ہوئی تھی لہذا اس قسم کی خامیاں ان ابتدائی عہدوں میں کمیاب نہیں۔

فرخی

فرخی کے دیوان کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں † دونوں طبع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر کو محمد مہدی بن مصطفی مخلص طہرانی نے شائع کیا اور آخر الذکر کو رضا قلی خاں ہدایت نے۔ رضا قلی خاں کتاب کے مقدمے میں لکھتا ہے:

"دو دیوان اشعار اورا بدست آوردہ یکے سہ ہزار بیت و یکے نُہ ہزار بیت۔ لیکن درست تمام او خواندہ نمی شد، لہذا قریب دو ہزار و پانصد بیت از آنہا انتخاب کردہ نوشتہ شد"

رضا قلی خاں کا نسخہ مخلص کے نسخے سے زیادہ مفصل ہے۔ اس

* یہ مصرع تاریخ گزیدہ کے نسخہ بادلیں ( Ch : 8 ) میں نہیں پایا جاتا۔

† نمبر ۲۰۳ و ۲۰۴ ۔

میں چھ غزلیں ھیں اور مخلص کے نسخے میں تین - اس بات کا ثبوت کہ فرخی نے چھ سے زیادہ غزلیں کہی تھیں رضا قلی خاں کے مندرجہ بالا بیان کے علاوہ حسب ذیل امور سے بھی ملتا ھے - اگرچہ مخلص کے نسخے میں صرف تین ھی غزلیں ھیں مگر پھر بھی ان میں سے دو رضا قلی خاں کے نسخے میں نہیں پائی جاتیں - ایک غزل لباب میں موجود ھے جو مذکورہ بالا نسخوں میں نہیں - یہی حال ان متفرق اشعار کا ھے جو مختلف تذکروں میں پائے جاتے ھیں اور جو بظاھر غزل کے معلوم ھوتے ھیں -

فرخی کی شاعرانہ عظمت سب تسلیم کرتے ھیں - وہ عظیم ترین قصیدہ گویوں میں ھے اور اس کے قصیدوں میں اپنے جملہ ھمعصروں سے زیادہ تغزل پایا جاتا ھے - صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ھے (صفحہ ۴۳۹)

"الحاصل حکیم فرخی را در شاعری طرزے مرغوب است و تغزلات شیریں عاشقانہ مسرت انگیز دارد - سخن وے سہل ممتنع است" —

اس امر کا سب سے بڑا ثبوت کہ فرخی کے تغزل کے اس کے ھمعصر بھی قائل تھے عنصری کے اس شعر سے ملتا ھے* —

خارج شود ز نعت خطت طبع عنصری
عاجز شود ز وصف لبت و هم فرخی

عنصری نہ محض فرخی کے عظیم ترین ھمعصروں میں تھا بلکہ دربار محمودی کا ملک الشعرا بھی تھا - فرخی بھی اسی دربار کا شاعر تھا اس لیے جذبۂ رقابت و خوف مسابقت قدرتی امر تھا - ایسی حالت

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۳ - دیوان کے دوسرے نسخے (۱۳۷۹۷ - سی - ۸) میں یہ شعر یوں ھے
خارج شود ز نعت لبت طبع عنصری عاجز شود ز وصف خطت و هم فرخی

میں عنصری کا اپنے قصیدے میں فرخی کے کمال تغزل کا اعتراف کرنا اس کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

فرخی پر رنگ تغزل اس قدر غالب ہے کہ اس کے قصائد در حقیقت طویل غزلیں ہوتی ہیں - اس کی تشبیبیں اتنی لطیف ہیں کہ ان میں سے ایک کا یہاں مثالاً نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا -

خوشا عاشقی خاصہ وقت جوانی　　خوشا با پری چہرگان کامرانی
خوشا با رفیقان یکدل نشستن　　بہم نوش کردن مے ارغوانی
بوقت جوانی بکن عیش زیرا　　کہ ہنگام پیری بود ناتوانی
جوانی و از عشق پرہیز کردن　　چہ باشد نہ دانی بجز جانگرانی
جوانے کہ پیوستہ عاشق نہ باشد　　دریغ است از روزگار جوانی
در شادمانی بود عشق خوباں　　بباید کشادن در شادمانی
در شادمانی کشا دست بر تو　　کہ خدمت گر شہریار جہانی

ان اشعار اور گریز کی تعریف محتاج بیان نہیں —

فرخی کے کلام میں ہمیں خوش قسمتی سے ایک ایسی مثال ملی جو اس کے میلان تغزل اور اس اہمیت کو جو غزل نے اس زمانے میں حاصل کرلی تھی، نہایت خوبی سے ظاہر کرتی ہے - آپ ایک قصیدے میں کہتا ہے —

خوش بگوش آید شعر یکہ در ان شعر بود　　مدحت خسروے با نعت رخے ہم چو قمر
مطربا آن غزل نغز و دلاویز بیار　　ورنہ دانی بشنو تا غزلے گویم زر
اے دریغا دل من کاں صنم سیمیں بر　　دل من برد و مرا از دل او نیست خبر
او دلے داشت گرامی ولے دیگر یافت　　کاش کے من دلکے یافتمے نیز دگر
دل فروشان خراساں را بازار کجاست　　تا دلے یابم از یشاں چو دل خویش مگر

اندریں شہر کسے را دل افزونی نیست ور بود ونیز ہمانا نہ فروشند بہ زر
ہرکہ او نزد بتاں گشت چو من بیدل شد حال ازینگونہ است اینجا حذر اے قوم حذر

ان اشعا کے بعد اصل قصیدہ پھر شروع ہوتا ہے - اوپر کی مثال میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں —

(الف) قصیدہ کی ابتدا اس غزل سے نہیں ہوتی اس لیے اس پر تشبیب کا گماں نہیں کیا جاسکتا —

(ب) اسے خود شاعر نے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس کی ابتدا مطلع سے ہوتی ہے - چونکہ یہ وسط قصیدہ میں واقع ہے اس لیے مطلع کا اس جگہ ہونا اس غزل کو قصیدے سے الگ کر دیتا ہے اور اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ اس زمانے میں غزل نے جداگانہ صنف سخن کی صورت اختیار کرلی تھی اور مطلع جزو غزل سمجھا جانے لگا تھا —

(ج) غزل مسلسل ہے —

فرخی کی مطبوعہ غزلوں کی تعداد نو ہے - اس مقالے کے حدود اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان سب سے بحث کریں ' اس لیے ہم ایک مکمل غزل اور ایک کا انتخاب پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں —

غزل

اے دوستی نمودہ وپیوستہ دشمنی در شرط من نبود کہ با من تو ایں کنی
دل پیش من نہادہ بتردوئی مرا آگہ نبودہ ام کہ ہمی دانہ افگنی
پنداشتم ہمی کہ دل از دوستی دہی بر تو گماں کہ برد کہ تو دشمن منی
دادن دل تو ازپئے آں بود تا مرا اندر فریبی و دل از جاے بر کنی
کشتی مرا بدوستی وکس نہ کشتہ بود زیں زار تر کسے را ہرگز بہ دشمنی

بسکی بہ مہربا دل من چند بار عہد　از چون توے سزد کہ کنوں عہد بشکنی

یہ غزل بھی مثل فرخی کی اور غزلوں کے مسلسل ہے - اس میں جس قسم کے جذبات کا اظہار ہے ان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں مگر وہ متاخرین کے معیار عشق و محبت کے منافی ہیں اور اس لیے ان کے کلام میں مفقود - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی ہے - حسب ذیل اشعار سے جو اس کی ایک دوسری غزل سے منتخب کیے گئے ہیں، اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے —

کوے تو جایگاہ فتنہ شدہ آست　بر ..ر کوے تو قدم نہ نہم

دوستاں از فراق تو خوں دل　من ہمی از وصال تو خرم

فرخی حیلۂ بباید کرد　تا از اں شوخ سنگ دل برہم

ان اشعار میں جو خیالات ادا کیے گئے ہیں وہ متاخرین کے مذہب عشق میں کفر ہیں - ان کے نزدیک عاشق صادق ہمیشہ ناکام نامراد رہتا ہے - شاد کامی و خوش بختی ہمیشہ رقیب روسیاہ کا حصہ سمجھی جاتی ہے - باوجود معشوق کی انتہائی جفا کاریوں کے عاشق ناکام راہ وفا سے منہ نہیں موڑتا بلکہ " سرور تپ غم " بیان کرنے کے لیے " ہر موے بدن زبان سپاس " بن جاتا ہے - اس کی زبان سے معاذاللہ نکل سکتا ہے " فرخی حیلۂ بباید کرد " - ان اشعار میں جن جذبات کا ذکر کیا گیا ہے وہ متاخرین کے معیار سے گرے ہوے سہی مگر وہ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ شعرا اس عہد میں جو خود محسوس کرتے تھے اسے اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے اور متاخرین ایک خیالی و رسمی دنیا میں رہتے تھے جسے اصلیت سے بہت کم کم سروکار تھا - ان اشعار میں دو باتیں اور قابل توجہ ہیں (الف) ان

اشعار میں تسلسل نہیں بلکہ یک گونہ تضاد پایا جاتا ہے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلسل غزلیں اس زمانے میں زیادہ رائج تھیں تاہم غیر مسلسل غزلیں بھی کہی جاتی تھیں —

(ب) آخر شعر میں تخلص پایا جاتا ہے - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے - یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ مقطع کا استعمال عام ہونا شروع ہوگیا تھا —

فرخی کی رباعیاں بھی تغزل سے لبریز ہوتی ہیں - ہم ان میں سے دو نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں* —

گویند کہ معشوق تو زشت ست و سیاہ
گر زشت و سیاہ ست مرانیست گناہ
من عاشقم و دل بر او گشتہ تباہ
عاشق نشود ز عیب معشوق آگاہ

تا در طلب دوست ہمی بشتابم عمرم بکراں رسید و من در خوابم
گیرم کہ وصال دوست درخواہم یافت این عمر گذشتہ را کجا دریابم

کسائی

کسائی بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں گذرا ہے - اس نے بھی کچھہ غزلیں ضرور کہی تھیں - عوفی نے کسائی کو بڑی اہمیت دی ہے اور اپنی کتاب کے پانچ صفحوں میں اس کا ذکر کیا ہے - صاحب چہار مقالہ بھی اس کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہے جن کی وجہ سے ان کے ممدوح کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا - ناصر خسرو جیسا عظیم المرتبت شخص بھی اپنے کلام

* ریاض صفحہ ۲۵۴

میں اس کا بار بار حوالہ دیتا ہے * —

بد قسمتی سے کسائی کا کلام زیادہ نہیں پایا جاتا - حسب ذیل غزل اس تغزل کا عمدہ نمونہ ہے † —

اے ز عکس رخ تو آئینہ ماہ — شاہ حسنی و عاشقانت سپاہ

ہر کجا بنگری دمد نرگس — ہر کجا بگذری بر آید ماہ

روے و موے تو نامۂ خوبیست — چہ بود نامہ جز سفید و سیاہ

بلب و چشم راحتی و بلا — بہ رخ و زلف توبہ و گناہ

دست ظالم ز سیم کوتہ بہ — اے بہ رخ سیم زلف کن کوتاہ

مطلع کے دوسرے مصرعہ میں کی تشبیہ جنگی زندگی کے اثر کو ظاہر کرتی ہے - اس کی مثالیں بعد میں بکثرت ملیں گی - تشبیہ و طرز ادا

---

* Ethe کے نزدیک یہ حوالہ جات کسائی کی تضحیک کی غرض سے ہیں اور وہ انہیں جذبہ رشک اور اختلاف عقائد کا نتیجہ خیال کرتا ہے - براؤن کی راے بجا طور پر اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ حوالہ جات در حقیقت توصیفی ہیں - مگر عجیب بات یہ ہے کہ براؤن انہیں توصیفی خیال کرنے کے باوجود کسائی کے ساتھہ ناصر خسرو کے اختلاف کے وجوہ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ Ethe کے بتائے ہوے وجوہ سے مختلف تھے - ہمارے نزدیک ناصر خسرو نے کسائی کا بار بار حوالہ اس وجہ سے نہیں دیا کہ اسے اس کے ساتھہ کوئی عناد تھا بلکہ اس وجہ سے کہ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں - عوفی کسائی کے متعلق لکھتا ہے " اکثر اشعار او در زہد و عظ است " اور یہی خصوصیت ناصر خسرو کے کلام کی بھی ہے - ذیل کے اشعار متذکرہ بالا حوالہ جات کی عمدہ مثال ہیں ( از بیت خانہ ) -

سوے شعر حجت در آ اے پسر — ( حجت ناصر خسرو کا تخلص تھا )

اگر ہیچ در خاطر تو رضا ست

کہ دیباے رومی ست اشعار من

اگر شعر فاضل کسای کسا ست

† لباب صفحہ ۳۷ - عوفی حسب دستور اسے شعر کہتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ خالص غزل ہے -

میں لطافت پیدا کرنے کی کوشش ان اشعار سے ظاہر ہے اگرچہ خیالات ابھی تک سطحی ہیں —

بوعلی سینا سنہ ۱۰۳۷

حکیم اعظم بوعلی سینا کی بھی دو غزلیں ہمیں ملیں - ظاہر ہے کہ حکیم موصوف نے صرف یہی دو غزلیں نہ کہی ہوں گی - بوعلی سینا جیسی عظیم المرتبت ہستی کی غزل سرائی کی وجہ سے اس صنف سخن کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہوگی وہ محتاج بیان نہیں - Ethe نے انہیں Gottinger Nachrichten (1875) میں شائع کیا ہے - پہلی غزل کے بجائے گیارہ شعروں کے Ethe نے صرف سات شعر دیے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زیر مطالعہ صرف نسخہ ایلیٹ ۲۹۳ تھا - نسخہ اوزلی ایڈ ۶۹ میں تین شعر اور مندرج ہیں - آتشکدہ میں ایک اور شعر ہے - مکمل غزل حسب ذیل ہے —

فدائے روح بود بادۂ رحیق الحق * — کہ رنگ او کند از دور رنگ گل را فق†

بہ طعم تلخ چو پند پدر ولیک مفید — بہ نزد مبطل باطل بہ نزد دانا حق

سہیل ‡ بالش و خورشید فروغ طلعت — بہ بوز عنبر و مشک و گلاب بردہ سبق

حلال بر عقلا و حرام بر جہال — کہ مے محک بود و خیر و شر ازو مشتق

حلال گشتہ بہ احکام عقل بردانا — حرام گشتہ بہ فتوائے شرع بر احمق

شراب را چہ گنہ زانکہ ابلہے بخورد — بہ سوے تیرہ برد دست پا سوے حق

§ چو درچکد زدہان ظروف در کاسہ — زلحن بالبدی خوشترا ست آں لق لق

* الحق - ایلیٹ ۲۹۳ صفحہ ۹۸ - نے اس کی تقلید کی ہے -

† کند بکند دور رنگ گل راشق - ایضاً

‡ صرف اوزلی ایڈ ۶۹ صفحہ ۳۹۵ میں -

§ ایضاً

*غلام آں مے نابم کہ از رخ خوباں | بہ یک دو کاسہ بگیرد ہزار گونہ عرق
مے از جہالت جہال شد بہ شرع حرام | چو ماہ کز سبب منکران دین شد شق
†بدار خدائے کہ جزوے دگر خدائے نیست | کہ مے چوں مے خورم اجزائے من بگیرد حق
چو بو علی مئے صاف‡ ارخوری حکیمانہ | بحق حق کہ وجودت شود بہ حق ملحق$

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک تو مطلع و مقطع دونوں کی موجودگی' دوسرے تسلسل - شعر نمبر ۸ کی لطافت قابل داد ہے -

دوسری غزل چھے شعر کی ہے - یہ بھی مسلسل ہے - اس میں مطلع ہے مگر مقطع نہیں - غزل بحیثیت مجموعی خشک ہے اور اخلاقی مضامین سے مملو - ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں (ایلیٹ ۲۹۲ - فولیو ۱۹۳ بی) —

حرامست دہ چیز بر راد مرد | کزاں شش بود مرد ازادہ فرد
حسد بردن و سفلگی و دروغ | نمودن نیاز و ضعیفی و درد
چو نعمت بود دست بر دوستاں | بباید کشودن بداد و بخورد
چو شدت بود راز پیدا مکن | بہل تا شود رویت از درد زرد
سوالے نیرزد سراسر جہاں | چہ فرجام باشد یکے آہ سرد
اجل نرد بازست و ما مہرہ ایم | فلک کعبتین و جہاں تخت نرد

غضائری سنہ ۱۰۳۵

غضائری بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں ہے - وہ عنصری کا زبردست مد مقابل تھا یہاں تک کہ آخرالذکر نے ایک دن انتہائی برھمی کی حالت میں اس کے دیوان کو اس کی موجودگی میں دھودھا برابر

* صرت اوزلی ایۃ ۶۹ صفحہ ۴۹۵ میں
† آتشکدہ صفحہ ۱۷۵
‡ ناب - ایضاً -
$ حق مطلق ایضاً

کہا * - اس لیے غضائری کے اشعار بہت کم ملتے ہیں - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کے عمدہ غزل گویوں میں تھا - اس نے ایک بار محمود کی فرمائش پر ایاز کی تعریف میں ایک غزل لکھی اور انعام سلطانی سے مالا مال ہوا- اس کے شعر میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے —

ہزار بود و ہزار دگر ملک افزود بہ یک غزل کہ ز من خواست پر لطیف غزال

بد قسمتی سے ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی † اس لیے ہم اس کے ذکر کو یہیں چھوڑتے ہیں اور اس کے حریف عنصری کا ذکر کرتے ہیں —

عنصری سنہ ۱۰۴۰

عنصری دربار کا ملک الشعرا تھا اس لیے اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں - اس زمانے کے دستور اور اپنے پیشہ کے مطابق عنصری کا زیادہ وقت قصیدہ خوانی میں گزرا - کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عشقیہ مثنوی موسوم بہ وامق وعذرا بھی تصنیف کی تھی — .

بتخانے میں اس کی چار غزلیں مندرج ہیں - باڈلین میں اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ (ایلیٹ ۱۴) ہے جس میں تیرہ غزلیں ہیں - ان تیرہ غزلوں میں بتخانے کی جملہ غزلیں شامل ہیں - اس کے دیوان

* مجمع الفصحا (صفحہ ۳۶۸) کے الفاظ حسب ذیل ہیں" بالآخر کار بجائے رسید کہ بعد از ملاقات و مباحثات دیوان اورا گرفتہ در حضورے فروشست و بر درید لہذا شعرش باقی نماند "-

† عوفی اس کے حسب ذیل دو اشعار کو غزل کہتا ہے (صفحہ ۵۹) -

معربے خوبروے و بربط او چو یکے کوز پشت عاشق پیر
نالہ شیر خوار دارد لیک بکنار اندروں نہ خواہد شیر

مگر ظاہر ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں -

کے ایک مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۸ - ہم اسے آئندہ صرف سی - ۸ کہیں گے ) صرف پانچ غزلیں ہیں اور ایک دوسرے مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۱۲ ہم اسے آئندہ صرف سی - ۱۲ کہیں گے ) صرف تین - مگر یہ جملہ غزلیں متذکرہ بالا قلمی نسخے میں پائی جاتی ہیں - اس طرح عنصری کی موجودہ غزلوں کی تعداد صرف تیرہ رہتی ہے - ہم ان میں سے چند کا ذکر یہاں کریں گے —

اس کی ایک غزل ہے (بت خانہ اور اہلبیت ۱۱۴) —

سر زلف مشکین جانان من　　مرا کشت و پیچید بر جان من
بیا ترک سیمیں تن و سنگدل　　ہویدا بہ تو راز پنہان من
بہ فرمان من باش تا برخوری　　ترا بد نہ آید ز فرمان من
نہ گردم ز پیمان تو من بہ دل　　مگرداں تو دل راز پیمان من

آخرالذکر دو شعر اپنے مضمون کی وجہ سے قابل توجہ ہیں - جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں حضرت عاشق کی یہ معشوق نوازی اور معشوق کو تابع فرمان سمجھہ کے اس سے تعمیل ارشاد کی امید رکھنی' جو اس عہد کی شاعری میں اکثر پائی جاتی ہے' اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ شاعری بہ مقابلہ زمانہ ما بعد کی شاعری کے حقیقت سے قریب تر تھی -

عنصری کا ایک اور غزل کا مطلع ہے (بت خانہ اور اہلبیت ۱۱۴)

بہ مجلس اندر کاں بت مرا شراب دہد　　بہ من شراب و بد خواہ من عذاب دہد

بھلا یہ خوش قسمتی بعد کے اس عاشق کو جو بدقسمتی سے شاعر بھی ہو' کہاں نصیب -

شاعر کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ یوں تو عاشق ہر زمانے ہی میں خوش قسمت و بد قسمت ہوتے آئے ہیں اور رہیں گے' مگر شاعر کے لیے عاشق

ناکام بننا لازمی ہے، چاہے وہ بذاتہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔

عنصری کی ایک غزل صنعت ذو قافیتین میں بھی ہے - یہ صنعت ان ابتدائی دور میں قصیدہ گو شعرا کو بہت پسند تھی - اسی کا اثر ہے کہ عنصری نے، جو در حقیقت ایک قصیدہ گو تھا، اسے غزل میں بھی استعمال کیا۔ ہم اس غزل کے صرف تین شعر نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں - (بت خانہ وایلیمت ۱۱۴)۔

فغاں زاں پری چہرہ عیار یار | کہ با منش دائم بہ پیکار کار
دہانے چو یک نار دانہ دونیم | مرا ہست در دل ازاں نار نار
دو زلف سیاهش بماند بداں | کہ دوزاغ دارد بہ منقار قار

آخری شعر کی تشبیہہ قابل توجہ ہے - اس کی ثقالت متاخرین کے مذاق لطافت پر بار ہوگی - اتنے ابتدائی عہد میں اس مشکل صنعت میں غزل کا پایا جانا اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ قصیدہ کا تصنع اسی زمانے سے غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

حسب ذیل اشعار اس کی ایک اور غزل سے منتخب ہیں (دیوان - سی - ۸) —

بہ گرد ماہ براز غالیہ حصار کہ کرد | بہ روے روز براز تیرہ شب نگار کہ کرد
بہ ماہ مانی آنکہ کہ تو سوار شوی | چگونہ اے عجبی ماہ را سوار کہ کرد

یہ اشعار صاف طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا معشوق "ڈاڑھی باز" ہے اور اس لیے صنف تری کا فرد - مطلع کے دونوں مصرعوں میں "بر" کا زائد استعمال قابل لحاظ ہے —

عنصری کی ایک غزل کا شعر ہے * —

---

* سی - ۱۲ - یہ شعر سی - ۸ میں نا مکمل درج ہے - پہلے مصرعے میں " است لیکن " اور دوسرے مصرعے میں " ـوزن " چھوٹ گیا ہے -

دو لب چون دانہ نارست لیکن بہ نوک سوزن اندیشہ سفتہ

یہ تشبیہ اس کے ایک اور شعر میں پائی جاتی ہے جو اوپر درج کیا جاچکا ہے - لیکن اس شعر میں شاعر نے پہلے سے بہت زیادہ بلند پروازی کی کوشش کی ہے - یہی بلند پروازی اور مبالغہ ہے جس نے رفتہ رفتہ ترقی کرکے دور پنجم میں شاعری کو حقیقت سے کوسوں دور پھینک دیا اور اسے چیستان و معمہ بنا دیا —

عنصری کی غزلیں عموماً مسلسل ہوتی ہیں - ہر غزل میں مطلع ہے ' اگرچہ مقطع نہیں - ان میں کوئی خاص خوبی نہیں اور وہ اس عہد کے دوسرے بلند پایہ شعرا کی غزلوں سے یقیناً کم رتبہ ہیں —

رابعہ بنت کعب

اب ہم ایران کی پہلی شاعرہ * یعنی رابعہ بنت کعب کا ذکر کرتے ہیں - اس کا قریب قریب جملہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے اور سب نہایت بلند پایہ ہیں - تاریخ غزل گوئی میں اس کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے ' اس لیے ہم اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں —

اس کے عہد شاعری کے متعلق کافی اختلاف رائے ہے - صاحب مجمع الفصحا رضاقلی خاں نے اس کی زندگی کے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے اور اس وجہ سے اس کی رائے اس موضوع پر قابل استناد سمجھی جاتی ہے - اس اس کے نزدیک رابعہ رودکی کی ہمعصر تھی † - برخلاف اس کے عوفی

---

* بڑا تعجب ہے کہ اگرچہ براؤن رابعہ کا ذکر اپنی کتاب میں دو جگہ کرتا ہے ( صفحہ ۱۱۶ اور ۱۵۷ ) مگر پھر بھی جب مہستی کا ذکر کرتا ہے جو عہد سنجر کی شاعرہ تھی تو لکھتا ہے It would be unchivalrous to pass over in silence the first persian poetess that we have yet come across ( P. 334 vol. II. ) -

† " معاصر آل سامان و رودکی بودہ " صفحہ ۲۲۱ -

اسکا شمار عہد غزنویہ کے آخری دور کے شعرا میں کرتا ہے * - علاوہ اس وزن کے جو عوفی کی راے کو بوجہ قدامت کے حاصل ہے خود رابعہ کا کلام ایسا ہے کہ ہم رضاقلی خاں کی راے کو بغیرشبہہ کی نظر سے دیکھ نہیں رہ سکتے - لیکن ہمیں عوفی سے بھی اتفاق راے نہیں - مولانا جامی نے نفحات الانس † میں شیخ ابوسعید ابوالخیر کو' جن کی وفات سنہ ۱۰۴۹ ع میں ہوئی' رابعہ کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے دکھایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھہ عرصہ پہلے تیدھستی کو ترک کرچکی تھی - ان باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اسے اس عہد کی شاعرہ تسلیم کریں تو زیادہ غلط نہ ہوگا —

عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ ۶۱) —

"اگرچہ زن بود اما بفضل بہ مردمان جہاں بخندیدے - فارس ہردو میدان ووالی ہر دو بیان - برنظم تازی قادر ودر شعر پارسی بغایت ماہر و باغایت ذکائے خاطر و حدت طبع پیوستہ عشق باختے و شاہد بازی کردے" —

صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۲۲۲) -

"اورا میلے بہ بکتاش نامی غلامے از غلامان برادر خود بہمر سیدہ و انجامش بہ عشق حقیقی کشیدہ "! -

یہی وجہ ہے کہ مولانا جامی نے رابعہ کو اپنے تذکرۃ الاولیا یعنی نفحات میں جگہ دی ہے اور اس کے متعلق حضرت شیخ ابوالخیر کا یہ

* لباب صفحہ ۶۱ -

† صفحہ ۷۳۲

قول نقل کیا ہے * —

"سخنے کہ او گفتہ است نہ چنانست کہ کسے را در مخلوق افتادہ باشد"

چونکہ عشق نے اسے آتش بجان کر دیا تھا اس لیے اس کے کلام میں بھی اس دھکتی ہوئی آگ کی گرمی پائی جاتی ہے - اس کی غزلیں صداقت جذبات و سوز و گداز سے لبریز ہیں - افسوس کہ ہمیں اس کی صرف چار غزلیں مل سکیں اور ایک اور غزل کے دو شعر - اس کی پہلی غزل حسب ذیل ہے (مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲) -

عشق او † باز اندر آوردم بہ بند کوشش بسیار نامد سود مند
توسنے ‡ کردم ندانستم ہمی کز کشیدن سخت $ تر گردد کمند
عشق دریائے کرانہ ناپدید کے تواں کردن شنا اے ہوشمند §
عاشقی خواہی کہ تا پایاں بری پس بباید ساخت باہر نا پسند ¶
زشت باید دید و انگارید خوب زہر باید خورد و پنداریہ قند

مطلع میں بعد کے غزل گو شعرا خصوصاً سعدی و حافظ کا محبوب مضمون ' یعنی حضرت انسان بے بس ہیں ' خاص کر معاملات عشق ' میں بڑی سادگی اور پراثر طریقے سے نظم کیا گیا ہے -

ان اشعار کے کوزوں میں غم و حزن کا بحر نا پیدا کنار جس طرح بند کیا گیا ہے وہ اہل دل سے مخفی نہیں -

---

* صفحہ ۷۳۲ - ممکن ہے شیخ کی مراد رابعہ بصری سے رہی ہو اور مولانا کو ہمنامی کی وجہ سے دھو کا ہوا ہو - مگر فی الحال ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں - اگر کبھی اس کا ثبوت مل گیا تو صوفی کی رائے کے مطابق رابعہ کو اواخر عہد غزنویہ کا شاعر تسلیم کرنا پڑیگا -

† را - نفحات صفحہ ۷۳۲ - ‡ نفحات میں یہ غزل کا آخری شعر ہے -

$ تنگ - نفحات - § مستمند - نفحات -

¶ نفحات میں یہ شعر یوں ہے - عشق را خواہی کہ تاپایاں بری بس کہ بہ پسندید باید نا پسند -

رابعہ کی دوسری غزل حسب ذیل ہے * -

مرا بہ عشق همی محتمل † کنی بہ حیل چہ حجت آری تو پیش خدائے عز و جل
بہ عشقت اندر عاصی همی نیارم شد بدیلم اندر طاعت همی شود بہ مثل
نعیم با تو نہ خواهم جحیم با تو رواست کہ بے تو شکر زهر است و با تو زهر عسل
بروے نیکو تکیہ مکن کہ تا یک چند بہ سنبل اندر پنہاں کنند نجم زحل
هر آئینہ نہ دروغ ست آنچہ گفت حکیم فمن تکبر یوماً فبعد عزذل

مطلع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رهی ہے۔ اس نے غزل میں خاص تاثر پیدا کردیا ہے —

تیسری غزل ‡ —

زبس گل کہ در باغ ماوی گرفت چمن رنگ از نلگ مانی گرفت
مگر چشم مجنون بہ ابر اندر است کہ گل رنگ رخسار لیلی گرفت
بہ مے ماند اندر عقیقین قدح سر شکے کہ در لالہ ماوی گرفت
سر نرگس تازہ از زر و سیم نشان سر تاج کسری گرفت
چو رهباں شد اندر لباس کبود بنفشہ مگر دین ترسا گرفت

اس غزل کی زبان اتنی اچھی ہے کہ اسے بجا طور پر بہت بعد کے زمانے کی سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرا شعر اتنا لطیف ہے کہ اگر هم اسے فارسی کے بہترین اشعار میں شمار کریں تو بیجا نہ ہوگا —

رابعہ کی چوتھی اور آخری غزل گیارہ شعر کی ہے، اس میں

---

* سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب مجمع الفصحا اس غزل کو قصیدہ کیوں کہتا ہے، عوفی اسے نہایت پر زور طریقے سے غزل قرار دیتا ہے اس کے الفاظ یہ هیں (لباب صفحہ ۶۲)
" ایں غزل کہ از کتب غزال در حلاوت زیادہ است واز وصال یار صاحب جمال در طراوت پیش است، میگوید - غزل " -

† متہم - مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۴ -

‡ مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۴ یہ غزل لکھتے وقت مصنف لکھتا ہے " بعضے برودکی نسبت دادہ اند "

مطلع و مقطع دونوں ہیں، چونکہ ہم اس کے کلام کا کافی نمونہ دے چکے ہیں اس لیے ہم اس غزل کے صرف چار شعر درج ذیل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں - (دقائق الاشعار - فولیو ۲۰۴ اے) —

الا اے باد شبگیرے پیام من بہ دلبر بر
بگو آں ماہ خوباں را کہ دل با جان برابر بر

نگارا چوں تو بنشینی میان نیکواں وانگہ
بداں ماند کہ بنشیند خطیب مہ بہ منبر بر

ہر آنچہ آیدز عشق تو بر ایں خستہ دل مسکیں
نیامد از غم یوسف بہ یعقوب پیمبر بر

مدارا اے بلت کعب اندہ کہ یار از تو جدا ماند
رسن گرچہ دراز آمد گزر دارد بہ چنبر بر

اس غزل کا قافیہ و ردیف بمقابلہ اور غزلوں کے زیادہ مشکل ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رابعہ مشاق شاعرہ تھی - افسوس کہ اس کا کلام زیادہ مقدار میں نہیں پایا جاتا - اس کی زبردست قوت شعری اور تیغ عشق کا زخم خوردہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے بہت کافی کلام چھوڑا ہوگا - آخرالذکر امر نے اسے غزل گوئی کی جانب مائل کیا ہوگا، اس کے قریب قریب جملہ موجودہ کلام کا غزل کی صورت میں ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غالباً اس نے زیادہ غزلیں ہی کہی ہوں گی - علاوہ ان کی بذات خود بلند پایگی کہ رابعہ کی زبردست شخصیت، اس کے علم و فضل اور تقدس نے ان غزلوں کو اور وقیع بنا دیا ہوگا، اس سے صنف غزل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہوگی - اس عہد کے اور شاعروں کا کلام، جس سے ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے، اس امر کو بخوبی

واضح کرتا ہے —

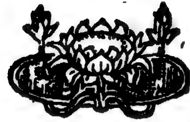
رابعہ کا ذکر چھوڑنے سے پہلے اس کے بقیہ دو شعروں کا، جو کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں، یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ (لباب صفحہ ٦٢)

دعوت من بر تو آں شد کایزدت عاشق گناد
بر یکے سنگیں دلے نا مہرباں چوں خویشتن

تا بدانی درد عشق و داغ مہر و غم خوری
تا بہ ہجر اندر بہ پیچی و بدانی قدر من

ان اشعار میں بھی وہی صداقت جذبات و سوز و گداز ہے جو رابعہ کے کلام کی خصوصیت ہے —

(باقی آئندہ)



# میر انیس کے غیر مطبوعہ اشعار

از

(قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا' پٹنہ)

میر انیس نے غزلیں کہیں یا نہیں؟ میر صاحب کے حالات زندگی کتابی صورت میں جن اصحاب نے لکھے ہیں' نہ معلوم انہوں نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے - اس وقت وہ کتابیں پیش نظر نہیں - 'نساخ' نے سخن شعرا میں میر انیس کے تین شعر درج کئے ہیں جو کسی طرح مرثیے یا سلام کے نہیں ہوسکتے - یہ اشعار میر انیس کے شایان شان نہیں - نہ معلوم نساخ کو کہاں سے ملے - حال میں ایک قلمی تذکرے میں مجھے میر انیس کی ایک مکمل غزل اور ایک مطلع ملا ہے - یہ تذکرہ میر انیس کے ایک معاصر نے لکھا ہے' اور کلام بھی میر انیس ہی کا معلوم ہوتا ہے -

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

شہید عشق ہوے قیس نامور کی طرح — جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح — ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ — کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہان آبرو یارب — چھپا مجھے صدف قعر میں گہر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں — مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
"انیس" یوں ہوا حال جوانی و پیری — بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

# لکھنؤ کا ایک لطیفہ

از

( جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب )

'اکبر' اور بیربل کے لطیفے تو زبان زد خاص و عام ہیں - ویسے بھی آپ نے اچھے سے اچھے لطیفے سنے ہوں گے تاہم کچھہ مضائقہ نہیں جو لکھنؤ کا بھی ایک لطیفہ سنیں - لکھنؤ بھی خدا اس کو سلامت رکھے عجیب و غریب شہر ہے - بگڑ بگڑ کر سنورتا ہے - اس کی رعنائیاں و دلربائیاں نت نئے شیدائی پیدا کرتی ہیں - پر جہاں ایسے قدر دانوں کی کمی نہیں وہیں رقیبوں سے مفر نہیں - بہت دن نہیں ہوئے کہ ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلی میں رقابت تھی - آئے دن دلی والے لکھنؤ والوں پر چوٹیں کیا کرتے تھے - ادیبوں اور شاعروں کی بزم ادب میں بس یہی ایک چرچا رہتا تھا - خوب گرما گرمی ہوتی تھی - ذراسی بات پر صفحے کے صفحے سیاہ کیے جاتے تھے - لیکن اب تو نہ 'داغ' ہیں نہ 'امیر' نہ اُن کے ہوا خواہ و قدر دان - نہ مشاعروں کی وہ گرما گرمی - خدا مغفرت کرے سجاد حسین مرحوم کی' اُن کے ساتھہ اودھ پنچ کا شباب بھی بیت گیا - ایک دولہا صاحب کا دم غنیمت تھا کل کی بات ہے کہ لوگ سال سال بھر تک اس دن کا انتظار کرتے تھے اور دور دور سے چلے آتے تھے کہ 'انیس' کے اس نام لیوا کو مجلس کے منبرؔ پر

بیٹھا دیکھہ لیں اور اس کا مرثیہ سن لیں - لیکن-

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری کا چرچا کم ہوگیا یا لکھنؤ سے مرثیہ خوانی اٹھہ گئی - چشم بد دور اب بھی اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں لیکن بقول جناب 'ظریف' کے اب تو خوش الحانی کی داد چاہی جاتی ہے' شاعری کہاں! مشاعروں کی بھی کمی نہیں - آئے دن ہر قصبے اور ہر ہوسٹل میں ہوتے رہتے ہیں لیکن جاکر دیکھیے تو وہ طوفان بدتمیزی کہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ نہیں کوئی سوراجیوں کا مظاہرہ عام ہے - غرض کہنے کی یہ ہے کہ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ زمانہ رہا - ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند !

پھر بھی نہ لکھنؤ کی رونق میں کمی ہے نہ اس کے رقیب ناپید ہیں- پہلے لکھنؤ اور دلی کا چرچا رہتا تھا اب لکھنؤ اور الہ آباد کا جھگڑا ہے - پہلے بزم ادب میں معرکے ہوتے تھے اب بساط سیاست پہ چالیں چلی جاتی ہیں اور الہ آباد کے پہلوان خم ٹھوک کر اکھاڑے میں اترتے ہیں- لکھنؤ غریب اب بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے - کوئی پوچھے کہ صاحب آخر یہ الٰہی بغض کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ راجدھانی تو الہ آباد ہے مگر سرکار کی نگاہ تلطف جب دیکھو تب لکھنؤ پر رہتی ہے - ہر فرمایش پوری کی جاتی ہے - ساری دولت و خزانہ اس کی آرائش و زیبائش پر لٹایا جاتا ہے - بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ اپنوں سے بیر غیروں سے ناتا - ہم سے تجھے اجی یہ رنڈاپا نہیں سہا جاتا - مانا کہ الہ آباد راجدھانی کہلاتا ہے پر لوشتۂ تقدیر تو نہیں کہ مٹایا بھی نہ جا سکے - ارے صاحب یہ تو بڑی پرانی مثل

ہے کہ جو پیا من بھائے سوھی سہاگن کہلائے۔ کوئی بات تو لکھنو میں ہوگی جو پیا من بھاتا ہے۔ لاکھہ سیرت اچھی سہی پر صورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ چہرہ پر نمکینی ہو جسے چھب کہتے ہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا سلیقہ ہو۔ گفتگو میں انداز دلربائی ہو تو لاکھہ آپ متقی و پرہیزگار ہوں نظر ایک دفعہ اُٹھہ ہی جاتی ہے۔ پھر دنیا میں سب متقی و پرہیزگار ہی تو نہیں ہوتے۔ طبیعتیں شوقین مزاج و طرحدار بھی ہوتی ہیں۔ البتہ لگتی کہیے کا' شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ کتنے ہیں کہ جو چاہے کالی ہو' بھدی ہو' بھونڈی ہو' لیکن محض بیوی ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کبھی کسی اچھی صورت پر نظر اُٹھا کر نہیں ڈالتے۔ راجا ہو یا پرجا' خاصۂ انسانیت سے تو کوئی خارج نہیں۔ کار پردازان حکومت بھی تو آخر انسان ہی ہیں کوئی فرشتہ تو نہیں۔ پھر اگر لکھنو کی رعنائیاں و دلربائیاں ان کو اپنا شیدائی بناتی ہیں اور اس کا جذب انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے تو یہ کون سا الزام ہے۔ لوگ کہتے ہیں' میں نہیں کہتا' کہ الہ آباد میں سوائے آمرود' کھیریل اور پراگ والوں کے دھرا کیا ہے؟ ایک حضرت 'اکبر' تھے سو خدا بخشے وہ بھی اب نہ رہے۔ پھر الہ آباد کو 'اکبر' پر ناز بیجا ہے وہ تو اودھ پنچ کے نو رتنوں میں سے ایک انمول رتن تھے اُن کو الہ آباد سے کیا واسطہ۔ یہ صحیح ہے کہ الہ آباد اقلیم سیاست و صحافت کا بادشاہ ہے اور بالعموم اخباروں اور رسالوں کو لکھنؤ کی آب و ہوا موافق نہیں آتی' اسی لیے حضرت 'جوش' ملیح آبادی نے "کلیم" کے لیے پنجاب کی قربت میں دھلی کا آشیانہ ڈھونڈ نکالا۔ لیکن جب ایسا ہے تو پھر آخر آپ نے اس غریب 'پاینیر' کو بڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے اور دم توڑنے کے لیے لکھنؤ کیوں بھیج دیا؟ لاکھوں روپیہ

مریض کی تیمارداری پر صرف کیا جا رہا ہے پر بوسیدہ ہڈیوں میں کوئی جوانی کی روح کیسے پھونک دے ؟

مذاق کی تو بات ہی دوسری ہے - پر سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ لکھنؤ ہی ہے - لاکھ اُجڑ گیا بگڑ گیا پھر وہی شہر ہے - مٹی مٹائی عظمت و تہذیب کی انمول نشانی ہے - شایستگی و شرافت کا گھر ہے - اودھ کی سرزمین اور لکھنؤ بھی وہ مردم خیز خطہ ہے کہ علم و ادب کی مجلس میں وہ وہ نامور پیدا کیے کہ جنھوں نے اپنا سکہ زمانہ پر بٹھا کر چھوڑا - انشا و سودا - آتش و ناسخ - انیس و دبیر - نسیم و میر حسن نواب مرزا شوق اور رجب علی بیگ سرور کا نام کون نہیں جانتا - خیر - یہ تو پرانی داستانیں ہیں - لیکن سرشار کو گذرے ہوے تو بہت دن نہیں ہوے اُردو میں فن فسانہ نگاری کا موجد تھا - مٹے مٹائے لکھنؤ کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی وہ وہ تصویریں اپنے قلم سے کھینچ گیا ہے کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں - جب تک ہندوستان میں اُردو کے قدر دان اور پڑھنے والے موجود ہیں فسانۂ آزاد کے 'خوجی' کو بھول نہیں سکتے - وہ دم بدم ان سے تھٹول کرے گا اور ان کو ہنساتا رہے گا - ہندو ہوں یا مسلمان - اردو والے ہوں یا ہندی والے - اس میں عورت و مرد کی بھی تخصیص نہیں - گلزار نسیم کس نے نہیں پڑھی - گل بکاولی کا تماشہ کس نے نہیں دیکھا - بیسوں شعر ضرب المثل ہوگئے اور سیکڑوں زبان زد خاص و عام ہیں - نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا نام کس نے نہیں سنا - آج بھی پڑھنے والے کلیجہ تھام کے رہ جاتے ہیں - لندن پنچ کی تتبع میں نہ معلوم ہندوستان میں بھی پنچ نہ رنگ کے کتنے ہی اخبار نکلے ہندی پنچ' بمبئی پنچ وغیرہ وغیرہ' لیکن اودھ پنچ کا سا شباب کسی

کو نصیب نہ ہوا - اس گلشن ظرافت کے پھول نہ مرجھاتے ہیں نہ باسی ہوتے ہیں - ویسے کے ویسے ہی بکھرے پڑے ہیں - جب جی چاہے چن کر اور بن کر گلدستہ بنا لیجیے - اس چمن کی تختہ بندی اور آبیاری اُن نکتہ رس اور بذلہ سنج زندہ دل طبیعتوں نے کی تھی جن کی ظرافت' زندہ دلی ' طنز و تمسخر اور بذلہ سنجی کی دھاک اور سکہ ہر کہ و مہ پر بٹھایا ہوا تھا - جو بر رو آیا اُسی نے منہ کی کھائی - مرزا سجاد حسین مچھو بیگ ستم ظریف - تربھون ناتھہ ہجر - اکبر حسین اکبر - جوالا پرشاد برق - نواب سید محمد آزاد - محمد علی کسمنڈوی وغیرہ اودھ پنچ کے وہ نو رتن تھے کہ جن کا نام دنیائے صحافت میں خدائے سخن کا مرتبہ رکھتا ہے - دولہا صاحب دیکھنے میں دبلے پتلے ' کمزور اور بوڑھے آدمی تھے - گردن ہمیشہ مراقبہ میں رہتی تھی مگر طبیعت میں دریائے سخن موجزن رہتا تھا - مضامین تھے کہ اُمڈتے چلے آتے تھے - مرثیہ گوئی کا جوہر انیس سے ورثہ میں ملا تھا - مرثیہ خوانی کا کمال خدا دادِ تھا - جس وقت منبر پر بیٹھتے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بند پڑھتے تو رن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا - معلوم ہوتا تھا کہ دراصل کوئی شہسوار شمشیر بے نیام کر رہا ہے - خدا جانے اس وقت ان بوسیدہ ہڈیوں میں کس بلا کی طاقت اور کہاں سے آجاتی تھی - بات یہ تھی کہ صاحب کمال تھے - اگر یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا - شاہی درباروں میں قدر و منزلت ہوتی - ہر اخبار و رسالے میں تصویریں چھپتیں اور نہ معلوم کتنی یادگاریں اب تک قائم ہو گئی ہوتیں - لیکن اس بد نصیب ملک کے ماہران فن و صاحبان کمال کے یادگاروں کی کس مپرسیِ کی حالت تو اسی شعر کے مصداق ہے کہ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے　　نے پر پروانہ سوزد نے صداے بلبلے

علم ادب و صحافت، شاعری، موسیقی، دستکاریوں کی صنعتیں، خور و نوش کے تکلفات ہر تہذیب و تمدن کی جان ہوا کرتے ہیں - قوموں کی شایستگی و شرافت کا پتہ انہیں باتوں سے چلتا ہے - میں کہہ چکا ہوں کہ اس مٹی مٹائی حالت میں بھی لکھنؤ شرافت و شایستگی کا گھر ہے - ہندوستانی تہذیب کا مرکز ہے - علم ادب و صحافت سے قطع نظر نغمہ وسرود تو لکھنؤ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے - گو زمانہ کے انقلاب نے اب یہاں کی رقص و سرود کی محفلوں کا رنگ ماند کردیا ہے - 'سنیما' اور 'ڈانس' کی اُچھل کود کے آگے انہیں کون پوچھتا ہے - مگر بہت دن نہیں گذرے کہ لوگ کالکا کا ناچ اور بندہ دین کی ٹھمریاں اور ہولیاں دور دور سے سننے آتے تھے - فی زمانہٖ کھادی اور چرخے کی دھوم ہے - دستکاریوں کی نمائشیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں - نئے نئے قسم کے چرخوں اور کرگھوں کی ایجاد کے لیے سینکڑوں روپے کے انعام دیے جاتے ہیں - ہاتھ کا بنا ہوا معمولی دیسی کپڑا عجائبات میں سے سمجھا جاتا ہے - اگر آنکھیں ہیں اور قدر کرنا جانتے ہو تو لکھنؤ کی چکن اور ٹانکے کی جامدانی ملاکر دیکھو کہ دستکاری کی صنعت و معجزہ کسے کہتے ہیں - اس جامدانی کو ہاتھ میں لیتے ہی بخدا طبیعت بے ساختہ چاہتی ہے کہ بنانے والے کے ہاتھ چوم لے - مٹی کے کھلونے ہر قصبہ و شہر میں بنتے ہیں مگر یہ بات صرف لکھنؤ کے ہی کھلونوں میں ہے کہ صرف جان ڈالنے کی کسر معلوم ہوتی ہے - لکھنؤ کے مطعون کرنے والے تو بہت ہیں لیکن فصل پر ملیح آباد کے سپیدے اور لکھنؤ کے دسہری کے پارسل کا بیچینی سے انتظار کیا جاتا ہے زردہ اور قوام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے پھر لکھنؤ ہی لکھنا

پڑتا ہے - لکھنؤ پہنچتے ہی بیگماتی گلوریوں کی فرمائش ہوتی ہے - ککڑی کی کیا حقیقت ہے - ایسی کوئی کھانے کی چیز ہی نہیں، لیکن جہاں "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں اور مجنوں کی پسلیاں ہیں" کی صدا کانوں میں آئی بے اختیار طبیعت للچاتی ہے اور خدمت گار کو حکم ہوتا ہے کہ دو پیسے کی لے آنا - ایک کیا سیکڑوں باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے - شبہ نہیں کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن شرافت و شایستگی کے تکلفات کی انہی چھوٹی باتوں سے ہر قوم کے تہذیب و تمدن کا اندازہ ہوتا ہے - یہی وہ باتیں ہیں جنہیں آپ فی زمانا مروجہ زبان میں Culture کہتے ہیں مگر اسے کیا کیجیے کہ ہمارے میدان سیاست کے سورما اور سور بیر اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن بھی شایستگی کے نام کا اہل ہے - انہوں نے اس سے زیادہ پڑھا اور سمجھا ہی نہیں کہ ہندو تہذیب کا ماحصل "چوٹیا و دھوتیا" ہے اور اسلامی تہذیب کا لب لباب - "گھٹنا اور بدھنا" - ان کے آگے اس دکھڑے کا بیان اسی ہندی مثل کا مصداق ہے کہ "اندھے کے آگے روئیے اور اپنے نین کھوئیے"! —

آپ کہیں گے کہ دعوت دی تھی لطیفہ سننے کی اور لگا یہ دکھڑا رونے - سو یہ بکواس بھی بالکل بے محل نہ تھی - اس تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ آپ لطیفے کا پورا لطف اٹھا سکیں - اچھا تو سنیے - مگر ہاں ایک بات کہنی بھول گیا اور وہ بہت ضروری ہے - یعنی یہ کہ جو کچھ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں وہ الہ آباد والوں کو برا نہ لگے - یہ فقیر تو اکبر آباد مرحوم کے اُجڑے دیار کا رمتا جوگی ہے - اسے نہ لکھنؤ کی پچ نہ الہ آباد سے کد نہ دلی سے واسطہ - صرف اتنا جانتا ہے کہ مست کا بول بالا رہے -

اچھا، لطیفہ سنیے - سنی ہوئی بات ہے، آنکھوں کی دیکھی نہیں -

اس لیے عذاب دروغ بر گردن راوی - کوئی چار پانچ برس کی بات ہے کہ ہنگامۂ انقلاب برپا تھا - ملک میں چاروں طرف سے سواے 'مہاتما کی جے' کے کوئی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی - لکھنؤ میں بھی جوش کافی تھا - مرد تو مرد عورتیں بھی اور اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں بے نقاب ہوکر میدان کارزار میں نکل آئی تھیں - عورتوں کی ہمت اور بہادری کا ہر طرف چرچا تھا - لوگ ان کی ہستی اور حقوق کے قائل ہوگئے تھے - اسی زمانہ میں میونسپلٹی کا الکشن ہونے والا تھا - سوراجیوں نے تو اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن اور ممبری کے امیدواروں کی کمی نہ تھی - چنانچہ چوک وارڈ سے ایک ڈاکٹر صاحب ممبری کے لیے کھڑے ہوے تھے - ان کا خاندان لکھنؤ کے پرانے خاندانوں میں تھا - پھر اپنے کام میں ہشیار تھے لوگوں کو ان کی ذات پر بھروسہ تھا - ان کے حامیوں اور مددگاروں کی کمی نہ تھی - یقین تھا کہ ممبر ہوجائیں گے - پر کوئی شخص کیسا ہی ہر دل عزیز کیوں نہ ہو خار کھانے والے اور مخالف ہر شخص کے ہوتے ہیں - کسی صاحب کو ان سے کد تھی - ہرانا اور جتانا تو ان کے بس کی بات تھی نہیں پر ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرنے کی انہوں نے ٹھانی تھی - آدمی سوجھ بوجھ کے اور بڑے دل لگی باز تھے - اور وثیقہ سلامت رہے دل لگی بازوں اور بے فکروں کی اب بھی لکھنؤ میں کمی نہیں - انہوں نے ایک بی صاحبہ کو ابھارا کہ ممبری کے لیے کھڑی ہوجائیں اور ڈاکٹر صاحب کا مقابلہ کریں - بی صاحبہ لکھنؤ کی مشہور گانے والیوں میں تھیں - ان کے بھی ہواخواہوں اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی - میراثی اور سازندے دوڑ دھوپ کے لیے حاضر تھے - نئے بگڑے ہوے تماشبین اور سیٹھ ساہوکار روپیہ خرچنے کو تیار تھے - چوک

کی تمام طوائفیں بے فکرے وثیقہ دار اور دل لگی باز ووٹ دینے کو موجود تھے - بی صاحبہ کو بھی اچھی دل لگی ہاتھہ آئی - دل لگی کی دل لگی اور مشغلہ کا مشغلہ - کھڑی ہوگئیں - نئی نئی بات تھی - گھر گھر یہی چرچا تھا اور شہر بھر میں اس کا غلغلہ - ڈاکٹر صاحب بھی گھبرائے کہ عجیب لغویت کا سامنا ہے ' اگر ایک طوائف کے مقابلے میں جیتے تو کون سی سرخروئی اور ہارے تو ذلت ہی ذلت - پھر یاران طریقت کی فقرے بازی مزید براں - بہت کچھہ سوچ سمجھہ کر بی صاحبہ کو پیغام بھیجا کہ پانچسو روپے لے لیں اور بیٹھہ جائیں - کسی طرح پلڈ تو چھوٹے - بی صاحبہ بڑی ستم ظریف تھیں ' انہوں نے جواب میں کہلا بھجوایا کہ "ڈاکٹر صاحب تو بڑے آدمی ہیں اور یہ لونڈی کس قابل ہے پر ایک هزار میں ہی دیتی ہوں ڈاکٹر صاحب ہی بیٹھہ جائیں" - ڈاکٹر صاحب نے رقم تگنی کرکے دوبارہ پیغام بھیجا - اُس نے جواب میں کہلا بھجا کہ "میں روپیہ کی بھوکی نہیں - میں تو صرف عورتوں کے حقوق کی پیروی کی غرض سے ممبری کے لیے کھڑی ہوئی ہوں ' ڈاکٹر صاحب کسی شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ اور بہذار مغز خاتون کو اپنی جگہ کھڑا کرادیں ' میں وعدہ کرتی ہوں کہ بیٹھہ جاؤں گی اور مخالفت نہ کروں گی" - اب تو ڈاکٹر صاحب کا قافیہ بڑا تنگ ہوا ' لیکن بڑے گرگ باراں دیدہ تھے اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے انہوں نے وہ چال چلی کہ بی صاحبہ کی فقرے بازی کچھہ کام نہ آئی - الکشن میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑ دیا - لکھنؤ ' میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑنا گویا بھس میں چنگاری لگانا ہے - جب زیادہ جوش بڑھتا ہے تو نقض امن تک کی نوبت آتی ہے - محرم کے زمانہ میں حکومت کو پولیس کا خاص انتظام کرنا پڑتا ہے آج - کل بھی 'مدح صحابہ' کا قضیہ اس سلسلے

میں چھڑا ہوا ہے اور نقض امن کا اندیشہ ہے - شیعہ سنی کا سوال چھڑتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا - طوائفوں اور سازندوں ! اُن کے حامیوں اور ہواخواہوں کے دو گروہ بن گئے - ایک شیعہ اور ایک سنی - الکشن ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا - لیکن پالا ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ رہا - بی صاحبہ ہار گئیں مگر Sportsman تھیں اپنا ووٹ ڈاکٹر صاحب کو ہی دیا اور نتیجہ معلوم ہونے کے بعد بہ نفس نفیس ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے پہنچیں - ڈاکٹر صاحب اپنے خیمہ کے باہر خوش خوش کھڑے تھے - ان کی ٹکڑی کے لوگ ان کے ارد گرد جمع تھے الکشن کے جوڑ توڑ کا ذکر ابھی جاری تھا کہ بی صاحبہ بھی آپہونچیں - آگے بڑھیں اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے بولیں —

بی صاحبہ - ڈاکٹر صاحب الکشن کی جیت مبارک -

ڈاکٹر صاحب - اجی ہار جیت تو ہوا ہی کرتی ہے اس میں مبارک کی کیا بات ہے —

بی صاحبہ - نہیں 'مبارک' دینا تو میرا فرض ہے 'پر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے شہر کی بدنامی ہوگی -

ڈاکٹر صاحب - وہ کیسے ؟

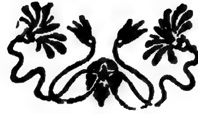
بی صاحبہ - اجی الہ آباد والے ویسے ہی روز ہم لوگوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں - انہیں ایک موقع اور مل گیا - کہیں گے 'اور صحیح کہیں گے 'کہ لکھنو والوں کی نگاہ میں عورت کی ہستی و حیثیت کی کچھہ قدر و منزلت ہی نہیں - عورتوں کے حقوق کا کچھہ پاس و لحاظ ہی نہیں -

ڈاکٹر صاحب - مجھے الہ آباد والوں کے کہنے سننے کا تو کچھہ غم نہیں

پر آپ سے شکایت ہے کہ آپ بھی ایسا کہتی ہوں -

بی صاحبہ - جو بات کھری ہوتی ہے کہنے میں آتی ہے - اچھا آپ ہی بتائیے ڈاکٹر صاحب' دیکھیے قران پاک کی قسم ہے سینہ پر ہاتھہ رکھہ کر سچ سچ کہیے گا' کہ آخر اس الکشن کے نتیجہ سے ظاہر کیا ہوتا ہے ؟ یہی نا کہ لکھنؤ میں مرد کم ہوں اور مریض زیادہ ! —

اس فقرے پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب کچھہ ایسا سٹ پٹائے کہ جواب دیتے نہ بنی —



# ادبی معلومات

( از " ناخدا " )

# ادبی معلومات

(از ناخدا)

## (۱) ایک ہسپانوی شاعری کی شہادت

(از :— ' پابلو نرودا ' (Pablo Neruda)

[ اسپین میں فاشسٹوں کا ظلم بیگناہ عورتوں اور معصوم بچوں کے قتل عام سے تجاوز کر کے ہر حقیقت بیں کی جان کا لاگو ہوگیا ہے - اوڑدو یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر اینلاس اور مشہور شاعر لورکا (Lorca) کی موت میں ایک جہان عبرت پوشیدہ ہے —

یہ مختصر مضمون جو دراصل ' لورکا ' کا نوحہ ہے ' جنوبی امریکہ کے نامور شاعر ' پابلو نرودا ' کا لکھا ہوا ہے - موصوف اب پیرس میں رہتے ہیں - ]

ہمیں جو جو گھاؤ لگے ہیں ' کیا میں ان میں سے ایک کو بھی بھول سکتا ہوں ؟ اندلس کے کسان ' مسطوریہ کے کوہکن ' دیہاتوں کے کاریگر اور شہروں کے مزدور جو ہمارے دشمنوں کی گولیوں کے شکار ہوگئے : ہزاروں عورتیں اور بچے جو ان کے برچھوں سے چھدے پڑے ہیں —— یہ سب ہمارے دیس کے لخت جگر تھے اور ان سب کی روحیں تمہارے آگے فریاد کرنے آئی ہیں - اگر تم فریب اور ظلم کے مخالف ہو تو یہ فریاد یقیناً تمہارے دل میں جگہ حاصل کرے گی - جس طرح جھولے بہتے بہتے کبھی زمین کے نیچے

چھپ جاتے ھیں تاکہ نئے جوش و خروش کے ساتھہ باھر اُبل آئیں ' اسی طرح دم بھر کے لیے ان کے نام زمین لیئم میں دفن ہوگئے ھیں - لیکن شہید کی یاد ھوا اور آگ کی طرح فور فانی ھوتی ھے —

یہ کیسے ھوسکتا ھے کہ میں ان میں سے صرف ایک ھی کا ذکر کروں اور دوسروں کی بات نہ پوچھوں ؟ - مگر سچ پوچھو تو اس نام میں ایسی تاثیر ھے کہ وہ تمام مظلوموں کی نمایندگی کرسکتا ھے - وہ سب اسی اصول کے لیے جیے اور مرے ' جس کے گیت گاتے ھوئے وہ سولی پر چڑھ گیا - وہ آخری سانس تک اپنے نغموں سے وطن کی حفاظت کرتا رھا —

فیڈرکو گارشیالورکا ! رباب کے تاروں کی طرح خنداں و شادماں اور اپنے ھم وطنوں کی طرح معصوم اور حساس تھا - زندگی بھر وہ عوام کا دم بھرتا رھا اور وہ بھی اس پر دم دیتے رھے - غداروں نے اس کی جان یہ سوچ کر لی کہ اس طرح ملک کی روح مجروح ھوجائے گی - وہ اسپین کی تازگی ' شگفتگی اور روشنی کو بجھانا چاھتے تھے —

یہ دو اسپینوں' دو خون کے پیاسے بھریوں کا مقابلہ تھا - ان میں سے ایک خونیں کفن میں لپٹا ھوا ' ریا اور ظلم کی اولاد ھے ' جو اپنے زھرآلود سانس سے ھر حیات آفریں عنصر کو مٹانے کے درپے ھے - دوسرا اسپین کا جواں مرد اور نیک دل ھے - اس نے اپنی محبت بھری آنکھوں سے دنیا کو ابھی ابھی دیکھا ھے - وہ ' لورکا ' کا اسپین ھے —

لورکا مرچکا ھے - وہ انسان جو انسانیت کی خدمت کے لیے زندہ تھا ' مرچکا ھے - اور اس مٹی کے نیچے دبا پڑا ھے جسے اس کے قاتلوں نے اس کی لاش پر ڈال دیا تھا - لیکن اسپین والوں کی دلیری کو آنچ نہیں لگی اور وہ اپنی آزادی کے لیے لڑ رھے ھیں - لورکا کے گیت اُن کے

حربے ھیں - یہ گیت انسانیت کی یادداشت پر خون کی روشنائی سے
لکھہ دیے گئے ھیں اور ھمیشہ لکھے رھیں گے —

ھسپانوی ادب نے دو تخلیقی دور دیکھے ھیں - ایک تو لوپ دواگا
( Lopedvaga ) کا زمانہ - عہد متوسط کے وہ دن جب لوگ اس جادو
بیان ادیب کے دامن کو بوسہ دیا کرتے تھے - یا پھر اس کے بعد آج کا
دن ھے کہ مضمون اور طرز کی ایسی بوقلمونی کبھی دیکھنے میں نہ آئی
اور نہ عوام میں شاعری کا ایسا چرچا ھوا —

لورکا خالی خولی جمال پرست نہ تھا - اس کی نظمیں اور تمثیلیں
جذبات انسانی میں ڈوبی ھوئی ھیں اور اس کی شاعری انسانیت کے
غم سے لبریز ھے - عوام کو اس کا منشا سمجھتے دیر نہ لگی اور انھوں
نے دل کھول کر اس کے گیت گائے اور انھیں ساری دنیا نے سنا —

اس کی تحریروں کی حقیقت پسندی کو جنوبی امریکہ نے بہت سراھا -
جنوبی امریکہ اور اس کے جنم دیس یعنی اسپین کے مابین زمان و
مکان نے صدیوں کی دوری اور سمندروں کا فاصلہ پیدا کر دیا ھے ' پھر
بھی وہ اس نوجوان شاعر کا شیدائی تھا کیونکہ وہ اپنے وطن کے غم کا
آئینہ دار تھا - تین سال پہلے میں نے جنوبی امریکہ میں اس کے ناٹکوں
کو اسٹیج پر دیکھا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا - اس نے قدیمی
ھسپانوی ڈرامے کو نئی جلا دی تھی - اس کی تحریر میں محبت اور
موت بغلگیر ھوکر رقص کر رھی تھیں - میں نے دیکھا کہ سب تماشائیوں
کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ھوئی تھیں —

اس کی تصویر کھینچنے کی قدرت مجھے نصیب نہیں - اس کے اخلاص '
انتھک محنت ' نیکی اور خوش مزاجی کا اندازہ الفاظ سے کیسے لگایا

جا سکتا ہے؟- وہ اپنے ساتھ خوشی کی لہریں لیے چلتا تھا —

اندلس کے دو شاعر لورکا اور البوتی زندگی کے شیدائی تھے - ان کے گیت میں رس ہے ' وہ ہمارے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں ' وہ چھوٹے بڑے سب کے شاعر ہیں- ان کی شاعری کا سوتا ایک ہی جگہ سے پھوٹتا ہے ' یعنی اندلس اور کیستائل کے پرانے دیہاتی گیتوں سے - ابتدا میں یہ رجحان ایک تجسس اور تلاش کی حیثیت رکھتا تھا؛ جیسے کوئی نکھرے سنورے چمنوں کی سیر سے تنگ آکر سیدھے سادے رمنوں میں جا نکلا ہو - ان کی تلاش کا پھل بہت میٹھا تھا کیونکہ ان کی شاعری میں جو جدت پیدا ہوئی وہ بہت مفید اور دور رس تھی- یہ دونوں جگری دوست تھے-

لورکا کی ناٹک منڈلی نے پورے ملک کا دورہ کر کے لوپ دوگا اور سرونٹیس ( Cerventes ) کے قدیم اسٹیج کو از سر نو زندہ کیا - یہ لورکا ہی کی ذات ہے جس کی وجہ سے اسپین کے ہر حصے میں ادب قدیم کی عظمت زندہ ہوئی- پہاڑیوں کے رہنے والے بھوکے ننگے جو موٹر اور گراموفون سے بھی نا آشنا تھے ' اپنے پرداداؤں کی زبان کو سن کر اور پرانی رسموں کو اسٹیج پر دیکھ کر چونکے- ان میں زندگی کا شوق پیدا ہونے لگا-

لورکا کو ہر لمحہ اس ستم سے دو چار ہونا پڑتا تھا ' جو امیر غریبوں پر توڑتے ہیں - اس نے اپنے سامنے ایک ایسی دنیا دیکھی جس میں صرف ایک راگ سنائی دیتا تھا اور یہ بھوک کا راگ تھا - یہ سب دیکھتے دیکھتے اس کا دل بھر آیا—

جب لورکا اپنے دیہات میں رہتا تھا تو اس نے ایک عجیب واقعہ دیکھا- سورج نکل رہا تھا اور گھر میں قدرت کی رنگینی چھپ گئی تھی - ایک مینڈھا کسی بہت بڑے بت کے سائے میں گھاس چر رہا تھا - اتنے میں

سات سات سؤر اس پر یک بیک جھپٹے اور چشم زدن میں اسے پھاڑ ڈالا -

جب لورکا نے میڈرڈ میں ایک بڑے مجمع کو یہ واقعہ سنایا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی —

جب اسے انسان نما درندوں نے پھاڑ ڈالا تو مجھے یہ قصہ یاد آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ لورکا اس وجہ سے کانپ رہا تھا کہ اس کی روح اس کے انجام کو دیکھہ رہی تھی —

تم سمجھتے ہوگے کہ میں میدان جنگ کے شور شغب کو بھلا کر کوئی مافوق الحیات نغمہ سناؤں گا - یہ نہیں ہو سکتا - میری رگوں میں اسپین کا خون بہتا ہے اور میں نے وہاں جاکر اپنے بھائیوں کے مصائب کو اِنہیں آنکھوں سے دیکھا ہے - میرے کانوں میں اُنہیں کا نوحہ سمایا ہوا ہے - میں سیاست داں نہیں ہوں اور سیاسی کشا کش سے دور رہتا ہوں تو' بھی میری آواز میں غصہ ہے - شاید تم مجھہ سے اس کی توقع نہ کرتے تھے - لیکن مجھے سمجھو! ذرا یہ سوچو کہ انہوں نے ایک ایسے آدمی کو مار ڈالا جو ہم سب کا سر تاج تھا - ہم لورکا کے قتل کو نہ بھول سکتے ہیں نہ معاف کر سکتے ہیں - کبھی نہیں ' کبھی نہیں !! —

# (۲) ادب عالم اور ادب جدید

از

کارل ریڈک

[ سوویت روس کے مشہور اہل قلم کی ایک تقریر کا یہ خلاصہ ہے - ]

سرمایہ داری کا انحطاط کوئی مسلسل دھارا نہیں ہے - کیونکہ ہر

دور کے انحطاط میں بھی یہاں وہاں ترقی کی ایک آدھ کرن پھوٹ پڑتی ہے -
یہی حال سرمایہ داری کے دور کے ادب کا ہے - کبھی کبھار وہ ایسے
شہپارے پیدا کر دیتا ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں - ہمارا فرض ہے کہ
اس زمانے کے مختلف رجحانات کو دیکھیں اور پرکھیں -

ادب جدید سے وہ ادب مراد ہے جو جنگ عظیم کہ ساتھہ شروع ہوا -
اس واقعہ کو اب لگ بھگ ۲۵ سال ہوے - اس مدت کو ہم تین حصوں
میں بانٹ سکتے ہیں تا کہ ان پیمانوں سے ادب عالم کی گونا گوں
خصوصیتوں کو جانچیں - یعنی : جنگ ' انقلاب روس اور فاشیزم کا نزول

## جنگ عظیم اور ادب

جب یہ ہولناک لڑائی شروع ہوئی تو ہم نے کیا دیکھا کہ ' ادب
براے ادب ' کے تمام جگادری نمائندے سامراجیوں کہ ساتھہ ہوگئے اور
کروڑوں معصوم انسانوں کہ خون ناحق کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا -

اناطول فرانس ( Anatole France ) جیسا دانا ، جو فرشتوں کی
بغاوت کے لیے بھی مادی اسباب ڈھونڈا کرتا تھا * سامراجی پر چار کے چکر
میں آگیا - ' صرف روماں رولاں ' نے جنگ کے دیوتا کے آگے سر نہ جھکایا -
لیکن اسکا احتجاج عدم تعاون کی حد سے آگے نہ بڑھا اور وہ امن پسندی
کے گوشۂ عافیت میں جا چھپا -

مشہور ادیبوں میں سے صرف دو نے کھلم کھلا اس جنگ کی
مخالفت کی - گورکی اور مارٹن انڈرسن نیکس ( M. Anderson Nexoe ) -
سنہ ۱۹۱۶ ع میں فرانس کے نامی انشاپرداز هینری بارجوس نے اپنا ناول
' Under Fire ' شائع کیا - اس زمانہ میں هم لوگ لینن کے ساتھہ سویٹزرلینڈ

* Revolt of Angels اناطول فرانس کا مشہور طنزیہ رومان ہے -

میں تھے اور ہم سب کی متفقہ راے تھی کہ عوام کی بیچینی کا یہ پہلا اظہار ہے - لیکن درحقیقت جب جنگ ختم ہو گئی تو ادب میں امن پسندی کا رجحان بڑے زور شور سے شروع ہوا - ان کتابوں میں سب سے پہلے Remarque کے ناولوں کا نام آتا ہے - مگر اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جنگ کے بنیادی اسباب کے خلاف کچھہ نہیں کہتا - چنانچہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے دوسرے ناول "واپسی" The Way Back کا ہیرو جیسے ہی گھر پہنچتا ہے اس کے ملک پر فاشیزم کا نرغہ ہوتا ہے اور خود مصنف کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے - یہیں معلوم ہوتا ہے کہ ' خلاف جنگ ' ادب کتنا بے بساط ہے کیونکہ نئے سامراجی جنگ کے ناگزیر ہونے کو وہ رو بسور کر تسلیم کر لیتا ہے - مثلاً ایچ - جی - ویلس کے ناول Mr. Britling sees it through کو لیجیے - اس میں مصنف نے جنگ کے مظالم سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے - لیکن اب وہ کہہ رہا ہے کہ اگلے پچاس سال مسلسل لڑائیوں میں گزرینگے -

اس قسم کا خالی خولی احتجاجی ادب دیوالیہ ہوتا جاتا ہے 'اور اس کے بر عکس ایک نیا رجحان پیدا ہو رہا ہے جو عوام میں جنگ کی برکتوں کا پرچار کر رہا ہے - جاپان میں ان آتش پاروں کی تعداد وبائی جراثیم کی طرح بڑھ رہی ہے - جرمنی بھی اس ادبی تیاری میں پیچھے نہیں - وہاں کے نازی ادیب Johst اور Beumelberg آیندہ جنگ کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں -

یہ ماننے کی بات ہے کہ سرمایہ دارانہ ادب نے اس زمانہ میں اپنی خدمت ایمانداری سے انجام دی - وطن پرستی کا نشہ پلا کر یا یہ کہہ کر کہ دنیا کہ مصائب ختم ہوگئے اور ایک زریں عہد کا آغاز

ہونے والا ہے ۔

اس زمانے میں اشتراکی ادب گھٹنوں چلنا سیکھ رہا تھا ۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہ ایک نا معلوم منزل کا نشان بردار تھا ۔ اسے بلجھ زمینوں کو توڑنا تھا ۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ اپنے بچپن ہی میں بڑے بڑے شاہکار پیدا کر دے گا ۔ تاہم ایسی متعدد کتابیں چھپیں اور مقبول ہوئیں جن میں جنگ کے خلاف عوام کی بغاوت کی تصویر تھی ۔

اس سلسلے میں ہمیں جاپانی ادیبوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے ۔ ان کے سب سورما قید خانوں میں بند ہیں لیکن ان کی آواز آزاد ہے اور جاپانی مظلوموں کو دعوت عمل دے رہی ہے —

انقلاب روس اور ادب

برنرڈشا اور روماں رولاں جیسے دو چار انصاف پسند ادیبوں کو چھوڑ کر تمام سرمایہ دار مصنفوں نے تاریخ کے اس شاندار کار نامہ کی مخالفت کی ۔ انہیں یہ نہیں سوجھا کہ انسان ایک نئی دنیا بسانے چلا ہے ۔ اس انقلاب کے متعلق ان کی تحریریں کذب و افترا کے دفاتر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں ۔ البتہ جو ادیب خانہ جنگی کے دوران میں ہمارے دیس میں آئے ' ان میں سے کئی نے ہمیں سمجھنے کی کوشش کی ۔ ان لوگوں میں ہم ' فلپ پرائیس ' اور ' آرتھر ریلنسوم ' کا نام لے سکتے ہیں —

سرمایہ داری کا آشوب

یہ دن بھی گذر گئے اور پھر سرمایہ داری کے آشوب ( Crisis ) کا زمانہ آیا ۔ ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام تیزی سے زوال پذیر ہونے لگا اور دوسری طرف روس کا اشتراکی نظام فروغ حاصل کرنے لگا ۔

مفکروں اور ادیبوں کو اس پہیلی کا حل بوجھنے کے لیے مجبور ہونا پڑا اور ان میں سے کئی ہماری طرف رجوع ہونے لگے —

مثلاً (Theodore Dreiser) دیکھیے - ایک مرتبہ اس نے لکھا تھا پوری زندگی کے غور و فکر کے بعد بھی سماج کے مسائل کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا - لیکن اب وہ امریکہ کو مشورہ دیتا ہے کہ روس کی تقلید کرے - یا روماں رولاں کو لو - اس ادیب کو ہر قسم کی کشمکش سے نفرت تھی، لیکن آج وہ روس کا ہم نوا اور ہمدم ہے —

ڈریزر اور رولاں کی یہ تبدیلی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اِن میں سے پہلا حقیقت پسند اور دوسرا انسانیت پسند تھا - لیکن آندرے ژید (Andre Gido) کو کیا کہیے جسے روز مرہ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور وہ سرتا سر رنگینی اور رومان میں سرشار تھا —

بس ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے قلعہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے - اور جن کے دل میں انسانیت کا درد ہے وہ ہماری تائید پر کمر بستہ ہو رہے ہیں - یہ کام بڑی جرأت کا ہے، کیونکہ اپنے ماضی کی تردید کے لیے کوئی شخص واحد جلد تیار نہیں ہوتا —

مگر ان ادیبوں کو ابھی حال ہی میں تاریخ نے ایک عبرت ناک سبق دیا ہے - پانچ سال پہلے جرمنی کے نازیوں نے دنیا کے تقریباً سب مصنفوں کی کتابوں کو چوراہوں پر یہ کہہ کر جلا دیا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے، وہ ہمارا مخالف ہے' - انہوں نے زمانۂ حال کے ادب سے یہ دو ٹوک بات کہہ دی کہ تاریخ کے منظر پر آج 'جو جنگ شروع ہوئی ہے' اس میں کوئی راہ فرار نہیں ہے - دو میں سے کسی ایک کا ساتھ برملا دینا ہی ہے —

اس چلوتی کے باوجود کئی مصنف عجب حیص بیص میں مبتلا ہیں۔ اس ضمن میں ہم برنرڈ شا کے ڈرامہ ( Too good to be true ) کا ذکر کر سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سرمایہ داری کی گود میں پلا پھولا' یہاں تک کہ اس کی دنیا اسی پس منظر میں سکڑ گئی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ اس نظام کی بنیاد کتنی کھوکھلی تھی تو وہ جھجکا کہ میں بھی اسی گھروندے میں رہتا تھا اور اگر یہ بالو کی دیوار گری تو میں بھی دب جاؤں گا —

فاشیزم اور ادب

موجودہ جرمنی کے بہترین ادیب کا نام Hans Fallada ہے۔ اپنی مشہور تصنیف Little Man what now میں اس نے بڑی خوبی سے یہ دکھایا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں عوام کی حالت کیسی خستہ و خراب ہوتی ہے اور جمہوریت کے نام لیوا اُنہیں کیسے کیسے فریب دیتے ہیں۔ مگر فیشیزم کے متعلق مصنف کی رائے مبہم رہی اور بہت سے لوگ سمجھ نہ سکے کہ وہ اس کا موافق ہے یا مخالف۔ جب ہٹلر گدی پر براجا تو بہت باتیں بنانے کے باوجود بیچارے فیلیڈا پر اس کا ستم ٹوٹا اور نازیوں نے اس کی کتابوں کو مردود قرار دیا —

پولینڈ کے لکھنے والوں میں Kaden Bandrovski کا بڑا نام ہے۔ خاص طور پر اس کے رومان Black Wings کا شہرہ ہے۔ مگر اس میں پولش فاسسٹوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اطالوی ادب کے بارے میں وہاں کا سب سے بڑا اخبار Giornale d' Itaila لکھتا ہے : " ہمارے ادب میں ایک ایسے شباب کی تصویر ملتی ہے جو بہیمانہ امراض کا شکار ہے اور جس کی زندگی مطلق بے فیض اور بے مقصد

ہے - یہ کوئی ادبی کارنامہ نہیں ہے - یہ مجسم بے راہ روی ہے - جتنی جلدی یہ بیہودہ گوئی بند ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے "- ایک دوسرا اخبار ( Tevere ) لکھتا ہے کہ ' ہمارے ملک نے ایک بھی ادیب پیدا نہ کیا جو یہاں کے کسانوں کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچتا ' —

معلوم یہ ہوا کہ فاشیزم قدیم ادب کو مٹا تو سکتا ہے لیکن اس کی خانہ پری نہیں کرسکتا - اس کے برعکس سوویت روس کا ادب یہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ اس نے اب تک جاوداں ادب پارے پیدا نہیں کیے' تاہم حقیقت کا سچا سچا روپ پیش کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے -

## اشتراکی ادب

ایک نئے انقلابی دور کے ساتھہ دنیا میں ایک نیا اشتراکی ادب پیدا ہو رہا ہے - امریکہ میں ڈریزر اور سینکلر اسپین میں ریمن سینڈر اور فرانس میں روماں رولاں اس نئے رجحان کے پیشوا ہیں - روماں رولاں کی نئی عظیم الشان تصنیف Enchanted Souls ہمارے ادبی نظریہ کی سب سے بڑی فتح ہے —

دوسری طرف جاپان میں انقلابی ادب کا دھارا اتنا تیز ہے کہ روس کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک اس کا جواب پیش نہیں کرسکتا —

## نئے ادیبوں کی کمزوریاں

مجھے اپنے نئے ادیبوں میں کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں اور جب تک وہ دور نہ ہوں' وہ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے - ایک تو یہ کہ ان میں رکھہ رکھاو اور آداب کی کمی ہے - یہ یوں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو تمدن کی جمع پونجی سمجھہ بیٹھے ہیں - لیکن اُنہیں کارخانوں اور کھیتوں کے سوا اور کیا دیکھنے

کا موقع ملا ہے - کارخانہ اور اپنا علاقہ — لے دے کر یہی ان کی دنیا ہے اور اس دنیا میں صرف دو جاندار رہتے ہیں — سرمایہ دار اور مزدور- مگر مارکس کی تعلیم یہ نہیں ہے - اس کا قول ہے کہ دنیا کو ہر زاویہ سے دیکھو کیونکہ اس کا ایک ایک ذرہ اپنے میں عجیب و غریب امکانات رکھتا ہے —

دوسری کمی یہ ہے کہ ان کا طرز بیان بڑا پھیکا ہوتا ہے - وجہ یہ ہے کہ قدیم ادب نے اس کے لئے مناسب اسالیب پیدا نہیں کئے - اس کے لیے بڑی جاں فشانی کی ضرورت ہے - اس کے لئے وقت اور صبر کی ضرورت ہے - ہمارے ادیبوں کو چاہئے کہ وہ قدیم اور جدید ادب کے تمام بڑے نمایندوں کا مطالعہ کریں اور ان میں جو سیکھنے کی باتیں ہیں انہیں سیکھیں - لیکن انہیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارا اصل فرض عوام کو بیدار کرنا ہے اور ادب اس روش کا ایک وسیلہ ہے —

## (۳) چینی ادب اور قومی جنگ -

از

یاؤسن ننگ - (Yao - Hsin - Nung)

اس صدی کے آغاز تک چینی ادب کی حالت بڑی ابتر تھی - سماجی نظام میں اجداد پرستی اور سامنتی سرداروں کی پوجا کا غلغلہ تھا اور ادھر عوام کے دماغ پر اوہام کی سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی - چینی عبارت کی ہزار دقتوں پر مستزاد یہ کہ قدیم طرز انشا

جسے 'وین یان' کہتے تھے، عام طور پر مقبول تھی - یہ بلیغ اور لچھے دار طرز ہر سنجیدہ اور علمی موضوع کے لیے ناموزوں تھا —

مگر جب نئی روشنی پھیلی تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے پہلے ادب میں اس کا اُجالا پہنچا - یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ نئے ادیبوں کا راستہ اور مسلک ایک ہی تھا - کچھہ نے تو پرانے اداروں اور دقیانوسی اوہام کا مذاق اڑانا شروع کیا کیونکہ یہ ان کی انفرادیت کا تقاضا تھا - بعض نے بدیسی سامراج کی نفرت کی وجہ سے یہ راہ اختیار کی - لوسن Lu hsun کی طرح کچھہ ایسے بھی تھے جنھوں نے اُن قوتوں کا صحیح اندازہ لگایا جو ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی تھیں —

مگر اُن مختلف رجحانات کی تہہ میں ایک چیز مشترک تھی - وہ یہ کہ دنیا کو حقیقت کی نظر سے دیکھیں اور چین میں ایسی فضا پیدا کریں کہ وہ واقعات کا صحیح تجزیہ کرسکے اور انھیں عقل کے معیار پر پرکھہ سکے —

پہلے تو یہ ادبی تحریک سرمایہ دارانہ مغرب کی پیروی کرتی رہی - لیکن چین کے حالات ایسے نہ تھے کہ انیسویں صدی کے لبرلزم کو پلنپنے کا موقع دیتے - بہت جلد اس نے ایک مادی اور انقلابی شکل اختیار کرلی - ساتھہ ہی ساتھہ 'وین یان' طرز انشا کی مخالفت ہونے لگی - کیونکہ شہنشاہیت پرست ذہنیت سے اس کا چولی دامن کا ساتھہ تھا - اِس کے موید بول چال کی زبان کو جسے 'پیءوا' (pai hwa) کہتے ہیں' حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے —

جمہوریت کے برسر اقتدار ہوتے ہی بول چال کی زبان نے 'وین یان' کی پرانی جھول کو اتار پھینکا اور سنہ ۱۹۲۰ میں حکومت نے اسے سرکاری

زبان تسلیم کرلیا —

ہمارے ادب کا یہ زرین عہد تھا - یورپ کی عمدہ عمدہ کتابوں کے تراجم تیزی سے ہو رہے تھے - انہیں دنوں ہمارے قائد اور استاد لوسن نے 'ایک پاگل کی ڈایری' اور 'اہ کیو کی کہانی' لکھہ کر تخلیقی ادب کی داغ بیل ڈالی —

یہ سن یات سین کا زمانہ تھا ' جب چینی انقلاب جمہوریت کی منزلوں طے کرکے روس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا - اب تک ہمارا نصب العین 'ادبی انقلاب' تھا - لیکن لوسن نے ایک قدم بڑھ کر ' انقلابی ادب ' کا نعرہ لگایا اور اس کی گونج ملک کے کونے کونے میں جا پہنچی - انقلابی افسانوں اور ڈراموں کا انبار لگ گیا اور سنہ ۲۶ - ۲۵ تک یہی کیفیت رہی - یہ وہ دن تھے جب چنگ کائی شیک اور کمیونسٹ دوش بدوش شمال کی مہم پر نکلے تھے اور سامنتیوں کے آخری گڑھ کا قلع قمع کر رہے تھے - لیکن اس کے بعد چنگ کائی شیک نے یک بیک چولا بدلا اور کمیونسٹوں کا قتل عام شروع ہوگیا - اس کے بعد عرصہ تک انقلابی خیالات نرغہ میں رہے اور ترقی پسند ادب میں افرا تفری پھیلی رہی —

اس افرا تفری کی وجہ سے کئی رجحان پیدا ہوگئے - ان میں سے ایک تو رومانی تھا جس کا لیڈر کومی جو تھا جو چین کا مشہور شاعر ہے - دوسرا رجحان حقیقت پسندی کا تھا جس کا قائد 'ماؤتن' چین کا سب سے بڑا ناول نگار ہے - اس کے پیرو 'لوسن' کے اس اصول کے ماننے والے تھے کہ ادب کی بنیاد حقیقی مشاہدہ پر ہو ' طرز تحریر عام فہم ہو اور مقصد ہر کسی انسانی مسئلہ کی تحقیق اور کسی سماجی

ہیجان کی تصویر —

چینی ادیبوں کو اپنے ملک کی خاطر بڑی سختیاں جھیلنا پڑیں - ان میں سے میں کئی فوج میں بھرتی ہو کر سامنتی غداروں کے خلاف لڑے اور سیکڑوں چنگ کائی شیک کے ہاتھوں قتل ہوئے —

اشتراکی تحریک دب کر زیادہ مضبوط ہوتی گئی - سنہ ۱۹۳۰ میں لوسن کی صدارت میں اشتراکیت پسند ادیبوں کی ایک انجمن قایم ہوئی جس میں مختلف گروہوں کے نمائندے یک جا ہوگئے - انتہائی سیاسی مظالم کے باوجود یہ انجمن اپنا کام کرتی گئی - اس کے ارکان میں سے ماؤتن نے ' شفق ' اور ایک ادیبہ تنگ لنگ نے 'ماں' نامی رومان لکھا - یہ دونوں کتابیں از حد مقبول ہوئیں -

چنگ کائی شیک کی رجعت پرور حکومت نے ادبی انقلاب کو روکنے کے لیے پھر سے قدیم طرز انشا کو زندہ کرنے کی کوشش کی تاکہ عوام میں نئے ادب کا چرچا رک جائے - اس کے جواب میں ترقی پسند ادیبوں نے رومن رسم الخط اور عام تعلیم کا پرچار شروع کردیا - اور حکومت کو منہ کی کھانی پڑی -

ادھر جاپانی حملے کا آغاز ہوچکا تھا - اور حکومت اس سے چشم پوشی کرکے چین کے انتہا پسندوں کو چن چن کر مار رہی تھی - سنہ ۱۹۳۵ میں یہ ظلم انتہا کو پہنچ گیا اور ادبی انجمن کو اپنا دفتر بند کر دینا پڑا - لیکن جاپان کی مخالف چینی پارٹیوں کی جماعت بندی کے پرچار میں اس نے بڑا کام کیا -

اس دور نے چین کے سب سے بڑے تخلیقی ادیب کا منہ دیکھا -

' تین چن ' جو منچوریا کے ایک کسان کا بیٹا تھا ' بھاگ کر شنگھائی گیا اور وہاں اس نے "اگست میں ایک گانوں" نامی ناول شایع کیا - موجودہ چینی ادب کے بابا آدم لوسن نے اسے پڑھ کر کہا کہ اب تک چین میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی - اس کی بیوی کا شمار چین کی سب سے اچھی لکھنے والیوں میں ہوتا ہے - ساتھ ساتھ ساؤیو کا ڈرامہ ' طوفان ' شائع ہوا جو ملک کا بہترین ڈرامہ سمجھا جاتا ہے - کتنی عجیب بات ہے کہ چین کی تاریخ میں جو دور سب سے کٹھن ہے ' وہ اس کے ادب کے لیے ابر رحمت ثابت ہوا —

سنہ ۳۷ میں ' متحدہ محاذ ' کی تحریک نے حکومت کی مغرور گردن کو خم کردیا اور اب چین کا ہر فرد جاپان کے خلاف لڑ رہا ہے - اشتراکیت پسند گروہ بھی متحد ہوگئے اور اپنے استاد لوسن کی موت کے بعد انہوں نے اس کی مقدس میراث کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی - اس کی میراث تھی آزادی کی حفاظت - چین کا ہر ادیب آج اس کا نگہبان ہے —

اب چین کی تمام تمدنی ' فنی اور ادبی جماعتیں ایک واحد انجمن میں منظم ہوگئی ہیں اور چینی تمدن کی بقا اور فروغ کے لیے لڑ رہی ہیں - ان کا ایمان ہے کہ یہ صرف چین کی ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام انصاف پسندوں کی جنگ ہے - تمدن کسی ایک ملک کی جائداد نہیں - وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے - جو لوگ تمدن اور ادب کے دعویدار ہیں وہ اپنے چینی بھائیوں کے لیے آج کیا پیغام لائے ہیں؟

---

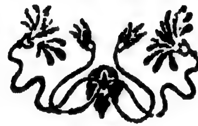
# (۴) ہندی شاعری کی ایک صنف - نائیکہ بھید

[دنیائے شاعری میں صرف ہندی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے محبوبہ کی تقسیم کوک شاستر کے اصولوں پر کی اور 'عورت' کے تخیل کو اتنا نجس اور ناپاک بنا دیا جس کی مثال کہیں نہیں ملتی - اس صنف کے متعلق ہندی ادب کے سب سے بڑے نقاد پنڈت مہاویر پرشاد دویدی کے خیالات یہاں درج کیے جاتے ہیں -]

دربار میں جگہ ملتے ہی شاعر کو یہ فکر ہوتا تھا کہ راجہ صاحب انواع و اقسام کی عورتوں سے کس طرح لطف اندوز ہوسکیں - دس سال کی معصوم لڑکی سے لے کر پچاس سال کی ادھیڑ بیوی تک کے باریک سے باریک فرق اور ان کے نک سک اور ناؤ بھاؤ کے تذکرے پر ہی شاعر اکتفا نہ کرتا تھا - عورتوں کو پھسلانے کے لیے کٹنیوں کو کیا کرنا چاہیے - مالن دھوبن وغیرہ میں کون اِس کام کے لیے موزوں ہوسکتی ہے اور کیوں کر؟ اس کا فیصلہ بھی شاعر ہی کرتا تھا - بھڑووں کے ذکر سے بھی یہ حضرت چوکتے نہ تھے - حتیٰ کہ تر٭ساتی پر بھی ان کی دوربین نظر پڑ ہی جاتی تھی - ایسی تصنیفوں اور نظموں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے -

ایسی کتابوں میں کیا لکھا ہوتا ہے ؟ طوائفوں کی بدکاریاں اور دوشیزاؤں کی عصمت فروشی اور بس ! یہ ننگ ادب تصنیفیں مشاطاؤں اور قحباؤں کی روسیاہیوں کی داستانیں ہیں - کٹنوں اور کٹنیوں کے ہت کنڈے یعنی وہ کس ترکیب سے مردوں اور عورتوں کو ملاتے ہیں ؛ بازار میں بیٹھ کر بیسوائیں کس طرح لوگوں کے دل لبھاتی ہیں -

بیویوں اور دوشیزاؤں کے ' بروگ ' کا کیا حال ہوتا ہے : کہیں کوئی ' نایکہ ' اندھیرے میں جمنا کے کنارے دوڑی جارہی ہے ' کہیں کوئی چاندنی میں روپہلی ساری پہنے گھر سے نکلی ہے اور ایک سنسان کُنج میں بیٹھہ کر اپنے یار کا انتظار کر رہی ہے - شام کو آئے ہوے پردیسی سے کوئی کہہ رہی ہے کہ میرا شوہر گھر پر نہیں ہے اور ساس اندھی ہے اس لیے رات تم یہیں بسر کرو - کہیں کوئی اپنے عاشق کے ساتھہ اپنی سکھی کو دیکھہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے - یہی باتیں بڑی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کے ساتھہ ان نظموں میں بیان کی گئی ہیں - اخلاق اور ادب کے لیے اس سے زیادہ قاتل زہر اور کیا ہوسکتا ہے !



# افکار و واقعات

(از ' اڈیٹر)

صفحہ





# افکار و واقعات

(از' اڈیٹر)

## ۱ - بمبئی اور پونا کا سفر

اس سے پہلے کئی بار خیال کیا اور کچھ کوشش بھی کی کہ بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہو جائے ' لیکن کوئی صورت نہ بنی - پچھلے دنوں ہمارے مہربان مولوی خلیل الرحمن جنھوں نے الہ آباد میں انجمن کی شاخ قائم کرنے اور اس کے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے سعیء بلیغ کی تھی ' بمبئی میں کچھ عرصے کے لیے مقیم تھے - ان کے اور مولوی نجیب اشرف ندوی پروفیسر گورنمنٹ اسمعیل کالج اندھیری اور بعض دیگر اصحاب کے صلاح و مشورہ سے یہ قرار پایا کہ مجھے بمبئی آنے کی دعوت دی جائے اور اُس وقت صوبۂ بمبئی کے لیے بمبئی شہر میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کی تدبیر کی جائے - مولوی خلیل الرحمن صاحب نے مجھے لکھا کہ یہ صورت ہے ' کیا رائے ہے - میں نے جواب دیا کہ کوئی تاریخ مقرر کر کے اطلاع دیجیے ' میں بلا تامل حاضر ہو جاؤں گا - چنانچہ جلسۂ مشاورت کی تاریخ ۹ مارچ قرار پائی - میں عین وقت پر پہنچ گیا - مولوی نجیب اشرف صاحب ندوی کے بنگلے پر تمام اصحاب جمع ہوگئے - اس مجلس میں اردو کے ہمدرد اور ہر طبقے کے نمایندے اچھی خاصی تعداد میں جمع تھے - دیر تک اردو کی اشاعت و ترقی اور انجمن ترقیء اردو کی شاخ قائم کرنے کے متعلق گفتگو رہی - اسی ضمن

میں وزیر فنانس صوبۂ بمبئی کے بجٹ اور اُن کی تقریر کا بھی ذکر آیا۔ بالآخر سب کی متفقہ راے سے یہ طے پایا کہ بمبئی شہر میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ انجمن ترقیء اردو صوبۂ بمبئی کے نام سے قائم کی جاے اور صوبے کے تمام اضلاع اور مشہور مقامات میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اُسی وقت ایک فہرست ارکان کی مرتب کی گئی اور اس عارضی جماعت کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے - پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب اس کے داعی (کنوینر) قرار پائے —

اس کے بعد ہی ڈاکٹر محمد بذل الرحمن صاحب پرنسپل گورمنٹ اسمعیل کالج کے ہاں ایک علمی مجلس تھی اور اس میں خاص خاص اہل علم مدعو تھے - میں بھی اس میں شریک ہوا اور حاضرین کے اصرار پر اردو زبان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تمام اہل بزم سے اردو کی اشاعت و امداد کی درخواست کی - اتفاق سے آنریبل مسٹر نوری، وزیر تعمیرات بھی وہاں موجود تھے - اُن سے طویل گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ وزیر اعظم سے مل کر زبان کے متعلق بعض غلط فہمیوں کو دور کر لیا جاے —

( آنریبل مسٹر کھیر وزیر اعظم حکومت بمبئی سے ملاقات )

مسٹر بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل نے اپنی عنایت سے وزیر اعظم سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا تھا - چنانچہ میں دوسرے روز (۷ مارچ کو) ایک بجے ان سے ملنے گیا - وہ بہت خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آے - میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ اب گورمنٹ ہیں، حریف یا مخالف پارٹی نہیں رہے ' اس لیے آپ کو ہر فریق سے یکساں برتاؤ کرنا چاہیے

اور خصوصاً اقلیتوں کے حق میں انصاف کرنا چاہیے - مسٹر کھیر نے فرمایا کہ انصاف ہی نہیں بلکہ جو اقلیتیں پس ماندہ ہیں اُن کے ساتھہ خاص رعایتیں کرنا بھی ہمارا فرض ہے - میں نے کہا کہ آپ کی زبان سے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور امید ہے کہ آپ کے زمانے میں ایسا ہی ہوگا - اس کے بعد میں نے کہا کہ ایسی حالت میں یہ کیا ضرور ہے کہ آپ کی حکومت کی طرف سے بلا وجہ ایسے لفظ استعمال کیے جائیں یا ایسی تجویزیں پیش کی جائیں جو دوسری جماعتوں یا قوموں کی دل آزاری کا باعث ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی اور غلط فہمی پیدا ہوگی - انہوں نے پوچھا کہ ایسی کون سی بات ہوئی ہے - میں نے کہا کہ ابھی حال میں آپ کے وزیر فنانس نے جو بجٹ پیش کیا اس میں یہ صاف طور سے تحریر ہے کہ اس قدر رقم اس صوبے میں ہندی کی اشاعت و ترقی کے لیے مخصوص کر دی گئی - اور اپنی تقریر میں بھی انہوں نے اس کا اعادہ کیا - کسی کانگریس حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ ملک کے خزانے کا روپیہ کسی ایسے صوبے میں جہاں کی زبان ہندی نہیں، ہندی کی اشاعت میں صرف کرے - انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ غلطی ہوئی - ہماری مراد اس سے ہندستانی تھی - میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ غلطی اکثر کانگریس حکومتوں اور ان کے وزرا سے ہوتی ہے حالانکہ کانگریس کا صاف اور صریح رزولیوشن موجود ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی، اور افسوس ہے کہ مجھے کانگریس کی حکومتوں اور کانگریس کے وزرا کو یہ بتانا پڑتا ہے - انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی اور جو آپ کا منشا ہے وہ مجھے لکھا دیجیے تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے -

چنانچہ میں نے انہیں لکھوا دیا کہ "ہندستانی" کا لفظ استعمال کرنا چاہیے اور ہندستانی زبان کی تعریف یہ ہے - یہ وہی تعریف تھی جو میرے اور بابو راجندرا پرشاد کے مشترکہ بیان میں درج ہے - میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ آیندہ زبان کے معاملے میں جب کبھی ایسی صورت پیش آئے تو انجمن ترقیء اردو سے مشورہ کر سکتے ہیں - اور اب چونکہ یہاں اُس کی ایک شاخ قائم ہوگئی ہے آپ کو اس میں زیادہ آسانی ہوگی - اس کے سکرٹری پروفیسر نجیب اشرف میرے ساتھ آئے ہیں ' آپ فرمائیں تو انہیں بلالوں ' آپ اُن سے مل لیجیے - چنانچہ پروفیسر صاحب سے وہ بہت خوشی سے ملے اور اُن سے فرمایا کہ جب کبھی ضرورت ہو آپ مجھ سے مل سکتے ہیں اور مشورہ دے سکتے ہیں - پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں سرکاری ملازم ہوں ایسے معاملات میں کیونکر مشورہ دے سکتا ہوں - فرمایا کہ سرکاری ملازم کا تو سب سے زیادہ یہ فرض ہے ' وہ تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں - غرض میں اس ملاقات سے بہت خوش ہوا اور مسٹر کھیر نے جتنی باتیں کہیں وہ نہایت معقول تھیں - لیکن سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ وہ اردو یعنی ہندستانی بہت اچھی اور بلا تکلف بولتے ہیں - میں نے ان سے انگریزی میں بات چیت شروع کی تھی لیکن جواب ایسی صاف اور اچھی اردو میں دیا کہ میں حیران رہ گیا —

( اردو زبان پر تقریر )

اسی روز شام کے سات بجے انجمن اسلام ہال میں میری تقریر تھی - یہ میرے آنے سے پہلے ہی طے ہوچکا تھا اور اس کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی تھی - جناب سید عبد اللہ بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل

نے صدارت فرمائی - جناب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر کے اثنا میں یہ بھی فرمایا کہ کانگریس کو ایک قومی ادارہ ہونے کا دعوی ہے اور بحیثیت ایک حقیقی قومی ادارے کے وہ اہل ہند کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت تسلیم کرتی ہے اور اس لیے اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندستانی ملک کی قومی زبان ہونی چاہیے - چنانچہ کانگریس کے دستور کے فقرہ ۱۷ میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ کانگریس کی تمام کارروائی عام طور پر ہندستانی زبان میں ہونی چاہیے - کانگریس کے خیال کے مطابق ہندستانی وہ زبان ہے جسے عام لوگ سمجھہ سکیں اور وہ دونوں رسم خط میں لکھی جانی چاہیے - اس کے بعد مسٹر بریلوی نے حکومت بہار کی ہندستانی کمیٹی کا ذکر کیا اور آخر میں اس افسوس ناک غلط فہمی کا ذکر کیا جو بمبئی کیبینٹ کی بجٹ کی تقریر سے پیدا ہوئی - فنانس منسٹر نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ ہماری حکومت نے قومی زبان ہندی کے لیے ایک معتدبہ رقم صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے - یہ لفظ "ہندی" فنانس منسٹر نے غلطی سے بلا ارادہ استعمال کیا تھا - مسٹر بریلوی نے فرمایا کہ میں سب کو اور خصوصاً مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے کانگریس کا حقیقی منشا ہندستانی تھا اور اس پر وہ عمل بھی کرنا چاہتی ہے -

مسٹر بریلوی نے اپنی آخری تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ وہ مقرر سے (یعنی مجھہ سے) اس امر میں پورا اتفاق کرتے ہیں کہ جب کہ کانگریس نے باضابطہ طور پر ہندستانی کو قومی زبان تسلیم کر لیا ہے تو اب ہر کانگریس والے کا یہ فرض ہے کہ وہ اس زبان کی ترقی کے لیے کوشش کرے - اور یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض کانگریس والے جب کبھی وہ قومی زبان کا ذکر کرتے ہیں تو اسے ہندی کہتے ہیں —

مجمع قابل اور صاحب ذوق لوگوں کا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ جلسے میں جو کچھہ ہوا اس سے وہ بہت مطمئن اور خوش تھے —

(پونا)

پونا کے بعض ہمدردان اردو کی خواہش تھی کہ کم سے کم ایک دن کے لیے وہاں ضرور ہو آؤں۔ منگل کے روز (۸ مارچ کو) ان کا تار بھی پہنچا۔ اس لیے مولوی نجیب اشرف صاحب کی ہمراہی میں پونا پہنچا۔ دوپہر کو سید ابوطاہر صاحب (اردو ترینِنگ اسکول) کے اصرار پر وہاں کے طلبہ کے سامنے اردو کی اہمیت اور اس بارے میں مدرسین کے فرائض پر تقریر کی۔ شب کے وقت مخصوص اصحاب کا ایک جلسہ مشورہ منعقد ہوا۔ اور اسی میں ایک عارضی کمیٹی بنائی گئی۔ جناب خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر صاحب، خان صاحب ہدایت اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو اردو اسکول، خان صاحب مولوی عبدالقدیر صاحب، مسٹر ابوطاہر صاحب، سید سبط نبی نقوی صاحب، خان صاحب باقر علی صاحب، زبیدہ خاتون صاحبہ (اردو ترینِنگ اسکول نسواں) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان صاحبوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پونا میں انجمن ترقیء اردو کی شاخ قائم کرکے اس کے مقاصد کو عمل میں لانے کی کوشش کریں گے —

میں اس خوش خبری کا منتظر ہوں

پونا میں سر رفیع الدین صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ اب ان کی بصارت جاتی رہی ہے لیکن عام صحت اور دماغی قوت اب تک ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اردو کے لیے بہت کچھہ کیا تھا —

## ۲ - ہندستانی اکیڈیمی کا سالانہ جلسہ

اسی سال ہندوستانی اکیڈیمی کا اجلاس بہت ہی ناگوار حالات میں ہوا - ہندو مسلم فساد کی وجہ سے الہ آباد درندآباد ہوگیا تھا - پہلا اجلاس ۱۹ مارچ کی سہ پہر کو ہوا - سر سلطان احمد اس سال صدر منتخب ہوے تھے لیکن وہ کسی وجہ سے نہ آسکے' اس لیے صدارت کا فرض بھی رائٹ آنریبل سرتیج بہادر سپرو نے ادا کیا - آپ نے موقع کے مناسب بہت اچھی اور پر لطف تقریر کی - شروع میں بڑی معقولیت سے ان اعتراضات کا جواب دیا جو بعض لوگ ہندستانی اکیڈیمی پر کرتے ہیں اور اس ضمن میں فرنچ اکیڈیمی کا بھی ذکر کیا جس کے سہ صدی جشن میں انھیں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا - آپ نے جدید ہندی کا بھی ذکر کیا اور کہاکہ آج کل جو تقریریں اس زبان میں کی جاتی ہیں اور جو ہندی ہندی رسالوں میں لکھی جاتی ہے وہ ہندی دانوں کی سمجھہ میں بھی نہیں آتی - آپ نے فرمایا کہ میں نے چند ہندی رسالے لیے اور ان کے مضامین بغور دیکھے' میں خود بھی ہندی جانتا ہوں اور اپنے ایک دوست کو جو ہندی زبان سے بخوبی واقف ہیں' انھیں بھی دکھائے - ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ تقریباً ۷۲ فی صدی ایسے الفاظ تھے جو ہم نہ سمجھہ سکے - ایسی زبان لکھنے سے کیا فائدہ جسے عام طور پر لوگ نہ سمجھہ سکیں - یہی اعتراض ان کا پنجاب کے بعض اردو رسالوں کے متعلق تھا - آپ نے میری طرف اشارہ کر کے کہاکہ یہ میرے سامنے بیٹھے ہیں ورنہ میں بہت کچھہ کہتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اردو جسے کہتے ہیں وہ ان کی اور ان کے

رسالے کی زبان ہے - ایک خیال انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ صورت کچھہ ایسی آپڑی ہے کہ هندی اور اردو اب دو الگ الگ زبانیں ہوگئی ہیں - کچھہ زمانہ پہلے ممکن تھا کہ وہ ایک ہوجاتیں لیکن اب ان کا ایک ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا - لہذا انہیں اپنے حال پر چھوڑدیا جائے اور اپنی اپنی راہ پر الگ الگ ترقی کرنے دیا جائے - اس خیال سے ان اصحاب کو ضرور افسوس اور صدمہ ہوگا جو ہندستان میں ایک مشترک زبان دیکھنے کے آرزو مند ہیں —

سرتیج بہادر نے اردو کے متعلق لکھنؤ میں بھی بعض خیالات کا اظہار فرمایا تھا جو ہماری توجہ اور غور کے قابل ہیں - وہ ہم نے ایک اخبار سے دوسری جگہ نقل کیے ہیں —

جناب صدر کی تقریر کے بعد هندی اور اردو شعبوں کے صدروں کی تقریریں ہوئیں - هندی شعبے کے صدر صاحب نے نہایت مختصر تقریر فرمائی یعنی صرف چند ہی جملے ارشاد فرمائے - اردو شعبے کے صدر جناب سجاد حیدر صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی تھی - رسم خط کے معاملے میں ان کی راے رومن حروف کے حق میں ہے - رسم خط کا مسئلہ آج کل ہر جگہ بحث میں آرہا ہے - صرف ادیب اور ادبی مجلسیں ہی اس پر غور نہیں کررہیں، بلکہ سیاسی جماعتوں میں بھی اس کا چرچا ہے - چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر نے بھی اپنے خطبے میں رومن حروف کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے —

آخر میں اکیڈیمی کے فاضل سکرٹری ڈاکٹر تارا چند نے ایک تحریر پڑھ کر سنائی - ابتدا میں بہت ہی مختصر طور پر اکیڈیمی کا ذکر تھا

لیکن اصل بحث ہندستانی زبان سے تھی - ان کی یہ راے ہے کہ اصل زبان ہندستانی ہے اور اردو اور ہندی اس کی دو شاخیں ہیں - ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جو ہندو مسلم اتحاد سے بنی اور جس میں نہ دقیق اور مشکل فارسی عربی الفاظ ہیں اور نہ سنسکرت کے - گویا یہ ایسی زبان ہے جسے ہندو مسلمان اور ہندستان کے دوسرے باشندے عام طور پر سمجھتے ہیں —

ہر سال پہلے اجلاس کے ختم پر سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے ایٹ ہوم دیا جاتا تھا - اس سال بھی حسب معمول آپ نے دعوتی رقعے تقسیم کیے تھے - لیکن شہر میں ایسی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی کہ اس کا انتظام نہ ہوسکا - جلسے میں بھی وہ رونق نہ تھی جیسی ہر سال ہوتی ہے - خود شہر کے بہت سے لوگ شریک نہ ہوسکے —

دوسرے دن کی نشست ۸ سے ۱۲ بجے تک رہی - ایک کمرے میں ہندی والے اور دوسرے میں اردو والے جمع ہوگئے - اس میں خاص خاص مضامین پڑھے گئے - یوں تو مضامین بہت سے تھے لیکن مجبوری کی وجہ سے مضمون پڑھنے والے جلسے میں نہ آسکے - صرف چار مضمون پڑھے گئے - سید آل احمد سرور صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی نے "اقبال اور ابلیس" پر ایک مقالہ پڑھا - خوب لکھا تھا - مضمون اور زبان دونوں اعتبار سے قابل تعریف تھا - مولانا سید سلیمان ندوی نے بعض الفاظ کی اصل و تحقیق پر بہت دلچسپ مضمون پڑھا - اس کا عنوان غالباً یہ تھا "چند پرانے لفظ نئے لباس میں" - ایک مضمون میں نے "اردو کے قدیم کتبے" پڑھا - یہ اس رسالے میں موجود ہے - یہ چیز سامعین کے لیے بالکل نئی تھی - آخر میں ایک صاحب نے ایک مضمون

پڑھا جس میں یہ بحث تھی کہ اردو شاعری اور غزل پر فارسی سے زیادہ ہندی کا اثر ہے - مضمون تلاش سے لکھا تھا - بس اسی پر جلسہ ختم ہوگیا —

## ۳ - ہندستانی کمیٹی صوبۂ بہار

پچھلے نمبر میں اس کے متعلق ذکر آچکا ہے - اس وقت تک اس کی تاریخ مقرر نہیں ہوئي تھی - بعد میں اطلاع آئی کہ اس کی تاریخ ۲۲ و ۲۳ مارچ مقرر کی گئی ہے - اس کا پہلا اجلاس ۲۲ کی سہ پہر کو پٹنہ یونیورسٹی کے سنڈیکٹ کے کمرے میں ہوا - مفصلۂ ذیل ارکان شریک جلسہ تھے :-

۱ - ڈاکٹر راجندرا پرشاد (صدر)

۲ - ڈاکٹر ایس - سنہا ' وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی -

۳ - ڈاکٹر ذاکر حسین ' جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی -

۴ - ڈاکٹر تارا چند ' الہ آباد یونیورسٹی -

۵ - ڈاکٹر بی - آر سیکسینہ ' الہ آباد -

۶ - مولوی عبدالحق ' حیدرآباد دکن -

۷ - مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ' دارالمصنفین اعظم گڈھ -

۸ - خواجہ غلام السیدین صاحب ' مسلم یونیورسٹی علی گڈھ -

۹ - پروفیسر نرائن دیو ' بنارس -

۱۰ - پروفیسر بدری ناتھہ ورما ' پٹنہ -

۱۱ - راجہ رادھکا رامن پرشاد سنہا سورج پور -

افسوس کہ مولانا ابوالکلام آزاد تشریف نہ لاے - اُن سے زبان کے معاملے میں بہت سی باتیں کرنی تھیں - ڈاکٹر سید عابد حسین بھی بوجہ علالت شریک جلسہ نہو سکے -

ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے کمیٹی کا افتتاح فرمایا اور اپنی تقریر میں ارکان مجلس کی شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور ھندستان کے لیے ایک قومی زبان کی ضرورت اور اھمیت پر زور دیا - اس امر پر افسوس ظاھر کیا کہ ھم اپنے ملک کی مشترک زبان کی طرف سے بہت غفلت کر رھے ھیں اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ھیں اور کمیٹی سے التجا کی کہ وہ قابل عمل اور قابل قبول تجاویز پیش کر کے اپنی قومی زبان کی ترقی میں مدد دے تا کہ ھندستانی زبان ھماری تعلیم کا ذریعہ بن سکے -

اس کے بعد کمیٹی کا کام شروع ھوا - اس اجلاس میں جو دو گھنٹے تک رھا ، اس مسئلے کے عام اصولوں پر بحث ھوتی رھی -

دوسرے دن کمیٹی کا اجلاس ڈاکٹر ایس - سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے مکان پر آٹھہ بجے صبح سے ھوا اور مسلسل تین گھنٹے کے غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد یہ رزولیوشن بالاتفاق منظور ھوے :—

۱ - ھندستانی وہ زبان ھے جو شمالی ھند میں معمولی بول چال میں اور آپس کے میل ملاپ کے وقت استعمال کی جاتی ھے اور جو ھندی اور اردو کی مشترک بنیاد ھے -

ثانوی تعلیم کے درجے تک مختلف مضامین کی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں ھندستانی زبان استعمال کی جاے اور ان کتابوں میں

اصطلاحی الفاظ مشترک ہونے چاہئیں - اِن اصطلاحوں کی بنیاد ہندستانی الفاظ پر قائم کی جاے اور جہاں اس طرح اصطلاحیں نہ بن سکیں تو دوسری زبانوں سے الفاظ لیے جاسکتے ہیں - یہ اصطلاحیں ہندستانی زبان کی صرف و نحو کے مطابق بنائی جائیں -

قرار پایا کہ سکرٹری (مسٹر نجم الہدیٰ) اُن انگریزی ' ہندی اور اردو اصطلاحوں کی ایک فہرست مرتب کریں جو ہائی اسکول کی جماعتوں تک کی نصاب کی کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں - یہ فہرستیں کمیٹی کے ارکان کی خدمت میں بھیجی جائیں تاکہ وہ اُس اصول کے مطابق جس کا اُدھر ذکر ہوا ہے ، ہندستانی اصطلاحیں بنائیں -

یہ تمام اصطلاحیں جو اس طرح بنائی جائیں گی کمیٹی کی منظوری کے بعد بہار کے مدارس کی کتابوں میں استعمال کی جائیں گی -

سکرٹری یہ فہرستیں ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۳۸ تک ممبروں کے پاس بھیج دیں - اس کے بعد کمیٹی کا اجلاس آخری فیصلے کے لیے مقرر کیا جاے گا -

۴ - ادبی ریڈروں میں جس قسم کے انتخاب شریک کیے جائیں گے ان کی نوعیت یہ ہونی چاہیے :-

(الف) ہندی اور اردو کے مشہور مصنفین کے کلام کے انتخاب -

(ب) سادہ ہندی اور اردو کے انتخاب دونوں کے لیے مشترک ہونگے -

(ج) ہندی ریڈروں کے لیے اردو عبارتوں کا انتخاب ایسا ہونا چاہیے جو اسی درجے کی ہندی ریڈر کے معیار سے کسی قدر کم ہو - اور یہی صورت اردو ریڈروں کے لئے ہندی عبارتوں کے انتخاب کی ہوگی —

۳ - پرائمری جماعتوں کی ریڈریں ہندستانی زبان میں ہونگی - اِن ریڈروں میں نثر کا حصہ یکساں یعنی مشترک ہوگا، البتہ نظم کے حصے میں سادہ ہندی اور اردو کی نظمیں مختلف ہوسکتی ہیں —

۴ - ریڈروں کے لکھوانے کے لیے سکرٹری صاحب بذریعہ اشتہار درخواست طلب کرکے یا کسی دوسرے طریقے سے مصنفوں اور مولفوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کریں - اس کے بعد کمیٹی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کی ریڈروں کے لکھوانے کے لیے اس فہرست میں سے مناسب صاحبوں کا انتخاب کرے گی —

۵ - مولوی عبدالحق مجاز کیے جاتے ہیں کہ ہندستانی زبان کا لغت تیار کریں، جس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہییں جو مستند ہندی مصنفوں نے استعمال کیے ہیں، اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کیے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں —

اس لغت کے جو حصے تیار ہوتے جائیں وہ مولوی عبدالحق ڈاکٹر تارا چند کو بھیجتے جائیں جو اُن کی نظر ثانی پنڈت رام نراین تری پٹھی سے کرائیں گے - اس نظر ثانی میں ڈاکٹر بی - آر سکسینہ اور دوسرے اہل علم بھی شریک رہیں گے —

۶ - مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر تارا چند سے درخواست کی جاتی ہے کہ ہندستانی زبان کی گریمر تیار کردیں - اس میں وہ دوسرے اہل علم سے بھی مشورہ لے سکتے ہیں —

---

# ۴ - شاخ انجمن ترقی اردو ، الہ آباد

جن ایام میں میں ہندستانی اکیڈیمی کی شرکت کے لیے الہ آباد جانے والا تھا ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ انجمن کی شاخ "انیس اردو" کا بھی ایک جلسہ کر لیا جائے گا - لیکن اُن دنوں میں کسی جلسے کا ہونا ممکن نہ تھا ، اس لیے پٹنے سے واپسی پر ۲۷ مارچ کو ڈاکٹر صاحب کے مکان پر جلسہ کیا گیا - اس میں متعدد تجاویز پیش اور منظور ہوئیں - اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں یا مضامین نشر کیے جاتے ہیں وہ زیادہ تر ہندستانی میں ہوتے ہیں - ہندی کے علم برداروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے - گویا ہندستانی ملکی زبان نہیں - اس بارے میں اس جلسے نے انجمن ترقیٔ اردو ہند کو خاص طور پر توجہ دلائی —

کام کی سہولت کے لحاظ سے مختلف شعبوں کی الگ الگ کمیٹیاں بنادی گئیں - ان کی تفصیل یہ ہے —

۱ - مجلس تحقیق حالات دسٹرکٹ بورڈ - اس کمیٹی کے سات ارکان تجویز ہوئے اور مفتی فخرالاسلام اس کے داعی قرار پائے —

۲ - مجلس نگران اخبارات و رسائل - اس کے پانچ ارکان تجویز ہوئے اور صدر ڈاکٹر زبید احمد صاحب —

۳ - مجلس تعلیمی - اس کے پانچ رکن تجویز ہوئے اور داعی پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید - اس کا ضمنی شعبہ نصاب تعلیم ابتدائی کا ہے جس کے ارکان ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ، مفتی فخرالاسلام اور مولوی ظفر احمد صاحب تجویز ہوئے —

۴ - سائنس بورڈ کی کمیٹی - اس کے پانچ ارکان ہیں - اور صدر جناب سید افضال احمد —

۵ - مجلس تاجران و تجارت - اس کے تین ارکان تجویز کیے گئے -

تجویزیں بہت معقول ہیں - اور اس سے قبل جو جلسہ گزشتہ ستمبر میں ہوا تھا اس میں انجمن کے جو مقاصد طے ہوئے تھے وہ بہت جامع اور ضروری ہیں - یہ سب کچھہ ہے لیکن سب سے زیادہ ضرورت عمل کی ہے - اور امید ہے کہ یہ مجلسیں اپنے اپنے فرائض کو توجہ اور تن دھی سے انجام دیں گے - انجمن کے معتمد مولوی خلیل الرحمن صاحب اور شریک معتمد سید اختر حسین صاحب دونوں بہت مستعد ہیں اور اردو کا درد رکھتے ہیں - ان دونوں صاحبوں سے یہ توقع ہے کہ وہ ان مجلسوں کو عمل کی طرف متوجہ کرتے رہیں گے —

---

## ۵ - ودیا مندر اسکیم

ودیا مندر اسکیم کا معاملہ ابھی تک طے نہیں پایا - مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے مجھے ودیا مندر اسکیم کی ایک نقل بھیجی تھی اور خواہش کی تھی کہ میں اپنی رائے اس کے متعلق ظاہر کروں - اس کے جواب میں میں نے جو خط انہیں لکھا تھا اس کا ترجمہ یہ ہے —

ڈیر مسٹر شکلا -

میں آپ کے عنایت نامے مورخہ ۲ مارچ سنہ ۱۹۳۸ ع اور ودیا مندر اسکیم کی مرسلہ نقل کا بہت شکر گزار ہوں —

میں نے اس اسکیم کو بغور پڑھا ' خصوصاً اس نظر سے کہ آپ کے صوبے

کے اردو بولنے والے طبقے پر اس کا کیا اثر پڑے گا —

اس اسکیم میں دو امور آپ کے غور کے قابل ھیں —

(۱) مجوزہ مدارس کا نام یعنی " ودیا مندر" لفظی اعتبار سے کیسا ھی اچھا ھو ' لیکن اس ملک میں ایک قومی ادارے کے لیے ھرگز موزوں نہیں ھوسکتا ' اس سے مذھبی اندیشے پیدا ھونگے - خود آپ کی اسکیم کے یہ الفاظ کہ " اس نام میں کئی کششیں ھیں" ان اندیشوں کو سمجھا رھے ھیں - یہ الفاظ پڑھ کر یہ پوچھنے کو جی چاھتا ھے کہ علاوہ خالص تعلیمی کشش کے دوسری کششیں کونسی ھوں - صرف یہی نہیں بلکہ ( جیسا کہ اسکیم میں درج ھے ) آپ کی اسکیم ۹۹ فی صدی اشخاص میں مقبول ھونے کی توقع رکھتی ھے - اس کے یہ معنی ھوے کہ یہ اسکیم آپ کے صوبے کی اکثریت کے لیے ایک فرقہ واری کشش رکھتی ھے - اس بنا پر میں آپ کو مشورہ دیتا ھوں کہ اس نام کو بدل کر کوئی مناسب نام تجویز کیجیے - نیز ایک طبقے کے مدارس کے لیے ودیا مندر اور دوسرے طبقے کے مدارس کے لیے بیت العلوم کے نام تجویز کرنے سے بھی یہ مشکل حل نہیں ھوتی - اس سے خواہ مخواہ مذھبی تفریق کا خیال پیدا ھوگا —

سب سے آسان بات تو یہ تھی کہ ھندستانی زبان میں جو الفاظ مروج ھیں انھیں میں سے کوئی اختیار کرلیا جاتا ' مثلاً مکتب ' مدرسہ ' سکول - لیکن اگر آپ کو کسی نئے لفظ ھی کے ایجاد کا شوق ھے تو اس کے لیے قدیم لفظوں اور ترکیبوں کی تلاش یا ایسے الفاظ کے استعمال کی کیا ضرورت ھے جن کی تہ میں مذھبی خیال ھو اور جو کسی خاص فرقے کے لیے کشش رکھتا ھو ' میں آپ کی خدمت میں " پڑھائی گھر " کا

نام پیش کرتا ہوں جو اپنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے بالکل ہندستانی ہے —

۲ - اس اسکیم کی رو سے جہاں کہیں ۴۰ لڑکے لڑکیاں پڑھنے کی قابل عمر کی ہونگی وہاں ایک مدرسہ قائم کردیا جاے گا - اس شرط کے ہوتے ہوے ایسے مقام پر کیا انتظام ہوگا جہاں دس اردو کے طالب علم ہیں اور تیس مرہٹی کے - اسکیم میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ تعلیم مادری زبان کے ذریعے سے ہوگی - ایسی حالت میں اِن دس اردو بولنے والے طالب علموں کا کیا حشر ہوگا - اگر آپ انہیں مرہٹی کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کریں گے تو یہ آپ کی اسکیم کے مقصد کے خلاف ہوگا - اس مشکل کے رفع کرنے کے لیے کیا آپ اِن دس اردو کے طالب علموں کے لیے الگ مدرسہ قائم کریں گے ؟ آپ یہ نہیں کرسکتے تو لازمی اور جبری تعلیم کی صورت میں جو والدین کو سزا دی جاے گی اُسے اٹھا دینا پڑے گا - اور اگر آپ یہ کرتے ہیں تو اس سے آپ کی اسکیم کی غایت فوت ہوجاتی ہے -

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی اسکیم زیادہ تر، بلکہ تمام تر، آپ کے صوبے کے ایک ہی فرقے کے لیے کار آمد ہوسکتی ہے اور دوسرے فرقے کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی - میری راے میں یہ مناسب ہوگا کہ آپ اس کے بجاے وردھا اسکیم کو، وہ جیسی کچھہ بھی ہے، اختیار کرلیں اور اپنے صوبے میں اس کا تجربہ کر کے دیکھیں -

آخر میں میں آپ کی نئی اسکیم متعلق ضلع بیتول کا ذکر کرنا چاہتا

ہوں - آپ اس ضلع میں ۱۲۶ مدرسے کھولنا چاہتے ہیں جنہیں گورمنٹ سے امداد دی جائے گی - مجھے امید ہے کہ یہ مدرسے بھی وردھا اسکیم کے تحت کام کریں گے" -

میں ۱۷ مارچ کو ایک دن کے لیے ناگپور گیا اور بعض اصحاب سے اس اسکیم کے متعلق مشورہ کیا - اسی شب کو ایک عام جلسہ عبدالسلام فاروقی صاحب ایڈوکیٹ ہای کورٹ ناگپور کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں میں نے ہندستان کی مشترکہ زبان اردو یعنی ہندستانی پر تقریر کی - تقریروں کے بعد یہ قرار داد بالاتفاق منظور ہوی کہ ایک وفد اُس مجلس نصاب تعلیم کی خدمت میں حاضر ہو جو گورمنٹ نے ودیا مندر اِسکیم کے ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں قائم کی ہے اور مجلس کے سامنے اِس صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور اردو مدرسوں کے قیام کے مناسب اِنتظام کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرے - انجمن ترقی اردو ناگپور نے بھی اپنے جلسے میں اس اسکیم کے خلاف قرار داد منظور کی اور اس کی نقلیں گورمنٹ سی پی کو، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو بھیجی گئیں -

اس معاملے میں علاوہ انجمن ترقیء اردو ناگپور کے خان بہادر مرزا رحمن بیگ صاحب اور خان صاحب عبد الرحمن خان صاحب ایم-ایل-اے نے خاص طور پر کوشش کی ' اسمبلی میں بھی اور اسمبلی کے باہر بھی - ہم جناب خان صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے اردو کی حمایت میں عین وقت پر کام کیا - انہوں نے گاندھی جی کو اس بارے میں ایک مفصل خط لکھا ہے - اگر اس پر توجہ کی جاتی تو یہ مسئلہ

بہت آسانی سے حل ہو جاتا - مرزا صاحب نے اِس خط میں بڑی تفصیل سے اس اسکیم پر بحث کی ہے اور اس کے نقائص اور نتائج پر پوری روشنی ڈالی ہے - آخر میں انہوں نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کو مد نظر رکھہ کر چند تجویزیں پیش کی ہیں اور گاندھی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ ان پر غور فرمائیں اور صوبے کی گورمنٹ کو مشورہ دیں کہ اس معاملے میں مناسب کارروائی کرے -

وہ تجاویز یہ ہیں :-

(۱) ودیا مندر کے نام کا فیصلہ بہار کمیٹی کے سپرد کردیا جاے جس میں بابو راجندرا پرشاد' مولوی عبدالحق اور دیگر اصحاب شریک ہیں تاکہ وہ اس کے بدلے کوئی ایسا نام تجویز کریں جو تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہو -

(۲) مسلمانوں کی لازمی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ وردھا اسکیم کے تحت حل کیا جاسکتا ہے —

(۳) موجودہ اردو پرائمری اور مڈل اسکول علی حالہ قائم رہنے چاہییں - نہ تو وہ بند کیے جائیں اور نہ کبھی وہ ہندی یا مرہٹی اسکولوں میں ضم کیے جائیں —

(۴) جہاں کافی تعداد پڑھنے والوں کی مل سکے وہاں گورمنٹ کے خرچ سے اردو مدرسہ قائم کردیا جاے —

(۵) جہاں کہیں تعداد کافی نہ ہو اور علحدہ اردو کا مدرسہ نہ کھولا جاسکے ' وہاں ان لوگوں کو ان کی مادری زبان یعنی اردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جاے —

(۶) چونکہ تعلیم کا تعلق ہر قوم کی زبان اور تہذیب سے ہے لہذا ہر

کمیٹی میں جو اس غرض سے قائم کی جائے، مسلمانوں کی مناسب نیابت کا خیال رکھا جائے۔ مسلمانوں کو اپنی زبان کے مستقبل کے متعلق بہت بڑا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کو نصاب کی کمیٹی، ہائی ایجوکیشن بورڈ، ٹکسٹ بک کمیٹی، نیز یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا جائے —

(۷) اردو اسکولوں کے نام کا مسئلہ نیز یہ مسئلہ کہ علحدہ اردو مدرسے کھولنے کے لیے کس قدر طالب علموں کی شرط لگائی جائے، مسلم تعلیمی اداروں اور مسلم ماہران تعلیم کے مشورے سے طے کیا جائے (یہاں انھوں نے ان اداروں وغیرہ کے نام بھی لکھ دیے ہیں)، اور زبان کے معاملے میں انجمن ترقیٔ اردو ہند کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے —

ان میں اکثر تجویزیں بہت معقول اور ضروری ہیں لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے —

نتیجہ یہ ہے کہ سی۔پی کی حکومت نے اس سال دو لاکھ روپیہ ودیا مندر اسکیم کے لیے منظور کیا ہے۔ اردو کی قسمت میں اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں۔ بیتول کے ضلع میں ہندی لازمی کی جا رہی ہے۔ صرف ایک اردو اسکول تھا وہ بھی بند کر دیا گیا۔ چنانچہ ناگپور کا روزانہ انگریزی اخبار "ہتوادا" ۲۵ فروری سنہ ۱۹۳۸ ع کی اشاعت میں لکھتا ہے —

"ڈسٹرکٹ کونسل بیتول نے اپنے ضلع میں جبری تعلیم جاری کرنے کے لیے ایک اسکیم پیش کی ہے جس کی رو سے ۳۹ دیہاتی مرکز قائم کیے گئے ہیں جن میں ۹۶ گانو ایسے ہیں جن میں کوئی مدرسہ نہیں۔

تجویز یہ ہے کہ جبر بتدریج عمل میں لایا جائے - یعنی پہلے سال ۶ سے ۸ سال تک کی عمر والوں کے لیے؛ دوسرے سال ۶ سے ۹ اور تیسرے سال ۶ سے ۱۰ اور ۶ سے ۱۱ تک کی عمر کے بچوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے- اس اسکیم سے صرف یوروپین اور اینگلو انڈین مستثنیٰ کیے گئے ہیں باقی سب پر اس کا نفاذ ہوگا- ذریعۂ تعلیم ہندی زبان ہوگی اور دس سال کی عمر تک لڑکے لڑکیاں مل کر پڑھیں گے- اسی قسم کی بیتول ضلع کے لیے دو اور اسکیمیں پیش کی گئی ہیں اور رقمیں بھی منظور ہوگئی ہیں —

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیتول ضلع میں اردو کے پڑھانے کا کوئی انتظام نہ ہوگا- ڈسٹرکٹ کونسل اور حکومت نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ضلع بھر میں کسی کی زبان اردو نہیں اور نہ اس کی تعلیم کی کوئی ضرورت ہے —

اسی خیال سے میں نے تین مستعد نوجوان طالب علموں کو سی - پی اور برار کے دورے پر بھیجا ہے کہ وہ اس صوبے کے اضلاع اور قصبات کا دورہ کرکے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں اور یہ دیکھیں کہ اردو کی تعلیم و اشاعت کے کیا امکانات ہیں اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں- اس کے متعلق میں آئندہ تفصیل سے لکھوں گا —

نصاب تعلیم کی کمیٹی کی رپورٹ کا بھی انتظار ہے- یہ دیکھنا ہے کہ اس نے کیا تجاویز پیش کی ہیں- افسوس ہے کہ اِن تمام کمیٹیوں میں صوبے کے کسی مسلمان کو شریک نہیں کیا گیا، حالانکہ اس کی بہت ضرورت تھی، اس سے کمیٹی کے کام میں آسانی پیدا ہوتی اور اسے علم ہو جاتا کہ وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مطالبات کیا ہیں —

وردھ میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کا نام بدل کر " اردو ودیا مندر "

رکھہ دیا ہے - مسٹر ہدایت علی ایم - ایل - اے نے اس کے متعلق اسمبلی میں سوال کیا تو مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے اس کا اعتراف کیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ہے - اور جب انہوں نے یہ پوچھا کہ کیا گورنمنٹ نے اس کے متعلق کوئی احکام جاری کیے تھے' تو جواب دیا گیا کہ نہیں - اس کے بعد کے سوال و جواب یہ ہیں :—

سوال — کیا یہ واقعہ ہے کہ وردہ کے مسلمانوں کو اس نام کی تبدیلی پر سخت اعتراض ہے ؟

جواب - ڈپٹی انسپکٹر اردو مدارس کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر میونسپل کمیٹی کے اس عمل کے خلاف اعتراض ہے - لیکن وردہ کے کسی مسلمان کی طرف سے میونسپل کمیٹی میں کوئی شکایت یا اعتراض پیش نہیں ہوا —

سوال - کیا گورنمنٹ کو احتجاجی رزلیوشن وصول ہوئے ہیں ؟ کیا امراوتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے کوئی احتجاج اس بارے میں کیا گیا ہے ؟

جواب - امراوتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سنٹرل سٹینڈنگ کمیٹی کی طرف سے اس کی مخالفت میں ایک رزولیوشن وصول ہوا ہے —

سوال - کیا گورمنٹ مہربانی کرکے اردو اسکول وردہ کے سابق نام کے برقرار رکھنے میں کوئی کارروائی کرے گی ؟ —

جواب - ڈپٹی کمشنر نے میونسپل کمیٹی کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی تھی - کمیٹی کا جواب رزولیوشن نمبر ۳ مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع میں موجود ہے —

کمیٹی میں ڈپٹی کمشنر کا خط پیش کیا گیا - اس پر جو بحث ہوئی اس میں یہ بیان کیا گیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ہے اور اس سے کسی فرقے یا مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے - اور محض نام کے بدلنے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ اس سے اکثریت کی تہذیب کا احیا اور تفوق قائم کرنا مقصود ہے - اس تمام کارروائی سے ظاہر ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے —

---

## ۲ - مدراس کے وزیر اعظم اور ہندی اور ہندستانی

ہندی کو جبری طور پر مدارس میں رائج کرنے کے متعلق مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بہت سخت اعتراض کیے - جس کے جواب میں وزیر اعظم نے فرمایا کہ اردو یا دیوناگری رسم خط کو ہندو مذہب اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں - اور پھر کہا کہ ہندی ہندستان کی زبان ہے جسے کسی مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے - وہ ہندی کے رائج کرنے سے ہندستان کے لیے کوئی مشترک زبان پیدا نہیں کرنا چاہتے' لیکن ان کے لڑکوں کو ہندی جاننا ضروری ہے اس لیے کہ زیادہ تر یہی زبان ہندستان میں بولی جاتی ہے —

مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق وزیر اعظم نے اپنا سابق وعدہ پھر دھرایا اور کہا کہ جہاں تک فنڈ میں گنجائش ہوگی وہ مسلمانوں کی تعلیم پر فیاضی کے ساتھ رقم صرف کریں گے —

یہ ٹائمز آف انڈیا اور دوسرے اخباروں کی رپورٹ ہے لیکن

بمبئی سینٹینل مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۳۸ ء کا بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے - وہ یہ ہے —

" مسٹر سی راج گوپال چاری وزیر اعظم نے مدراس لیجس لیٹو کونسل میں هندستانی کے متعلق کانگرس گورمنٹ کا طرز عمل صاف بیان کر دیا —

اسمبلی میں دیوناگری اور عربی رسم خط کے متعلق معمولی نزاع پیدا هوگیا - اس پر وزیر اعظم نے کہا کہ رسم خط کو کسی مذهب سے کوئی تعلق نہیں - مقصد صرف یہ ہے کہ هندستانی کا کام چلاؤ علم آجاے " -

اڈیٹر سینٹینل لکھتے هیں کہ افسوس ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے اور حیرت کی بات ہے کہ مسٹر راج گوپال چاری جیسا شخص اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس رسم خط میں قرآن لکھا جاتا ہے مسلمانوں کی نظر میں وہ مذهبی رو سے بہت بڑی اهمیت رکھتا ہے —

اس سے قطع نظر مسٹر راج گوپال چاری نے جو کچھہ بیان کیا ہے وہ هر طرح قابل قبول ہے اور امید ہے کہ هندستانی کے مخالف اور هندی زبان کے مجنوں حامی اسے ذهن میں رکھیں گے —

مدراس کے وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ خواهش نہیں ہے کہ هندستان کے لیے کسی مشترک زبان کو رائج کریں لیکن اُن کی راے میں یہ مناسب معلوم هوتا ہے کہ هم میں سے اکثر و بیشتر " هندی یا هندستانی " جانیں —

یہ پہلا وقت نہیں ہے کہ ایسا بیان کیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ هندی کے پرچارکوں (مبلغوں) نے اپنی کوششوں سے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ وہ هندستانی کے بجاے جو هندستان کی عام اور مشترک زبان ہے ،

ایک دوسری زبان کی اشاعت کے درپے ہیں (جس کا نام ہندی ہے) —
اگر اس تحریک کو کامیاب بنانا ہے تو اس خیال کا رفع کرنا نہایت ضروری ہے" —

لیکن ۲۶ مارچ کا 'لیڈر' کچھہ اور ہی لکھتا ہے :—

"آج سہ پہر (۱۹ مارچ) کو ہندی کو مدرسوں میں رائج کرنے کے متعلق ایک سلسلۂ سوالات کے جواب میں ڈاکٹر سُہا راین وزیر تعلیم نے کہا کہ گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندستانی فسٹ' سیکنڈ اور تھرڈ فارم میں پڑھائی جاے۔ سال رواں میں یہ ۱۲۵ مدرسوں میں جن میں ۲۵ گورنمنٹ اسکول بھی ہیں' جاری کی جائے گی - یہ مدرسے صوبے کے تمام اضلاع میں پھیلے ہوے ہیں - وہاں اس زبان کے سکھانے میں کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ بعض مدرسوں میں پہلے سے ہندستانی پڑھائی جاتی ہے - ہندستانی نصاب کی کتابیں دونوں خطوں میں تیار کی جائیں گی اور گورنمنٹ کی سرپرستی میں شایع کی جائیں گی تاکہ زبان کا ایک معیار قایم ہو جاے" —

اس بحث میں عجیب خلط مبحث ہوگیا ہے - یا تو یہ لوگ ہندی ہندستانی کا فرق نہیں سمجھتے - یا کسی نہ کسی طرح سے ہندی کو سامنے لانا چاہتے ہیں - اول ہندی کہتے ہیں ؛ جب اعتراض ہوتا ہے تو ہندی یا ہندستانی کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں - مسٹر راج گوپال چاری نے جتنے بیان اس وقت تک شایع کیے ہیں یا اسمبلی میں جو کچھہ کہا ہے وہ اس قدر مبہم اور ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ صحیح طور سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا منشا کیا ہے —

---

# ۷ - مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی اور ہندی

میں اوپر مسٹر کھیر کی ملاقات کا ذکر کرچکا ہوں جس میں انہوں نے لفظ ہندی کے استعمال کے متعلق غلطی کا اعتراف اور آیندہ اصلاح کا وعدہ کیا، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ ء میں ان کی اس تقریر کا خلاصہ پڑھا جو انہوں نے گاندھی میدان، دادر میں ہندی سکھشا پرچارک سمتی کے سالانہ تقسیم انعام کے موقع پر فرمائی - اس میں ہندی کے متعلق یہ ارشاد کیا ہے —

"مسٹر بی - جی کھیر وزیر اعظم بمبئی نے فرمایا کہ ملک بھر میں کسی کو اس بارے میں مطلق اختلاف نہیں کہ ہندستان کی ایک مشترک زبان ہونی چاہیے ... ... ... اور سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے" —

ایک کانگرس حکومت کے وزیر اعظم کی زبان سے ایسے الفاظ کا نکلنا نہایت حیرت انگیز ہے - یہ سراسر غلط ہے کہ سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہندستان کی مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے، خصوصاً جب کہ خود کانگرس کا قطعی فیصلہ موجود ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے - میں ایک مدت تک اس الجھن میں رہا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کہ کانگرس نے اپنے رزولیوشن اور اپنے دستور (کانسٹی ٹیوشن) میں صاف طور سے یہ اعلان کردیا ہے کہ ہندستان کی زبان ہندستانی ہے تو پھر کانگرس حکومتوں کے وزرا اور کانگرس کے ارکان کیوں بار بار بجائے ہندستانی کے ہندی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیتے ہیں اور جتانے پر اور اپنی

غلطی ماننے پر بھی کیوں اپنے اس خیال پر قائم ھیں اور جب موقع آتا ہے تو وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ھندی ھی کا راگ الاپتے ھیں - بہت دنوں کے غور کے بعد یہ راز کھلا اور وہ یہ ہے کہ

کانگرس سے بھی بالا اور اعلیٰ ایک ھستی ہے جس کے ایک اشارے، ایک لفظ کے سامنے کانگرس کے تمام رزولیوشن، اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ھیچ ھیں - گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ھندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اس لیے کانگرس کا ہر وزیر اور ہر رکن وھی کہتا ہے جو "مہاتما جی" کہتے ھیں - جو نوت امام کی وھی ان کی —

اور لطف یہ ہے کہ گاندھی جی سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہوگئے ھیں، کانگرس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں، اس لیے ان سے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کانگرس کے رزولیوشن کی کیوں پابندی نہیں کرتے - باوجود اس کے کانگرس ان کی انگلیوں پر ناچتی ہے اور کسی وزیر یا کانگرس کے ممبر یا کانگرس کے پریزیڈنٹ کی یہ مجال نہیں کہ ان سے اختلاف کرسکے - یہ ہے اصل حقیقت اس قضیے کی —

لیکن اصولاً کانگرس کے کسی رکن کو اور خصوصاً کسی وزیر حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ ھندی کا پرچار کرے - اگر اسے ایسا ھی شوق ہے تو پہلے اسے کانگرس سے مستعفی ہوجانا چاہیے اور پھر اس کام کو کرنا چاہیے، جب تک وہ کانگرس میں ہے اس پر کانگرس کے قواعد کی پابندی لازم ہے -

---

# ۸ - راشٹر بھاشا کانفرنس اور مسٹر کھیر اور مسٹر سوباش چندر بوس وغیرہ کے ارشادات

۲۰ فروری کو کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی کے پنڈال میں راشٹر بھاشا (قومی زبان) کا اجلاس ہوا جس کے صدر جمنا لال بجاج تھے۔ اس موقع پر مسٹر سوباش چندر بوس صدر نیشنل کانگریس کا پیغام پڑھا گیا جس میں ہندستان کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا - ان کی رائے میں وہ زبان صرف ہندی یا ہندستانی ہوسکتی ہے - مسٹر بوس نے ان لوگوں سے جنھوں نے اب تک ہندی نہیں سیکھی پرزور درخواست کی کہ وہ اسے جلد سیکھ لیں کیونکہ یہ "ہندستانی قوم کے بنانے میں مدد دے گی"—

سیٹھ جمنا لال بجاج نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک مشترک زبان کی اشاعت کی ضرورت کو پرزور الفاظ میں بیان کیا اور اپنے اہل وطن کو جتایا کہ وہ ہندی زبان کی اشاعت کو سوراج کے حصول کا اصلی جز خیال کریں—

ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ ایسے تمام ادارے جن کا تعلق ہندستان کے مختلف صوبوں سے ہے، اپنے کاروبار اور مراسلت میں ہندی زبان استعمال کریں - رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا—

اس رزولیوشن کی تائید میں مسٹر کاکا کالیلکر، مسٹر اینے اور مسٹر اننت سیانم آینگار نے بھی تقریریں کیں—

مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی نے کہا کہ میں نے دکشنا بھارت ہندی سبھا کے مسلسل تین امتحانوں میں کامیابی حاصل کی اور ہر امتحان

میں تمام کامیاب امیدواروں میں اول آیا - میں ہندی کی جماعت میں اپنے دس سالہ بیٹے کے ساتھہ شریک ہوتا تھا - اور باوجود کام کی کثرت کے میں نے ہندی زبان سیکھی - انہوں نے تمام حاضرین سے التجا کی کہ وہ زبان کے مسئلہ کو معمولی نہ سمجھیں بلکہ اس کی طرف پوری توجہ کریں " —

یہ سب کارروائیاں انڈین نیشنل کانگریس کے پنڈال میں ہوتی ہیں - اس کے بعد بھی مدینہ کے فاضل اڈیٹر کو یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ کانگریس نگر میں کہیں اردو نظر نہیں آتی —

---

## ۹ - صدر کانگرس اور ہندستان کی مشترک زبان

مسٹر سوباش چندر بوس نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ " جہاں تک ہندستان کی مشترک زبان ؛ تعلق ہے اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ ہندی اور اردو کا امتیاز مصنوعی ہے - اصل زبان وہ ہے جو ان دونوں کے میل سے بنی ہے اور جو ملک کے اکثر حصوں میں روز مرہ بولی جاتی ہے اور ہندی اور اردو دونوں حروف میں لکھی جا سکتی ہے - میں جانتا ہوں کہ ہندستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان میں سے ایک رسم خط کے حامی ہیں اور دوسرے کے بالکل روادار نہیں - مگر ہماری پالیسی ناروا داری کی نہیں ہونی چاہیے - ہمیں دونوں کے استعمال کی پوری آزادی دینی چاہیے " —

اس کا مقابلہ آپ کے راشٹر بھاشا کانفرنس کے پیغام سے کیجیے - کتنا بڑا تفاوت ہے —

لیکن سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ جناب سوبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگریس میں جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ خود بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور ایک شخص پیچھے بیٹھا ہوا برابر لقمہ دیتا جا رہا تھا —

شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ کانگرس والوں کے قول اور فعل میں بڑا بل ہے —

---

## ۱۰ - اڑیسہ میں ہندی کا پرچار

"آنریبل مسٹر بودھ رام دوبے وزیر تعلیم اڑیسہ نے اڑیسہ کے تمام مدارس میں ہندی پڑھانے کے احکام جاری کر دیے ہیں اور کٹک کے بعض مدارس میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے —

عنقریب راونشا گرلز سکول میں لڑکیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے مستقل طور پر ایک معلمہ کا تقرر کیا جائے گا" (یونائٹڈ پریس) —

اڑیسہ میں کانگریسی حکومت ہے جو کانگرس کے احکام کی اس طرح تعمیل کر رہی ہے - اب بھی اس میں کسی کو شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ کانگریسی حکومتیں کانگرس کے احکام کو گاندھی جی کے ارشاد کے سامنے بالکل بے حقیقت سمجھتی ہیں - اور لطف یہ ہے کہ ہندستانی کا رزولیوشن جو کانگرس نے منظور کیا وہ حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے - لیکن اس سے کیا ہوتا ہے کانگرس والے تو ان کے منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں - کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا نام بدل کر گاندھی کانگرس رکھ دیا جائے - کہیں تو قول و فعل میں مطابقت ہو —

یہ سب کچھہ ہوتے ہوے بھی گاندھی جی مسٹر جناؔ سے مصالحت کی بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں - اس پر میر صاحب کا یہ مصرع یاد آتا ہے۔

دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

---

## ۱۱ - پراونشل اینٹی ہندی کانفرنس (صوبۂ مدراس)

صوبۂ مدراس میں ہندی کی مخالفت میں ایک کانفرنس قایم ہوگئی ہے - فروری کے آخری ہفتے میں اس کا بڑا جلسہ منعقد ہوا جس کے صدر سر کے وی ریڈی تھے - انہوں نے فرمایا کہ "ہم دراوڑیوں کے لیے ہندی ایسی ہی غیر زبان ہے جیسی انگریزی - اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ نہ تو کسی قدامت کا دعویٰ کرسکتی ہے اور نہ کسی بڑی ترقی کا" —

اسی جلسے میں سر ایم کرشنن نائر نے کانفرس کا افتتاح کرتے ہوے وزارت مدارس کی اُن کوششوں پر سخت اعتراض کیا جو وہ ہندی کو مدرسوں میں داخل کرنے کے متعلق کررہے ہیں - انہوں نے کہا کہ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ انگریزی کو تو غیر زبان سمجھہ کر خارج کیا جارہا ہے اور لوگوں کی خواہش کے بر خلاف ہندی کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو ایک ناممکن کام ہے"۔

---

## ۱۲ - اردو کے متعلق سر تیج بہادر سپرو کا ارشاد

ہندستانی اکیڈیمی کے تذکرے کے ضمن میں سر تیج بہادر سپرو کے جس ارشاد کا حوالہ دیا گیا تھا اس کا خلاصہ بعض اردو اخباروں میں

شایع ہوا ہے ، جو ہم یہاں نقل کرتے ہیں -

انجمن بہار ادب کا ایک جلسہ سر تیج بہادر کی صدارت میں آج تیسرے روز ختم ہوا - شعرا کی انجمن میں اردو زبان کی سیاسی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوے سر تیج بہادر نے لکھنؤ والوں کو اردو کی حیات کا ذمہ دار ٹھیرایا - اور سخت تردید اُن لوگوں کی کی جو اردو کو محض مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں - انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان پر اس سے زیادہ کوی ظلم نہیں ہوسکتا کہ اس کو مسلمانوں سے منسوب کر کے چھوڑ دیا جاے - اردو در اصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے - اردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت ہو ، تاکہ باہمی یکجہتی اور ہم آہنگی قائم ہو سکے - آج سے پچاس سال قبل اسی مقصد کے لیے پچاس روپے پر معلم مقرر ہوتے تھے ، حالانکہ اب جامعات کے پروفیسروں کی تنخواہیں پندرہ سو تک ہو گئی ہیں - سر تیج بہادر نے فرمایا کہ اگر یہ دو فریق — یعنی ایک اردو میں زیادہ سے زیادہ فارسی عربی الفاظ شامل کرنے والا اور دوسرا زیادہ سے زیادہ سنسکرت الفاظ ٹھونسنے والا — کچھہ عرصے کے لیے اور قائم رہے تو یہ ہوگا کہ آپس میں گفتگو کے لیے بھی مترجم ساتھہ رکھنے پڑیں گے - سر تیج بہادر نے لکھنؤ والوں سے اپیل کی کہ وہ لکھنؤ کی اردو کے احیا پر کمر بستہ ہو جائیں جو اصلی زبان تھی - آخر میں سر تیج بہادر سپرو نے فرمایا کہ

" ہندو مسلم اتحاد کا انحصار
محض اردو کی بقا پر ہے - "

جلسے کو ایسے مقررین نے بھی مخاطب کیا جن کی مادری زبان اردو نہ تھی مگر ان کو اردو سے بڑی دلچسپی تھی - اُنھوں نے اردو کو ملک کی واحد مشترکہ زبان تسلیم کرلیا - چنانچہ مسٹر والفرڈ (اینگلو انڈین طبقے کی جانب سے رکن قانونیہ) نے کہا کہ قانونیہ (لیجس لیٹو کونسل) کی تقریریں اردو زبان کے زوال کا بین ثبوت ہیں اور اُن کی ذاتی طور پر یہ راے ہے کہ کوئی یوروپین یا اینگلو انڈین جو اردو سے واقف نہ ہو بہت بڑے ظلم کا مرتکب ہوگا - انھوں نے بہت زور دے کر کہا کہ اِن طبقوں کے بچوں کی تعلیم میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شریک کیا جانا چاہیے - "

میں نے سرتیج بہادر کا قول یہاں اس لیے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ ایک حقیقت شناس و صاحب نظر اور ایک مقلد و بے خبر کی راے میں کس قدر فرق ہوتا ہے - کانگریسی حکومتوں کے اکثر وزیر جو ہندی ہندی پکارتے ہیں وہ نہ ہندی کو جانتے ہیں نہ ہندستانی کو - ان میں سے اکثر ہندستانی تہذیب اور ہندستانی زبان سے ناواقف ہیں اور محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کر رہے ہیں - گاندھی جی بلا شبہہ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن زبان کے معاملے میں اُن کی راے مستند نہیں ہو سکتی - وہ کیا جانیں کہ ہندستانی تہذیب کا ہندستانی زبان سے کیا تعلق ہے - ہندستانی زبان سے غفلت کرنا ہندستانی تہذیب کا برباد کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کاٹنی ہے - اس مسئلہ میں اگر کسی کی راے مستند ہو سکتی ہے وہ سرتیج بہادر سپرو ہیں —



# ۱۳ - انجمن کے اردو مدرسے

انجمن کے اردو مدرسوں کا ذکر اس سے قبل اس رسالے کے کسی گزشتہ نمبر میں ہو چکا ہے - یہاں صرف ان مدرسوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے بعد قائم ہوے ہیں —

## (۱) ضلع نیلگری کے نئے مدرسے

۱ - مدرسۂ اروَن کاڈو - یہاں گورمنٹ کا بارود کا کارخانہ ہے جس میں بہت سے مسلمان کام کرتے ہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا - چاند خاں صاحب کی (جو کارخانے کے دفتر میں ملازم ہیں) کوشش سے گزشتہ دسمبر میں یہ مدرسہ قائم ہوا - اس وقت ۲۴ بچے تعلیم پا رہے ہیں - اردو سب کے لیے لازمی ہے - اس مدرسے کا نصف خرچ انجمن دیتی ہے —

۲ - سینٹ جوزفس کالج کولوز - یہاں اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا - اردو لینے والے طلبہ نجی کے طور پر اپنے پڑھنے کا انتظام کر لیتے تھے - سردار خاں صاحب ایم - اے پریزیڈنٹ نیلگری اردو سوسائٹی ' لوڈیل کی کوشش سے شروع سال سے اس کالج میں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہوگیا ہے - مدرس کی تقریباً نصف تنخواہ انجمن ادا کرتی ہے —

## (۲) علاقۂ مالا بار کے مدرسے

۱ - تیلی چری - یہ مالا بار کا مشہور مقام ہے - یہاں خان بہادر موئدو صاحب ایم - ایل - سی کی کوشش سے ایک شبینہ مدرسہ جاری کیا گیا ہے -

۲ - ارکوا - اس مقام پر مسلمانوں کی ایک انجمن ہے جس کا نام ندوۃ الاسلامیہ ہے - اس کی زیر نگرانی گزشتہ ستمبر سے اردو کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے - مدرسہ اچھی حالت میں ہے اور ترقی کر رہا ہے —

۳ - کاکٹ - یہاں بھی مسلمانوں کی ایک انجمن ہے اس کی نگرانی میں گزشتہ نومبر سے اردو کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے - طلبۃ کی تعداد ۴۰ ہے —

## (۳) شمالی آرکاٹ

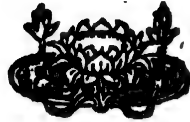
ترو نامِلے - یہاں بھی انجمن کا ایک مدرسہ ینگ مسلم سوسائٹی کی نگرانی میں چل رہا ہے - ۲۰ مسلمان اور سات ہندو تعلیم پا رہے ہیں -

## (۴) جنوبی آرکاٹ

مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن تلندی ونم کی نگرانی میں دو مدرسے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ - دونوں مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے - حکومت مدراس نے ابھی تک کوئی امداد منظور نہیں کی - انجمن پچیس روپے ماہوار مدد دیتی ہے - یہ مدرسہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور خوب ترقی کر رہا ہے - تقریباً تین سو مسلمان اور ہندو طالب علم ہیں - اردو سب کے لیے لازمی —

مالا بار اور دیگر مختلف مقامات سے اردو مدارس قائم کرنے کے لیے برابر درخواستیں آرہی ہیں - لیکن افسوس کہ انجمن کے سرمایہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ سب درخواستیں منظور کرلے - تاہم جہاں زیادہ ضرورت معلوم ہوتی ہے وہاں مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - ہمیں اردو کے بہی خواہوں سے امید ہے کہ وہ اس کام میں ہمارا

ہاتھ بٹاسکتے ہیں - کم سے کم اگر صاحب ثروت اصحاب ایک ایک مدرسہ ہی کا کل خرچ یا نصف خرچ اپنے ذمے لے لیں تو انجمن بہت سے مدرسے قائم کر کے ملک کے دور دراز مقامات میں اردو کی اشاعت کر سکتی ہے - ہم مدراس کے نامور بزرگ ساہوکار جمال محمد صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ممنون ہیں کہ ان دونوں حضرات نے بے طلب اس کام میں انجمن کی مدد فرمائی ہے -



# تبصرے





# تبصرے

## ادب

### [illegible] -

( مولفہ سید محمد عبد الحکیم صاحب حکمت - قیمت مجلد دو روپے - منیجر حکمت بک ڈپو عالم گنج ڈاک خانہ گلزار باغ، پٹنہ سے مل سکتی ہے )

یہ منشی امیر احمد، امیر مرحوم کی سوانح عمری ہے - لکھنے والے اُن کے خاص شاگرد اور فدائی حضرت حکمت صاحب ہیں - قابل مولف نے منشی صاحب مرحوم کے حالات جمع کرنے میں پوری کوشش کی ہے اور اس سے قبل جو کتابیں یا مضامین ان کی شاعری یا اُن کے سوانح کے متعلق لکھے گئے ہیں اُن سب کو بغور پڑھا ہے - ایک باب ان کے شاگردوں کے حالات و تصانیف کے لیے مخصوص کر دیا ہے - غرض منشی صاحب مرحوم کے حالات، خیالات، سیرت، کردار، تعلقات اور اُن کے کلام اور تصانیف پر کافی تبصرہ ہے - لیکن مولف نے مدح میں اتنا غلو کیا ہے کہ بعض معمولی

اور ادنی اشعار کو بھی آسمان پر پہنچا دیا ہے - شاید وہ اسے شاگردانہ سعادتمندی خیال کرتے ہیں - لکھنے لکھنے کا فرق ہے ورنہ یوں سمجھیے کہ آزاد نے ذوق کو جو رتبہ دیا ہے وہی رتبہ مولف کی نظر میں امیر کا ہے - مولف امیر مرحوم کے بہت بڑے شیدائیوں میں سے ہیں، لیکن انہیں وہ گر معلوم نہیں جو اس قسم کی تحریروں کے لیے ضروری ہے —

اس کتاب کو بہ لحاظ تنقید، طرز بیان اور خیالات کے مولوی امیر احمد صاحب علوی کی کتاب طرۂ امیر پر ترجیح نہیں ہوسکتی - تاہم مولف کی محنت قابل قدر ہے اور انہوں نے بعض ایسی معلومات اور حالات بہم پہنچائے ہیں جو اس سے قبل کی تالیفات میں نہیں ملتے —

---

## مضامین رشید -

(پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے مضامین کا مجموعہ
مکتبۂ جامعہ، دہلی - قیمت مجلد دو روپے)

رشید احمد صدیقی صاحب زمانۂ حال کے چند نامور ظرافت نگاروں میں سے ہیں - وہ صرف ظرافت نگار ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس موضوع پر ایک اچھی کتاب بھی لکھی ہے - ان مضامین میں سے اکثر یا سب کے سب پہلے بعض رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اب کتاب کی صورت میں شایع کیے گئے ہیں - ان میں سے بیشتر ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق مسلم یونیورسٹی یا پروفیسر رشید صاحب کے احباب سے ہے یا اُن کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضمنی طور پر آگیا ہے، اس لیے پورے طور پر سمجھنے اور لطف حاصل کرنے کے لیے اُس صحبت سے واقف ہونا ضروری ہے - رشید صاحب

طبعاً ظریف ہیں، اردو خوب لکھتے ہیں اور موقع محل بے ایسے لفظ استعمال کرتے یا بعض اوقات گھولیتے ہیں کہ بات میں اور لطف پیدا ہوجاتا ہے - قوت مشاہدہ بھی تیز ہے اور ایک نظر میں اپنے مطلب کی بات ایسی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ ظرافت کا پہلو نکل آتا ہے - استعاروں اور تشبیہوں کا تعلق ظرافت کے پیرائے میں حالات حاضرہ سے برابر قائم رکھتے ہیں جس سے پڑھنے والے بہت محظوظ ہوتے ہیں - یوں تو سب مضمون پڑھنے کے قابل ہیں لیکن کوئی کوئی بہت دلچسپ ہے - مثلاً "کارواں پیداست" - لیکن رشید صاحب کے مضامین میں ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ کبھی کبھی غیر متعلق باتیں اس طرح داخل کردیتے ہیں کہ جس سے آورد کا شبہہ ہوتا ہے - ظرافت میں آمد ہی کچھہ مزہ دیتی ہے، جہاں طبیعت پر زور ڈال کر کوئی بات کہی تو مزہ جاتا رہا —

کتاب کے شروع میں رشید صاحب کا فوٹو بھی ہے - صورت سے ذہین معلوم ہوتے ہیں گو ظریف نہیں معلوم ہوتے؛ لیکن ظرافت بغیر ذہانت کے نہیں ہوتی —

---

## نذر ولی

(سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد،
صفحات ۲۴۹ مجلد)

مضامین کی فہرست:-

۱ - ولی کا تخیل		از: لطیف النسا بیگم، بی - اے

۲ - کلام ولی اور تصوف		از: نجم النسا بیگم، بی - اے

۳ - ولی کی معلومات اور از ' نعیم النسا بیگم ' بی - اے
شاعری کی خصوصیات

۴ - ولی کا فن شعر از ' جہاں بانو بیگم ' بی - اے

گزشتہ دنوں جگہ جگہ "یوم ولی" منائے جانے کے بعد سے ولی کے متعلق زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے - زیر نظر مجموعہ مضامین اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ' لکھنے والیاں سب کی سب جامعۂ عثمانیہ کی جماعت ایم - اے کی طالبات ہیں ' مضامین سے پہلے " سلسلہ ادبیات اردو " کے مدیر عمومی کی مختصر سی تقریب بھی ہے —

پہلا مضمون "ولی کا تخیل" کتاب کے ایک سو بارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں ولی کے متعلق معلومات ' اعتقادات ' پند و موعظۃ اور دوسری خصوصیتوں پر بھی بحث کی گئی ہے ' بادی النظر میں ولی کے سمجھنے کے لیے یہی ایک مضمون کافی ہوتا اور دوسروں کے لکھنے کے لیے کچھ باقی تو نہ تھا مگر بعد کے مضامین کے پڑھنے سے طالبات کی ذکاوت اور اس کاوش کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اجمال کو تفصیل اور بصیرت سے لکھنے میں کامیاب رہیں —

" کلام ولی اور تصوف " ماہرانہ انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے ' تصوف کے مرکزی مسایل اور مصطلحات کو شرح و بسط کے ساتھ سمجھایا گیا ہے جس کی وجہ سے اہل نظر اور " تماشائی " دونوں کے لیے دلچسپی کی تقریب نکل آئی ہے ' اس "قال" میں کہیں کہیں "حال" کی بھی جھلکیاں ہیں — واقعیت کے اس دور میں تصوف جیسے مسئلہ پر صاحب دلانہ انداز میں اس تبحر کے ساتھ لکھا جانا یقیناً مکتب کی کرامت ہے - موضوع کی سنجیدگی ' اسلوب پر اثر انداز ہوے بغیر نہ رہ سکی —

" ولی کی معلومات اور شاعری کی خصوصیات " دراصل ولی پر اس اعتراض کا جواب ہے کہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا ؛ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ولی اُمی محض نہ تھا اس کے کلام میں آئی ہوئی بہت سی تلمیحوں کو چن کر ان پر چھوٹے چھوٹے نوٹ دیے گئے ہیں اور ساتھہ ہی ساتھہ ولی کے کلام کی نمایاں خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ' — یہ مضمون بلا کسی لن ترانی یا آرایش کے سیدھی سادی زبان میں لکھا گیا ہے —

" ولی کا فن شعر " قابل توجہ اور دلچسپ ہے - ولی کے فن شعر کو اُجاگر کرنے کے لیے خود " فن شعر " پر بحث ناگزیر تھی مگر یہ اچھا ہوا کہ مضمون فن شعر سے زیادہ حسن کی تفسیر اور فلسفہ جمال کی تشریح کے لیے وقف ہوگیا ' اسلوب بیان بھی اسی نسبت سے اختیار کیا گیا ہے —

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف اور جلد نہایت دیدہ زیب ہے ' تمام مضامین محنت اور شوق سے لکھے گئے ہیں ' یہ گل بداماں مجموعہ اردو مطبوعات میں ایک حسین اضافہ کہلایا جاسکتا ہے ' اگر طالبات اپنے دل و دماغ کی تازگی کو زندگی سے قریب تر موضوعات کے لیے صرف کرنے پر آمادہ ہوسکیں تو ان کا قلم اور زیادہ مفید اور قابل قدر ہوسکے گا —

( د )

---

## قصص الامثال -

( مولفہ ابو عامر خواجہ محمد باقر حسن صاحب -

پبلشر سید محمد اشفاق علی مالک وایل ایجوکیشنل

بک ڈپو، اردو بازار دهلی، چهوٹی تقطیع
حجم ۳۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ پانچ آنے)

یہ کتاب ڈهائی سو سے زیادہ کہاوتوں کا مجموعہ ہے، متعلقہ قصے کہانیاں، لطیفے اور حکایتیں بڑی محنت و کاوش سے فراہم کی گئی هیں، اور کچهہ مولف نے "علم درسینہ" کی مدد سے اضافہ کی هیں - زبان نہایت سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے - هر ضرب المثل کا محل اور موقع استعمال بیان کیا گیا ہے، ایک مضمون کی کہاوتیں اکثر یکجا کردی گئی هیں اور ساتهہ هی ساتهہ دوسری زبانوں کی هم معنی ضرب الامثال بهی جگہ جگہ پیش کردی گئی هیں اور کہیں مفہوم ظاهر کرنے کی خاطر ان کی تشریح بهی ہے، ایسے محاوروں کو بهی جنهوں نے کثرت استعمال کی بدولت کہاوتوں کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اس تالیف میں شامل کرلیا گیا ہے، موضوع کے لحاظ سے اس مختصر سے مجموعے میں اور زیادہ تفصیلات کی گنجائش بهی بمشکل هی نکل سکتی کیونکہ الفاظ و محاورات کے بہ نسبت کہاوتوں کا وجود کہیں زیادہ مقامی روایات و حالات کا رهین منت هوا کرتا ہے - غالباً اسی وجہ سے بعض ضرب الامثال عام مروجہ شکل سے ذرا هٹ کر استعمال کی گئی هیں اور اسی مناسبت سے ان کی تشریح بهی کی گئی ہے، مثلاً "اندهیر نگری چوپٹ راج" کے بجائے صرف "الٹی نگری اندها راجہ" لکهہ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے - "قصص الامثال" بچوں کے لیے لکهی گئی ہے لیکن توقع ہے کہ بڑوں میں بهی دلچسپی سے پڑهی جائے گی اور مفید ثابت هوگی —

(ر)

---

## صحیفۂ چین

(از سید اسدعلی صاحب ' انوری ' فریدآبادی ' بی ' ایس ' سی ' آئی ' ایف ' ایس ' حجم ۲۴۸ صفحات ' چھوٹی تقطیع ' لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے تائٹل پر چین کے قومی پرچم کا نشان ہے قیمت ' ایک روپیہ آٹھہ آنے - مکتبہ جامعہ ملیہ ' دهلی)

شروع کے ۷۴ صفحات تک کنفیوشس کی کتاب " شوکنگ " کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے اور باقی صفحات چین کی تاریخ ' کنفیوشس کے حالات ' اس کی تعلیمات اور چین کے بادشاہوں کی ابتدا سے لے کر چیانگ کائی شیک کی موجودہ قومی حکومت کے قیام تک کی تاریخ وار فہرست بڑے اهتمام سے مرتب کی گئی ہے جس سے چین کی قدیم عظمت کی شان معلوم ہوتی ہے - ضمیمہ (ب) میں چین کی تاریخ کے ساتھہ ساتھہ جغرافیائی حالات و خصوصیات کا تذکرہ بھی ہے جس کی بدولت وہاں کے قدیم و جدید حالات سے قرار واقعی آگاہ ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے - ناموں کے تلفظ اور ہجا میں خاص اهتمام رکھا گیا ہے - چین کے علوم و فنون اور وہاں کے حالات سے نا واقفیت کا بڑا سبب زبان کا اختلاف تھا ' اردو میں یہ کتاب اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے - " شوکنگ " کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہے ' اگرچہ اصل کتاب کے سترہ بادشاہوں میں سے صرف گیارہ کے حالات کا ترجمہ پوش کیا گیا ہے -

" شوکنگ " تاریخ کی نہایت ابتدائی کتابوں میں سے ہے - اور اس کا مصنف کنفیوشس چین میں پیغمبری کا رتبہ رکھتا ہے ' اصل نام " کنگ فوزے تھا اور سنہ ولادت (۵۵۱ ق - م) - امور سلطنت میں کار گزار رهنے کے بعد

سیاست اور مذہب میں نئے رجحانات کا موجد بنا ' اس وقت بھی چین میں اس کے ۳۵ کروڑ پیرو موجود ہیں - حیات انسانی کے متعلق اس کا فلسفہ یہ تھا کہ " انسان کی فطرت صحیحہ اجتماعی ہے اور وہی نیک ہے ' بر خلاف اس کے انفرادیت اور انانیت فطری نہیں بلکہ عادتاً ہیں اس لیے بُری ہیں " - اس کی تعلیم یہ تھی : —

" ایسے رہو کہ دوسروں کے لیے تمہارا وجود رحمت ہو " —

مولف صاحب نے کنفیوشس کے فلسفے اور تعلیم سے اختلاف کرتے ہوئے جس میں حیات انسانی کے اجتماعی تصور کو انفرادیت پر کھلی کھلی ترجیح دی گئی ہے ' انفرادیت یا انانیت کو غیر فطری قیاس کرنے سے انکار کیا ہے - لیکن استدلال میں محض عوام کی سمجھ کے لیے اس نظریہ کا بلند ہونا کہہ دینے پر اکتفا کی گئی ہے - سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے مغربی صاحبان فکر نے بھی اس مابہ الاختلاف مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انفرادیت اور اجتماعیت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ' البتہ ترجیح و اولیت اب بھی معرض بحث میں ہے - کنفیوشس اور اس کے ہم خیالوں کے نزدیک خاندان کا جو تصور ہے وہی مملکت اور معاشرت کے تصور میں اُن کا رہبر ہے ' لہذا کنفیوشس کے پیش کردہ اصول کو بغیر مدلل بحث کے غلط کہہ دینا کسی قدر جرات کی بات ہے —

کنفوشش کی " شوکنگ " میں زراعت اور آبپاشی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے اور ان انتظامات کی طرف توجہ کرنے والے بادشاہوں کو رعایا کا سچا بہی خواہ کہہ کر سراہا گیا ہے - زمین کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ دستور سلطنت میں نو وزرا کے نام

ھیں جن میں سے چار وزرا کا تعلق اراضیات سے تھا - چین میں نجوم کو جو اھمیت حاصل رھی وہ غالباً اسی وجہ سے ہے - زراعت ھی چین کی کثریت کا پیشہ رھا ہے لیکن صنعت و حرفت بھی وھاں بڑے پیمانے پر موجود تھی' رسل و رسایل کی آسانی اور فلاحت کی ترقیوں کی خاطر انہروں کا جال بچھا ھوا تھا' دیوانی و فوجداری قوانین موجود تھے اور دستور و ضابطہ پر حکومت کاربند تھی اور یہ سب پچیس صدی پیشتر کہا حالانکہ بعض نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں اب بھی قوانین مالگزاری کی تدوین مکمل نہیں ھو پائی ہے - چین میں افلاس بالکل تو مٹایا نہ جا سکا تھا لیکن رعایا کی آواز معدلت پناہ تک پہنچتی اور اس کا اثر ضرور ھوتا تھا - چنانچہ جب بادشاہ "سن" نے جو ایک خود راے اور عیش پسند شخص تھا پہلی مرتبہ کھانا کھانے کی قلمیں ھاتھی دانت کی بنوائیں (چینیوں میں بانس یا لکڑی کی تیلیوں سے کھانا کھانے کا رواج بہت قدیم سے ہے) تو حکیم "کی سے" نے اس پر ملامت کی اور کہا "اب تو تم نے ھاتھی دانت کی قلمیں بنوائی ھیں' پھر تم بلور کے پیالے بنواؤ گے' پھر آگے چل کر تم ریچھ کے پنجے اور شیرنی کا رحم کھانا چاھو گے ... ... اسی قماش کی چیزوں کی ضرورت تمہیں زیادہ ھوتی جائے گی اور یقیناً ملک اس طرح کنگال ھو جائے گا" - (صفحہ ۹۹) - گویا بادشاہ کی خواھش پرستی کے خلاف رعایا کے حقوق سے اس کو آگاہ کیا گیا - کتاب نہ صرف چین کی قدیم تہذیب و سیاست کا آئینہ ہے بلکہ زمانۂ حال کے لیے ایک قابل قدر درس ہے —

( ر )

# متفرقات

## رومی جلد اول و دوم-

(مولفہ و مصنفہ مہر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد، سرحد)

مہر صاحب نے مثنوی مولانائے روم (رح) کو جدید نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے - اب تک بعض لوگ اسے محض مجموعۂ اساطیر سمجھتے تھے اور بعض اسے فلسفے کی دقیق کتاب کے نام سے موسوم کرتے تھے' لیکن مہر صاحب نے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ کتاب سراسر سعی و عمل اور جد و جہد کا پیغام ہے -

فاضل مؤلف نے اپنے اس نقطۂ نظر سے مثنوی کے خاص خاص التماسات دیے ہیں - ترتیب اس کی یوں ہے کہ سب سے پہلے تمہیدی یا ابتدائی تشریحی بیان ہے - پھر مثنوی کا متن جلی قلم سے لکھا گیا ہے - اس کے بعد ان اشعار کا مختصر اور پر مطلب ترجمہ ہے - خوبی اس میں یہ رکھی گئی ہے کہ مبتدی بھی بہ آسانی معنے سمجھ لیتا ہے - قرآنی آیات اور تلمیحات کو خوب واضح کیا گیا ہے اور بعض بعض مقامات پر مثنوی کے اشعار کی شرح قرآن کریم کے حوالے سے کی گئی ہے -

دوسری جلد کے خاتمے پر سات صفحوں میں مولانا جلال الدین رومی (رح) (صاحب مثنوی) کا مختصر مگر جامع تذکرہ بھی درج ہے -

لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت فی حصہ ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت بادۂ ناب - ایبٹ آباد (صوبہ سرحد)

(ر - ا)

# آداب حق موسوم بہ باغ جہاں افروز

(مولفہ مولانا محمد ایوب 'باغ' صاحب قادری چشتی اکبر آبادی ثم اجمیری صفحات ۲۹۰ - قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- آزاد ایجنسی اجمیر)

اس کتاب میں خاص خاص عنوان قائم کر کے صوفیاے کرام و مشائخ عظام کے اقوال جمع کیے گئے ہیں - ہر عنوان کے نیچے مصنف (رح) کے اشعار بصورت قطعہ یا رباعی رکھے گئے ہیں پھر آپ کے اقوال ' بعدہ دیگر صوفیا و اہل اللہ کے اقوال - غرض ' اِس کی ترتیب میں محنت سے کام لیا گیا ہے 'ور بلاشبہہ یہ کتاب عام طور پر مفید ہے -

افسوس ہے کہ املا کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً فائز المرام کو فائض المرام ' غنیۃ الطالبین کو غنیمت الطالبین' صوفیائے کرام کو صوفیاے اکرام ' چکھہ کو چکہہ اور خلائق کو خلالق لکھہ دیا گیا ہے - پھر کاتب صاحب نے نہایت بے دردی سے عربی عبارتوں پر کند چھری چلائی ہے مثلاً رحمۃ للعالمین کو ایک جگہ رحمت الا لعلمین لکھہ دیا ہے اور دوسری جگہ رحمۃ لا لعلمین - ارحم الرحمین کو الرحم الرحمن اور اهدنا الصراط المستقیم کو اهدنا الصراط المستقیم - وغیرہ وغیرہ- طباعت معمولی ہے

(ر - ا)

---

# اقوال قانونی

(مرتبہ افضل حسین صاحب فاروقی - ایچ - سی - ایس)

روم کا ملکی قانون ' أم القوانین ' کہا جاتا ہے اسی لیے آج بھی

دنیا کے جتنے مجموعۂ قوانین ہیں سب اسی سے متاثر اور کم و بیش اُن ہی قدیم اصولوں پر مدون کیے گئے ہیں - یہ ایک بحث طلب مسئلہ ضرور ہے کہ روم نے عرب کا اثر قبول کیا یا عرب نے روم سے استفادہ کیا ' بہر حال قانون کی مروجہ کتابیں اور قانون کے پروفیسروں کے لکچر اور مقالے شاید تشنہ معلوم ہوتے اگر رومیوں کے اصولوں کا انہیں کے الفاظ میں جابجا حوالہ نہ دیا جایا کرتا - مولوی افضل حسین صاحب نے ان ہی روز مرہ کے استعمال کے مقولوں کو جو روم کے ملکی قانون کے معروف اصول کہے جاتے ہیں ' یکجا کر کے ہر ایک کے مقابل اردو ترجمہ ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے مقولے زیادہ تر (Broom's Legal Maxims) سے لیے گئے ہیں اور ترجمے میں رام نرائین کی قانونی محاورات کی لغت سے مدد لی گئی ہے ' دو جگہ انگریزی جملوں کے اردو ترجمے ہیں ' یہ مجموعہ کار آمد ضرور ہوسکتا تھا مگر بعض مقامات پر زبان کو بہت زیادہ قانونی بنانے اور بعض جگہ لفظی ترجمے کی خاطر مبہم عبارت اور نامانوس ترکیبوں کے استعمال سے گریز نہیں کیا جاسکا -

(ر)

---

## مسلمانوں کا روشن مستقبل

اس کتاب کے مصنف جناب طفیل احمد صاحب منگلوری ہیں جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شریک معتمد نیز رسالہ " سود مند " وغیرہ بعض رسائل و کتب کی اشاعت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں - کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں

اپنے مستقبل کی طرف سے جو خوف پیدا ہوگیا ہے اور ان میں افسردگی اور مایوسی کی کیفیت پائی جاتی ہے، یہ بے بنیاد و عارضی ہے، اور وہ نہ صرف آزادی ہند کی جد و جہد میں بڑا حصہ لیں گے بلکہ آزاد ہندستان میں بھی ان کی قومی حالت ہر اعتبار سے اچھی اور لائق اطمینان رہے گی —

یہ موضوع نہایت دلکش ہے اور کچھہ شک نہیں کہ لائق مصنف کا مقصد تصنیف بھی بہت نیک اور حب قومی کی دلیل ہے - لیکن بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ جس طرح جناب موصوف کو رسالہ "سود مند" کی اشاعت کے موقع پر غالباً تجربہ ہوا ہوگا، آپ کے بنیادی خیالات مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے خیالات سے بالکل مختلف ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر جناب مصنف کے پیش کردہ واقعات و دلائل اور استخراج کیے ہوے نتائج کو درست مان لیا جاے تو بھی مسلمانوں کا یہ گروہ ہرگز اس حالت پر مسرور و مطمئن نہ ہوگا جسے جناب طفیل احمد صاحب "روشن مستقبل" کے شوق انگیز نام سے یاد فرماتے ہیں - یہ عرض کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ابتدا میں "بنیادی حقوق" گنوانے کے بعد فاضل مصنف نے آخر میں ان کی بحث کو بہت ہی تشنہ اور غیر واضح تحریر فرمایا ہے کہ حالانکہ کتاب کی جان یہی حصہ ہونا چاہیے تھا —

کتاب کے شروع میں ہندستان کی اسلامی حکومت اور پھر انگریزوں کے تسلط پر بھی کئی فصلوں میں بحث کی ہے - لیکن ان تاریخی واقعات کو اصل ماخذوں سے جمع کرنے کی بجاے عموماً بعد کی کتابوں، رسالوں بلکہ معمولی مجلسی تقریروں سے نقل کرنے پر قناعت فرمائی گئی ہے جس سے کتاب کے اس حصے کی قیمت کسی اخباری مقالے سے

یہ مشکل زیادہ کہی جا سکتی ہے —

کتاب کے سب سے کارآمد ابواب وہ ہیں، جن میں جدید تعلیم اور علی گڑھ تحریک کے آغاز و فروغ کے حالات لکھے ہیں - اور اسی ضمن میں بتایا ہے کہ کس طرح مسٹر بیک نے پہلے سر سید پر اور پھر ان کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسیات پر قبضہ حاصل کیا اور انہیں کانگرس کا حریف بنا کر قومی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے - ان حالات کو کافی تفصیل و واقفیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ہر چند مصنف کا نقطۂ نظر کانگرسی ہے اور وہ ہندستان کے سیاسی یا اسلامی مسائل پر کچھ بہت گہری نظر نہیں ڈال سکے ہیں، تاہم کتاب کا یہ حصہ خاصی تاریخی اہمیت رکھتا ہے —

آخری ابواب میں جدید سیاسی تحریکات، خلافت، ترک موالات، مطالبہ سوراج وغیرہ کے واقعات تحریر ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس قدر پس ماندگی اور زبوں حالی کے باوجود ہندستان کے مسلمانوں نے ان تحریکوں میں کیسے جوش و خروش اور ایثار سے کام کیا اور کر رہے ہیں —

کتاب چھوٹی تقطیع کے چھ سو سے کچھ زیادہ صفحات پر مجلد شائع کی گئی ہے اور دو روپے آٹھ آنے قیمت میں یقیناً ارزاں ہے - نظامی پریس بدایوں یا مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے —

( ھ )

# اُردو کے جدید رسالے

## مجلس

(ڈون اسکول اورینٹیل سوسائٹی)

کچھہ دنوں پہلے آغا محمد اشرف صاحب ایم - اے کا تعلق دلّی کے ریڈیو سے تھا - اور اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی کی وجہ سے بہت مقبول تھے - اب ان کا تعلق ڈیرہ دون اسکول سے ہوگیا ہے - یہاں بھی وہ اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں - یہ رسالہ انہیں کی نگرانی میں شایع ہوتا ہے - اس کے دو حصے ہیں - ایک اردو کا' دوسرا ہندی کا - اردو کا حصہ ۷۲ صفحے کا ہے اور ہندی کا ۴۲ صفحے کا —

اردو کے حصے میں ۲۱ مضمون ہیں ساغر صاحب کا گیت خارج کردیا جائے تو باقی بیسوں اسکول کے بچوں کے لکھے ہوے ہیں - تین مضمون تو گیارہ گیارہ برس کے بچوں کے لکھے ہوے ہیں اور چھہ مضمون تیرہ برس کی عمر والوں کے ہیں - زبان سب مضمونوں کی بہت سادہ' صحیح اور پیاری ہے - یہ آغا صاحب کا فیض معلوم ہوتا ہے - مضمون بھی بہت دلچسپ ہیں اور بعض بعض میں ظرافت کا بھی چٹخارا پایا جاتا ہے - جتنے مضمون ہیں وہ لکھنے والوں کی طبیعت' عمر اور ماحول کے مناسب ہیں - بچوں کے لیے یہ رسالہ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے' انہیں دیا گیا تو بہت شوق سے پڑھیں گے —

ایک بات اس "مجلس" میں خاص طور پر دیکھنے اور غور کرنے کی ہے - اس میں بیس مضمون ہیں اور سب بچوں کے لکھے ہوئے ہیں- ان لکھنے والوں میں تین تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اصل نام نہیں لکھے۔ اب رہے سترہ، تو ان میں سے بارہ ہندو اور پانچ مسلمان ہیں- اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ زبان کسی ایک فرقے یا قوم کی نہیں بلکہ ہم سب کی ہے اور جس طرح شروع میں اس کے بنانے اور بڑھانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے اب بھی دونوں اسی شوق سے پڑھتے اور لکھتے ہیں- جو لوگ یہ بات نہیں مانتے اور اسے کسی ایک قوم کی زبان بتاکر اس کی طرف سے بدگمانی اور نفرت پھیلاتے ہیں وہ اپنے ملک سے دشمنی کرتے ہیں- یہ ہماری محبت اور یک جہتی کی یادگار ہے اور اس لیے ہم سب کو اس کی پرورش کرنی چاہیے - کیا تعجب ہے کہ ڈون اسکول کی مجلس زبان کی صفائی اور ترقی کے لیے وہی کام کرے جو کسی زمانے میں کلکتہ، دلی اور علی گڑھ نے کیا تھا - اگرچہ اس مجلس کے رونق دینے والے بچے ہیں، لیکن بعض وقت بچے بڑوں بڑوں کو سبق دے دیتے ہیں —

یہ رسالہ لطیفی پریس دہلی میں چھپا ہے اور خوب چھپا ہے - جیسے اچھے اور ستھرے اس کے مضمون ہیں ویسی ہی اچھی اور ستھری اس کی لکھائی چھپائی ہے —

## زمانہ، پریم چند نمبر -

رسالہ 'زمانہ' کانپور نے منشی پریم چند آنجہانی کی یادگار میں

'پریم چند نمبر' شایع کیا ہے - یہ نمبر ادبی لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہے اوراس میں منشی صاحب مرحوم کی سوانح حیات اور ان کے عاسی کارناموں کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں - اس نمبر کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے - پہلے حصے میں منشی جی کی سوانح حیات بیان کی گئی ہے - ان کی آپ بیتی کے علاوہ ان کے جگری دوست منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر 'زمانہ' نے اپنے طویل و بسیط مضمون میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات تفصیل اور خوبی سے لکھے ہیں' یہ مضمون ہر لحاظ سے قابل قدر اور تمام رسالے کی جان ہے - مسز پریم چند کے مضمون سے منشی صاحب کے خانگی تعلقات' عادات و خصائل پر خاص روشنی پڑتی ہے ' اور ان کی سادگی اور ایثار کا حال معلوم ہوتا ہے - خاص طور پر ان کے آخری وقت کا بیان بہت موثر اور دردانگیز ہے - اسی حصہ سے متعلق کئی اور اصحاب نے بھی مضمون لکھے ہیں - مثلاً مرزا محمد عسکری نے پریم چند مرحوم سے زیادہ خود اپنی تعریف کی ہے - ندا علی 'خنجر' اور 'فراق' کے مضمون بھی اسی قبیل کے ہیں کہ ممدوح کی تعریف کے ضمن میں اپنا ذکر خیر بھی فرمادیا ہے - 'بیتاب' کا مضمون البتہ اچھا ہے اور انہوں نے پریم چند مرحوم کے حالات زندگی کو چار دوروں میں تقسیم کر کے ان کی خوبیوں کو بیان کیا ہے —

دوسرے حصے میں منشی جی کی افسانہ نگاری سے متعلق مضمون لکھے گئے ہیں اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے - اس حصے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا مضمون اچھا اور دلچسپ ہے - دوسرے مضامین بھی اچھی غور و فکر کا نتیجہ ہیں —

تیسرے حصے میں منشی پریم چند کی وفات پر ملک کے مختلف شعرا نے

جو اظہار غم کیا ہے، وہ نظمیں، قطعات اور تاریخیں مندرج ہیں -

غرض 'پریم چند نمبر' ہر طرح مرحوم کے شایان شان نکالا گیا ہے اور اس کے لیے مدیر زمانہ مستحق مبارک باد ہیں کہ انہیں مرحوم سے جو محبت و ربط تھا اس کی یادگار بھی انہوں نے انتہائی خلوص و عقیدت سے پیش کی —

اس نمبر میں پریم چند مرحوم کی کئی تصویریں بھی شایع کی گئی ہیں- قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے رکھی گئی ہے اور ضخامت تقریباً ۲۵۲ صفحات ہیں - کاغذ معمولی استعمال کیا گیا ہے —

( ت - ر )

---

## سب رس -

" ادارۂ ادبیات اردو " کا ماہ نامہ جنوری سنہ ۳۸ ع سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری 'زور' کی نگرانی اور 'میکش' صاحب کی ادارت میں شایع ہونا شروع ہوا ہے - 'زور' صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں' ان کے علمی و ادبی کارناموں سے اردو داں حضرات بخوبی واقف ہیں- حیدرآباد میں اردو کی ترقی اور علم و ادب کی فراوانی کے باوجود اچھے رسائل کا ایک بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے - اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے " سب رس " نکالا گیا ہے - یہ ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے دلچسپ اور عام فہم مضامین شایع کیے جائیں کہ جنھیں عام و خاص سب سے پڑھ سکیں - اب تک اس کے تین نمبر

شایع ہو چکے ہیں - زیر نظر پرچہ مارچ کا ہے ' جو " محرم نمبر " کے نام سے شایع کیا گیا ہے - شہدائے کربلا کی یادگار میں یہ نذر عقیدت انتہائی خلوص سے پیش کی گئی ہے - شہادت سے متعلق بعض مضامین بہت اچھے اور قابل مطالعہ ہیں - متعدد سلام اور نوحے بھی درج ہیں - اس کے علاوہ اردو مرثیہ نگاری کے متعلق مختلف مضامین کے ذریعہ کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں —

" اردو مرثیوں کا ارتقا " کے زیر عنوان ڈاکٹر ' زور ' صاحب نے تقریباً ۱۱۳ مرثیہ نگاروں کے نام اور ان میں سے اکثر کا نمونۂ کلام بھی شایع کیا ہے - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں صنف مرثیہ نگاری کس قدر مقبول رہی ہے ' اور اس میں کس طرح بتدریج ترقی ہوئی ہے —

محرم سے متعلق مضامین کے علاوہ مارچ کے ' سب رس ' میں عام مضامین بھی شایع کیے گئے ہیں - جن میں سروری صاحب کا " جھٹکا " عظیم بیگ چغتائی کے یکہ کے نمونہ پر لکھا گیا ہے - مرزا عصمت اللہ بیگ کا مزاحیہ مضمون " بلدر بھبکی " بھی برا نہیں - ' میکش ' صاحب کی نظم ' کشمکش ' اور جہاں بانو بیگم کا مضمون " شام غربت کی اک جھلک " قابل تعریف ہے —

' سب رس ' کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا ایک حصہ بچوں کے لیے وقف ہے ' جس میں ان کی دلچسپی کے مضامین ' طرح طرح کی معلومات ' نظمیں ' کہانیاں ' پہیلیاں ' لطیفے اور چٹکلے ہوتے ہیں - رسالہ کا سالانہ چندہ حیدرآباد کے لیے چار روپے اور حیدرآباد سے

باہر چار روپے آٹھ آنے مقرر کیا گیا ہے - کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے تصاویر بھی شایع کی جاتی ہیں —

ملنے کا پتہ : رفعت منزل - خیریت آباد ہے —

ت - ر

---

## بورڈ ٹیچر

بورڈ ٹیچرز یونین کا اصلاحی و علمی رسالہ ہے جس کا مقصد بورڈ ٹیچرز کے حقوق و مفاد کی حفاظت و نگرانی کرنا ہے - اساتذہ کے تقرر' ترقی' تخفیف علیحدگی وغیرہ جملہ امور کے متعلق مفید مشورے بہم پہنچانا اور مدرسین کو موجودہ ذلت اور پستی سے نکال کر ان کی علمی اور مالی حالت کو سنوارنا ہے - اس کے علاوہ علمی و اصلاحی مضامین شایع کرنا' خاص طور پر ایسے مضامین جن میں کمسن طالب علموں کی تعلیم و تربیت اور درستی اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی جائے' غرض؛ اس رسالے کے مقاصد بہت مفید ہیں - چندہ سالانہ دو روپے ہے - مقام اشاعت بٹالہ' گورداسپور ہے —

( ت - ر )

---

## دوام

پشاور سے اس نام کا ایک ماہوار رسالہ ستمبر سنہ ۳۷ ع سے جاری ہوا ہے - صوبہ سرحد میں اردو رسائل بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں - اور وہاں کسی علمی و ادبی رسالے کو چلانا آسان بھی ہے اور مشکل

بھی ' آسان اس لیے کہ جہاں کم رسالے نکلتے ہوں وہاں اگر کوشش اور ہمت سے کام لیا جائے تو نئے رسالے کا کامیابی حاصل کرلینا اتنا دشوار نہیں جتنا اس جگہ جہاں پہلے ہی سے بے شمار رسائل جاری ہوں - مشکل اس لیے ہے کہ جب تک رسالے کو دلچسپ اور مفید نہ بنایا جائے کہ وہ " پسند کرلیں خواص ' سمجھہ میں آئے عوام کی بھی کا مصداق ہو جائے ' وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا —

مدیر رسالہ کے برادر محترم نے ' دوام ' کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں اگر اُن پر عمل در آمد کیا جائے تو یقین ہے یہ رسالہ پروان چڑھ سکے گا —

چندہ سالانہ کچھہ درج نہیں - قیمت فی پرچہ چھہ پیسے ہے -

(ت - ر)

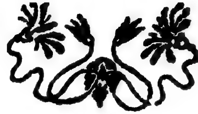
## اختر لاہور

' اختر ' لاہور نے اپنا جنوری کا پرچہ نو روز نمبر کے نام سے شایع کیا ہے - نظرات میں مدیر محترم لکھتے ہیں کہ وہ بذات خود سالنامہ نکالنے کے خلاف ہیں - اس لیے موجودہ نمبر میں انہوں نے یہ جدت کی ہے کہ دیگر ادبی جرائد نے جو سالنامے اس سال پیش کیے ہیں ' ان میں سے چند چیدہ مضامین انتخاب کر کے شایع کر دیے ہیں ' تاکہ وہ لوگ جو مختلف سالنامے خرید کر نہیں پڑھ سکتے ' اس طرح ان کے مضامین سے لطف اندوز ہو سکیں - اس سلسلے میں تین افسانے اور ایک ڈراما منتخب کیا گیا ہے —

پہلا افسانہ 'پریم کا جادو' نامکمل ہے ' جس کی وجہ سے اس کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا ہے - باقی افسانے اور ڈرامے خاصے ہیں - دو نظمیں بھی ہیں جو معمولی ہیں -

آئندہ نمبر " اقبال نمبر " نکالنے کی تجویز ہے جس کے متعلق بہت کچھ توقعات ظاہر کی گئی ہیں - قیمت ۸ آنے مقرر کی گئی ہے - رسالے کا سالانہ چندہ دو روپیہ پندرہ آنے ' فی پرچہ چار آنے ہے -

(ت - ر)



# اردو


| ۱۸ | جنوری سنه ۱۹۳۸ ع | حصۂ ۶۹ |
|---|---|---|


انجمن ترقی اردو کا سه ماہی رساله

اورنگ آباد (دکن)

# دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

مرتبۂ

## انجمن ترقی اُردو ( ہند )

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً ہر لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

( ۱ ) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

( ۲ ) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

( ۳ ) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

( ۴ ) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

( ۵ ) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

( ۶ ) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

( ۷ ) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

( ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۲ + ۳۳ ) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصولڈاک

### ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیء اردو ( ہند ) اورنگ آباد ( دکن )

# اردو

## فہرست مضامین

### بابت جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع

نقوش ۱۹۵۹ ء ۸۸۴ ے

# دیوان میر کا ایک مخصوص نسخہ

## اور

# میر کے متعلق معلومات میں خاص اضافہ

از

( جناب عبدالباری آسی صاحب - لکھنؤ )

شعراے ریختہ کی تذکرہ نویسی کا سلسلہ میر تقی میر مرحوم کے وقت سے جاری ہوا اور آج تک اسی طرح جاری ہے خود میر صاحب نے بھی تذکرہ لکھا - اور ان کے موقر معاصرین میر حسن، سودا، قایم، مصحفی وغیرہ نے بھی - مگر چونکہ اس زمانے میں تذکرہ نویسی قرابادین نویسی سے زیادہ نہ تھی کہ امراض انسانی کے سر سے لے کر پیر تک کے نسخے جمع کردیے اور بس - اسی طرح تذکروں میں شاعر کی تعریف اور مختلف شاعروں کا کلام ہوتا تھا اور بس - اگرچہ ان میں سے بعض مستثنیٰ بھی کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے کلام جمع کرنے کے سوائے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی ہے - مگر وہ بھی دھندلی دھندلی - اسی سبب سے تمام متقدمین کے تذکرے جمع کرلیجیے پھر بھی اجمال اور اہمال کی تاریکیوں سے نکلنا کچھہ آسان کام نہیں ہے - کہا کیا جائے اس زمانے کی رسم اور اس وقت کا دستور ہی یہ تھا کہ شاعر کی ذاتی

تعریف و محاسن کے رنگین فقروں کے لیے دو دو صفحے وقف اور صحیح حالات کے لیے دو سطریں بھی نہیں —

متقدمین کا دور گزرا متوسطین کا زمانہ آیا - شیفتہ ' نساخ ' باطن ' صہبائی وغیرہ نے تذکرے لکھے وہ بھی ایک قدم اس قدیمی لیکھہ سے نہیں ہٹے اور کسی طرح قدیمی وضع میں فرق نہیں آنے دیا - مگر جب یہ لوگ بھی متاخرین کے لیے جگہ خالی کرگئے تو تنقید و تحقیق کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی - جہاں تک خیال ہے تین چار تذکرے اس دور میں بہت ہی بہتر لکھے گئے - آب حیات مولانا آزاد ' کاشف الحقائق امداد امام صاحب اثر ' جلوۂ خضر یہ سب تذکرے اپنی اپنی نوعیت میں علیحدہ ہیں - مگر وہ چیز جس کو نگاہیں ڈھونڈتی تھیں آبحیات میں موجود ہے اور اس کی جامعیت یقینی اس وقت کے مولفین و مصنفین کے لیے قابل رشک ہے - حالات ' سوانح ' لطایف ظرایف ' تنقید تحقیق ' رنگینی و روانی عبارت غرض کہ یہ سبھی چیزیں اس میں موجود ہیں - مگر اتنی سی کمزوری بھی ہے کہ جہاں مولانا کو کوئی تاریخی سہارا نہیں ملتا تو ان واضعان حدیث کی روش اختیار کرنی پڑتی ہے جنھوں نے مذہب کو نزہت الناظرین بنا کر پیش کیا ہے - جب وہ چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد کی فضا میں نکل جاتے ہیں تو گمان ' قیاس ' تک بندی ' چٹکلے بدیہہ گوئی غرض کسی چیز سے بھی پرہیز نہیں کرتے - مگر باوجود اس کے بھی آب حیات سے اکثر ایسی چیزیں اور ایسی باتیں بروئے کار آگئیں جن پر نہ معلوم کب سے جہل کے پردے پڑے ہوئے تھے —

آب حیات کو نقش اولیں ضرور کہا جاسکتا ہے مگر اس حقیقت میں انکار کی گنجائش نہیں کہ دور موجودہ کے نقادان فن نے روایتوں

کو درایت کی کسوٹی پر کس کر اُس زر ناقص کو کامل العیار بنادیا ہے جو اب سے پہلے نہایت خراب حالت میں تھا - اب واقعات کو اس طرح آئینہ بناکر سامنے لایا گیا ہے کہ عہد ماضی کی صحیح صحیح تصویریں اس میں نظر آتی ہیں چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب کے بعض تذکروں پر لکھے ہوئے مقدمات' مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کا گل رعنا' رام بابو صاحب سکسینہ کی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا ترجمہ تاریخ ادب اردو اس دعوے کے شاہد عادل ہیں - کوئی شک نہیں کہ ان تذکروں میں ہر اجمال کو تفصیل کے ساتھہ بدل کر داد تحقیق دی گئی ہے —

پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر نہ کوئی قیاس آرائی کی جاسکتی ہے اور نہ درایت وہاں تک پہنچتی ہے اور وہ جہل اور عدم وقوف ہنوز جہل اور عدم وقوف سے آگے نہیں بڑھے —

مثال کے طور پر میر کی عمر کے مسئلے ہی کو لے لیجیے - وہ جیسا قدیم سے اختلافی تھا ہنوز اختلافی ہے - ان کے سنہ پیدائش سے ناواقفی بدستور ہے - مصحفی کے تخمینے کا میر حسن کے بیان سے تطابق کیا جاتا ہے کہ مصحفی کا تذکرہ جب تالیف ہو رہا تھا ان کی عمر اس وقت اسی (۸۰) برس کی تھی - میر حسن جب میر کا ذکر کر رہے تھے اس وقت ان کی عمر ساٹھہ سال کی تھی - آزاد اٹھتے ہیں تو ایکدم انہیں ایک دم انہیں ایک سیکڑے تک بغیر کسی تاریخی سہارے کے پہنچادیتے ہیں - ان سب قیاس آرائیوں کے بعد مولانا عبدالحق صاحب اور مرزا محمد عسکری صاحب نہایت کاوش کے بعد ان کی عمر ۸۹ یا ۹۰ قرار دیتے ہیں - اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے مگر

پھر بھی یہ تعین قیاس اور درایت کا ممنون احسان ہے اور ہنوز اعتماد نہیں کیا جا سکتا —

خیر یہاں تک تو درست ہے۔ مگر ان باتوں پر کیا قیاس آرائی کی جائے جن باتوں کا سرے سے پتا ہی نہیں۔ مثلاً یہ تو معلوم ہے کہ سنہ ۱۲۲۵ ھ میں میر صاحب کا انتقال ہوا مگر نہ مہینہ معلوم نہ تاریخ نہ دن —

اسی طرح یہ تو مسلم کہ اُن کا لکھنؤ میں قیام تھا اور وہ دولت آصفیہ سے وابستہ تھے۔ مگر یہ خبر نہیں کہ وہ کہاں رہتے تھے —

یہ بھی خبر ہے کہ وہ لکھنؤ ہی میں مدفون ہیں مگر اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ کہاں دفن ہیں۔ کوئی کہتا ہے مصری کی بغیا میں اور کوئی کہتا ہے سعادت گنج یا عیش باغ میں۔ کوئی کہتا ہے بھیم کے تکیے میں۔ غرض اختلافی مسائل ہنوز اختلافی، قیاسی قیاسی، نا معلوم نا معلوم ہیں —

مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے واقعات سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ مل رہے ہیں اور گمان کو یقین کے درجے پر پہنچا رہے ہیں۔ چنانچہ آج ہم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ شاید اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً دنیاے ادب میں اتنا بڑا درجہ رکھتی ہے جو شاید دوسری چیز کو حاصل نہیں —

خصوصیت اول | وہ کیا ہے؟ میر تقی میر کا چوتھا دیوان۔ مگر کیسا۔ جو خود انہوں نے اپنے شاگرد محمد محسن المخاطب بہ زین الدین کو اپنے ہاتھ سے دیا۔ اور نہایت خوشی و رغبت سے دیا اور معاف کیا —

یہ واقعہ مہر صاحب کی وفات سے دس بارہ برس پہلے کا ہے - اور غالباً یہ چاروں دیوان تھے جن میں تین شاید محمد محسن کے ہاتھہ سے تلف ہوگئے تھے اور ایک دیوان باقی رہ گیا تھا جس کی طرف خود محمد محسن صاحب نے اُس تحریر میں اشارہ کیا ہے جو انہوں نے اپنے قلم سے اس پر لکھی ہے —

**خصوصیت دوم** یہ دیوان میر حسن علی تجلی داماد مہر مغفور کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہے - جو شاید اُنھوں نے مہر مرحوم کے اشارے سے لکھا ہو - کیونکہ اس دیوان کا مہر صاحب کے قبضے میں ہونا اور اُن کا اپنے ایک شاگرد کو بخشش دینا اس کی بین دلیل ہے —

**خصوصیت سوم** اس دیوان پر محمد محسن کے ہاتھہ کی لکھی ہوئی جو عبارت ہے اُس سے ان تمام باتوں کا پتہ چل جاتا ہے جو اب تک کسی تذکرے والے نے نہیں لکھیں - اور یہ عبارت مہر کے انتقال سے چھہ سات روز بعد لکھی گئی —

**خصوصیت چہارم** یہ دیوان نہایت صحیح ہے اور یقینی طور پر مہر مغفور کی نگاہ سے گزر چکا ہے -

**خصوصیت پنجم** اس دیوان کے آخر میں سوانح مہر بھی ہیں جن سے اُن کے حالات زندگی پر اور بھی تیز روشنی پڑتی ہے اور یہ حالات بھی اس قسم کے ہیں جو کسی تذکرے میں درج نہیں ہیں - یہ کسی کتاب نوادرالکلام سے لیے گئے ہیں —

**خصوصیت ششم** اس پر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی مُہریں درج ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دیوان کتب خانہ جات شاہی میں رہا ہے اور بہترین درجہ پاچکا ہے —

خصوصیت ہفتم: اس دیوان میں بہ نسبت دیوان متداول کے کلام زیادہ ہے - چنانچہ سب سے آخر میں ایک غزل ہے جو کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے —

خصوصیت ہشتم: چونکہ اس دیوان کے ساتھہ مہر کی پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں ان میں ایک تاریخی مثنوی غیر مطبوعہ ہے اور و کسی متداول دیوان میں نہیں ہے —

اس کے بعد ہم وہ عبارت نقل کرنا چاہتے ہیں جو اس دیوان کے پہلے صفحے پر درج ہے اور جس سے اکثر واقعات سامنے آجاتے اور شکوک جاتے رہتے ہیں - اس کے بعد ہم اس کی تشریح کرکے بتائیں گے -

## نقل عبارت

بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام سنہ ۱۲۲۵ ھ یک ہزار و دو صد و بست پنج هجری بود کہ مہر محمد تقی صاحب مہر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ شتھکی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند - و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند - و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ہمٔ ازاں جملہ است بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوزالله عنہ سیاتہ درحین حیات خویش بہ کمال رغبت بحل کردہ بخشیدند - خدایش بیامرزاد —

حررّہ محمد محسن علی عفی عنہ روز جمعہ بست و هفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت چہار گھڑی روز باقیماندہ - ایں دیوان بہ دستخط مہر حسن علی تجلی داماد مہر مغفوراست —

| اس عبارت سے میر کے متعلق معلومات میں کیا اضافہ ہوتا ہے | میر کے متعلق سنہ وفات تو ناسخ کی تاریخ واویلا مرد شہ شاعراں سے متعین ہوچکا ہے |
|---|---|

لہذا یہ کوئی نئی نئی معلومات نہ ہوگی - البتہ اسی عبارت کے نیچے محمد محسن محسن کی دو تاریخیں درج ہیں وہ ضرور قابل نقل ہیں:

تاریخ نمبر ۱

محمد تقی میر شاعر که بود    مسلم و را تخت و تاج سخن
با قلیم معنی ز ارباب شعر    ستانندہ او بود باج سخن
ز مرگش چو بے نور شد شعر سال    نوشتم بمردہ سراج سخن
۱۲۲۵

تاریخ نمبر ۲

میر تقی استاد فن شعر    مرد و ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش همه بیسر    میر تقی استاد رقم شد
۱۲۲۶

دوسری تاریخ کے نیچے ۱۲۲۶ کے ساتھ ۱۲۲۵ بھی لکھا ہے - غالباً ایک کی زیادتی کی کوئی پروا نہیں کی گئی اور اشعار کے الف کا ایک عدد دور کر کے اس کو تخرجہ کی صورت میں رکھ لیا گیا —

دوسری چیز جو معلومات میں اضافہ کرتی ہے وہ مہینہ ہے یعنی شعبان سنہ ۱۲۲۵ - تیسری چیز دن یعنی روز جمعہ چوتھی چیز ۹۰ برس کی عمر اور وقت انتقال یعنی وقت شام - پانچویں چیز جائے انتقال یعنی محلہ ستھکی * جس سے اُن کے مکان کا بھی پتہ چل گیا اور

* پرانے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جو ڈالی گنج کے محاذ میں دریا کے جنوبی کنارے کی طرف دور تک آباد تھا اور یہیں اسی نام کا ایک بازار تھا جہاں سوت وغیرہ کی خرید و فروخت ہوتی تھی - یہ محلہ میر کی وفات کے بعد عرصہ تک آباد رہا - میر انیس کا مکان بھی اسی محلے میں تھا - لکھنؤ کے مشہور شاعر جان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے —

جہاں جاتی ہوں مردوں کی ستھکی سی ہے لگ جاتی    یہ مجھلا بڑھیا کا کاتا ہے جوانوں کا تماشا ہے

اب اسی محلہ کا نام بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں ممکن ہے کہ میرے اس پتہ میں کوئی تبدیلی ہوسکے مگر اس محلے کے ہونے میں کلام نہیں -

جائے قیام بھی معلوم ہوگئی — ؟

چھٹی چیز یہ کہ جس روز ان کا انتقال ہوا اس روز دفن نہیں ہوے بلکہ جمعہ کی شام کو انتقال ہوا اور ہفتہ کو دو پہر کے وقت دفن ہوئے - ساتویں چیز یہ کہ ان کے اعزا و اقربا بھی یہاں انتقال کر چکے تھے انہیں کی قبروں کے پاس یہ مدفون ہوئے - اگرچہ اب نہ ان کے اعزا کی قبروں کا نشان ہے نہ ان کی قبر کا پتہ ' مگر بتانے والے نے اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے ایک صحیح نشان بتایا تھا جسے امتداد زمانہ نے ہمارے لیے باقی نہیں رکھا - آٹھویں اہم چیز ان کی جاے دفن کا نام ہے - یعنی اکھاڑہ بھیم * - اور اس سے وہ تمام قیاسات اور روایات باطل ہوجاتے

---

* اکھاڑہ بھیم کے متعلق جب تحقیق کی گئی تو عمر رسیدہ حضرات سے دو باتیں معلوم ہوئیں - بعض نے بتایا کہ بھیم کا اکھاڑہ بھیم کے تکیے کے نام سے بھی مشہور تھا - اور وہ یہی قبرستان ہے جو گولہ گنج ریل کی پٹری کے برابر دور تک چلا گیا ہے - اور اتفاق کی بات ہے کہ میر کی قبر اسی قبرستان میں مشہور بھی ہے چنانچہ ریل کے پھاٹک کے قریب جہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہے اور ایک دو مجاور بھی وہاں رہتے ہیں اُسی کو میر کی قبر بتایا جاتا ہے - اب اُس پر عرس وغیرہ بھی ہوتا ہے - مگر مولانا سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو لکچرار یونیورسٹی سے یہ سن کر مجھے نہایت افسوس ہوا کہ اب ایک فقیر نے جو وہاں رہتا ہے اُسے شاہ جنش کا مزار مشہور کرنا شروع کردیا ہے -

دوسری بات جو اکھاڑہ بھیم کے متعلق معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ عیش باغ کے قریب تھا - مگر جہاں تک تحقیق کی یہ دوسری چیز صحیح ثابت نہیں ہوئی بھیم کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ ایک پہلوان تھا جو کسی اور جگہہ سے وارد لکھنؤ ہوا تھا - اور اس نے ایک املی کو چیر کر اُس کے اندر ایک اینٹ رکھدی تھی اور چیلنج دیدیا تھا کہ اب کوئی اس اینٹ کو سالم اس سے نکال لے تو میں اُس کو پہلوان مان لوں گا - مگر یہ سب باتیں کچھہ مہمل سی معلوم ہوتی ہیں - اس جگہہ کے متعلق بھی جان صاحب نے ایک جگہہ ذکر کیا ہے -

ایک ایک نکتہ پر اجی لڑتے ہیں مردوے معقل مشاعرے کی اکھاڑا ہے بھیم کا

بہر حال یہ اکھاڑہ اور یہ تکیہ ضرور تھا - اور عجب نہیں کہ یہی ہو جس پر لوگوں کا گمان ہے - ' آسی '

ہیں جو مزار میر کے تعین کرنے کی کوشش میں رسالوں اور اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کر چکے ہیں - اور اب تک لکھنؤ کے بعض رسالوں میں اسی قسم کے مضمون نکل جاتے ہیں - نوین بات یہ ہے کہ یہ دیوان جس کی عبارت نقل کی گئی ہے میر کے مرنے سے دس بارہ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے کیونکہ لکھنے والے کی یہ عبارت دیکھہ کر۔ " کہ چہار دیوان خود را کہ این دیوان چہارم ہم از آں جملہ است " ذوق تنقید کو کاوش ہوتی ہے کہ آج کلیات میر میں چھہ دیوان ہیں - پھر کیا میر صاحب نے اپنے شاگرد کو ایک نا تمام نسخہ دیا تھا ۔ ہرگز نہیں - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اُس وقت کا دیا ہوا ہے جب کہ میر صاحب کے صرف چار دیوان اختتام کو پہنچے تھے - چنانچہ تذکرہ گلزار ابراہیم علی ابراہیم خاں جو سنہ ۱۱۹۸ ھ میں لکھا گیا وہ لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اج کے دن تک کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری میں وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا ... ... یہ رہنما قوم سخن سرمایگان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہاں ہے یعنی صاحب چار دیوان - اسی طرح مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں جو سنہ ۱۲۲۱ ھ میں شروع ہوا اور سنہ ۱۲۲۹ ھ میں اختتام کو پہنچا لکھا ہے کہ چہار دیوان از خامۂ فکرش ریختہ - غرض اُن کی آخر عمر تک چار ہی دیوانوں کا پتہ چلتا ہے —

اس ہم کو ایک اور چیز پر قیاس آرائی کا موقع مل جاتا ہے - کہ میر صاحب کے دیوان پنجم و ششم میں جو غزلیں ہیں وہ آخر وقت کی ہیں جب کہ اُن کی عمر ۸۵ - ۸۶ سال کی ہو چکی تھی - اس کے ساتھہ ہی ساتھہ قیاس کو اور وسعت دی جائے تو یہ گماں بھی یقین کی حد پر پہنچ جاتا ہے کہ اُن کے دیوانوں کی ترتیب اُن کی عمر کے لحاظ سے

ہوئی پہلے دیوان میں ابتدائی شاعری کا کلام ہے اور دوسرے دیوان میں اُس کے بعد کا اور یوں ہی بتدریج —

پھر اس کے بعد ایک اور مہتم بالشان صورت یہ بھی نکل آئیگی کہ اُن کے ابتدائی کلام کا اُن کے وسط عمر اور آخر عمر کے رنگ سے مقابلہ کرنا آسان ہوگا جو یقیناً ایک بہت بڑا ادبی نتیجہ پیدا کر کے اُن کے حالات و خیالات پر روشنی ڈالے گا - دسری بات یہ ہے کہ میر صاحب کے چھہ سات روز بعد محمد محسن نے اُن کے یہ حالات لکھے ان میں کوئی بات مشکوک اور شبہہ کے قابل نہ ہوگی —

یہ اُس عبارت سے ہم کو معلومات ہوتی ہے جو دیوان کے ٹائٹل پر باریک خط میں درج ہے - اب میں اُس عبارت کو نقل کرتا ہوں جو دیوان کے ختم ہونے کے بعد دوسرے صفحے پر درج ہے - جو غالباً محمد محسن کی لکھی ہوئی نہیں ہے - کسی دوسرے شخص نے اُسی زمانے میں کسی کتاب نوادرالکملاء سے نقل کردی ہے - اس سے پھر بہت سی نئی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اُن کی آخری زندگی کے حالات آئینہ ہو جاتے ہیں —

## سوانح محمد تقی میر

اصلش از اکبر آباد - در اواخر یکصد و سی پنج هجری ولادت واقع شدہ - بعد واقعہ هائلہ پدر بزرگوار بہ عمر هفدہ سالگی در دهلی رفت - و بہ خانہ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ - بعد مرور دهور کہ جدائی فیمابین واقع شد بہ روسائے عظام در خورد و بر خورد - و بہ فراغت تام و خوبی مالا کلام با امرا و اقربا زندگی بسرمے برد - تا زمانے کہ آشوب عظیم و فتنۂ نمایاں

بروے کار آمد - ہنگامہ نادرہ گرم شد - کاروبار مردم در هم و برهم شد -
خانما نها به تاراج اوباشاں رفت - برنجها و شرفا عرصۂ حیات تنگ شد -
مردماں شاهجهان آباد از هردرے که یافتند از جا بیروں رفتند - وروبه
صحرائے غربت نہادند - میر صاحب تا زمانے بیجا بر جا (ماندند ؟) حیران
و پریشان سراسیمه و سرگردان - نه انیسے که یاری کند و نه انیسے که
غمگساری - کلفت ها دیدند و کربتها کشیدند - آخر کار به ایمائے نواب وزیر حضرت
دهلی را که بجائے وطن مالوف بود وداع کرده به بلاد شرقی
شتافتند - و در بلدۂ لکھنؤ طرح اقامت انداخته مورد عواطف آصفی شدند -
شهرۂ حسن کلام زمین و زماں را برگرفت - ذره ذره روشناس و قطره قطره
محو سپاس - چه تعظیم ها که نه دیدند و چه آفرینها که نه کشیدند -
گردوں بے مدار فتنه اساس و زمانۂ غدار ناسپاس است کسے را نه بیند که نوازد ،
جگر میر را به حوادث گونا گوں فگار ساخت - و آسودۂ را شکار آزار
کرد - در سالے مایۂ ناز پروردۂ آغوش ناز دختر - و در سالے دیگر مرهم
جگر افگار خلف کامگار - و در سالے دیگر اهلیۂ عفت شعار به کنج عافیت
مزار آسودند - قیامت آشکار و محشر پدیدار شد - در حواس و مزاج
اختلال کلی راه یافت - برداشتگی خاطر از دنیاے ناپائدار از حد افزوں
و شوق جاں سپردگی از اندازه بیروں رفت - داماں عزلت مستحکم گرفتند -
مجالس و محافل را وداع نمودند - مدتے به همیں نوع گزشت انچه
گزشت - آخر در شهر ربیع الثانی عوارض مزمنه رو به ترقی آوردند -
درد قولنج که جلیس قدیم و همراز و ندیم بود ساعتے نه گزاشت - وجع مفاصل
قوائے جسمانی را معطل ساخته - پزشکان شاهی که شناسائے قدیم بودند
هجوم آوردند - رائے همگناں براں قرار یافت که چارۂ کار قرار واقعی

باید نمود و داروئے باید بہ استعمال آورد کہ قبض طبیعت بر طرف شود - تلیئے دادند اسہال بود کہ پیام مرگ ' جثۂ نحیف و مضغۂ ضعیف و اسہال یکروزہ یک صد و پنجاہ - واویلا آہ آہ - دو سہ روز ہمیں نوبت بود - آزار بہ مرگ انجامید - فرشتۂ موت جام ہلا ہل کل من علیہا فان پیش نمودہ - بیاشامید - ان للہ و انا الیہ راجعون ثم ان للہ و انا الیہ راجعون - مرحوم مردے بود متوکل سپاہی پیشہ رقیق القلب پابند وضع جہاندیدہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ سر آمد سخنوران ماضی و حال در سخن سنجی بے مثال کم اختلاط و با دوستاں سراسر ارتباط ' سنجیدہ' از حرص و ہوائے دنیا آزاد - و کسے را کہ نیازردے ہرگز ہرگز حملہ بران نیاوردے - کسے را بد نمی گفت و بد نمی شنفت - استغنائے بیش از بیش بہ تعظیم و تکریم ہر کہ و مہ پیشا پیش - مراختہ و مطارحہ را ترک نمودہ بود تاہم سخن گوئی را مدار حیات خویش انگاردہ تادم واپسیں گرفتار طرۂ سخن بود - حرفہا می زد و کلام ہا می گفت - ورد آخرینش ہمیں مطلع غزل کہ گفتۂ او بود - بود :

ساز پسیج آمادہ ہے سب قافلہ کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

قریب بہ چہار صد کس حاضر جنازہ اش بودند - و بعد ازاں شنوندگاں و عقیدتمنداں جوق جوق نماز غائبانہ گزاردند - ہر صنف کلام یادگار اوست مثنوی و غزل و مدح و ذم گرمیٔ بازار اوست - پس اللہم اغفرہ ولکا بتہا -

از نوادرالکملاء نقل گرفتہ شد و زیب دیوانش نمودہ آمد

اس عبارت کے دیکھنے سے بھی اکثر ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے ہم اس وقت تک بالکل ناواقف ہیں - چنانچہ سب سے پہلی بات

جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ نوادرالکملاء تذکرے کی قسم سے کوئی کتاب
بھی جو اب کہیں نہیں - اور نہ اس کا ذکر کہیں ملتا ہے - خدا معلوم
کس نے مرتب کی اور کیونکر ناپید ہوئی —

(۲) ولادت کے سنہ کا علم - جس کے بعد اُن کی عمر کے تعین میں قیاس
کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اور سنہ ۱۱۳۵ کے آخر سے ۲۰ شعبان
سنہ ۱۲۲۵ھ تک جوڑنے سے صاف صاف نتیجہ نکل آتا ہے —

(۳) میر صاحب سترہ برس کی عمر میں دہلی آئے - اس سے تذکرۂ
بہار بےخزاں کی اُس عبارت کی بھی کچھہ تصدیق ہوجاتی ہے جو
میر صاحب کے متعلق اُنہوں نے لکھی ہے - کہ " بہ شہر خویش با
پری تمثالے کہ از عزیزانش بود " در پردۂ تعشق طبع و میل خاطر داشت -
آخر عشق او خامۂ مشک پیدا کردہ - می خواست کہ بطبع بہ چار
سوے رسوائی کشد و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید - از ننگ
افشائے راز وطن و اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں با خاطر
ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد
از خانہ بر اندازی ہائے بہ شہر لکھنؤ رسید " - ظاہر ہے کہ سولہ
سترہ برس کی عمر سے پہلے اُس قسم کے تعلقات پیدا ہونا ذرا دشوار
سا ہے - اور اس عبارت سے ان کے گھر سے نکلنے کی ایک وجہ بھی
پیدا ہوجاتی ہے —

(۴) دہلی پہنچ کر سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں کا قیام تو خیر
مسلم ہے لیکن یہ نکتہ بھی حل ہوجاتا ہے کہ میر صاحب نے دلی
میں علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کی - اور اس وقت ان علموں کی
تکمیل کے معنے یہ تھے کہ جید عالم ہوجائے - لہذا میر صاحب کی

تحصیل علمی پر روشنی پڑتی ہے اور پھر وہ صرف شاعری نہیں رہتے -

( ۵ ) سراج الدین علی خاں آرزو سے علحدگی کی تصدیق ہوتی ہے - مگر نہ اس طرح کہ آج آئے دو دن رہے اور دو دن کے بعد چل دیے - مگر نہ اس طرح جیسے کہ آزاد نے لکھا ہے - بلکہ عقلی و نقلی کی تکمیل کے بعد - اور عرصہ گزرنے پر -

( ۶ ) خان آرزو سے علحدگی کے بعد ان کا دلی میں رہنا اور بہ فراغت زندگی بسر کرنا - اس سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے اس قول کی تردید ہوتی ہے - "دربدر و حال بہ شاہجہان آباد آمد ' و تمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ میگزرانید" -

( ۷ ) میر صاحب کا لکھنؤ جانا نواب آصف الدولہ کے ایما سے تھا - جیسا کہ انہوں نے ذکر میر میں بھی لکھا ہے - اس سے آزاد کے اس قول کی تردید ہوجاتی ہے کہ وہ خود دلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے ' سرائے میں ٹھہرے ' مشاعرے میں گئے ' یہ ہوا اور وہ ہوا -

( ۸ ) میر صاحب کی شاعری دلی میں شروع ہوئی اور وہاں کی شہرت کو لکھنؤ میں چار چاند لگے -

( ۹ ) میر صاحب نے لکھنؤ میں فارغ البالی سے زندگی بسر کی اور یہیں ان کے لڑکے ' لڑکی اور بیوی کا انتقال ہوا - اور یکے بعد دیگرے تین سال میں یہ سانحے در پیش ہوئے -

( ۱۰ ) میر صاحب نے بددل ہوکر مجالس شعر و سخن کو خیرباد کہہ دیا اور گوشہ تنہائی اختیار کی - مگر پھر بھی فکر سخن جاری رہی -

( ۱۱ ) میر صاحب کا زمانہ مرض موت طویل تھا - اور وہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۲۵ھ میں بستر علالت پر گرے - چھہ ماہ بیمار رہے آخر سنبھل نہ سکے

اور شعبان میں انتقال ہوا -

(۱۲) وہ قولنج کے قدیمی مریض تھے - وجع مفاصل کی وجہ سے اعضا بیکار ہوگئے تھے --

(۱۳) اگرچہ قولنج اور وجع مفاصل ان کی موت کا سبب بنے مگر ان کا انتقال اسہال کی زیادتی کے سبب سے ہوا - جن کو طبیبوں کی رائے کی خطا تو نہیں کہہ سکتے مگر موت کا بہانہ ضرور کہہ سکتے ہیں --

(۱۴) ان کے اوصاف ذاتی و جبلی نہایت ہی جامع طور پر بیان ہوئے ہیں - (ا) وہ متوکل تھے - اس لیے کہ وہ بزرگ زادے تھے اور ایسے بزرگوں کی آغوش شفقت میں پرورش پائی تھی کہ قناعت ان کا شیوۂ خاص ہے - (ب) وہ سپاہی پیشہ تھے - اس سے بھی کوئی انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ وہ مختلف معرکوں میں شریک رہے - جس کا ثبوت ان کی کتاب ذکر میر اور ان کی بعض مثنویوں سے ملتا ہے - (ج) رقیق القلب ہونا ان کے تمام کلام سے ظاہر ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل ایک شیشہ تھا جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جانے کا احتمال رکھتا تھا - (د) پابند وضع' جہاندیدہ' سرد و گرم زمانہ چشیدہ - یہ سب باتیں اس لیے زیادہ صحیح ہیں کہ اول تو وہ زمانہ ہی وضعداروں کا تھا - دوسرے نوے برس کی عمر ان سب باتوں کی کفیل ہے - (ر) ان کی سخن سنجی کے بارے میں کچھہ لکھنا ہی بیکار ہے - جس قدر شعرا گزرے ہیں سب ان کو استاد مانتے رہے اور اب تک مانتے ہیں - (س) وہ کم اختلاط تھے - بمگر اپنے احباب کے ساتھہ سراپا ارتباط تھے - یہ بات ان

کے تذکرے سے صاف صاف ظاہر ہوتی ہے - وہ اکثر لوگوں کا بیگانہ وار ذکر کرتے ہیں - مگر اپنے دوستوں کو طرح طرح کی تعریفوں اور دعاؤں کے ساتھہ یاد کرتے ہیں - (ط) وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے تھے جب تک اُن پر کوئی حملہ نہیں کرتا تھا - چنانچہ ان کی تمام ہجویہ مثنویاں اس کی شاہد عادل ہیں - (ع) وہ آخر تک فکر سخن میں منہمک رہے - چنانچہ دیوان پنجم اور ششم ان کی آخر عمر کا نتیجۂ فکر ہیں -

(۱۵) انہوں نے آخر میں یہ غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے :

ساز پسیچ آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے

مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

(۱۶) ان کا کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے - اور وہ غزل، مثنوی اور مدح وذم کے استعاد ہیں -

(۱۷) نماز جنازہ کے نمازیوں کی تعداد - جس سے میر کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے -

اس کے بعد ہم اس غزل کی نقل بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اس دیوان چہارم میں زاید ہے اور مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے -

رنج کی اس کے جو خبر گزرے رفتہ وارفتہ اس کا مر گزرے

ایک پل بھی نہ اس کے آنسو پچھے روتے مجھہ کو پہر پہر گزرے

جوئے خوں آنکھوں سے بہے شاید خون سے میرے وہ بھی ڈر گزرے

مارے غیروں کو یا مرے عاشق کچھہ نہ کچھہ چاہیے کہ کر گزرے

راہ جاناں سے ہے گزر مشکل جان ہی سے کوئی مگر گزرے

غنچہ ہو شرم سے ان انکھوں کی گل نرگس اگر نظر گزرے

سر کا جانا ہے ہر قدم پر 'مہر'

کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

یہ دوسری غزل غیر مطبوعہ مثنوی کے آخر میں ہے - اور ہم نے اس کو اول میں نقل کرنا زیادہ بہتر سمجھا تاکہ دو غزلیں ایک ساتھ دیکھنے والے کو مل جائیں —

غزل غیر مطبوعہ دیوان چہارم جو سب سے آخر میں ہے -

یہ * کلول نہیں تلتی جی پر سے اس کے علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اُس کے

شکھا دے ہے ہجراں کا غم دلبروں کے اُٹھے پھول کانٹے ہو بستر سے اُس کے

وہ بے رحم گھر سے بھی ایک نہ نکلا گئیں نعشیں غم کشتوں کی در سے اُس کے

کبھو کھاوے گا آفتاب آفتابہ سحر دیر بڑھتا ہے اب گھر سے اس کے

کہیں مہر کے جلتے آنکھیں ہوں ٹھنڈی

کف پا ملو دیدۂ تر سے اُس کے

اس کے بعد میں اس غیر مطبوعہ مثنوی کی طرف توجہ کرتا ہوں جو اس دیوان کی مثنویوں میں آخری مثنوی ہے اور جو جنگ نامہ کے نام سے موسوم ہے —

یہ مثنوی سنہ ۱۲۰۹ ھ میں لکھی گئی - جس میں تعمیہ کے طور پر تاریخ نکالی گئی ہے —

سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال لطف کے رو سے کی ملک نے مقال

کاے سخن گستر جہاں اُستاد فتح نواب سے کر اب دل شاد

---

* یہ غزل دیوان چہارم میں کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے - ممکن ہے کہ کسی اور دیوان میں مل جائے - میں نے سب دیوانوں کی تلاش نہیں لی - 'آسی' -

لطف کے رو - (ل) کے ۳۰ عدد مصرع ختم نواب الخ کے اعداد ۱۱۷۹ میں ملادیے جائیں تو سنہ ۱۲۰۹ ھ ہوتے ہیں - غالباً یہ وہ لڑائی ہے جو آصف الدولہ کے زمانے میں سید غلام محمد خاں والی رام پور کی مسند نشینی اور سید محمد علی خاں کے قتل کے بعد واقع ہوئی - جس کے لیے نواب آصف الدولہ اوایل ماہ ربیع الاول میں الہ آباد سے روانہ ہوکر لکھنؤ آئے اور یہاں تین مقام کرکے رام پور کی جانب کوچ کیا —

اس جنگ کے وجوہات اور جو کچھہ بھی ہوں لیکن وجہ وجیہ یہ ہوئی کہ جب سنہ ۱۲۰۹ ھ میں نواب فیض اللہ خاں روہیلہ کا انتقال ہوا اور ان کے بڑے بیٹے محمد علی خاں زینت افزائے مسند حکومت ہوئے تو اسی وقت میں ان کے چھوٹے سگے بھائی غلام محمد خاں نے اقافلہ سے مل کر محمد علی خاں کا کام تمام کردیا - اور خود گدی پر بیٹھہ گیا - شدہ شدہ جب یہ خبر نواب آصف الدولہ تک پہنچی تو ان کو نہ صرف رنج ہوا بلکہ غصے کی وجہ سے انتقام کی آگ اُن کے دل میں بھڑک اُٹھی - اور اس کا سبب یہ تھا کہ محمد علی خاں دو مرتبہ آستانہ بوس وزارت ہوچکے تھے اسی لیے نواب وزیر ان کی رعایت کرتے تھے —

یہ وہ زمانہ تھا کہ مارکوئس کارنوالس بہادر ولایت جا چکے تھے اور اُن کی جگہ مسٹر جان شور گورنر کام کر رہے تھے - مسٹر جان شور کو بھی اس خون ناحق نے بے حد برافروختہ کردیا تھا - چنانچہ انھوں نے جنرل ابرکرمبی کو فوراً غلام محمد خاں کی گرفتاری کا حکم دیا - یہ اس وقت فوج کے کمانڈر انچیف تھے چنانچہ فوج انگریزی مع

آصف الدولہ بہادر کی فوج کے معہ توپ خانہ وغیرہ کے رام پور پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہو گئی —

مورخین کا بیان ہے کہ اس توپ خانہ میں عجیب و غریب نام کی توپیں تھیں جن کے بعض نام یہ ہیں - دھور دھانی' فتح پیکر' نہلگ' شیر پیکر' جم تکار' مُلک میدان' فتح بار' اجگر' خود پسند' کھنڈ دھاتی' کوک بجلی' سرجیو' گھن گرج' سنگار دل' فتح لشکر' صف شکن' وزیری' جہانگیری' حیدری' سلیمانی' پہلجیری' فتحیاب' غباری' انگریزبان' شترنال' کرنال' ہتھہ نال وغیرہ جن میں سرجیو بہت بڑی توپ تھی - سید ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہے کہ نواب مظفر جنگ بنگش رئیس فرخ آباد اور رزیڈنٹ انگریزی چیری صاحب * بھی نواب کے ساتھ تھے - چنانچہ پہلے کچھہ نواب کی فوج اور کمانڈر انچیف کی جمعیت روانہ ہوئی - اور اس کے بعد دو ایک روز کی تعویق سے نواب بھی روانہ ہوئے - چنانچہ پہلی منزل نول گنج میں دوسری الماس گنج میں تیسری سلطان گنج میں چوتھی قصبہ باون میں پانچویں سرمن نگر میں چھٹی شاہ آباد ضلع ہردوئی میں ساتویں شاہجہاں پور میں آٹھویں قریب تلہر کے ہوئی - انگریزی فوج بھی کڑی کڑی منزلیں طے کرتی ہوئی بریلی پہنچی اور لکھنؤ کی فوج کا انتظار کرنے لگی —

مؤلف عمادالسعادت کا بیان ہے کہ اس لشکر میں بے شمار آدمی تھے - اور ایسے ایسے لوگ بھی شریک تھے جنھوں نے عمر بھر لکھنؤ سے باہر قدم نہ رکھا تھا —

غلام محمد خاں کے چھوٹے بھائی سید فتح علی خاں نے جو اُن کی

* یہ مسٹر الوسن صاحب کے بعد رزیڈنٹ مقرر ہوئے تھے -

طرف سے نواب وزیر کے پاس بطور سفارت بھیجے گئے تھے اپنے بڑے بھائی
کو اطلاع کی - وہ بھی ساتھہ ہزار فوج لے کر رام پور سے نکل کھڑے ہوے -
اور پہلی منزل میلک میں ہوئی - ادھر نواب وزیر کی فوج کی صحیح
تعداد ۹۷ ہزار تھی —

نواب غلام محمد خاں نے موضع میلک میں تنخواہ میں اشرفیاں
تقسیم کیں - اور بڑی داد دھش کرکے اپنی فوج کا دل بڑھایا - مگر پھر
بھی احتیاطاً جنرل کرمبی کو لکھا کہ آپ بیچ میں پڑ کر نواب وزیر سے
صلح کرادیجئے - چونکہ آصف الدولہ کی فوج تلہر میں تھی اور بریلی
اس وقت تک نہ پہنچی تھی اس واسطے جنرل مذکور نے لکھا کہ اچھا
نواب وزیر یہاں تک پہنچ جائیں تو ایسا ہی کیا جائے گا - مگر شدنی امر
وہاں اس بات کا یہ مطلب سمجھا گیا کہ انگریزی فوج نواب وزیر
کی منتظر ہے - جب ان کی فوج بھی آجائے گی تو متفقہ حملہ ہوگا - اس
واسطے غلام محمد خاں کی فوج آگے بڑھی اور دو جوڑہ تک آپہنچی -
جنرل کرمبی کو جب یہ خبر ہوئی تو اس نے سفیر کو بلاکر کہا کہ تمہارے
نواب کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا - ہم نے جو ان سے معاہدہ کیا تھا
اب اس کو فسخ سمجھنا چاہیے - اور ان کو لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیے -
یہ کہہ کر اس کو رخصت کردیا - اس کے بعد انگریزی فوج بھی بریلی سے
آگے بڑھی اور سنگھا کے پل کے پاس قیام کیا —

اُدھر نواب غلام محمد خاں کو اب صلح کی اُمید جاتی رہی اور
وہ آگے بڑھے اور موضع بھگورے کے کھیڑے پر ان کی فوج قبضہ کرنے لگی
یہ جگہ انگریزی فوج سے دو میل کے فاصلہ پر تھی - اب فتح گنج یا فتح
گنج غربی کے نام سے مشہور ہے - ۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۲۰۹ ھ مطابق

۲۴ اکتوبر سنہ ۱۷۷۴ ع کو جنگ شروع ہوئی - اور جنرل کرمبی کے ایک کپتان مسٹر رامزی کو غلام محمد خاں کی فوج پر حملہ کا حکم ہوا - مگر کپتان سے کچھہ غلطیاں ہوئیں اور آخر کپتان رامزی کو شکست ہوئی - اور انگریزی فوج میں ابتری پھیل گئی - پھر بھی لفٹنٹ کاهن اور ریچارڈسن نے دوبارہ فوج کو درست کر کے صف بندی کی - مگر روهیلوں کے دل بڑھے ہوئے تھے وہ انگریزی فوج میں گھس آئے اور خوب خوب لڑے یہاں تک کہ پچاس انگریزی سردار اور دھائی سو گورے اور دو هزار تلنگے کام آئے - چنانچہ لاشوں کو خندق میں ڈال کر پاٹ دیا - اور بے انتہا زخمی بریلی بھیج دیے گئے -

نواب سید غلام محمد خاں ایک ٹیلے پر سے مع اپنے بھائیوں کے تماشہ دیکھہ رہے تھے انہوں نے جنرل کرمبی کی ابتری دیکھکر وقت سے پہلے فتح کے شادیانے بجوادیے - ادھر جو روهیلے انگریزی فوج میں گھس گئے تھے اُن کو کوئی مدد نہ پہنچی - ایک انگریزی افسر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور چار توپوں سے روهیلوں پر حملہ کر کے آتشباری شروع کردی - تھوڑی دیر میں ہوا بدل گئی اور ایک هزار روهیلے کام آئے ، باقی منتشر ہو کر بھاگ گئے - شدہ شدہ روهیلوں کو کامل شکست ہوئی - نتیجہ یہ ہوا کہ سید غلام محمد خاں مع اپنے بعض صاحبزادوں کے رام پور کی طرف بھاگے اور یکم ربیع الثانی کو رامپور سے اپنے اهل و عیال سمیت دامن کوہ کی طرف بھاگے اور ایک گھاٹی میں پناہ لی - بعد شکست سید غلام محمد خاں آصف الدولہ بہادر کا لشکر بھی انگریزی لشکر میں مل گیا اور یہ فتح آصف الدولہ بہادر کے نامزد ہوئی - بعد کو نواب کو معافی دی گئی اور وہ

حج بیت اللہ کو چلے گئے *—

یہ ہے اس مثنوی کی حقیقت جو آپ ملاحظہ فرما چکے ۔ اور جس کو مجمل طور پر تواریخ سے مدد لیکر لکھا گیا ہے - اب مثنوی ملاحظہ ہو —

## جنگ نامہ

اب کے نواب رام پور آیا ناگہاں اس طرف خدا لایا

آگے آتا تھا بھر سہر و شکار بازی † یکسر روہیلی ہے اسہار

گرد تھی فوج کی سپہر تلک بن گیا اور ایک تارہ فلک

جمع افغاں پسر تھے اس جاگہ لیک سارے تھے جنگ نا آگہ

یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار ہے تحمل سے رہ میں دیر گزار

یعنی تخریب ایک آن میں ہے روکشی اُن کی کسر شان میں ہے

بے تہی سے وے پیش جنگی کر دانتے ‡ دے دے گرے ہر اول پر

دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے پکے پھوڑے کے رنگ پھوٹ پڑے

جیتے تلواروں میں فرنگی سے مرے مارے بہت کڈھنگی سے

تھا تہور نہ یہ شجاعت تھی ساعت جنگ یا قیامت تھی

تھے تلنگے روہیلے محو جنگ لوتھوں § سے ہو گیا تھا عرصہ تنگ

گورے کالے جدا جدا کیا تھے دونوں ¶ مردم گیا سے یکجا تھے

---

* اس واقعہ کو اور شاعروں نے بھی نظم کیا ہے چنانچہ در منظوم فارسی بھی اسی حال میں ہے جو مولوی غلام جیلانی رفعت کی تصنیف ہے - اسی حال کو مہر صاحب نے بھی جنگ نامے کے نام سے لکھا ہے -

† یعنی اس مرتبہ سب روہیلے پن کی سی باتیں ہیں -

‡ یعنی کٹ کٹا کر گرے - § لاش -

¶ ایک گھاس کا نام جو آدمی کے مشابہ بتائی جاتی ہے

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پہ اُس جا  تھا اُنھوں کا جہاں ثبات پا

سہل سردار سمجھا یہ مرنا  اللہ اللہ ترا جگر کرنا

توپ پر آن کر چلی تلوار  جھیل کر زخم لڑ موا سردار

صاحب اک اور اُس کی جا آیا  جن نے ایسی بلا کو چلُوایا

جنگ مغلوبہ تھے گُتھے باہم  مرتے تھے دونوں اور کے رستم

صاحب انگریز کے گرے اکثر  تھک گئے لڑتے مرتے ہمدیگر

نہ کہ ک بار پہلو سے ماری  صف الٹ دی حریف کی ساری

لشکری سب سراں سمیت رہے  سبز جو کچھ ہوئے تھے کھیت رہے

لاش پر لاش گر کے ڈھیر ہوئے  بھو کے مرنے کے جی سے سیر ہوئے

پیچھے * سردار تھا پٹھانوں کا  دیکھا جانا جو اُن نے جانوں کا

خواب غفلت سے چونک اُٹھا جاگا  دست پاچہ ہوا گیا بھاگا

مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا  مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا

غارت از بسکہ لشکری لائے  لاشوں سے اشرفی روپے پائے

وہ جو بھاگا تھا معرکے سے رئیس  بھاگا یوں جیسے پیش اسپ سئیس

ہوتے جو ہیں رُہیلے ظلم شعار  لُٹتے جاتے تھے شہر راہ گزار

رام پور † میں بھی آکے رہ نہ سکا  وہ خدا گیر بات کہہ نہ سکا

بھاگا واں سے ہے لیکے کچھ اسباب  کہ لگا آیا لشکر نواب

لی پناہ اُن نے جا کے زیر کوہ  واں بھی تھا ساتھ کوہ کوہ انبوہ

تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی  وہیں نا کے پہ تھا یہ دنگل بھی

---

* اشارہ ہے نواب غلام محمد خاں کی طرف جو ٹیلے پر سے جنگ کا تماشا دیکھ رہے تھے -

† جیسا کہ عبارت نثر میں ہم نے لکھا ہے کہ بعد شکست نواب غلام محمد خاں اہل و عیال کو لیکر دامن کوہ کی طرف چلے گئے -

واں ڈھیلے ہوئے اکٹھے سب — بعد دو چار پانچ روز و شب

عجز کی راہ سے کہا پیغام — ہم ہیں نواب کے کمینے غلام

بندہ رکھتے ہیں باوجود خطا — تمسے صاحب امیدوار عطا

لطف کریے امیدواروں پر — رحم کریے گناہگاروں پر

ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر — اب نہ خدمت سے ہووینگے قاصر

کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم — موجب طوع وہ ہے دور سے حکم

کہ مجھے اپنے ہاتھ لیجاوے — پاؤں کٹنے کہ عاجز آپ آوے

ذات نواب ہے کرم سیرت — کہا صاحب کو تم بصد عزت

معرفت اپنی جاکے لاؤ اُسے — پاس خیمہ میں لا بٹھاؤ اسے

یا کہ خیمہ جدا کرو اِستاد — ہم اُسے وقت پر کریں گے یاد

لایا صاحب چنانچہ خود جاکر — پاس کرتا ہے تابندر چاکر

سر میں اُس کے خیال باطل تھا — آپ بھی وہ جوان جاہل تھا

گفتگو میں کجی لگا کرنے — ہوا موجود مارنے مرنے

چاہتا تھا کہ آپ کو مارے — بارے ہتھیار چھن گئے سارے

رفقا کے تئیں نکال دیا — رنجہ کر تھلووں کو ٹال دیا

اُٹھ گئے جو حرام زادے تھے — ہو چکے دل میں جو ارادے تھے

عاقبت اُس کو باندھ کر بھیجا — کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا

جمع تھے لوگ سو پریشاں ہیں — رہ گئے ہیں سو عجز کیشاں ہیں

جنگ نے صبح کے تئیں ہے نہ شام — آشتی کے ہیں اب پیام و سلام

غالباً صلح آج کل ہووے — ہر طرف جنگلی خلل ہووے

لیکے اب ملک و مال سب نواب — راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب

سال تاریخ کا تھا مجھکو خیال — لطف کے روسے کی ملک نے مقال

کاے سخن گستر و جہاں استاد فکر نواب سے کراب دل شاد

میر کوئی غزل کہو اب تم سنہ ۱۱۷۹

لذت شعر میں رہو خود گم ۳۰

۱۲۰۹

هر چند کہ میر صاحب کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں یہ مثنوی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی مگر چونکہ تاریخی ہے اس لیے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے —

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ محمد محسن المخاطب بہ یزالدین کون تھے - ان کے بارے میں کچھ ایسے مختلف بیان ہیں کہ سمجھنا دشوار ہوگیا ہے - بہر حال ہم سب کی رائیں اور عبارتیں لکھے دیتے ہیں اور سب سے پہلے میر صاحب ہی کا بیان قلمبند کرتے ہیں - وہ لکھتے ہیں :—

کہ محمد محسن سلمہ اللہ - محسن تخلص کرتے ہیں اور میرے برادر زادہ ہیں - نہایت ذہین اور سلیقہ مند ہیں - مجھ سے شعر ریختہ کی اصلاح لیتے ہیں - اس وقت ان کا سن بیس برس کا ہوگا - انشاءاللہ آگے چل کر عمدہ شعر کہیں گے - اس کے بعد ان کا کلام نقل کیا ہے - اور وہ اکتیس شعر ہیں —

میر حسن کا بیان ہے کہ محمد محسن ایک نوجوان ہے - سراج الدین علی خاں آرزو کے عزیزوں میں سے - وہ میر تقی میر کا برادر زادہ اور اکبرآباد کا رہنے والا ہے - شاعری میں نہایت مشتاق ہے سراج الدین علی خاں آرزو کا تربیت یافتہ - سالار جنگ بہادر کے یہاں ملازم ہے - اب شعر گوئی کا اتفاق نہیں ہوتا - اول میں جو کچھ کہا کہا اب شعر نہیں کہتا - یہ شعر ان کے قدیم کلام سے لکھے جاتے ہیں -

اس کے بعد جو شعر لکھے ہیں ان میں سے چھ سات شعر وهي هيں

جو میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں لکھے ہیں —

اب لیجیے تذکرۂ حکیم قدرت اللہ قاسم کو انہوں نے وضاحت کے ساتھ حال لکھا ہے مگر بالکل الگ - وہ کہتے ہیں کہ محمد محسن محسن ' سراج الدین علی خاں آرزو کے قریب عزیز تھے اور میر تقی میر کے بھی رشتہ دار تھے - بقدر ضرورت عربی بھی جانتے تھے - اور کتب متداولۂ فارسی پر بھی عبور تھا - نہایت سلیم الطبع اور نہایت خوش گو - خان آرزو کے انتقال کے بعد ان کے تمام مال و متاع کے بھی وارث قرار پائے - زیادہ تر فارسی کا شعر کہتے تھے مگر اردو کا بھی دیوان کہا جو اب ناپید ہے - چار شعر بڈھوں کی زبانی سنے ہیں وہی لکھتا ہوں - اس کے بعد چار شعر نقل کئے ہیں - اور لطف یہ کہ وہ چاروں شعر بھی میر کے تذکرے میں محسن کے نام سے موجود ہیں -

قائم کا بیان ہے کہ محمد محسن ایک جوان آدمی ہیں - خان آرزو کے بھانجے میاں حسن کے لڑکے - نہایت صحیح ذوق شعر اُن میں موجود ہے - کہتے رہے تو خوب کہیں گے - اس کے بعد ۲۲ شعر نقل کیے ہیں - اور یہ سب وہی ہیں جو میر صاحب نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں -

مولوی مسعود حسن صاحب ادیب لکچرار یونیورسٹی نے محسن کو کلیم کا لڑکا بتایا ہے ۔ اور غالباً یہی صحیح ہے - مغالطہ کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ کلیم میر صاحب کے بہنوئی تھے - اور وہ اُن کی نہایت تعظیم کرتے تھے - ان کو بزرگ مانتے تھے اس لحاظ سے اُن کو بھائی اور اُن کے لڑکے کو برادر زادہ لکھا ہے - اور بس -

اب تجلی کا حال سن لیجیے جن کے ہاتھ کا یہ دیوان لکھا ہوا ہے - میر صاحب نے اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں تجلی کا کوئی ذکر نہیں

کیا - مگر مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے کہ وہ ایک جوان آدمی ہیں ریختہ گوئی میں بے نظیر ہیں - میر تقی میر کے بھانجے ہیں - ایک بہت بڑا دیوان ترتیب دیا ہے - مثنوی لیلیٰ مجنوں اور اکثر مسدس اور مخمس خوب خوب کہے ہیں - بحر کامل میں ان کی اکثر غزلیں ہیں جو شاہجہاں آباد کے لوگوں کی زبان پر ہیں - اب قریب چالیس برس کے عمر ہے - فرقۂ سپاہگری میں اعزاز و امتیاز کے ساتھ عمر بسر کرتے ہیں - میرے گہرے دوست ہیں خدا سلامت رکھے - اس کے بعد کچھ کلام ہے - ان کا عرف میاں حاجی ہے —

تذکرہ قاسم میں لکھا ہے کہ وہ پہلے دہلی میں عرب سرائے میں رہتے تھے اور بعدہ لکھنؤ چلے گئے وہیں انتقال کیا - انہوں نے غلطی سے ان کا محمد محسن نام لکھا ہے - حالانکہ ان کا نام محمد حسن تھا - اور چھوٹے بھائی کا محمد محسن - باپ کا محمد حسین نام کلیم تخلص - اور انہیں میر صاحب کی صاحب زادی منسوب تھیں' جیسا کہ ان کے چھوٹے بھائی کا بیان ہے اور اس دیوان کی عبارت سے پتہ چلتا ہے -

اب ہم ان مُہروں کا ذکر کرتے ہیں جو اس دیوان پر لگی ہیں -

دیوان کے ٹائٹل پر تین مہریں ہیں -

مہر اول' بالکل پڑھی نہیں جاسکی - سرخ رنگ سے قریب ڈیڑھ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی ہے - اور اس میں کوئی شعر ہے جو پڑھا نہیں جاتا -

مہر دوم' سلیماں جاہ کے کتب خانہ کی ہے - جو قریب $1\frac{1}{4}$ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی ہے سرخ رنگ ہے اور اس میں یہ شعر ہے -

خوش است مہر کتب خانۂ سلیماں جاہ

بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ سنہ ۱۲۴۴ ھ

تیسری مہر، سلطان عالم راجد علی شاہ آخری تاج دار اودھ کے کتب خانے کی ہے جس پر یہ شعر ہے -

خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب

ثابت و پرنور بادا چوں فروغ آفتاب سنہ ۱۲۶۳ ھ

یہ بھی سرخ رنگ سے لگی ہے - ایک انچ سے زیادہ چوڑی اور دو انچ لمبی ہوگی - اوپر سے کچھہ نقش و نگار بھی ہیں -

ختم کتاب کے صفحہ پر ایک مہر زاید ہے وہ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی ہے - یہ بھی سرخ رنگ سے لگی ہے اور سب سے بڑی ہے - مہر کا شعر یہ ہے -

نامہ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب

خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

یہ دیوان پختہ مگر معمولی خط میں ہے مگر نہایت صحیح ہے —



# میر صفیر بلگرامی اور میرزا غالب

از

(جناب قاضی عبدالودود صاحب)

میرزا غالب کے دوست، شناسا اور شاگرد بہت تھے، لیکن ان میں سے کم ایسے ہیں جنھوں نے میرزا سے اپنی ملاقات اور ان کی طرز بود و ماند کا ذکر تفصیل کے ساتھ لکھا ہو - میر فرزند احمد صفیر بلگرامی میرزا کے آخری زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے، اور سنہ ۱۲۸۲ ھ میں دہلی جا کر ڈھائی مہینے میرزا کے مہمان رہے تھے - صفیر مرحوم نے اپنے تذکرے موسوم بہ جلوۂ خضر میں میرزا سے اپنی ملاقات کا حال بالتفصیل درج کیا ہے، اور شعر اردو اور زبان سے متعلق میرزا نے ان کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا انھیں بھی قلم بند کر دیا ہے - اس تذکرے کے حصۂ اول کی پہلی جلد سنہ ۱۳۰۲ ھ میں شائع ہوئی، اور دوسری سنہ ۱۳۰۷ ھ میں - میرزا کے حالات جلد اول میں صفحہ ۲۱۸ سے ۲۲۸ تک درج ہیں - میرزا کے خطوط مومن خاں کے حالات کے ذیل میں نقل کیے ہیں، جو (جلد اول ص ۲۰۵ تا ۲۴۰) - دوسری جلد میں پانچ خطوط ہیں جو میرزا نے صفیر مرحوم کو لکھے تھے - اس جلد میں اپنے حالات کے ضمن میں قیام دہلی اور میرزا کی اصلاح کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں نے حضرت غالب کی ملازمت اور شاگردی کی کیفیت جلد اول ... میں لکھہ دی ہے ' اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں - مگر اتنا لکھنا ضرور ہے کہ سنہ ۱۲۸۲ ھ میں محرم کے مہینے میں حضرت کی ملازمت کے لیے دھلی گیا ' اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھہ فائدہ اٹھایا ... اصلاح کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت شاگرد کا کلام خود اپنی چشم مبارک سے دیکھہ کر اپنے ھاتھوں سے اصلاح دیتے تھے ' چنانچہ رسالہ فیض صفیر ... حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھہ سے ملاحظہ فرمایا اور جابجا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی جو عود هندی میں چھپی ہے - اور کلام فارسی و اردو کی اصلاح بھی اکثر ہوا کی ہے" —

میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں :

(۱) میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا -

(۲) میرزا کی غذا - اس کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے —

(۳) فارسی شاعری کی مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھہ لکھا ہے ' وہ لفظ بہ لفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوے معلیٰ میں موجود ہے - حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انہیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا ' اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں - مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار —

(۴) مہر صفیر مرحوم ناسخ کے شاگرد تھے، لیکن ناسخ سے جو عقیدت انہیں تھی وہ ان سے براہ راست مستفید ہونے والوں میں بھی کسی کو نہ ہوگی۔ جب وہ ناسخ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں، تو قصیدے کا انداز آجاتا ہے۔ اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں، جو در اصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔ اب مہر صفیر مرحوم کا بیان ملاحظہ کیجیے —

سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا۔ جب مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گہر بار اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمایش تفضل حسین خاں (جنہوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا۔ اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر

ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا - جب میں نے بوستان خیال کو اردو کرکے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا ' میں نے ایک جلد بھیج دی - اس وقت سے خط و کتابت رہی ' یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے سنہ ۱۲۸۲ ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھہ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا - آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھہ کردیے - میں علی گڈھ سے دہلی روانہ ہوا - دس بجے شب کو دہلی پہنچا - شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی ' صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا - حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی کر رہے تھے ' ماموں صاحب بھی حاضر ہوے ' دیکھہ کر بشاش ہوگئے ' اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں عرض کیا صفیر - ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا - بولے ذرا ٹھہر جائیے - یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے ' اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے ' گرمی کے دن تھے ' صفر کا مہینہ تھا - حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا ' پاجامہ سپاہ بوٹے دار دریس کا ' کلی دار ' نیمہ سرخ تنزل کا ' بدن میں مرزائی ' سر کھلا ہوا ' رنگ سرخ سفید ' منہ پر داڑھی دو انگل کی ' آنکھیں بڑی ' کان بڑے ' قد لمبا ' ولایتی صورت ' پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھہ گئی تھیں ' اور بھی سبب

تھا - کان کی سماعت میں کچھہ ثقل آ چلا تھا —

الغرض اندر آکر بیٹھے ' بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں ' اتنے میں نواب ضیاءالدین خاں بھی تشریف لاے ' حضرت نے مجھے ان سے ملایا - وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے ' کرتا پہلے خلطہ دار پاجامہ ' سر پر ٹوپی ' جریب ہاتھہ میں ' بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں' اس کے بعد کچھہ ان سے سرگوشی ہوئی - جب وہ اُٹھہ گئے اور دو پہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا - ہر جگہہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے واسطے ' آخر زینے کے پاس آے - اور چھت پر چلے ہم لوگ بھی ساتھہ تھے اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ بنا ہوا تھا ' لطیفہ :- فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے ' میں نے کہا سمجھا ' یعنی گرمی کے دن میں دھلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے ' الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں ' اس لیے ضیاءالدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے ' آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے ' گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا - میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے فرمایا کچھہ ایسا دور نہیں ہے ' یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور

میرے ساتھہ کیا' اس مکان میں پہنچے' وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک برسر سڑک تھا' جس پر ایک بنگلہ خوشنما بنا ہوا اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ' اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ سجا سجایا' اس کی پشت پر محل سرا دونوں بغلوں میں کمرے' غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا' ہم سب ۲ آدمی تھے' اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے - الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوشنما پڑے تھے انہیں رفیق کے ساتھہ آئے' معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھہ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں - الغرض کھانا کھایا بہت مزے دار اور خوش گوار تھا' قورمہ' قلیہ' شیر مال' پلاؤ' زردہ' شیر برنج' متنجن' کباب' پراتھا سب کچھہ تھا' بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا' صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے' میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا' بڑی نفرت ہوگئی' اپنے ساتھہ کے آم نکال کر کھائے اس سے کہیں بہتر پائے' پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا' وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھہ کر آئی جس کا آخر مصرع مجھے یاد ہے - " کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم " - اور سب آم منگالیے - آم کا شوق حضرت کو بہت تھا' الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا' آموں کی بہت تعریف کی - قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا - صبح کو فیض صنفہر رسالہ تذکیر و تانیث کا لے کر گیا' حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور چار روز میں تمام رسالہ دیکھہ ڈالا اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھہ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھہ چھپی ہے' اور عود ہندی

میں بھی موجود ہے، ہر روز کی ملازمت سے طبیعت بہت محظوظ ہوتی رہی ہے —

ایک دن قریب دو پہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیوگے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے، ہنسکر بولے ضرور - اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کوئیں سے پانی لے آؤ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا - فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے - ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا ور مذہب کو استفسار کیا، میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا متھم، اور میری طرف اشارہ کرکے فرمایا مثّا —

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا، تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہوگیا وہ بند یہ ہیں :-

## مرثیۂ فرمودہ حضرت غالب

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیان شہ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی — اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بپا ہے — کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا — کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا — ہوگا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے — گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے.

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا 'دبیر' کا ہے' دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا' ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھہ اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ' قورمہ' قلیہ' شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہے' آج آپ میرا کھانا دیکھیے' الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا - ایک دستر خوان بچھایا گیا اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا' اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے تِوے کے - اور ایک رکابی تانبے کی خالی' پھر وہ رفیق آکر بیٹھے' انہوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے' پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربہ لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملاکر حلوے کی طرح بناکر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھہ دیا' اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور دستر خوان پر آبیٹھے - پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے' اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے' البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا - اور کھا چکے - اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے - شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلواکر کھا لیتا ہوں —

ایک دن نواب ضیاءالدین خاں نے میری دعوت کی' بہت تکلف کا کھانا کھلایا' میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کرسکتا' بہت دیر تک باتیں ہوا کیں' ایک دن مولوی صدرالدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے - ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا —

ایک دن پلکی کے ملنے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بیٹھا - وہ ملا بھی قابل دید تھا، دھلی کا ملا کیا کہنا ہے - میں نے دھلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی - جامع مسجد کو دیکھا - سبحان اللہ کیا کہنا ہے - تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوے دیکھے - خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا - بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دھلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو - کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان خمخانہ میں چھپی ہیں —

غرض دھلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اُٹھائے، آخر رمضان سنہ ۱۲۸۲ ھجری تک آرے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ھوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی، آخر سنہ ۱۲۸۶ ھجری میں انتقال فرمایا —

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے —

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھاؤ اور دھلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے - حضرت نے دیکھ کر فرمایا ہاں، اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں

بہ فرمایش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے ' اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھہ قواعد تھے ' کوئی پانچ چھہ جزو کا رسالہ تھا ' جناب ڈائرکٹر صاحب نے مؤلف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھہ کر بھیج دیجیے ' چنانچہ حضرت نے اس کا اهتمام میرے سپرد کیا تھا - مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا ' پھر خدا جانے کیا ہوا ' اسی طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا ' وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے ' الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھہ دهلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا - فرمایا ' میاں اگر مجھہ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ' ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا ' اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے ' مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے ' ہاں قواعد لکھہ نہیں گیا - قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے - ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا ' مگر یاد رہے ' اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا ' پھر ہنس کر فرمانے لگے ' اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا - میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا ' جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشوو نما ہو سکتا تھا ' مگر یاروں نے چلنے نہ دیا - اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے ' میاں ' جب ناسخ کا کلام دهلی میں پہنچا ' جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں ' اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے ' اس وقت فارسی کی شاعری دهلی میں بہت چمکی تھی ' مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال

میں تھی ، اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے ، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی - مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا - کچھہ ایسی دقت نہ ہوئی ، پھر بھی جتنے لوگوں نے ، ادھر توجہ کی ، ہر ایک کی ایک نئی طرز ہوگئی - مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا) دھلی میں آکر سب کو حیران کر دیا - اور قاعدے کے ساتھہ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا ، دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا ، یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا ، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام بر آوردہ تھے ، میں اور مومن خان اور ذوق ، ذوق نے ادھر کم رغبت کی - کیونکہ ان کو اپنے مضمون ھی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی ، زبان کی طرف کب خیال کرسکتے ھیں ، مگر مومن خان نے خیال کیا - پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے - شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے ، مگر مومن خان نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کے طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی ، ادھر میں نے بھی ، غرض ہم دونوں دھلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوے ، مگر جب بہت کچھہ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہوگئی - اور کوئی ناسخ سے نہ ملی - میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا ، اور مومن خان اپنے اسی رنگ میں رہے ، خلاصہ یہ کہ دھلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤگے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ھی زبان ہوگئی ، وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے ، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھہ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دھلی کا اور زبان

لکھنؤ کی مسلمہ ہے ' ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں —

' نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے '

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی ' بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ گھرے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے - اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے ' میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے ' عشق و عاشقی ان کی بلا جانے ' نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق ' ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے —

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں ' میں چوہرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا ' وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے ' مجھہ سے لوگوں نے کہا کچھہ شعر پڑھیے ' میں نے چند شعر پڑھے ' منجملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا --

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں

لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے ' آپس میں کہنے لگے ' بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے ' جناب پھر پڑھیے گا میں نے پھر پڑھا ' ان لوگوں نے اس شعر کو لکھہ لیا ' اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں ' اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا - جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا ' فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے - حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھہ آجائے اس کو باندھ دینا چاہیئے - کیا غریب معشوق نہیں ہوسکتا ہر ایک کا معشوق

الگ ہوتا ہے - کسی کو گورا پسند ہے ' کسی کو سانولا - ' معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت است ' کا حال ہے - یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے ' مگر یہاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے ' وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لیکر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرهم تک ایک گروہ ہے ' ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے ' پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں سعدی ' جامی و ہلالی ' یہ اشخاص متعددہ ہیں - فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا ' خیالہائے نازک اور معانیء بلند کا - اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے ' سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑگئی - اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرواز دیا ' صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں ' رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا - اور سعدی کی تحریر نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا - فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے - تو اب طرزیں تین ٹھہریں - خاقانی اس کے اقران ' ظہوری اس کے امثال ' صائب اس کے نظائر ' اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہوگیا - جس کو بظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر ' اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں ' اُن کا کیا پوچھنا - اور جو مجازی میں پورے نکلے ' وہ بھی قدم بقدم ٹھہرے اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں —

اگرچہ شاعران نغز گفتار    زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں    خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم    ورائے شاعری ' چیزے دگر ہست

وہ چیز دگر حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر –

بد نام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا – دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم – قائم اور تجھہ سے طلب بوسے کی کیونکر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں – تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کثرت، آتش کے یہاں بیش تر، یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں، میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں، فرمایا، ہاں پڑھو ––

ناسخ – یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذات خدا ہے، اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم
وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار مہربان
کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہوسکے
مر چلا ہوں اُمید واری میں
ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر

میں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے —

آتش - آئے بھی لوگ بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

سجدۂ شکر خدا یا میں کیے رکھتا ہوں
قدم یار پہ ہے سر کو جھکانا شب وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض -

---

# مقالات گارساں دتاسی

## هندوستانی زبان و ادب سنه ۱۸۷۱ع میں

(مترجمه جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
پروفیسر جامعۂ عثمانیه حیدرآباد دکن)

پچھلے سال، جو فرانس کے لیے انتہائی نامرادی کا ثابت ہوا، هندوستان برابر ترقی کے راستے پر گامزن رها - حقیقت یه هے که اس کا قدم به نسبت پیشتر کے زیاده مستعدی سے اٹھ رها هے - میں اس سال کے تبصرے میں اس ترقی کا ذکر کروں گا - میں یہاں یه دهرانا نہیں چاهتا که اردو زبان نشوونما پا رهی هے اور اس کی وسعت بڑھتی جاتی هے اور نه اس موقع پر اس جھگڑے کا تفصیلی ذکر کروں گا جو اردو اور هندی میں کچھ عرصے سے پیدا هوگیا هے - هندی وه بولی هے جو اردو سے پہلے سے موجود هے اور اب بھی اس کے ساتھ موجود هے -

سورت، کے ایک هندو عالم نے جن کا نام گنپت رام هے اور جو اپنے دوسرے اکثر هم مذهبوں کے خلاف تعصب سے پاک هیں اور محب وطن هیں، ابھی حال میں ایک خط شائع کیا هے جس میں تمام هندوستان کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت واضح کی هے اور بتایا هے که اس مقصد کے لیے هندوستانی سے زیاده موزوں اور کوئی زبان نہیں هے -

مسلمانوں کی ہندوستان کی فتوحات کے بعد اس زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش ہوگئی ہے۔ * موصوف اس خط میں لکھتے ہیں کہ دیوناگری خط جو ہندی میں استعمال ہوتا ہے فارسی رسم خط کے مقابلے میں ہندوستانی زبان کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ یہ خط سید احمد خاں کے نام ہے اور ۲۶ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کے علی گڑھ اخبار میں شائع ہوا ہے —

گنپت رام نے اپنے خط میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے خلاف جن میں ایک زبان بولی جاتی ہے ہندوستان مشترک زبان کے فوائد سے محروم ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر صوبجاتی زبانیں بولی جاتی ہیں اور کچھ عرصے سے انگریزی زبان نے ملک پر دھاوا کردیا ہے۔ لیکن اب ان مختلف صوبوں میں رسل وسائل کے سلسلے عام طور پر قایم ہوگئے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں یہ سہولت موجود نہیں تھی جب کہ ہر صوبہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا اور دہلی کا اقتدار اعلیٰ محض اخلاقی حیثیت رکھتا تھا۔ مختلف صوبوں کے ہندوستانیوں کے لیے گر وہ اردو نہیں بولتے تو آپس میں ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی بولیاں بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ حکومت کے انگریزی ملازموں کا جب ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبادلہ ہوجاتا ہے تو انہیں بالکل نئی زبان سیکھنی پڑتی ہے —

یہ بات یقینی ہے کہ ہندوستان میں اگر ایک مشترک زبان رائج ہوجائے تو اس سے ملک کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہوگی اور ملک کو

* ہندوستانی زبان کے الفاظ تمام ایشیا میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیومون دورویل نے لکھا ہے کہ تونگا تابو Tonga-Tabou ( بحر اوقیانوس میں ایک جزیرہ ) میں قومی جشنوں کو "ناچی" کہتے ہیں جو لفظ ناچ کا بگڑا ہوا ہے۔ ان موقعوں پر ناچ گانا ہوتا ہے —

ترقی حاصل ہوگی جس کے لیے بہت سے مخلص لوگ کوشاں ہیں-
گنپت رام نے اپنے خط میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہر صوبے میں اس خاص مقصد کے لیے ایک مجلس بنائی جاے اور اس خیال کو عام کرنے کے لیے کویلی مجالس بنائی جائیں۔ ہندوستانی زبان کا ایک رسالہ دیوناگری خط میں اس مقصد کی نشر و اشاعت کے لیے جاری کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ سے سارے ہندوستان میں اس زبان کو رائج کرنے کا کام لیا جاے-
پھر دوسری زبانوں کے اخبار نویسوں کو آمادہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی زبان میں اپنے اخبارات و رسائل کو شایع کریں اور سواے اس کے اور دئی زبان نہ استعمال کریں- اسی طرح ہندوستانی زبان میں کتابیں تالیف و تصنیف ہونی چاہییں- ظاہر ہے کہ یہ اصلاحی کام ایک دم سے نہیں کیا جاسکتا- آہستہ آہستہ صبر و استقلال کے ساتھہ ہندوستانی زبان سارے ملک میں پھیل سکتی ہے —

اس کے ساتھہ حکومت سے درخواست کرنی چاہیے کہ سوائے ہندوستانی زبان کے اور کسی دوسری زبان کو کالجوں اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے اور اسی زبان میں نصابی کتابیں شایع کی جائیں- بلا شبہہ حکومت خوشی سے اس تجویز کو منظور کرلے گی —

ممکن ہے اس پر لوگ آمادہ نہ ہوں کہ سارے ہندوستان میں سواے ہندوستانی کے اور کوئی زبان بولی ہی نہ جاے لیکن یقیناً اس پر سب راضی ہوجائیں گے کہ ہندوستانی کی تعلیم سارے ملک میں عام کی جائے تاکہ ہر شخص تھوڑا بہت اس زبان میں گفتگو کرسکے اور ایک مشترک رسم خط کی وجہ سے کل ملک کے پڑھے لکھے لوگوں میں باہمی تبادلہ خیالات ممکن ہوسکے —

اس ضمن میں ہندوستانی پر نظر انتخاب اس لیے پڑتی ہے کہ بہت زمانے سے یہی زبان کل ملک میں پھیلی ہوئی ہے - اب ضرورت اس کی ہے کہ اس کا استعمال اور وسیع کیا جاے اور اس کو سارے ہندوستان کی سرکاری اور ادبی زبان بنایا جاے جس طرح کہ اب بھی ایک حصۂ ملک کی وہ ادبی اور سرکاری زبان ہے - بعض لوگ یہ کام انگریزی زبان سے لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ زبان ہندوستانیوں کے لیے اس درجہ اجنبی ہے کہ وہ کبھی بھی عام زبان نہیں بن سکتی - گنپت رام اور اس کے اکثر ہم وطن بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان اسی خیال کی حمایت میں ہیں - انگریزی بہت عرصے تک ذریعۂ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی جیسا کہ سید عبداللہ اور کرنل نسولیز نے دوسرے مستند ہندوستانی لوگوں کی طرح صاف صاف کہا ہے - یہ بات مسلم ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہندوستانی بہ اعتبار اپنی نزاکت اور خوبی کے اور دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے - بابو گنپت رام نے اپنے ہم مذہبوں کی خاطر جو یہ خیال پیش کیا ہے کہ دیوناگری رسم خط کو فارسی رسم خط پر ترجیح دینی چاہیے تو میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں اس راے سے متفق نہیں ہوں - اس کے وجوہ میں پہلے بھی متعدد مرتبہ بیان کرچکا ہوں - اصطلاحات کے متعلق بھی بابو صاحب کہتے ہیں کہ اگر سہولت ہو تو عربی زبان سے انہیں مستعار لیا جاے لیکن وہ سنسکرت الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں -

ظاہر ہے کہ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ہندوستانی زبان کو وسیع کیا جاے اور بہتر بنایا جاے اور اس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں - جس طرح کہ پچھلے چالیس سال سے آجکل کے یونانی اپنی زبان

کے متعلق کر رہے ہیں - اس طرح ہندوستانی زبان کی سطح بھی بلند کی جاسکتی ہے اور دنیا کی وقیع زبانوں کے پہلو بہ پہلو یہ اپنا مرتبہ حاصل کرسکتی ہے --

یہ اعتراض کیا جارہا ہے کہ اگر ہندوستانی زبان کو کل ملک کے لیے اختیار کیا گیا تو صوبجاتی زبانوں کی طرف عام طور پر بے توجہی برتی جائےگی - لیکن ہماری راے میں اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ جو قومی فائدہ حاصل ہوگا وہ زیادہ اہم ہوگا - پھر اگر مقامی زبانوں میں کوئی تصنیف واقعی دلچسپ اور مفید ہوگی تو کوئی امر مانع نہیں کہ لوگ اسے اصلی حالت میں نہ پڑھیں * -

مسٹر جی کیرز نے، جو ایک فاضل شخص ہیں اور میرے خطبوں میں شریک رہے ہیں، مجھے اس بات کا پورا یقین دلایا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کا ہندوستان کی موجودہ زبانوں نیز مردہ زبانوں سے مقابلہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہندوستانی ہی اس کی مستحق ہے کہ اسے ہندوستان کی تاریخی زبان کہا جاسکے۔ صرف ونحو کے اعتبار سے بہ نسبت دوسری زبانوں کے وہ سنسکرت سے قریب تر ہے - پھر مختلف زمانوں میں اس کے الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا رہا ہے - ان الفاظ کے ذریعہ ہم تاریخ ہند کے مختلف عہدوں اور ان تغیرات کا جو رونما ہوے سراغ لگا سکتے ہیں - ان وجوہ سے ہندوستانی زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہندوستان کی وسیع برطانوی سلطنت کی مستقل ادبی زبان قرار دی جاے -

بمبئی کے ریورنڈ براؤن کرنے، جنھیں اپنے ان سفر ناموں کی

* علیگڑھ اخبار، مورخہ ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۱ ع -

وجہ سے شہرت حاصل ہوئی ہے جو ہندوستان اور انگلستان کے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں ' حال میں اپنے ایک خط میں میرے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مضمون کے متعلق لکھتے ہوے یوں کہا ہے :- " میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصے میں اردو زبان نہایت مفید ثابت ہوتی ہے - میں نے راس کماری سے ہمالیہ تک اور گنگا کے دہانہ سے لے کر دریاے اندس تک ہر جگہ یہ بات محسوس کی" -

انگلستان میں بھی ہندوستانی کی اہمیت کا لوگوں کو احساس ہو رہا ہے چنانچہ لندن کے یونیورسٹی کالج کی مجلس رفقا میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہندوستانی زبان کی جو چیر قائم کی گئی ہے اس پر فوراً کسی کا تقرر ہونا چاہیے - چنانچہ حال میں قاضی شہاب الدین ابراہیم کا اس خدمت پر تقرر عمل میں آیا ہے جو "ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن" کے معتمد اعزازی ہیں اور عرصہ تک کوتہ کے راجہ کے وزیر رہ چکے ہیں اور اب بھی راجہ کے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں - موصوف کو ہندوستان کی قومی زبان پر پورا عبور حاصل ہے اور ان کی قابلیت کی عام طور پر شہرت ہے * —

آج کل اس مسئلہ پر انگلستان میں سنجیدگی کے ساتھ غور ہو رہا ہے کہ لندن میں ایک ایسا کالج قائم کیا جاے جہاں خاص طور پر ہندوستانی سول سروس کے لیے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کیا جاے - یہ نیا کالج 'ہیلی بری' کے کالج کا قائم مقام ہوگا جس کے بند ہونے پر مستشرقین نے سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا تھا - اب بھی ایک کالج ایسا موجود ہے جہاں ہندوستانی سول سروس کے طلبہ کی تعلیم ہوتی ہے اور جہاں ہندوستان

* انڈین میل ' مورخہ ۱۵ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع -

کی زبانوں میں صرف ہندوستانی لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے —

پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقاء میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ سائنس پر اردو زبان میں جو بہترین رسالہ لکھے گا اسے سالانہ یونیورسٹی کی جانب سے انعام دیا جائیگا اس لیے کہ اردو نہ کہ ہندی شمالی ہند کی زبان ہے - ہندی بہ نسبت اردو کے کم استعمال کی جاتی ہے - نیز یہ کہ اردو میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوئے خیالات کی ترجمانی کرنے کی بہتر صلاحیت موجود ہے - اس میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوے خیالات اچھی طرح ادا ہوسکتے ہیں اور اگر ان خیالات کے ادا کرنے کے لیے محاورے موجود نہ ہوں تو آسانی کے ساتھہ بنائے جاسکتے ہیں - بابو نوین چند رائے نے اس خیال سے مجلس رفقاء میں اختلاف کیا اور وہی دلائل پیش کیے جو ہندی کے حامی اکثر پیش کیا کرتے ہیں اور جن کے جواب میرے خیال میں نہایت تشفی بخش طریقے پر بارہا دیے جا چکے ہیں * چونکہ بابو صاحب ہندو ہیں اس لیے انہوں نے مذہبی حیثیت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے - ہم یورپین لوگ اس قسم کے مسائل پر زیادہ بے تعصبی اور غیر جانبداری سے رائے قائم کرسکتے ہیں - جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقاء کے فیصلہ کو خوشی سے تسلیم کرنے کو تیار ہوں —

سنہ ۱۸۷۰ ع کی تعلیمات کی سرکاری رپورٹ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے قواعد کے مطابق اودھ کے تمام اضلاع کے مدارس میں طلبہ کو

---

* بابو صاحب نے اس ضمن میں ایک خاص لسانی تقسیم پیش کی ہے - وہ ہندوستانی کو اردو اور ہندی دونوں سے علحدہ ایک زبان تصور کرتے ہیں جو دونوں پر حاوی ہے - ویسے علحدہ طور پر ہندی ہندوؤں کی ہے اور اردو مسلمانوں کی -

اردو پڑھائی جاتی ہے اس لیے کہ تجربہ سے یہ پتا چلا کہ بہ نسبت ھندی ( ناگری رسم خط ) کے زیادہ مفید اور مقبول خیال کی جاتی ہے - رپورٹ نگار نے لکھا ہے کہ دیسی علماء اس بات پر متفق ھیں کہ اردو زبان کے طرز نگارش اور انشاء میں اس وقت تک لطف پیدا نہیں ھوسکتا جب تک کہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں —

صوبۂ متوسط میں جہاں قدیم قبائل کثرت سے آباد ھیں ھندی بہ مقابلہ اردو کے زیادہ استعمال کی جاتی ہے - اس صوبے کی عدالتوں میں بھی ھندی استعمال ھوتی ہے اور مدارس میں اردو کے ساتھ ساتھ ھندی کی تعلیم کا انتظام ہے - یہاں بہ نسبت ھندی کے اردو کم طالب علم پڑھتے ھیں * —

مستشرقین کے لیے مشرقی زبانوں کو جب لاطینی رسم خط میں لکھا جائے تو اکثر مغالطہ ھوجاتا ہے اس لیے کہ لاطینی رسم خط میں ایک ھی لفظ کو مختلف اشخاص مختلف طریقوں پر لکھتے ھیں - چنانچہ حکومت ھند نے بھی یہ دشواری محسوس کی اور جیسا کہ میں پہلے بتلا چکا ھوں یہ فیصلہ ھوا ہے کہ لاطینی رسم خط میں سرکاری طور پر جو اعلام لکھے جائیں ان میں یکسانیت ھونی چاھیے - اور اسی طرح انگریزی الفاظ یا اعلام جب اردو میں لکھے جائیں تو ان میں یکسانیت ھونی چاھیے - یہ نہیں کہ جس کا جس طرح جی چاھے لکھے - پنجاب کے ناظم تعلیمات مسٹر 'ھالرائڈ نے' اس مقصد کے حصول کے لیے قواعد وضع کیے ھیں جن میں انگریزی تلفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو تحریر سے مختلف

---

* ھندی پڑھنے والوں کی تعداد ۷۴ ھزار ہے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد ۳ ھزار ہے ( رپورٹ تعلیمات صوبۂ متوسط بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع - سنہ ۱۸۷۰ ء ص ۱۳ ) -

ہوتا ہے * —

ہندوستان کے تین کروڑ مسلمان اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اور ہندوؤں کی مخالفت کا اچھی طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بات یاد ہے کہ انہوں نے ہندستان پر چھہ صدی تک حکومت کی ہے اور اس لیے انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ انگریزوں سے جنھوں نے ان کی جگہ لی ہے، انصاف کی توقع رکھیں۔ اس لیے اور بھی وہ انگریزوں سے لحاظ کی توقع رکھتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مسلمانوں کو اس کا اعتراف ہے کہ انگریزی حکومت ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتی لیکن بقول کرنل 'نسولیز' قدیم صدر کلیہ اسلامی کلکتہ' مسلمانوں کو اس بات کا ملال ضرور ہے کہ حکومت کے بعض قوانین سے انہیں نقصان پہنچا ہے جنھیں وہ خلاف انصاف تصور کرتے ہیں۔ مثلاً ان جاگیروں کی ضبطی جو مغل شہنشاہوں سے نسلاً بعد نسلٍ انہیں منتقل ہوئی تھیں' ان مسلمانوں کے وارث کے حق کو تسلیم کرنا جنھوں نے مذہب بدل دیا ہو' قاضیوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کرنا' وقف کو مذہبی اغراض کے علاوہ دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کی اجازت اور مسلمانوں کے بجائے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کا مامور ہونا جس کی وجہ سے وہ انگریزی تعلیم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر سرکاری عہدوں کی توقع ان میں باقی رہتی تو وہ خود بخود تعلیم کی طرف رغبت کرتے۔ مسلمانوں کی ان شکایت کو بقول کرنل 'نسولیز' دور کیا جاسکتا ہے۔ کرنل موصوف نے

---

* ملاحظہ ہو:—
"A Scheme for writing English words in the Persian character"
مطبوعہ لاہور' سنہ ۱۸۷۱ م —

ان مسائل کے متعلق جو بحث کی ہے وہ ہندی مسلمانوں کے حامیوں کو ضرور پڑھنی چاہیے * بعض سربر آوردہ مسلمانوں نے اپنی متذکرہ بالا شکایات "ہندوستان میں معاشری ترقی کی امداد کی انجمن" کے ایک جلسے میں، جو گزشتہ نومبر 'لندن' میں منعقد ہوا تھا پیش کی ہیں † —

مذہب اسلام تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں آپ کو مساجد نظر آئیں گی - آج بھی مسیحی مذہب کے مقابلے میں اسلام کی ترقی ہندوستان میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے - چین اور افریقہ میں جن شیر خوار بچوں کو ان کے ظالم والدین لاوارث چھوڑ دیتے ہیں انہیں دریا دل مسلمان مبلغ اپنے مذہب کے آغوش میں پناہ دیتے ہیں - ان بے کس شیر خوار بچوں کی جان بچانے کے لیے اسلامی مبلغوں کی دیکھا دیکھی مسیحی مبلغین نے بھی انتظام کیا ہے - نانسی کے لاٹ پادری 'فوربین جانسون' کی خاص توجہ کے باعث اب مسیحی مبلغین کا کام بہت بڑھ گیا ہے - یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ شمالی چین میں مسلمانوں نے چین کی شہنشاہی سے آزاد خود مختار ریاستیں قایم کرلی ہیں -

ملاکا، جاوا، بورنیو اور اس مجمع الجزائر کے دوسرے ٹاپوؤں میں اسلام کو خوب فروغ ہورہا ہے - ان جزائر میں ہندوؤں کے قدیم مندر بھی نظر آتے ہیں لیکن وہ سب عرصے سے نہایت شکستہ حالت میں ہیں - ان مندروں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندوں نے بت پرستی ترک کردی ہے جو ان کے باپ دادا کا مذہب تھا اور وہ

---

* ٹائمز مورخہ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

† Allens Indian Mail مورخہ ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

س حقیقی خدا کی پرستش کرنے لگے ھیں جس کی انجیل مقدس اور وریت میں تعلیم دی گئی ہے - اس میں مضائقہ نہیں کہ وہ مسلمان ہوگئے ھیں نہ کہ عیسائی اس واسطے کہ قرآن بجائے خود انجیل مقدس اور توریت کی تعلیم کو اپنے مخصوص افسانوی رنگ میں پیش کرتا ہے —

یہ سچ ہے کہ اکثر مسلمان اپنے مذہب کی حقانیت پر ایمان رکھتے ھیں اور اپنے مذھبی احکام کی پوری پیروی کرتے ھیں - یہی وجہ ہے کہ وہ تبلیغ کا کام اچھا کرسکتے ھیں - بہت سے ایسے ممتاز مسلمانوں کے حالات ہم تک پہنچتے ھیں جن کی نیکی اور فیاضی میں مسیحیت کی جھلک نظر آتی ہے - بہادر لیکن بد قسمت ٹیپو سلطان کی اولاد میں ایک آخری شخص باقی رہ گئے ھیں وہ اسی قسم کے لوگوں میں ھیں- ان کا نام غلام محمد ہے - اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہے - گزشتہ فروری کی ۱۷ تاریخ کو لارڈ میئو وائسرائے ھند نے انھیں کے - سی - ایس - آئی کا خطاب عطا کیا - شہزادہ غلام محمد نے شجاعت کی بجائے فیاضی اور سخاوت سے نام پیدا کیا ہے - دراصل دانشمند لوگوں کے نزدیک یہ صورت زیادہ قابل ترجیح ہے* - اس قسم کے مسلمان جو عیسائیوں کی طرح نیک زندگی بسر کرتے ھیں قابل احترام ھیں - ویلز کے مشہور واعظ جے ' رابرٹ سن ' نے یوحنا باب ۱ - سطر ۹ کی عبارت کی جو تشریح اپنے وعظ میں کی ہے وہ ایسے لوگوں پر صادق آتی ہے - وہ عبارت یہ ہے : "وہ حقیقی روشنی ہے جو ہر شخص کے دل کو روشن کرتی ہے جو دنیا میں آتا ہے" -

---

* شہزادہ غلام محمد نے کلکتہ کے غرباء کے لیے ایک لاکھ ۲۵ هزار روپے کی رقم وقف کردی تھی - بعد میں اس میں ایک لاکھ کا اور اضافہ کیا گیا - موصوف نے غریب عیسائیوں کی امداد کے لیے بھی ایک لاکھ کی رقم وقف کی ہے - (انڈین میل - ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۷۱ اور ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع) —

جے رابرٹ سن اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں :- "اگر کوئی شخص اپنے دل میں پاکیزہ خیال کو جگہہ دیتا ہے یا نیکی اور شرافت کو اپنے عمل میں سموتا ہے تو ہمیں زیبا نہیں کہ ان اوصاف سے چشم پوشی کریں اور انہیں ظاہر داری پر محمول کریں بلکہ ہمیں چاہیے کہ جس شخص سے جیسے اعمال صادر ہوں انہیں ان کی فطری حالت میں دیکھیں- ہمیں یہ دیکھہ کر خوش ہونا چاہیے کہ بعض اوقات نہایت تاریک گوشوں میں بھی اس روشنی کی جھلک ہمیں نظر آجاتی ہے جو سر چشمۂ عدل کا آفتاب ہے" —

'ڈبلو براؤن کیرلے' جن کی نسبت میں ابھی ذکر کرچکا ہوں' بمبئی کے ایک اخبار "اوورلینڈ اسٹار آف انڈیا" ( Overland star of India ) مورخہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع اپنے بیجاپور کے سفر کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو قابل ذکر ہے - بیجاپور دکن میں عادل شاہیوں کا دارالسلطنت رہ چکا ہے - موصوف بیان کرتے ہیں کہ انہیں اس سفر میں معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی خدا کے نام کی کس قدر عزت کرتا ہے - موصوف نے اتفاق سے جب کہ وہ اس شہر کے آثار دیکھنے گئے ایک پرانی توپ پر اپنا پاؤں رکھہ دیا - اتفاق سے انہوں نے جہاں پاؤں رکھا تھا اس کے نیچے لفظ "اللہ" نہایت خوبصورت ایرانی خط میں کندہ تھا - موصوف توپ پر اس لیے دونوں پیر رکھہ کر کھڑے ہوے تھے تاکہ قرب و جوار کا منظر اچھی طرح دیکھہ سکیں - ان کے ساتھہ جو شخص قدیم آثار کے متعلق وضاحت کر رہا تھا وہ مسلمان تھا - اس نے فوراً صاحب موصوف کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ ان کے پیر کے نیچے "اللہ" کا نام کندہ ہے جس کی بے حرمتی ہو رہی ہے - جب صاحب موصوف نے اپنے پیر وہاں

سے ہٹالیے تو اس شخص نے نہایت خوش اعتقادی اور احترام کے جذبات کے ساتھ اس جگہہ کو اچھی طرح صاف کیا —

اگرچہ میں مسلمانوں کا طرفدار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب درحقیقت مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیسا کہ مون پلیئے ( Montpellier ) کے مشہور سوال و جواب میں مذکور ہے - مجھے یہ دیکھکر سخت ملال ہوتا ہے کہ بعض عیسائی لوگ اسلام قبول کرلیتے ہیں اور حقیقت کو چھوڑ کر گمراہی میں پڑجاتے ہیں - انہیں شرم آنی چاہیے کہ وہ ایسا کرتے ہیں- ایک انگریز رابرٹ گرین نے جو برمنگھم کا باشندہ ہے اور اس کا باپ سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں باغیوں کے ہاتھہ سے مارا گیا تھا' اس سال کے شروع میں بمبئی میں دین اسلام قبول کرلیا - اسلامی روایات کے مطابق اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا اور اب اپنا نام عبداللہ رکھا ہے- * ایک نہایت معزز نوجوان انگریز خاتون مس 'ڈونلی' نے حال ہی میں لکھنؤ میں اسلام قبول کرلیا اور ایک اور انگریز خاتون مس 'چارلوٹ ہل' بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئی ہیں اور اب وہ مسز غلام قادر ہیں- † مجھے یہ پوری توقع ہے کہ مسلمان لوگ سورۂ فاتحہ میں جو دعا مانگتے ہیں "اهدنا الصراط المستقیم" وہ بارگاہ رب العزت میں ضرور قبول ہوگی اور یہ پوری جماعت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے ہمارے رہبر صادق حضرت مسیح ابن مریم کی ہدایت قبول کرے گی ‡

* انڈین میل ' مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

† انڈین میل ' مورخہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

‡ گارساں دتاسی کٹر عیسائی تھا - اس لیے تعجب نہیں کہ اس قسم کی توقعات نے اس کے دل و دماغ میں راہ پائی - ( مترجم ) -

قسطنطنیہ کے سلطان کو سنّی مسلمان اپنا خلیفہ مانتے ہیں ' نہ صرف روحانی اعتبار سے بلکہ دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی - چنانچہ 'تونس' کے حاکم صادق پاشا نے خلیفۃ المسلمین کے اقتدار کو کھلم کھلا تسلیم کیا ہے- خلیفۃ المسلمین نے صادق پاشا کے بھتیجے کو ان کا جانشین قرار دے دیا ہے - خلیفۃ المسلمین کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ نہ صرف عالم اسلامی کے روحانی پیشوا بلکہ دنیاوی مقتدر بھی تسلیم کیے جائیں - لیکن مصر والے خلیفہ کے اقتدار کو دل سے نہیں مانتے - سلطان قسطنطنیہ کے خلاف حال میں وہابیوں نے جو شورش اٹھائی تھی اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی - سلطان نے ان کے خلاف جنگ کی اور انہیں زیر کر لیا - وہابیوں کے متعلق یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ وہ مذہب اسلام کو آلائشوں سے پاک اصلی شکل میں رائج کرنا چاہتے ہیں- انہیں ہم پروٹسٹنٹوں یا پیوریٹنوں سے مشابہ کہہ سکتے ہیں- خوش عقیدہ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی آزاد خیالی کی طرف مائل ہیں وہ وہابیت کا کچھ نہ کچھ رجحان ضرور رکھتے ہیں- یا کم از کم وہابیوں کو برا نہیں سمجھتے - مثال کے طور پر میں سید احمد خاں کا نام پیش کرسکتا ہوں جن کا اتفاق سے وہی نام ہے جو ہندی وہابیت کے بانی کا تھا * —

ہندوستان کی انگریزی حکومت کی نظر میں وہابی باغی تصور کیے جاتے ہیں - لیکن ایسا سمجھنا بڑی غلطی ہے - وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض اشخاص نے جو اپنے کو وہابی کہتے تھے حکومت ہند کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ مکّہ

---

* ملاحظہ ہو میری کتاب " ہندوستانی ادب کی تاریخ " جلد ۳ - صفحہ ۳۲ (اس باب میں سید احمد خاں کا ذکر ہے) —

کے علماء سے حاصل کیا * - لیکن جہاد تو اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کہ اسلام کی عظمت اس سے قایم ہوتی ہو اور کامیابی کی توقع ہو - سید احمد خاں نے کلکتہ کی "اسلامی انجمن" کی رائے کے مطابق اس فتوے کی اصلیت کے متعلق "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع میں نہایت مدلل بحث کی ہے - یہ مضمون بطور ایک خط کے شائع ہوا ہے - موصوف کا خیال ہے کہ اسلامی مملکت کسی دوسری مملکت کے خلاف اس وقت جہاد کر سکتی ہے جب کہ اس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو اور وہاں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے جاننے والے آباد ہوں - یا جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب کہ کسی غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہوں اور وہ اپنے مذہبی احکام کی پیروی نہ کر سکتے ہوں - اگر اس غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں کو اس کا یقین ہو کہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو کامیابی یقینی ہے ' ایسی حالت میں جہاد جائز ہوگا - ان کی بغاوت ہی در اصل جہاد تصور ہوگی - لیکن مسلمانان ہند کے حالات بالکل دوسرے ہیں - باوجود مکی علما کے فتوے کے ان پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کریں اس لیے کہ حکومت ان کے مذہبی معاملات میں مطلق کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتی اور اس باب میں انہیں پوری آزادی دے رکھی ہے - فی الحقیقت ہندوستان کو ہمیں بجائے دارالحرب کے دارالسلام کہنا چاہیے —

---

* ملاحظہ ہو میری کتاب " ہندوستانی ادب کی تاریخ " دوسرا ایڈیشن - ص ۳۸۴ - مسٹر ہنٹر نے اپنے رسالے " مسلمانان ہند " میں اس فتوے کو نقل کیا ہے - یہ رسالہ مسلمانوں کے خلاف لکھا گیا ہے جس کا جواب سید احمد خاں نے " علی گڑھ اخبار " مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر میں دیا ہے —

وھابیوں کا اصل مقصد موجودہ مسلمانوں کے عقائد اور رسوم میں اصلاح کرنا ھے - جہاد کے متعلق ان کے بھی وھی عقائد ھیں جو دوسرے مسلمانوں کے ھیں سید احمد خاں نے اصول جہاد کی نسبت جو مثالیں پیش کی ھیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ھے - سید صاحب نے اپنے دلائل سے ثابت کردیا ھے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم میں سوائے ایک کے اور دوسرے وھابیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا - نیز یہ کہ وھابی اصول کسی طرح بھی حکومت وقت کے خلاف نہیں ھیں - سید صاحب نے وھابیوں کی جو حمایت کی ھے اس سے کٹر مسلمانوں اور حکومت دونوں کو ناخوش کرنے کا اندیشہ ھے - لیکن معتدل خیال لوگوں کو دشواری ھمیشہ پیش آیا کرتی ھے اور انتہا پسندوں کا انھیں نشانۂ ملامت بننا پڑتا ھے - سید صاحب نے اس باب میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ھے وہ عین دانشمندی اور معقولیت پر مبنی ھے —

سنہ ۱۸۷۰ ع میں امبالہ اور سرھند کے قریب اور بالخصوص سیستان کی نوآبادی میں جسے مشہور مصلح سید احمد نے آباد کیا تھا انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ مشتعل ہوگئی - یہ شورش وھابیوں کی طرف منسوب کی جاتی ھے جنھیں ایک ملا نے جو جہاد کی تلقین کرتا پھرتا تھا آمادۂ بغاوت کردیا - یہ بھی مشہور کردیا گیا کہ وھابی لوگ انگریزی حکومت کا خاتمہ کرکے مغلیہ سلطنت کو پھر سے قایم کرنا چاھتے ھیں - اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض لوگوں نے مساجد اور مدارس میں اپنے وعظوں کے ذریعہ مسلمانوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنے کی پوری کوشش کی لیکن حکومت کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں - اس کے مخالفوں کے وسائل بہت محدود ھیں اور وہ اس کو کوئی شدید

نقصان نہیں پہنچا سکیں گے - اس قسم کی تحریکوں کو سنہ ۱۸۵۷ع کی سپاہیوں کی بغاوت کے مماثل نہیں سمجھنا چاہیے - بقول 'سعدی':

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

سنہ ۱۸۷۱ع میں ہندوستانی زبان کی متعدد کتب شائع ہوئی ہیں - پنجاب میں سرکاری طور پر ہندی اور اردو کی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوا کرتی ہے اس سے مجھے ان کتابوں کا حال معلوم ہوا - کپتان ہولرائڈ کی مہربانی اور توجہ کی بدولت مجھے یہ فہرست دیکھنے کو ملجاتی ہے - موصوف اہل ہند کی تعلیم کے لیے عرصے سے کوشاں ہیں - میں پہلے ہندی کتابوں کے متعلق ذکر کرتا ہوں —

رجلدر کی دان لیلا - یہ نظموں کا مجموعہ ہے - سداما اور پرمانند کی نظموں کے مجموعے کا بھی یہی نام ہے —

موہن کی سہنا لیلا - یہ بھی نظموں کا مجموعہ ہے - کمار داس اور سداما کی نظموں کے مجموعے کے بھی یہی نام ہیں —

سمجھوڑ کی رکمنی منگل - بشن داس کی تصنیف کا بھی یہی نام ہے جسکی نسبت میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے (جلد ۳ - ص ۵۲) —

چرن داس کی نوس کیتو - اس میں نوس کیتو کے قصے کو نظم کیا گیا ہے جو گرد پران سے ماخوذ ہے - یہ کتاب دہلی میں چھپی ہے —

سیوا پشن بن جلی - یہ اشعار کا انتخاب ہے جو بابو کالی چرن نے سیوا کے متعلق جمع کیا ہے - بابو صاحب نے ہندی میں اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کی ہیں —

سونے لوہے کا جھگڑا - اس میں سونے اور لوہے کی بحث کا حال ہے -

یہ کتاب دہلی میں سنہ ۱۸۷۰ع میں چھپی ہے —

اس ضمن میں میں ' نچیکن باگ '' کا ذکر کردوں جو پستن جی بھرائیچ والا کی تصنیف ہے اور بمبئی میں سنہ ۱۸۷۰ع میں چھپی ہے - یہ کتاب گجراتی رسم خط میں ہے اور ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے دوسری کتاب " راجہ گوپی چند اکھیان " ہے جو رستم ایرانی کی لکھی ہوئی ہے - یہ بھی بمبئی میں چھپی ہے اور گجراتی رسم خط میں ہے اور ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے * - اس کتاب میں اجین کے ایک راجہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری اختیار کرلی تھی - اس مضمون کو اور دوسرے مصنفوں نے بھی بیان کیا ہے - چے دت نے ہندی میں ( دیکھو میری کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " - جلد ص ۹۹ ) اور امیر پرشاد نے اردو میں اسی مضمون پر کتابیں لکھی ہیں۔ آخرالذکر کی کتاب دہلی میں چھپی ہے —

یجُروید کے ہندی ترجمے کا اعلان کیا گیا ہے - ترجمے کا نام " ویدارتھا پرادیپ " رکھا گیا ہے - اس کا پہلا حصہ علیگڑھ میں چھپا ہے جس کو ' بوسم ' کے راجہ گوری پرشاد سنگھہ نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کیا ہے - اس کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اتھروید کا اصل متن شائع کیا جائیگا اور بین السطور اردو ترجمہ ہوگا † - اسکا ایک نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے لیکن مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں —

---

* جس طرح پانڈی چری میں ہندوستانی کو تامل کے رسم خط میں اور بنگال میں بنگالی کے رسم خط میں لکھتے ہیں اسی طرح بمبئی پریسی ڈنسی میں اکثر ارقات ہندستانی گجراتی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور سندھ میں سندھی رسم خط میں —

† اخبار عالم - مورخہ ۲۳ فروری سنہ ۱۸۷۱ م —

بنارس کے ریورنڈ ڈبلو ایتھرنگٹن نے اہل ہند کے لیے ہندی زبان کی صرف و نحو پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت میں گزشتہ سال ذکر کرچکا ہوں - موصوف نے اسی مضمون پر ہندی میں ایک اور کتاب " بھاشا بھاسکر " کے نام سے لکھی ہے - صوبہ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات نے اس کتاب کی قدر افزائی کی ہے اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں شامل کرلیا ہے - اس مسیحی مبلغ کے لیے یہ بات موجب فخر ہونی چاہیے کہ وہ اہل ہند کے لیے سلیس ہندی زبان میں یہ کتاب لکھنے کے قابل ہوا - ہندی کی صرف و نحو پر ایک اور کتاب حال میں شائع ہوئی ہے جسکی مشہور مستشرق مسٹر فٹز ایڈورڈ ہال نے بہت تعریف کی ہے - اس کتاب کا نام " بھاشا تتوا بودھنی " ہے - سیتل پرشاد گپت کی ہندی صرف و نحو کی کتاب " شبد پرکاش " بھی قابل ذکر ہے —

ہندی زبان کے مشہور مصنف بابو ہری چندر نے جو " کاوی بچن سدھا " کے ایڈیٹر ہیں ، سنہ ۱۸۷۰ ع - سنہ ۱۸۷۱ ع میں بنارس میں بھارت چندر کے بنگالی ناٹک کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے - اس کا نام " ودیا سندر ناٹک " ہے - مجھے توقع ہے کہ ہندی کے " شکنتلا ناٹک " کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اسے بھی نصیب ہوگی - " شکنتلا ناٹک " کے قلیل عرصے میں متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں - میں اس کا پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ بابو صاحب کا ارادہ ہے کہ سنسکرت زبان کے مشہور ناٹکوں کا ہندی میں ترجمہ شائع کریں - بابو ہری چندر کی دوسری کتاب " اگروالا کی اُت پتی " کے شائع ہونے کا بھی اعلان کیا گیا ہے - یہ کتاب ہندی میں ویش ذات کے متعلق ہے - کہا جاتا ہے کہ " اگروالا " کے نام کی بنا شہر " اگروہا " سے پڑی ہے جو دہلی کے مغرب میں واقع ہے - لیکن میرے

خیال میں اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ اس ذات کے لوگ پہلے آگرہ سے آے تھے - بابو ہری چندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس مصنف کو ۸۰۰ روپیے بطور انعام پیش کریں گے جو فرانس و جرمنی کی گزشتہ جنگ کی تاریخ هندی زبان میں سب سے اچھی لکھے گا —

نواب محمد مردان علی خان نواب چھتر پور نے ایک جنتری شائع کی ہے جو ایک سو ایک سال تک مفید ہوسکتی ہے - اس کا ایک نسخہ نواب صاحب نے علیگڑھ کی مجلس ادبی کو نذر کیا ہے * —

اردو کتابوں میں سب سے پہلے "کلیات ظفر" قابل ذکر ہے - یہ دہلی کے آخری تاجدار بہادرشاہ ثانی المتخلص بہ ظفر کے کلام کا مجموعہ ہے - اس بادشاہ کو اپنے تخت و تاج سے سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد ہاتھہ دھونا پڑا - اس بد قسمت بادشاہ کا حال میں نے اپنی کتاب " ادب هندی و هندوستانی کی تاریخ " میں مفصل بیان کیا ہے (جلد ۳ - ص ۳۱۷ وغیرہ) مولوی غلام رسول نے قصۂ بلال نظم کیا ہے - اس نظم کی زبان پنجابی ہے اور وہ لاہور میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں طبع ہوئی ہے - دیوی دیال نے لیلی مجنوں اور سسی پنوں کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے - مولوی خلیل علی نے " داستان امیر حمزہ " کا فارسی سے اردو میں ایک نیا ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ ۵۲۱ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک جلد میں ہے - یہ کتاب فارسی میں اکبر بادشاہ کے حکم سے تالیف کی گئی تھی - اس کے لکھتے وقت مولف کے پیش نظر مہابھارت کا مضمون تھا - اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکبر کے زمانے میں سنسکرت سے فارسی میں جو تراجم کیے گئے تھے وہ هندی اصل پر

---

* علیگڑھ اخبار - مورخہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ء -

ملتی دیے * —

مرزا اعظم بیگ نے " تاریخ گجرات " لکھی ہے جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - یہ کتاب لاہور میں چھپی ہے - پنڈت کاشی ناتھ نے اپنی تصنیف " کتاب اخلاص کاشی " کا نام اپنے نام پر رکھا ہے - اس کتاب میں کہانیوں کے طور پر مفید باتیں بیان کی گئی ہیں - علیگڑھ اخبار میں اسکے متعلق متعدد بار ذکر نکل چکا ہے - اس کتاب کی اشاعت میں حکومت نے بھی مدد دی ہے اور مدارس کے لیے اسکے ایک ہزار نسخے خرید ے ہیں -

" تہذیب القلوب " اخلاق پر ایک کتاب ہے اور سنہ ۱۸۷۰ع میں دہلی میں چھپی ہے - یہ فارسی کتاب " مفرح القلوب " مصنفۂ محمد ارزانی کا ترجمہ ہے اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - فارسی میں سنسکرت کی کتاب " ہتو پدیشا " سے ترجمہ کیا گیا تھا - اردو ترجمہ ۴۷۶ صفحات پر مشتمل ہے † —

" تحفۃ الاحبا فی تحریم النساء " مولوی قطب الدین دہلوی کی تصنیف ہے اور ۱۸۹۱ ع میں لکھنؤ میں چھپی ہے - اسی مصنف کی دوسری کتاب " تحفۃ الزوجین " دہلی میں دوسری مرتبہ طبع ہوئی ہے - اس کتاب میں زن و شوہر کے حقوق و فرائض پر بحث کی گئی ہے - مولوی قطب الدین دہلوی نے حال میں ایک کتاب ان مسلمانوں کے لیے لکھی ہے جو مذہب کے پابند نہیں ہیں - اس کتاب کا نام " رسالۂ بے نمازاں " ہے —

" اعتراض قرآن " میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے - شورش عظیم سے قبل رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے —

" سراج القاری " میں قرآن کے لب و لہجہ اور تلفظ کے متعلق بحث کی گئی ہے - اس کتاب کی نسبت میں نے اپنی تصنیف " ادب ہندی

* H. Blochman, Proceedings of the Asiatic Society Bengal, 1871, P. 142.

† دیکھو میری کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " جلد ۱ - ص ۶۰۹ -

و ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے - اس کتاب کی زبان پنجابی ہے - لیکن فارسی رسم خط میں ہے اور لاہور میں طبع ہوئی ہے —

"کلمات الحق" - یہ نصرت علی کی اردو نظم ہے اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں دہلی میں چھپی ہے - اس میں مشہور صوفی منصور کے سولی پر چڑھنے کا حال بیان کیا گیا ہے - یہ بات قابل ذکر ہے کہ منصور کے حالات زندگی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات سے مشابہ بتلایا گیا ہے —

"راہ نجات" - اس کتاب کے مصنف کا نام غلام حسین ہے نہ کہ محمد علی جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے (جلد ۲ - ص ۳۵۵) —

"گوہر شب تاب" پنڈت بانکے بہاری لال نے بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ کتاب سنہ ۱۸۹۹ ع میں لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے - اس ترجمہ کو دیکھتے ہوے میں ڈاکٹر لیٹز کی اس راے سے بالکل متفق ہوں کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کا لفظ بہ لفظ ہندوستانی میں ترجمہ کرنے کے بجاے ان کے مطالب کو سلیس زبان میں ادا کرنا چاہیے - اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگ ان تصانیف کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور ترجمہ کرنے والوں کو بھی سہولت ہوگی - انگریزی سے اردو میں اچھا ترجمہ کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ ایسی تو نہیں ہیں کہ ان پر قابو نہ پایا جاسکے جیسا کہ مولوی عظمت اللہ مظفر پوری نے "رسالۂ جلسۂ تہذیب" کی دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کی اشاعت میں بوضاحت بیان کیا ہے - لیکن نظم کا معاملہ دوسرا ہے - نظم ہمیشہ مبہم اور غیر واضح ہوا کرتی ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے بوستان میں کہا ہے :—

شیخ سعدی کے اس قول کے ضمن میں میں یہاں اس طرف اشارہ کردوں جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "مشرقی ادب پر ایک نظر میں" لکھا تھا کہ ایشیائی شاعر مظاہر فطرت کو ذہنی اور تمدنی اشیا سے اکثر تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کا ایک مسلمان شاعر اپنے معشوق کے ہونٹوں کے رنگ کو گلاب کے رنگ کے مثل بتاتا ہے تو ہندو شاعر دریائے گنگا کی موجوں کو سبز مخمل پر جو گوٹ لگائی جاتی ہے اس سے تشبیہ دیتا ہے اور موجوں کی آواز کو ان برہمنوں کی گنگناہٹ سے مشابہ قرار دیتا ہے جو گنگا کے کنارہ وید کی مناجاتیں پڑھا کرتے ہیں۔

منشی نظام الدین نے ناصرالدین محمد بن الاحسان طوسی کی کتاب "اخلاق ناصری" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ لاہور سے شائع ہوا ہے اور ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام مصنف کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ کہستان کے شہزادہ کے نام پر رکھا گیا ہے جو مصنف کا ہمنام تھا اور اسی کے نام کتاب معنون کی گئی ہے۔ میں منشی نظام الدین کی دوسری تصانیف کے متعلق اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کر چکا ہوں —

علی گڑھ کی اکاڈمی سائنس اور ادب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہی ہے - اس کا رسالہ اور دوسری مطبوعات اور مباحثے نہایت مفید ہوتے ہیں۔ اکاڈمی کی طرف سے اردو میں لاہور کے ریورنڈ ڈبلو' ولکن سن' نے جو جغرافیہ لکھا تھا اس کی طباعت کا کام ختم ہوگیا۔ اس کا نام "مرآت غریب" رکھا گیا ہے - کتاب دو حصوں میں منقسم ہے -

لاہور کے پروفیسر جی ڈبلو لیٹنر نے اپنی تصنیف "سنین الاسلام" شائع کردی ہے جو ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے - یہ اردو میں

اسلامی تاریخ اور ادب کا خلاصہ ہے - موصوف کو اس کتاب کی تیاری میں مولوی محمد حسین سے بہت مدد ملی - یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ہندوستان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے - اس کتاب کا طرز تحریر نہایت سلیس اور شستہ ہے جس کی اہل مشرق بڑی قدر کرتے ہیں اور جو اکثر ان کتابوں میں مفقود ہوتا ہے جو اہل یورپ ہندوستان کے متعلق خود لکھتے ہیں یا دوسروں سے لکھواتے ہیں —

ان کتابوں کے علاوہ جو مولوی عمادالدین نے پہلے مسیحی مذہب کے متعلق شائع کی تھیں ابھی حال میں تین کتابیں اسی موضوع پر موصوف نے لکھی ہیں - مولوی عمادالدین پہلے مذہب اسلام کے "عماد" تھے تو اب مسیحی مذہب کے "عماد" ہیں - وہ اپنی تحریر اور تقریر سے مسیحی مذہب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہے ہیں - یہ تین کتابیں یہ ہیں - (۱) اعجازالقرآن - یہ کتاب چھہ حصوں میں ہے - پہلے حصے میں مصنف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا قرآن کو آسمانی کتاب کہہ سکتے ہیں یا نہیں - دوسرے حصے میں مولوی عمادالدین نے ثابت کیا ہے محمد (علیہ السلام) کا تمام تر استدلال یہود و نصاریٰ کی کتب سے ماخوذ ہے - تیسرے حصے میں حضرت جبرئیل کے وحی لانے پر بحث کی ہے - چوتھے حصے میں حضرت جبرئیل کی ماہیت بیان کی گئی ہے - پانچویں حصے میں اس واحد ذریعۂ نجات پر بحث کی گئی ہے جو خدا کا بتایا ہوا ہے - چھٹے حصے میں سچی وحی کے ثبوت میں قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے - آخر کے باب میں قرآن اور حدیث کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق کوئی

اعجازی کتاب نہیں ہے —

(۲) تفسیر مکاشفات - یہ کتاب لاہور میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں شائع ہوئی ہے -

(۳) آثار قیامت - اس کتاب میں قیامت کے روز مُردوں کے زندہ ہونے کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے - یہ کتاب بھی لاہور میں سنہ ۱۷۸۰ ع میں شائع ہوئی ہے —

شملہ کے مسٹر پوترواٹن نے' جو حکومت ہند کے محکمۂ امور خارجی میں مددگار معتمد ہیں' ایک ہزار روپے کا انعام اس شخص کو دینے کا وعدہ کیا ہے جو میرے قدیم دوست مسٹر اے کِلین کی کتاب "سماوات" کا بہترین ترجمہ ہندوستانی زبان میں کرے گا - یہ اعلان ۳ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کو شائع ہوا ہے - ترجمے ۳۱ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع تک پہنچ جانے چاہییں - ان ترجموں کی جانچ کے لیے سر سید احمد کی صدارت میں ایک مجلس مقرر کی گئی ہے جو اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ انعام کا کون مستحق قرار دیا جائے —

کپتان ہولرائڈ کی تصانیف میں "قواعد اردو" قابل ذکر ہے - اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی حال میں شائع ہوا ہے اور اس کے ۱۲۵۰ نسخے طبع کیے گئے ہیں - کتاب ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے - اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے میں ہندوستانی زبان کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس زبان میں کس قدر خوبیاں موجود ہیں اور اس کے لکھنے والوں کے طرز تحریر میں کس قدر فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے —

ہندوستانی زبان کی جو دوسری کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں بعض پہیلیوں پر ہیں' بعض نظمیں ہیں؛ پرندوں کے حالات انگریزی سے

خواجہ ضیاالدین نے ترجمہ کیے ہیں؛ سقراط، افلاطون، ارسطو، بیکن، پلوٹن، فارسی شاعر فردوسی اور سنسکرت کے شاعر والمیکی مصنف راماین کی سوانح عمریاں ہیں - (سر) سید احمد (خاں) نے دھلی کے آثار قدیمہ پر سلسلۂ مضامین لکھا ہے اور اسی طرح مصر کے اہرام اور چین کی دیوار اور چینیوں کے رسم و رواج پر بھی مضامین شائع ہوئے ہیں —

اودھ کی تعلیمی ترقی بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع - سنہ ۱۸۷۰ ع کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں بعض نئی مطبوعات کا ذکر ہے جن کی نسبت میں یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں —

" مفید الانشا " - منشی امین الدین نے خطوط نویسی کے اصول اس میں بیان کیے ہیں - پنڈت شیو نرائن نے اس کتاب کو ہندی میں بھی شائع کیا ہے - میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " میں اس کتاب کے متعلق ذکر کیا ہے - ( دیکھو جلد ۳ - ص ۴۴۴) —

" اشرف القوانین " - یہ سید ابوالفتح عرف مولوی اشرف علی کی لکھی ہوئی صرف و نحو کی کتاب ہے اور بمبئی میں چھپی ہے - سندھی زبان کی صرف و نحو پر ہندوستانی میں منشی اُدھا رام نے ایک کتاب لکھی ہے - " دل پسند کہانیاں " بھی اسی مصنف کی لکھی ہوئی ہیں جو ہندوستانی زبان میں ہیں - الومل تکم داس نے سنہ ۱۸۷۱ ع میں " مختصر تاریخ سندھ " ہندوستانی زبان میں شائع کی ہے —

اس وقت میں اس خبر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ الہ آباد کے ریورنڈ مسٹر بیٹ جو امریکی مسیحی مبلغ ہیں اور عالم فاضل شخص ہیں، ہندی کی ایک لغت تیار کر رہے ہیں جس میں ۳۷ ہزار لفظ ہوں گے -

یعنی تامسن کی لغت کے مقابلے میں اس میں ۱۲ ہزار لفظ زائد ہوں گے * —

پٹنہ میں منشی سورج مل نے ڈاکٹر ایس ڈبلو ' فیلن ' کے زیر نگرانی ایک اردو لغت تیار کرنا شروع کیا ہے جس میں اردو لفظوں کے معنی اردو میں بیان کیے جائیں گے - یہ لغت فارسی رسم خط میں ہوگی اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوگی - اس کی ۸ سائز کی تقطیع ہوگی اور ہر صفحے پر دو کالم ہوں گے - الفاظ کی ترتیب فارسی حروف تہجی کے لحاظ سے ہوگی - ہر لفظ کے ساتھ اس کا ماخذ بتایا جائے کا کہ آیا وہ عربی کا ہے ' فارسی کا یا سنسکرت کا ہے - سنسکرت کے الفاظ کی اصل دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے گی - اس لغت کے الفاظ کے ساتھ مشہور مصنفوں اور شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دی جائیں گی تاکہ ان کے معنی کا تعین ہوسکے - اس لغت کا اشتہار اس وقت میرے پیش نظر ہے جس کے ساتھ چار صفحات بطور نمونہ منسلک ہیں - ان صفحات کے دیکھنے سے میں نے یہ رائے قایم کی ہے کہ کام قابل اطمینان طریق پر ہوا ہے - میری خواہش ہے کہ یہ لغت جلد تیار ہوکر چھپ جائے —

میں اس موقع پر خاص طور پر اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اردو اور ہندی میں سائنس پر سنہ ۱۸۷۱ ع میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بعض عنقریب شائع ہونے والی ہیں - ان میں سے بعض پٹنہ میں زیر طباعت ہیں - رائے سوہن لعل ناظم نارمل اسکول پٹنہ اور مسٹر فیلن کے زیر نگرانی یہ کتابیں لکھوائی گئی ہیں - مسٹر فیلن نے ازراہ کرم ان کتابوں کے نمونے جو مجھے بھیجے ہیں انہیں دیکھنے سے

* ٹائمز آف انڈیا ' مورخہ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع

معلوم ہوا کہ سائنٹفک اصطلاحوں کو بجائے سنسکرت یا عربی کے ہندوستانی میں ترجمہ کیا گیا ہے - بعض مصنف یہ کرتے ہیں کہ علمی اصطلاحوں کو علی حالہ رہنے دیتے ہیں اور انہیں انگریزی رسم خط میں متن میں تحریر کردیتے ہیں - لیکن پٹنہ میں جو کتابیں شائع ہورہی ہیں ان میں یہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا - میں خود ہندوستانی زبان میں اصطلاحات کے ترجمے کرنے کا قائل ہوں - میرا خیال ہے کہ اس طرح مغربی علوم کا چرچا ہندوستان میں بڑھے گا اور سائنس کی معلومات سے لوگ آگاہ ہوسکیں گے - اس وقت اس قسم کی ۵۶ اصطلاحات میرے پیش نظر ہیں جو ہندوستانی میں ترجمہ کی گئی ہیں —

یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی قدیم رسائل و اخبارات کے بند ہونے پر نئے اخبار و رسائل جاری ہوتے ہیں - اس سال ہندوستانی کے ۳۰ نئے اخبار و رسائل جاری ہوے ہیں لیکن یہ سب کے سب روزانہ اخبار نہیں ہیں ان میں سے بیشتر ہفتہ وار ہیں اور بعض دسویں دن نکلتے ہیں اور بعض مہینے میں دو مرتبہ - بنگلور کا " قاسم الاخبار " ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا لیکن اس کی اشاعت بند ہوگئی - اودھ اخبار نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع سے اس کی اشاعت ہفتہ میں دو مرتبہ ہوگی - اس اخبار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے - شروع میں یہ صرف چار صفحات پر ہوتا تھا اور اب اس میں ۲۴ صفحے ہوتے ہیں - یہ خبر کہ یہ اخبار ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوا کرے گا ہندوستانیوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ہندوستانی زبان سے شغف رکھتے ہیں باعث مسرت ہے —

صرف صوبۂ شمال مغربی میں اس وقت ۲۳ اخبار دیسی زبانوں

میں نکلتے ھیں۔ ان میں سے ۱۹ ایسے ھیں جو حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوتے ھیں - جو اخبار حکومت کے اثر سے آزاد ھیں وہ جب ضرورت سمجھتے ھیں تو انگریزی حکومت پر تنقیدیں کرتے ھیں - اب پریس کی قوت هندوستان میں ایک حقیقت ہوتی جاتی ہے (انڈین میل - مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع) —

هندوستانی زبان کے نئے اخبار جن کے متعلق میں نے اوپر ذکر کیا ہے مندرجہ ذیل ھیں - ان میں ماہوار رسالے اور ایجنسیوں کی میعادی مطبوعات بھی شامل ھیں —

اخبار محتشم جاورا - (؟) - اس اخبار کے متعلق لکھنؤ کے اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع کے " جلسۂ تہذیب " میں اعلان کیا گیا تھا —

اخبار سوشل راجپوتانہ - اس اخبار کا اعلان جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کے " جلسۂ تہذیب " میں کیا گیا ہے - اس کا مقصد راجپستان کے معاشرتی حالات کی اصلاح و ترقی ہے —

اخبار سوسائٹی کانپور : اخبار ناگپور - اس کا ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے " علیگڑھ اخبار " میں ذکر ہے —

المورہ اخبار - اس اخبار کی هندوستان میں بہت قدر ہو رہی ہے —

اخبار انجمن پنجاب - یہ اخبار هفتہ وار ہے اور ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر چار کالم ہوتے ھیں اور ہر کالم میں ۲۵ سطریں - غالباً یہ اخبار وہی ہے جس کا پہلے نام " ہمائے پنجاب " تھا اور جس کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع والے مضمون میں تذکرہ کرچکا ہوں - اس اخبار کے سرورق پر ہما کی خیالی تصویر بنی ہوئی ہے -

یہ اخبار "اخبار پنجاب" سے علحدہ ہے * - اسی اخبار کو "رسالۂ انجمن پنجاب" اور "رسالۂ انجمن اشاعت پنجاب" بھی کہتے تھے - جس انجمن کی طرف سے یہ اخبار شائع ہوتا ہے وہ اس کا التزام کرتی ہے کہ عام لوگوں سے مفید مطلب مضامین اس میں شائع ہوا کریں- چنانچہ اس میں صرف وہ یاد داشتیں شائع ہوتی ہیں جو ارکان انجمن بھیجتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی دلچسپی کے مضامین کی اشاعت بھی ہوتی ہے - انجمن کے صدر مسٹر لیپل گریفن ہیں اور معتمد بابو نوین چند راے ہیں- ان دونوں کی نگرانی میں اخبار نکلتا ہے - حکومت کی سرپرستی اس اخبار کو حاصل ہے - چنانچہ سرکاری طور پر اس کے ۲۰۰ نسخے خریدے جاتے ہیں - منشی نظام الدین اس کے مدیر ہیں - ۲۶ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں جو اس وقت میرے پیش نظر ہے انجمن کانگوہ (پنجاب) کی کارروائی درج ہے - اس انجمن کا جلسہ منشی امین چند کلکٹر ضلع کے تبادلہ کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا - جلسے میں جتنی تقریریں ہوئیں ان میں انجمن اور پورے ضلع کی طرف سے اظہار افسوس کیا گیا † - اس اخبار میں

* "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" جلد ۳ - ص ۲۷۷ -

† میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں منشی امین چند کے متعلق بہ حیثیت ہندوستانی کے مضمون نگار کے ذکر کیا ہے - (دیکھو جلد ۲ - ص ۱۹۹) -

ریاست کشمیر کا حال نہایت دلچسپ انداز میں بیان
کیا گیا ہے - اس مضمون کے شروع میں جو ۱۵ کالم میں
ہے منشی جلال الدین شیرازی نے کشمیر کی تعریف میں
ایک نظم لکھی ہے - یہ نظم اس لائق ہے کہ اس کا
انگریزی یا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جائے - اس اخبار
میں تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دیسی
لوگوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ قابل قدر ہے - اس کی
آخری اشاعت میں موجودہ بادشاہ ایران نصیرالدین
کی تصویر ہے اور بوشہر کے پُل کا منظر ایک تصویر
میں دکھایا گیا ہے —

آگرہ اخبار - یہ ہفتہ وار اخبار آگرہ سے شائع ہوتا ہے اور ۸ صفحوں کا
ہوتا ہے - ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں - ایک کالم میں اردو
اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے - اس اخبار کا پہلے
"ایجوکیشنل گزٹ" نام تھا - اس میں تعلیم کے متعلق
مضامین اب تک شائع ہوتے ہیں —

بدیا بلاس - یہ ہندی کا اخبار جمّو سے نکلتا ہے - غالباً یہ وہی اخبار ہے
جس کی نسبت میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی
کی تاریخ" (جلد ۳ - ص ۴۷۸) میں ذکر کیا ہے —

بدھی بلاس - یہ اخبار بھی جمّو سے مارچ سنہ ۱۸۷۰ ع سے نکلنا شروع ہوا
ہے اور قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے —

بلند اختر - اس کا پہلا نمبر دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع میں مراد آباد سے
شائع ہوا ہے —

فیض عام - یہ ماہوار رسالہ گجرانوالہ کی ادبی انجمن کے زیر اہتمام نکلتا ہے - اس کا پہلا نمبر یکم جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع کو سیالکوٹ سے شائع ہوا - اس کے مدیر منشی دیوان چند ہیں جن کی ادارت میں "چشمہ فیض" نکلتا تھا * —

گورنمنٹ گزٹ - اودھ سے اردو میں شائع ہوتا ہے - اسی نام کا اخبار لکھنؤ سے انگریزی زبان میں بھی نکلتا ہے -

گورنمنٹ گزٹ مغربی و شمالی - یہ اخبار صوبہ شمالی مغربی کا ہے —

ہندو پرکاش - یہ اخبار ہندی کا ہے اور کانپور کی "مجلس اصلاح معاشرت" کی جانب سے شائع ہوتا ہے - یہ انجمن مغل سرائے کی مقامی انجمن کو اپنے پرچے بھیج دیتی ہے † —

ہلی شہر پترکا (؟) - علیگڑھ اخبار مورخہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس کی تعریف کی گئی ہے —

خورشید جہاں تاب - یہ اخبار آگرے سے ہر مہینہ کی پہلی اور پندرھویں کو شائع ہوتا ہے - اس کا پہلا نمبر یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو شائع ہوا تھا - اس کے ہر نمبر میں ایک یا دو صفحوں پر "جہانگیر نامہ" شائع ہوتا ہے - اس کے قلمی نسخے بہت کمیاب ہیں اور اب تک یہ طبع نہیں کیا گیا ہے —

سلو بہار - یہ ماہ نامہ تھانہ (بمبئی) سے کرشن جی پرسورام گور کے زیر ادارت نکلتا ہے - اس میں ہندوستانی، مرہٹی

---

* "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" - جلد ۳ - ص ۴۷۹ -

† علی گڑھ اخبار - مورخہ ۲ جون و یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

گجراتی اور سنسکرت کے مضامین ہوتے ہیں —

مطلع نور- یہ اردو کا اخبار کانپور سے نکلتا ہے -

مفرح القلوب- یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے - اسی نام کا ایک اور رسالہ شکار پور سے شائع ہوتا ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " ( جلد ۳ - ۴۸۴، میں ذکر کیا ہے —

منتخب مارواڑ- یہ رسالہ مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے - اس میں اردو اور ہندی دونوں کے مضمون ہوتے ہیں - یہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع سے مارواڑ سے شائع ہوا ہے اور ۱۲ صفحات کا ہے - اس کا وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر اخبار کی اشاعت بڑھی تو اس کے صفحات کی تعداد بڑھادی جائے گی —

نورالابصار- یہ اخبار الہ آباد سے نکلتا ہے - اسی نام کا دوسرا اخبار بھی ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " ( جلد ۳ - ص ۴۸۴ ) میں ذکر کیا ہے - یہ دونوں بالکل الگ الگ ہیں - مسٹر کمپسن کی رائے ہے کہ " نورالابصار " جو الہ آباد سے نکلتا ہے صوبۂ شمال مغربی کا بہترین اخبار ہے - ۹ مئی کے پرچے میں " انجمنوں " کے متعلق ایک مضمون ہے جس میں بعض مشرقی مصنفوں کے حوالے دیے گئے ہیں اور ۱۷ مئی کے پرچے میں الہ آباد کی سڑکوں کا حال شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے - بالخصوص برسات کے موسم میں اس شہر کی سڑکوں کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کی ہے -

اس ضمن میں "فسانہ عجائب" کا ایک شعر لکھا ہے :—

دیکھی نئی ریت اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پریاگ دوت — یہ ہندی کا اخبار بھی الہ آباد سے نکلتا ہے —

رسالہ ڈبیٹنگ سوسائٹی- یہ میرٹھ کی مجلس مباحثہ کا ماہوار رسالہ ہے —

رہنمائے پنجاب — اس کی نسبت جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کے "رسالہ جلسۂ تہذیب لکھنؤ" میں ذکر ہے —

ریاض نور — ستمبر سنہ ۱۸۷۰ ع سے یہ اخبار مراد آباد سے شائع ہوا ہے - اسی نام کا ایک اخبار ملتان سے بھی نکلتا ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" (جلد ۳ - ص ۴۸۵) میں ذکر کیا ہے —

سدر اس گزٹ — یہ ہندی میں شاہجہاں پور سے شائع ہوتا ہے —

سلبھہ سمچار — یہ ہفتہ وار ہندی رسالہ ہے - اس کے چار صفحے ہوتے ہیں اور قیمت بہت کم ' صرف ایک پیسہ ہے - "انڈین ریفارم ایسوسی ایشن" کی طرف سے کلکتہ سے شائع ہوتا ہے - اس اخبار کا یہ مقصد ہے کہ غریب لوگوں کی خدمت کرے - اس میں مفید اور دلچسپ معلومات اور خبریں درج ہوتی ہیں - اس میں دیسی لوگوں کی ضروریات اور ان کی شکایتیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ حکومت کو ان کے متعلق علم ہو اور وہ انہیں دور کرنے کی طرف

توجہ کرے * —

اردو لا رپورٹ — یہ میرٹھ سے مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتی ہے - پہلے یہی " گلنجھنۂ احکام " کے نام سے ماہوار نکلتا تھا —

ذخیرۂ بال گوبند — یہ آگرہ سے نکلتا ہے -

کبی بچن سدھا — یہ ہندی کا ادبی رسالہ بنارس سے بابو ہری چندر کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے - اس کے سرورق پر ایک ہندی شعر لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے :—

" سدھا ( آب حیات ) وہاں دستیاب ہوتا ہے جہاں غیر فانی ہستیاں سکونت پذیر ہیں - تمہاری رسائی اس تک دشوار ہے - لیکن وہ لوگ جو عقل و فہم رکھتے ہیں اس سے ( اس رسالے سے ) اس کو حاصل کرسکتے ہیں اور اس کا ذائقہ چکھہ سکتے ہیں " —

مسٹر کمپسن ، جو صوبۂ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات ہیں ، جب تعریف کرتے ہیں یا کوئی دعوی پیش کرتے ہیں تو کبھی احتیاط کو ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے - انہوں نے " کبی بچن سُدھا " کے متعلق اپنی سانہ ۱۸۷۰ ع کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ " ہندی کے سب رسالوں کے مقابلے میں یہ رسالہ سب پر فوقیت رکھتا ہے - اس کا طرز تحریر دلکش ہے اور اس کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے " - یہ رسالہ خالص ادبی ہے اور مہینے میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے - اس میں کبھی سیاسی معاملات پر بھی بحث کی جاتی ہے اور خبریں شائع کی جاتی ہیں - اس کی تقطیع پہلے بڑی ہوا کرتی تھی

* انڈین میل - مورخہ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۱۷ ع -

لیکن اب چھوٹی ہوتی ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - اس چھوٹی تقطیع کا پہلا نمبر ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کو شائع ہوا ہے - اس کی دوسری اشاعتوں میں هندی شاعری کی مختلف اصناف مثلاً کبت ' سورتھہ ' بسنت ' هوری اور کہروا وغیرہ کے انتخابات ہیں - ایک ناٹک " نتمهلی ناٹک " کے نام سے سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے - میں نے اپنی کتاب " ادب هندی و هندوستانی کی تاریخ " میں " سدھا برشا " کا ذکر کیا ہے - لیکن یہ رسالہ هندی اور بنگالی دونوں زبانوں میں سنہ ۱۸۵۴ ع میں کلکتہ سے شائع ہوا کرتا تھا * —

میور گزٹ — اس کے متعلق میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۹ ع کے خطبے میں ذکر کیا تھا - یہ اردو کا رسالہ میرٹھہ سے نکلتا ہے - اب دیوناگری خط میں بھی اس کے مضمون اردو کے ساتھہ ساتھہ شائع ہوتے ہیں —

مخزن العلوم — یہ رسالہ بریلی سے نکلتا ہے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب " ادب هندی و هندوستانی کی تاریخ " ( جلد ۳ - ص ۴۱۳ ) میں ذکر کیا ہے —

مظفرپور کی سائنٹفک سوسائٹی اپنے رسالے " اخبار الاخیار " کو کامیابی کے ساتھہ چلا رہی ہے - مہینے میں یہ دو مرتبہ نکلتا ہے - اس رسالے کے نسخے اس کے قابل مدیر مولوی سید امداد علی خان بہادر ازراہ کرم مجھے بھیجدیا کرتے ہیں - یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ۲۰ اگست کے جلسے کی کارروائی بھی درج ہے —

---

* J. Long., Catalogue of Bengali publications, p. 61.

مسلمان اس بات سے مطمئن ہیں کہ سرکاری مدارس میں ہندوستانی ' عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - عربی اور فارسی ان کی کلاسکی زبانیں ہیں اور وہ سنسکرت کی طرح مردہ زبانیں نہیں ہیں ان کی وہی حیثیت ہے جو یورپ میں یونانی اور لاطینی کی ہے - مسلمانوں کو یہ بات بھی بہت پسند ہوئی ہے کہ حکومت کا ارادہ ہے کہ روز مرہ کی زبان میں نئی کتابیں لکھوائی جائیں ' انگریزی سے ترجمے کرائے جائیں اور اس کام کو ترقی دینے میں ہمت افزائی کی جائے - مسلمانوں کی تمام علمی انجمنیں حکومت کی اس کے لیے شکر گذار ہیں - "اخبار الاخیار" میں ایک مضمون ہے جس میں یہ بتا یا گیا ہے کہ روزمرہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت پیدا ہوگی اور دیسی لوگوں کو تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا - اسی اشاعت میں میری ان چند سطروں کا ترجمہ بھی درج ہے جو میں نے مظفر پور کی انجمن کے متعلق اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مقالے میں سپرد قلم کی تھیں -

روہیلکھنڈ اخبار - مسٹر کمپسن کی رائے ہے کہ یہ ایک عمدہ اخبار ہے- اس میں بعض اوقات نہایت اعلی درجے کے دلچسپ مضامین ہوتے ہیں —

نجم الاخبار - اس اخبار میں خاص طور پر تعلیمی مسائل پر مضامین ہوتے ہیں - اس کی رائے قابل قدر سمجھی جاتی ہے —

منگل سماچار - اس کے متعلق میں اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مقالے میں ذکر کرچکا ہوں - اس میں انجمن ہند کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں - اس انجمن کا مقصد ہندوؤں کی معاشرتی اصلاح ہے تاکہ شادی بیاہ پر فضول خرچی کو روکا جائے -

اتالیق پنجاب - مسٹر ہولرائڈ جو پنجاب کے ناظم تعلیمات ہیں اور ایک

روشن خیال شخص ہیں اہل ہند کی تعلیمی ترقی کے
لیے برابر کوشاں ہیں- یہ ماہوار رسالہ ان کی سرپرستی
میں منشی پیارے لال کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے -
اس میں تاریخ جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید
مضامین ہوتے ہیں مسٹر ہولرائڈ کا مقصد اس رسالے سے
یہ ہے کہ اہل ہند کی معلومات میں اضافہ ہو - موصوف
ازراہ نوازش یہ رسالہ مجھے برابر بھیجتے رہتے ہیں -
اس کی آخری اشاعت میں حکومت انگلستان پر ایک
مختصر مضمون ہے ' انگلستان اور ہندوستان کے بادشاہوں
کی ایک فہرست ہے جس میں ان کے عہد حکومت کا
مقابلہ کیا گیا ہے اور ایک بیس صفحے کا "کنفوشس"
پر مضمون ہے —

علی گڑھ اخبار۔ دیسی اخباروں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے
اس واسطے کہ اس میں سید احمد خاں بہادر کے
مضامین اور بعض اوقات ان کے جوابات شائع ہوا کرتے
ہیں - اس اخبار کے بعض مضامین ایسے ہیں جن کا
ذکر صوبۂ شمالی مغربی کے ناظم تعلیمات کی سنہ ۱۸۷۰ ع
کی رپورٹ میں کیا گیا ہے - اس اخبار کی ۷ جولائی
سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک مضمون میری نظر
سے گذرا جس میں پٹیالہ کے پنڈت کاشی ناتھہ نے اخبارات
کی اس ذمہ داری پر بحث کی ہے جو قومی بیداری
پیدا کرنے کے لیے ان پر عائد ہوتی ہے - پنڈت جی اپنی

ہندوستانی نظموں اور دوسری تصانیف کے باعث مشہور ہیں ۔ ان کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " میں بھی ( جلد ۲ ص ۱۲۶ ) ذکر کیا ہے ۔ اس اخبار کی ۱۱ مئی سنہ ۱۸۸۱ ع کی اشاعت میں سید خیرالدین وزیر اعظم تیونس کی کتاب " رقوم المسالک " کے مقدمہ کا ترجمہ درج ہے ۔ اس کتاب میں اس ملک کی تصویر کھینچی گئی ہے جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اچھا نظم و نسق قائم کیا گیا ہو ۔ ۹ اکتوبر کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس میں تعلیم یافتہ اور ہوشمند اہل ہند سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے اپنی تحریر یا کسی اور ذریعہ سے اپنی یادگار میں ادارے قائم کیے جائیں یا جو ادارے انہوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے قائم کیے ہیں ان کے باقی رہنے کا انتظام کریں ۔ ۱۳ اکتوبر کے نمبر میں عربی الفاظ " تصنیف " اور " تالیف " کے فرق پر ایک عالمانہ منظور شائع ہوا ہے —

اخبار تہذیب الاخلاق علیگڑھ کا یہ اخبار خاص طور پر مسلمانوں کے مذہبی مسائل سے بحث کرتا ہے ۔ اس میں میری نظر سے سید احمد خاں کا ایک مضمون گزرا جس کا عنوان " مذہبی عقائد اور تعلیم عامہ " تھا ۔ اس مضمون میں سید صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ تعلیم کے نصاب میں سے مذہبی تعلیم کو خارج

نہیں کہا جاسکتا - علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی
کے اخبار " علیگڑھ اخبار " میں سید صاحب کا
یہ مضمون نقل کیا گیا تھا - اس پر "اودھ اخبار"
نے مخالفت کی اس لیے کہ اس اخبار کی پالیسی
یہ ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو خوش
کرنا چاہتا ہے - غرض کہ کچھہ عرصے تک دونوں
اخباروں میں نوک جھوک ہوتی رہی —

لکھنؤ سے " رسالۂ جلسۂ تہذیب " کی نومبر سنہ ۱۸۷۰ ع کی اشاعت میں ۲۲ صفحوں کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انگریزی حکومت کے ان مساعی کا ذکر ہے جو اس نے ہندوستان میں علوم و فنون اور صنائع کی ترقی کے لیے کی ہیں - یہ مضمون ایک مسلمان کے قلم کا لکھا ہوا ہے جن کا نام مولوی محی الدین خاں صاحب بہادر رئیس کاکوری ہے - موصوف علمدوست شخص ہونے کے علاوہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں - ایک زمانے میں موصوف سرکار اودھ کی طرف سے انگلستان کے شاہی دربار میں مامور تھے میری اُن سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ نواب اودھ کی والدہ کے ساتھہ پیرس تشریف لائے تھے نواب اودھ کی والدہ کا یہیں انتقال ہوگیا تھا —

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظما نے ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۵۴ ع کے اپنے مراسلے میں اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ مفید علوم و فنون کے ذریعہ اہل ہند کی اخلاقی اور مادی حالت درست کی جائے - ان الفاظ سے ہندوستان کی حکومت کے اس ارادے کا پتہ چلتا ہے جو وہ اہل ہند کی تعلیم کے متعلق رکھتی تھی - مسٹر' پیل' نے

جو احاطۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات ہیں ' ان مذکورہ بالا الفاظ کو اپنی سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع سنہ ۱۸۷۰ ع کا زیب عنوان بنایا ہے - اس ۵۴۸ صفحات کی رپورٹ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر پیل نے ان الفاظ کو کس طرح عملی جامہ پہنانے کی سعی بلیغ کی ہے - لیکن اس رپورٹ میں ہندوستانی کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہیں اس واسطے کہ احاطۂ بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی کا عام طور پر زیادہ رواج ہے —

مسٹر 'ہاول' نے برطانوی ہند کے جو تعلیمی اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر میں مدرسہ جانے والے طلبا کی تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب ہے - ان مدارس میں ہندوستانی یا دوسری مقامی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے - صرف کلکتہ ' مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے - قومی درسگاہوں کے طلبا کی تعداد ۱۰۹۹۰۲۸ ہے جو ۳۷۰۹۷ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں - ۵ لاکھ طلبا سرکاری مدارس میں ہیں - ایسے مدرسے جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے ۲۷۵۷۴ ہیں اور ان میں ۳۰۱۷۸۹ طلبا پڑھتے ہیں - حکومت کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ان ہندوستانی لوگوں کے لیے جنھیں حصول معاش کے مشاغل کے باعث دن میں فرصت نہیں ملتی ان کے لیے مدارس شبینہ کا انتظام کیا جائے - اگر اس منصوبے میں کامیابی ہوئی تو طلبا کی تعداد بڑھ جائے گی * - ایسے مدرسے جو

(*) ضلعوں کے ایک ہزار مدارس میں جو براہ راست انگریزی حکومت کے تحت ہیں جسمانی سزا کی اجازت نہیں ہے سوائے غیر معمولی حالات کے - عام طور پر طلبا کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ مدرسے کے اوقات ختم ہونے کے بعد انہیں تھوڑی دیر کے لیے روک لیا جاتا ہے -

بالکل آزاد ہیں اور کسی قسم کی سرکاری امداد نہیں لیتے تعداد میں ۲۳۶۲ ہیں اور ان میں ۳۹۳۳۷ طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ احاطۂ بمبئی میں طلبا کی تعداد سب سے زیادہ ہے اس کے بعد صوبہ شمال مغربی ' بنگال ' پنجاب اور مدراس کا نمبر آتا ہے - اگرچہ اودھ کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے لیکن وہاں طلبا کی تعداد صرف ۳۶۹۴۰ ہے - لکھنؤ کے ماڈل اسکول کے صدر بابو رامچندر سین ہیں۔ اس اسکول کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو زبان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے تاکہ اس زبان کے ذریعہ تہذیب کو ترقی ہو۔ اس اسکول کے ایک مدرس نے جس کا نام مولوی امان الحق ہے "امان اللغات" کے نام سے ایک لغت شائع کی ہے جس میں عربی الفاظ کے اصلی معنوں اور ان کے اردو میں مروجہ معنوں کا فرق واضح کیا ہے —

کیننگ کالج میں ۴۷۹ طلبا اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف ۲۳ ہندی کی۔ لکھنؤ کے مارٹینئر کالج میں سنہ ۱۸۷۰ع میں ۲۷۱ طلبا ' تعلیم پاتے تھے جن میں سے ۲۰۰ اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ۳۵ فارسی کی اور انگریزی زبان سبھوں کے لیے لازمی تھی -

ہندوستان کے تمام شہروں میں کتب خانے قایم ہوگئے ہیں - ان کتب خانوں سے قصبات کے مدرس اپنے نام کتابیں جاری کراسکتے ہیں بشرطیکہ وہ برائے نام تھوڑی سی رقم ادا کیا کریں۔ لکھنؤ کے کتب خانے میں جو صرف دو سال کا عرصہ ہوا قایم کیا گیا ہے اس وقت ۲۹۴ کتب موجود ہیں جن میں سے بیشتر اردو کی ہیں۔ لکھنؤ کے ریفارم کلب کے کتب خانے میں بچوں کی کتابوں کا ۱۱۹۲ جلدوں کا ذخیرہ موجود ہے —

بنگال میں تعلیم نسواں کو خوب ترقی ہو رہی ہے - زنانہ تعلیم کا والدین یا بھائی ایسا انتظام کرتے ہیں کہ مشرقی اور مغربی تعلیم کے فوائد سے عورتیں مستفید ہو سکیں - چونکہ عورتیں پردے میں رہتی ہیں اس لیے ان کی تعلیم میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں - ان تک صرف ان مردوں کی رسائی ممکن ہوتی ہے جو ان کے بالکل قریبی عزیز ہوتے ہیں - مدارس نسواں کی تعداد بہت محدود ہے اور ان میں صرف ایک خاص طبقے کی عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں - اگرچہ ہندوستانی عورتیں تعلیم حاصل کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی ہیں لیکن رسوم و روایات ان کے تعلیم حاصل کرنے میں مانع آتے ہیں —

مسلمانوں میں عام طور پر ہمیشہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم کا رواج رہا ہے اور مسلمان عورتیں بھی عربی فارسی سیکھتی تھیں اور آج بھی سیکھتی ہیں - ان زبانوں کے سیکھنے سے یہ خاص فائدہ ہوتا ہے کہ قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے کے علاوہ ادبیات کی کتابیں بھی مستورات اپنی طویل فرصت کے اوقات میں پڑھتی ہیں - قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے سے انہیں روحانی تشفی حاصل ہوتی ہے - لیکن اعلیٰ طبقوں کی عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں بالکل جاہل رہتی ہیں اور انہیں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوتی - ان کی تعلیمی آزادی انگریزی حکومت کی رہین منت ہے —

ہندوستان میں بالعموم انگریزی تعلیم کے خلاف ردعمل پیدا ہوگیا ہے اور خاص طور پر صوبۂ شمال مغربی میں مشرقی علوم اور السنہ کی طرف توجہ کی جارہی ہے - اس مقصد کے حصول کے لیے اہل ہند ایسے ادارے قایم کر رہے ہیں جہاں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام

کیا جائے تاکہ یوروپین اثرات سے بچاؤ ممکن ہو - یہ مدارس باوجود سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے خوب ترقی کر رہے ہیں - جس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے وقت یونانی اور لاطینی سیکھنے کا لوگوں کو شوق پیدا ہوگیا تھا بالکل اسی طرح آج کل ہندوستان میں سنسکرت اور عربی کا چرچا بڑھ گیا ہے - ان دیسی مدرسوں میں قابل اساتذہ پڑھاتے ہیں اور ان کے درسوں میں لوگ شوق سے شرکت کرتے ہیں - ان مدرسوں میں صرف کلاسکی علوم ہی نہیں پڑھائے جاتے بلکہ اس کے ساتھ جدید ادبیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہے تاکہ جدید طرز کے انشاپرداز پیدا ہوں * —

جیسا کہ کرنل نسولیز نے کہا ہے اہل ہند کی یہ خواہش ہے کہ وہ مغربی علوم و فنون حاصل کریں لیکن اپنی مروجہ زبانوں کے ذریعہ سے نہ کہ انگریزی کے توسط سے - وہ انگریزی زبان اپنی خوشی سے سیکھنا چاہتے ہیں - وہ یہ نہیں چاہتے کہ انہیں اس زبان میں امتحان کامیاب کرنے پر مجبور کیا جائے جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف ہے - بنگال میں یوروپین تعلیم کا رواج بہ نسبت ہندوستان کے دوسرے حصوں کے زیادہ پایا جاتا ہے لیکن بنگال کل ہندوستان نہیں ہے - شمالی ہند کے باشندے جو اہل بنگال کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں اپنی زبان اور اپنی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں - مسلمان اور ہندو دونوں اپنی قدیم زبانوں اور ادبیات کا احترام کرتے ہیں - وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے انگریزی کی تعلیم کی خاطر اپنی روایات سے بیگانہ رہیں اور اپنے

---

* ڈاکٹر لیٹنر کے زیر سرپرستی لاہور سے ایک عربی رسالہ جاری ہوا ہے جسکا نام " النفع العظیم " ہے -

مذہب اور اپنی رسوم سے انہیں ایک طرح کی نفرت پیدا ہو جائے -
وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کو اس میں سہولت ہوتی ہے کہ اپنی
زبان دیسی لوگوں کو سکھائیں بجائے اس کے کہ ان کی زبان خود سیکھیں -
شمال مغربی صوبے کے لوگوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ حکومت انگریزی داں
بنگالیوں کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرتی ہے بجائے اس کے کہ مقامی لوگوں
کو اعلیٰ عہدے سپرد کیے جائیں جو بالعموم انگریزی زبان سے واقف نہیں
ہیں - بنگالی لوگ واقعی نہایت ذہین ہوتے ہیں - انہوں نے بڑے شوق سے
انگریزی تعلیم حاصل کی ہے - لیکن جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے
اہل بنگال ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے پست حالت میں
ہیں * - مسلمانوں کا حکومت سے یہ مطالبہ ہے جیسا کہ امیرعلی خاں
نے اپنی لندن کی تقریر میں کہا تھا کہ ان کے اور ہندوؤں کے درمیان
غیر جانبداری کا برتاؤ کیا جائے —

کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے امتحانات کی جانچ انگریزی زبان میں رکھنے
کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں - (۱) کوئی اورینٹل کالج ایسا
موجود نہیں جہاں تاریخ ' سائنس اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام
ہو اور امتحانات کی تیاری کی جا سکے - (۲) اعلیٰ جماعتوں کے لیے انگریزی
کے علاوہ کسی زبان میں کتابیں موجود نہیں ہیں - (۳) مترجمین کی
نا اہلیت - (۴) دیسی زبانوں میں سائنٹفک اصطلاحوں کو ادا کرنے کی
عدم صلاحیت - لیکن اگر یہ سب وجوہ درست بھی ہوں تو کوئی امر
مانع نہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ دیسی زبانوں کے ذریعہ امتحان میں

---

* The Oriental Movement in the North- West, p. 3.

شرکت کرنا چاہتے ہیں انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ دیا جائے - لیکن حقیقت میں جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ دیسی زبانوں میں نہ کتابوں کی کمی ہے اور نہ مترجموں کی - اردو میں مغربی علوم اچھی طرح ادا کیے جاسکتے ہیں اور اس میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت موجود ہے کہ قوانین فطرت' فلسفہ اور سائنس کے مطالب بیان کیے جاسکیں - مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے پیشتر اس کے کہ دوسرے طریقوں کی چھان بین کرے من مانے طور پر یہ فیصلہ کرلیا کہ انگریزی زبان ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے اور یہ طریق تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی ہونا چاہیے - کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ آیا دیسی زبانوں میں سائنٹفک اصطلاحات ادا کی جاسکتی ہیں یا نہیں ؟ - اس کا ثبوت اس وقت اچھی طرح مل سکتا تھا جب کہ یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں طلبا کو اس کا موقع دیا جاتا کہ وہ دیسی زبان میں اپنے مطالب ادا کریں - شمالی ہند کے ہندوستانی لوگ صرف یہی چاہتے ہیں کہ انہیں یہ موقع دیا جائے - اگر حکومت اس تجویز کو منظور کرلے تو ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ وہ فوائد حاصل کر سکے گا جو اب تھوڑی سی تعداد کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں - اس سے یہ بھی ہوگا کہ اعلیٰ عہدوں پر یورپ زدہ ہندوستانیوں کا اجارہ ختم ہو جائے گا - اس تجویز کو منظور کرنے سے حکومت اہل ہند کے ایک بڑے طبقے کو اپنا گرویدہ بنالے گی جو انگریزی زبان کی لازمی تعلیم کو پسند نہیں کرتے - بہت سے لوگ جو اب انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں جانے سے احتراز کرتے ہیں مشرقی مدارس میں خوشی سے شرکت کریں گے اور جدید تمدن کی برکتوں سے

مستفید ہوسکیں گے جس کے متعلق ہندوستانی زبان کے ذریعہ انہیں معلومات حاصل ہوں گی - ہندوستانی زبان سے ان لوگوں کو جو دلی تعلق ہے وہ انگریزی سے کبھی نہیں ہوسکتا - اگر حکومت نے اپنے نظام تعلیم میں یہ تبدیلی قبول کرلی تو انگریزی اداروں کی انصاف پسندی اور انسانیت دوستی کا اہل ہند کو احساس پیدا ہوگا درآنحالیکہ اب انہیں اداروں کے متعلق ان کی واقفیت ناقص ہے اور اسی لیے وہ ان سے نفرت کرتے ہیں - ہندوستانی زبان میں تعلیم ہونے سے اہل ہند کی تعلیم عامہ کو بہت فروغ حاصل ہوگا - مغربی خیالات کی بدولت ان کے ادب کو ترقی حاصل ہوگی اور ان کی زبان کے نشو و نما میں مدد ملے گی - اب اندھادھند انگریزی الفاظ ہندوستان میں ٹھونسے جارہے ہیں لیکن اگر زبان کی ترقی ہوئی تو اس بات کی تمیز بھی پیدا ہوگی کہ کونسے لفظ مفید ہیں اور کونسے بیکار ہیں اور زبان میں نہیں کھپ سکتے - مولوی اور پنڈت لوگ جب مغربی علوم و فنون کے ترجموں کو پڑھیں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ تمام انسانی علوم صرف سنسکرت اور عربی زبان تک محدود نہیں ہیں جیسا کہ وہ اس وقت یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے —

انگریزی درسگاہوں میں ہندوستانی لوگ جو مغربی علوم حاصل کرتے ہیں اسکا اثر بہت محدود رہتا ہے - قوم کی زندگی میں اسکا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا - انگریزی داں طبقے کی گویا ایک علحدہ ذات سی بن گئی ہے - یہ انگریزی داں اپنے خیالات سے اپنے ہم وطنوں کو اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعہ مستفید نہیں کرتے - ان کی معلومات انہیں تک محدود رہتی ہیں - یہ لوگ دیسی زبانوں کی ادبی مجلسیں

قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتے اس واسطے کہ وہ اپنے ادب اور اپنی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں - یہ لوگ انگریزی سے ہندوستانی میں ترجمہ تک نہیں کرسکتے اور اگر کرتے ہیں تو ہندوستانی محاوروں کے ساتھہ انگریزی محاورے اسطرح ملا دیتے ہیں کہ وہ صاف طور پر نظر آتے ہیں - وہ انگریزوں کی طرح انگریزی لکھنے پر فخر کرتے ہیں —

مشرقی مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا کی استعداد اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن وہ مغربی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں - انگریزی درسگاہوں سے بعض نہایت لائق طلبا نکلے ہیں جن کی سائنس کی معلومات اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں لیکن مشرقی ادب سے وہ بالکل بیگانہ ہوتے ہیں - مجھے اس کی توقع ہے کہ کچھہ عرصے بعد دونوں قسم کی درسگاہوں میں ایک طرح کی مفاہمت کی صورت پیدا ہوجائیگی - یہ صحیح ہے کہ انگریزی درسگاہوں میں قدیم مشرقی علوم رائج کیے گئے ہیں لیکن نہایت محدود طریقے پر - اسی طرح مجھے توقع ہے کہ مشرقی درسگاہوں میں انگریزی کی تعلیم رائج کی جائیگی - اس طرح دونوں طریقہ ہائے تعلیم میں ایک قسم کی خوشگوار مسابقت پیدا ہوجائیگی —

کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے قطعی طور پر فیصلہ کیا ہے کہ وسطانیہ کے امتحانات ہندوستانی اور دوسری مروجہ زبانوں میں ہونے چاہییں - وسطانیہ کے آخری امتحان کے بعد امیدوار کو اس کی قابلیت کی تصدیق کا صداقت نامہ دیا جائیگا - اس قسم کا پہلا امتحان یکم مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع منعقد ہوگا * - اردو میں سید احمد خاں کی "آثارالصنادید" اور "دیوان غالب" نصاب میں شامل ہیں - اس سے یہ ہوگا کہ خالص

* علیگڑہ اخبار - مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع —

انگریزی تعلیم کا اثر جسے ہندوستان میں لارڈ میکالے نے جاری کرایا کچھ کم ہوجائیگا - بھلا مشرق کو مغرب بنانا، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی نکلیں ؛ ایک ناممکن بات کی کوشش کرنا نہیں تو کیا ہے ـــ

پنجاب اور صوبۂ شمال مغربی کے ہندوستانیوں کی یہ دیرینہ آرزو ہے کہ ان کے لیے ایک مشرقی جامعہ قایم کی جائے - دیکھیے یہ آرزو کب پوری ہو ؟ - فی الحال انہیں یونیورسٹی کالج لاہور کے قیام پر صبر شکر کرنا چاہیے - ڈاکٹر 'لیٹنر' نے جو اس کالج کے پرنسپل ہیں اپنی رپورٹ میں اس کالج کی ترقی کے نہایت امید افزا حالات بیان کیے ہیں * مجھے پوری توقع ہے کہ عنقریب یہ کالج خوب فروغ حاصل کرے گا - اس کالج کا سرمایہ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع میں ۱۰۵۹۰۳ روپیے تھا اور اب ۲۹۴۴۹۷ روپیے ہے - اس کی سالانہ آمدنی پہلے ۲۲۹۸۰ روپیے سالانہ تھی اور اب ۴۲۲۲۰ روپیے سالانہ ہے - اس درسگاہ کی بدولت پنجاب میں سرکاری کالجوں کی تعداد اب ۳۴ ہوگئی ہے - اس میں طلبا کی تعداد ۱۷۲ ہے جو سب ۱۶ سال کی عمر سے زیادہ کے ہیں - رپورٹ میں ان امیدواروں کی تعداد درج ہے جنہوں نے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے - اب انہیں وہ فوائد حاصل ہوں گے جن کے وہ متوقع تھے - کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں میں ۱۷ مسلمان ہیں ۴۹ ہندو اور سکھ ہیں ـــ

اس درسگاہ میں تعلیم کا طریقہ تینوں سرکاری یونیورسٹیوں سے مختلف ہے جہاں ریاضی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے - یہاں یونان و روم

* ڈاکٹر لیٹنر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں شہرت رکھتے ہیں - ان کی علمی خدمات کے صلہ میں ملکہ معظمہ نے انہیں سی آئی ای کے خطاب سے سرفراز کیا ہے - مجھے توقع ہے کہ بہت جلد وہ اسٹار آف انڈیا کے خطاب سے سرفراز ہوں گے -

کی تاریخ کے بجاے سرکاری یونیورسٹیوں کے دستور کے خلاف ایشیا کی تاریخ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس لیے کہ یورپ کی تاریخ کے مقابلے میں اہل ہند کے لیے یہ زیادہ مفید ہے —

ہزار روپیے ان مصنفین و مولفین کی امداد کے لیے حکومت کی طرف سے رکھے گئے تھے جن کی کتابیں سلیس ہندوستانی زبان میں ایسے موضوع پر ہوں گی جو عام طور پر مفید ہوں- ان کتابوں کی طباعت کے لیے ایک ہزار سات سو روپے علحدہ تھے- اس کے علاوہ ہزار روپے کے دو انعام رکھے گئے جو علوم فطرت اور علوم صحیحہ پر بہترین مضمون لکھنے والوں کو دیے جائیں گے —

لاہور کا شعبۂ طب جس کا افتتاح ۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو ہوا یونیورسٹی کالج کا ایک حصہ ہوگا- علم طب کے طلبا اور دیسی اطبا کے لیے یہاں کیمیا، علم الاجسام اور دائی کے کام کی تعلیم دی جاے گی- یہاں درس ہفتہ وار ہوا کریں گے- ایام حمل، زچگی اور بچوں کے متعلق ہندوستانی زبان میں جو رسائل لکھائے گئے ہیں وہ صوبے کے سب سول اسپتالوں میں تقسیم کیے گئے ہیں- اردو میڈیکل گزٹ جو ماہوار نکلتا ہے اس کے نسخے تین سو کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں- مغربی علم طب اور جراحی کے متعلق ایک مستند کتاب اردو میں لکھائی جارہی ہے اور عنقریب شائع ہوجاے گی —

ہندوؤں کے مدارس میں الہ آباد کا "دھرم گیان اپدیش پاٹ شالہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے- یہ مدرسہ جولائی سنہ ۱۸۷۰ ع میں قائم کیا گیا- یہاں ہندی، سنسکرت، ریاضی اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے- انگریزی کی تعلیم پنڈت کاشی ناتھ کے سپرد ہے جو اس کام

کے اهل هیں - ۸ جنوری سنه ۱۸۷۱ ع میں اس مدرسے میں پنڈت هردیودت کے زیر صدارت جلسهٔ تقسیم اسناد منعقد هوا - صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں ان والدین کی خوب خبر لی جو اپنے بچوں کی مذهبی اور ذهنی تعلیم کی مطلق پروا نہیں کرتے - اس کے بعد طلبا نے قدیم مذهبی کتابوں میں سے مناجاتیں پڑھیں جنهیں حاضرین جلسه نے بہت پسند کیا - یه مناجاتیں ایسی هیں که ان کے خلاف کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں هوتا اور ان سے بچوں کی مذهبی تعلیم کا مقصد بدرجه اتم پورا هوجاتا هے * —

مہاراجه کشمیر و جمو نے اپنی ریاست میں ایک کالج قایم کرنے کے لیے ایک لاکھه روپیه دیا هے - اس کے علاوہ اتنی هی رقم دو مدرسوں کے لیے سالانه دینے کا وعدہ کیا هے جہاں پنڈت بخشی رام کی نگرانی میں پانچ سو طلبا کی تعلیم کا انتظام کیا جاے گا تاکه ریاست کے آئندہ عہدہ دار ان مدارس کے تعلیم یافته هوں - ان مدرسوں میں انگریزی اور هندوستانی کے علاوہ قدیم زبانوں کی تعلیم کا انتظام هوگا - سائنٹفک کتابوں کے ترجمے اور طباعت کے لیے ۳۰ هزار روپے کی منظوری دی گئی هے † —

راجکوٹ ( کاتھیاواڑ ) میں راجکماروں کے کالج کا ۱۷ دسمبر سنه ۱۸۷۰ ع کو سر ایس فٹزجیرلڈ گورنر صوبه بمبئی نے افتتاح کیا - افتتاحی رسم نہایت شان و شوکت کے ساتھه منائی گئی - میں سنه ۱۸۷۰ کے مقالے میں اس کے متعلق ذکر کر چکا هوں که کرنل کیٹنگ کو سب سے پہلے اس کالج کے قایم

* علی گڑھ اخبار - مورخه ۱۷ فروری سنه ۱۸۷۱ ع -

† اخبار عالم - مورخه ۲۳ مارچ سنه ۱۸۷۱ ع ( میرٹھه ) -

کرنے کا خیال آیا تھا - اس جلسہ میں مسٹر پیل ناظم تعلیمات صوبہ بمبئی
نے بھی شرکت کی - موصوف اب اپنے عہدے کے فرائض سے سبکدوش ہوچکے
ہیں اور مسٹر چیٹفر مکنا کٹن ان کی جگہہ ناظم تعلیمات مقرر ہوئے ہیں۔
کاٹھیاواڑ کے والیان ملک کے ولیعہد اور دوسرے راجکمار تعلیم و تربیت
کی غرض سے اس کالج میں شریک ہوچکے ہیں - اس کالج کے سرمایہ
میں ابھی حال میں ۴ لاکھہ ۵۰ ہزار فرانک کا مزید اضافہ ہوا ہے * -

'کچھہ' کے راؤ صاحب کا مدت سے ارادہ تھا کہ 'منڈوی' میں ایک
ھائی اسکول قایم کیا جائے - اس کے لیے ڈیوڑھ لاکھہ روپے کی رقم علحدہ
رکھہ دی گئی تھی - حال ہی میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا - راؤ صاحب
نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پانچ ہزار روپے سالانہ اس مدرسہ کی داشت
کے لیے دیں گے تاکہ اس رقم میں سے طلبا کو بھی وظائف دیے جاسکیں
اور طلبا کی ایک مقررہ تعداد کے بہم پہنچنے کا اطمینان ہوسکے † —

مہاراجہ پٹیالہ نے جو ہندوستانی والیان ریاست میں نہایت روشن‌خیال
اور تعلیم یافتہ ہیں' اپنی ریاست میں تعلیم عامہ کو بہت فروغ
دیا ہے - مہاراجہ کے وزیر اعظم خلیفہ سید محمد حسن نے تعلیم کا ایک خاکہ
تیار کیا ہے جس کے مطابق عمل ہورہا ہے - خلیفہ سید محمد حسن کلکتہ
کی ایشیاٹک سوسائٹی کے بھی رکن ہیں - انہوں نے ریاست کے محکمۂ تعلیمات
کے لیے ایک علحدہ وزیر مقرر کیا ہے - پٹیالہ کالج میں ذریعہ تعلیم اردو ہے
اور انگریزی' فارسی' عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے -
ریاست پٹیالہ کے بارہ شہروں میں بھی مدارس قایم کرنے کا حکم ہوچکا ہے -

* انڈین میل مورخہ ۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع -
† علی گڑہ اخبار مورخہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع

ان مدارس میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ وزیر اعظم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ انگریزی' فارسی' عربی اور سنسکرت کی مستند کتب کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے اور مترجموں کو اس کا معاوضہ دیا جائے۔ نیز ان کتابوں کی طباعت کا ریاست کی طرف سے انتظام ہو ۔

مہاراجہ پٹیالہ نے ڈیوک آف اڈنبرا کی تشریف آوری کے موقع پر لاہور کی شرقی جامعہ کے قیام کے لیے ۷۲ ہزار روپے کا عطیہ دیا ہے۔

تعلیم عامہ کے دیسی مدارس میں ضلع مرزا پور کا مدرسہ بھی قابل ذکر ہے۔ گزشتہ فروری کے مہینے میں ایک طالب علم کو عربی کی سند دی گئی ہے۔ سند کے ساتھ دستار بھی دی جاتی ہے۔ یہ دستور اس قسم کا ہے جس طرح ہمارے یہاں "لورئے" کے پھولوں کا تاج پہناتے ہیں * ۔

۲ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع کو سر ولیم 'میور' لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغربی نے 'گورکھپور' میں ایک دربار منعقد کیا جس میں بڑے بڑے امرا نے شرکت کی۔ اس دربار کا مقصد یہ تھا کہ امرا اور زمینداروں کے مادی اور اخلاقی مفاد کے متعلق غور کیا جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے حسب معمول ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی طرف متوجہ ہوں اور حکومت کی حتی الامکان مدد کریں تاکہ بچوں کو مار ڈالنے کی رسم قبیحہ اور دوسری معاشرتی خرابیوں مثلاً شادی کے فضول اخراجات وغیرہ کی اصلاح ممکن ہو۔ موصوف نے کہا کہ ضلع کے امرا کے باہمی تعاون ہی سے یہ ممکن ہوگا کہ شہری زندگی کی آسائش میں اضافہ ہو اور ضلع گورکھپور مرفہ الحالی اور علم کی ترقی

* علی گڑھ اخبار ۲۶ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع۔

میں ملک کے دوسرے حصوں کے دوش بدوش کھڑا ہوسکے* —

سرولیم میور نے ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع بنارس میں ایک اور دربار منعقد کیا جس میں دیسی امرا اور رؤسا نے شرکت کی۔ موصوف نے نہایت سلیس ہندوستانی میں اس موقع پر تقریر کی اور کہا کہ صوبۂ شمال مغربی کو احاطۂ بنگال پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس صوبے میں زراعت پیشہ لوگوں کی ابتدائی تعلیم کا گاؤں میں خاص انتظام کیا گیا ہے - ان ابتدائی مدرسوں میں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں- لیکن صوبۂ شمال مغربی میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے - بلا شبہ شہر بنارس میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں اس لیے کہ یہ شہر صوبے کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اور پھر نسبتاً کلکتہ سے قریب بھی ہے - الہ آباد میں سنٹرل کالج یا یونیورسٹی کالج قایم کرنے کی جو تحریک ہے وہ امید ہے کہ بارآور ہوگی- اس کالج کے قیام کے لیے مہاراجہ بنارس اور دوسرے امرا نے بڑی فیاضی سے عطیات دیے ہیں- یہ بھی تجویز ہے کہ الہ آباد میں ایک طبّی (میڈیکل) کالج بھی قایم کیا جاے جس کے لیے مہاراجہ وزیانگرم نے عطیہ عنایت کیا ہے- جلسے کے اختتام پر سرولیم میور نے ملکۂ معظمہ کی جانب سے دو ہندو عالموں کو اسٹار آف انڈیا کے خطاب عطا کیے- یہ دونوں ہندو عالم راجہ جے کشن داس بہادر اعزازی معتمد مجلس ادبی' علی گڑھ اور بابو شیو پرشاد ہیں- بابو صاحب کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ ہندوستانی کے فصیح شاعر ہیں اور ' وہبی ' تخلص کرتے ہیں —

* علی گڑھ اخبار ۳ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع

ہاتھرس میں ایک جدید مدرسہ کے افتتاح کے موقع پر راجہ جے کشن داس نے ایک نہایت موثر تقریر کی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ راجہ صاحب کی تقریر کے بعد مسٹر ایچ ایم چیز' مجسٹریٹ ضلع' نے نہایت فصیح ہندوستانی میں حاضرین کو خطاب کیا۔ موصوف کی تقریر میں ایسی روانی تھی جیسی کہ کسی اہل زبان کی تقریر میں ہوتی۔ موصوف نے دوران تقریر میں وہی مشرقی تشبیہیں استعمال کیں جو حاضرین کے دلنشین ہوسکتی تھیں اور کہا کہ مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ تعلیم عامہ کو ترقی دینے کے لیے حکومت کی مساعی میں خود اہل ہند شریک ہیں جیسا کہ اس جلسے سے ظاہر ہے۔ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے لوگوں کی اخلاقی بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ جلسہ عبدالرزاق کی نظم پر ختم ہوا * —

سید احمد خان بہادر انگلستان میں دو سال تک رہے۔ ان کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اور جس طرح سب لوگ خوش اخلاقی سے ان سے پیش آئے اس سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے ہیں۔ سید صاحب نے صاف صاف لکھا ہے کہ میری دلی تمنا ہے کہ میرے ہم وطن بھی اخلاق واطوار کے وہ طریقے سیکھیں جو انگریزی قوم میں پائے جاتے ہیں۔ سید صاحب نے اس باب میں جو رائے ظاہر کی ہے اس کے سبب سے ہندوستان میں ان کے بہت سے دشمن ہوگئے ہیں۔ لیکن ایک ہندوستانی مضمون نگار نے میرٹھ کے "اخبار عالم" میں سید صاحب کی تائید کی ہے اور وجاہت علی نے اس اخبار کے مدیر کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی سید صاحب کے خیالات کو سراہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ہندوستانیوں

---

* علیگڑھ اخبار - ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

کو کسی طرح انگریزوں کے مقابلے میں کمتر اور پست نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ایسے بہت سے ہندوستانی موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی انگریزوں سے تعلیم و اخلاق میں کم نہیں ہیں - یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسے ہندوستانیوں کی تعداد بہت محدود ہے حالانکہ انگلستان میں ایسے انگریزوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کی تعلیم اور جن کے اخلاق کا معیار بلند ہے - سید صاحب کے خیالات کی تائید یا تنقید کے ضمن میں ضروری ہے کہ موصوف کے ذاتی تجربے کو پیش نظر رکھا جائے - سید صاحب نے شملہ، کانپور اور امرتسر کے سفر کے دوران میں مقامی انگریز حکام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی - ہر جگہ انگریز حکام نے نہایت خوش خلقی سے سید صاحب کی درخواست کا جواب دیا - لیکن اس کے برخلاف سید صاحب نے اسی طرح کی ملاقات کی درخواست چار دیسی رئیسوں سے کی تو ان میں سے کوئی اخلاق سے پیش نہ آیا - پھر اس کے بعد اور تین سے ملاقات کی درخواست کی - ان میں سے ایک نے اپنے ملازم کے ہاتھ زبانی جواب کہلا بھیجا کہ کل صبح تشریف لائیے - دوسرے نے لکھا کہ فلاں وقت آئیے ورنہ کسی دوسرے وقت ملنا ممکن نہیں - تیسرے صاحب نے جواب دیا کہ دوسرے مشاغل کے باعث ملنا ممکن نہیں ہے —

یہ خط جس کا تجزیہ میں نے یہاں پیش کیا ہے تین کالموں میں ہے - اس پر مدیر نے اپنے تین کالم لکھے ہیں جن میں کم و بیش وہی مضمون پیش کیا گیا ہے - اس مضمون میں ہندوستانی رئیسوں کی خوب خبر لی گئی ہے اور ان کے غرور اور نکتہ چینی کو صاف صاف بیان کیا ہے - ان کا برتاؤ اُن لوگوں سے جو دولت یا معاشرتی رتبے میں ان سے کمتر ہوتے ہیں اچھا نہیں ہوتا، چاہے وہ لوگ علم و فضل اور اپنی نیک اعمالی

کے باعث ان سے بلند تر مرتبہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں - یہی لوگ جو اہل علم و فضل سے ملنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں بجائے اچھوں کی صحبت کے احمقوں اور مسخروں کی صحبت میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اچھوں کی صحبت میں رہیں تو ان کی نصیحتوں اور مشوروں سے مستفید ہوسکیں —

اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ سید احمد خاں نے اپنے ہم مذہبوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بھی ان کی طرح اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان بھیجیں بالخصوص وہ جو متمول ہیں اور معاشرہ میں حیثیت رکھتے ہیں - سید صاحب نے " علیگڑھ اخبار " مورخہ ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع میں ایک مضمون میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر ان کے بچے عیسائیوں کے ساتھ رہیں گے تو کوئی چیز مانع نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے پابند نہ ہوں - اس کے ساتھ ایک خط انہوں نے اپنے صاحب زادے کا بھی نقل کیا ہے - یہ خط اصل میں ہندوستانی زبان ہی میں لکھا گیا ہے ' ترجمہ نہیں ہے - اس خط میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہم لوگ روزہ نماز کی ولایت میں رہ کر بھی پابندی کرسکتے ہیں اور شراب' جوے اور سور کے گوشت سے احتراز کرسکتے ہیں - اس خط میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے مسلمان والدین کو پورا اطمینان ہونا چاہیے کہ ان کے بچوں کا دین ایمان ولایت جانے سے خطرے میں نہیں پڑ جاتا - وہ انگریزوں کی رواداری اور خوش اخلاقی پر بھروسہ کریں تو انہیں اپنے بچوں کو انگلستان بھیجنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے - وہ سید احمد خاں کی آزاد خیالی کا تتبع کرسکتے ہیں جن کی عزت نہ صرف مسلمانوں کے دل میں

ہے بلکہ اہل یورپ بھی ان کا احترام کرتے ھیں —

ہندوستان میں ادبی اور علمی انجمنیں اہل ہند کی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ھیں - بالخصوص ان لوگوں کے لیے یہ انجمنیں بڑی دلچسپی اپنے اندر رکھتی ھیں جو تعلیم یافتہ ھیں - بقول فارسی شاعر کے :

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت وجاہ ومال و منال

کلکتہ میں ابھی حال میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام " اہل ہند کی اصلاح کی انجمن " (انڈین ریفارمیشن سوسائٹی) ہے - اس انجمن کا یہ مقصد ہے کہ اہل حاجت کی امداد کی جائے ، متوسط طبقے کے لوگوں اور غریبوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صنعت و حرفت کی ہر طرح ہمت افزائی کی جائے - تمام تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال ہندوستانی شوق سے اس انجمن کی رکنیت قبول کر رہے ھیں اور اپنے چندے داخل کر رہے ھیں تاکہ انجمن کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں تھوڑی بہت امداد ملے - مغل سرائے کی ادبی مجلس کے سب ارکان اس انجمن میں شریک ہو رہے ھیں - توقع کی جاتی ہے کہ دوسری ادبی اور علمی انجمنوں کے ارکان بھی اس انجمن میں شرکت کریں گے * —

کلکتہ کی مسلمانوں کی مجلس ادبی کے علاوہ جس کی نسبت میں پیشتر متعدد مرتبہ ذکر کر چکا ہوں دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع میں بنارس میں بھی ایک انجمن سید احمد خاں کے مقاصد کے تحت قایم ہوئی ہے جس کا نام " کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان " رکھا گیا

* علیگڑھ اخبار - ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۱ م —

ہے - اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیا مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ جاری رہنا چاہیے - اس کے لیے انجمن کی طرف سے مسلمان مصنفین کے لیے انعام مقرر کیے جائیں گے جو مسلمانوں کے قدیم علوم پر اپنی تحقیقات شائع کریں گے - ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع کے "علی گڑھ اخبار" میں اس انجمن کے قواعد شائع ہوئے ہیں - ارکان کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ سب مسلمان ہوں لیکن وہ انگریز بھی شریک ہوسکیں گے جو مسلمانوں کی علمی اور ادبی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کے متمنی ہیں - اسی اخبار میں ان ارکان کے نام درج ہیں جو اس انجمن کے اب تک رکن بن چکے ہیں - سید احمد خاں اس کے معتمد ہیں - اس اخبار میں ان مضمونوں کی بھی فہرست درج ہے جن کے متعلق انجمن مضامین لکھوانے والی ہے - آئندہ اس اخبار میں انجمن کی کارروائیوں اور جلسوں کی رو داد عام اطلاع کی غرض سے شائع ہوا کرے گی —

۸ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے "علی گڑھ اخبار" میں بنارس کی مذکورہ بالا انجمن کی ذیلی کمیٹی کا اعلان کیا گیا ہے - اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ اردو کی تمام کتابوں کی، چاہے وہ اصل ہوں یا ترجمے ہوں مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ، ایک مضمون واری فہرست تیار کی جائے جس میں مختصر طور پر کتاب اور مصنف یا مترجم کا نام ہوگا - ایسی کتابوں کی علحدہ فہرست تیار کی جائے گی جو دستیاب ہو سکتی ہیں اور ان کی علحدہ جو دستیاب نہیں ہو سکتیں - وہ کتابیں علحدہ رکھی جائیں گی جو یونیورسٹیوں کے امتحانات میں کام آتی ہیں - ذیلی کمیٹی کی تمام کارروائیاں بعد میں انجمن کے عام جلسے میں پیش ہوں گی جو ہر کام کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا - انجمن ان اسباب کی تحقیق کرے

کی جن کے باعث سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کی تعداد کم ہے - اس کے اسباب کی بھی تحقیق کی جائے گی کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کیوں کس مپرسی میں پڑے ہوئے ہیں اور جدید علوم کی طرف انہوں نے اب تک کیوں توجہ نہیں کی ہے - ان موضوعوں پر بہترین مضامین لکھنے والوں کے لیے تین انعام بھی رکھے گئے ہیں - ایک ۵۰۰ روپے کا' ایک ۳۰۰ کا اور ایک ۱۵۰ روپے کا - یہ مضمون هندوستانی زبان میں ہونے چاهیں اور معتمد انجمن کے نام بھیجے جائیں - مضمون نگاروں کے لیے مسلمان ہونا لازمی ہے - ان مضامین کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ ایک خاص کمیٹی کرے گی جو اسی غرض کے لیے مقرر کی جائے گی - ان مضامین میں اصلاح حال کے جو مشورے دیے جائیں گے ان کو انجمن کی ذیلی کمیٹی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی -

لکھنؤ کی انجمن تہذیب بدستور اچھی حالت میں ہے - اس میں بعض نہایت قابل قدر لوگ شریک ہیں - اس کے ارکان میں نواب شجاع الدولہ کے ایک پوتے بھی ہیں جن کا نام مرزا امام علی خان ہے - اس انجمن کے معتمد بابو شیونارائن نے سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۷۰ع انجمن کے ماہوار رسالے میں شائع کی ہے - اس رپورٹ میں ان تمام کارروائیوں کی روداد شامل ہے جو انجمن کے مقاصد کے حصول کے لیے کی گئیں - رپورٹ میں اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ انجمن سنہ ۱۸۶۸ع میں ایک درجن هندوؤں اور مسلمانوں کے تعاون عمل سے وجود میں آئی - انجمن کے ان اصلی بانیوں کے نام بھی درج ہیں - ان میں سے ہر ایک اپنے علم و فضل کے باعث شہرت رکھتا ہے - اس کا پہلا جلسہ ۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ع منعقد ہوا - اس چار سال کے عرصے میں انجمن

نے بہت ترقی کی ہے اور اب اس کی بنیادیں مضبوط ہوگئی ہیں - حکومت نے بھی اس کی مدد کی اور انفرادی طور پر اس کے لیے چندے جمع کیے گئے جن کی بدولت اس کا کام چلتا رہا —

انجمن اپنے اصلاحی خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے تین ذرائع اختیار کرتی ہے - یہ معمولی اور غیر معمولی جلسے منعقد کرتی ہے ' رسالے شائع کرتی ہے اور اپنے کتب خانہ کے ذریعہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے - معتمد نے انجمن کے جلسوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گزشتہ سال ۱۹ موضوعوں پر مقالے پڑھے گئے - ایک مقالے کا عنوان " حقوق انسانی " تھا - یہ عنوان ہندوستانی سے زیادہ امریکی رنگ کا ہے - اس پر بابو رام چندر نے مقالہ پڑھا - ایک دوسرا مقالہ بابو سلن سنگھ نے " ہندوستان کی گزشتہ اور موجودہ حالت " پر پڑھا - مجھے یہ عنوان نسبتاً زیادہ پسند ہے - ایک اور مقالہ مولوی امام اشرف نے " مسلمانوں میں سائنس کی ترقی " پر پڑھا تھا - میں یہاں اُن دوسرے مقالوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو ہم لوگوں کے لیے باعث دلچسپی نہیں ہیں —

" انجمن تہذیب لکھنؤ " کے ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کے جلسے میں مولوی مسیح الدین خان نے انگلستان کی سیاسی قوت پر ایک مضمون پڑھا - موصوف ایک زمانے میں انگلستان میں نواب اودھ کے سفیر تھے - یہ مضمون نہایت مفید اور دلچسپ تھا اور حاضرین نے بہت پسند کیا - مضمون کے ختم ہونے کے بعد صدر جلسہ نے لائق مقرر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کے بادشاہ مطلق العنان ہوا کرتے تھے - چنانچہ جب ہندوستانیوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ انگلستان کی

حکومت نہ شاہی اور نہ جمہوریت ہے اور یہاں کے بادشاہ مروجہ قانون کی خلاف ورزی کے مجاز نہیں ہوتے تو انہیں بڑا تعجب ہوا - انہیں تعجب اس پر تھا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں - مولوی مسیح الدین کے اس مضمون سے لوگوں کو انگلستان کے بادشاہ کی دستوری حیثیت کے متعلق علم ہوگا اور انہیں معلوم ہوگا کہ باوجود محدود ہونے کے اس کے اختیارات بہت وسیع ہیں --

انجمن کے جلسوں میں جو تجاویز منظور ہوئی ہیں اور جن امور پر بحث ہوئی ہے ان کے متعلق معتمد انجمن نے حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے - زیادہ تر یہ امور عام اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تفصیل معتمد کی رپورٹ میں موجود ہے - ہمیں توقع ہے کہ حکومت ان تمام امور پر ہمدردانہ غور کرے گی - ان میں سے چند یہ ہیں - تعلیم عامہ کی سہولتیں ؛ لکھنؤ میں ایک پبلک کتب خانہ کا قیام ' گاؤں میں ڈاکٹروں کا تقرر وغیرہ —

اس کے بعد معتمد نے اپنی رپورٹ میں ان اخبارات کی فہرست درج کی ہے جو انجمن میں آتے ہیں - ان میں ۲۶ ہندوستانی ہیں - بعض روزانہ ' بعض ہفتہ وار اور بعض ماہوار - دس انگریزی کے اخبار آتے ہیں جن میں "دی ہندو پٹریٹ" ( The Hindu Patriot ) ' "دی ونڈ آف انڈیا" ( The Wind of India ) ' اور "دی پایس گزٹ" ( The Pious Gazette ) شامل ہیں - اس کے علاوہ انجمن میں پنجاب ' بریلی ' میرٹھ اور سیتاپور کی علمی اور ادبی انجمنوں کی مطبوعات آتی ہیں - انجمن کو توقع ہے کہ عنقریب ان سب انجمنوں کی مطبوعات جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں حال میں قایم ہوئی ہیں ؛ اس

کے ہاں آنے لگیں گی —

جو اخبار اور رسالے انجمن میں آتے ہیں وہ پہلے انجمن کے دفتر میں کچھ روز رکھے جاتے ہیں پھر اس کے بعد مختلف ارکان کو بھیجدیے جاتے ہیں - ہر اخبار کو کم از کم بارہ اشخاص ضرور پڑھتے ہیں۔ رپورٹ لکھنے کے وقت کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں موجود تھیں جن میں سے تقریباً سو خریدی ہوئی تھیں اور باقی انجمن کو تحفتاً دی گئی تھیں توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب کتب خانے کی کتابوں میں اضافہ ہوگا لوگ کچھ تحفتاً کتابیں دیں گے اور اس کے ساتھ انجمن اپنے ارکان کے چندوں سے اس قابل ہوسکے گی کہ خود بھی کچھ کتابیں خریدے —

بعض لوگ اعتراضاً کہتے ہیں کہ بھلا انجمن قایم کرنے سے کیا فائدہ ہوا - انجمن کے معتمد نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انجمن کی مساعی اور اس کے نتائج کا حال سالانہ رپورٹ سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے نہ اور نتائج تو دراصل آئندہ برآمد ہونے کی توقع ہے جن کی تیاری انجمن کی موجودہ کارروائیوں کے ذریعہ عمل میں آرہی ہے —

انجمن نہایت احتیاط اور دانشمندی سے اپنا کام کر رہی ہے - اگر انجمن کسی معاملے میں انتہا پسندی اختیار کرے گی تو یہ اس کی بڑی غلطی ہوگی - پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ انجمن اپنے ارکان کی شخصی زندگی کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کرے پیشتر اس کے کہ حکومت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے - اس باب میں انجمن اپنے حدود میں رہکر جو کچھ کرسکتی ہے وہ کر رہی ہے اور حکومت اس کے جوش عمل اور خلوص کی پوری طرح قدر کرتی ہے —

بہرنوع ایک ایسی انجمن کا وجود بجائے خود جہاں تھوڑا سا چندہ

دیگر پڑھے لکھے لوگ ' جو علم و ترقی کو عزیز رکھتے ہیں ' آپس میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں ' جلسے منعقد کرسکتے ہیں ' اخبارات سے دنیا کا حال معلوم کرسکتے ہیں - اور کتابوں کے مطالعہ سے اپنے علم میں اضافہ کرسکتے ہیں - یہ انجمن صرف اودھ کے صدر مقام کے لیے ہی باعث برکت نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کے لیے عزت کا موجب ہے - لکھنؤ کی " انجمن تہذیب " کی دیکھا دیکھی سیتا پور اور کانپور میں بھی اسی نوعیت کی انجمنیں قایم ہوگئی ہیں —

اودھ کے ناظم تعلیمات مسٹر کولن براونگ نے جو سالانہ رپورٹ مجھے بھیجی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جبل پور میں تین ادبی اور علمی انجمنیں کام کر رہی ہیں - ادبی انجمن جس میں مباحثے بھی ہوا کرتے ہیں سنہ ۱۸۹۸ ع میں قایم کی گئی تھی - ایک طبی انجمن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبی معلومات کو پھیلایا جائے - اس انجمن میں دیسی ڈاکٹر شریک ہیں - ایک انجمن اشاعت علوم کے لیے ہے جس کے صدر مولوی صفدر علی ہیں جو ایک صاحب شہرت شخص ہیں اور مہتمم تعلیمات ہیں - اس انجمن کے جلسوں میں جو مضامین پڑھے گئے ان کی روداد پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں انجمن کے بیس ارکان نے اردو یا ہندی کی نظمیں پڑھیں —

رائے پور میں بھی ایک انجمن ہے جس کا مقصد مفید معلومات کی نشرواشاعت ہے - صرف اودھ میں لکھنؤ کی " انجمن جلسۂ تہذیب " کے ماسوا تین اور انجمنیں ہیں - ایک گونڈہ میں ' ایک فیض آباد میں اور ایک پرتاب گڑھ میں - گونڈہ والی انجمن کا نام " انجمن رفاہ " ہے - علیگڑھ میں ایک " انجمن اخلاق " قایم کی گئی ہے - اس کے ایک

جلسے میں اس کے معتمد درگا پرشاد نے انجمن کے مقاصد پر بہت دلچسپ مقالہ پڑھا - یہ مقالہ " لکھنؤ اخبار " کی ۳۰ جون سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں شائع ہوا ہے - شاہجہاں پور میں ایک " انجمن اصلاح " ہے جس میں معاشرتی اصلاح کے متعلق تدابیر سوچی جاتی ہیں - کلکتہ کے قریب بارہ نگر میں ایک " انجمن اصلاح معاشرت " قایم کی گئی ہے جس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جو بہت قلیل عرصے کلکتہ میں رہیں اور جن کی مساعی جمیلہ کی نسبت " انڈین اسوسی ایشن " کی اشاعتوں میں آپ کو تفصیلی ذکر ملے گا - ' بے ہولا ' کی انجمن کا نام " Improvement Society " ( انجمن اصلاح و ترقی ) ہے - اعظم گڈھ میں مولوی قربان علی مہتمم مدارس ضلع نے ایک مجلس مباحثہ قایم کی ہے تاکہ عام طور پر لوگ اس میں شرکت کرسکیں - اس میں ادبی اور علمی جلسے منعقد ہوتے ہیں اور اس انجمن کی علحدہ علحدہ خاص کمیٹیاں ہیں - مولوی قربان علی نے جبلپور میں اس سے قبل ایک انجمن کی بنا ڈالی تھی جس کا مقصد معاشرتی اصلاح تھا - یہ انجمن بہت مفید ثابت ہوئی - ہمیں توقع ہے کہ نئی انجمن بھی ترقی کرے گی اس لیے کہ اس کے ارکان میں خلوص اور جوش موجود ہے - انجمن کی ابتدا سے شہر کے ذی وجاہت اور علم دوست حضرات جنہیں علوم و فنون سے کچھہ لگاؤ ہے ' اس میں شرکت کر رہے ہیں - راجہ محمد سلامت خاں اس کے صدر اور مولوی قربان علی جو اس کے بانی بھی ہیں ' معتمد مقرر ہوئے ہیں - انجمن کے پہلے جلسے میں جلسوں کے انعقاد کے متعلق قواعد و ضوابط منظور کئے گئے - پھر اس پر غور کیا گیا کہ جلسوں میں کس قسم کے موضوعوں پر بحث و مباحثہ ہوا کرے -

طے یہ ہوا کہ پہلے تعلیم نسواں کے مسئلہ پر بحث ہونی چاہیے *—

نینی تال کی انجمن اپنی ادبی اور اخلاقی خدمات میں مشغول ہے - گزشتہ اگست کے ایک جلسے میں ایک مسلمان فاضل نے عقد بیوگاں پر ایک مقالہ پڑھا اور اس ضمن میں اسلام میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا بھی ذکر کیا - لیکن مقالہ نگار نے عربی فارسی کے ایسے مغلق الفاظ اپنے مضمون میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر استعمال کیے تھے کہ جلسے کے صدر پنڈت گنگادت نے مقالہ نگار کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرائی کہ آئندہ وہ عام فہم اور سادہ زبان لکھنے کی کوشش کریں - سر ولیم میور بھی اس جلسے میں شریک تھے - انہوں نے جلسے کے آخر میں انجمن کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ وہ آئندہ مزید خدمات کرسکے گی - موصوف نے دوران تقریر میں یہ بھی کہا کہ مقالہ نگار نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ صرف نظریہ کی حد تک نہیں رہنی چاہییں بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے - صدر کی طرح انہوں نے بھی توقع ظاہر کی کہ مقالوں میں ایسی آسان زبان استعمال کرنی چاہیے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آسکے نہ کہ ایسی مشکل زبان جو صرف چند عالم لوگ سمجھ سکیں —

بہار کی ادبی اور علمی انجمن اس غرض کے لیے مظفر پور میں قائم کی گئی ہے کہ اہل ہند میں مغربی تعلیم کی نشر و اشاعت کرے - اس انجمن نے مجھے اپنا اعزازی رکن منتخب کرکے میری عزت فزائی کی ہے - یہ تعلیم مروجہ زبان میں ' جو اس علاقے میں سمجھی جاتی ہے ' دی جائے گی اور ہندوستان کی قدیم زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا - اس انجمن کے ارکان کی تعداد تین سو تک پہنچ چکی ہے -

---

* علیگڑھ اخبار ' مورخہ ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۱ ع -

اس وقت اس کے پاس دس ہزار روپیے کا سرمایہ موجود ہے جو چندوں اور عطیات سے ملا ہے - انجمن کی طرف سے ایک فاضل شخص کو تین سو روپیے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے جس کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ انگریزی زبان سے ہندوستانی میں ایسی کتابوں کا ترجمہ کرے جو طلبہ کے کام کی ہوں - اس انجمن کی پانچ شاخیں ہیں - ایک شاخ مظفر پور میں ہے جس کا نام " انجمن تہذیب " ہے - یہ انجمن بہت اچھا کام کر رہی ہے - اس کی طرف سے ایک کالج قایم ہے جس میں سو کے قریب طلبہ تعلیم پاتے ہیں - اس کالج میں ذریعۂ تعلیم ہندوستانی ہے - عربی فارسی اور یورپین سائنس کے مبادیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے - اس کا بھی اہتمام ہے کہ روز مرہ کی زبان میں مختلف مضامین طلبہ کو پڑھائے جائیں - اس انجمن کا تیسرا سالانہ جلسہ گزشتہ سال ۲۴ مئی کو منعقد ہوا تھا جس سے اس کی زندگی کے چوتھے سال کا آغاز ہوتا ہے - اس جلسے کی وہی تاریخ رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی پیدائش کی تاریخ ہے جب کہ تمام انگریزی علاقوں میں جشن منایا جاتا ہے - اس جلسے میں دو سو سے زائد اشخاص نے شرکت کی - ان میں ریورنڈ چے لانگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - موصوف اہل ہند کے سچے اور پکے دوست ہیں اور پورٹ رویال ( Port-Royal ) کے درویشوں کے بڑے مداحوں میں سے ہیں - * اس موقع پر ہندوستانی زبان میں متعدد تقاریر ہوئیں - انجمن کے معتمد مولوی سید امداد علی نے انجمن کی کار گذاری پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ علم و ادب کی خدمت کرے اور

---

* پورٹ رویال فرانسیسی درویشوں کی مشہور خانقاہ تھی جہاں بعض اہل علم نے ترک دنیا کر کے سکونت اختیار کرلی تھی - پاسکال اور آر نو وغیرہ کی تصانیف یہیں لکھی گئیں - سیاسی وجوہ کی بنا پر سنہ ۱۷۰۵ع میں لوئی چہاردہم کے حکم سے اس خانقاہ کو بند کردیا گیا - (مترجم) —

اس کا اصول اب تک یہ رہا ہے کہ اپنے یہاں کی تقاریر اور تحریروں میں حتی المقدور مذہبی مسائل کو نہ چھیڑا جائے۔ یہی اصول انجمن کے اخبار "اخبارالاخبار" کی اشاعت میں بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

مغل سرائے کی ادبی انجمن معاشرتی مسائل کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں ہے۔ عقد بیوگان، تعدد ازدواج، اور لڑکوں اور لڑکیوں کی فروخت وغیرہ کے متعلق وہ لوگوں میں صحیح خیالات کی نشر و اشاعت کر رہی ہے۔ اس انجمن کے ایک جلسے میں بابو دینا ناتھ نے، جن کے متعلق میں پہلے ذکر کرچکا ہوں، اشاعت تعلیم کے متعلق ایک عالمانہ تقریر کی۔ "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس تقریر کے اقتباسات دس کالموں میں درج ہیں۔ بابو صاحب نے اپنے اہل وطن کو مبارک باد دی کہ ان کی بعض تقاریر اور مقالے ایسے تھے جو اہل یورپ کے معیار سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ یہ بات باعث فخر ہے کہ ان کے درمیان اعلیٰ درجے کے خطیب اور بلند پایہ اخبارات کے مدیر موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ یہ ستارے مغرب کے سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ نہایت ذہین ہوتے ہیں لیکن ابھی انہیں اہل یورپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے جن کی برتری مسلّم ہے۔ اہل ہند کو چاہیے کہ وہ صرف یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کے متمنی نہ ہوں بلکہ انہیں دنیا کے تمام مسائل سے دلچسپی رکھنی چاہیے اور اپنے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں مبلغین مسیحیت کی بابو صاحب نے تعریف کی کہ وہ اہل ہند کو تعلیم دے رہے ہیں اگرچہ ان کے مذہبی عقائد کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کیا۔ وہ طلبا جو ان مسیحی مدارس میں تعلیم پاتے

ہیں ان سے مختلف ہوتے ہیں جو سرکاری مدارس میں پڑھتے ہیں۔ آخرالذکر اکثر ہندو مذہب سے بیزار ہوجاتے ہیں اور تشکیک اور عقلیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ بابو صاحب نے یورپ کے بعض صاحب فکر لوگوں کی طرح طریق امتحانات کی خرابیاں واضح کیں۔ ان امتحانات میں صرف حافظے کی جانچ کی جاتی ہے نہ کہ ذہانت کی۔ طلبا کو جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں ایسے انعام بھی ہونے چاہییں جو اچھے اخلاق و عادات کے لیے دیے جائیں۔ بابو صاحب نے ان ہندوستانیوں کی برائی کی جو انگریزی زبان سیکھنے کے بعد صرف قصے اور ناول پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابو صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اہل ہند کو چاہیے کہ ہر گاؤں اور ہر شہر میں انجمن‌ہاے اصلاح قایم کریں جہاں اخلاقی موضوعوں پر مقالے پڑھے جائیں اور بحث مباحثہ ہو۔ اہل ہند کی بے سوچے سمجھے انگریزوں کی اندھی تقلید کو برا بتایا گیا۔ صرف اس بنا پر انگریزوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ حاکم قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اہل ہند کی روایات سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً شراب اور گوشت کا استعمال ہندوؤں کے مذہب کے بالکل خلاف ہے جو انگریزوں میں پایا جاتا ہے۔ دراصل کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ انگریزوں کی اچھی صفات کی تقلید کی جاے جن کے باعث انھیں فوقیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم پر کتب شائع کی جائیں اور بڑے بڑے لوگوں کے سوانح لکھے جائیں تاکہ ان کی سیرت کی اعلیٰ خد و خال ظاہر ہوں اور زندگی کے مختلف حالات میں دوسروں کے لیے باعث رہبری ہوں —

اسی جلسے میں بابو امبکاچرن چٹرجی نے ایک مقالہ پڑھا جس کی

سب حاضرین نے بہت تعریف کی۔ اس مقالے میں یہ بات ظاہر کی گئی کہ ہندو لوگ بہت مغرور ہیں اور یہی عیب ان کے سماج کی معاشرتی خرابیوں کا اصلی سبب ہے * —

علی گڑھ اخبار' مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۸۷۱ ع میں اخبار پاینر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا پور کے رئیسوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ اس شہر میں ایک انجمن قایم کرنی چاہیے جس میں سیاسی اور علمی مسائل پر بحث مباحثے ہوا کریں۔ مہنت چھ رام گرو نے جلسے کا افتتاح کیا اور پنڈت رادھا کرشن نے اپنی تقریر میں جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انجمن کے قایم ہونے سے اہل شہر کو بہت فائدہ ہوگا۔ یہ انجمن اسی نوعیت کی ہوگی جیسی بنارس' علی گڑھ' شاہجہاں پور اور مراد آباد میں انجمنیں قایم ہوئی ہیں۔ جب پنڈت تقریر ختم کر چکے تو بعض حاضرین نے اس تجویز کی موافقت کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن کا نام "مرزا پور سوسائٹی" رکھا جائے گا۔ پندرہ روز بعد انجمن کا پھر جلسہ منعقد ہوگا جس میں قواعد و ضوابط بنانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی † —

[illegible]ن کی "انجمن فنون" کے گزشتہ مارچ کے جلسے میں مسٹر ہائڈ کلارک نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک "مشرقی کانگریس" قایم کرنی چاہیے جو خاص طور پر ہندوستان کے مسائل سے دلچسپی رکھے اور جس کے جلسے باری باری سے انگلستان کے مختلف بڑے صنعتی شہروں میں منعقد ہوا کریں۔ اس کے جلسوں میں ایسے موضوعوں پر تقریروں اور

---

* علی گڑھ اخبار' مورخہ ۱۰ و ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع —

† علی گڑھ اخبار' مورخہ ۷ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع —

مقالوں کا انتظام ہوگا جن سے ہندوستان کے مادی وسائل کے متعلق معلومات میں اضافہ ہو اور اس ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالت سدھارنے کی تدابیر پیش کی جائیں- علم طبقات الارض' زراعت' علم حیوانات اور لسانیات کے متعلق خاص طور پر مقالے لکھے جائیں گے- مسٹر برنارڈ کواٹرھی نے جو ایک مستشرق ہیں اس تجویز کی پر زور تائید کی اور کہا کہ اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تحقیقات کو ترقی ہوگی - موصوف نے نہایت تفصیل سے ان زبانوں اور خاص کر ہندوستانی سیکھنے کے فوائد بیان کیے - بعض اور دوسرے مقرروں نے نہایت مفید باتیں کہیں اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مجوزہ "مشرقی کانگریس" کو جلد از جلد قایم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے —

بعض مشہور ہندو شادی کے متعلق اُن رسوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے ہم مذہب لوگوں کو فضول خرچی کی عادت پڑتی ہے - ان کی مخالفت سے اب یہ رسوم کم ہو رہی ہیں - ضلع جونپور میں ایک جلسہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو زیر صدارت سر ولیم میور منعقد ہوا تھا جس میں صدر نے ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور شادی کے موقع پر فضول خرچی کی بری رسم کی خرابیاں بیان کیں- صدر کی تقریر کے بعد اسی مضمون کی چند اور تقریریں ہوئیں- ہمیں پوری توقع ہے کہ ان تقریروں کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا اور اس انجمن کے ارکان جن خراب رسوم کو مٹانا چاہتے ہیں وہ بہت جلد ہندو سماج میں باقی نہیں رہیں گی —

کلکتہ میں ایک "زنانہ سوسائٹی" قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبقۂ نسواں میں ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے-

اس انجمن کا ایک جلسہ ۹ جون کو منعقد ہوا تھا - اس میں ان خواتین نے جو اس انجمن کی ارکان ہیں اُن طریقوں پر غور کیا جن پر عمل کرنے سے اُن عورتوں کو تعلیم کے فوائد سے بہرہ ور کیا جاسکے جو پردہ نشین ہیں * —

ان مختلف انجمنوں میں جن کی نسبت میں نے ذکر کیا ہے ' یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں لیکن وہ خاصے پیش پیش نظر آتے ہیں اور اکثر اوقات اس قسم کے جلسوں میں ان کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہوتی ہے - اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ وہ انجمنوں سے پورا فائدہ اٹھائیں اور جدید تہذیب و تمدن میں ترقی کریں —

اس کی ضرورت ہے کہ اہل ہند کی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے ہر طرح ہمت افزائی کی جائے - یورپین لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی ہر طرح امداد کریں - اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۷۰ ع میں 'برسٹل' میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام " ہندوستان کی معاشرتی ترقی کی قومی انجمن " ہے - یہ وہی مقام ہے جہاں ہماری صدی کے سب سے بڑے ہندو مصلح راجہ رام موہن رائے نے انتقال کیا - اس انجمن کا قیام راجہ موہن رائے کے جانشین بابو کیشب چندرسین کے دوران قیام میں عمل میں آیا - اس انجمن کا ایک ماہوار رسالہ یکم جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع سے شائع ہونا شروع ہوا ہے - اس انجمن کی بانی اور روح و رواں مس کارپنٹر نے ازراہ کرم اس رسالے کا ایک نسخہ مسز مکلین کے توسط سے مجھے بھیجا ہے - اس رسالے میں اس امر کی وضاحت کی

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۲۳ جون سنہ ۱۸۷۱ ع

گئی ہے کہ یہ انجمن کن ذرائع سے اہل ہند کی معاشرتی بہتری کرنا چاہتی ہے - چنانچہ اس ضمن میں تین ذرائع پیش کئے گئے ہیں - (۱) اہل ہند میں تعلیم کا رواج بڑھانا اور ان کی اخلاقی زندگی کو سدھارنا - (۲) ہندوستان کے متعلق صحیح حالات انگریزوں کو بتانا اور اس ملک میں ان کی دلچسپی پیدا کرانے کی تدابیر کرنا - (۳) اُن ہندوستانی لوگوں سے تعاون عمل کرنا جو اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں - اس رسالے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کچھہ نہ کچھہ کام کیے جارہی ہے - انجمن نے بمبئی اور کراچی کے مدارس کے لیے ہر قسم کی مفید اشیا بھیجی ہیں تاکہ یورپین چیزوں کے متعلق طلبا کی واقفیت میں اضافہ ہو - ان میں جغرافیہ کے نقشے اور مختلف قسم کی تصاویر شامل ہیں - اس انجمن نے اہل ہند کی اب تک جو خدمت کی ہے اور جو آئندہ اس سے توقعات وابستہ ہیں ان کا اظہار ہندوستان کے مشہور وکیل مسٹر آئی تی پریچرڈ نے اپنی گرشتہ ۱۴ اپریل والی تقریر میں بخوبی کیا تھا - یہ تقریر ایک بہت بڑے جلسے کے روبرو کی گئی - ان کے علاوہ چار مسلمان اور ایک ہندو مقرر نے اپنی تقریروں میں انجمن کی خدمات نہایت تفصیل سے بیان کیں —

اس انجمن کے علاوہ لندن اور ویلز اور شمالی انگلستان کے مختلف شہروں میں اسی قسم کی انجمنیں قایم ہوئی ہیں جن کا مقصد اہل ہند میں تعلیم کو فروغ دینا خاص کر تعلیم نسواں کو بڑھانے کی تدابیر کرنا ہے - اگر اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو اہل ہند کی آئندہ نسلیں روشن خیال ہوجائینگی اور بہت سی رسوم قبیحہ اور توہمات کا خاتمہ ہوجائیگا - بعض انجمنیں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اہل ہند کے لیے ہر قسم کی سہولتیں

بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کریں - اہل ہند کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ اُنہیں اس کا موقع حاصل ہوکہ وہ ہمارے بڑے بڑے تمدنی مرکزوں کی زندگی کا مشاہدہ کریں * - لندن کی انجمن نے اس کا انتظام کیا ہے کہ جو ہندوستانی لوگ اپنے بچوں کو انگلستان تعلیم کی غرض سے بھیجیں انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر آئیں اور ان کی نگرانی کا اہتمام کیا جائے - اس انجمن کا یہ اصول ہے کہ مذہبی معاملات میں بالکل غیرجانبدار رہے گی - انجمن نے جان بوجھکر اس اصول کو اپنا رہنما بنایا ہے اسواسطے کہ اس سے بہت سے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات مل جائیگی اور دنیاوی معاملات میں مذہب کو نہیں داخل کیا جائیگا - نگلستان کی سب انجمنوں کو اس اصول پر عمل کرنا ضروری ہے —

گزشتہ جولائی کے مہینے میں لندن میں ہندوستان کے متعلق دو تقاریر ہوئیں جن میں پروفیسر گولڈاسٹکر کی قایم کی ہوئی مثال پر عمل کیا گیا - ایک تقریر ایس ان بنرجی نے کی جس کا موضوع بنگال کے ہندو سماج کی خرابیوں کے متعلق تھا - دوسری تقریر سر بارٹل فریرنے کی جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی رائے عامہ کی کسطرح تنظیم کی جائے بجائے اس کے کہ اس کی نمائندگی باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ میں کی

* اہل ہند کو یورپ کے سفر میں سہولتیں بہم پہنچانے کے متعلق بابو گردھاری لال نے جو نظام حیدرآباد ( دکن ) کے ایک عہدہ دارہیں ایک تجویز پیش کی ہے جو علیگڑھ اخبار مورخہ ۹ جون سنہ ۱۸۷۱ ع میں تفصیل سے شائع ہوئی ہے - موصوف کا خیال ہے کہ ایک جہاز خاص طور پر ان سہولتوں کا انتظام کرے جو اہل ہند چاہتے ہیں - اس جہاز پر کھانے وغیرہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو بھی اس پر سفر کرنے میں مطلق تامل نہ ہو اور انہیں اپنی ذات کھونے کا اندیشہ نہ رہے —

جائے جیسا کہ اہل ہند کے ہوا خواہوں کی خواہش ہے - اس مسئلے کے متعلق بہت بحث ہوئی - سید محمد محمود نے جو (سر) سید احمد خان کے قابل اور ہونہار فرزند ہیں اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ' اس مسئلے کے متعلق نہایت بصیرت افروز تقریر کی - یہ تقریر انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں شائع ہو چکی ہے - علیگڑھ اخبار مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں پوری تقریر چھپی ہے - سید محمد محمود نے دوران تقریر میں کہا کہ ہندستانیوں کی رائے عامہ کو دیسی اخباروں کی رائے سے نہیں جانچنا چاہیے اس واسطے کہ دیسی اخبار حکومت کے خلاف چوں نہیں کرسکتے - یہ اخبار حکومت پر تنقیدیں اس لیے نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کی مطلق العنانی کے سامنے بالکل بے بس تصور کرتے ہیں - یہ بھی واقعہ ہے کہ حکومت پر تنقید کرنا ایک دشوار کام ہے - چونکہ اہل ہند ابھی یورپین تہذیب و تمدن سے اسقدر بے بہرہ ہیں کہ وہ حکومت کے مسائل اور اس کے کاموں کے متعلق صحیح رائے قایم کرسکیں - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خود حکومت کے لیے یہ بات ناگزیر اور اہم ہے کہ وہ اہل ہند کی رائے عامہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائے کہ عام طور پر اہل ہند حکومت کے کاموں کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں - دراصل اگر انگریز عہدہ داروں کو اس کا علم ہوتا کہ اہل ہند کے خیالات اور احساسات کیا ہیں تو سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کا پہلے سے سد باب کیا جاسکتا اور لوگوں کو بہت سی مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا - اسی طرح اگر اہل ہند کو حکومت کے متعلق صحیح واقفیت ہوتی جو ان کے وا و بست کی مختار ہے تو وہ یقیناً بغاوت نہ کرتے - سید محمد محمود

کا خیال ہے کہ اس وقت ہندوستان کی رائے عامہ روس کے ہندوستان
پر حملہ کی متوقع ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ حملہ ہو اس واسطے
کہ یہ ان مظالم کا انتقام ہو گا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے بعد بپا
کئے گئے - اگر روس کا حملہ ہوا تو یقیناً اہل ہند حملہ آور کا ساتھہ دیں
گے تاکہ ایک آقا کی تابعداری چھوڑ کر دوسرے کے آگے اپنا سر جھکائیں-
اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان امور کے متعلق اہل ہند کو صحیح واقعات
بتائے جائیں اور ان کی توقعات کو غلط ثابت کیا جائے - بد قسمتی سے
حکومت اس کے شور و شغب سے لاعلم ہے یا دیدہ و دانستہ اس کی کچھہ
پروا نہیں کرتی —

ہندوستان کی رائے عامہ کے خیال میں حکومت ہند کے محکمۂ مال
کے انتظامات ناقابل اطمینان ہیں - اس کی وجہ یہ بتائی جاتی
ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو محکمۂ مالیات میں کام کرنے کا موقع
نہیں دیا جاتا —

سید محمد محمود کے کہنے کے مطابق ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو
معلوم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہوگی کہ ضلع واری مجالس قایم کی
جائیں جن میں ان سب لوگوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہونا چاہیے
جو کچھہ تھوڑی بہت ملکیت رکھتے ہیں - ان مجالس کے ذریعہ جن کے
ارکان تعلیم یافتہ ہوں گے حکومت رائے عامہ کا یقین کر سکے گی - یہ ضروری
نہیں کہ ان لوگوں کی تعلیم انگریزی زبان کے توسط سے ہوئی ہو -
ہندوستانی یا صوبوں کی دوسری زبانوں کے ذریعہ سے بھی یہ تعلیم یافتہ
بن سکتے ہیں —

ہندوستان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی جو انجمنیں انگلستان میں

قایم ہورہی ہیں اسی طرح کی انجمنیں ممالک متحدہ امریکہ میں بھی قایم کی جارہی ہیں - چنانچہ ایک انجمن 'بوسٹن' میں قایم ہوئی ہے جس میں نہایت عمدہ تقاریر کا انتظام کیا گیا ہے - اس انجمن میں ان ہندوستانیوں کی تقریریں بھی ہوتی ہیں جنہوں نے برہمو سماج کے اصلاحی خیالات قبول کرلیے ہیں —

برسٹل کی "انڈین ایسوسی ایشن" میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے متعلق خاص طور پر بحث مباحثے ہوتے ہیں - اس انجمن کے ماہواری رسالے کی اپریل کی اشاعت میں بنگال کے مشہور مصلح کیشب چندر سین کی اس تقریر کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں - جو انہوں نے کلکتہ میں گزشتہ فروری میں کی تھی - مقرر نے دوران تقریر میں کہا کہ بنگال میں عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم خود منو شاستر کی رو سے ناجائز ہے - بنگال میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں یہ رسم مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں میں بھی رائج ہوگئی - منوشاستر کے بموجب ہندو عورتوں کو اس کی اجازت ہے کہ وہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جائیں اور ایک دوسرے سے صحبت حاصل کرنے کی کوشش کریں - بابو صاحب نے کہا کہ اس کے لیے تو کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستانی عورتیں پردے میں رہکر تعلیم حاصل کریں - ان کی تعلیم اُن استادنیوں کے سپرد ہوسکتی ہے جنہوں نے نسوانی نارمل اسکولوں میں تعلیم پائی ہے - اس طرح ممکن ہوگا کہ ہندوستانی عورتیں انگریز عورتوں کی طرح اخلاقی اور ادبی ترقی کرسکیں گی اور یورپ کی اعلیٰ اور متوسط سوسائٹی کی عورتوں کے ہم پلہ ہوسکیں گی - عورتوں کی ترقی ہی کے باعث آج انگلستان کو یورپین اقوام میں

اس قدر بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اسی اخبار کی مئی کی اشاعت میں اسی قسم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو ایک دکنی برہمن کا لکھا ہوا ہے جو آج کل انگلستان میں قانون کی تعلیم پا رہا ہے۔ اُس نے بھی کیشب چاندرسین کی طرح عورتوں کی تعلیمی اصلاح اور برہمو سماج کی اصلاحی تحریک کی تائید کی ہے۔ اپنے مضمون میں اس نے بتایا ہے کہ انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے جو ایک زبردست پانی کے دھارے کے مثل ہے ہندو سماج کی تمام غلطیاں صاف ہوجائیں گی۔ یہ جذبات قابل تعریف ہیں اور خود اہل یورپ اس سے بہتر طور پر ان معاملات کو نہیں پیش کرسکتے —

گلاسگو میں اس انجمن کی ایک شاخ موجود ہے جہاں ہندوستان کے مشہور فاضل گوپال چندر رائے نے ان اصلاحات کے متعلق متعدد تقاریر کیں جن کی اشاعت مقصود ہے۔ موصوف نے دعا کے متعلق چند جملے کہے جو یہاں نقل کیے جاتے ہیں :- "اگرچہ یہ سچ ہے کہ مادی عالم میں فطرت کے قابل تغیر قانون نافذ ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی زندگی میں روحانی قوانین کی بھی کارفرمائی ہے۔ روحانی عالم کا انحصار بالاتر قوت پر ہے جسے خدا کہتے ہیں۔ بغیر توفیق الہی کے انسان اپنی بہتری کی تدابیر بھی نہیں کرسکتا۔ انسان کو جو کچھ طاقت اور اختیار ملتا ہے وہ خدا سے مانگنے سے ملتا ہے۔ دن کے بعد رات نہایت پابندی سے آتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس کے طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن روحانی عالم میں مظاہر کی یکسانیت نہیں ملتی اس لئے کہ وہ مادی قوانین سے بالاتر ہے۔ توفیق انسان کے شامل حال اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک اس

کی طلب صادق ہوتی ہے - یہ چیز انسان کو دعا ہی سے مل سکتی ہے۔ ہم چاروں طرف دنیاوی خواہشات کے ناپاک اور پر فریب جال میں پھنسے ہوے ہیں - اس سے ہم اسی وقت بچ سکتے ہیں جب خدا کی مدد شامل ہو - مکروہات دنیوی سے محفوظ رہنے کے لیے ہم قوت کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں ؟ کیا ہم بدی کا مقابلہ خود اپنی قوت سے کرسکتے ہیں ؟ یہ صحیح ہے کہ صرف تعلیم ہی کے ذریعہ سے ہم اپنے جذبات پر قابو پاسکتے ہیں لیکن کیا اس کا بھی امکان ہے کہ مذہبی اصول اور سائنٹفک علوم کے درمیان مطابقت پیدا کردی جائے ؟ ہمیں ضرورت اس کی ہے کہ مذہبی تعلیم کا علحدہ انتظام کیا جاے جس کے ذریعہ ہم خدا کی طرف مائل ہوسکیں اور تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے کے سامنے اپنی نیازمندی کا اظہار کرسکیں - بغیر توفیق الٰہی کے اس کا امکان نہیں نظر آتا کہ ہم ان آندھیوں میں اپنے توازن کو قایم رکھہ سکیں جو ہمارے چاروں طرف چل رہی ہیں - اسی وجہ سے ہماری روحانی بہتری کے لیے دعا ضروری چیز ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم دنیاوی مکروہات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اپنے خالق کے آگے اپنی عبودیت اور شکر کا اظہار کرسکتے ہیں "—

" ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن " کے معتمد دادا بھائی نوروجی گذشتہ جون کے مہینے میں ہندوستان واپس گئے ہیں - موصوف نے بمبئی، احمدآباد، کاٹھیاواڑ اور کچھ کا دورہ کیا تاکہ وہاں کے امرا کو اس انجمن کی رکنیت میں شامل کریں - موصوف انجمن کے کام کو فروغ دینے کے لیے نہایت گرمجوشی کا ثبوت دے رہے ہیں * - اس انجمن کی

* علی گڑھ اخبار - مورخہ ۷ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع -

ہندوستان میں متعدد شاخیں ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس میں شرکت کی ہے - مشہور لوگوں میں جو انجمن کے رکن بنے ہیں نواب صاحب جوناگڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - نواب صاحب نے سالانہ ایک ہزار روپیے چندہ کے علاوہ ۱۵ ہزار روپیے کی رقم بطور عطیہ دی ہے —

بابو کیشب چندر سین کے انگریز احباب اس خیال سے کہ بابو صاحب کلکتہ کے اپنے مندر میں عبادت کے وقت موسیقی کی وہ لے استعمال کرنا چاہتے ہیں جو کلیسا کی بعض دعاؤں میں استعمال کی جاتی ہے، انہیں ایک ارگن باجا بھیج رہے ہیں - برہمو سماج کی چالیسویں سالگرہ پر جو جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع میں ہونے والی ہے، یہ پہلی مرتبہ بجایا جائے گا - برہمو سماج کے جلسوں میں جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں وہ ان دعاؤں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں جو انقلاب فرانس کے وقت لکھی گئی تھیں جن میں خدا کا تخیل بغیر مذہبی عقائد کے پیش کیا گیا تھا برہمو سماج کی دعائیں مختلف مذہبوں سے ماخوذ ہیں - ان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں کے مذہبی خیالات کے اجزا ملتے ہیں —

۲۸ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع برہمو سماج کے پیرووں نے اپنی مذہبی جماعت کے قایم ہونے کی کلکتہ میں ۴۱ ویں سالگرہ منائی - اس روز اس جماعت کے ہزاروں ارکان نے کلکتہ کی سڑکوں پر ہاتھوں میں جھنڈے لیے جلوس نکالے - جلوس کے وقت وہ اپنی دعائیں پڑھتے جاتے تھے - دوسرے روز وہ سب اپنے مندر میں جمع ہوئے اور ان کے امام نے ان کے روبرو تقریر کی - تقریر اور دعاؤں کے بعد، بقول اخبار "انڈین مرر" (Indian Mirror) جو غالباً برہمو سماج کے مقاصد کا ترجمان ہے، سارے مجمع میں ایک

خاص روحانی کیفیت کارفرما تھی اور شرکا کے دل جوش مذہبی سے مملو تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا محبت خداوندی سے ان کے دل معمور ہوگئے ہیں اور بہت سے گناہ گار اپنے گناہوں کے جنجال سے چھٹکارا پا کر نیک راستہ اختیار کر لیں گے * —

راجہ کالی کرشن بہادر نے برہمو سماج کے ارکان کو دعوت دی تھی کہ وہ درگا پوجا کے موقع پر اس کے یہاں آکر جشن و رقص کی محفل میں شریک ہوں - لیکن ان لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ صرف نظری حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عملاً اس قسم کی محفلوں کو خلاف اخلاق تصور کرتے ہیں اور بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں شرکت گوارا نہیں کی † -

شادی کے موقع پر جو بے جا اسراف ہندوؤں میں کیا جاتا ہے اس کے خلاف تحریک زور شور سے جاری ہے - لالہ پیارے لال نے کایستھوں کی معاشرتی انجمن کی جانب سے ان قواعد کا تعین کر دیا ہے جو لاہور سے لے کر کلکتہ تک سب کایستھوں کے لیے واجب العمل ہوں گے - ان قواعد میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ دعوتیں وغیرہ کس طرح اور کتنے خرچ کے اندر ہونی چاہییں - اسی موضوع کے متعلق مغل سرائے کی "ادبی انجمن" نے ایک رسالہ اردو میں شائع کیا ہے - ۵ مئی کو انجمن کا جو جلسہ منعقد ہوا اس میں اس اردو رسالے کا ہندی ترجمہ پڑھا گیا - اسی جلسے میں ایک اور اردو رسالہ پڑھا گیا جو بنارس کی ادبی انجمن کی طرف سے شائع ہوا ہے جس کے مقاصد

* انڈین میل - ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع -

† انڈین میل - ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

میں معاشرتی اصلاح بھی شامل ہے * —

ہندوستان میں عقد بیوگان کی تحریک جاری ہے - اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندو بیواؤں کو نذر آتش کرنے کے بجائے زندہ رہنے دیا جائے اور دائمی عبادت و توبہ کی زندگی کے بجائے انہیں دنیاوی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے - برہمو سماج کے ارکان خاص طور پر اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں - مغل سرائے کی انجمن بھی اس تحریک میں دلچسپی لے رہی ہے - بنارس کے ایک مشہور شخص ٹھاکرسی دیوجی نے وعدہ کیا ہے کہ برہمن اور بھاٹ لوگوں کی بیواؤں کے عقد ثانی کے کل اخراجات اپنے پاس سے ادا کریں گے —

" نیشنل انڈین ایسوسی ایشن " کے اخبار کی ستمبر کی اشاعت میں ایک صنعتی اسکول کے قیام کے متعلق تفصیلات درج ہیں - یہ اسکول جبل پور میں حکومت کی طرف سے قایم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ٹھگوں کے بچوں کو دستکاری سکھانے کا انتظام کیا جائے - ٹھگ لوگ راہگیروں کو لوٹتے کھسوٹتے اور انہیں قتل کر دیا کرتے تھے - انگریزی حکومت نے ان کا استیصال کر دیا - ان کے جو بچے باقی رہ گئے ہیں رحم و کرم کے مستحق ہیں - اس مدرسے میں انہیں اپنے ہاتھ سے کسب کرنے کی تعلیم دی جائیگی تاکہ وہ اپنے باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ دیں اور پرامن شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھیں —

مذہبی اصلاح کے خیالات سب ہندوستانیوں نے ابھی تک قبول نہیں کئے ہیں - بعض ہندو امراء کو لندن اور نیویارک میں اپنے مندر قایم کرنے کا خیال دامنگیر ہے - چنانچہ بمبئی گزٹ کی روایت کے بموجب

* علیگڑھ اخبار - ۵ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع -

ہندو امراء کا ایک جلسہ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع میں جونا گڑھ میں ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ چندے کے ذریعہ رقم جمع کی جائے تاکہ ان ہندو طلبہ کی امداد اور ہمت افزائی ہوسکے جو تعلیمی اغراض کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہیں - اس کے ساتھ لندن میں ایک مندر تعمیر کرایا جائے جو ہری ( وشنو) اور مہادیو ( شیوا ) کے نام پر وقف ہو تاکہ قدیم ہندو دیومالا کے دونوں خداؤں کے معتقد تمند مطمئن ہوں اور انہیں شکایت کا موقع نہ رہے - اس مندر کے لیے ایک لاکھ روپیے کی رقم علحدہ رکھدی جائے گی - اس مندر میں شیوا اور وشنو دونوں کے بت ہوں گے - اس طرح ہندو نوجوان اپنے نئے ماحول میں بھی مذہبی عقاید پر عمل کرسکیں گے * —

جیسا کہ عام طور پر یورپ میں خیال کیا جاتا ہے اہل ہند کے لیے یہ بات اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ ہندو مصلحین کی تعلیم پر عمل پیرا ہوسکیں - ذات باہر ہونے کے خطرے سے لوگوں کو نئے خیالات قبول کرنے میں بہت تامل ہوتا ہے - بمبئی کے ایک جج نے جو ذات سے برہمن تھا کیشب چندر سین کے خیالات قبول کرلیے تھے - اس سال جو اُس کا حشر ہوا وہ ایک بڑی دردناک مثال ہے - اس جج کی بیوی مرچکی تھی اور وہ کئی بچوں کا باپ تھا - اُسنے ایک نوجوان بیوہ سے شادی کرلی - اس شادی کے بعد اس کے ذات والوں نے اس کو سخت تکلیفیں دینا شروع کیں اس لیے کہ اس نے اُن کے تعصبات کے خلاف آزادی رائے سے عمل کیا - حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ بیچارہ اپنی زندگی سے تنگ آگیا - اس کی پہلی بیوی کے بیٹے نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا تاکہ

* Allen's Indian Mail - مورخہ ۲۹ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

قانوناً وہ اس کی بیوی اور اُس کا بچہ جو اس دوسری بیوی سے تھا ' ذات باہر کردیے جائیں - یہ بیچارہ ان سب باتوں سے مجبور ہو گیا اور اپنی ذات والوں کے ہاتھوں زچ ہوگیا - اس بدقسمت ہندو کے فلسفۂ حیات نے اس کو دھوکا دیا - اس نے بالآخر خود کشی کا عزم بالجزم کرلیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ خود کشی کرلے - گزشتہ سال ۱۰ فروری دونوں اپنے گھر کے کنوے میں کود پڑے - دونوں کی نعشیں اس کنوے سے برآمد ہوئیں ان دونوں نے اپنی ذات والوں کے تعصب کی وجہ سے اپنی جان دے دی * —

بابو سیود بانرجی نے جو ' بڑا نگر ' کی معاشرتی انجمن کے معتمد ہیں' اسی قسم کے حالات میں صبر و استقامت سے کام لیا - موصوف نے بت پرستی ترک کردی ہے اس لیے ذات والوں نے انھیں ذات باہر کردیا - اس کے والدین اور احباب نے تعلقات منقطع کرلیے - اس کے گھر کے دروازے اس کے لیے بند کردیے گئے اور دو دن تک اسے اور اس کی بیوی کو فاقہ کرنا پڑا - ہر قسم کی مصائب برداشت کیں - اس کے صبر اور استقلال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ عرصے بعد وہی لوگ جو اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے اس کے ہم خیال بن گئے † —

اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو لوگوں میں مذہبی تعصب ابھی تک موجود ہے - یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہندو لوگ گائے ( اور ایک حد تک بیل ) کو مقدس خیال کرتے ہیں - اگرچہ

* ڈیلی ٹیلیگراف ۲۹ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع —

† جرنل آف دی انتین ایسوسی ایشن - مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع —

انگریز لوگ اور مسلمان عام طور پر گاے کا گوشت کھاتے ھیں لیکن اس کا ھندوستان میں انتظام کیا گیا ھے کہ گاے کو عام شاھراھوں پر ذبح نہ کیا جاے اور اس کے گوشت کو کھلا نہ رکھا جاے تاکہ ھندو لوگوں کی اس پر نظر نہ پڑے۔ لیکن معلوم ھوتا ھے پچھلے دنوں پنجاب میں اس قسم کی احتیاط نہیں کی گئی۔ سکھوں کے ایک فرقے کو جسے کوکا کہتے ھیں یہ بات ناگوار گذری اور انھوں نے کئی قصائیوں کو قتل کر ڈالا۔ حکومت کی مداخلت سے فساد رفع کیا گیا اور کئی ملزم گرفتار کیے گئے۔ 'کوکا' لوگوں کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ھے۔ ان کے گرو کا نام رام سنگھ ھے جس کی وہ بلا چون و چرا اطاعت کرتے ھیں۔ ان کا مطالبہ یہ ھے کہ امرتسر میں گاے ذبح کرنا موقوف کردیا جاے۔ تاکہ پھر ان سے جھگڑا نہ ھو۔ حکومت کو اس کے متعلق کچھ انتظام کرنا ھوگا * —

ھندوؤں کی ترقی پسند جماعت برھمو سماج جس کے لیڈر کیشب چندر سین ھیں حکومت سے یہ مطالبہ کر رھی ھے کہ اس کے اراکین کو اپنے اصلاحی خیالات کے مطابق شادی کی اجازت دی جائے۔ یہ لوگ سول شادی کے قائل ھیں جو ان تمام ملکوں میں رائج ھے جہاں عقائد کی آزادی موجود ھے۔ چنانچہ اس باب میں ایک مسودۂ قانون تیار کیا گیا ھے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا تعجب ھوتا ھے کہ ان مصلحین کی قدیم شاخ جس کے سر براہ بابو رابندرا ناتھ ٹیگور ھیں' سول شادی کی مخالف ھے۔ وہ ھندوؤں کی قدیم طرز کی مذھبی شادی کی تائید میں ھے اگرچہ ھندوؤں کے دوسرے عقائد میں یہ جماعت بھی یقین نہیں

* Allens Indian Mail - مورخہ ۱۲ و ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۷۱

رکھتی - اس مسئلے پر برہمو سماج کی دونوں شاخوں میں اختلاف رائے اور نااتفاقی پیدا ہوگئی ہے —

ہندوستان کے لیے یہ ایک زبردست انقلاب ہوگا اگر یہ ملک انگریزی اثر سے مسیحیت کو قبول کرلے - انگلستان ایک مسیحی ملک ہے اور اس کا دعویٰ بھی ہے کہ وہ مسیحیت کی نشر و اشاعت میں کوشاں ہے - لیکن اگر ہندوستان مسیحیت قبول کرے گا تو اس کے لیے وقت درکار ہے - اگر واقعی مسیحیت حقیقی معنوں میں اہل ہند کی زندگی میں تبدیلی کرے گی تو یہ بتدریج ہی ممکن ہوگا - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسیحی مبلغین سعی و جہد میں منہمک ہیں - وہ اپنا مستحسن کام کیے جارہے ہیں اگرچہ انگلستان کی وزارت نے نہ صرف اُن کی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ کھلم کھلا ان سے مخالفت کا اظہار کیا ہے * —

لدھیانہ کے امریکی مسیحی مشن کی طرف سے متعدد ہندی کے رسالے شائع کیے گئے ہیں - ان میں سے اکثر ریورنڈ ای ڈبلو وھیری ' ریورنڈ ایس ایچ کلوگ اور ڈاکٹر ولسن کے لکھے ہوئے ہیں - اسی مشن نے سات ہندوستانی زبانوں میں کتابیں شائع کی ہیں —

جنوبی بنگال کے "امریکن فری بپٹسٹ مشن" کی رپورٹ جو مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع میں شائع ہوئی ہے ہر طرح قابل اطمینان معلوم ہوتی ہے - دیسی عیسائیوں نے ' جن میں سے اکثر سنتالون پر مشتمل ہیں ' ایک کلیسا عبادت کے لیے اپنے آپ تعمیر کیا ہے - اس مشن کے مدارس میں سات سو سے زائد طلبہ تعلیم پا رہے ہیں † —

* انڈین میل - ۱۹ اور ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -
† Allen's Indian Mail مورخہ ۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع -

کلیسائے ویلز کی خواهش هے که مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں هندوستان میں کچھ حصه لے - بریشن کے اسقف' ریورنڈ ڈاکٹر فوربس اور اس کے بھائی ریورنڈ جی ایچ فوربس اس کلیسا کے زمرے میں شامل هیں - یه دونوں بھائی اپنی قابل قدر تصانیف کی بدولت ادبی اور مذهبی حلقوں میں بہت عرصے سے شہرت رکھتے هیں - اس کلیسا نے اپنا ایک مشن هندوستان میں 'چندا' کے مقام پر قائم کیا هے اور عنقریب دوسرے مقامات پر بھی اس کی شاخیں قایم هوجائیں گی - کلکته کے اسقف ریورنڈ آرملیین نے بجائے مخالفت کے کلیسائے ویلز کے مشن کی هر طرح همت افزائی کی هے —

"کرسچین ورنا کلر ایجو کیشن سوسائٹی" سنه ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد قائم کی گئی تھی - اس کی تیسری رپورٹ میرے پیش نظر هے - اس انجمن نے ۲۰ هزار پونڈ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کتابیں چھپوانے پر صرف کیے هیں - یه کتابیں هندوستان کی مختلف زبانوں میں' جو ۱۸ کروڑ اهل هند بولتے هیں' طبع هوئی هیں - ان کتابوں کے نسخوں کی تعداد تیس لاکھ هے - یه کتابیں کولمبو تک بھیجی جاتی هیں - اس انجمن کے اس وقت ۱۱۷ مدارس چل رهے هیں جن میں ۴۲۲۰ طلبا تعلیم پا رهے هیں - ان مدارس میں عیسائی مدرس دنیاوی اور مذهبی تعلیم دیتے هیں —

"انجمن اشاعت انجیل" کی بمبئی کی شاخ کا سالانه جلسه ۲۱ دسمبر سنه ۱۸۷۰ ع بمقام ٹاؤن هال منعقد هوا - جلسے کی صدارت ریورنڈ ایچ اے ڈگلس نے کی جو بمبئی کے اسقف هیں - اس جلسے میں مسٹر پلنٹ نے جو انجمن کے معتمد هیں اپنی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

اس رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ احاطۂ بمبئی میں مسیحیت کی تبلیغ قابل اطمینان رہی ہے اور اس علاقے میں آئندہ اینگلی کن کلیسا کی ترقی کے اور زیادہ امکانات ہیں —

جرمن مبلغین بھی مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں منہمک ہیں - ان کا سرگروہ برلن کا مبلغ 'گوسنر' ہے - اس نے 'کول' لوگوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی ہے - 'کول' لوگ چھوٹا ناگپور کے علاقوں میں آباد ہیں - اس وقت اس علاقے میں تقریباً ۱۴ ہزار عیسائی اس شخص کی مساعی کی بدولت موجود ہیں - چونکہ جرمن مبلغین کا تعلق حاکم قوم سے نہیں ہے اس واسطے غالباً دیسی لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں —

ایسا معلوم ہوتا ہے مشرق کے ایک حصے میں روس خدا کی طرف سے بھیجا گیا - تاتار اور چین میں روسی مبلغین جو نہایت پر جوش ہیں مسیحیت کی تبلیغ کر رہے ہیں - بعض روسی مبلغ ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں —

رومن کیتھولک مشن ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں - ان کی کامیابی کا حال جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہو رہی ہے "حالات تبلیغ مذہب" سے معلوم ہوا - سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس مشن کے مبلغین نے کراچی میں ایک پارسی کو مسیحی زمرے میں شامل کیا یہ نوجوان غالباً پہلا شخص ہے جو پارسیوں کی ملت میں سے مسیحی حلقے میں داخل ہوا* —

* انڈین میل - ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء —

مسٹر جان مردوش نے اپنے رسالے " ہندوستان میں مسیحی ادب پر تبصرہ " میں تفصیل سے ان مذہبی کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے جو مبلغین مسیحیت نے سنہ ۱۸۷۰ ع میں ہندوستان میں شائع کی ہیں - سنہ ۱۸۷۰ ع میں صرف مظفرپور کے جرمن مشن نے ۴٫۲۹۰ نسخے ہندی رسائل کے اور ۳۵۰۴ نسخے اردو کے شائع کئے - مرزا پور میں بھی اشاعت کی رفتار خاصی تیز رہی - الہ آباد میں ریورنڈ جے جے والش اردو زبان میں "خزینہ مسیحیت" بدستور شائع کر رہے ہیں - اس ماہوار رسالے کی زبان اردو ہوتی ہے لیکن اس کا رسم خط رومن ہوتا ہے تاکہ دیسی عیسائی لوگ اسے بہ سہولت پڑھ سکیں —

" میتھوڈسٹ امریکن مشن " نے مسیحی ہندوستانی ادب کی متعدد کتب شائع کی ہیں - اس سال سات نئی کتابیں ہندوستانی زبان کی شائع ہوئیں اور چار ہندوستانی کتابوں کو دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی - جب سے یہ مشن ہندوستان میں قایم ہوا ہے ' جسے بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا ' اس نے اردو اور ہندی میں ۹۰ مطبوعات شائع کی ہیں - اس مشن کے دو اردو کے رسالے نکلتے ہیں جن میں سے ایک ماہوار ہے اور دوسرا مہینے میں دو مرتبہ نکلتا ہے —

علوم مسیحی کی ترقی کے لیے جو انجمن ہندوستان میں کام کر رہی ہے اس کی شاخیں تین پریسی ڈنسیوں میں موجود ہیں - اس انجمن نے جو خاص کتاب شائع کی ہے وہ " Common Prayer Book " کا اردو اور ہندی ترجمہ ہے - اس کے علاوہ انجمن نے صرف مدراس میں ہندوستانی زبان کی کتابیں اور رسالے پانچ سو کی تعداد میں شائع کیے ہیں - ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا مفید کام اور دوسری

انجمنیں بھی انجام دے رہی ہیں - لاہور کے " ڈونیٹی اسکول " کے متعلق میں گزشتہ سال اپنے مقالے میں ذکر کرچکا ہوں - اس اسکول کے بانی ریورنڈ جے ڈبلو ناپ تھے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوگیا - ان کے ساتھ اس کام میں ریورنڈ جے ڈبلو فرنچ اور ریورنڈ آر کلارک بھی شریک تھے - ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے غلط عقاید کی انجیل مقدس کی تعلیم سے تکذیب کریں - اس مدرسے کے فارغ التحصیل انجیل مقدس اور اس کی تفاسیر کے مطالعہ ' مسیحیت کے خلاف جو تحریریں ہیں ان کے رد اور ان قدیم زبانوں کی تحقیق سے جن میں یہ تحریریں لکھی گئی ہیں ' مسیحی حقائق کو اجاگر کرسکیں گے - اس ادارے کو جدید اصول پر چلایا جائے گا - یہاں کے طلبا غریب ہندوستانی طلبا کی طرح سے زندگی بسر کریں گے - کسی قسم کی مغربی نمود و نمایش نام کو نہ ہوگی - ان طلبا کا فرض ہوگا کہ دیسی لوگوں کی زبانیں سیکھیں اور ان کے رسوم و عادات اختیار کریں تاکہ ان میں کام کرسکیں - وہ سب کے سب سینٹ پال کے نمونے کو اپنے سامنے رکھیں گے تاکہ دوسروں کو مسیحی زمرے میں شامل کرکے ان کی ارواح کو نجات کا راستہ بتائیں - وہ سینٹ پیٹر کی طرح حکیم ہوں گے جب کہ اس نے "کورنٹی" کو اس کی اجازت تک نہ دی کہ اس کے سامنے جھکے - جو لوگ ان کے دین میں شامل ہوجائیں گے چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہوں وہ ان کے بھائی بن جائیں گے —

فیروزپور کے بابو مایاداس کے عیسائی ہونے سے لوگوں میں سنسنی پیدا ہوگئی ہے - بابو صاحب کا اس شہر کے ذی وجاہت لوگوں میں شمار ہوتا ہے جن کی ہر چھوٹا بڑا عزت کرتا تھا - اس ضمن یہ بات

قابل لحاظ ہے کہ کسی مسیحی مبلغ کے توسط سے بابو صاحب نے مسیحی مذہب نہیں قبول کیا بلکہ خود اپنے ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے انہوں نے اس مذہب کی حقانیت کو پہچانا - اگرچہ بابو صاحب کے بعض ہم وطنوں نے انہیں عیسائی ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن موصوف نے انہیں اپنے مذہب بدلنے کی وجوہ اچھی طرح سمجھا دیں —

لکھنؤ کی قدیم برھمو سماج جماعت کے تین ممتاز ارکان نے مسیحیت کی تعلیم قبول کرلی ہے - ان میں بابو چندر سین قابل ذکر ہیں جن کے نام کو بابو کیشب چندر سین مصلح برھمو سماج کے نام کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے - بابو چندرسین نے 'وزلی' کے پروٹسٹنٹ مسلک کو اختیار کیا ہے —

مخلص عیسائیوں کو یہ سنکر خوشی ہونی چاہیے کہ ایشیا اور افریقہ میں عیسائی مذہب کو خوب فروغ حاصل ہورہا ہے - اس کے ساتھہ انہیں یہ بات دیکھہ کر دکھہ ہونا چاہیے کہ مسیحی تعلیم کا اثر خود یورپ میں دن بدن کم ہوتا جاتا ہے - یورپ میں جسے " علم مذہب " کہا جاتا ہے وہ " علم لا مذہبی " کے مترادف ہے - یہ " علم مذہب " ( Science of Religion ) ایمان کا دشمن ہے اور گزشتہ صدی کے نظری اصول اور مضحکہ خیز بے اعتقادی کے ساتھہ موجودہ صدی کی تشکیک سے اس کی ساخت ہوئی ہے - اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک مذہب کی ترقی ہورہی ہے اور اس پر جو حملے ہوتے ہیں وہ ان سے اپنا بچاؤ کرلیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اندر ہی اندر گھن لگنا شروع ہوگیا ہے — خوشی کی بات ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو ان تمام باتوں کا علم نہیں ہے - پس ہمیں خواہش کرنے دو کہ وہ مسیحیت کے سچے مذہب کو

قبول کریں گے اور اس راستے میں داخل ہوں گے جو دنیاوی طوفانوں سے بچنے اور نجات کی طرف سے جانے والا ہے —

جس طرح زندگی کا انجام موت ہے اسی طرح میں اپنے تبصرے کو ان بزرگوں کی موت کے ذکر پر ختم کرتا ہوں جو گزشتہ سال اس دنیا سے گذر گئے —

سب سے پہلے میں الگزنڈر کاظم بے کے انتقال پر ملال کا ذکر کروں گا۔ وہ روس کے نہایت ممتاز باشندوں میں تھے اور علمی دنیا میں ان کی شہرت تھی۔ اگرچہ انہیں ہندوستانی زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایک علم دوست مستشرق کی حیثیت سے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے تاتاری زبانوں پر اپنی تحقیقات شائع کیں جن کے متعلق فرانس میں موسیو پاوے دے کورتئی کام کر رہے ہیں جو مشہور مستشرق سلوستر دے ساسی کے پوتے ہیں۔ الگزنڈر کاظم بے اسلامی ہند کی کلاسکی السنہ یعنی عربی اور فارسی اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ میں ذیل میں مرحوم کی زندگی کے حالات لکھتا ہوں جو ان کے فرزند سے مجھے حاصل ہوئے ہیں۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کس قدر مشغول رہی۔ سرکاری ملازمت، مختلف اکاڈمیوں کی رکنیت، شاہی نوازشیں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا —

مرزا کاظم بے 'دربند' کے ایک اعلیٰ خاندان کے رکن تھے۔ وہ ایک فاضل اور پارسا شخص تھے۔ گزشتہ صدی کے آخری ایام میں قاف کے علاقوں میں جو شورشیں ہوئیں ان کے باعث وہ ترک وطن کر کے مکہ چلے گئے اور پھر وہاں سے مدینہ پہنچے۔ بالآخر ایران میں 'رشت' کے

مقام پر سکونت پذیر ہوئے جہاں انہوں نے ایک خاتون سے شادی کرلی۔ سنہ ۱۸۰۲ ء میں ان کے ہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام محمد علی بیگ رکھا۔ سنہ ۱۸۰۸ ع میں وہ تنہا 'قاف' آے اور بیوی بچے کو ایران ہی میں رہنے دیا۔ جب وہ شیخ الاسلام مقرر ہوگئے اور 'دربند' میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تو اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی ایران سے قاف بلا لیا۔ کچھ عرصے بعد ان کے دشمنوں نے حکومت روس کو ان سے بد ظن کردیا۔ ان پر انقلابی رجحانات کا الزام قایم کیا گیا اور مقدمہ چلایا گیا۔ ان کا سارا مال اسباب اور ملک بحق سرکار ضبط کرلی گئی اور انہیں 'استرا خان' جلا وطن کردیا گیا۔ یہ واقعات سنہ ۱۸۷۰ ع میں گذرے۔ اگلے سال ان کا بیٹا بھی ان کے پاس 'استرا خان' آگیا۔ اس کی عمر اس وقت ۱۸ سال تھی۔ اس کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی تھی اور اس نے قرآن حفظ کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ فقہ اور عربی' فارسی اور ترکی ادب کی واقفیت بھی بہم پہنچائی تھی۔ اتفاق سے استرا خان میں اس کی ملاقات اسکاٹ لینڈ کے مبلغین مسیحیت سے ہوئی جنہوں نے اس کو ترکی اور عربی پڑھانے کی ترغیب دی۔ وہ انہیں عربی اور ترکی سکھانے پر آمادہ ہوگیا بشرطیکہ وہ اس کو انگریزی پڑھائیں۔ اس طرح اس کا تعلق مبلغین مسیحیت سے قایم ہوگیا۔ چونکہ وہ ایک جوشیلا نوجوان مسلمان تھا اس لیے حتی المقدور وہ ان مشنریوں سے مذہبی بحث مباحثہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ مسیحیت کے مقابلے میں مذہب اسلام کی فوقیت ثابت کرے۔ چنانچہ اس خواہش کے تحت اس نے انجیل کا مطالعہ شروع کیا۔ انجیل کی تعلیم سے واقف ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے اسلامی عقاید کمزور

ہونا شروع ہوگئے اور حقیقت کی چبھن اس کے دل میں رہنے لگی۔ بالآخر وہ مسیحیت کے زمرے میں شامل ہوگیا۔ اس کے باپ نے ہر چند کوشش کی کہ وہ مذہب اسلام کو ترک نہ کرے لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اس کے باپ نے اس سے ترک تعلق کرلیا اور مرتے وقت اس کو معاف کیا۔ اس کے عزیز و اقارب نے بھی اس کو طرح طرح سے ستایا اور دھمکیاں دیں لیکن وہ مسیحیت کے جدید عقاید پر قایم رہا۔ اسکاتلینڈ کے مشنری نے اسے بپتسما دیا اور اس کا نام مرزا الکزنڈر کاظم بیگ تجویز کیا۔ بپتسمے کی رسم ایک بڑے جلسے میں ۲۹ جون سنہ ۱۸۲۳ع کو منائی گئی۔ الکزنڈر کاظم بیگ کا خیال پہلے مبلغ مذہب بننے کا تھا لیکن اس کو یہ خیال بہت جلد ترک کرنا پڑا اسواسطے کہ روسی حکومت نے اس کے پاس احکام روانہ کیے کہ ایک امیر زادہ اور روسی رعایا کی حیثیت سے اس کو کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس پر اس نے حکومت سے درخواست کی کہ اسے وزارت امور خارجہ میں کچھ کام دیا جائے تو مناسب ہے اس لیے کہ وہ ترجمانی کے فرائض بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ لیکن امسک (سائبیریا) کے مدرسۂ شرقیہ میں استاد کی حیثیت سے اس کا تقرر کیا گیا۔ جب وہ امسک جا رہا تھا تو راستے میں 'کازان' میں سخت بیمار ہوگیا۔ جب وہ اچھا ہوا تو 'کازان' میں اس کے بعض قدردانوں نے اس سے وہیں کی جامعہ میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ وہ کازان کی جامعہ میں مشرقی زبانوں کا استاد مقرر ہوگیا اور کچھ عرصے بعد ادبی شعبہ کا صدر ہوگیا۔ سنہ ۱۸۵۰ع میں سینٹ پیٹرس برگ بلالیا گیا اور امپیریل اکاڈمی کا اسے رکن بنا دیا گیا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے شعبۂ ادبی کا صدر اور مشیر خصوصی کے عہدے سے سرفراز کیا گیا۔

میں (گارساں دتاسی) تقریباً بیس سال سے خط و کتابت کے واسطے سے الکزنڈر کاظم بیگ سے واقف تھا۔ سنہ ۱۸۶۹ع میں جب وہ پیرس آے تو مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ لندن اور پیرس میں جو لوگ ان سے ملے وہ ان کے بڑے مداح ہوگئے۔ ان کا علم و فضل اور فطری ذوق قابل تعریف تھا۔ اس زمانے میں جب ان سے ملا تھا تو ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ چنانچہ ناسازیٔ مزاج کا سلسلہ جاری رہا اور ۲۷ نومبر سنہ ۱۸۷۰ع کو ان کا انتقال ہوگیا۔

مرزا محمد وجاہت علی کو جو "اخبار عالم" اور "سماچار درپن" کے مدیر ہیں سنہ ۱۸۷۰ع کے آخری ایام میں سخت صدمے پہنچے۔ ان کا ایک بچہ جس کی عمر تین سال تھی اور دوسرا بچہ جو صرف چند ماہ کا تھا ضائع ہوگئے۔ موت نے دونوں بچوں کو چند ہفتوں کے فصل سے ان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ مرزا صاحب کے احباب اور ان کے اخباروں کے پڑھنے والے ان کے ساتھ رنج میں شریک ہیں۔ ان بچوں کی موت کی تاریخ بھی نکالی گئی ہے جو ظاہر ہے غمزدہ والدین کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ لیکن والدین کو یقین ہے کہ قیامت کے دن وہ اپنے بچوں کو دیکھیں گے۔ قیامت کا یہ انجیلی عقیدہ قرآنی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔

پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر ہنری ڈیورنڈ نے یکم جنوری سنہ ۱۸۷۱ع

کو ہاتھی پر سے گر کے انتقال کیا - وہ 'اڈسکومب' کے اسکول کے ہونہار طالب علم تھے - اس اسکول میں انہوں نے اپنے استاد جان شیکسپیئر سے ہندوستانی زبان سیکھی تھی جو میرے بھی استاد تھے - سر ہنری ڈیورنڈ سنہ ۱۸۲۸ ع میں فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان گئے - غزنی کی فتح میں وہ شریک تھے - پھر لارڈ ایلن برو کے معتمد ہوگئے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے - اس کے بعد سول سروس کے مختلف اہم عہدوں پر مامور رہے - سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے موقع پر وہ اندور میں ریزیڈنٹ تھے - اس کے بعد انگلستان میں انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہوئے - پھر وہاں سے ہندوستان واپس آئے اور لارڈ کیننگ کی حکومت میں معتمد اور خارجی کے عہدے پر سرفراز ہوئے - سنہ ۱۸۶۵ ع میں وائسرائے کی کونسل کے رکن مقرر ہوئے اور سب سے آخر میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر بنائے گئے - آج انگلستان اور ہندوستان میں سر ہنری ڈیورنڈ کی ہر طرف تعریف ہو رہی ہے - ان کی خدمات' ان کی فوجی قابلیت اور نظم و نسق کی صلاحیت کو ہر کوئی تسلیم کر رہا ہے - ان کے تدبر' خوش فہمی اور وسیع اخلاق کے متعلق ہر طرف لوگ ذکر کر رہے ہیں - وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موت کو زندگی کا دروازہ تصور کرتے ہیں - در حقیقت "موت ایسی چیز ہے جس پر جری لوگ قابو پالیتے ہیں' عقل مند لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں' فسردہ لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں اور نیک لوگ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اسواسطے کہ وہ جانتے ہیں کہ ابدی روشنی کا راستہ قبر ہی کی تاریک گلی سے ہو کر جاتا ہے" —

میں نے اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے تبصرے میں ان مختلف قصوں کی نسبت ذکر کیا تھا جن کی اشاعت مدراس کے میجر مارک ولیم کار نے اپنے ذمہ لی تھی یہ قصے دکنی زبان کے ہیں۔ آج مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اس فاضل مستشرق کا انتقال ہوگیا۔ اس کی موت کے سبب سے وہ کام رک جائے گا جسے اس نے شروع کیا تھا۔ میجر کار کو متعدد مشرقی زبانوں پر جو قدرت حاصل تھی اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ تلنگی زبان کی ضرب الامثال پر جو کتاب اس نے شائع کی تھی وہ بہت مشہور ہوئی اور اس سے اس کے علم وفضل کا اظہار ہوتا ہے۔ میجر کار کو خاص طور پر ہندوستانی زبان سے لگاؤ تھا۔ اس کے انتقال سے اس مختصر طبقے میں بڑی کمی پیدا ہوگئی جو ہندوستانی زبان کے قدر دانوں کا ہے۔ اس کا ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع بمبئی سے میرے نام آیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ دو ایک ماہ کے لیے بمبئی سیر و تفریح کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ مدراس چلا جائے گا۔ غالباً سمندری راستے سے وہ "جنرل آؤٹرم" نامی جہاز سے واپس ہوا اور راستے میں ڈوب کر مرگیا۔ میرے اور میجر کار کے تعلقات بہت گہرے اور قدیم تھے۔ نہ صرف ادبی مشاغل کی یکسانیت کے باعث بلکہ مذہبی عقائد مشترک ہونے کی وجہ سے میرے وہ بڑے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ اپنی مذہبیت کی وجہ سے مدراس کی سوسائٹی میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے —

یکم اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع مسز میننگ کا انتقال ہوگیا جو "ہند قدیم و وسطی" کی مصنف تھیں۔ یہ اُس زمانے کی نہایت فاضل اور خوش اخلاق انگریز عورت تھیں۔ یہ خاتون سنہ ۱۸۰۳ ع میں پیدا ہوئیں

مس کارپنٹر کی طرح انھیں بھی راجہ رام موہن رائے کی دوستی کی وجہ سے ہندوستان کے ساتھہ شغف پیدا ہوگیا - راجہ رام موہن رائے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں مسز میننگ کے والد کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے - مسز میننگ نے اپنے پہلے شوہر ڈاکٹر اسپیئر کی معیت میں ہندوستان میں تین سال گذارے اور خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام حالات دیکھے جو بعد میں ان کی تحریروں کا موضوع بنے - وہ ہندوستانی زبان بلا تکلف بول سکتی تھیں اور اہل ہند سے گفتگو کرسکتی تھیں - انگلستان میں واپسی پر انہوں نے اپنی کتاب "قدیم ہند کی زندگی" تصنیف کی - یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو دو جلدوں میں سنہ ۱۸۶۹ ع میں شائع ہوئی - اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہوں نے مسٹر میننگ سے شادی کرلی جو مشہور قانون داں شخص تھے - مسز میننگ نے 'ہچن' کے مدرسۂ نسواں کے قیام میں اپنی فیاضی اور مشورہ سے بڑی مدد دی - گزشتہ سال جب بابو کیشب چندر سین انگلستان آئے تو مسز میننگ نے انھیں دعوت دی بالکل اسی طرح جیسے ان کے والد راجہ رام موہن لال کو اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے - کچھہ عرصہ مسز میننگ نے "انڈین ایسوسی ایشن" کے قایم کرنے میں بڑی امداد کی تھی اور مس کارپنٹر کے ساتھہ تعاون عمل کیا تھا - ان کی بہو مس ای اے میننگ بھی ہندوستان کے ساتھہ ہمدردی رکھتی ہیں - وہ صرف "انڈین ایسوسی ایشن" ہی میں شریک نہیں ہیں بلکہ انہوں نے لندن میں اس قسم کی ایک اور انجمن قایم کی ہے جس کی وہ اعزازی معتمد ہیں —

گزشتہ ستمبر میں کلکتہ میں ایک مشہور مجسٹریٹ جے سی نارمن کو کسی نے قتل کرڈالا - وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے - وہ اگرچہ اپنے

فیصلوں میں سخت تھے لیکن انصاف کو کبھی ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے تھے - لوگ ان کے متعلق اچھی راے رکھتے تھے اور ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے - انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں - شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی متعصب وہابی نے انہیں قتل کیا ہے - لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان کے قتل میں کوئی سازش نہیں تھی - ایک پٹھان نے جس[6] کا نام عبداللہ تھا بھنگ کے نشے میں انہیں قتل کرڈالا - اس کو جج سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اس کی عرض داشت کو لینے سے انکار کیا - قاتل کو پھانسی دی گئی اور اس کی نعش کو نذر آتش کردیا گیا - جب اس پٹھان کو پھانسی کے لیے لے جانے لگے تو وہ نماز پڑھ رہا تھا - چلتے وقت اس نے صرف ہندوستانی کا لفظ "اچھا" کہا اور بس —

مسٹر 'نارمن' کے قتل پر کلکتہ کے پورے شہر نے ماتم کیا - ان کی موت ایک عام نقصان خیال کی گئی - شہر کی دکانیں بند کردی گئیں - شہر کے عیسائی' ہندو اور مسلمان ان کے جنازے کے ساتھہ قبرستان تک گئے - مسلمانوں نے خاص طور پر ان کے قتل پر اظہار رنج کیا اسواسطے کہ متوفی جج کو ان کی بہتری کا خیال رہتا تھا - مسلمانوں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں قتل پر اظہار ملال کیا اور متوفی جج کی یادگار قایم کرنے کے لیے چندہ کیا - سید عبداللہ نے Allen's Indian Mail کی ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا ہے اور اس میں یہ امر ثابت کیا ہے کہ اس قتل میں کسی قسم کی سازش نہیں تھی بلکہ وہ صرف ایک شخص کا ذاتی فعل تھا —

آخر میں میں اپنے ناظرین کو بتا دوں کہ جیج نے مرتے وقت اتوار کے دن والی مناجات پڑھنے کو کہا اور خود یہ الفاظ دہرائے: "ہمارے قصور معاف فرما جس طرح ہم معاف کردیتے ہیں"۔ بقول سینٹ جان "انہیں ابدی مسرت حاصل ہوگی جو خدا کے لیے مرتے ہیں"۔ ورڈزورتھ نے کیا خوب کہا ہے:

"اس جنت نعیم کی خوبیاں اور شان کون بیان کرسکتا ہے۔ جب خود خدا اس کے متعلق بہت کم کہتا ہے تو دانش مندی کا اقتضا یہ ہے کہ خموشی اختیار کی جائے"—

# خطبۂ صدارت

از


عبدالحق

آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)


جو

(سندھ پراونشل اردو کانفرنس (کراچی) کے اجلاس منعقدہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ع میں پڑھا گیا)۔

یہ زمانہ عجیب و غریب انقلابات و تغیرات اور عجیب و غریب اختراعات و ایجادات کا ہے۔ ہم وہ عجائبات دیکھ رہے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تار برقی، ٹیلیفون، ایروپلین، اور دوربینی (Television) نے عالم میں انقلاب پیدا کردیا ہے۔ زمان و مکان جن کی وسعت اور بے پایانی انسانی فہم سے بالا ہے آج اس خاک کے پتلے کے سامنے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ گھر بیٹھے ہزاروں کوس کی تقریریں اس طرح سنتے اور وہاں کے کھیل تماشے اس طرح دیکھتے ہیں گویا یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ ان ایجادات کی بدولت سفر میں حضر اور حضر میں سفر کا لطف پیدا ہوگیا ہے۔ آمد و رفت، خط و کتابت، حمل و نقل، تعلیم و تعلّم میں دنیا ایک ہوتی جاتی ہے۔ انسانی دماغ

نے یہ تو سب کچھہ کیا لیکن زبان کے معاملے میں یہ اب تک عاجز ہے -
ہر ملک کی الگ الگ زبان اور ہر زبان میں کئی کئی بولیاں ہیں -
جب دو غیر زبان یا غیر ملک والے ایک جگہ آملتے ہیں تو باوجود نطق
کے جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے گونگے بن جاتے ہیں اور حیرت سے ایک
دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں - یہ اور بات ہے کہ اشاروں اور ہاتھہ آنکھہ
کے چلانے سے دو ایک موٹی موٹی ضرورتیں پوری کرلیں - لیکن نہ معاملات
پر گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ اپنے دل کی بات دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں -
اس کے علاوہ تمدنی ' تہذیبی اور علمی ضروریات اس امر کی مقتضی
ہیں کہ دنیا کے پردے پر مختلف حصوں میں جو کچھہ ہو رہا ہے اس
کا فوراً ہم تک پہنچنا ضروری ہے - آج تک حالت یہ ہے کہ زندگی کے
ہر شعبے میں جلد جلد تغیرات ہو رہے ہیں ' نئے نئے اکتشافات ' نئی نئی
ایجادیں ' طرح طرح کے نظریے عمل میں آرہے ہیں اور ایک ایسے شخص
کے لیے جو علم کا پیاسا ہے یا کسی تحقیقات میں مصروف ہے ان معلومات
کا فوری علم لازم ہے - اور جب تک دوسرے ذرائع یا ترجمے کی وساطت
سے یہ معلومات اُس تک پہنچیں دنیا آگے نکل جاتی ہے ' یہ پیچھے رہ
جاتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عمر بھر کی کمائی اکارت جاتی ہے —

یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کے بعض ہمدردوں نے اس ابتری
اور افراتفری کو دیکھہ کر ایک بین اقوامی زبان "یا جگت بھاشا" ایجاد
کرنے کی کوشش کی - یہ کوششیں مختلف زبانوں میں ہوئیں اور بڑے
اچھے دماغوں نے اس پر محنت کی لیکن اب تک اس میں خاطر خواہ
کامیابی نہیں ہوئی اور اس نقص کی وجہ سے انسان اب تک بہت سی
خامیوں اور ناکامیوں کا شکار بنا ہوا ہے —

گو کوئی جگت بھاشا اب تک نہیں بنی اور نہ ابھی کوئی توقع ہے لیکن باوجود اس کے جب تجارت، کشور کشائی، جلاوطنی نے مختلف زبانوں کے لوگوں کو ایک جگہ لا ملایا تو باہم متواتر سابقہ پڑنے یا دوسرے دیس میں بس جانے سے ان لوگوں نے ایک دوسرے کی زبانوں کو گڈمڈ کرکے ایک نئی زبان بنالی اور اسی میں بات چیت، لین دین، کاروبار اور معاملات انجام دینے لگے - دنیا میں اس قسم کی متعدد زبانیں ہیں - انہیں میں سے ایک ہماری زبان بھی ہے جو اردو یا ہندوستانی کے نام سے موسوم ہے جو کسی بادشاہ کے خبط یا کسی حکیم کی حکمت یا کسی خوش فکر کے وہم کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی ضروریات کا اقتضا اس کا باعث ہوا —

جگت بھاشا نہیں تو نہ سہی، کم سے کم ہمارے پاس ایک ایسی زبان تو ہے جسے ہم "دیش بھاشا" کہہ سکتے ہیں- ایک ایسے ملک میں جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں اور بولی جاتی ہیں، ایک ایسی زبان کا ہونا لازم تھا - قانون قدرت نے اپنا کام کیا اور انسانی ضرورت نے اسے لٹیک کیا اور رواج نے اسے پھیلایا- اس لیے کہ جب اسلامی سلطنت کو یہاں استحکام ہوا، حکومت کو وسعت ہوئی، امن و عافیت میں ترقی ہوئی، مختلف صوبوں میں ربط قائم ہوا، آمد و رفت اور میل جول کی آسانیاں پیدا ہوئیں، نئے سامان ظہور میں آئے، حالات و خیالات میں تغیر ہوا اور ایک جدید ماحول کا دور شروع ہوا تو ان حالات اور ماحول کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت واقع ہوئی کیونکہ اس وقت جتنی زبانیں ہندوستان میں رائج تھیں وہ سب اپنے اپنے حلقے میں محدود تھیں اور اس نئی خدمت کے

انجام دینے سے قاصر تھیں - فارسی ہر چند کہ سرکاری درباری زبان تھی اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان ' افغانستان ' ایران نیز مملکت روم تک چھائی ہوئی تھی مگر آخر غیر زبان تھی اور ملکی زبان نہیں ہوسکتی تھی ( بعینہٖ جیسے اس وقت انگریزی ) - اس لیے ایک زبان کی جگہ خالی تھی - اس خالی جگہ کو خود بخود اس نئی زبان نے پُر کیا جو ضروریات وقت کے لحاظ سے دونوں قوموں یعنے ہندو مسلم کی شرکت اور اتحاد سے بنی تھی- یہی ہماری دیش بھاشا ہے- یہی ہماری ملکی اور قومی زبان ہے کیونکہ اس کی تخلیق کی غرض و غایت ہی یہی تھی- اب کوئی دوسری ' خواہ نئی ہو یا پرانی ' اس سے یہ منصب نہیں چھین سکتی —

اس قسم کی مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک خاص بات عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے یعنے ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آسکے اپنی بعض خصوصیات کو ترک کرنا پڑتا ہے اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح ان میں ایک توازن سا پیدا ہوجاتا ہے جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے - اُردو یا ہندوستانی کے بننے میں بھی یہی ہوا - فریقین یعنی ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتربیونت کی ' اپنی مخصوص خصوصیات کو ترک کیا اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اسے اختیار کیا جو ضرورت زمانہ کے مطابق اور حالات کے مناسب تھی اور جو اب ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندوستان کی مشترک اور عام زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے - ہم نے اسے قربانی کرکے حاصل کیا ہے اور کسی کا یہ

منہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ہم سے اسے چھڑائے —

اس قسم کی مخلوط زبانیں دنیا میں جہاں جہاں ہیں ان میں سے اکثر اور غالباً سب کی سب بول چال اور کاروبار کی حد تک کام آتی ہیں - یہ امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ وہ لشکر اور بازار سے نکل کر مسندانشا تک پہنچی ' رونق محفل شعرا ہوئی ' علم و ادب کا سہارا بنی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج یونیورسٹی کے اعلیٰ مضامین اور علم کا ذریعہ وتعلیم ہے - یہ وہ درجہ ہے جو اب تک ہندستان کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہوا —

کہا جاتا ہے کہ اب نیا زمانہ آگیا ہے ' نئے حالات ہوگئے ہیں - نئے دور نے جنم لیا ہے ' نئے خیالات کی آمد ہے ' اس لیے اب زبان بھی نئی ہونی چاہیے - بے شک ایک زمانہ ایسا تھا کہ نئے حالات اور خیالات اور جدید ماحول کی وجہ سے بھی ایک جدید زبان کی ضرورت تھی اور وہ اس لیے کہ پہلے سے ملک میں کوئی زبان موجود نہ تھی - اب جب کہ ایک زبان بن چکی ' ملک میں رائج ہوچکی ' ملک کی عام اور مشترک زبان مانی جاچکی تو اس کے ہوتے کسی دوسری زبان کا بنانا سودائے خام اور خیال باطل ہے —

ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ایسی زبان میں جو ملک بھر کی زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے اتنی صلاحیت اور استعداد ہونی چاہیے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور نئے خیالات اور افکار ادا کرسکے - یہ ہر زندہ زبان کے لیے لازم ہے ورنہ وہ زندہ نہیں رہ سکتی - یہ صلاحیت اس میں پوری پوری موجود ہے جس کے لیے مجھے اس وقت شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں - الفاظ کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے - نئے نئے

اسلوب بیان پیدا ہوتے جاتے ہیں - نظم و نثر کا رنگ بدلتا جاتا ہے ' نئی اصطلاحات وضع ہوتی جاتی ہیں - مغربی تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں - مختلف علوم پر تالیفات کی جا رہی ہیں - یہ سب باتیں ہماری زبان کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں —

ایک حکیم کا قول ہے کہ غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کرلینا کہ اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہ رہے بلاشبہ بہت مشکل کام ہے لیکن غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کرلینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں ' اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے - یہ استعداد اردو زبان میں بدرجہ کمال موجود ہے - اس میں سیکڑوں ' ہزاروں الفاظ غیر زبانوں کے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بولنے ' پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہ دیسی ہیں یا بدیسی ' اپنے ہیں یا پرائے —

میں علی الاعلان یہ کہتا ہوں اور اس کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم ہندی ' سندھی یا ہندوستان کی کسی زبان کے بھی مخالف نہیں بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہر زبان کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق ہے - لیکن یہ امر مسلم ہے اور ہر طبقے اور ملت کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی ایک زبان ایسی ضرور ہونی چاہیے جو ہماری ملکی اور قومی زبان ہو - اب بحث اس میں ہے کہ وہ کونسی زبان ہو —

ہمارا کہنا یہ ہے اور ہم اس کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک ایسی زبان پہلے سے موجود ہے جسے اردو یا ہندستانی کہتے ہیں یہ وجود میں آئی ہی اس غرض سے تھی - اقتضائے وقت نے اسے پیدا ہی اسی لیے کیا تھا - یہ اب تک ملکی اور مشترکہ زبان سمجھی جاتی رہی اور

مشترکہ زبان کا کام دیتی رہی اور اس وقت بھی یہی خدمت انجام دے رہی ہے - میرا یہ دعویٰ اس لیے نہیں کہ یہ میری زبان ہے بلکہ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا —

رہی ہندی ' سو اس کے مخالف تو ہم ہو ہی نہیں سکتے ' اس لیے کہ وہ ہماری ہی ساختہ پرداختہ ہے - ہمیں نے اس کو فروغ دیا اور پھیلایا کیونکہ جب مسلمان یہاں آئے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے ہر علاقے کی بولی الگ الگ تھی - نہ ملک کی کوئی عام زبان تھی اور نہ کوئی ایک حکومت تھی اور نہ ذرائع آمد و رفت وسیع تھے اس لیے ہر بولی کا حلقہ محدود تھا - مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی - جب انہوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں کی ایک مقامی بولی سے جو اب کھڑی بولی کہلاتی ہے اور جس کے معنے عوام کی بولی کے ہیں فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی - جیسے جیسے ہندو مسلمانوں میں میل جول بڑھتا گیا ان دونوں زبانوں میں بھی ربط ضبط بڑھنا شروع ہوا - اور رفتہ رفتہ یہ دونوں ایسی گھل مل گئیں کہ فارسی اور کھڑی بولی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور جوں جوں اسلامی سلطنت پھیلتی گئی اس کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور یہ بولی جسے کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا ہماری بدولت سارے ہندستان میں پہنچی - سلطنت کی فوجوں ' صوفی و درویش ' علما و شعراء ' عمال و حکام جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ہندستان کے گوشے گوشے سے اسے روشناس کرادیا - ہم اس کی مخالفت کیونکر کرسکتے ہیں ؟ یہ ہماری زبان کی بنیاد ' ہماری زبان کی زینت اور رونق بلکہ اس کی جان ہے - اگر آج ہم اپنی زبان سے اسے خارج کردیں تو ہماری زبان مہمل اور بے معنی ہو جائے گی —

لیکن ہاں ہم اس جدید ہندی کے بے شک مخالف ہیں جو ہندستان کی دو بڑی قوموں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے جس کی بنیاد نئی قومیت کے جوش اور فرقہ واری جذبے پر ہے جس کا منشا عربی فارسی الفاظ کو خارج کرکے ان کے بجائے سنسکرت اور ہندی کے نامانوس الفاظ رائج کرنا ہے حالانکہ وہ عربی فارسی الفاظ صدہا سال سے رس بس کی ہندستانی زبان کا جزو ہوگئے ہیں —

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندستانی یا اردو مخلوط زبان ہے - یہاں کی خالص زبان نہیں - اول تو دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں دوسرے ہماری زبان کا مخلوط ہونا عیب نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے اس سے اس کا یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ وہی ملک کی مشترکہ زبان ہے - نیز اس اختلاط کی وجہ سے اس میں ایک ایسی وسعت ، قوت اور فراوانی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب کو ہر قسم کے خیالات نئے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے اور صحیح اور موزوں لفظ کے انتخاب میں جو سہولت ہے وہ شاید ہی ہندستان کو کسی دوسری زبان میں ہو —

مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ کے بنانے اور ترکیب دینے کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے - ایک ایسی زبان کے لیے جو علمی اور ادبی ہونے کی آرزو یا دعویٰ رکھتی ہے یہ بہت بڑی چیز ہے —

جدید ہندی کے حامیوں نے زبان کو خالص بنانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ فارسی عربی کے لفظ چن چن کر نکال دیئے جائیں اور ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے لفظ داخل کیے جائیں خواہ وہ مانوس ہوں یا نہ ہوں سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں - یہ نہایت احمقانہ خیال

ہے - انشا پرداز یا ادیب کے پیش نظر یہ اصول ہونا چاہیے کہ عام استعمال میں سب سے بہتر لفظ کونسا ہے خواہ کسی زبان کا ہو- الفاظ کے انتخاب میں لفظ کی نسل و اصل کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کونسا لفظ خیال کو صحت اور خوبی کے ساتھہ ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے - الفاظ کے انتخاب کی بنیاد اس اصول پر رکھنا کہ کوئی لفظ غیر زبان کا نہ آنے پائے خواہ کیساهی موزوں، صحیح اور عام فہم کیوں نہ ہو نہایت گمراہ کن اصول ہے اور زبان کے حق میں سخت مضر ہے —

میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں - کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے میں میرٹھہ سے دھلی جارہا تھا - گاڑی ایک گانو کے اسٹیشن پر ٹھیری - وہاں سے دو ھندو صاحب سوار ہوئے - آج کل گنّے کی کاشت کا بہت رواج ہورہا ہے اُدھر بھی جگہ جگہ لوگوں نے سہولت کے لیے اسٹیشنوں کے قریب گنّے کی کاشت کے ساتھہ گڑ بنانے کے کارخانے قائم کر رکھے ہیں - گنے کا پھوک اور دوسرا کوڑا کرکٹ ریلوے لائن کے قریب پھینک دیتے ہیں جس سے بہت بدبو پھیل جاتی ہے چنانچہ جب گاڑی چلی اور بدبو آئی تو میں نے کہا کہ اس گانو سے بہت بدبو آرهی ہے اُن ھندو صاحب نے فرمایا کہ یہاں گڑ کا کارخانہ ہے اس کی وجہ سے سخت تعفّن پیدا ہوگیا ہے - اس گفتگو میں ان صاحب نے تعفن کا لفظ استعمال کیا اور میں نے بدبو کا - لیکن میں بدبو کو تعفن پر ترجیح دیتا ہوں اس لیے نہیں کہ یہ لفظ میں نے کہا تھا اور نہ اس لیے نہ تعفن عربی لفظ ہے اور بدبو ھندوستانی، بلکہ اس لیے کہ یہ زیادہ عام فہم اور سہل ہے اور بالکل وهی مفہوم ادا کر رہا ہے جو تعفن - لیکن اگر کوئی قیمت، دکان، کتاب کی جگہہ نامانوس- ھندی یاسنسکرت

کے لفظ استعمال کرے گا تو میں کبھی روا نہ رکھوں گا - اگرچہ قیمت اور دکان عربی اور فارسی کے لفظ ہیں لیکن وہ اس قدر عام طور پر رائج اور اس قدر مختصر اور سہل ہیں کہ ان کی جگہہ ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال کرنا ذوق سلیم کا خون کرنا ہے —

ایک اور غضب آج کل یہ ہو رہا ہے کہ اچھے خاصے ٹھیٹ ہندی لفظوں کی جگہہ جان جان کر ثقیل نامانوس سنسکرت لفظ داخل کیے جا رہے ہیں یا ان اصل سنسکرت الفاظ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لایا جا رہا ہے جن سے ہندی لفظ بنے ہیں مثلاً برس کو ورش، کانو کو گرام کہیں گے حالانکہ برس اور گانوں خاص و عام سب کی زبان پر ہیں اور خالص ہندی ہیں یا مثلاً پھر نہیں پد کہیں گے - اس قسم کے سیکڑوں لفظ نئے نئے داخل کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل خواہ مخواہ موجب طوالت ہوگی - اس سے ان کی نیت کا پتہ چلتا ہے - میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں - میرا ایک ہندو طالب علم ریل میں سفر کر رہا تھا اسے دیا سلائی کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنے ہم سفر ہندو نوجوان سے مانگی - اس نے دیا سلائی تو دے دی مگر ساتھہ ہی یہ بھی کہا کہ اب اس کا نام دیا سلائی نہیں رہا - طالب علم نے حیرت سے پوچھا کہ پھر اب اسے کیا کہتے ہیں ؟ اس نے کہا "دھومرشلا کا" - اس حماقت اور بد ذوقی کی کوئی انتہا ہے ؟ دیا سلائی ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور اس کے دونوں جز ہندی ہیں پھر ایک نہایت عام فہم، سادہ اور خوبصورت لفظ ہے - اس کی جگہہ دوسرا ثقیل، نامانوس مہمل لفظ استعمال کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے - آخر اس کا کیا مطلب ہے ؟ مطلب ظاہر ہے اور مجھے اس کی تصریح کی ضرورت نہیں —

ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے ہندی زبان میں ارشاد فرمایا۔ اگرچہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ جامعۂ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اعلیٰ جماعتوں تک اردو ہے اور وہاں ہر سال کانووکیشن کا ایڈریس اردو ہی میں پڑھا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہوئی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ برٹش انڈیا کی ایک پرانی یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس ایک دیسی زبان میں سنایا گیا - پنڈت جی نے شروع میں حاضرین سے انگریزی زبان میں دو باتوں کی اجازت چاہی ایک تو یہ کہ میں بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہوں، اپنی تقریر بیٹھ کر کروں گا - دوسرے یہ کہ میں اپنی تقریر اپنی مادری زبان میں کروں گا - اس کے بعد جو انہوں نے تقریر شروع کی تو وہ سنسکرت آمیز ہندی میں تھی - اس پر ایک طالب علم نے (خدا اس کی ہمت میں برکت دے) اٹھ کر کہا "جناب میں آپ کی زبان نہیں سمجھ سکتا" اس پر پنڈت جی چونکے اور انہوں نے ایسی ہندی میں تقریر کی جو آدھی مادری زبان تھی اور آدھی پدری - پنڈت جی علاوہ سنسکرت اور انگریزی کے عالم ہونے کے ہندستانی زبان کے بھی ادیب ہیں - جن لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ان کی تقریریں سنی ہیں وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ وہ کیسی شستہ اور فصیح ہندستانی یعنی اردو بول سکتے ہیں - لیکن ان اثرات اور حالات کی وجہ سے جو آج کل ہماری بدنصیبی سے ملک پر چھائے ہوئے ہیں انہوں نے اپنا رخ بدل دیا ہے - جب ایسے پختہ کار، دور اندیش اور ہمدرد بزرگ جن سے اصلاح و مصالحت کی توقع ہے مضر اثرات سے نہیں بچ سکتے تو نوجوانوں

اور بے خبر لوگوں سے کیا شکایت ہو سکتی ہے - ایک بات ان کی تقریر میں یہ نظر آئی کہ جب انہیں کوئی ہندی لفظ نہیں ملتا تھا تو اردو یا فارسی کا مروجہ لفظ نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اس کی جگہ انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے تھے - سنسکرت کے جو اقوال ان کی تقریر میں آتے تھے اس کا ترجمہ وہ ہندستانی میں نہیں بلکہ انگریزی میں فرماتے تھے - یہ سب باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے —

ہم ان باتوں کے روادار نہیں ہو سکتے - بدگمانی بری چیز ہے لیکن بدگمانی پیدا کرنے والوں کو کیا کہا جائے؟ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں صاف طور سے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی لیکن اس معزز جماعت نے کبھی اس کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی - اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ممتاز ارکان ہندی کی اشاعت پر تلے ہوئے ہیں تو ہماری بدگمانی بالکل بجا ہے - ابھی حال میں ایک راجہ نے ایک بیش قرار رقم مسٹر سی راج گوپال اچاریہ کی خدمت میں اس غرض سے پیش کی ہے کہ وہ اسے ہندی کی اشاعت میں صرف کریں - سی راج گوپال اچاریہ کانگریس کے رکن اعظم اور صوبۂ مدراس کی کانگریس حکومت کے وزیر اعظم ہیں - انہیں چاہیے تھا کہ وہ شکریہ کے ساتھ اس رقم کو واپس کردیتے اور صاف کہہ دیتے کہ کانگریس کے عقیدے اور اصول کے رو سے وہ اس رقم کو قبول نہیں کرسکتے ' ہاں اگر ہندوستانی کی اشاعت کے لیے دیے جاتے ہیں تو بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہیں - لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا - اس سے ظاہر ہے کہ ہندستانی کا ریزولیوشن بھی ایک سیاسی چال تھی —

حضرات! زبردستی قائم کرنے ' پر جوش سیاسی تقریریں کرنے یا

خوشنما الفاظ میں ریزولیوشن منظور کرلینے سے دل نہیں بدلتے- دل بدلنے والی چیزیں اور ہی ہوتی ہیں —

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلے پر ایک رسالہ شائع کیا ہے- اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی- یہ بیان سراسر خلاف واقعہ اور غلطی پر مبنی ہے- پنڈت جی نے یا تو لاعلمی کی وجہ سے یا اُس عام پروپیگنڈے کی وجہ سے جو ہر طرف کیا جارہا ہے یہ لکھہ دیا ہے ورنہ وہ جدید زبان جسے آج کل ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندستان کے کسی دیہات میں نہیں بولی جاتی- میرٹھہ یا دلی کے دیہات والے کے لیے بہار کے دیہات والے کی بولی ایسی ہی اجنبی ہے جیسے ایک لاہوری کے لیے ملتانی- ہندی کا لفظ مبہم ہے اور اس سے مغالطہ پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن ہم اس غلطی یا دھوکے میں نہیں آنا چاہتے- ہمیں قطعی طور سے یہ طے کرلینا چاہیے کہ ہندستانی یعنی اُردو ہمارے ملک کی زبان ہے اور اس کی اشاعت اور ترقی میں ہمارے ملک کی بہبودی ہے-

اے اہل سندھ! اگرچہ اردو کی ابتدا آپ کے ملک میں نہیں ہوئی لیکن سب سے پہلے مسلم ہندو تہذیبوں کی یکجائی آپ ہی کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یک جہتی میں وہ رنگ پیدا کیا جس کے نمونے کچھہ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کے رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے- اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول چال اور تحریر میں آتے ہیں- گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل کی- اگرچہ ہم دونوں کی یک جہتی اور اتحاد کی اور بہت

سی نشانیاں اب بھی موجود ہیں اور بہت سی مٹتی جاتی ہیں لیکن یہ زبان جو اردو یا ہندستانی کہلاتی ہے ہندو مسلم یک جہتی اور اتحاد کی سب سے بڑی اور زندہ یادگار ہے - اس کی ساخت اور ترکیب میں دونوں قوموں کے اعلی دماغ اور افکار، دونوں قوموں کی بے ریا اور متحدہ کوششوں اور دونوں قوموں کے ادبی نتائج کا نچوڑ موجود ہے - اب بھی اگر کوئی چیز ہمارے اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے تو یہی ہے - اب بھی اگر ہمارے بکھرے شیرازے کو ایک رشتے میں منسلک کرسکتی ہے تو یہی ہے - اس کے قائم رکھنے میں ہماری سعادت مندی اور اس کے پھیلانے اور ترقی دینے میں ہماری قومی بہبودی ہے —

آپ کے صوبے کی زبان یوپی، پنجاب اور بہار کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اردو سے قریب تر ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہزاروں فارسی عربی کے لفظ آپ کی زبان میں رس بس گئے ہیں، فارسی زبان کا تسلط یہاں صدہا سال تک رہا ہے - عربی کی تعلیم اب تک جاری ہے، رسم خط تقریباً وہی ہے جو اردو کا ہے اور یہ سب سے بڑی سہولت ہے جو آپ کو حاصل ہے - جملے کی ترکیب اور ترتیب وہی ہے جو اردو زبان کی ہے - آپ کے صوبہ میں سینکڑوں اردو کے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں - اردو کے اخبار اور رسالے بھی نکلتے ہیں - مشاعرے بھی یہاں اسی دھوم دھام سے ہوتے ہیں جیسے ہندستان کے دوسرے شہروں میں - اس لیے آپ کو اس زبان کی تحصیل و اشاعت میں بہت سی آسانیاں حاصل ہیں جو ہندستان کے بعض دوسرے صوبوں کو حاصل نہیں - جب جنوبی آرکاٹ میں تنقی ونم اور شمالی آرکاٹ میں وانم باڑی اور نیلگری وغیرہ اضلاع کے لوگ اردو کو حاصل ہی

نہیں کرتے بلکہ اپنی مادری زبان کی طرح بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں تو میرے خیال میں اہل سندھ ان سے کہیں بہتر اس میں مہارت پیدا کرسکتے ہیں اور اگر وہ ذرا بھی اس طرف توجہ کریں گے تو چند ہی سال میں ان میں ایسے ایسے ادیب اور شاعر ہونے لگیں گے جیسے پنجاب، یوپی، بہار اور حیدرآباد دکن میں —

آپ نے سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا اہتمام بڑی شان اور سلیقے سے کیا ہے - یہ بہت اچھا خیال ہے - اس کی سخت ضرورت تھی اور آپ کی یہ سعی قابل مبارک باد ہے - اس میں فصیح و بلیغ تقریریں ہوں گی، دلکش اور پُراثر نظمیں پڑھی جائیں گی، مفید اور ضروری ریزولیوشن پیش ہوں گے، اردو کی اشاعت و ترقی کی تجویزوں پر غور ہوگا، مشاعرے کی دھوم دھام ہوگی - بلا شبہ یہ تحریک بہت کارآمد اور قابل قدر ہے - اس سے اردو کا چرچا ہوگا، مطالعہ کا شوق بڑھے گا اور لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا - لیکن کیا آپ کی رائے میں ایک ایسی زبان کے لیے جسے آپ سارے ہندستان کی عام اور مشترک زبان خیال کرتے ہیں یا عام اور مشترک زبان بنانے کی آرزو رکھتے ہیں، اس قسم کے چند ہنگامے کردینے کافی ہوں گے؟

زمانے کی رفتار میں اس وقت غیر معمولی سرعت نظر آتی ہے - خود ہمارے ملک میں جو تغیرات گزشتہ چند سال سے رونما ہور ہے ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں - اس لیے اگر ہم اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ تیزی، زیادہ مستعدی اور زیادہ تندھی سے کام نہ لیں گے تو ہم پہلے سے بھی پیچھے رہ جائیں گے —

اردو زبان کی اشاعت اور اردو ادب کی ترقی بجائے خود ایک

اہم مسئلہ ہے - اس معاملے میں ہر صوبے اور ہر علاقے کی حالت جدا جدا ہے اس لیے کام کی نوعیت میں بھی پوری یکسانی نہیں ہوگی - لیکن میں اپنے ذاتی تجربے نیز اُن اطلاعات کی بنا پر جو مجھے مختلف مقامات سے وصول ہوتی رہتی ہیں ' یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کثرت سے لوگ اردو زبان کے سیکھنے کے خواہاں ہیں - لیکن کام کرنے والے نہیں اور کہیں ہیں تو یہ نہیں جانتے کہ کیا کیا جائے - اور کیونکر کیا جائے - دوسری مشکل یہ ہے کہ ہر جگہ اس کا رونا ہے کہ سرمایہ نہیں - انجمن ترقی اُردو (ہند) کے پیش نظر یہ مسئلہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی اشاعت کے لیے ہندستان کے ہر صوبے اور علاقے میں کیونکر تنظیم کی جائے - چنانچہ اس غرض سے اردو زبان کے جائزے کا کام شروع کیا گیا جس کا مقصد ان امور کا معلوم کرنا ہے کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کتنے اُردو بولنے اور سمجھنے والے ہیں - کتنے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں ' کتنے ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے - کتنے اُردو مدارس ہیں اور اردو پڑھنے والوں کی کیا تعداد ہے - کتنے کتب خانے ہیں ' کتنے اردو اخبار ' رسالے اور مطبع ہیں ' اردو نصاب تعلیم کی کیا حالت ہے - سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کا کہاں تک دخل ہے - کون کون لوگ اُردو سے ہمدردی رکھتے اور اردو کی خدمت کرتے ہیں - غرض اسی قسم کے اور استفسارات ہیں جن کے جواب مہیا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے - ان سب کا منشا یہ ہے کہ ہم ہر صوبے اور علاقے کے مخصوص حالات پیش نظر رکھ کر وہاں کام شروع کریں - لیکن صدر انجمن کچھ نہیں کرسکتی اگر خود ان علاقوں کے لوگ اس کی مدد نہ کریں یا

اس کام میں اس کا ہاتھ نہ بٹائیں ۔ انجمن کی شاخیں ہر علاقے میں اسی غرض سے قایم کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات سے زیادہ باخبر اور اپنی ضروریات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں ۔ صدر انجمن نے زبان کی اشاعت اور ترقی ادب کا خاکہ تیار کردیا ہے ۔ اب یہ ہر شاخ کا کام ہے کہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب کوئی مشکل آپڑے گی یا ضرورت محسوس ہوگی تو صدر انجمن اپنی شاخوں سے تعاون کرنے اور امداد اور مشورہ دینے میں کبھی دریغ نہیں کرے گی —

عام طور پر شاخوں کے لیے یہ کام تجویز کیا گیا ہے :—

۱ — مناسب مقامات پر اُردو کے مکاتب قایم کرنا —

۲ — بالغوں کی تعلیم کے لیے مدارس شبینہ قائم کرنا —

۳ — لوگوں کے دلوں میں اردو زبان کی ضرورت اور اہمیت کا احساس پیدا کرنا —

۴ — مطبوعات انجمن ترقی اُردو وغیرہ کی اشاعت میں کوشش کرنا —

۵ — مختلف مقامات پر کتب خانے اور مطالعہ خانے قائم کرنا —

۶ — حسب ضرورت ادبی جلسے کرنا —

۷ — اپنے اپنے علاقے میں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس ، نیز سرکاری مدارس اور مکاتب میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا —

۸ — اپنے اپنے علاقے کے اچھے اردو لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا —

۹ — اپنے اپنے علاقے کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اُردو زبان کے رواج کی کوشش کرنا —

۱۰ — مقامی ضروریات کے مطابق اردو کے تحفظ و ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنا —

یہ شاخوں کے کام کا مجمل خاکہ ہے - اس بنیاد پر تفصیلی کام ہر ایک شاخ کو اپنے اپنے علاقے کے مخصوص حالات کے مطابق کرنا ہوگا —

کراچی میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ ایک مدت سے قایم ہے - میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے کچھہ کام نہیں کیا لیکن اس زمانے کے لحاظ سے اسے ابھی بہت کچھہ کرنا ہے - اس کے کام کی موجودہ رفتار بالکل نا کافی ہے - آپ نے جس شوق سے اس کام کی ابتدا کی تھی اسے انجام تک پہنچانے کے لیے پوری کوشش اور پوری قوت اور کامل تندہی کی ضرورت ہے —

یوں تو ہم میں سینکڑوں اختلافات موجود ہیں لیکن غالبا زبان ہی کا مسئلہ ایسا ہے جس میں ہم سب متفق ہیں مگر اختلافات پیدا ہوتے کچھہ دیر نہیں لگتی - اس لیے آپ کو ہر قسم کے اختلافات اور مشکلات کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے - کرنے کے قابل ایسے ہی کام ہوتے ہیں اور اسی میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں —

حضرات ! اگر آپ کو اپنی زبان عزیز ہے اور آپ اسے قومی زبان خیال کرتے ہیں تو اس کی ترقی کے لیے ایسی ہی کوشش کیجیے جیسے آپ اپنی زندگی کے لیے کرتے ہیں کیونکہ یہ ہماری زندگی کا جز ہے اور ہمارا تمدن اور تہذیب اور معاشرت اس سے وابستہ ہے —

اس لیے میں اپیل کرتا ہوں تمام اہل سندھ سے - میں اپیل کرتا ہوں تمام اردو کے بہی خواہوں اور ہمدردوں سے اور اپیل کرتا ہوں ملک و قوم کے ہوا خواہوں سے اور خصوصا مسلم ہوسٹل کے طالب علموں

ہے کہ وہ اپنی قومی زبان کی اشاعت و ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں اور سب سے آخر میں اور سب سے زیادہ زور اور ادب کے ساتھ میں علمائے کرام اور مشائخان عظام کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارادتمندوں اور عقیدتمندوں کو اس طرف متوجہ کریں تاکہ ان کے اثر اور ہدایت کی بدولت زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے قومی اتحاد کو بھی استحکام اور ترقی نصیب ہو —



# 'هندستانی'

(خطبہ جو آنریبل مسٹر یعقوب حسن نے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ ع کو دکھشنا بھارت هندی پر چار سبھا کے ساتویں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر مدراس میں پڑھا) -

**جدید معاشرت**

اس وسیع براعظم کو جو افغانستان اور بلوچستان کے مشرق میں واقع ہے عربوں نے 'هند' اور ایرانیوں نے 'هندستان' کا نام دیا' انہوں نے سندھ (دریائے سندھ کے علاقے) پنجاب (پانچ دریاؤں کے علاقے) اور راجپوتانہ (راجپوتوں کے وطن) میں کوئی امتیاز نہیں کیا بلکہ سب کے لیے انہوں نے ایک هی نام کافی سمجھا - دهلی جو اس بڑے ملک کا دارالسلطنت بھی تھا سارے ملک کے لیے تمدنی و سیاسی مرکز بنا رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ هندستان کا سارا افسوں اسی ایک نام سے جکڑا جاتا رہا کیونکہ دراصل دهلی کو هندستان میں وهی درجہ حاصل ہے جو سلطنت روما میں روم کو حاصل تھا - پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں عربوں' ایرانیوں اور مغلوں کے گروہ هندستان میں وارد هوتے رهے' ان میں تجار بھی تھے اور صناع و دستکار بھی' طالب علم اور علماء بھی تھے اور مذهبی مبلغ بھی' ان میں بعض سیاح تھے اور بعض تلاش معاش میں جانباز قسمت آزما بن کر آئے' ایک بڑی تعداد سپاهیوں کی تھی' انهی میں وہ شریک تھے جو فاتح بن کر آئے

اور حاکم بنے لیکن ان سب نے ہندستان آکر واپس جانے کا خیال تک چھوڑ دیا اور یہیں رس بس گئے، یہیں شادی بیاہ کیا اور یہیں ان کی نسلیں چلیں - ان مسلمانوں نے اپنا بدیسیؔ قوم ہونے کا امتیاز بالکل مٹادیا اور بہت جلد ہندوؤں کے ساتھہ ایسے گھل مل گئے کہ نہ صرف یک رنگ اور ہم نوع معلوم ہونے لگے تھے بلکہ خط و خال اور چہرے مہرے میں بھی متجانس ہوگئے - ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کا لباس اختیار کرلیا اور ایک دوسرے کے رسوم و رواج اپنی معاشرت میں شامل کرلیے اور اس طرح معاشرت اور نظام ماند و بود میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوا - یہ ایک واقعہ ہے ہندستان کے باشندے جوق کے جوق اس طرح مسلمان نہیں ہوئے تھے جس طرح ترکستان، عجم، اور افغانستان کے باشندے بلکہ دور دراز کی دیسی ریاستوں میں جہاں نہ مسلمانوں کی فوجوں کا گذر ہوسکا تھا اور نہ وہاں ان کی حکومت تھی، اچھی خاصی تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے - خود میرا تعلق جس فرقے سے ہے یعنی کچھی میمن فرقہ، یہ در اصل لوہانا فرقے کی ایک جماعت تھی جس کو ایک برگزیدہ مسلمان بزرگ نے جن کا مزار کچھہ میں واقع ہے، دائرۂ اسلام میں شامل کیا تھا - خود ہندو مت اسلام کے اصول وحدانیت کو نہ روک سکا، بلکہ خود اس سے بہت کچھہ متاثر ہوا - نہ صرف 'کبیر' 'نانک' 'دیا نند سرسوتی' اور 'رام موہن رائے' کی تعلیم و تبلیغ سے سکھہ، آریا سماج اور برہمو سماج ایسے فرقے وجود میں آئے جن کا اصل اصول توحید ہے بلکہ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت عقائد کے اعتبار سے موحد بن گئی جیسا کہ پہلے نہ تھا —

اردو

مسلمانوں کے دور حکومت تک فارسی درباری اور سرکاری زبان تھی، ہندو مسلمان دونوں اس کو بڑے استقلال اور محنت سے سیکھتے تھے اور عام طور سے اسی کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی بولی یعنی پراکرت نے فارسی سے متاثر ہوکر نیا چولا بدلا، اس کی درشتی جاتی رہی اور اس کے صوتی محاسن میں بہت اضافہ ہوا - سنسکرت کے حروف میں فارسی زبان سے خ، ز، اور ژ اور عربی زبان سے 'غ' اور 'ق' کے حروف شامل کرلیے گئے جن کی بدولت ہندستانی حروف تہجی اس قدر مکمل اور جامع ہوگئے کہ کوئی ایسی آواز باقی نہیں رہی جو دنیا کے کسی حروف تہجی کے ذریعہ ادا کی جاسکتی ہو اور ہندستانی حروف تہجی اس کو ادا کرنے سے قاصر رہیں - اس کے باوجود اوپر کے طبقوں میں فارسی ہی بول چال کی زبان رہی، لیکن بازاروں اور فوجی چھاؤنیوں میں جو نئی زبان بولی جانے لگی تھی اس کا نام اردو پڑگیا - اردو ترکی لفظ، چھاؤنی کا مرادف ہے - غرض اردو کی ابتدا اس طرح ہوئی - ادب کو چمکانے والے پہلے بھاٹ ہوتے ہیں اور اس کے بعد اسے شائستہ بنانا شعرا کا کام ہوتا ہے - چنانچہ ولی دکھنی نے اردو میں پہلے پہل غزل کہنی شروع کی، اس کے ساتھ ہی ان تمام شعرا نے جو اس وقت تک فارسی زبان میں خیال آرائی کیا کرتے تھے اس کی تقلید شروع کردی اور بہت جلد ہندستانی شاعری فارسی شاعری کے بلند مرتبہ تک پہونچ گئی ، حتی کہ 'غالب' جو ہندستانی زبان کا شاعر ہے مشرق کا ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جانے لگا - ابھی اسّی نوے برس پیشتر تک سرکاری دفتروں میں فارسی زبان ہی رائج تھی اور خانگی خط و کتابت بھی اسی زبان

میں ہوتی تھی ' اس لیے جب هندستانی نے فارسی کی جگہ لی تو
رسم الخط فارسی هی کا باقی رہا کیونکہ تعلیم یافتہ هندو اور مسلمان دونوں
بہ نسبت دیوناگری رسم الخط کے فارسی حروف سے زیادہ واقف اور
مانوس تھے ' باہمے بقال اور مہاجن بیشک اب بھی کہاتے دیوناگری
رسم الخط هی میں لکھتے رہے - سندھی زبان کے لیے بھی عربی حروف کا
هی انتخاب کیا گیا اور تامل ناڈ کے مسلمان باشندوں نے تامل زبان کو
انھی حروف میں لکھنا شروع کیا ' چنانچہ اس وقت بھی وہ تامل زبان
کی کتابیں عربی رسم الخط میں لکھتے اور چھپواتے هیں اور یہ عرب تامل
کہلاتی ہے —

هندستانی | عام طور پر اردو ابھی حال تک اردو قصبات اور شہروں میں
بولی جاتی تھی اور دیہاتوں میں هندی رائج تھی ' گویا
ایک شہری زبان تھی اور ایک دیہی - لیکن جیسے هی اردو زبان نے
فارسی کو بالکلیہ نکال پھینکا تو مسلمانوں نے بھی اسلوب بیان میں سادگی
اور سلاست اختیار کرلی ' فارسی عربی الفاظ سے عمداً اجتناب کرنے لگے '
لیکن هندوؤں نے علمیت کے اظہار کی خاطر مسلمانوں کی بہ نسبت کہیں
زیادہ عربی و فارسی الفاظ اپنی تحریروں تقریروں اور گفتگو میں استعمال
کرنا شروع کردیے ' چنانچہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے جو اسقدر
الفاظ نظر آتے هیں اس کی یہی وجہ ہے اور اسی لیے اب لوگ ان الفاظ
سے بہ نسبت ان کے سنسکرت و پراکرت مرادفات کے زیادہ مانوس
هوگئے هیں - البتہ مسلمانوں کے علما اور مولوی لوگوں نے کہ جن کی تعلیم
کا جزو اعظم فارسی کے بجائے قران و حدیث کی عربی تھی ' ایسی اردو
لکھنا اور بولنا شروع کی جو خالص عربی آمیز تھی مگر ان کی تحریریں

عوام میں کبھی مقبول و معروف نہ ہوئیں - لیکن جب مولوی سر سید احمد خان بانی علی گڑھ کالج نے ایسی سلیس اور مقبول اردو میں اصلاح مذہب و معاشرت کا کام شروع کیا جو ہر شخص سمجھہ سکتا اور پسند کرتا تھا تو یہ لوگ (علما) ان کا مقابلہ نہ کرسکے - سر سید اور ان کے رفقا نے اس طرح اردو کی بہت بڑی خدمت کی ' اور خالص اردو کی نشو و نما کا صحیح طریقہ اختیار کیا اور اس کی ترقی میں جو کام ان لوگوں نے کیا وہ کوئی دوسری جماعت نہ کرسکی - ڈاکٹر نذیر احمد کی دو کتابیں ' مراۃ العروس ' اور " بنات النعش " جو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لکھی گئی تھیں ؛ کئی نسلوں تک نصاب میں شریک رہیں - خالص اردو کی جیتی اچھی مثال مولانا حالی کی ' مناجات بیوہ ' میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی - اس نظم نے ہزارہا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں سوز اور درد پیدا کیا اور اس سے عقد بیوگاں کی تحریک کو بڑی مدد ملی - اسی طرح نواب محسن الملک کی تقریروں نے اردو خطابت کا ایک ایسا بلند معیار قائم کیا کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے - پروفیسر ذکاء اللہ خاں نے سادہ سلیس زبان میں تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس ریاضیات اور اخلاق پر سو سے زائد کتابیں لکھیں ' رتن ناتھہ سرشار نے ' فسانۂ آزاد ' میں اپنے زمانے کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی - یہ ضخیم ناول افسانہ کی معیاری کتابوں میں سر والٹر اسکاٹ کی ویورلی ناولز کے سلسلے کے برابر جگہ پانے کی مستحق ہے - اس سارے ادب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو کسی رسم الخط میں بھی لکھا جائے اس کی عبارت میں کوئی فرق نہ آئے گا —

**ہندستانی تہذیب**

اب اگر ہم سنہ ۱۸۸۰ کے ہندستان کا تصور کریں جب کہ باغ جنت میں سیاست کے سانپ نے گھس کر ہمارے قومی اتحاد میں پھوٹ نہیں ڈالی تھی تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جس طرح ساری دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی انسانوں کے دو گروہوں میں باہم اختلاط و ارتباط پیدا ہوا اور دونوں کو یک جا رہتے صدیاں گذر گئیں تو ان کے تمدن و تہذیب کی امتیازی خصوصیات ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں اور ایک نیا مشترکہ تمدن وجود میں آیا اور ایک نئی زبان پیدا ہوئی ' وہی یہاں بھی ہوا کہ شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی الگ الگ قومیت فنا ہوگئی دونوں نے مل کر ایک متجانس قوم " ہندستانی " کی بناء ڈالی اور ' ہندستانی ان کی واحد مشترکہ زبان اور قومی تہذیب کا مشترکہ ذریعہ قرار پائی ' اگرچہ اس کی ایک غلط تفریق غلط ناموں کے ساتھ کر دی گئی تھی یعنی شہری زبان کو ' اردو ' اور دیہاتی زبان کو ' ہندی ' کہا جانے لگا ۔ اس وقت ہندستان خاص مشتمل تھا مشرقی پنجاب ' دہلی ' ممالک متحدہ ' بہار ' صوبجات متوسط کے شمالی علاقوں ' وسط ہند اور راجپوتانہ پر جس کی سرحد گجرات تک پہنچتی تھی ۔ اگرچہ پنجاب میں روز مرہ کی زبان پنجابی تھی مگر تعلیم یافتہ اور مہذب طبقوں میں ہندستانی ہی رائج تھی ——— شمالی سرحدی صوبہ اور سندھ میں بھی جہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں امید ہے کہ کم از کم یہ صورت حال بہت جلد پیدا ہوجائے گی ——— ہندستانی مسلمانوں نے ہندستانی زبان اور تہذیب کو مغرب میں گجرات ' مہاراشٹر ' کرناٹک اور ملیبار تک پہنچا دیا ' جنوب میں آندھرا اور تامل ناڈ کے علاقوں

میں اور مشرق میں بنگال اور آسام تک پھیلا دیا۔ ان علاقوں کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا اور وہیں رس بس گئے، لیکن یہ جہاں کہیں بھی گئے ہندستانی زبان اور ہندستانی تمدن اپنے ساتھ لیتے گئے اور وہاں ان کو رواج دیا۔ ان علاقوں کے اصلی مسلم باشندے بڑی تیزی سے ہندستانی زبان اور تہذیب کو جذب کر رہے ہیں کیونکہ وہ اس کو خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں اور اردو کو "مسلمانی" کہتے ہیں۔

**ہندستانی قومیت**

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندستانی قومیت کی بنا اور اس کا ارتقا برطانوی حکومت اور انگریزی تعلیم کے رواج کی بدولت ہوا وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ہندستان کو ایک واحد ملک کی حیثیت مسلمان کے دور اقتدار میں حاصل ہو چکی تھی جب کہ کشمیر سے لے کر جنوب میں ٹیپو سلطان کی سلطنت تک اور جونا گڑھ سے لے کر آسام تک سارا علاقہ ایک ہی شمار ہوتا تھا۔ ہندستانی قومیت بھی اسی مشترکہ زبان اور تہذیب کا نتیجہ ہے جو ہندستان کے ہر حصے پر چھائی ہوئی تھی اور جس کو مسلمانوں نے ملک کے ہر گوشے میں اپنے ساتھ لے جا کر رائج کیا، اسی لیے مسلمان غیر ہندستانی صوبوں کے ہندوؤں کے مقابلے میں بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کا زاویۂ نگاہ اپنے صوبے تک محدود نہیں ہے بلکہ قومیت پسندی میں وہ ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔

**قومیت اور صوبہ پرستی**

ان تمام ذرائع کی فہرست میں جو ہندستان جیسے وسیع ملک کی ایسی آبادی کو جو متعدد لسانی علاقوں میں منقسم ہے متجانس و متحد کرنے کے پیش کیے جا سکتے ہیں، ایک مشترکہ زبان کا ذریعہ سب سے پہلے سمجھا جاتا ہے، یہ سب سے زیادہ اہم اور قوی

ذریعہ ہے - غیز ہندستانی صوبے کے لوگ جب ہندستانی سیکھہ لیتے ہیں تو وہ صوبہ پرستی کے تنگ دائرہ سے نکل کر، قومیت کے وسیع اقلیم میں داخل ہوجاتے ہیں میں ان ایک سو پینتالیس حضرات کی خدمت میں جو اس سال اپنی سند کامیابی لینے کے لیے اس جلسۂ تقسیم اسناد میں شریک ہوے ہیں ونیز ان آٹھہ ہزار دو سو تیرہ بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں جنھوں نے امسال ہند کے تین ابتدائی امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے، بڑی مسرت اور خلوص سے "تاج محل" والا ہندستان پیش کرتا ہوں، وہ 'تاج محل' جو صدیوں کی مشترکہ تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا مرقع ہے اور جس میں اسلاف کے صدیوں کے اتحاد اور کارناموں کی جھلک اب بھی موجود ہے - اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ " ہنوز دلی دور است "—

**ہندی ادبی زبان کی حیثیت سے** ہندی کو ادبی زبان بنانے کی کوشش ابھی زیادہ سے زیادہ پچاس سال سے شروع ہوئی ہے اور چونکہ اس کوشش کی ابتدا اور قومی کانگرس کی ابتدا ایک ہی زمانہ میں تقریباً ساتھہ ہی ساتھہ ہوئی اس لیے مسلمان اس تحریک کو بھی اسی طرح شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس طرح کانگرس کو۔ اور بدقسمتی سے 'اردو' 'ہندی' کا تنازع موجودہ فضا میں اور بھی نقصان رساں ہوگیا ہے مگر یہ دیکھہ کر بیشک کسی قدر اطمینان ہوتا ہے کہ اس کو رفع کرنے اور دونوں زبانوں کے مبلغین کو کسی ایک نقطے پر متحد کرنے کی کوشش شروع ہوگئی ہے - چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور بابو راجندر پرشاد کے مابین حال ہی میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اس نے ایک ایسی زبان کے لیے میدان تیار کردیا ہے جس کو

هندو اور مسلمان دونوں کی زبان کہا جاسکے گا اس مفاهمت کی رو سے هندستانی وہ زبان کہلائی جاے گی جو شمالی هندستان میں مشترکہ طور پر سب سے زیادہ بولی جاتی هے' لغت میں الفاظ کے داخل و خارج کرنے کا معیار رواج کو قرار دیا جاے گا اور هندستانی کو ملک کی مشترکہ عام زبان بنانے میں هندو مسلمان دوش بدوش کوشش کریں گے' یہ زبان اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاے گی اور تمام دفتری و تعلیمی کاموں میں اسی کو استعمال کیا جاے گا نیز اردو اور هندی دونوں زبانوں کو نشو و نما اور ترقی کی پوری آزادی حاصل هوگی۔ اور اس کی بھی کوشش کی جاے گی کہ هندی اور اردو کے اهل زبان باهم مشورے اور تعاون سے اساسی هندستانی کی لغت مرتب کریں یہ بھی تجویز هے کہ ایک مختصر سی نمایندہ کمیٹی اس غرض سے قائم کی جائے کہ وہ ایسی لغت مرتب کرنے کی عملی تجاویز پیش کرے نیز زبان کے متعلق دوسرے اهم مسائل مثلاً فنی اصطلاحات وغیرہ کا فیصلہ کرے۔

**مدرسوں میں اردو کا رواج** آپ لوگوں کو معلوم هوگا کہ آندهرا کے علاقے' اضلاع مفوضہ' شہر مدراس اور سالیم' کوئمبٹور' نیلگری اور ترچناپلی وغیرہ اضلاع میں مسلمانوں کے ابتدائی مدرسوں میں هندستانی هی ذریعہ تعلیم هے - صوبۂ مدراس کے تمام ثانوی مسلم مدارس میں هندستانی دوسری لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی هے - حکومت کی طرف سے سنہ ۱۹۰۱ ع میں جو مسلم ایجوکیشن کمیٹی مقرر هوئی تھی اس کی سفارش کی بنا پر حکومت نے منظور کرلیا هے کہ ایسے تمام ورنا کیولر مدارس میں جہاں مسلمان طلبہ کی کافی تعداد هو ان کے لیے هندستانی کی تعلیم کا بندوبست کیا جاے - حکومت نے یہ بھی

قرار دیا ہے کہ ان مقامات پر جہاں مسلمانوں کے جدا مدرسے نہیں ہیں وہاں دوسرے غیر مسلم مدارس میں مسلمان طلبہ کے لیے اردو پڑھانے کے واسطے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ان مدارس میں مسلمان مدرسین کی مناسب تعداد مقرر کی جائے - چنانچہ معلمین کی تعلیم کے لیے کئی مدرسے اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ وہاں مدرسین کو تمام مضامین اردو زبان میں پڑھانے کی مشق کرائی جاتی ہے لیکن اگر ان اساتذہ کو ساتھ ہی ساتھ دیوناگری بھی پڑھائی جایا کرے تو وہ ان طلبہ کو بھی تعلیم دے سکیں گے جو هندستانی کو هندی رسم الخط کے ذریعہ سیکھنا چاہتے ہیں —

مجھے تامل اضلاع کے اپنے حالیہ دورے میں یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ مسلمان اردو کی تعلیم کے لیے تو اس قدر مصر ہیں لیکن بعض مسلم مدرسوں میں بھی اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے - علاوہ بریں ملیبار میں اردو پڑھانے والوں کی شدید مانگ ہے مگر مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اس کو پورا کرنے کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو جس کی ایک شاخ ابھی حال ہی میں مدراس میں بھی قائم ہوئی ہے اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ صرف مدراس کے مسلم و دیگر مدارس میں اردو پڑھانے والوں کا انتظام کرے بلکہ اس کا بھی اهتمام کرے کہ لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں هندستانی کی تعلیم حاصل کرسکیں - مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ وہ طریقہ جو ان طلبہ کو هندستانی لکھنا پڑھنا سکھانے میں اختیار کیا جاسکتا ہے جن کی مادری زبان هندستانی ہے ان طلبہ کے لیے مناسب نہ ہوگا جو هندستانی کو محض اجنبی

زبان کی حیثیت سے بالکل ابتدا سے سیکھنا شروع کریں گے اور یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کے لیے جو درسی کتابیں ہوں گی وہ موخرالذکر کے لیے موزوں ثابت نہ ہوں گی —

**ثانوی مدارس میں ہندستانی کی تعلیم**

میں نے شروع سے ہی ہندی پرچار کی تحریک کو خوش آمدید کہا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس ذی اثر ادارہ کی کوششوں کی بدولت مدراس میں ہندستانی زبان اچھی طرح رواج پاجائے گی اور میں اس کامیابی پر جو اس تھوڑے ہی عرصہ میں ہوئی ہے اس کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں' حال ہی میں مدارس کی کانگرسی کابینہ نے یہ طے کیا ہے کہ تمام مدارس میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخط کے ساتھ ' ہندستانی ' کو لازمی مضمون قرار دیا جائے - اس اقدام سے مسلمانوں کی اس کوشش میں بھی کہ پورے صوبہ مدراس میں مسلمانوں کے تمدنی ارتقا کے لیے اردو کو ذریعہ بنائیں بڑی مدد ملے گی علاوہ بریں حکومت کے اس اقدام کی بدولت مسلمانوں کو تامل ناڈ ' کنارا ' کیرالا اور آندھرا کے اضلاع میں ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے اور ان سے ربط بڑھانے میں بھی بہت مدد ملیگی بلکہ شمال اور جنوب کے باشندوں میں فی الوقت جو اجنبیت سی پائی جاتی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی - میں اس تجویز کو ان لوگوں کے غور کے واسطے پیش کرتا ہوں جن کو اس مسئلہ سے خاص طور پر دلچسپی ہے —

**ہندستانی کلچر سوسائٹی**

میری رائے میں انجمن ترقی اردو اور ہندی پرچار سبھا کو اس مشترک مقصد کے حصول میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہیے کہ ہندستانی کو سارے ملک کی مشترکہ

قومی زبان بنا دیا جاے'. میں ایک عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ مدراس میں ایک هندستانی کلچر سوسائٹی قایم کروں مگر اب وقت آگیا ہے کہ میری یہ دیرینہ تمنا پوری ہو —

میری راے میں طلبہ کی حد تک رسم الخط کا انتخاب اختیاری رکھا جائے مگر مدرسین کو دونوں رسم الخط سے واقف ہونا ضروری ہونا چاهیے - اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو اور هندی زبانوں میں فی زمانہ جو بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی ان سے وہ هندو اور مسلمان دونوں استفادہ کرسکیں گے جو اپنے رسم الخط کے علاوہ دوسرے رسم الخط سے بھی واقف ہیں —

**هندستانی یونیورسٹی**

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ہی حقیقی معنوں میں ایک ایسی جامعہ ہے جس کو صحیح طور سے هندستانی جامعہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ وهاں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے - اور اب بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ بنارس کی هندو یونیورسٹی اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے بجائے هندستانی ہی ذریعۂ تعلیم ہو جائے گی اور یہ تینوں جامعات مل کر مستقبل کے عظیم تر هندستان کے لیے اس کے شایان شان تمدن کا گہوارہ بنیں گی —

**فرقہ واری اتحاد**

میرا ایک خوشگوار فریضہ یہ بھی ہے کہ دکھشنا بھارت هندی پرچار سبھا کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے اس عام جلسہ میں ایک ایسے موضوع پر خطاب کرنے کا موقعہ ملا جو مجھے بہت ہی عزیز ہے مجھے امید ہے کہ میرے اس خطبہ کو جو ایک پر خلوص دل کی صدا ہے' هندو اور مسلم دونوں اسی نظر سے دیکھیں گے - ساتھ ہی میری آستدعا ہے کہ اس صوبے کے هندو مسلمان آپس میں ایسے مناقشات و تعصبات

کو جگہ نہ دیں جن کا رنگ اور اثر شمالی ہند کی بعض تحریکوں میں بری طرح نمایاں ہے - نیز ہندستانی کی اشاعت سے ہمارا مقصد صرف یہ نہ ہونا چاہیے کہ ملک کے تمام صوبوں کے باشندوں کو ایک رشتہ میں منسلک کردیں بلکہ ہمارا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہر صوبے کے مختلف فرقوں میں باہم اتحاد و محبت پیدا کردیں —

آخر میں میں اپنے تمام ہندو اور مسلمان دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں " ہندستانی " کا لفظ استعمال کیا کریں تاکہ یہ معلوم ہو کہ جس زبان کی اشاعت اور ترقی مقصود ہے وہ ایک مشترکہ قومی زبان ہے اور کسی خاص رسم خط کی ترقی یا فروغ پیش نظر نہیں ! —

# افکار و واقعات

## ۱ - الہ آباد کی شاخ

### ( از اڈیٹر )

وسط دسمبر میں مجھے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا - آل انڈیا اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں یہ طے ہوا تھا کہ الہ آباد میں انجمن کی ایک مرکزی شاخ قائم کی جائے - اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی اور مولوی خلیل الرحمن صاحب کے مشورے سے بعض صاحبوں کو اس بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مدعو کیا گیا - اس جلسے میں بیس صاحب شریک تھے - کچھ دیر تک انجمن ترقیِ اردو اور اس کی مرکزی شاخ قائم کرنے پر گفتگو رہی —

۱ - علی گڑھ کی اردو کانفرنس میں طے ہوا تھا کہ صوبۂ متحدہ میں تین مرکز قائم کیے جائیں (الہ آباد، لکھنؤ اور علی گڑھ) مگر اضلاع کی تقسیم نہیں کی گئی تھی - بعد کافی بحث کے یہ قرار پایا کہ الہ آباد کے مرکز سے متعلق حسب ذیل ضلعے ہوں گے :-

الہ آباد، کان پور، فتح پور، جھانسی، اورئی، باندہ، ہمیر پور، مرزا پور، بنارس، اعظم گڑھ، غازی پور، جون پور، بلیا، گورکھ پور اور بستی —

۲ - قرار پایا کہ مناسب ہوگا کہ اگر لکھنؤ اور علی گڑھ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی :-

(ا) لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، پرتاب گڑھ، سلطان پور، فیض آباد، گونڈہ، بارہ بنکی، کھیری (لکھیم پور) سیتا پور اور ہردوئی -

(ب) علی گڑھ، متھرا، آگرہ، ایٹہ، بلند شہر، اٹاوہ، فرخ آباد، مین پوری، مظفر نگر، بجنور، سہارن پور، بدایوں، مراد آباد، بریلی، پیلی بھیت، شاہ جہاں پور، نینی تال، المورا، گڑھوال، ڈیرہ دون اور میرٹھ —

۳ - قرار پایا کہ ضلع الہ آباد میں اردو سروے کا کام فوراً شروع کردیا جائے - کچھ اصحاب منتخب کیے جائیں کہ وہ دیہات میں جاکر ہر مقام کے متعلق دریافت کریں کہ وہاں کون کون سے مدرسے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے یا نہیں؛ اور اگر ہے تو کیا انتظام ہے - اردو کے طالب علموں کے لیے کیا سہولتیں ہیں اور کیا دقتیں یا موانع - سروے کا کام جہاں تک جلد ہوسکے ختم کیا جائے؛ مگر کسی حالت میں تین مہینے سے زیادہ نہ گزرنے پائیں-

۴ - قرار پایا کہ اردو نصاب کی کتابیں جو آج کل اس صوبے میں رائج ہیں ان کا ایک ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ صدر انجمن ترقیٔ اردو ان پر تنقید کرے -

۵ - بعد بحث کے قرار پایا کہ اردو لکھنے پڑھنے کی تعلیم چھ ہفتے کی مدت میں بہ آسانی دی جاسکتی ہے - اس سلسلے میں ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی جس کے رکن حسب ذیل اصحاب مقرر کیے گئے-

(ا) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب -

(۲) مفتی فخر الاسلام صاحب -

(۳) مولوی ظفر احمد صاحب انصاری -

۶ - اس جلسے میں انیس اردو الہ آباد کے معتمد اور متعدد اراکین موجود تھے، جن سے معلوم ہوا کہ یہ انجمن اردو ادب اور زبان کے لیے مفید کام کر رہی ہے - اور اگر انجمن ترقیء اردو اسے اپنی شاخ بنانا پسند کرے تو غالباً انجمن انیس اردو کی انتظامی کمیٹی اسے پسند کرے گی - اس بنا پر انجمن ترقی اردو کی طرف سے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے انجمن انیس اردو کو دعوت دی کہ وہ بطور انجمن ترقیء اردو کی شاخ کے کام کرے - انجمن انیس اردو کے معتمد اختر حسن صاحب نیز اس کے رکن انتظامی مفتی فخرالاسلام صاحب نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ اس کی تحریک انجمن انیس اردو کی انتظامی مجلس میں کریں گے -

۷ - حسب ذیل اصحاب انجمن اردو، شاخ انجمن ترقیء اردو کے انتظامی کمیٹی کے رکن تجویز کیے گئے؛ مگر الحاقی کارروائی کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا قطعی فیصلہ ملتوی رکھا گیا -

(۱) صدر مولوی مقبول احمد صاحب صمدانی -

(۲) نائب صدر مولوی سید حبیب احمد صاحب -

(۳) معتمد مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب -

(۴) نائب معتمد مولوی سید اختر حسن صاحب -

(۵) ایک نمائندہ مسلم ہوسٹل کا جو وہاں کی یونین منتخب کرے گی -

(۶) مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی -

(۷) مولوی عبدالحفیظ صاحب، معلم گورنمنٹ کالج -

(۸) مفتی فخر الاسلام صاحب۔

(۹) مجیب الرب صاحب۔

(۱۰) حمید اللہ صاحب۔

(۱۱) ظفر احمد صاحب انصاری۔

۸۔ جو صاحب اس جلسے میں شریک تھے انہوں نے مختلف اضلاع کے بعض ایسے اصحاب کے نام لکھوائے جن سے یہ توقع ہے کہ وہ انجمن کے کام میں ہر طرح مدد دیں گے۔

مسلم ہوسٹل کی دعوت پر میں وہاں کے طلبہ سے ملا۔ اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب اور میں نے طلبہ سے انجمن کے مقاصد کے متعلق گفتگو کی۔ طلبہ نے کام کرنے کی آمادگی ظاہر کی اور ان طلبہ کی فہرست مہیا کرنے کا وعدہ کیا جو تعطیلات میں اپنے اپنے ضلع میں کام کریں گے۔ کام کی نوعیت سے بھی انہیں آگاہ کیا گیا۔

## ۲۔ سندھ میں اشاعت اردو

اس مرتبہ میں نے تقریباً دو ہفتے کراچی کے سفر اور قیام میں صرف کیے۔ میرا قیام کراچی میں دس روز رہا۔ انہیں ایام میں سندھ پراونشل اردو کانفرنس کے بھی اجلاس ہوے جس کی مختصر روئداد آگے آئے گی۔ اسی قسم کی کانفرنسیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ عموماً کانفرنس کے بانیوں اور داعیوں کی نیت نیک ہوتی ہے۔ تجویزیں اور قرار دادیں بھی معقول ہوتی ہیں، تقریروں اور بحثوں سے گرمجوشی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ مل کر کام کرنے کا تجربہ بھی ہوجاتا ہے اور معلومات میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے، لیکن کانفرنس ختم ہونے

کے بعد سارا جوش بھی ختم ہوجاتا ہے - لوگ کانفرنس کے ہنگامے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کس مقصد سے کی گئی تھی اور اس کے بعد بھی کچھہ کرنا ہوگا - ہمارے کاموں میں ناکامی اکثر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم ذریعہ کو مقصود بالذات سمجھہ لیتے ہیں - اس لیے ہم نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ کانفرنس میں قرار دادیں زیادہ نہ ہوں صرف چند ہوں جو ضروری اور قابل عمل ہوں اور پھر منظور ہونے کے بعد اُن پر فوراً عمل بھی شروع کردیا جاے - چنانچہ اسی غرض سے میں کانفرنس کے بعد بھی کراچی میں ٹھیرا رہا، مقامی حالات سے واقفیت حاصل کی اور وہاں کے با اثر اور معزز اصحاب سے ملاقاتیں کی اور بہت کچھہ غور و فکر کے بعد سندھ میں اردو کی اشاعت کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب کی ایک مختصر مجلس قائم کی —

جناب خان صاحب بابو فضل الٰہی صاحب (صدر)

جناب شیخ عبدالمجید صاحب پارلیمنٹری سکرٹری لیجس لیٹیو کونسل صوبہ سندھ —

جناب ڈاکٹر حاجی عبدالمجید صاحب

جناب سیٹھہ طیب علی صاحب علوی

جناب مولانا محمد صادق صاحب فاضل دیو بند

جناب شعبان صاحب ایم - ایل - سی

جناب حاتم اے علوی (معتمد)

یہ سب صاحب اپنے اثر اور عمل کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اور اِس کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور کام کرنے کے لیے آمادہ ہیں - حاتم علوی صاحب معتمد مجلس کی مدد کے لیے ایک تنخواہ دار

مددگار بھی دیا۔ اس لیے محمد مجتبیٰ صاحب کا انتخاب کیا گیا جو
اپنی مستعدی اور فرض شناسی کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔
اس مجلس کی ترتیب کے بعد عملی کارروائی بھی فوراً شروع کردی گئی
اور مجھے پوری امید ہے کہ سندھ میں اشاعت اردو کے متعلق جو
تدبیریں سوچی گئی ہیں اس میں ہمیں ضرور کامیابی ہوگی —

کراچی میں انجمن کی ایک شاخ تقریباً اٹھارہ سال سے قائم ہے
اور اس کا ایک کتب خانہ اور مطالعہ خانہ بھی ہے۔ اور وہ ادبی
جلسے اور مشاعرے بھی کرتی رہتی ہے لیکن بعض وجوہ سے وہ کراچی
سے باہر کام کرنے سے قاصر ہے اس لیے اس کام کے لیے ایک خاص مجلس
قائم کرنے کی ضرورت واقع ہوئی —

ایک شب کو مسلم ہوسٹل کے طلبہ نے مجھے مدعو کیا۔ میں نے اپنے
مقصد کے متعلق اُن کے سامنے تقریر کی اور بعض طلبہ سے اس بارے
میں گفتگو رہی جنھوں نے اردو کی اشاعت کے لیے کام کرنے کا وعدہ کیا۔

میں بابو فضل الٰہی صاحب، شیخ عبدالمجید صاحب، سیٹھ طیب
علی علوی صاحب، حاتم اے علوی صاحب، مولوی نورالحق صاحب،
خان بہادر محمد دین صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے
اپنے مشورے وغیرہ سے مجھے اس کام میں بہت مدد دی —

## سندھ پراونشل اُردو کانفرنس

### (کراچی)

ہم ۳۰ دسمبر کو کراچی میل کے ذریعے کراچی سٹی سٹیشن پر پہنچے۔ مجلس
استقبالیہ کمیٹی کے ارکان پلیٹ فارم پر موجود تھے انھوں نے نہایت شاندار

استقبال کیا۔ خاں صاحب بابو فضل الہی گورنمنٹ کنٹریکٹر کے مکان پر ہمیں ٹھہرایا گیا۔ دن بھر مقامی لوگ آتے جاتے رہے۔ شام کو مقامی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک خاص اجلاس کا انعقاد ہوا جس میں شیخ عبدالمجید صاحب ایم ایل اے۔ خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجینیر۔ مولوی دین محمد صاحب وفائی ایڈیٹر "الوحید"۔ ڈاکٹر حاجی عبدالمجید صاحب صدیقی۔ مولانا نورالحق صاحب ندوی پروپگینڈ سکرٹری کانفرنس سیٹھ فدا حسین محمد علی کوئٹہ والے اور چند دیگر اصحاب نے شرکت فرمائی۔ پورے ایک گھنٹہ کی گفتگو کے بعد کانفرنس کے غور کے لیے تجاویز کا خاکہ تیار کیا گیا —

۳۱ دسمبر سنہ ۳۷ ع کو تین بجے سہ پہر خالقدینہ ہال میں کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ مسٹر عبدالرب نے "اُردو زبان ہماری" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ محمد ہاشم صاحب گزدھر ایم ایل اے صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا۔ گزدھر صاحب کی تحریک اور شیخ عبدالمجید صاحب کی تائید سے مولانا عبدالحق صاحب صدر جلسہ منتخب ہوے۔ راؤ بہادر شیورتن مہار نے اُردو میں تقریر کرتے ہوے مولانا کو پھولوں کا ہار پہنایا۔ صدر مجلس استقبالیہ نے ان اصحاب کی طرف سے آئے ہوئے پیغامات پڑھ کر سنائے جو اپنی بعض دیگر مصروفیتوں وغیرہ کی بنا پر کانفرنس میں شرکت نہ فرماسکے۔ مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں :- (۱) سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعظم صوبہ سندھ - (۲) ہزہائی نس سر آغا خان - (۳) سر عبداللہ ہارون - (۴) سید سلیمان ندوی - (۵) دیانرائن صاحب 'نگم' ایڈیٹر "زمانہ" کانپور۔ (۶) وزیر صاحب ریاست خیرپور —

مولانا عبدالحق صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھا جو حاضرین کے لیے ایک زبردست پیغام عمل تھا - بعدہ سبجکٹ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا —

شرکائے کانفرنس کی تفریح طبع کے لیے دوسرا اجلاس ۹ بجے شب طرحی مشاعرہ کی صورت میں رکھا گیا تھا جو علامہ سیماب اکبرآبادی کی صدارت میں ساڑھے گیارہ بجے تک رہا - بہت سے مقامی شعرا نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا —

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع - صبح گیارہ بجے سبجکٹ کمیٹی کا خاص اجلاس شروع ہوا - آٹھ ریزولیوشن مرتب کیے گئے مختلف اصحاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا —

دوسرا اجلاس تین بجے سہ پہر کو شروع ہوا - پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ 'کیفی' نے اپنی ایک خاص مسدس سناکر اجلاس کا افتتاح فرمایا - تمام ریزولیوشن یکے بعد دیگرے مدلل اور موثر تقاریر کے ذریعے بالاتفاق منظور ہوئے —

تیسرا اجلاس پھر طرحی مشاعرہ پر مشتمل تھا جناب کیفی کی صدارت میں نو بجے شب منعقد ہوا - مقامی شعرا نے اپنا اپنا کلام سنانے کے بعد حضرت 'کیفی' سے درخواست کی کہ وہ بھی حاضرین کو اپنے ارشادات سے مستفیض فرمائیں چنانچہ انہوں نے اپنی بیاض سے بعض چیدہ چیدہ نظمیں سنائیں جو نوجوانوں کے لیے خضر راہ کا کام دیتی تھیں —

---

# سندھ پراونشل اردو کانفرنس

## کراچی

کے اجلاس منعقدہ یکم جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع میں مندرجۂ ذیل
ریزولیوشن بالاتفاق منظور ہوئے

۱ - سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا یہ اجلاس سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) کے انتقال پر دلی جذبات رنج و الم کا اظہار کرتا ہے - مرحوم اپنی وجاہت، اعلیٰ قابلیت اور قومی ہمدردی اور مخصوص خصوصیات کی وجہ سے ہماری قوم کے بے نظیر شخص تھے - ان کی بے وقت وفات سے ملک اور قوم کو اور خصوصاً آل انڈیا انجمن ترقی اردو کو جس کے وہ صدر تھے سخت نقصان پہنچا ہے - کانفرنس کا یہ اجلاس ان کی والدہ ماجدہ اور ان کے فرزندوں اور عزیزوں سے اس صدمہ میں دلی ہمدردی رکھتا ہے —

محرک :— خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجنیر

موید :— مولوی ثناء اللہ خاں صاحب

تمام حاضرین جلسہ نے کھڑے ہوکر اس رزولیوشن کو منظور کیا —

۲ - اِس کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے اضلاع میں جس قدر عربی مدارس موجود ہیں ان سب کی مکمل فہرست تیار کی جائے اور ان مدارس کے مہتمم صاحب کی توجہ اس طرف منعطف کرائی جائے کہ وہ اردو زبان کی تعلیم کو بھی اپنے نصاب میں داخل کریں —

محرک :— ڈاکٹر حاجی عبدالمجید صاحب صدیقی

موید :— مولانا محمد صادق صاحب فاضل دیوبند

موید تائید :— مولانا نورالحق صاحب ندوی

۳ - یہ کانفرنس حسب تحریک آل انڈیا انجمن ترقی اردو یہ مناسب اور ضروری خیال کرتی ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو سندھ کے تمام اضلاع میں انجمن کی شاخیں قایم کی جائیں اور ہر مقام کے حالات کے مطابق اسی "طریق کار" کو عمل میں لانے کی کوشش کی جائے جو صدر انجمن نے اپنی شاخوں کے لیے مرتب کیا ہے —

محرک :— مولوی ثناءاللہ خاں صاحب

موید :— ملک حاجی عبدالعزیز صاحب

۴ - یہ کانفرنس مسلم ہوسٹل کے طلبہ سے استدعا کرتی ہے کہ جب وہ اپنے مقامات اور دیہات میں جائیں تو وہاں کے لوگوں کو اردو زبان کے حاصل کرنے کا شوق دلائیں - یہ کانفرنس حسب ضرورت ان کو ہر قسم کی مدد دینے میں کوشش کرے گی —

محرک :— جناب محمد ہاشم صاحب گزدھر ایم ایل اے

موید :— خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجنیر

۵ - سنہ ۱۹۲۹ ع میں بذریعۂ ریزولیوشن نمبر ۲۱۴ کراچی میونسپل اسکول بورڈ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندی اور اردو کو بطور اختیاری مضمون تمام میونسپل پرائمری مدارس میں رائج کیا جائے - اس ریزولیوشن کی تعمیل کرتے ہوئے افسران اسکول بورڈ نے ہندی کی تعلیم تو فوراً جاری کردی لیکن اردو کی تعلیم کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا - لہذا یہ کانفرنس میونسپل اسکول بورڈ سے

استدعا کرتی ہے کہ جلد از جلد اس تجویز پر عمل درآمد شروع کرکے پھر اردو مدارس میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرے —

محرک :— جناب غلام علی صاحب الانا

موید :— حافظ شریف حسین صاحب

۶ - یہ کانفرنس اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کے لیے نہایت ضروری خیال کرتی ہے کہ سندھ کے مشائخ اور علمائے کرام سے اس قومی کام میں مدد لی جائے۔

محرک :— پیر غلام مرتضیٰ صاحب سرہندی

موید :— ماسٹر محمد رشید صاحب

۷ - یہ کانفرنس سررشتۂ تعلیم صوبۂ سندھ سے درخواست کرتی ہے کہ جن ہائی اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں اردو کی تعلیم کے لیے اسی طرح علحدہ مدرسین مقرر کئے جائیں جس طرح عربی فارسی اور دیگر مضامین کے لیے مقرر ہیں کیونکہ موجودہ انتظام میں اردو کے لیے الگ مدرسین نہیں ہیں جس کی وجہ سے اردو کی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے —

محرک :— حکیم فتح محمد صاحب سیوہانی

موید :— سیٹھہ فدا حسین محمد علی کوئٹہ والے

۸ - یہ کانفرنس گورنمنٹ سندھ سے درخواست کرتی ہے کہ لیاری کوارٹر میں جس طرح لڑکوں کے لیے جبری تعلیم کے احکام نافذ ہیں اور ان سے بہت حد تک کامیابی ہوئی ہے اسی طرح تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے لڑکیوں کی جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ بھی کیا جائے —

محرک :— مریم زمانی بیگم حافظ شریف حسین صاحب

موید :— لیڈی ڈاکٹر حوّا باقی صاحبہ

موید تائید :— سیٹھہ طیب علی صاحب علوی

# ۴ - مدراس گورمنٹ اور هندی کی اشاعت

آنریبل مسٹر بی - گوپال ریڈی' وزیر لوکل سیلف گورمنٹ نے مسلم (علاقۂ مدراس) میں آل سوتھہ انڈیا هندی پرچارک کانفرنس کا افتتاح کرتے وقت فرمایا - " هندی کی تعلیم نہ صرف زبان کی اشاعت کا ذریعہ هوگی بلکہ قومی استحکام کا بھی موجب هوگی " - نیز انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ مدراس میں هندی کے رواج دینے کی اسکیم مرتب کی جارهی هے اور مجھے یقین هے کہ جو اصحاب اس جلسے میں حاضر هیں وہ گورمنٹ کی اس تجویز کی پوری پوری تائید کریں گے - مجھے قوی امید هے کہ هندی کے جھنڈے کے نیچے هم سب ایک هوجائیں گے اور متفقہ طور پر قومی استحکام کے لیے کام کریں گے —

مسز امب جوم مل ( ڈاکٹر مسٹر ایس - سری نواس آینگار ) نے جو اس جلسے کی صدر تھیں فرمایا - " اب کہ وزارت مدراس نے هندی کو مدرسوں میں لازم قرار دیدیا هے ' لہذا همارا فرض هے کہ هم حکومت کی مساعی میں اس کے ساتھہ پورا پورا تعاون کریں " - ( سندھ آبزرور )

ایک طرف تو انڈین نیشنل کانگریس کا یہ فیصلہ هے کہ ملک کی زبان هندستانی هوگی اور دوسری طرف اس کی سب سے زبردست حکومت هندی کو مدارس میں لازمی اور جبری بنانے کی کوشش کر رهی هے - یہ عجب قسم کا دوغلہ پن هے - مدراس گورمنٹ نے پہلے بھی اسی قسم کی حرکت کی تھی اور اس پر بہت شور غل مچا تھا تو وزیر اعظم سی گوپال چاریار نے اپنا بیان شایع کیا لیکن وہ بالکل نا کافی تھا - انہوں نے

اطمینان دلایا تھا کہ مسلمان طلبہ کو ناگری رسم خط استعمال کرنے پر مجبور نہیں کیا جاے گا - یہ گویا مسلمان طلبہ کے حق میں بہت بڑی رعایت فرمائی ہے - میں نے اس بارے میں سیٹھہ یعقوب حسن کو لکھا - جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ " مسٹر سی گوپال چاریار اور وزیر تعلیم ڈاکٹر سبارایں نے صاف طور پر یہ اعلان کردیا ہے کہ ہندستانی کی تعلیم لازمی ہوگی - ہندی دیوناگری رسم خط کے ساتھہ ہندؤں اور دوسروں کے لیے اور اردو فارسی رسم خط کے ساتھہ مسلمانوں کے لیے " - یہاں سیٹھہ یعقوب حسن نے بھی دوسرے مدراسیوں کی طرح ہندی ' ہندستانی اور اردو کو خلط ملط کردیا ہے - میرا کہنا یہ ہے کہ کسی کانگریس حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے صوبے میں ہندی کی اشاعت کرے - اردو اس صوبے میں کئی صدی سے رائج ہے اور مسلمان آبادی کی ایک تعداد کثیر کی مادری زبان ہے اور سررشتۂ تعلیم نیز گورنمنٹ نے اسے صوبۂ مدراس کی دیسی زبانوں میں تسلیم کرلیا ہے - لیکن ہندی اس صوبے کی زبان کبھی تھی نہ ہے اور اس بنا پر اس کا مدارس میں لازمی اور جبری طور پر داخل کرنا قطعی ناجائز ہے - کہتے ہیں کہ انسان کے قول و فعل میں مطابقت ہونی چاہیے - لیکن شاید سیاست میں یہ رسم نہیں ہے - اور خاص کر مدراسی سیاست میں —

## ۴ - سیٹھہ یعقوب حسن اور اُن کا خطبۂ صدارت

### ( ہندی پرچار سبھا میں )

سیٹھہ یعقوب حسن صاحب مدراس حکومت کے وزرا میں سے ہیں -

انہوں نے حال ہی میں "دکھنا بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس" کے ساتویں جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت فرمائی اور خطبۂ صدارت پڑھا جس کا ترجمہ ہم نے اسی رسالے میں کسی دوسری جگہ درج کیا ہے - اگرچہ اس خطبے میں کہیں کہیں واقعات کی خفیف غلطیاں ہیں لیکن انہوں نے بڑی خوبی سے اردو ہندی اور ہندستانی کی اصل اور ان کے تعلقات کو بتایا ہے —

خطبے کے آخری حصے میں انہوں نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ مدراس کی کانگریس کیبنٹ نے یہ طے کیا ہے کہ ثانوی مدارس میں ہندستانی زبان ( ہندی اور اردو رسم خط کے ساتھ ) لازمی قرار دی جائے - اس بیان میں ہندی اردو رسم خط کے الفاظ مبہم ہیں - آیا اس کا یہ مطلب ہے کہ طلبہ کو دونوں رسم خط سکھائے جائیں یا ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جاے گا کہ جس رسم خط کو چاہیں اختیار کریں - ان کا مطلب غالباً یہی ہے کہ رسم خط کا معاملہ طلبہ کی مرضی پر منحصر ہوگا - یہ اندیشے سے خالی نہیں - کیونکہ مدارس میں اکثر و بیشتر اور بعض صورتوں میں سب کے سب ہندو مدرس ہونگے' ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی جماعتوں کے مسلمان طلبہ کو اردو رسم خط سکھائیں گے' ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے - اس کا یہ جواب دیا جائیگا کہ مدرسین کو ٹریننگ اسکولوں میں رسم خط کی تعلیم دی جاے گی - یہ جواب بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا عمل میں آنا مشکل ہے - اس میں کئی مشکلیں ہیں - ایک تو یہ کہ آیا ٹریننگ اسکولوں میں اردو رسم خط کی ایسی کافی تعلیم دی جاے گی کہ مدرس اردو کے طلبہ کو بخوبی تعلیم دے سکیں - دوسری مشکل یہ ہے کہ آیا وہ اردو رسم خط کی تعلیم

اُسی شوق سے دیں گے جیسے ہندی رسم خط کی - تیسری مشکل ہندستانی زبان کے نصاب کی ہے - یہ تو ثانوی مدارس کا ذکر ہے - تحتانی اور وسطانی مدارس میں کیا ہوگا یہ کچھ معلوم نہیں - غالباً اس کے لیے موجودہ صورت برقرار رہے گی - یعنی اردو کے مدارس جدا ہونگے اور دوسری دیسی زبانوں (تامل، تلنگی، ملیالم) کے جدا - بہر حال مدراس حکومت کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کے صوبے میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی مادری زبان اردو ہے اور تقریباً کل مسلمان اردو کو اپنی قومی سمجھتے ہیں اور اس کے پڑھنے کے شایق ہیں - تعلیم کی کوئی تجویز بھی ہو، اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری اور لازم ہوگا —

یعقوب حسن صاحب نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ہندی پرچار سبھا اور انجمن ترقی اردو کو ہندستانی کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے - یہ مشورہ نیا نہیں ہے - اس سے قبل بھی بعض نیک دل بزرگوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ باہمی مشورے اور اتفاق سے ہندستانی زبان کی تشکیل ایسی کی جاے کہ وہ بات چیت کے علاوہ ادب و انشا کے کام بھی آجاے - یہ مشورہ ناقابل عمل تو نہیں مگر دشوار ضرور ہے - اس کے لیے بہت کچھ صبر، بے تعصبی، کشادہ دلی اور صحیح ذوق کی ضرورت ہے - اگر فریقین میں سے چند شخص ان صفات کے مل جائیں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے - اور اب تک بہت کچھ ہو جاتا اگر گاندھی جی بیچ میں نہ کود پڑتے - انہوں نے بجائے اس کے کہ ہندستانی زبان کی طرف توجہ کرتے اپنی ساری کوشش اور محنت ہندی کی اشاعت اور فروغ میں صرف کردی اور اس کی خاطر روپیہ پانی کی طرح بہا دیا - اگر یہ کوشش پنڈت مالوی جی یا کسی دوسرے شخص

کی طرف سے ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس تحریک کا گاندھی جی کی طرف سے ہونا جو ہندو مسلم اتحاد اور مصالحت کے مدعی ہیں' غضب ہوگیا - انہوں نے ایسے وقت یہ بیج بویا کہ آپس کی پھوٹ اور بڑھ گئی اور بڑھتی جاتی ہے۔ بڑوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں —

## ۵ - یو پی کے مدرسوں میں ہندی کی کیفیت

چند روز ہوئے علی گڑھ سے ایک قابل پر جوش طالب علم کا خط وصول ہوا اُن کے بیانات پر مجھے اعتماد ہے - کوئی بات ایسی نہیں لکھیں گے جو بے بنیاد ہو۔ ذیل کے اقتباسات پڑھنے کے قابل ہیں —

" ابھی یہاں دس بارہ روز ہوئے ہردوا گنج میں جو علی گڑھ سے سات آٹھ میل ہے یو پی پولیٹکل کانفرنس ہوئی تھی - پنڈت جواہر لال نہرو' موہن لال سکسینہ اور اسی قسم کے لیڈر جمع تھے - تقریریں ہو رہی تھیں - تو مولوی صاحب یہ سمجھیے کہ کسی نے بھی تو ایسی زبان میں تقریر نہیں کی جسے خالص ہندستانی کہا جا سکے جسے ہم لوگ بولتے ہیں - یعنی یہ کہ رُک رُک کے سوچ سوچ کے برابر ہندی کے الفاظ لائے جا رہے اور سنائے جا رہے تھے - حالانکہ وہ اُن ہندستانی الفاظ کو بہ آسانی بول سکتے تھے جو عام طور پر رائج ہیں' لیکن زبردستی! ... ... ... سکسینہ کی تو کئی مرتبہ یہ حالت ہوئی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ وقت کم رہ گیا ہے اور بولنا زیادہ ہے تو انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور اُس وقت اُن کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ اردو کے تھے" —

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں : -

" میرے ایک دوست ... ... میں ڈپٹی کلکٹر ہیں - وہ ابھی دیہات میں اپر پرائمری اسکولوں کے معائنے کے لیے بھیجے گئے تھے - میری کمزوری شوق سے واقف ہیں - چنانچہ جو کچھ ہندی کا پرچار انھوں نے وہاں دیہات میں دیکھا اُس کی تفصیل ایک خط کے ذیل کے جملوں سے معلوم ہو سکتی ہے " —

" ... ... اب بڑی مصیبت یہ ہے کہ اردو زبان کو بالکل ہی نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - جو فارسی الفاظ کہ دیہات میں معمولی معمولی کسانوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ان کی بجائے زبردستی ہندی سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے - ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے اسکولوں کے معائنہ کا اتفاق مجھے ہوا - مسلمان مدرس ایک بھی نظر نہ آیا - دو چار مسلمان لڑکے جو ہیں وہ بھی ہندی پڑھ رہے ہیں - اُن کو احساس کیا ، جیسا ماسٹر صاحب نے کہا ویسا پڑھا - تم کو شاید معلوم ہوگا کہ اردو اسکولوں ( یا یہ کہیے کہ اپر پرائمری اسکولوں وغیرہ میں ) لڑکے حاضری کے وقت " حاضر جناب " یا " حاضر صاحب " کہہ کر جواب دیا کرتے تھے - میں نے بارہ تیرہ اسکولوں کے معائنے کیے اور تین جگہ میں نے یہ دیکھا کہ حاضر جناب یا حاضر صاحب کی بجائے " اُپستھت شریمان " کا فقرہ رائج کیا جا رہا ہے - لڑکے خود اس کو نہیں سمجھتے ہیں اور اس کا مطلب پوچھنے پر عام فہم فقرہ " حاضر صاحب " استعمال کر دیتے

ہیں - میں ذیل میں ایک واقعہ درج کرتا ہوں اور امید
کرتا ہوں کہ تم اس کو ڈرامے یا افسانے یا مضمون کی صورت
میں شائع کرنے کی کوشش کروگے -

ایک جگہ ایک اسکول کا معائنہ کر رہا تھا - ایسے موقعوں پر بہت ہی سخت قسم کا Officialdom کا استعمال نہیں ہوتا اور گانو کے کسان، دیہاتی، سیدھے سادے قسم کے لوگ بھی آکر ڈپٹی صاحب کے معائنے کو دیکھنے لگتے ہیں - دس پانچ آدمی اس قسم کے جمع تھے - حاضری شروع ہوی - "اُپستھت شریمان" کے ثقیل نعرے بلند ہونے لگے - کچھہ دیر بعد میں نے ان حاضر کسانوں سے پوچھا کہ اس فقرے کا کیا مطلب سمجھے - جواب ملا "کچھہ نہیں" - تین چار لڑکوں سے پوچھا - جواب نہ دے سکے - آخر میں ایک لڑکے نے بتایا کہ اس کا مطلب حاضر صاحب ہے - اس پر دو ایک کسان کہنے لگے کہ اب سمجھہ میں آیا - میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ تم کو اپنی کتاب میں سے جو سبق سب سے زیادہ پسند ہے اس کا خلاصہ اس طرح بیان کرو کہ یہ دیہاتی تمہارے گانو والے بھی سمجھہ سکیں - لڑکا ایک قصہ اس طرح شروع کرتا ہے —

"بھارت ورش کے پرسدّھ نگر پاٹلی پتر میں ایک راجہ
تھا (راجہ کے لیے بھی ایک ثقیل ہندی لفظ تھا جو اس وقت
یاد نہیں آرہا ہے) اس نے ایک سنگھہ دیکھا" وغیرہ وغیرہ -
میں نے ایک کسان سے پوچھا کہ مطلب سمجھہ میں آیا - اُس
نے جواب دیا کچھہ نہیں - لڑکے سے کہا کہ ایسی سیدھی بولی
میں قصہ کہو کہ یہ لوگ‌؛ سمجھہ سکیں - اب لڑکے نے دوبارہ اس
طرح شروع کیا - "ہندستان کے مشہور شہر پٹنہ میں ایک راجہ

تھا - ایک دن جنگل میں اس نے ایک شہر دیکھا " وغیرہ وغیرہ -

" سینکڑوں الفاظ آپ کو ایسے ملیں گے جو فارسی زبان کے ہیں اور دیہاتی لوگوں وغیرہ کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں - لیکن یہی الفاظ عام بول چال اور خصوصاً موجودہ ٹکسٹ بک وغیرہ سے بہت بیدردی سے نکالے جا رہے ہیں مثلاً خوش (پرسن) - سمے بمعنے وقت - آدمی (پرش یا منش) حاکم (ادھیکاری) - شہر (سنگھٹ) دوستی (مترتا) وغیرہ وغیرہ " -

یہ یہاں کسی تشریح کا محتاج نہیں - یہ اب روز مرہ کی بات ہوگئی ہے - اس رو کو اگر ابھی سے نہ روکا گیا تو زبان ہی کے حق میں نہیں بلکہ سارے ملک کے حق میں بہت مضر نتائج پیدا ہونگے - ہمارے سیاسی سردار زبان کو معمولی چیز سمجھتے ہیں - یہ معمولی چیز نہیں ہے - یہ سیاست ' معاشرت ' تہذیب کی جڑ بنیاد ہے - اس سے کھیلنا ناگ سے کھیلنا ہے - اگر اس معاملے میں انہوں نے خودسری برتی یا تنگ نظری سے کام لیا تو اتفاق و اتحاد کی ساری کوششیں خاک میں مل جائیں گی -

## ۲ - مسٹر بوس اور اردو

مسٹر بوس نے جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہونے والے ہیں ' انگلستان میں ایسٹ انڈ کے سینکڑوں مقیم سکھوں اور ہندو مسلمانوں کے سامنے مشرق و مغرب کے فرق پر ایک سیدھی سادی تقریر اردو زبان میں کی (ٹائمز آف انڈیا - ۱۴ جنوری ۳۸ ع) -

امید ہے کہ دوسرے معزز لیڈر بھی مسٹر بوس کی تقلید کریں گے - مسٹر بوس خوب سمجھتے ہیں کہ ہندستان کی سیاست میں زبان کا کیا درجہ ہے —

## ۷ - ہندی کے جبری رواج پر ملای ہندیوں کی مخالفت

سنگاپور اور ملایا کے دوسرے شہروں میں مدراس کی وزارت کانگرس کی اس تجویز کے خلاف جلسے کیے جا رہے ہیں کہ ہندی کو جبری طور پر مدارس میں پڑھایا جاے - ہندستانیوں کے ایک کثیر اور با اثر طبقے میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہ تجویز درحقیقت ہندی کو ہندستان کی قومی زبان کی تحریک ہے - ان کا خیال ہے کہ مدراس کی اس تجویز سے تامل زبان معطل ہو جاے گی —

مسٹر جی - سرنگا پلی نے سنگاپور میں اپنی تقریر میں کہا کہ ہندی کے حامیوں کا یہ دعوی ہے کہ ہندی کے توسط سے قومی اتحاد مکمل ہو جاے گا - لیکن اُن کے ( یعنی مسٹر سرنگا پلی کے ) خیال میں یہ نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ صرف ایک زبان سے قومی اتحاد وجود میں نہیں آسکتا - ان کی راے میں ہندستان کی زبانوں کی ترقی موجودہ طریقہ ہی پر ہونی چاہیے اور انگریزی دوسرے ایسے مقاصد کے لیے استعمال کرنی چاہیے جن کا تعلق ہمارے گھر گرہستی اور معاشرتی امور سے نہیں ہے - انہوں نے بیان کیا کہ وہ ہندی لیڈر جو انگریزی بولتے ہیں وہ اس "فلاسفانہ فطرت" کا اظہار نہیں کرتے جو ہندی کے حامیوں کی راے میں ناگزیر ہے اگر انگریزی مشترکہ زبان ہو گئی - ہندی کے جبری رواج کے

خلاف هندستان کو رزولیوشن بھیجے گئے " (ٹائمز آف انڈیا) —

حقیقت یہ ہے کہ مدراس میں هندی کو رواج دینا الٹی گنگا بہانا ہے - سوائے اردو کے صوبۂ مدراس میں جتنی زبانیں بولی جاتی هیں وہ سب کی سب دراوڑی هیں اور انہیں هندی سے مطلق کوئی واسطہ نہیں - نہ صرفی و نحوی لحاظ سے نہ رسم خط کے لحاظ سے اور نہ زبان کی ساخت اور اسلوب بیان کے اعتبار سے —

## ۸- سی-پی اور هندی اردو

سی - پی (ممالک متوسط) کی حکومت کے وزیر تعلیم مسٹر شُکلا کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم شایع هوگئی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے :—

۱ - اس کا نام " ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے —

(۲) یہ تعلیم مفت اور جبری هوگی —

(۳) اس کا نفاذ ان تمام دیہات میں هوگا جہاں قابل تعلیم عمر کے چالیس لڑکے لڑکیاں هونگے —

(۴) ذریعۂ تعلیم مادری زبان هوگا —

(۵) ان مدارس میں صرف ایک مدرس رکھا جائے گا —

مسلمانوں کو اس نام پر اعتراض ہے - یہ مسٹر شکلا کی جدت ہے - اور اس پر " ایجاد بندہ " کی مثل صادق آتی ہے - پہلے سے جو نام چلے آرہے هیں ان کو بدلنے کی بظاهر کوئی ضرورت نہیں معلوم هوتی - مجھہ سے بھی مسٹر شکلا سے اس بارے میں گفتگو آئی تھی ' ان کا خیال ہے کہ اس نام " تقدس" کی شان پیدا هو جاتی ہے - بات یہ ہے کہ

باوجود صدہا سال ایک ساتھ رہنے کے ہم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات سے ناواقف ہیں - ہم اپنی بات چیت' تحریر و تقریر اور کردار کے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے سوا دوسرے لوگ بھی اس ملک میں آباد ہیں - جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ذراسی لغزش اور ایک معمولی سے لفظ سے بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے اور اس کا اصل کام پر برا اثر پڑتا ہے - مسٹر شکلا کی نیت نیک سہی لیکن مصلحت وقت کے خلاف ہے —

قطع نظر اس کے اِس تجویز کے رو سے وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے یا جو اردو کے ذریعہ سے تعلیم پانا چاہتے ہیں' اردو زبان سیکھنے سے محروم رہ جائیں گے - اس کی چند وجوہ یہ ہیں —

اول' سی پی میں ایسے دیہات شاذ و نادر ہی ملیں گے جن میں چالیس قابل تعلیم بچے ایسے ہوں جن کی مادری زبان اردو ہو - اگر چہ ہندی ودیا مندر اور مرہٹی ودیا مندر کے ساتھ اردو ودیا مندر کا نام بھی تجویز کیا گیا ہے لیکن یہ نام ہی نام رہے گا - نہ چالیس اردو والے بچے ملیں گے نہ اردو ودیا مندر آباد ہو گا —

دوسرے' ایسے مدرسوں میں صرف ایک ایک مدرس ہوگا - اور ظاہر ہے کہ یہ مدرس یا تو ہندی داں ہوگا یا مرہٹی داں' اردو داں شاید ہی کوئی نکلے —

نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو پڑھنے والوں کے لیے اردو سیکھنے کی کوئی صورت نہ ہوگی - اور چونکہ تعلیم جبری ہوگی اس لیے اُن کو لامحالہ ہندی یا مرہٹی پڑھنی ہوگی - چند سال بعد اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ اس صوبے کی زبان ہندی یا مرہٹی

ہے اردو نہیں - لہذا اردو ودیا مندر تعلیم سے خارج - اس کے بعد دوسرا اندیشہ یہ ہے کہ اِس وقت جو اردو مدرسے جاری ہیں وہ بھی نہ بند کر دیے جائیں —

میری یہ بدگمانی بلا وجہ نہیں ہے اور خدا کرے یہ غلط ثابت ہو- لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے - اُس کے یہ نتیجے ایسے صاف اور صریح ہیں کہ کوئی معقول پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا - اس لیے مسٹر شکلا کی یہ اسکیم ہمارے لیے نہایت اندیشہ ناک ہے —

اس سے سی پی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے - انجمن کی ایک شاخ ناگپور میں ہے جو بہت اچھا کام کر رہی ہے - اس کے ارکان نے ایک جلسہ کر کے اس کے خلاف ایک قرار داد منظور کی - اس کے بعد شہر کے مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں تقریباً پانچ ہزار اشخاص شریک تھے اور اس کے صدر انجمن ترقی اردو کے رکن محمد ابراہیم خاں صاحب میونسپل کمشنر تھے - اس جلسے کا یہ اثر ہوا کہ آنریبل یوسف شریف صاحب وزیر قانون و انصاف نے ہمارے انجمن کے پر جوش اور قابل رکن مولوی حکیم اسرار احمد صاحب کو بلا بھیجا اور کہا کہ حکومت اس اسکیم پر نظرثانی کرنے کے لیے تیار ہے - اسی سلسلے میں انھوں نے گاندھی جی سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا - چنانچہ حکیم صاحب وزیر صاحب کے ساتھ شوگانو پہنچے اور گاندھی جی سے اس معاملے میں صاف صاف گفتگو ہوئی - گاندھی جی نے فرمایا کہ "مندر" کا لفظ نکال دیا جائے گا یعنی وہ وزیر تعلیم کو زبانی سمجھا دیں گے کہ وہ اس لفظ کی بجائے کوئی دوسرا لفظ رکھ دیں اور

"ودیا مندر" والی اسکیم کو "وردھا اسکیم" کے تابع کر دیا جائے گا - اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی بولنے والے علاقے میں دونوں خطوں کی تعلیم لازمی ہوگی اور غیر ہندستانی بولنے والے علاقے میں تعلیم کے پانچویں اور چھٹے سال میں ہندستانی زبان کی تعلیم کسی ایک رسم خط میں ضروری ہوگی - (اِس صوبے میں گیارہ اضلاع ہندستانی بولنے والے اور سات مرھٹی بولنے والے) - اگر چہ اس سے بھی ہمارا منشا پورا نہیں ہوتا تاہم موجودہ ناگوار حالات میں یہ بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ یہ ہو جائے —

کچھہ عرصہ ہوا جب میں نے مسٹر شکلا سے مل کر اردو تعلیم کے متعلق اپنے مطالبات پیش کیے تھے اور بعد میں انھیں لکھہ کر بغرض تصدیق مسٹر شکلا کی خدمت میں بھیجا تھا تو انھوں نے اپنے جواب میں مجھے یہ لکھا تھا کہ میری یاد داشت کو اپنی تعلیمی اسٹینڈنگ کمیٹی میں جو قائم ہونے والی ہے پیش کردیں گے - خط کے آخر میں انھوں نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ کانگریس کے اصول کی رو سے اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کی حفاظت اُن کا فرض ہے —

سیاسی عقیدے اور وعدے دیکھنے اور سننے میں بہت معقول اور بہت دل خوش کن ہوتے ہیں - لیکن عمل کچھہ اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ فریق ثانی کے کچھہ پلّے نہ پڑے اور ساتھہ ہی قانونی اور منطقی گرفت بھی نہ ہوسکے - معلوم یہ ہوا کہ مسلسل شور غل' مخالفت' لڑائی جھگڑے سے کچھہ مل جائے تو مل جائے ورنہ اِن معاملات میں انصاف کی توقع رکھنا نری سادہ لوحی ہے —

---

# ۹ - صوبۂ بہار اور ہندستانی

ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم صوبۂ بہار کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جو ان امور پر غور کرے —

(۱) نصاب تعلیم کے لیے مستند اصحاب سے کتابوں کی تیاری' تنقید اور منظوری —

(۲) ہندستانی زبان کے لغت کی ترتیب —

(۳) ہندی اور اردو مصنفین کے لیے لغت اصطلاحات کی ترتیب —

(۴) جدید اصول پر صرف و نحو کی تالیف —

(۵) مترجمین کے استعمال کے لیے انگریزی ہندستانی لغت کی ترتیب

اس کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے -

بابو راجندر پرشاد صاحب - ڈاکٹر ایس سنہا' وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی - مولانا ابوالکلام آزاد - پروفیسر ڈاکٹر تارا چند - پروفیسر نریندر دیو (کاشی ودیالہ بنارس) - ڈاکٹر بابو رام سمپنا - مولانا سید سلیمان ندوی - مولانا عبدالحق - ڈاکٹر ذاکر حسین - پروفیسر غلام السیدین - پروفیسر بدری ناتھ ورما (بہار ودیا پیٹھ) - راجہ رادھکا رام پرشاد سنگھ آف سورج پور -

شکر ہے کہ ہماری انجمن کی جد و جہد اور چیخ پکار کا کچھ تو اثر ہوا -

—— * ——

# تبصرے

# تبصرے

## ادب

### مکاتیب غالب

( مدوّنہ مولوی امتیاز علی صاحب عرشی، ناظم کتاب خانہ ریاست رامپور )

نواب یوسف علی خاں، وارث ریاست رامپور ہونے سے پہلے لڑکپن میں کچھہ مدت اپنے والد کے ساتھہ دہلی میں رہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھہ روز تک مرزا غالب مرحوم سے فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی - لیکن یہ تعلق اتنا سرسری اور بظاہر چند روزہ تھا کہ دس گیارہ برس بعد سنہ ۱۸۴۰ع میں جب تقدیر کی یاوری سے ان کے والد ماجد محمد سعید خاں دوبارہ مسند ریاست پر متمکن ہوئے تو ان کے بھائی اور مرزا صاحب کے دوست عبداللہ خاں (صدر صدور میرٹھہ) کی تحریک کے باوجود مرزا صاحب نے قصیدۂ تہنیت لکھنے سے معذرت کی - خود نواب یوسف علی خاں کی مسند نشینی (سنہ ۱۸۵۵ع) پر قطعہ تاریخ لکھہ کر بھیجا تو اس کی بھی اُدھر سے رسید نہ ملی اور وہ قطعہ اب مفقود ہے - (مکاتیب - ص ۳) لیکن تقریباً دو سال کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک سے

دوبارہ ایک عریضہ اور قصیدہ مدحیہ تحریر کیا جس کا نفیس مطلع یہ ہے :-

همانا اگر گوهر جاں فرستم

به نواب یوسف علی خاں فرستم

اور اسی کے بعد نواب صاحب نے مرزا کی شاگردی اختیار کی۔ رقمی امداد بھی دینے لگے اور جولائی سنہ ۱۸۵۹ ع سے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کردی جو ان کے جانشین نواب کلب علی خاں کے زمانے میں بھی جاری اور مرتے دم (یعنی فروری ۱۸۶۹ ع) تک مرزا صاحب کو ملتی رہی۔ گویا کم و بیش بارہ سال وہ دربار رامپور کے متوسل رہے۔ اس عرصے میں دربار رامپور بھی آئے اور خط کتابت کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ ان میں سے وہ مراسلات جن میں اصلاحی غزلیں بھیجی جاتی تھیں، ظاہر ہے کہ علحدہ محفوظ نہ رکھے گئے ہوں گے لیکن دوسرے خطوں کی ایک کافی تعداد ریاست کے 'دارالانشا' یعنی محافظ خانے میں موجود ہے جنھیں حکام کی اجازت و اعانت سے 'عرشی' صاحب نے ایک بسیط دیباچے کے ساتھ نسخ ٹائپ میں چکنے کاغذ پر بہت عمدہ چھپوا کر "مکاتیب غالب" کے نام سے مجلد شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۴۱ خط نواب یوسف علی خاں کے نام، ۶۴ نواب کلب علی خاں کے نام اور ۱۰ دوسرے احباب رامپور کے نام، اور ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ملا کر کُل ۱۱۷ مکاتیب ہیں۔ یہ قطعہ اور قصیدہ، نیز تین ابتدائی خط فارسی میں ہیں - آخری چند رقعات بہت مختصر اور محض تنخواہ کی رسیدیں ہیں۔ کئی خطوں میں اپنے قرض کی ادائی یا دوسری ضروریات کے لیے روپے کا تقاضا ایسے الفاظ میں کیا ہے جو ایک عالی خیال شاعر کی غیرت و خود داری سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اسی لیے ممکن ہے

بعض احباب کو اس قسم کے خطوط کی اشاعت ناگوار ہو اور انہیں وہ اپنے محبوب ممدوح کی کسرشان تصور کریں - لیکن اول تو مرزا غالب نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب ادبی تبرک کا مرتبہ رکھتا ہے دوسرے ان کے ساتھ عاقلانہ شیفتگی کا مقتضی یہ ہے کہ ان کی سیرت کا ہر نیک و بد پہلو پوری صحت و صراحت سے محفوظ رکھا جاے - ایسی شخص پرستی جس میں اپنے ممدوح کو سورما بناکر محض اس کے فضائل و محاسن میں مبالغہ کیا جاے، تاریخی اعتبار سے نہایت معیوب اور اخلاقاً سخت مضر ہے —

دیباچۂ کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے، مرزا صاحب کے شاگرد ہونے سے پہلے ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا (ص ۹۷) یہ گویا اس قیاس کی تائید ہے جو شاید ۱۹۱۴ ع میں رسالۂ الناظر لکھنؤ میں پیش کیا گیا تھا کہ ناظم کے کلام کا بہت سا حصہ (یعنی دیوان اول) بیشتر خود مرزا غالب کا کہا ہوا معلوم ہوتا ہے - نواب صاحب کے واسطے یہ تخلص بھی مرزا صاحب ہی نے تجویز فرمایا تھا (مکاتب ص ۷) اور جب ۱۸۶۳ ع کے اخیر یا ۱۸۶۴ ع کے شروع سے مرزا صاحب نے علالت و ضعف پیری کے عذر پر اصلاح دینی موقوف کی اور جیسا کہ منشی امیر احمد صاحب مینائی نے لکھا ہے، حضرت 'اسیر' لکھنوی سے یہ خدمت متعلق ہوی تو کلام کا رنگ ہی بالکل بدل گیا - چنانچہ دوسرے دیوان میں جس قسم کی عشقیہ غزلیں، ضلع جگت کے اشعار اور واسوخت وغیرہ درج ہیں، مرزا تو کیا، ان کا کوئی صحبت یافتہ بھی ایسی شاعری نہ کرسکتا تھا - عرشی صاحب نے مینائی مرحوم کے مذکورۂ بالا قول کی جو تردید فرمائی ہے وہ کمزور دلائل سے بداہت کی تردید ہے -

'مکاتیب' میں ساتواں خط (ص ۱۱) فارسی ہے اور اس میں مرزا

صاحب نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات بیان کیے ہیں - مگر کوئی نئی بات تحریر نہیں کی - پنشن کے بند ہونے اور پھر جاری ہونے کا قصہ کئی خطوں میں جا بہ جا مذکور ہے - نمبر ۲۹ و نمبر ۳۰ میں خلعت کی بحالی اور لفٹننٹ گورنر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس کے بالآخر قبول فرمائے جانے پر شادمانی کا اظہار ہے - دوسرے سفر رامپور سے واپسی کے وقت مراد آباد پر ندی کے پل ٹوٹنے' اور کافی زحمت و صعوبت کے بعد دلی پہنچنے کا حال مکتوب نمبر ۵۸ میں تحریر کیا ہے - خط کا خاتمہ اس تضمین پر ہوتا ہے : ق

مغلوب سطوت غم دل غالب حزیں
کاندر تنش ز ضعف ' تواں گفت جاں نبود

از رامپور زندہ بدہلی رسیدہ است
مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

مکتوب نمبر ۶۰ میں نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی کی نذر میں ایک غزل "نئی طرز کی' نئی بحر میں عرض کی ہے" یہ غزل کلیات غالب میں موجود نہیں - غالباً پہلی دفعہ منظر عام پر آئی ہے اور اپنی ندرت و نفاست کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ پوری نقل کی جائے :

بحر ہزج مثمن سالم

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن

"اے خداوند خردمند و جہاں داور دانا
وے بہ نیروئے خرد برہمہ کردار توانا
اے برگفتار و بدیدار' بزیبائی و خوبی
سرو نو خاستہ آسا' مہ نا کاستہ مانا

بہ ادا پایہ فزایا ' بہ نظر عقدہ کشایا
بہ کرم ابر عطایا نہ غضب برق سمانا
بہ نگہ خستہ نوازا بہ سخن بذلہ طرازا
بہ قلم غالیہ سایا بہ نفس عطر فشانا
شہ نشاں کلب علی خاں کہ توی یوسف ثانی
نبود ثانی و ہمتائے تو در دہر ہمانا
دانم از حال و مآلم خبرے داشتہ باشی
سر نوشتے ازلی گرچہ ندارد خط خوانا
دشمنم چرخ و تو بیدلی و نسوزی بعتابش
بہ عدو صاعقہ ریزا بہ محب فیض رسانا
جانشین* تو کند نام ترا زندہ بہ گیتی
باد فردوس برین جائے تو فردوس مکانا
غالب از غم چہ خروشی بگو زیبا ست خموشی
باکریم ہمہ داں ہیچ مگو ہیچ مدانا"

---

اصلاح شعر نواب یوسف علی خاں کے آخر زمانے سے موقوف ہو چکی تھی ' لیکن ۱۸۶۶ ع میں نواب کلب علی خاں نے ایک نثر فارسی اصلاح کی غرض سے مرزا صاحب کو بھیجی۔ اس کے بعض محاوروں پر اعتراض کی ضمن میں مرزا صاحب نے حسب عادت فارسی لغت نویسوں پر بھی تعریض کی۔ نواب صاحب یا شاید اُن کے ادبی مشیر برہم ہوے

---

* اس شعر میں نواب یوسف علی خاں مرحوم سے خطاب ہے جن کا ما بعدالموت لقب " فردوس مکاں " قرار پایا تھا۔

اور جواب میں ناراضی کا اظہار کیا - مرزا صاحب نے معذرت پیش کی لیکن یہ بھی لکھدیا کہ " اِن باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی راے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق " - مرزا صاحب کے یہ دو خط مکاتیب میں ۷۱ اور ۷۲ نمبر پر درج ہیں - ذیل میں عرشی صاحب نے مفید حواشی لکھدیے ہیں - اسی قسم کی ادبی بحث مکتوب نمبر ۱۱۶ میں درج ہے - یہ خط 'خلیفہ' احمد علی صاحب راجپوری کے نام ہے جو مرزا صاحب سے ملے اور اثناے گفتگو میں عرفی کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا - آخری مکتوب ( نمبر ۱۱۷ ) محمد حسن خاں مالک مطبع و اخبار "دبدبہ سکندری" کے نام ہے جس میں ان کی اور ان کے اخبار کی خوب خبر لی ہے اور نہایت تاکید سے خدا کے واسطے دے کر لکھا ہے کہ آیندہ اسے بھیجنا بند کردیا جاے —

مکاتیب میں بعض رباعیاں اور قطعات تاریخ بھی آگئی ہیں جو غالباً دوسری جگہ شائع نہیں ہوے تھے - تاریخیں عموماً معمولی ہیں - ان میں ایک تعمیہ جو سب سے بہتر نظر آیا ذیل میں نقل کیا جاتا ہے - یہ نواب یوسف علی خاں کی والدہ کی تاریخ وفات ہے —

جناب عالیہ از بخشش حق بفردوس بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب ' سال رحلت " خلود خلد " گفت از روے الہام
۱ + ۱۲۷۴

بہر حال " مکاتیب غالب " مرزا صاحب کی گم شدہ یادگاروں کا مجموعہ ہے جسے ارباب شوق آنکھوں پر رکھیں گے اور فاضل مدوّن اور حکام ریاست کو دعائیں دیں گے کہ ان کی سعی و ہمت سے یہ چھپا خزانہ نظر کے سامنے آگیا - کتاب میں قیمت درج نہیں لیکن مطبع شرف الدین الکتبی کے

ایک اشتہار سے ظاہر ہوا کہ ۴ روپیہ ہے اور کتاب خانہ ریاست 'رامپور' یا اس مطبع سے دستیاب ہوسکے گی —

( ش )

---

## تفسیر حیات

( مصنفہ میاں اسلم صاحب - صفحات ۷۱۲ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - میاں دین محمد اینڈ سنس لاہور )

یہ میاں اسلم صاحب کے چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے میاں اسلم صاحب بہت پرنویس افسانہ نگار ہیں شاید ہی اردو کا کوئی ماہانہ رسالہ ایسا ہو جس میں ان کے افسانے نہ شایع ہوئے ہوں ' زیر تبصرہ مجموعہ کے اکثر افسانے بھی مختلف رسالوں میں نکل چکے ہیں —

ناولیں اور داستانیں تو اردو زبان میں ایک زمانے سے لکھی جارہی ہیں ' لیکن مختصر افسانے لکھنے کا فن ابھی حال کی پیداوار ہے ' اور سوایے ایک یا دو چوٹی کے افسانہ نگاروں کے ' اکثر حضرات نے ابھی اس فن کی خصوصیات اور ضروریات کو پوری طرح سے نہیں سمجھا ہے ' ہر واقعہ مختصر افسانے کا موضوع نہیں ہوسکتا اور نہ ہر قلم کفایت الفاظ ' اور سہرت نگاری کی ان نزاکتوں کا متحمل ہوسکتا ہے جو مختصر افسانوں اور طویل داستانوں میں مابہ الامتیاز ہوتی ہیں —

ہم نے میاں اسلم صاحب کے ہر افسانے کو شروع سے آخر تک پڑھا ' اور ہم اپنے اس عجز کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں ان میں وہ "بات" جس کی ایک ایسے مشاق افسانہ نویس سے توقع ہوسکتی ہے

کہیں نظر نہیں آئی اس میں شک نہیں کہ میاں صاحب نے منظرنگاری پر خاص کوشش صرف کی ہے لیکن ان کے مناظر مثلاً طلوع و غروب آفتاب کا حال پڑھکر خدا معلوم کیوں ہمیں 'شرر' مرحوم کی ناولیں یاد آجاتی ہیں، وہی بندھی ٹکی تشبیہیں' وہی یکسانیت اور ---

میاں اسلم صاحب شاید مختصر افسانوں میں 'پلاٹ' کے قایل نہیں ہیں' سوائے چند افسانوں کو چھوڑ کر' ان کے " مرکزی واقعات " جاذب نظر نہیں ہوتے' سیرت نگاری مختصر افسانوں کا غالباً سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتی ہے' ناول نویس کے پاس تو اس چیز کے لیے بہت بڑا میدان ہوتا ہے' لیکن مختصر افسانہ لکھنے والے کو صرف دو قسم کی ہلکی جنبشوں سے یہ مشکل فرض ادا کرنا ہوتا ہے' ہمیں میاں اسلم صاحب کے چالیس افسانوں میں ایسی سیرتیں جو جاذب توجہ ہوں مشکل سے نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ میاں صاحب کا زبان کا پہلو کسی قدر کمزور ہے۔ وہ اکثر مشہور اشعار کے الفاظ کو اپنی نثر میں لکھہ جاتے ہیں مثلاً " چشمہ کی شورشوں میں باجا بج رہا تھا " " جیسے کوئی حسینہ جھک کر آئینہ دیکھہ رہی ہو " " ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی آرہی تھی " اکثر افسانوں میں " پچھلے پہر کی کوئل " کا ذکر ہے اور ہمیشہ " پچھلے پہر " سے مراد 'سہ پہر' لی گئی ہے' حالانکہ اقبال کا مشہور مصرع ہے " پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن " سینہ کا ذکر ہمیشہ ان الفاظ میں ہوتا ہے " جو شباب کی مستیوں کا آئینہ دار تھا " ہیروئن کی گفتگو اکثر وبیشتر " دونوں ہاتھہ کمر پر رکھکر " ہوتی ہے' اور تقریباً ہر افسانے میں اس کا سر " ایک جنبش جانانہ " کے ساتھہ ہلتا ہے ---

.. جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں' ان افسانوں میں زبان کا پہلو بہت کمزور

ہے ' قدہ ( بجائے قدح ) امق ( بجائے املق ) اور مہتر رانی ( بجائے مہترانی ) مقبول صورت ( بجائے قبول صورت ) کو ہم چاہے کاتب کی غلطی سمجھ لیں ' لیکن " پینگ ڈالنا ' " رباب کی تاریں " " قدم ڈھمکانا " " اجیرن ہونا " ( پریشان ہونا کے معنوں میں ) " رحول کہاں ہوتا ہے " ( بجائے کہاں رہتا ہے ) ایسی مثالیں ہیں جن کی توجیہ اس طرح نہیں کی جاسکتی —

"رادھا کی کنھیّی " اور " مفت ہوئے بدنام " اچھے افسانے ہیں - "امی مجھے ڈھونڈھلو " ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی سچی تصویر ہے —

کتاب کے شروع میں مولانا چراغ حسن ' حسرت ' کا " تعارف " ہے ہم فاضل مصنف اور ناشرین کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں ' اور ہمیں امید ہے کہ میاں اسلم صاحب اپنی افسانہ نویسی کی صلاحیت سے ملک کے افسانہ نگاروں میں اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرلیں گے —

( و )

## حیدر علی

( مصنفہ محمود خاں محمود صاحب - صفحات ۱۸۳

قیمت آٹھ آنے - محمد سراج الدین نمبر ۹ ڈکنس روڈ بنگلور )

یہ محمود خاں صاحب مصنف تاریخ سلطنت خدا داد میسور کا تاریخی ناول ہے - مصنف نے نواب حیدر علی کے عہد کے ایک واقعہ کو داستان کی صورت میں بیان کیا ہے - جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بدنور کا راجہ بسویا نایک مرگیا تو تخت کا وارث ایک کم سن لڑکا چن بسویا

ہوا جسے راجہ نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا - لیکن تخت و تاج کی مالک نوجوان بیوہ رانی ہوگئی - عیش و عشرت میں پڑگئی - رانی نے اپنے آشنا برہمن کی سازش سے چن بسویا کا کام تمام کر دیا - لیکن درحقیقت وہ مرا نہیں تھا اور ایک جوگی کی ہوشیاری سے وہ نیم مردہ پھر زندہ ہوگیا اور روپوش ہوگیا - ایک مدت بعد جب نواب کو اس مظلوم لڑکے کا حال معلوم ہوا تو اس نے بدنور پر حملہ کرکے ریاست کو فتح کیا اور چن بسویا کو گدی پر بٹھا دیا اور رانی اور اس کے آشنا کو وظیفہ دے کر کاروبار سلطنت سے الگ کر دیا لیکن رانی نے چالاکی سے راجہ کو اپنے ساتھ ملا لیا - اور رانی' راجہ اور رانی کے آشنا نے سازش کرکے حیدر علی کا کام تمام کرنے کی پوری سازش کی - وقت پر سازش کھل گئی اور نواب نے رانی' راجہ اور برہمن کو گرفتار کر کے قلعہ مادھوگری میں قید کر دیا —

یہ خیالی فسانہ نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے - مصنف نے اسے ناوَل کے رنگ میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور اس زمانے کی ہندو سوسائٹی کی معاشرتی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے —

کتاب کے دیباچے میں قابل مصنف نے تمام تاریخی شواہد کا ذکر کر دیا ہے - اور جو بعض الزامات نواب حیدر علی پر لگائے جاتے ہیں ان کی تردید نہایت معقول طور سے تاریخی واقعات پیش کر کے کی ہے — کتاب بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے —



# دیوان ساحر موسوم بہ کفر عشق

(مجموعۂ کلام جناب پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی-
صفحات ۲۱۲ مجلد قیمت ایک روپیہ چھ آنے مصنف سے لال حویلی'
محلہ چوڑی گراں دہلی کے پتے سے مل سکتا ہے - )

حضرت ساحر ہماری قدیم تہذیب اور اخلاق و آداب کا اعلی نمونہ ہیں - اور اس وضعداری کو وہ اب تک بڑی خوبی سے نبھائے جا رہے ہیں - ہر سال بڑے التزام اور شوق و ذوق سے مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں - دو سال ہوئے اس مشاعرے کی پچیس سالہ جوبلی تھی - اُس وقت انہوں نے غیر معمولی انتظام کیا تھا - دور دور سے اُن کے احباب اور قدردان آئے تھے - اُن دنوں حضرت ساحر کا انہماک دیکھنے کے قابل تھا - اس بڑھاپے میں ان کی غیر معمولی مستعدی اور تگ ودو کو دیکھ کر جوانوں کو رشک آتا تھا - ایک ریڈیو کو چھوڑ کر باقی سارا رنگ ڈھنگ قدیم وضع کا تھا اور اگلی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتا تھا —

ساحر صاحب ایک درویش صفت اور صوفی منش بزرگ ہیں - ان کا سارا کلام توحید و معرفت سے بھرا ہوا ہے - اور اسی کی مناسبت سے ہر ایک غزل کا عنوان بھی انہوں نے قائم کر دیا ہے - مثلاً مجازعین حقیقت ' پاس انفاس، جلوۂ بقا ' صفات جلوۂ ذات ' نغمۂ توحید ' پندار وجود ' فروغ حسن وغیرہ وغیرہ - ان کے کلام میں پختگی اور خیالات میں وسعت پائی جاتی ہے - ان کی زبان اگر چہ دلی کی ہے لیکن الہیات و تصوف کے مضامین بیان کرنے میں انہیں وہی الفاظ و محاورات اور اصطلاحات استعمال کرنی پڑی ہیں جو ان مضامین کے شایاں ہیں - یہاں

اُن کے کلام سے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو گا —

ہم قلب کو بے بیم و رجا دیکھ رہے ہیں ہیں مومن و کافر کے لیے جنت و دوزخ
ہم عالم مستی میں یہ کیا دیکھ رہے ہیں عریاں نظر آتے ہیں بہم وحدت و کثرت

نگاہ وقف جمال و خیال محو جلال رہ فنا میں ہیں دو نقش پانشاں کے لیے
حضور قلب ہے سرمایۂ حیات دوام نفس ہے خضر مرا عمر جاوداں کے لیے
مری نماز کو بھر وضو ہے جام طہور صلائے ساقیٔ کوثر ہے بس اذاں کے لیے
کہا یہ رحمت حق نے کہ ہے یہ حق سے بعید کہ وقف ہو کوئی جلوہ کسی مکاں کے لیے

---

آنکھیں قصور وار ہیں دل شرمسار ہے دو پردہ در ہیں راز کے ایک پردہ دار ہے
خلوت ہے انجمن میں تو خلوت میں انجمن آئینہ سے نگاہ کسی کی دو چار ہے

---

ہے حریم جسم و جاں میں کشمکش حلقۂ دارالاماں میں کشمکش
مرکز اضداد ہے کون و مکاں ہے کہاں یہ لامکاں میں کشمکش
کیسے قائم رہ سکے پائے ثبات ہے زمین و آسماں میں کشمکش
گرچہ حسن و عشق میں ہے اتحاد ہے مگر جذب نہاں میں کشمکش
بلبل و گل میں فریب حسن سے ہے گلستان جہاں میں کشمکش

پانی پت میں ایک مشاعرہ تھا - اُس میں ساحر صاحب نے بھی طرحی غزل پڑھی جس کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

سوز میں ساز رہا سوختہ سامانوں سے محفلیں گرم رہیں شمع کے پروانوں سے

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے
جانچتے عشق کو ہیں عقل کے پیمانوں سے

ہوش میں آئے نہ آئیں کبھی مستان الست
وہ چھکے بیٹھے ہیں ساقی ترے پیمانوں سے

آتی ہے بوئے ریا دیر و حرم سے مجھکو
صدق دے بار خدا یا مجھے میخانوں سے

کفر و اسلام سے کاوش ہے نہ آویزش ہے
میرا مذہب ہے جدا دینوں سے ایمانوں سے

## محبت اور نفرت

(مصنفۂ سید اختر حسین صاحب رائے پوری صفحات ۲۰۲ - مجلد '
قیمت ایک روپیہ چار آنے - ساقی بک ڈپو' دھلی)-

یہ کتاب افسانوں کے نام سے چھپی ہے - مگر درحقیقت یہ دلی جذبات' ذاتی مشاھدات اور کسی قدر آپ بیتی کی داستان ہے - ان سب کو مصنف نے نئے رنگ اور نئی زبان میں ادا کیا ہے - نثر میں شاعری کرنا مشکل ہی نہیں مذموم بھی ہے لیکن قابل مصنف نے نئی تشبیہوں' اچھوتے استعارات اور دلکش طرز بیان سے نثر میں شعر کا لطف پیدا کردیا ہے - مثلاً :

"میں چاھتا ہوں کہ میری تخییلی دنیا میں جب تک ایک آدمی بھی جدائی کے صدمے اٹھا رھا ہو' کسی کو وصل میسر نہ ہو؛ جب تک پھول مرجھاتے ہوں کوئی کلی نہ کھلے ؛ جب تک بدنمائی باقی رہے کہیں حسن نہ ہو' جب تک آنکھوں میں آنسو ہوں کہیں تبسم کی گل پاشیاں نہ ہوں - میں چاھتا ہوں کہ میری دنیا میں چاندنی امرت نہ لٹائے - برق بلا آنکھوں کو یوں خیرہ کردے کہ پھر روشنی کی ضرورت نہ رہے - گل رخوں کی سحر آفریں نگہت کبھی خواب آگیں ہواؤں کو

نہ چکائیں۔ جب تک رنج و یاس میں کوئی راحت و آرام کا نام نہ لے۔ میں جس منزل پر چل رہا ہوں وہ ہمیشہ نا تمام رہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ میری تکان دور کرنے کے لیے راہ میں سایہ نصیب ہو۔ لیکن میری مراد بر نہیں آتی! کاش کہ اس صحرا نوردی اور بے رہ روی میں، اِس آبلہ پائی اور شوریدہ سری میں کہیں سے دو چار پھول ٹپک کر اس دشوار گزار رستہ کو آسان بنا دیتے ہیں - یہی نہیں۔ مجھے روک کر دریائے محبت کی رنگینیوں کو دور سے دیکھنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں جو میری یک زندگی سے الگ ہٹ کر دوسرے جانب سکون و اطمینان کو اپنی لہروں پر نچا رہا ہے "—

یہ اقتباس ہم نے یونہیں کتاب کھول کر لکھ دیا ہے۔ ساری کتاب مصنف کے تخیل کی بلند پروازی اور جذبات شدید و لطیف نقاشی سے بھری ہوئی ہے۔ اردو زبان میں اس قسم کی تحریر نئی ہے اور ضرور پڑھنے کے قابل ہے۔

---

## گلدستۂ مضامین و انشا پردازی

(مولفہ و مرتبہ رمضان علی صاحب ایم - اے و اختر علی صاحب ایم۔اے، اردو لکچرار۔ صفحات ۳۲۰۔ ایجوکیشنل بک ہوس، سول لائن، شمشاد بلڈنگ۔ علی گڑھ)

یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے اور چار ابواب پر تقسیم کی گئی ہے — پہلے باب میں مضمون نویسی اور اس کے ۱۶۵ مختلف موضوعات

پر مختلف مضامین کے نمونے اور مفید اشارات —

دوسرے باب میں مشقی مضامین کا سلسلہ مع مختلف عنوانات اور ان کے تحت مفید اشارات —

تیسرے باب میں خطوط نویسی اور اس کے مختلف نمونے مع ضروری قواعد و ضوابط —

چوتھے باب میں مشہور ادیبوں اور مستند انشا پردازوں کے مکتوبات۔

خدا کرے مولفین کا منشا پورا ہو اور طلبہ اس کتاب کتاب کے مطالعہ سے اردو انشا پردازی سیکھہ جائیں۔ لیکن ہمیں اس میں کسی قدر شبہ ہے۔ اس قسم کی ہدایتوں اور نمونوں سے انشا پردازی مشکل سے آتی ہے —

افسوس ہے کہ املا کی صحت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کتاب پر ایک اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن مولفین کی محنت اور تلاش بلا شبہ قابل داد ہے —

———

## نظر کے دھوکے ۔

(مصنفہ شکیب صاحب ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے حیدرآباد ڈپو اور مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ سے مل سکتی ہے)

محمد بدرالدین خان شکیب بی ۔ اے ۔ ایل ایل بی (عثمانیہ) "سابق مدیر مہتمم مجلہ عثمانیہ" کے افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ جس میں "ایک حیدرآبادی نوجوان کی اولوالعزمی' شجاعت اور رومان انگیزیاں"

(۱) گم شدہ لاش - (۲) انسانی خون - (۳) عارضی شوہر - (۴) پر اسرار شخصیت - (۵) شہادت واقعاتی - (۶) قتل گاہ کے عنوانات سے بیان کی گئی ہیں —

یہ تمام افسانے جہاں تک ہمارا خیال ہے Adventures of a Lady's man by William Le Queau سے ماخوذ ہیں - مگر لائق مصنف نے اس امر کا کہیں ذکر نہیں کیا - اور ان تمام افسانوں کو حیثیت سے پیش کیا ہے کہ گویا ان کی تصنیف ہیں - بیان کے لحاظ سے بھی اس میں اکثر جگہہ خامیاں پائی جاتی ہیں - مثلاً:

صفحہ (۱۱) پر "میں اس کے قریب پہنچا اور 'دل کی حرکت' معلوم کیا" یہاں فعل کو مونث استعمال کرنا چاہیے تھا -

اسی طرح صفحہ (۱۹) پر "ہم نے اس کو ...... لاکر کھڑا کردیے"

صفحہ (۲۱) پر "فاقہ بدمست" اور "مبادا ان کی کارگذاری پر حرف نہ آجائے" مبادا کے ساتھہ 'نہ نفی' کا استعمال درست نہیں سمجھا جاتا —

صفحہ (۲۸) پر "اس عورت 'کی' ہمت اور ...... اس 'کی' جرءت ... تعجب خیز 'تھا'" —

صفحہ (۱۰۷) "میں نے لوگوں کا دیکھا دیکھی" دیکھا دیکھی زبان اردو میں مونث استعمال ہوتا ہے -

صفحہ (۱۰۸) "اگر میری موت کے متعلق کوئی چہ میگوئیاں ہوں" میں 'کوئی' کا استعمال جمع کے ساتھہ جائز نہیں سمجھا جاتا -

اسی طرح مصنف نے گفتگو لکھنے میں احتیاط نہیں برتی بعض جگہہ افسانوی مکالمہ لکھتے لکھتے خطابیت کی شان پیدا کردی ہے

صفحہ ۴۶ اور صفحہ ۴۷ پر اس کا نمونہ ہے یا صفحہ (۱۱۵) پر "فطرت کی وجد آفرینی موجوں کا یہ رقص پیہم اور مہتاب کی ضیا پاشیاں شاید اسی رشک ماہ کے انتظار میں فردوس بدوش تھیں" - یہ جملہ ایک عورت کے تالاب میں گرنے سے قبل حسین ساگر کی فضا کے متعلق استعمال کیا گیا ہے - جس سے اس امر کی غلط فہمی ہونے کا امکان ہے کہ مصنف بیجا طور پر اپنی علمیت کا اظہار کرنا چاہتا ہے —

پھر بھی شکیب صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ ان کی پہلی ہی افسانوی کوشش کافی دلچسپ ہے اور وہ ان افسانوں میں مقامی رنگ پیش کرنے میں بہت کامیاب رہے ہیں —

(ز)

---

## ایمان سخن -

(مرتبہ مولوی سید محمد ایم - اے - قیمت بارہ آنے - سید عبدالقادر تاجر کتب چار مینار، مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن، جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے)

سلسلہ انتخابات شعرائے دکن کا یہ پانچواں نمبر شیر محمد خاں المتخلص بہ 'ایمان' کے کلام کا انتخاب ہے - اس کے مرتب مولوی سید محمد ایم - اے (عثمانیہ) لکچرار اردو گورنمنٹ سٹی کالج ہیں - شروع میں 'دکن کی اردو شاعری' پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم - اے پی ایچ ڈی کا لکھا ہوا دیباچۂ عمومی ہے' اس کے بعد مرتب کا لکھا ہوا سولہ صفحے کا مقدمہ - دیباچہ اور مقدمہ دونوں اپنی اپنی جگہہ خوب

ہیں۔ اور ان سے دکن کی شاعری کے متعلق خاصی معلومات ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مدیر عمومی (ڈاکٹر 'زور') نے دکن کی اردو شاعری کے پانچویں دور کے قابل ذکر شعرا درگاہ 'شیدا' شفیق' تجلی' ایمان' قیس' چندا' شاداں' ایما' اور احساں قرار دیے ہیں (صفحہ ۱۲)۔ اور مرتب (مولوی سید محمد صاحب) نے ایمان اور ان کے مشہور شاگرد قیس' حفیظ' اور چندا کے علاوہ میر علی مردان خاں 'بیدل' (۱۲۰۹) محمد علی 'نیاز' محمد خاں 'نیاز' (۱۲۱۱) میر محمد ہاشم 'فقیر' (۱۲۱۴) مرزا محمد جاں نثار (۱۲۱۲) میر نجف علی خاں 'قدرت' اور مرزا داود 'هنر' قرار دیے ہیں۔ اب ان میں سے کسے صحیح سمجھا جائے۔ لائق مرتب نے انتخاب میں کچھ سہل انکاری سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً:

صفحہ ۷۸ پر

چاہے ہے ایماں کہ ہو دولت بیدار نصیب
رہو غافل نہ کبھی وقت سحر سے ہرگز

مصرعہ اولیٰ میں ایک "ہے" زیادہ ہے —

صفحہ ۷۹ پر

مجھ سے کل گور غریباں میں کہا عقل نے یوں
اور کچھ یاں نہ سوا حسرت و غم کے ہے نہ خاک

مصرعہ ثانی میں "کے" زیادہ ہے جس کی وجہ سے مصرعہ ناموزوں ہوگیا —

صفحہ ۸۳ پر

ہم سے عمل نیک ہوئے کب    جب تلک ترا کچھ کرم نہ ہوا

ناموزوں ہے —

صفحہ ۸۰ پر

سے خوار الجھ جاوے، ستمگار الجھ جاوے،

والی غزل کی ردیف 'جائے ہونا چاہیے ورنہ 'جاوے' کی وجہ سے مصرعہ ناموزوں ہوجاتا ہے —

صفحہ ۹۸ پر

ہے زہد خشک کا اب تر اسباب عصا فوارہ و تسبیح دولاب

مصرعۂ اولیٰ میں ایک لفظ کی کمی ہے —

اس کے علاوہ کتابت کی بھی بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ قدیم شعرا کا کلام طبع کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اُس زمانے کے تلفظ کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے اور کتابت کی غلطیوں کا بھی جو اگرچہ آج کل ناگزیر ہیں مگر اس قسم کی علمی کتابوں سے کوشش کرکے دور کرنی چاہییں —

مرتب کے مقدمہ سے 'ایمان' کے حالات بالتفصیل معلوم ہوتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق اندازہ کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے اور مرتب نے شاعر کے ماحول کو کامیاب طریقے سے پیش کیا ہے —

(ز)

---

## پریم سوگ

(مرتبۂ محمد حسام الدین خاں صاحب غوری۔ قیمت آٹھ آنے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن)

اس کتاب میں " منشی پریم چند جی کی حیات اور ان کی خصوصیات تحریر،

پر تبصرہ کیا گیا ہے - جیسا کہ خود صاحب کتاب نے صفحہ د پر تحریر فرمایا ہے " اس تذکرہ کا مطالعہ طلبا کے لیے منشی صاحب کی خصوصیات تحریر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا " سلیس اور عام فہم انداز بیان بھی غالباً اسی وجہ سے اختیار کیا گیا - کتاب میں سب سے زیادہ نمایاں چیز محمد حسام الدین خاں صاحب اور منشی پریم چند کے آپس کے تعلقات کا ذکر ہے —

( ز )

---

## یادگار محشر

( مرتب اشفاق حسین خاں صاحب گورکھپوری -
مطبوعۂ آسی پریس گورکھپور )

یہ جوانا مرگ شاعر عبیداللہ محشر تیمی کا مجموعۂ کلام ہے جسکو ان کے دوست اشفاق حسین خاں صاحب نے مرحوم کے انتقال پر بطور یادگار شائع فرمایا ہے - ' محشر ' تیمی مرحوم کی ۲۱ سال کی عمر میں رحلت واقعی ایک درد ناک سانحہ ہے - پھر اس حالت میں کہ مرحوم میں ایسے ادبی جوہر موجود تھے جن سے ان کی شاعری کے متعلق بہت شاندار توقعات کی جاسکتی تھیں - مجنون صاحب گورکھپوری نے صفحہ ( ج ) پر یہ لکھنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کیا کہ " ان کا کوئی شعر صداقت اور اثر سے خالی نہیں ہے " —

اللہ رے فریب تماشائے رنگ و بو دنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا

---

ہر اشارہ چشم ساقی کا مکمل ذوق ہے دل کو پیمانہ بنا لیں شوق کو صہبا کریں

---

زندگانی ہے ازل کی اک صدائے بازگشت سن رہا ہوں میں جیسے وہ دور کی آواز ہے

ایسے شعر اس مختصر مجموعے میں کافی تعداد میں ہیں - انہیں سے ان کی ہونہاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے —

اشفاق حسین صاحب نے اس مختصر یادگار کو شائع کر کے نہ صرف حق دوستی ادا کیا بلکہ ایک ادبی خدمت بھی انجام دی ہے کتاب اعلیٰ درجے کے کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہے —

(ز)

---

## تعلیم

### سلسلۂ گلدستۂ تعلیم اسلام

(مولفہ مولانا محمد عماد الدین صاحب انصاری

ناظم شعبۂ دینیات اسلامیہ ہائی سکول جالندھر)

فاضل مولف نے مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لیے یہ سلسلہ لکھا ہے - تعلیمی تدریج اور سلاست زبان کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے - اور وہ تمام ضروری معلومات، جن سے ہر مسلمان بچے کو آگاہ ہونا چاہیئے، اس میں موجود ہیں —

یہ سلسلہ فی الواقع اِس قابل ہے کہ تمام اسلامیہ سکول اسے داخل نصاب کریں - تقطیع نہایت مناسب، چھپائی اچھی اور کاغذ عمدہ ہے - البتہ کتابت میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جو اگلے ایڈیشن میں امید

ہے، رفع ہو جائیں گی —

## سلسلۂ تعلیم القرآن

یہ سلسلہ بھی مولانا محمد عماد الدین صاحب کے قلم سے نکلا ہے -

قابل مولف نے قرآنی تعلیمات کو نہایت آسان اور عام فہم پیرائے میں پیش کیا ہے - اس میں قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے معنے اور تفسیر سلیس اردو میں دیے گئے ہیں - شروع میں ایک بسیط مقدمے اور آخر میں لغات القرآن کا نہایت مفید اضافہ کیا گیا ہے —

حقیقت میں یہ قرآن اور اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے - سردست صرف دو حصے شائع ہوئے ہیں - قیمت حصہ اول ۴ آنے حصہ دوم کی قیمت سہو کتابت یا کسی اور وجہ سے درج نہیں ہوئی —

ہر دو سلسلے کتب خانہ انصاریہ جالندھر شہر نے شائع کئے ہیں —

## تلمیحات و اشارات در ادب فارسی ( انگریزی )

( مرتبہ زال - ایس - آر - ایرانی صاحب )

اس کتاب میں تقریباً وہ تمام تلمیحات آگئی ہیں - جن کا ذکر بمبئی یونیورسٹی کے امتحانات فارسی کے نصاب میں آتا ہے - مولف نے ان کی نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ تشریح کر دی ہے -

امیدواران امتحانات فارسی کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے -

قیمت ۸ آنے - ملنے کا پتہ - حاجی آقا شیرازی اینڈ سن تاجران کتب جیل روڈ، عمر کھاڑی، بمبئی

# پستالوزی

(مصنفۂ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب زبیری بی - اے (جامعہ) ایم -
اے ' پی ' ایچ ' ڈی (برلن) مجلد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -
مکتبۂ جامعۂ ملیہ ' قرول باغ ' دھلی)

اس کتاب کی اشاعت کا سہرا بھی مکتبۂ جامعہ ملیہ کے سر ھے ' ' روسو ' کے ' معاھدۂ عمرانی ' کے ساتھ ساتھ نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے مشہور ماھر تعلیم ' پستالوزی ' کے فلسفے اور اس کے تعلیمی نظریوں سے اردو داں طبقے کو مانوس کرانا جامعہ کا قابل تعریف کارنامہ ھے —

فاضل مصنف نے اپنی کتاب کو ایک مقدمے اور چہار ابواب پر تقسیم کیا ھے ' مقدمہ جو ۳۸ صفحات پر مشتمل ھے بجائے خود اٹھارھویں صدی عیسوی کے یورپی تمدن ' فلسفہ اور مذھب پر ایک جامع تبصرہ ھے ' چار ابواب میں علی الترتیب پستالوزی کی شخصیت اس کے فلسفۂ تمدن ' فلسفۂ مذھب اور فلسفۂ تعلیم سے بحث کی گئی ھے —

پستالوزی ایک جیّد مفکر اور فلسفی تھا ' اور اس کی متعدد تصانیف اس پر شاھد ھیں ' لیکن عام طور پر وہ ماھر و مصلح تعلیم کی حیثیت سے روشناس ھے ' اس لیے زیر تبصرہ کتاب کا باب چہارم خاص طور پر ان حضرات کے لیے زیادہ اھمیت رکھتا ھے جو اس پاک سیرت اور بلند خیال "مدرس" کے تعلیماتی خیالات سے مستفید ھونا چاھتے ھیں - 'پستالوزی ' نے "انسانیت" کی ترقی کی دھن اور اس کی فلاح و بہبود کے راستوں کی کھوج میں سیاست تمدن قانون سب کی چھان بین کی ' اور ھر طرف سے تھک کر آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بنی نوع انسان کی مستقل اور

پائیدار اصلاح کی امید اگر کہیں ہے تو ابتدائی تعلیم میں ہے اسی لیے اس نے اپنے قوائے عمل کا رخ اسی میدان کی طرف پھیر دیا' اور "بچہ کی نفسیات" کو تعلیماتی نظریہ اور اصول میں وہ اہمیت دی جو آج تک قائم ہے - اس میں شک نہیں کہ اس ایک صدی میں جو پستالوزی کے زمانے اور عصر حاضر کے درمیان گزری ہے' تعلیماتی نظریوں میں بہت کچھ تلاش اور تحقیق کی گئی ہے - نفسیات پر' خصوصاً نفسیات اطفال پر بیش بہا کام ہوا ہے' لیکن اس کام کی اولیت کا شرف اس ضعیف الجثہ مگر صائب الرائے بڈھے 'مدرس' ہی کو حاصل ہے جس نے سب سے پہلے بچے کی ذہنی آزادی کا علم بلند کیا' اور اسے ایک "نامی" ہستی کی طرح تعلیم دینے کا مطالبہ کیا ـــ

کتاب از اول تا آخر زبان اور خیال کی پوری قدرت کے ساتھہ لکھی گئی ہے' فاضل مصنف "پستالوزی" کی زندگی میں ڈوبے ہوے ہیں' انہوں نے اس کا ہر حیثیت سے مطالعہ کیا ہے' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیرت کے پہلوؤں اور اس کے تصورات اور نظریوں کے پس منظر کی تصویر ایسے نقوش میں اتاری ہے جس سے ان کا تبحر ظاہر ہوتا ہے ـــ

کتاب مجلد اور چھوٹی تقطیع پر ہے - ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے' آخر میں فہرست اصطلاحات علمیہ اور فہرست اسمائے مصنفین اور ضمیموں کے لگائی گئی ہے' قلم بہت باریک ہے' اگر دوسرے اڈیشن میں کسی قدر جلی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا -

(و)

# متفرقات

## معاہدہ عمرانی یا اصول قانون سیاسی-

(مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب پروفیسر ڈھاکہ
یونیورسٹی - مجلد قیمت دو روپے - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

یہ کتاب فرانسیسی حکیم "ژان ژاک روسو" کی مشہور کتاب "Social Contract" کا ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم - اے ' پی ' ایچ ' ڈی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے مصنف کی اصل فرانسیسی کتاب سے کیا ہے - فاضل مترجم کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس بارہ سال پہلے جامعہ ملیہ نے اس کتاب کا ترجمہ "عقد اجتماعی" کے نام سے مولوی محمد مسلم صاحب ایم - اے سے کرایا تھا جس کا کچھ حصہ تلف ہوگیا ' چنانچہ فاضل مترجم نے بجائے اس کی تکمیل کے ' پورا ترجمہ خود ہی کر لیا ' دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے بھی اسی کتاب کا ترجمہ اسی نام سے کرایا ہے - لیکن شاید اس کی اشاعت کی نوبت اب تک نہیں آئی ہے —

'روسو' کے نام سے ہر وہ شخص جو انگریزی داں ہے یا سیاسیات سے تھوڑی بہت دلچسپی بھی رکھتا ہے ضرور واقف ہے ' اس کی بے چین شخصیت نے اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں نہ صرف فرانس بلکہ سارے یورپ میں

تہلکہ ڈال دیا تھا' یورپ کی سیاسیات میں انسانی عنصر' انسانیت کی عظمت' اور "ادارہ اجتماعی" کے تصورات اسی کے داخل کیے ہوئے ہیں۔ اس کی اس کتاب کا پہلا فقرہ" انسان آزاد پیدا ہوا' مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے" وہ اعلان جنگ تھا جس نے استبدادی حلقوں میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ تقریباً دو صدی گزر جانے اور دنیا کے حالات بدل جانے کے بعد بھی اس کی یہ کتاب سیاسیات کی 'کلاسک' ہے' اور ہم 'جامعہ ملیہ' اور فاضل 'مترجم' دونوں کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی کے اس دور میں اس کتاب کو شائع کیا' ہمیں امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس کا مطالعہ بہ نظر غائر کریں گے' اور "نعروں" اور "جھکاروں" کے سیلاب میں بہنے کی بجائے' طالب علمانہ حیثیت سے سیاست کی گتھی سلجھانے کی کوشش کریں گے —

فاضل مترجم نے کتاب کے شروع میں ۳۷ صفحات کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں 'روسو' کی سوانح' اس کے زمانے کے تاریخی پس منظر' اور اس کے نظریات کو بڑی محنت کے ساتھ اور شرح و بسط سے بیان کیا ہے' کتاب کے شروع میں مصنف کی تصویر بھی ہے۔ آخر میں انگریزی اور اردو حروف تہجی کے اعتبار سے اصطلاحات کی فرہنگ بھی شریک ہے' جو ناظرین کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی —

(و) . . .

———

# اُردو کے جدید رسالے

## تنویر -

(اڈیٹر سحر صاحبہ - سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنے
تیرڈ سائکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸)

یہ ماہانہ رسالہ بمبئی سے شایع ہوا ہے - اس کی اڈیٹر ایک خاتون ہیں - مضامین زیادہ تر ادبی اور معاشرتی ہوتے ہیں - فسانے اور نظمیں بھی ہوتی ہیں - رسالے کی ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے - مضامین کی عبارت صاف اور صحیح ہوتی ہے - خیالات میں آزادیء فکر پائی جاتی ہے - بمبئی سے ایسے رسالے کی اشاعت بہت غنیمت اور قابل قدر ہے - شہر بمبئی میں اردو زبان کا رواج ایک مدت سے چلا آرہا ہے - اب بھی اردو کے متعدد اخبار اور رسالے شایع ہوتے ہیں - بمبئی شہر صوبہ بھر کے لیے اردو کا بہت اچھا مرکز ہوسکتا ہے —

---

## مشعل -

(اڈیٹر مفتی عزیزالرحمن صاحب ' بی - اے ' بی - ٹی -
ایس - گورنمنٹ ٹریننگ اسکول (مردانہ) پشاور -
سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے )

یہ ماہانہ رسالہ صوبۂ سرحد کے مدرسۂ تعلیم المعلمین سے شایع ہوتا

ہے- اس لیے اس میں تمام مضامین تعلیمی اور علمی ہوتے ہیں اور جس طرح مدرسین اور طلبہ کے لیے مفید ہیں، ویسے ہی عام شائقین کے لیے بھی کارآمد ہیں—

اس رسالے کے پہلے نمبر میں ایک مضمون "اردو کی ترویج اور صوبۂ سرحد" پر ہے- اس میں صوبۂ سرحد کی زبانوں پر مدلل بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالات میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہی ہونا چاہیے اور یہ نہ صرف صوبۂ سرحد کے حق میں بلکہ بلحاظ تعلقات سارے ملک کے لیے بہتر اور مناسب ہوگا- جن لوگوں نے اس صوبے میں ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا کیا ہے وہ ہندستان کے دوست نہیں ہوسکتے وہ خواہ مخواہ دو قوموں میں نفاق پیدا کر کے سارے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں—

## خاص نمبر

## خاتون سرحد -

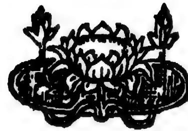
( اڈیٹر ش - ت بنت میاں غلام صمدانی مرحوم --
سالانہ چندہ قسم اول چار روپے اور قسم دوئم دو روپے )

خاتون سرحد، پشاور کا یہ خاص نمبر اچھا خاصا ضخیم ہے اور اس میں ہر قسم کے دلچسپ اور مفید مضامین ہیں - خصوصاً ایسے مضامین کی تعداد زیادہ ہے جن کا تعلق انتظام خانہ داری اور صحت و صفائی

سے ہے - یہ خاص نمبر بڑی خوبی سے مرتب کیا گیا ہے - متعدد رنگین تصویریں بھی ہیں —

## پھول باغ پٹیالہ کا سالانہ نمبر -

یہ خاص نمبر بڑی تقطیع کے ۱۹۲ صفحے پر ہے - جس میں مختلف مضامین ' نظموں ' فسانوں وغیرہ کی تعداد ۹۴ ہے - مضامین کی نوعیت بھی متعدد ہے - مثلاً اخلاقی ' ادبی ' تفریحی ' تعلیمی اور بچوں کے لیے خاص مضامین - آخر میں ایک خاص پٹیالے سے متعلق ہے جس میں والیء ریاست اور بعض مشاہیر پٹیالہ کے حالات درج ہیں - قابل اڈیٹر نے ملک کے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں سے مضامین حاصل کیے ہیں اور اس رسالے کو فی الحقیقت پھول بنا دیا ہے —



# اطلاع

انجمن ترقیء اُردو (ہند) کے ذخیرۂ کتب میں حسب ذیل کتابوں کا حال میں اضافہ ہوا ہے ، شائقین دفتر انجمن سے یہ کتب طلب فرما سکتے ہیں —

## مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی کی تازہ ادبی و علمی کتب

(۱) میری کہانی مکمل - (پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی - (ہر دو حصہ قیمت چار روپے

(۲) میدان عمل - (منشی پریم چند آنجہانی کا شاندار ناول) قیمت دو روپے آٹھ آنے

جوش ملیح آبادی کی نظمیں )

(۳) فکر و نشاط " " ایک روپیہ آٹھ آنے

(۴) شعلہ و شبنم " " تین روپے

(۵) نقش و نگار " " دو روپے

(۶) تاریخ فلسفۂ اسلام - قیمت دو روپے

(۷) المدینۃ الاسلام - دو روپے

(۸) خطبات خالدہ ادیب خانم، دو روپے

(۹) نغمات - (آلِ احمد اکبر آبادی کے مضامین کا مجموعہ) - بارہ آنے

(۱۰) مضامین رشید (پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ) دو روپے

(۱۱) معاہدۂ عمرانی - (انقلاب فرانس کے بانی روسو کی شہرۂ آفاق تصنیف سوشیل کنٹر کٹ کا ترجمہ - دو روپے

(۱۲) جاپان (ایشیا کے انگلینڈ یعنی جاپان کے سبق آموز حالات) - دو روپے

(۱۳) ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ - چار آنے

(۱۴) دیہی صنعتیں - دو آنے

(۱۵) شاخ نبات - ایک روپیہ آٹھ آنے

(۱۶) کلام جوہر - (ہندوستان کے محبوب رہنما مولانا محمد علی کے کلام کا مجموعہ) آٹھ آنے

المشتہر :- انجمن ترقیء اُردو اورنگ آباد (دکن)

(۱۷) عقیدۂ اعجاز القرآن کی تاریخ - ۵ آنے

(۱۸) تعلیمات قرآن - دو روپے

(۱۹) پستالوزی - از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب) ایک روپیہ آٹھ آنے

بچوں کے لیے (مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی)

شہزادی گلنار - چار آنے

ننھی مرغی دو آنے

بچوں کی کہانیاں - دو آنے

تانبیل خاں - دو آنے

کائنات - چار آنے

بھکاری - تین آنے

شہد لا - تین آنے

نیت کا پھل - دو آنے

مرغی اجمیر چلی - دو آنے

چھدو - تین آنے

---

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

میکفرن اور لوسی - دو آنے

مکاتب - ایک روپیہ

ترجمہ سفر نامۂ شاہ ایران - ایک روپیہ آٹھ آنے

افراد کا سبھ - چار آنے

مجاہدین مراکش - ایک روپیہ بارہ آنے

مضامین مہاتما گاندھی - دس آنے

دیوان ذوق مرتبہ آزاد - دو روپے

ترک موالات در ممالک غیر - دس آنے

تذکرۂ کاملان رامپور - تین روپے

اتحاد اسلام - چار آنے

وکرم اروسی - ایک روپیہ آٹھ آنے

دختر فرعون

مصر و ایران کے تہذیب و تمدن اور رفعت و عروج کا تذکرہ اس کے مطالعہ سے ایران و مصر کی عظمت رفتہ کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے قیمت حصہ اول دو روپے قیمت حصہ دوم دو روپے

---

شاد بک ڈپو پٹنہ عظیم آباد

فکر بلیغ (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ایک روپیہ آٹھ آنے

داستان عجم - (شاہ نامۂ فردوسی پر سیر حاصل تبصرہ) - (نواب نصیر حسین

خیال عظیم آبادی مرحوم کے قلم سے) ایک روپیہ
یادگار عشق - ایک روپیہ چار آنے
مثنوی مادرھند (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ۸ آنے
ظہور رحمت (از شاد عظیم آبادی مرحوم) ۸ آنے
رموز العروض (از حمید عظیم آبادی) ۸ آنے

**نظام الملک اصفجاہ اول**

(بانیء سلطنت آصفیہ کے سبق آموز حالات)

یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ نے انگریزی زبان میں نہایت دلکش انداز میں تحریر فرمائی ھے - قیمت چھہ روپے



### انجمن کی بعض زیر طبع تصانیف

## کلیات فانی

آردو کے مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کے مکمل اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ' یہ کتاب انجمن کی طرف سے نہایت اھتمام سے دھلی میں طبع ہو رہی ھے —

## حیات جاوید

مولانا حالی مرحوم کی مشہور تصنیف جو تقریباً نایاب ہو چکی تھی انجمن کی طرف سے بہترین طباعت و کتابت اور نہایت عمدہ کاغذ پر عنقریب شائع کی جائے گی —

نوٹ : اِن دونوں کتب کے لیے شائقین ابھی سے آرڈر بھیج دیں تا کہ چھپتے ہی یہ کتب ان کی خدمت میں ارسال کی جا سکیں —

المشتہر : منیجر انجمن ترقیء اُردو اورنگ آباد (دکن)

# خطوط شبلی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے وہ نادر دلکش خطوط جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام انتہائی اخلاق و محبت سے تحریر فرمائے تھے - اس مجموعہ کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیء اردو (ہند) نے ایک نہایت لطیف و دلکش مقدمہ تحریر فرمایا ہے قیمت ایک روپیہ —

# حقیقت اسلام

نواب سر امین جنگ کی مشہور تصنیف ' نوٹس آن اسلام' کا با محاورہ و سلیس ترجمہ قیمت ۱۲ آنے —

---

# عروس ادب

مولوی سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ادبی' تاریخی' اخلاقی اور سیاسی مضامین کا قابل قدر مجموعہ قیمت دو روپیے —

---

# پروفیسر منہاج الدین کی تصانیف

**نظریۂ اضافیت**

اس کتاب میں آئین اسٹائین کا نظریہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے - سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے قیمت غیر مجلد چار روپیے مجلد چار روپیے بارہ آنے —

**زینت آسمان**

ستاروں کو پہچاننے کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی کتاب موجود نہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے -

**ریڈیو**

اس کتاب میں بے تار پیام رسانی اور اس کے متعلق تمام ضروری مسائل نہایت شرح و بسط سے بتادیے ہیں قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے -

المشتہر :- انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد ( دکن )

# جگ بیتی

پنڈت برجموهن صاحب کیفی کی پر اثر اور دلکش مثنوی ' طباعت و کتابت دیدہ زیب' نہایت اعلیٰ قسم کا کاغذ لگایا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے مجلد ایک روپیہ —

# چند ہمعصر

مصنفہ جناب مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

سکریٹری انجمن ترقیء اردو (ہند)

اس کتاب میں مولانا کے وہ مضامین نہایت کاوش سے جمع کیے گئے ہیں جو مولانا موصوف نے اپنے بعض ہمعصروں کی وفات کے بعد تحریر فرمائے تھے - مولانا کی اس تصنیف میں کیرکٹر اسکیچ کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں جو اپنی نظیر آپ کہلانے کے مستحق ہیں - یہ کتاب نہایت اہتمام سے لطیفی پریس دہلی میں طبع ہوئی ہے - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ کلدار مجلد ایک روپیہ چھہ آنے کلدار —

الملہ ، ہیکر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

# فاؤست

جرمنی کے الہامی شاعر گوئٹے کے ڈرامے "فاؤست" کا دنیائے ادب و تخیل کا وہ کارنامہ ہے جو ایک صدی سے تمام عالم میں مشہور اور دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے' مبسوط محققانہ مقدمے کے ساتھ اسے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب' ایم' پی' ایچ' ڈی (برلن) نے ترجمہ کیا ہے - قیمت مجلد چار روپے' غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے —

# مقالات حالی حصۂ دوم

اس میں مولانا حالی کی تمام تقریریں اور مشہور نامور کتابوں پر تبصرے اور تقریظیں ہیں - اردو ادب کی بے مثل کتاب ہے - کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہے - قیمت مجلد دو روپے غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے —

# سودا

یہ کتاب نہایت تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے - سودا کے متعلق اس سے بہتر اور کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی - کاغذ اعلیٰ - طباعت دیدہ زیب - انجمن کے خوشنما اور خوبصورت ٹائپ میں رنگین بارڈر کے ساتھ خاص اہتمام سے چھاپی گئی ہے - صفحات - ۳۹۷ - تقطیع ۱۰ ۱/۲ × ۷ ۱/۲ قیمت غیر مجلد ڈھائی روپے کلدار اور مجلد تین روپے کلدار —

# اطلاع

ملک کے دوسرے اشاعت خانوں کی اعلیٰ درجے کی تصانیف کے علاوہ حسب ذیل اداروں کی بلند پایہ اردو کتب بھی انجمن ترقیٔ اردو کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہو سکتی ہیں :—

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ - نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں - شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور - دارالاشاعت پنجاب لاہور - قومی کتب خانہ لاہور - دارالمصنفین اعظم گڑھ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن - کتابستان الہ آباد - شاد بک ڈپو پٹنہ - ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد - مسلم ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ - ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ —

المشتہر :- منیجر انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

# مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو

| نام کتاب | مجلد | | غیر مجلد | | نام کتاب | مجلد | | غیر مجلد | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | روپے | آنے | روپے | آنے | | روپے | آنے | روپے | آنے |
| فلسفۂ تعلیم | ۲ | ۰ | ۱ | ۱۲ | تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| القول الاظہر | ۱ | ۰ | ۰ | ۸ | تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| رہنمایان ہند | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ | تاریخ یونان قدیم | ۲ | ۰ | ۰ | ۰ |
| امرائے ہنود | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ | نکات الشعرا | ۲ | ۴ | ۱ | ۱۲ |
| النمر | ۱ | ۰ | ۰ | ۱۰ | وضع اصطلاحات | ۳ | ۱۲ | ۳ | ۴ |
| تاریخ تمدن حصہ اول | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ | بجلی کے کرشمے | ۱ | ۱۲ | ۱ | ۴ |
| تاریخ تمدن حصہ دوم | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ | تاریخ ملل قدیمہ | ۱ | ۱۲ | ۰ | ۰ |
| فلسفۂ جذبات | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ | محاسن کلام غالب | ۱ | ۰ | ۰ | ۱۰ |
| البیرونی | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ | قواعد اردو | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| دریائے لطافت | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ | تذکرۂ شعرائے اردو | ۱ | ۱۴ | ۱ | ۶ |
| طبقات الارض | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ | جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ |
| مشاہیر یونان و روما حصہ اول | ۴ | ۰ | ۳ | ۰ | تاریخ ہند ہاشمی | ۰ | ۰ | ۱ | ۱ |
| مشاہیر یونان و روما حصہ دوم | ۳ | ۰ | ۲ | ۸ | مثنوی خواب و خیال | ۱ | ۸ | ۱ | ۰ |
| اسباق النحو حصہ اول | ۰ | ۰ | ۰ | ۶ | کلیات ولی | ۵ | ۰ | ۴ | ۰ |
| اسباق النحو حصہ دوم | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ | چمنستان شعراء | ۵ | ۸ | ۴ | ۸ |
| علم المعیشت | ۵ | ۸ | ۵ | ۰ | ذکر میر | ۰ | ۰ | ۲ | ۰ |

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ملنے کا پتہ : انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

# انجمن ترقی اردو

| نام کتاب | مجلد روپے | مجلد آنے | غیر مجلد روپے | غیر مجلد آنے |
|---|---|---|---|---|
| سہ نظم ہاشمی | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ |
| بزم مشاعرہ | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| دیوان اثر | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| مخزن نکات | ۱ | ۸ | ۱ | ۲ |
| دیوان یقین | ۲ | ۰ | ۱ | ۸ |
| باغ و بہار یا قصۂ چہار درویش | ۰ | ۰ | ۲ | ۰ |
| گوئٹے کا فاؤسٹ | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| ریاست | ۵ | ۰ | ۴ | ۸ |
| تذکرۂ ہندی (از مصحفی) | ۲ | ۰ | ۱ | ۱۰ |
| ریاض الفصحاء (از مصحفی) | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| عقد ثریا (از مصحفی) | ۱ | ۲ | ۰ | ۱۲ |
| تاریخ ادبیات ایران (ترجمہ از براؤن) | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ |
| سب رس | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| ترکوں کی اسلامی خدمات | ۰ | ۰ | ۱ | ۸ |
| داستان رانی کیتکی | ۰ | ۰ | ۰ | ۴ |
| تذکرۂ شعرائے گجرات (گردیزی) | ۱ | ۳ | ۰ | ۱۴ |
| گلزار ابراہیم | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |
| مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| اردو اور صوفیائے کرام | ۰ | ۰ | ۰ | ۸ |
| مرحوم دہلی کالج | ۰ | ۰ | ۱ | ۸ |
| حقیقت جاپان | ۳ | ۸ | ۳ | ۰ |
| مقالات حالی حصہ اول | ۴ | ۰ | ۳ | ۸ |
| کلیات تاباں | ۲ | ۴ | ۱ | ۱۲ |
| خطبات گارساں دتاسی | ۵ | ۰ | ۴ | ۸ |
| جوش اوراطالیہ (رمانیکی) | ۰ | ۰ | ۰ | ۱۰ |
| گل عجائب | ۱ | ۱۰ | ۱ | ۴ |
| جنگ نامہ عالم علی خاں | ۰ | ۰ | ۰ | ۶ |
| ارتقا | ۱ | ۶ | ۱ | ۰ |
| لغت اصطلاحات علمیہ | ۶ | ۰ | ۰ | ۰ |
| انتخاب کلام مہر | ۲ | ۸ | ۲ | ۰ |

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

# شعلۂ طور

دوسرا ایڈیشن

شاعر رنگیں حضرت "جگر" مرادآبادی کے کلام سے کون واقف نہیں - ان کے کلام کے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ نے شایع کیا ہے - اس مرتبہ موصوف کی چند نئی غزلوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے —

طباعت وغیرہ اعلیٰ' از حد دیدہ زیب' پچ رنگی سنہرا کور' مضبوط و خوبصورت جلد اور "جگر" کی ایک بے نظیر تصویر - ان تمام خصوصیت کے باوجود ہم نے قیمت میں کمی کر دی ہے -

یعنی تین روپے کے بجائے دو روپے آٹھ آنے

# سائنس

## انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھہ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) طلباء کے ساتھہ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں چار روپے آٹھہ آنے سکۂ انگریزی یا پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 18 JANUARY, 1938. No. 69

# The Urdu

## The Quarterly Journal

OF

## The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

**Abdul Haq B. A., (Alig.)**

HONORARY SECRETARY

qqi - e - Urdu, Aurangabad, (Deccan).